

تصوف پر علمی تحقیقی و دعوتی مجلہ
کتابی سلسلہ
الاحسان
An Annual Journal on
ISLAMIC SPIRITUALITY
10
سلطان المشائخ نمبر
Pay heed! Indeed upon the friends of Allah
is neither any fear, nor any grief (10:62)
شاہ صفی اکیڈمی
SHAH SAFI ACADEMY
A centre for research on Islamic studies and Sufism

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصوف پر علمی، تحقیقی و دعوتی مجلہ

الاحسان

شاہ صفی اکیڈمی

خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں

سلسلۂ مطبوعات نمبر (۲۲)

کتابی سلسلہ: الاحسان (شمارہ نمبر-۱۰)

مدیر: حسن سعید صفوی

ترتیب: ذیشان احمد مصباحی، غلام مصطفیٰ ازہری، ضیاء الرحمن علیمی، مجیب الرحمن علیمی

سرورق: طارق رضا قادری

کمپوزنگ: ظفر عقیل سعیدی

اشاعت: مارچ ۲۰۲۰ء/ رجب ۱۴۴۱ھ

ضخامت: ۶۴۶ / صفحات

ناشر: شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں، کوشامبی (یوپی)

قیمت فی شمارہ:	Rs. 600
بیرون ممالک:	$. 50

Alehsaan (*An Annual Journal on Islamic Spirituality*)

Published by: **Shah Safi Academy**, Khanqah-e-Arifia

Saiyed Sarawan, Kaushambi, U.P.(India) 212213

Ph:9312922953 / 9026981216-Email:alehsaan.yearly@gmail.com

اھل قلم کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں!


قد أفلح من تزكى

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو زندہ کنم دار و رسن را

سلطان المشائخ

برہان الحقائق

عالم علومِ ربانی

کاشفِ اسرارِ رحمانی

خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی قدّس اللہ روحہٗ

(پیدائش: ۶۳۶ھ/ ۱۲۳۷ء- وفات: ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۴ء)

کے نام

درویشی و فقر و کج کلاہی دارد

زیبائی و دارائی و شاہی دارد

کم یافت کسے ز اولیائے امت

آں رتبہ کہ محبوب الٰہی دارد

(رہبر نصیر)

مشمولات

احوال

25-09

بادہ وساغر

46-27

بادۂ کہنہ

106-47

پس منظر

174-107

شخص وعکس

431-175

ملفوظات

524-433

خصوصی تحریر

621-525

تأثرات

628-623

مکتوبات

643-629

”شیخ عبدالقادر گیلانی و شیخ نظام الدین بدایونی در مقام معشوقی بودند. واللہ! همچون نظام الدین بدایونی و عبدالقادر گیلانی در زیر کبود آسمان نیامده است و نخواهد آمد.“

شیخ عبدالقادر جیلانی اور شیخ نظام الدین بدایونی مقام معشوقیت پر فائز تھے۔
خدا کی قسم! روئے زمین پر ان حضرات جیسا نہ آیا ہے اور نہ آئے گا۔
حضرت خضر علیہ السلام (۱)

---

(۱) بروایت شیخ محمد جعفر مکی، خلیفہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی، بحر المعانی، مکتوب: ۱۴، ص: ۲۱۳، ۲۱۴

احوال

افادات: شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی
ترتیب: ضیاء الرحمٰن علیمی

شذرات

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں ہیں: ایک طرف آپ خلق کی طرف اللہ کے نبی ہیں تو دوسری طرف اپنے رب کے محبوب وولی ہیں۔ نبوت کا تعلق خلق سے اور ظاہر سے ہوتا ہے جب کہ ولایت کا تعلق رب سے اور باطن سے ہوتا ہے۔

فیضان نبوت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک دین پہنچایا جائے اور ان کے ظاہر میں دین قائم کر کے ان کو قوانین شرع کا پابند کیا جائے، اور خطا ہونے کی صورت میں حدود وتعزیرات جاری کیے جائیں۔ اس کے برعکس فیضان ولایت یہ ہے کہ بندے کا تعلق اپنے رب سے قائم ہو جائے اور بندگان خدا کے باطن کو اس طرح آراستہ و پیراستہ کر دیا جائے کہ اسے بھی محبت الٰہی اور قرب ربانی حاصل ہو جائے۔ حضور کی مکی زندگی فیضان ولایت کے غلبے کا مظہر ہے جب کہ مدنی زندگی فیضان نبوت کے غلبے کا نمونہ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیک وقت نبی بھی ہیں اور ولی بھی، چنانچہ آپ کے بعد آپ سے دو چشمۂ انوار جاری ہوئے: چشمۂ نور فیضان نبوت اور چشمۂ نور فیضان ولایت۔

جب غلبہ نور فیضان نبوت کا ہوتا ہے تو دین اسلام کی نشر واشاعت ہوتی ہے، اسلامی سرحدیں وسیع ہوتی ہیں، اسلامی حدود وقوانین کا اجراء ہوتا ہے اور فتنے نہیں ہوتے۔ اس کے برخلاف جب نور فیضان ولایت کا غلبہ ہوتا ہے تو دینِ اسلام کی عمومی نشر واشاعت اور اسلامی حدود کی توسیع نہیں ہوتی بلکہ دینِ احسان کا غلبہ ہوتا ہے اور فتنوں کی کثرت ہوتی ہے اور

عشق ہے یہ تماشہ نہیں ہے — کھال کھنچتی ہے کٹتی ہے گردن

کے مظاہر سامنے آتے ہیں۔

تمام خلفاے راشدین بشمول سیدنا ابو بکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہم دونوں چشموں سے مستفیض ہوئے البتہ ان

دونوں حضرات کے یہاں غلبہ،نور فیضان نبوت کا رہا،اس لیے ان حضرات کے عہد میں حدود اسلامی کی توسیع ہوئی، دین اسلام کی نشر واشاعت ہوئی اور فتنے کم سے کم رہے۔ان کے برخلاف سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتنے زیادہ ہوئے کیوں کہ ان پر نور فیضان ولایت کا غلبہ تھا۔ دونوں طرف دو دو خلفائے راشدین کے درمیان سیدنا عثمان کی شخصیت برزخ کی ہے کہ ان کے نصف مدت خلافت میں نور فیضان نبوت کا غلبہ رہا جب کہ نصف میں فیضان ولایت کا غلبہ رہا۔اسی لیے ان کے نصف مدت خلافت میں اسلامی سرحد کی خوب توسیع ہوئی اور امن وامان رہا جب کہ دوسرے نصف میں فتنوں کا سیلاب اُمڈ پڑا جوان کی شہادت پر ختم ہوا اور اس طرح آپ ایک دوسرے معنیٰ میں بھی ذوالنورین کہلائے،یعنی نور فیضان نبوت اور نور فیضان ولایت کے جامع۔

سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ پر جب خلافت علی منہاج النبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور دوبارہ بحالی کی امید بھی منقطع ہو گئی اور ارشاد رسول کے مطابق کاٹ کھانے والی بادشاہت آ گئی اور کذب پھیل گیا یہاں تک کہ نواسۂ رسول امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا تو دین کی حفاظت اور اس کی نشر واشاعت کا ذمہ مختلف اہل اللہ کی جماعتوں نے اٹھالیا۔ چنانچہ متکلمین نے عقیدے کی، محدثین نے احادیث رسول کی اور فقہا نے احکام وشرائع کی حفاظت کی اور روح دین کی صیانت اور بندگان مولیٰ کی ایمانی واحسانی تربیت کی ذمہ داری صوفیہ نے لے لی اور انہوں نے منہاج نبوی پر نور فیضان ولایت کی نشر واشاعت سے مشن کا آغاز کیا،اس لیے کہ مکے میں اسلامی ریاست قائم نہیں تھی لیکن تربیت یافتہ مخلصین ومقربین تیار ہو رہے تھے۔صوفیہ کو معلوم تھا کہ خلافت ظاہری قائم ہو یا نہ ہو دین کا کام چلتا رہے گا،یوں صوفیہ کی جماعت اپنے نام کے ساتھ وجود میں آئی اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہر زمانے میں کبار صوفیہ نے اس احسانی مشن اور نور فیضان ولایت کی ترویج کے لیے جدو جہد کی اور قوا أنفسكم وأهليكم نارا پر عمل کرتے ہوئے اپنی خانقاہ اور متعلقین کے دائرے میں اقامت دین کا فریضہ بھی انجام دیا یہاں تک کہ قطب ربانی محبوب سبحانی سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کے عہد میں آفتاب تصوف نصف النہار پر پہنچ گیا اور پھر اس عہد سے لے کر سلطان المشائخ محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا کے عہد تک نصف النہار پر رہا، گویا تصوف کے لیے محبوب سبحانی سے لے کر محبوب الٰہی تک کا وقت ضحوۂ کبریٰ کا ہے جس میں آفتاب نصف النہار پر ہوتا ہے،اس کے بعد زوال شروع ہو گیا، یہاں تک کہ ہم جس عہد میں ہیں اس سے بالکل جو قریب زمانہ ہے اس میں گویا بالکل تاریکی چھا گئی لیکن ہر شب دیجور کے بعد سپیدی سحر نمودار ہوتی ہے،موجودہ عہد میں ہر طرف پھر سے تصوف کا نام لیا جا رہا ہے۔امید ہے کہ پھر سے نور فیضان ولایت عام ہوگا اور پھر سے یہ آفتاب نصف النہار پر پہنچے گا اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا یہاں تک کہ سیدنا امام مہدی کا ظہور ہوگا اور ان کی ذات میں نور فیضان نبوت اور نور فیضان ولایت دونوں جمع ہو جائیں گے اور ان کی ذات سے نور فیضان نبوت اور نور فیضان ولایت دونوں عام وتام ہوگا۔

○○○

ذیشان احمد مصباحی

ابتدائیہ

عہد حاضر میں فروغ تصوف کا جو ایک نیا ظاہرہ سامنے آیا ہے، وہ خوش آئند بھی ہے اور تشویش ناک بھی۔ خوش آئند اس لیے کہ دیر یا سویر ہی سہی، دنیا میں کچھ ایسے اسباب پیدا ہوئے جن کی وجہ سے شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمان تصوف- روح اسلام- کی طرف متوجہ ہوئے۔ عہد تغلب نے مسلمانوں کے اندر جو ''دینی مزاج'' پیدا کیا اور عہد مغلوبیت نے دنیا میں جس اسلاموفوبیا کو جنم دیا، ان کی وجہ سے دنیا بھر میں اسلام کی جو غلط شبیہ سامنے آئی، وہ ایک جنگ جو مذہب کی شبیہ تھی۔ فروغ تصوف کے نئے ظاہرے سے توقع ہے کہ اب اسلام کی درست شبیہ سامنے آئے گی۔ مسلمانوں کے اندر بھی اسلام کی حقیقی اخلاقیات کا احیا ہوگا اور غیر مسلموں کے اندر بھی اسلام کے تعلق سے پیدا غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا۔

فروغ تصوف کا نیا ظاہرہ تشویش ناک اس لیے ہے کہ اس کے پس پشت جو محرکات ہیں، ان میں دینی سے زیادہ سیاسی اور اسلامی سے زیادہ غیر اسلامی اغراض شامل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ طالبان- جو وہابی اسلام کا حامل تھا- کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد امریکا بہادر دنیا بھر میں صوفی اسلام کو Replace کرنے میں کوشاں ہے۔ دوسری طرف مذہبی حلقوں کا جائزہ لیجیے تو گذشتہ چند سالوں میں اہل سنت کے بیچ تصوف اور بعض متصوفانہ خیالات کے نام پر تفریق و انتشار کا ایک نیا Trend سامنے آیا ہے۔ ایک طرف تصوف سے جڑے اہل سنت کا ایک طبقہ متصوفانہ خیالات کے استہزا میں مصروف ہے تو دوسری طرف تصوف کے نام پر احکام شریعت میں تقصیر اور شریعت کی تخفیف کی ایک نئی روایت کا آغاز ہو رہا ہے۔ داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ صفوی فرماتے ہیں کہ ڈر ہے کہ کہیں تصوف کے نام پر مسلمانوں میں ایک نئے فتنے کی شروعات نہ ہو جائے، اس لیے ہمیں تصوف کے حوالے سے بھی انتہائی حساس اور سنجیدہ رہنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح صوفیانہ فکر و اخلاق سے دست برداری اور شریعت کے نام پر خالص ظاہر داری اور شدت پسندی و بد خلقی ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے، اسی طرح تصوف کے نام پر شریعت سے جداگانہ روش بھی ہمارے لیے کسی قیمت پر قابل قبول نہیں ہے۔ ایک طرف بعض بے

بصیرت فقہا کا اسلام ہے جس میں نہ صرف غیر مسلموں سے کلی قطع تعلق واجب ہے بلکہ اپنے مسلک کے علاوہ دیگر اہل قبلہ کے احترام وتوقیر کی بھی کوئی گنجائش نہیں ،تو دوسری طرف بعض جہلا ہیں جو صوفیانہ رواداری کے نام پر بتوں کے سامنے ماتھا ٹیکنے اور بھجن، کیرتن کرنے میں بھی ذرہ برابر گریزاں نہیں ہیں۔

ان دونوں رویوں کے خلاف ہمیں علمی ،فکری، قلمی ،لسانی اور عملی جہاد جاری رکھنا ہوگا۔

حدیث جبریل کی شرح وتفسیر کرتے ہوئے حضرت داعی اسلام فرماتے ہیں:

اسلام کو تین درجات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱- ناقص اسلام- اسے دوسرے لفظوں میں منافقت یا زبانی اسلام بھی کہا جا سکتا ہے۔قاضی اور حاکم کے یہاں یہی اسلام معتبر ہے۔ جو زبان سے خود کو مسلمان کہتا ہے،حکومت کے رجسٹر میں اسے مسلمان ہی لکھا جاتا ہے، جب کہ یہ اسلام خدا کے حضور غیر معتبر اور مردود ہے۔ یہ وہی اسلام ہے جس کا ذکر قرآن پاک کی سورۃ الحجرات آیت نمبر ۱۴ رمیں ہوا ہے۔ارشاد ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ۔

جاہلوں نے کہا ہم ایمان لے آئے ،آپ کہہ دیں کہ تم ایمان نہیں لے آئے ،تم نے تو صرف اسلام کا اظہار کیا ہے۔ایمان تو ابھی تمہارے قلوب میں داخل ہی نہیں ہوا۔

۲- کامل اسلام- یہی اسلام اگر یقین قلبی کے ساتھ ہو تو اسلام کامل ہو جاتا ہے۔اسلام کامل ہی دراصل ایمان ہے۔ یہی اسلام اللہ کے حضور مقبول اور آخرت میں معتبر ہے۔لہٰذا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ظاہرِ احکام کی مکمل پابندی کے ساتھ ساتھ اپنا عقیدہ بھی درست رکھے اور بطور خاص خدا کے وجود اور آخرت ورسالت کی ہر وقت تصدیق کرتا رہے۔اس کے بغیر جو بھی اسلام ہوگا، آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

۳- اکمل اسلام- اکمل اسلام کو ہی حدیث جبریل میں احسان کہا گیا ہے۔ اسے ہی عرف عام میں تصوف کہا جاتا ہے۔ اس کے اندر ظاہری احکام کے اتباع اور قلبی تصدیق کے ساتھ ساتھ ہمیشہ یہ احساس ہونا ضروری ہے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں یا کم از کم یہ کہ خدا مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تصوف دراصل پابندی احکام ،تصدیق قلبی اور احساس حضوری کا نام ہے۔ ان تینوں میں سے اگر کوئی عنصر بھی غائب ہو تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مگر تصوف نہیں ہو سکتا۔عہد حاضر میں مدعیان تصوف کو ہمیشہ یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے، تاکہ انہیں یہ بات معلوم رہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ تصوف کے نام پر تصوف کے علاوہ کسی اور چیز کو اٹھائے جا رہے ہوں۔

مجلہ الاحسان کے پہلے شمارے میں کہا گیا تھا:

''ایک طرف اکثر موافقین تصوف، روح تصوف اور حقیقت تصوف سے نا آشنا نظر آتے ہیں، بلکہ طرفہ تماشہ یہ کہ بے جا رسومات اور خرافات کی اس قدر پابندی کرتے ہیں جیسے کہ یہی روح تصوف ہو اور دوسری طرف موافقین کی بے راہ روی کو دیکھ کر اور کچھ تعصب و عناد کی وجہ سے بعض اہل قلم تصوف، صوفیہ اور ان کی تعلیمات کو اسلام سے خارج کرتے نظر آتے ہیں- ایسے میں اہل علم کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ جانبین کو افراط و تفریط سے بچانے اور صوفیہ اور ان کی تعلیمات، درگاہیت و خانقاہیت کے مابین فرق اور خانقاہی نظام کی مقصدیت و معنویت کو علمی و دعوتی اسلوب و انداز میں موافقین و مخالفین تک پہنچانے کی پر خلوص کوشش کریں تاکہ دل و دماغ اور عقل و روح کو روشن کرنے والا علمی و روحانی چراغ ''تصوف'' اپنے اور پرائے تمام کے ظاہر و باطن کو روشن کر کے معاشرے کو امن و سکون اور محبت و بھائی چارگی کا گہوارہ بنا سکے-''

اللہ کا شکر ہے کہ خانقاہ عالیہ عارفیہ اپنے تمام شعبہ جات کے ساتھ اسی مقصد اور اسی روش پر گامزن ہے۔ خانقاہ سے شائع ہونے والا یہ مجلہ اسی مشن کا علمی ترجمان ہے۔ ہمارے سامنے علمی سطح پر دو بڑے کام ہیں:

الف: تصوف کو تمام تر خرافات اور آلودگیوں سے پاک کرنا، حقائق پر پڑے مراسم کے دبیز پردوں کو چاک کرنا اور حقائق، نظریات اور مظاہر کے بیچ تفریق اور درجہ بندی قائم کرنا۔

ب: تصوف کے حوالے سے قائم غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا، صوفیانہ مسائل و مباحث اور مصطلحات و آداب کے حوالے سے علمی و شرعی دلائل فراہم کرنا، تاکہ اس طبقے کی فکری تفہیم ہو سکے، جو مقاصد و حقائق دین سے نا آشنا ہے اور جس کی ہر تان صرف کل بدعة ضلالة کی بے بصیرت تکرار پر ٹوٹتی نظر آتی ہے۔

ان دو بڑے علمی مقاصد کے ساتھ ان کے ضمن میں حسب ذیل امور بھی شامل ہیں:

۱- تصوف سے متعلق مسائل و مباحث کی علمی تحقیق و تنقیح۔

۲- علمی اختلاف رائے کی فضا ہموار کرنا اور اہل علم کے بیچ توسع اور تحمل کی اخلاقیات کو فروغ دینا۔

۳- افہام و تفہیم کا ماحول بنانا اور بے جا نفرت و عداوت، جبر و تشدد اور بغض و عناد کو ختم کرنا۔

۴- صوفیہ کے انسانی و اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے شرعی دلائل فراہم کرنا، تاکہ نام نہاد متنفر مذہبیت کا خاتمہ ہو اور انسانی اور اسلامی اخلاقیات کے فروغ کے لیے عملی راہیں کھل سکیں۔

۵- مسائل و مباحث تصوف کی علمی تحقیق کے ذریعے تصوف کے حوالے سے طرفین کی فکری تفہیم اور نظری تطہیر کرنا، تاکہ اس کے بعد عملی تصوف کی راہ ہموار ہو سکے۔

کاروان ''الاحسان'' اول روز سے ان خطوط پر گامزن ہے اور ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ تازہ شمارہ اسی سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

کیا تصوف کے دور کا خاتمہ ہو گیا؟ اب خانقاہوں کے اندرون میں بھی ایسے سوالات پر سرگوشیاں شروع ہو گئی ہیں۔ خانقاہوں سے باہر قوالیوں کے خلاف ڈھول پیٹنے والے تو پہلے سے یہ راگ الاپے جا رہے تھے؟ یہی سوال اپنے وسیع تناظر میں ان الفاظ کے ساتھ آتا ہے: کیا مذہب کے دور کا خاتمہ ہو گیا؟

دراصل اس قسم کے سوالات مادیت کے بڑھتے سیلاب کا شاخسانہ ہیں، جس کے سبب ایک زندہ انسان اپنی روح اور روحانیت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر غافل ہوتا جا رہا ہے۔ سائنس-جس کا تعلق درحقیقت عالم مادی سے ہے- کی دوربین سے لوگ روح اور خدا کی تلاش کرتے ہیں اور جب انہیں کچھ نظر نہیں آتا تو انکار یا تشکیک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ حضرات دراصل ہوا پر کشتی چلانے کے متمنی ہیں اور جب اس کوشش میں ناکام ہوتے ہیں تو بجائے اس کے کہ اپنی غلط آرزو کی اصلاح کرتے اور منحرف منہج فکر سے رجوع ہوتے، ہوا کے وجود کا ہی انکار کر بیٹھتے ہیں۔ سائنس جہاز اور بم تو بنا سکتی ہے، لیکن سیاسی و معاشی غلبے کے لیے معصوموں پر بم برسانا غلط ہے، سائنس اپنی لیباریٹری میں یہ اخلاقی سبق نہیں پڑھا سکتی۔

جہاز اور بم کی طرح ہی اگر یہ اخلاقی سبق بھی انسانیت کے لیے ضروری ہے، تو پھر مذہب اور تصوف سے بے نیازی انسان کے لیے کبھی بھی ممکن نہیں ہے، خواہ انسان زمین چھوڑ کر مشتری اور مریخ پر ہی کیوں نہ آباد ہو جائے۔

رہا یہ سوال کہ مذہبی لوگ یہاں تک کہ صوفی لوگ بھی تو اخلاقی خون آشامیوں کے بڑے مجرم ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مذہب اور تصوف کا لبادہ اوڑھ کر بھی بسا اوقات سیاست اور اغراض آتے رہتے ہیں۔ ایسے میں مذہب اور تصوف کی ضرورت کے ادراک کے ساتھ ایک اور ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ آدمی مذہبی لبادے اور صوفیانہ دلق کو جانچتا اور پرکھتا رہے کہ کہیں اس کے اندر کوئی سیاست باز اور ڈھونگی شعبدہ باز تو نہیں۔ یہ کام بھی عقل و نقل اور فکر و بصیرت کے ساتھ اعلیٰ علمی و شرعی تحقیق و تنقیح کا متقاضی ہے۔

جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں اس وقت پورا ہندوستان ایک عجیب اضطرابی کیف سے گزر رہا ہے۔ این آر سی اور سی اے اے کے حوالے سے موجودہ حکومت کی جو تجاویز اور پالیسیز سامنے آئی ہیں، ان کی وجہ سے یہاں کے اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے اندر عدم تحفظ کا احساس تیز سے تیز تر ہونے لگا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اہل نظر- بلا تفریق مذہب و ملت- اس حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں کہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اب خطرات سے دوچار ہے۔ جہاں کل مذاہب اپنی کثرت کے باوجود غیریت اور نفرت کا احساس مٹا رہے تھے، آج وہیں یہ مذاہب اپنے جدید سیاسی شارحین کی عنایتوں کے سبب نفرت، عصبیت، غیریت بلکہ قتل و جدال کا سبق پڑھانے لگے ہیں۔

سکے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ آج - مذہب وملت اور نسل وجنس کی تفریق کے بغیر- سارا ہندوستان سڑکوں پر ہے اور نفرت کے سوداگروں کو چیلنج کر رہا ہے کہ ہم کثرت میں وحدت کے اپنے عالم گیر اور قدیم فلسفے کو اپنی نگاہوں کے سامنے برباد ہوتا دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے۔

اس دورخے ظاہرے نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ملک میں دو واضح اور متقابل آئیڈیالوجی روبرو ہیں۔ ایک ہندوستان کی دیرینہ روایتوں کا امین ہے تو دوسرا ان کا قاتل۔ ایسے میں خصوصاً مسلمانوں اور ان میں بھی بالخصوص اہل تصوف ومعرفت کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے کہ وہ نفرت کے بالمقابل محبت کی داعیانہ کوششوں کو تیز کر دیں۔ اس لیے کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صوفیانہ قدروں سے بے گانگت کے سبب خود مسلمانوں کے اندر مسلمانوں اور انسانوں کے حوالے سے اسلامی اخوت اور انسانی محبت کا رشتہ کمزور ہو گیا ہے۔ آزادی کے بعد کا یہ تقریباً ۷۵ رسالہ دورانیے میں مسلمانوں کے اندر کلمہ کا احترام کافی کمزور ہوا ہے اور برادران وطن سے تعلق میں کافی گراوٹ آئی ہے۔ ایسے میں مٹھی بھر فسطائی طاقتیں اگر مسلمانوں کے خلاف زبان وقلم اور بعض اوقات دست وبازو سے زہرافشانی اور خون آشامی کا کھیل کھیل رہی ہیں تو ہمیں اس کھیل میں اپنے رول سے بھی انکار نہیں کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی اس بات کی بھی کوشش ہونی چاہیے کہ خواجہ صاحب سے لے کر سلطان المشائخ اور امیر خسرو تک اور ان سے لے کر بعد کے مشائخ طریقت تک سب نے مل کر جس گنگا جمنی تہذیب کی تعمیر کی تھی، اس کی تعمیر نو ہو۔ وہ پریم رس پھر پلایا جائے جس نے اہل وطن کو مسلمانوں کے حق میں ایک بااخلاق میزبان بنا دیا تھا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانان ہند پورے شعور وبصیرت کے ساتھ ماضی کی صوفیانہ قدروں کو گلے لگائیں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان میں چشتی مشائخ کی روش پر پھر سے کاربند ہوں جو ہندوستانی ماحول اور معاشرت کے حق میں درست اسلامی واخلاقی روش ہے۔ اس سیاق میں سلطان المشائخ کی شخصیت اور افکار پر مشتمل یہ دستاویز ایک اہم ماخذ ثابت ہوگا۔ ان شاء اللہ!

مجلہ ''الاحسان'' کا دسواں شمارہ حاضر خدمت ہے۔ اپریل ۲۰۱۰ء میں اس قافلے کا آغاز ہوا تھا۔ مارچ ۲۰۲۰ء میں یہ اپنے دسویں پڑاؤ پر ہے۔ تلك عشرة كاملة۔ اس کاروان جذب وشوق کی سعادت بختی دیکھیے کہ اس کا دسواں پڑاؤ، شہنشاہ دہلی، سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (۶۳۶ھ-۷۲۵ھ/ ۱۲۳۸ء-۱۳۲۵ء) قدس سرہ کے آستانۂ خیر وبرکت پر ہو رہا ہے۔ یوں تو ہر شمارے میں کسی بڑے صوفی فقیہ کی شخصیت و افکار پر ایک خصوصی گوشہ شامل رہا ہے، لیکن یہ پہلا موقع ہے جب پورا کا پورا مجلہ ایک عالم وعارف اور داعی و مصلح کی شخصیت کے نام وقف ہے۔ ویسے بھی سلطان المشائخ کی ذات بابرکات ایسی محبوب ومقبول ہے کہ اہل علم صوفیۂ ہند میں سب سے زیادہ آپ ہی کے فکر وادب کو موضوع سخن بناتے ہیں اور اہل دل سب سے زیادہ آپ ہی

کی بارگاہ قدس کی طرف اپنے اندرون میں ایک وارفتگانہ شوق کا احساس پاتے ہیں۔خوشی اس بات کی ہے کہ مجلہ ''الاحسان'' نے اس ذات ستودہ صفات کی بارگاہ میں اپنا یہ حقیر نذرانہ پیش کرتے ہوئے صرف روایتی باتوں کا اعادہ نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے اندر کئی نئے گوشے سامنے آ گئے ہیں، جنہیں اہل علم محسوس کریں گے اور ان کی قدر و قیمت کا تعین فرمائیں گے۔

الاحسان کا تازہ شمارہ جو اپنے عشرے کی تکمیل کر رہا ہے، اس کے بارے میں ہم پورے وثوق کے ساتھ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ مجلہ اپنی ضخامت، ثقاہت، ظاہریت، معنویت اور روحانیت ہر لحاظ سے سابق شماروں پر فائق ہے۔تازہ شمارہ ۹ رمختلف ابواب/ کالمز پر مشتمل ہے، جن کا اجمالی تعارف حسب ذیل ہے:

''احوال'' کے اندر ابتدائیہ سے پہلے سرپرست مجلہ داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ کے ''شذرات'' شامل ہیں، جن کو مجلّے کے شریک مرتب مولانا ضیاء الرحمن علیمی نے مرتب کیا ہے، جس کے اندر حضرت سلطان المشائخ کے مقام و مرتبے کے اظہار کے ساتھ تاریخ اسلامی میں ولایت و عرفان کے عروج و زوال کی ایک ہلکی مگر دل آویز تصویر آ گئی ہے۔ یہ حضرت شیخ کے عرفانی نکات میں سے ایک اہم نکتہ ہے جو یقیناً عقل و روح کو یکساں طور پر اپیل کرتا ہے۔

''بادہ و ساغر'' کا کالم بھی اس بار کافی صحت مند ہے۔امیر الشعراء طوطیِ ہند حضرت امیر خسرو کے بہت سے وہ اشعار جو ان کے دواوین کے مختلف صفحات پر سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ کی مدح و ثنا میں بکھرے پڑے ہیں، ان کا ایک خوب صورت انتخاب خصوصیت کے ساتھ اس کالم میں شامل کیا گیا ہے، جو کالم کے وقار اور مجلہ کے اعتبار میں اضافے کا باعث ہے۔ایک تو امیر الشعراء کی فصاحت و بلاغت اور لفظی و معنوی جمالیات کے کوثر و تسنیم میں ڈھلی ہوئی زبان، اس پر محبوب الٰہی کے حسنِ دل فریب کا ذکر اور عاشقِ صادق کی جانِ سوختہ اور قلبِ حزیں کی واردات، سب نے مل کر شاعری کے حسن کو سہ آتشہ کر دیا ہے۔حضرت امیر خسرو کی اس قسم کی آٹھ منظومات شامل ہیں جن میں ایک کا ترجمہ خواجہ حسن ثانی نظامی (۲۰۱۵ء) نے اپنی دلی کی زبان میں کیا ہے جب کہ باقی سات مناقب کا ترجمہ لاہور کے آبروئے زبان و ادب پروفیسر معین نظامی نے فرمایا ہے۔خواجہ حسن ثانی نظامی کا ترجمہ فوائد الفواد کے نسخے سے لیا گیا ہے جسے انہوں نے اپنے ترجمہ اور اہتمام سے شائع فرمایا تھا، جب کہ پروفیسر نظامی کے ذریعے پیش کیے گئے مناقب اور ان کے ترجمے پہلی بار اہل علم کے سامنے آ رہے ہیں، جنہیں ان کے علمی انکشافات میں شمار کیا جانا چاہیے۔

مناقب خسرو کے علاوہ حضرت سلطان المشائخ کی شان میں مولف فوائد الفواد خواجہ حسن سجزی نظامی کی ایک منقبت بعنوان ''غلام نظامِ ایم'' بھی شامل شمارہ ہے، جس کا خوب صورت ترجمہ مدیر الاحسان مخدوم گرامی

مولانا حسن سعید صفوی نظامی دام ظلہ نے فرمایا ہے۔حسن اتفاق دیکھیے کہ شاعر بھی حسن نظامی اور مترجم بھی حسن نظامی۔مقطع اوراس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

گفتیم پنج بیت بہ یادت چو پنج گنج
ما خود حسن نہ ایم، غلامِ نظامی ایم

''آپ کی یاد میں ہم نے پانچ شعر مثل پنج گنج (پانچ خزانے) کہے ہیں؛حسن!اب ہم حسن نہیں (صرف اورصرف) خواجہ نظام کے غلام ہیں۔''

حضرت سلطان المشائخ کی بارگاہ میں تین نئے منظومات بھی بطورخراج عقیدت زینت شمارہ ہیں۔ان میں ایک نظم خود پروفیسر معین نظامی کی ہے جس کا عنوان''ارمغان دہلی'' ہے۔اس نظم میں انہوں نے زبان دہلی سے نا آشنائی اور دلی سے دوری پر اظہار رنج کے ساتھ خودکو''لاہور میں میہمان دہلی'' کہا ہے اورخسرو اور پھر غالب کی زبان آوری سے استمداد کرتے ہوئے جو نظم لکھی ہے اس میں خسرو اور غالب کی زباں شناسی اور دردمندی کا خاصہ عنصر سمٹ آیا ہے۔کیوں نہ ہو،ان کا حال تو یہ ہے کہ:

خوابوں میں تو بارہا گیا ہوں　　　　چوما ہے وہ آستانِ دہلی

پروفیسر معین نظامی نے دہلی سے دوررہ کربھی''اپنے خرقے کوزعفران دہلی میں رنگ لیا ہے'' جس کا اظہار نظم کی سطر سطر سے ہوتا ہے۔

سابق ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی لاہور جناب احمد جاوید صاحب کی نظم بھی لاجواب ہے جس کے اندر زبان و بیان کی ساری خوبیاں سمٹ آئی ہیں۔چھوٹی بحر میں سہل ممتنع کا طرز لیے رواں دواں اس نظم کا صحیح اعتراف ماہرین زبان وادب اور حاملین ذوق تصوف ہی کرسکیں گے۔آخری شعر بہت ہی بامعنی ہے:

یہ باغِ عشق ہے اور اس کا ناظم
نظام الدین محبوبِ الٰہی

سرزمین الٰہ آباد کی معروف ادبی اور خانقاہی شخصیت ڈاکٹر سید شمیم احمد گوہر دام فضلہ کے بھی ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے ادارے کو حضرت محبوب الٰہی کی شان میں لکھی تازہ منقبت عنایت فرمائی جوان کی محبتوں اور عنایتوں کا آئینہ دار ہے۔ان کا یہ شعر پسند آیا:

وظیفہ پڑھتا ہے نور وضیا ترے در کا
شب سیاہ بھی جیسے سحر نظام الدین

''بادۂ کہنہ'' کے اندر دو مقالات شامل ہیں اور دونوں ہی سلطان المشائخ کے دو ممتاز حلقہ بگوشوں کی نہایت معروف ومقبول کتابوں سے متعلق ہیں۔علامہ فخر الدین زرادی حضرت سلطان المشائخ کے ممتاز خلفا میں سے ایک

ہیں جنھوں نے اپنے پیرومرشد کے حکم سے مسئلے سماع کی تحقیق وتنقیح میں رسالہ ''اصول السماع'' لکھا تھا۔ یہ رسالہ یوں تو مطبوع تھا، لیکن تین مختلف نسخوں کی مدد سے جدید منہج پر پہلی بار اس کی تحقیق وتخریج جامعہ عارفیہ کے نوجوان استاذ مولانا محمد ذکی نے فرمائی ہے۔ ساتھ ہی کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف اور کتاب کا اردو ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا بڑا کام ہے، جس پر بجا طور پر وہ مبارکبادیوں کے مستحق ہیں۔

اس باب میں دوسرا مقالہ پاکستان کے معروف مخطوطہ شناس فاضل محترم ڈاکٹر عارف نوشاہی کا ہے۔ انہوں نے مشائخ چشت کے پہلے سوانحی انسائیکلو پیڈیا ''سیر الاولیاء'' کا تعارف کرایا ہے اور اس کے مطبوعہ و مخطوطہ نسخوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اس کتاب مستطاب کی از سر نو تحقیق واشاعت کی تجویز پیش کی ہے اور حق یہ ہے کہ وہ اپنی اس تجویز میں حق بجانب ہیں۔ مجلہ الاحسان کو مستقبل میں بھی ان سے علمی تجویز وتعاون کا ہمیشہ انتظار رہے گا۔ کاش کوئی مرد قلندر ان کی اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کمر ہمت کس سکے۔

''پس منظر'' کے تحت چار مقالات شامل ہیں۔ ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کی آمد واشاعت، سلطان المشائخ کا عہد– سیاسی، سماجی اور معاشی تناظر میں، سلطان المشائخ کی والدہ حضرت مائی صاحبہ اور سلطان المشائخ کے پیرومرشد بابا فرید گنج شکر۔ یہ مقالات بالترتیب مولانا اصغر علی مصباحی، جناب احمد جاوید، جناب عینین علی حق اور جناب نورین علی حق نے قلم بند فرمائے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ علمی وتحقیقی اور تاریخی وتفکیری مقالہ جناب احمد جاوید صاحب کا ہے، جب کہ مولانا اصغر علی مصباحی اور عینین برادران نے بھی اپنے طور پر موضوع کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

''شخص وعکس'' کا کالم سب سے زیادہ صحت مند ہے۔ اس میں کل ۸؍ علمی مقالات شامل ہیں۔ پہلا مقالہ ڈاکٹر جہاں گیر حسن مصباحی مدیر ماہ نامہ ''خضر راہ'' الہ آباد کا ہے، جو حضرت سلطان المشائخ کی ایک جامع اور دل آویز سوانح ہے۔ اس کے اندر سوانحی تفصیلات کے ساتھ بیانی جمالیات بھی شامل ہے جس کی وجہ سے یہ معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا دلچسپ بھی ہو گیا ہے۔

مولانا ضیاء الرحمن علیمی کے اس کالم میں دو مقالات شامل ہیں۔ ایک ''سلطان المشائخ اور عربی زبان و ادب'' کے عنوان سے ہے، جو راقم کی معلومات کی حد تک اپنی نوعیت کا پہلا کام ہے۔ اس مقالے کو بجا طور پر سلطان المشائخ کے باب میں لکھے جانے والے مقالات میں ایک گراں قدر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ زبان وادب پر حضرت کی گرفت کو مولانا نے بڑی تفصیل، تحقیق اور تلاش وجستجو کے بعد پیش کیا ہے، جس پر وہ محبان سلطان المشائخ کی طرف سے بجا طور پر تشکر وتبریک کے مستحق ہیں۔ علاوہ ازیں بعض اہل قلم نے سلطان المشائخ کے حوالے سے ایک غلط معلومات یہ رائج کی کہ علامہ برہان الدین محمود بلخی کو سلطان المشائخ کا براہ راست استاذ بتا دیا۔ مولانا علیمی نے بڑے مضبوط اور مستند دلائل سے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ یہ مقالہ صرف پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کی علمیت نے اس کے لیے اس باب میں شمولیت کا جواز فراہم کر دیا ہے۔

اس کالم بلکہ مجلّے کا بیت القصید محترمی مولانا غلام مصطفیٰ ازہری صاحب کا مقالہ ''سلطان المشائخ بطور محدث وفقیہ'' ہے، جو محدثانہ اور فقیہانہ رنگ وآہنگ کے ساتھ مکمل صوفیانہ معارف کا گنجینہ ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انصاف واعتدال کے ساتھ فقہ وحدیث میں سلطان المشائخ کے مقام ومرتبہ اور منہج کی تفہیم کے لیے اس سے بہتر تحریر اب تک نہیں لکھی گئی ہوگی، اگرچہ علمی دنیا میں اختلاف کی گنجائش ہر سطح پر باقی رہتی ہے۔ اس کے اندر ضمنی طور پر فقہ وحدیث اور تصوف کے شہ سواروں کے بیچ قائم شکررنجی کا ازالہ بھی بہت ہی حکیمانہ انداز سے کیا گیا ہے۔

سنی دار العلوم الہ آباد کے پرنسپل محب گرامی مولانا رفعت رضا نوری نے ''سلطان المشائخ کے خانقاہی نظام'' کا صحیح نقشہ کھینچا ہے، جب کہ جامعہ اشرفیہ کے جواں سال استاذ مفتی محمد رضا قادری نے تاریخ وتذکرہ کی کتابوں کے حوالے سے یہ دکھایا ہے کہ ہندوستان کے بڑے مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کی نظر میں حضرت سلطان المشائخ کا مقام ومرتبہ کیا ہے۔

یہ دونوں مقالات بھی بہت اہم ہیں اور اس بات کے مستحق ہیں کہ اضافات کے بعد انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔

خانقاہ چشتیہ اصدقیہ نالندہ کے ولی عہد اور تحریک پیغام اسلام جمشید پور کے روح رواں خطیب وقلم کار مولانا سید سیف الدین اصدق مجلہ الاحسان کے دیرینہ معاونین ومحبین میں شامل ہیں۔ ''سلطان المشائخ - رحمت الٰہی کا ایک وسیع شامیانہ'' کے زیر عنوان انہوں نے ایک خوب صورت تحریر لکھی ہے، جس سے حضرت سلطان المشائخ کی انسانی اور اخلاقی قدروں کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ تحریر بھی اسی کالم کی زینت ہے جسے اہل علم پسند فرمائیں گے۔

اس کالم کی آخری تحریر مولانا ساجد الرحمن شبر مصباحی استاذ جامعہ عارفیہ کی ہے جنہوں نے برصغیر کی بعض چشتی نظامی خانقاہوں کا تعارف کرایا ہے جہاں سے آج بھی چشتی نظامی فیضان جاری ہے اور اہل ذوق وشوق اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی کا فریضہ انجام پا رہا ہے۔ مولانا نے بڑی عرق ریزی سے مواد جمع کیا ہے اور عمدہ ترتیب دی ہے، جس کے لیے وہ مستحقِ مبارک باد ہیں۔

''ملفوظات'' کا کالم بھی خاصہ وقیع ہے۔ اس میں کل پانچ مقالات شامل ہیں۔ محترم جناب نوشاد عالم چشتی ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں، انہوں نے فوائد الفواد سے حضرت سلطان المشائخ کے گہر ہائے آبدار کا انتخاب کیا ہے اور ساتھ ہی اس پر مختصر تبصرہ بھی فرمایا ہے۔

سید قمر الاسلام صاحب شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں، انہوں نے بھی فوائد الفواد کو ہی موضوع بحث بنایا ہے اور اس سے چند علمی مباحث اپنے تبصرہ وتجزیہ کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

ڈاکٹر شبیب انور علوی کاکوروی شعبۂ فارسی لکھنؤ یونی ورسٹی کے استاذ ہیں، انہوں نے حضرت امیر خسرو کے مرتب کردہ افضل الفوائد (مجموعہ ملفوظات سلطان المشائخ) کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ اسی طرح مولانا حماد رضا مصباحی استاذ جامعہ عارفیہ نے سلطان المشائخ کے مرتب کردہ راحت القلوب (ملفوظات بابا صاحب) کا تعارف کرایا ہے۔ یہ چاروں مقالات علمی اور تعارفی جہت سے خاصے اہم ہیں۔

اس کالم کا آخری مقالہ جواں سال اسکالر مولانا زین العابدین اشرفی کا ہے جو فوائد الفواد اور لطائف اشرفی کے تقابلی مطالعے پر مشتمل ہے۔ یہ مطالعہ اس کالم کا نسبتاً زیادہ عمیق، علمی، تنقیدی، تقابلی اور تجزیاتی صفات کا حامل ہے۔ انہوں نے تصوف کی ان دونوں عظیم کتابوں کے امتیازات، اشتراکات اور اختلافات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ موصوف جامع اشرف کچھوچھہ اور پھر جامعہ عارفیہ سید سراواں کے فارغ التحصیل ہیں اور اس وقت جامعہ از ہر مصر میں زیر تعلیم ہیں۔

''خصوصی تحریر'' کے ذیل میں خصوصی رعایت کے ساتھ راقم السطور کا ضخیم مقالہ شامل ہے۔ خصوصی رعایت اس لیے کہ اس مقالے کا سلطان المشائخ نمبر سے کوئی راست تعلق نہیں ہے۔ ارباب حل وعقد نے اپنی خصوصی عنایتوں سے اسے شامل شمارہ فرمایا ہے، جو دراصل سماع کے حوالے سے لکھی جارہی راقم کی کتاب کا ایک باب ہے، جس میں کتاب وسنت اور عقل وبصیرت کی روشنی میں آلات موسیقی کے تعلق سے جواز وعدم جواز والے دلائل کا نقد وتجزیہ کیا گیا ہے۔ گذشتہ کئی شماروں سے مسئلۂ سماع کی مختلف جہتوں پر راقم کا سلسلہ وار مقالہ جاری ہے۔ امید ہے کہ اس سلسلے کی مزید کڑیاں اسی طرح آتی رہیں گی۔ مولیٰ کریم اسے تکمیل آشنا فرمائے۔

''تأثرات'' کے کالم میں ہمارے دو بزرگوں کے کلمات تبریک وتشجیع شامل ہیں۔ ان میں اول حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی کے جانشین حضرت خواجہ سید محمد نظامی کا پیغام ہے جو ہمارے لیے بارگاہ سلطان المشائخ کی جانب سے سعادت اور قبولیت کی سند ہے، جب کہ دوسری تحریر پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی ڈین فیکلٹی آف آرٹس مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی ہے۔ ادارہ ان کی اس عنایت خاص پر ممنون ہے اور مستقبل میں بھی اس کے لیے امیدوار ہے۔

''مکتوبات'' کے کالم میں بالترتیب جناب احمد جاوید، سید قمر الاسلام، مفتی میرزا شمشاد احمد بیگ، جناب رضی احمد مصباحی، سید عینین علی حق، سید نورین علی حق اور مفتی آفتاب رشک مصباحی اور سید سیف الدین ایاز کے مکاتیب شامل ہیں، جو مجلہ الاحسان اور خانقاہ عارفیہ کے حوالے سے ان کے جذبات وخیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

مجلہ الاحسان کے پہلے شمارے کے ابتدائیہ میں لکھا گیا:

''تصوف کی حمایت ومخالفت میں ماضی میں بھی بہت کچھ لکھا گیا اور آج بھی بہت کچھ لکھا جارہا ہے۔ تصوف کے موضوع پر بعض رسائل وجرائد بھی کبھی نظر سے گزرتے ہیں۔ لیکن ان تمام تحریروں میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہ تمام تحریریں یک طرفہ ہیں۔ یا تو تصوف کی حمایت میں یا مخالفت میں۔ ہر شخص تصوف کی موافقت

یا مخالفت میں صرف اپنی بات کہتا ہے، فریق مخالف کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کہیں کوئی ایسا اسٹیج نظر نہیں آیا جہاں فریقین ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ جب کہ جدید دور ایک علمی دور ہے جس میں کسی بھی مسئلے کے دونوں پہلوؤں کو سامنے لانا علمی دیانت کا تقاضا ہے، تا کہ مسئلے کا ہر پہلو عام قارئین کے سامنے آسکے۔ اس لیے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ تصوف پر کوئی ایسا مجلہ سامنے آئے جس میں تصوف کے موافقین ومخالفین کھل کر مگر شائستگی کے ساتھ اپنی بات کہہ سکیں تا کہ تصوف کے حوالے سے جو غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں، ان کا علمی انداز میں ازالہ ہو، تصوف کے حوالے سے لوگوں کا ذہن صاف ہو اور اس کے بعد عملی تصوف کی راہ کھل سکے۔ زیر نظر مجلہ ''الاحسان'' اسی خیال کا عملی پیکر ہے۔''

اس پیکر تراشی میں مجلہ الاحسان اور اس کے مدیر ومرتبین کہاں تک کامیاب ہوئے، اس کا فیصلہ مجلّے کے اہل علم قارئین کریں گے، تاہم درج ذیل توشیقات سے ہمیں اپنی کوششوں کی نتیجہ خیزی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے:

● **پروفیسر اختر الواسع** (جودھ پور): مجلہ ''الاحسان'' تصوف اسلامی کی علمی، فکری اور نظری مباحث و معلومات سے بہرہ منداور مستفید ہونے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس جریدے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مختلف مسالک کے نمائندہ اہل علم و دانش کی ایسی اچھی تحریریں پڑھنے کو ملی ہیں، جن سے تنوع وتوسع جو کہ صوفیہ کا سب سے بڑا وصف رہا ہے، کا اظہار ہوتا ہے۔ (مجلہ الاحسان، شمارہ-۲)

● **پروفیسر معین نظامی** (لاہور): اتفاق سے مَیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور میں الاحسان کے کچھ شمارے دیکھ چکا تھا، اس کے علمی وتحقیقی معیار سے گہرا متاثر ہوا تھا اور اس کی مجلسِ ادارت وانتظام سے رابطہ کر کے اپنی نیک خواہشات کا اظہار بھی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ مجمع السلوک کی اشاعت کا جان کر یقینی اطمینان ہو گیا کہ یہ کتاب بھی صوری ومعنوی طور پر واقعی شایانِ شان انداز میں شائع ہوئی ہوگی۔ (مجلہ الاحسان، شمارہ-۸)

● **پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی** (علی گڑھ): تصوف وطریقت پر پہلے بھی کئی رسائل وجرائد نکلے اور خوب نکلے مگر وہ شعلہ مستعجل کی مانند جلد ہی منظر عام سے غائب ہو گئے۔ اس تاریک منظر نامہ میں آپ سب نے ''الاحسان'' کی مشعل طریقت جلا کر دلوں کو سرور ونشاط اور آنکھوں کو نور فراہم کر دیا۔ (مجلہ الاحسان، شمارہ-۲)

● **پروفیسر سید علیم اشرف جائسی** (حیدرآباد): الاحسان کے مرتبین ومعاونین سے مجھے کسی قدر شناسائی حاصل ہے۔ یہ تمام افراد نوجوانوں کے جوش وخروش اور بوڑھوں کے حکمت وتدبر سے آراستہ ہیں۔ ان کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ اصالت اور عصریت دونوں کے جامع ہیں اور دعاۃ ومصلحین کا یہی بہترین رخت سفر ہے۔ فکر میں اصالت اور پیش کش میں عصریت کامیابی کی ضمانت ہے۔ فکر کا غیر اصیل ہونا جس قدر نقصان دہ ہے، پیش کش کا غیر عصری ہونا بھی اتنا ہی ضرر رساں ہے۔ بلاشبہ مجلہ الاحسان موضوع اور ہدف کی اصالت اور تقدیم وپیش کش کی عصریت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ''إلى التصوف من جديد'' کی مہم میں یہ مجلہ ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔ (مجلہ الاحسان، شمارہ-۳)

● **پروفیسر الطاف احمد اعظمی** (دہلی): شاہ صفی اکیڈمی الٰہ آباد کے علمی، تحقیقی ودعوتی مجلہ ''الاحسان'' کے دوشمارے (مارچ ۲۰۱۳ءوفروری ۲۰۱۴ء) موصول ہوئے۔ اس عنایت کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ آپ اور آپ کے رفقا تبریک وتہنیت کے مستحق ہیں کہ اس دورِ کم سواد میں تصوف پر اتنا عمدہ مجلہ کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اس مجلّے کی جس خوبی نے راقم الحروف کو متأثر کیا وہ اس کے سرپرست اور مدیر دونوں کی وسیع النظری اور علمی فراخ دلی ہے جو اس تعصب گزیدہ عہد کے بہت سے اہل علم بالخصوص علما اور صوفیہ کے یہاں تقریباً مفقود ہے۔ یہ خوبی کسی فرد میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اس میں حقیقی معنی میں علم کی بو باس ہو اور اس کا آئینۂ قلب مسلکی کثافت سے آلودہ نہ ہو۔ آفریں باد بریں ہمت مردانۂ تو۔ (مجلہ الاحسان، شمارہ-۶)

● **پروفیسر کنور محمد یوسف امین** (علی گڑھ): 'الاحسان' کی سب سے بڑی خوبی، جو دیگر کسی تحقیقی اسلامی جریدے میں نظر نہیں آتی، وہ ہر تحقیقی عنوان یا سوال کو اسلام کی غائی (Ultimate) حقیقت یعنی 'ابدیت' کے حوالے سے دیکھنا ہے۔ چونکہ اُمّتِ مسلمہ کے اہل علم اور اہل دل کے سواد اعظم کا عمل اسی 'ابدیت' پر مرکوز ہے، اس لیے 'الاحسان' دیگر اسلامی جرائد کے علی الرغم مسلمانوں کی تاریخ اور روایت سے پوری طرح میل کھاتا ہے۔ (مجلہ الاحسان، شمارہ-۹)

● **پروفیسر فاروق احمد صدیقی** (مظفر پور): خالص تصوف کے موضوع پر مجلہ ''الاحسان'' الہ آباد بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے علم واطلاع کے مطابق اردو میں پہلی مرتبہ اتنا ضخیم اور وقیع مجلہ اشاعت پذیر ہوا ہے۔ (مجلہ الاحسان، شمارہ-۵)

● **ڈاکٹر عارف نوشاہی** (اسلام آباد): راقم السطور کا مجموعی تاثر اس کی پیشانی پر تحریری اعلان ''تصوف پر علمی، تحقیقی ودعوتی مجلہ'' کی تائید وتوثیق ہے اور یہ نشریہ اس وقت برصغیر میں اپنے موضوع پر شائع ہونے والے دیگر رسائل کے درمیان اپنے اعتدال اور میانہ روی کی وجہ سے خاص امتیاز رکھتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی کی ہدایت اور اپنے رفقا کی مدد اور لکھنے والوں کی ہمکاری سے اس نشریے کو نہ صرف جاری رکھیں بلکہ اس کا معیار بلند تر ہو۔ آمین! (مجلہ الاحسان، شمارہ-۹)

● **مولانا مبارک حسین مصباحی** (مبارک پور): الاحسان عصر حاضر کے جدید اسلوب میں واقعی، ایک علمی، تحقیقی اور دعوتی مجلہ ہے- سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ اس عہد تخصص میں مجلہ کا خاص موضوع تصوف ہے، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ کم از کم ہندوستان میں اپنی نوعیت کا یہ منفرد کتابی سلسلہ ہے جسے عرفانی ماحول میں فکر وادب کی تیز روشنی میں سلیقہ شعاروں نے مرتب کیا ہے- (مجلہ الاحسان، شمارہ-۲)

● **احمد جاوید** (پٹنہ): 'الاحسان' کا نواں شمارہ پیش نظر ہے اور سلطان المشائخ نمبر آپ کا دسواں شمارہ ہوگا، تلك عشرة كاملة! کیسا حسین اور کتنا مبارک اہتمام ہے۔ شاہ صفی اکیڈمی کی گراں قدر اشاعتوں کا وصف خاص اس کا یکساں صوری ومعنوی معیار ہے۔ مجلہ کا ہر شمارہ اپنے ماسبق سے زیادہ پرکشش ہوتا ہے۔ آپ حضرات اس میدان میں وہ ہیں جن کا مقابلہ کسی اور سے نہیں، آپ ہر بار اپنے آپ ہی پر سبقت لے جاتے ہیں۔ (مجلہ الاحسان، شمارہ-۱۰)

معاصر اخبارات و رسائل کے حسب ذیل تبصرے بھی الاحسان کے اس کاروان علم وعرفان کی اہمیت و افادیت کی مستحکم شہادت ہیں:

● اردو بک ریویو، نئی دہلی (اپریل، مئی، جون ۲۰۱۲ء)/تبصرہ نگار: عارف اقبال

تصوف پر علمی، تحقیقی ودعوتی مکالمہ کے لیے مستقبل میں یہ مجلہ اردو دنیا کے حوالے سے امتی سطح پر عالمی پلیٹ فارم بن سکتا ہے، بشرطے کہ اس کے اداراتی امور سے وابستہ حضرات وسیع القلبی اور وسیع النظری کے ساتھ ہر طرح کی آرا کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اردو دنیا میں اس نوعیت کا منفرد مجلہ فی الحال دوسرا نظر نہیں آتا۔

● روزنامہ انقلاب (۸/اپریل ۲۰۱۲ء)/تبصرہ نگار: سید عینین علی حق

عرصۂ دراز سے تصوف، شریعت، طریقت جیسے اہم موضوعات پر مشتمل رسائل اور مجلوں کا فقدان نظر آرہا ہے مگر اس خلا کو پر کرنے اور ان موضوعات پر اعلیٰ معیار کے مضامین پیش کرنے کا کام خانقاہ عارفیہ نے الاحسان کے ذریعے انجام دیا۔

● روزنامہ راشٹریہ سہارا (۲۹/اپریل ۲۰۱۲ء)/تبصرہ نگار: ڈاکٹر منور حسن کمال

تصوف پر علمی اور تحقیقی کتابیں اردو دنیا سے ناپیدسی ہوتی جارہی تھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تصوف پر کتابیں بالکل ہی نہیں آتیں، لیکن ان کی تعداد کسی فیصد میں شمار نہیں ہوسکتی۔ اس کمی کو شاہ احسان اللہ محمدی صفوی نے بڑی حد تک دور کرنے کی کوشش کی ہے، جن کی سرپرستی میں تصوف پر علمی، تحقیقی ودعوتی مجلہ 'الاحسان' شائع ہورہا ہے۔

● روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی (۲۳ مئی ۲۰۱۴ء)/تبصرہ نگار: وصیل احمد خان

الاحسان کا اجرا ایسے دور میں بارش کی اس ٹھنڈی اور فرحت بخش پھوار کی مانند ہے جو شدید گرمی اور جھلستے ہوئے ایام میں راحت وسکون کا پیغام لاتی ہے۔

● ماہ نامہ جام نور، دہلی (اپریل ۲۰۱۳ء)/تبصرہ نگار: ساجد سعیدی

تصوف میں درآئے ان تمام خرافات کا نہایت علمی طریقے سے اخراج ضروری ٹھہرا جو تصوف کی روشن پیشانی پر سیاہ داغ بنے ہوئے ہیں۔ زیر تبصرہ مجلہ الاحسان تصوف کے حوالے سے دیگر تحقیق وتنقید اور دنیا کے سامنے تصوف کی اصل شبیہ پیش کرنے ساتھ اس کار سعید کی بھی ایک مسعود ومبارک کوشش ہے، جس کا آغاز آج سے چار سال قبل ۲۰۱۰ء میں ہوا۔

● ماہ نامہ اشرفیہ، مبارک پور (اکتوبر ۲۰۱۴ء)/تبصرہ نگار: طفیل احمد مصباحی

تصوف ایک کتاب دل ہے، جس کی بے شمار تفسیریں اور شرحیں لکھی جاچکی ہیں اور ان شاء اللہ قیامت تک لکھی جاتی رہیں گی۔ زیر نظر کتاب الاحسان پانچواں شمارہ اسی سلسلۂ خیر وبرکت کی ایک مضبوط اور مستحکم کڑی ہے۔ میری ناقص رائے کے مطابق اکیسویں صدی کے ہندوستان میں تصوف کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک جن خانقاہوں سے اٹھی ہے، ان میں خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد، یوپی سرفہرست ہے۔

● ماہ نامہ کنزالایمان (مارچ ۲۰۱۵ء)/تبصرہ نگار: ظفرالدین برکاتی

اسلامی اور غیر اسلامی تصوف میں فرق و امتیاز کی عملی وضاحت اور تصوف کے نام پر غیر اسلامی خیالات کی تنقیح ونشان دہی اس کے مقاصد کا حصہ ہے اور پھر صحیح تصوف اور صحت مند صوفی ادب کی ترویج و اشاعت بھی اس کی دعوتی، علمی، فکری اور تعمیری شاہراہوں کا نمایاں سنگ میل ہے۔

● ماہ نامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی (جولائی ۲۰۱۳ء)/تبصرہ نگار: توفیق احسن مصباحی

خوشی کی بات یہ ہے کہ اس جریدے کو ملک کے مقتدر ارباب قلم کا تعاون حاصل ہے اور مکتوبات کا کالم بتا رہا ہے کہ یہ کتابی سلسلہ ہر طرح کی شخصیات کے مطالعے کی میز تک پہنچ رہا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے جو اس رسالے کو امتیاز دے رہی ہے۔

● ماہ نامہ ماہ نور، دہلی (جولائی ۲۰۱۲ء)/تبصرہ نگار: نورین علی حق

'الاحسان' کا ہر شمارہ پچھلے شمارے سے زیادہ بہتر، محقق، پر اثر ہوتا جا رہا ہے اور اس کا حلقہ بھی روز افزوں ہے۔ آثار یہ بتاتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں مذہبی انقلاب جو آئے گا اس میں 'الاحسان' اور 'خانقاہ عارفیہ الہ آباد کا بڑا اہم کردار ہوگا۔

● ہماری ویب ڈاٹ کام (۲۲ نومبر ۲۰۱۲ء)/تبصرہ نگار: ڈاکٹر مشاہد حسین رضوی

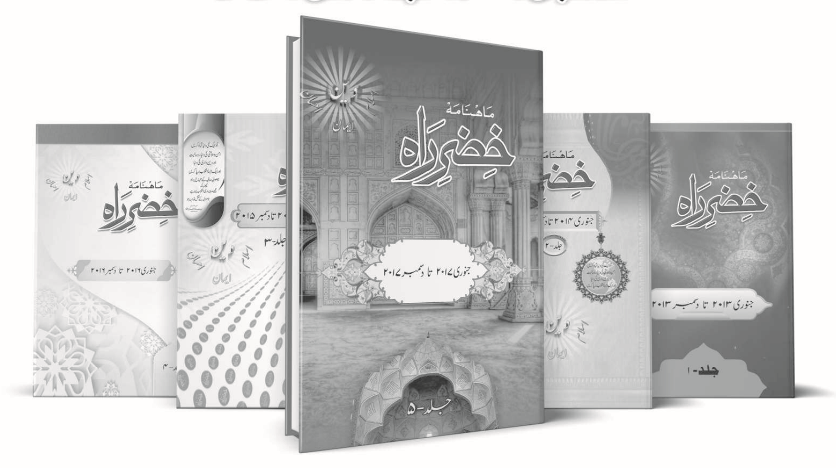
''الاحسان'' کے وسیلے سے مادہ پرستی کے اس دور میں روحانیت وتصوف کا علمی وتحقیقی اور دعوتی نہج پر جو پاکیزہ کام آپ حضرات نے شروع کیا ہے وہ یقینا قابل تقلید بھی ہے اور تحسین بھی۔

آخر میں روایت اور حقیقت دونوں کی رعایت کرتے ہوئے ساقی مے خانۂ الاحسان عارف ربانی آیت رحمانی حضرت داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ النورانی کا تشکر و امتنان واجب ہے جن کے دم قدم سے یہ ساری بہاریں قائم ہیں۔ مولیٰ کریم انہیں عمر خضر عطا فرمائے اور ان کے جلو میں ہم سب کو جانب منزل رواں دواں رکھے۔

جیسا کہ صاحب زادۂ گرامی حضرت مولانا حسن سعید صفوی دام فضلہ نے عندیہ ظاہر کیا ہے کہ اگلا شمارہ گیارہواں ہوگا اور گیارہویں کی مناسبت سے قطب ربانی فیض سبحانی سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ روحہ کی شخصیت، افکار اور خدمات کے نام منسوب ہوگا، تاکہ محبوب الٰہی اور محبوب سبحانی کے فیوض و برکات سے یہ رسالہ اَحَدَ عَشَرَ کَوْ کَباً کا عکس جمیل بن سکے۔ اہل قلم اپنے خیالات، تاثرات، تنقیدات اور نگارشات سے ادارہ کو سرفراز فرمائیں۔ اللہ بس باقی ہوس!!

○○○

اردو زبان کا محبوب و مقبول رسالہ



خصوصیات

- آسان زبان میں اسلامی افکار و خیالات کا انمول خزانہ
- گھر کے ہر فرد کی فکری اور روحانی تسکین کا سامان
- سفر و حضر کا بہترین ساتھی

شاہ صفی اکیڈمی کی ایک منفرد پیش کش

اردو زبان کا محبوب و مقبول ماہنامہ ”خضرِ راہ“ تقریباً ایک دہائی سے مسلسل علمی و اصلاحی نگارشات سے قارئین کو محظوظ کر رہا ہے۔ قارئین کی افادیت کے پیشِ نظر سال کے اختتام پر تمام شماروں کا ایک خوبصورت مجلد تیار کیا جاتا ہے۔

مجلد حاصل کرنے کے لیے رابطہ کریں۔

+91-9312922953 / +91-9935791673

بادہ و ساغر

حضرت امیر خسرو قدّس سرّہ

ترجمہ: خواجہ حسن ثانی نظامیؒ

نظامِ سلکِ فرید

اے شربتِ عاشقی بہ جامت	وز دوست زمان زمان پیامت
سودازدگانِ شوقِ حق را	تسکین ز مفرحِ کلامت
درگاہِ تو قبلہ و ملائک	پرّان چو کبوتران بہ بامت
شد سلکِ فرید از تو منظوم	زانست کہ شد لقب نظامت
جاوید بقاست بندہ خسروؔ	چون شد زِ ہزار جان غلامت

۱-اے پریم رس کے پیالے والے! تیرے لیے پل پل محبوب کے سندیسے!

۲-شوق حق کے سودائیوں کو تیری امرت بانی سے تسکین!

۳-تیری درگاہ قبلہ! تیری اٹاری پر فرشتوں کی کبوتروں سمان اڑان!

۴-تجھ ہی سے ''سلک فرید'' منظوم ہوئی (بابا فرید کا روحانی سلسلہ قائم ہوا) ایک دانہ موتیوں کی لڑی کو تو نے ہی پرویا اور یوں ''نظام'' یعنی پرونے، جوڑنے اور مرتب کرنے والا کہلایا!

۵-بندہ خسرو، ہزار جان سے تیرا غلام بنا تو امر ہو گیا۔ اسے سدا سدا کی زندگی مل گئی!

○○○

حضرت امیر خسرو قدّس سرّہ

انتخاب و ترجمہ: پروفیسر معین نظامی، لاہور

مدحِ حضرت سلطان المشائخ

انتخابِ قصائد و مثنویاتِ حضرت امیر خسرو

[ا]

مَباش خفتہ چو طفلان بہ گاہوارۂ تن

کہ آفتابِ قیامت در آمد از روزن

جسم کے پنگھوڑے میں بچوں کی طرح سوئے نہ رہو کیوں کہ روزن سے قیامت کا سورج نکل آیا ہے [خوابِ غفلت میں پڑے رہنے کا وقت باقی نہیں رہا ہے۔]

ازین نشیمن اگر مرغ زیرکی، بر پر

کہ آشیانِ غرور است و دام گاہِ محِن

اگر تم سمجھ دار پرندے ہو تو اس نشیمن سے اڑ نکلو کہ یہ تو فریب کا آشیانہ ہے اور ایسی جگہ ہے جہاں رنج و الم کے جال بچھے ہوئے ہیں۔

رونده از نظرِ رہنما رسد بہ مقام

نہ از سجادہ و زنبیل و خرقہ و سوزن

سالک اپنے راہنما کے فیضِ نظر سے منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے، سجّادے، زنبیل، خرقے اور سوئی کے بل بوتے پر نہیں۔

اگر نہ لعل ز تاثیر آفتاب بود

ہزار سنگ توان لعل کردن از روغن

لعل تو سورج ہی کی تاثیر سے بنتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو تیل سے چمکا دمکا کر ہزاروں پتھروں کو لعل بنایا جا سکتا ہے۔

ز دیدہ آب زنم خاکِ آستانۂ او
مگر بہ چشمِ عنایت نظر کند بر من

میں ان کے آستانے کی مٹی پر آنکھوں کا پانی چھڑکتا ہوں، شاید وہ مجھ پر عنایت کی نظر ڈال لیں۔

چراغِ ملّت و دین مبین نظام الدّین
کہ شمعِ ملت و دین شد بہ نامِ او روشن

نظام الدین ملت اور دین مبین کا چراغ ہیں، دین وملت کی شمع انھی کے نامِ نامی سے روشن ہوئی ہے۔

وجودِ او شدہ مشکوٰۃِ عشق را گوہر
ضمیرِ او شدہ اسرارِ غیب را مخزن

ان کا وجود عشق کی مشعل کی روح ہے، ان کا ضمیر غیب کے رازوں کا گنجینہ ہے۔

در آن زمان کہ بہ خلوت انیسِ قُرب شود
کہ راست زہرہ کہ تا گرد دُش بہ پیرامن

جس گھڑی وہ خلوت میں قربِ الٰہی کے انیس ومونس ہوتے ہیں ان لمحوں میں کسی میں ہمّت نہیں ہوتی کہ مُخل ہو۔

برای آن کہ ببند د دو دستِ شیطان را
کشید رشتۂ زنّار از گلوی شمن

شیطان کے دونوں ہاتھ باندھ دینے کے لیے انھوں نے بت پرستوں کے گلے سے زُنّار اتار لیا۔

حضورِ خدمت تو یافتن بہ ملکِ جہان
بوَد خریدنِ گوہر بہ دانۂ ارزن

دنیا کی بادشاہی دے کر بھی آپ کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہو جائے تو یہ معاملہ یوں ہے کہ جیسے رائی کے دانے کے بدلے میں موتی خرید لیا جائے۔

ہزار ناوکِ تقدیر رد تواند کرد
کسی کہ حرزِ دعای تو باشدش جوشن

جسے آپ کی حفاظتی دعاؤں کی زرہ میسّر ہو، وہ تقدیر کے ہزاروں تیر خالی پھیر سکتا ہے۔

بزرگوارا، ازین بندہ خسرو این ابیات
قبول کن ز کرم، گرچہ نیست مستحسن

حضورِ والا! اس غلام خسرو کی جانب سے از راہ کرم یہ اشعار قبول فرمایئے، اگر چہ یہ کلام آپ کے شایان شان نہیں ہے۔

اگر چہ بلبلِ نُطقم بہ گلشن عالَم
زِ شاخِ دولتِ تو می پرَم در این گلشن

اگرچہ مَیں دنیا کے چمن میں چہچہاتا ہوا بلبل ہوں، مَیں اس چمن میں آپ ہی کی شاخِ دولت سے اڑتا پھرتا ہوں۔

بہ صید گاہِ عنایت مکن فراموشم
کہ نیم خوردۂ شاہین خورند زاغ و زغن

عنایت کی شکارگاہ میں مجھے فراموش نہ فرمایئے گا، کیوں کہ شاہین کا پس خوردہ کوّے اور چیلیں ہی کھاتے ہیں۔

(تُحفۃُ الصّغر میں سے)

[۲]

باش، تا پردہ براندازد جہان از روی کار
وانچ امشب کردہ ای، فردات گردد آشکار

ذرا صبر کرو، تاکہ دنیا معاملے کے چہرے سے پردہ ہٹادے اور جو کچھ تم نے آج رات کیا ہے، وہ آنے والے کل میں تم پر ظاہر ہوجائے۔

تا فقیران بینی آنجا پایمرد و دستگیر
تا امیران بینی آنجا زرد روی و شرمسار

تاکہ تم وہاں (میدانِ قیامت میں) دیکھ لو کہ فقیر لوگ عزم و ہمّت والے اور دست گیری کرنے والے ہیں اور تم دیکھ لو کہ مال دار لوگوں کے چہرے پیلے پڑے ہوئے ہیں اور وہ شرم سار ہیں۔

خسروا، گر گنج سِرِّ اللہ خواہی در ضمیر
گدیہ کن پیشِ درِ شیخ شیوخِ روزگار

اے خسرو! اگر تم اپنے باطن میں اللہ کی معرفت کا خزانہ چاہتے ہو تو زمانے کے شیخ المشائخ کے آستانہ سے خیرات مانگو۔

غوثِ عہد و قطبِ عصر، اعظم نظام الحق کہ ہست
بادشاہِ فقر و بر مُلکِ ولایت شہریار

زمانے کے غوث، قطبِ دوراں، صاحبِ عظمت نظام الحق جو فقر کے بادشاہ اور ملکِ ولایت کے شہریار ہیں۔

آن محمد نام کز رُتبت رسولِ پاک را
یارِ پنجم شد کہ در ہر جا خدایش باد یار

ان کا اسم گرامی محمد ہے اور ان کا مرتبہ ایسا ہے کہ وہ گویا رسول پاک کے پانچویں ساتھی ہیں، اللہ تعالیٰ ہر مقام پر ان کا حامی وناصر ہو۔

مقتدای مقتدایانِ طریقت ، خواجہ ای
کز ازل مسعود گشت و تا ابد شد بختیار

وہ طریقت کے پیشواؤں کے پیشوا ہیں اور ایسے سردار ہیں جو روزِ ازل سے مسعود ہیں اور ابد تک بختیار رہیں گے۔(۱)

شبلی ای باید حریفِ مجلسش، ہر خام را
کَی سرِ این مستی است وکَی دماغِ این خمار

کوئی شبلی ہی ان کا رفیقِ محفل ہوتو ہو، ہر ناپختہ شخص ایسی سرمستی کا طالب کہاں ہوتا ہے اور ایسا خمار کہاں سہار سکتا ہے۔

بار ندہد بادشاہان را و خاصانِ درش
سینہ ہای چاک چاک و جامہ ہای تارتار

وہ بادشاہوں کو حاضری کی اجازت نہیں بخشتے ، چاک چاک سینے والے درویش اور پھٹے پرانے کپڑوں والے فقیران کے خاص قرب سے سرفراز ہیں۔

خاک روبِ قصرِ او، خاشاکِ دنیا را ہمہ
رُفتہ از جاروبِ لا وز دربرون افگندہ خوار

ان کے آستانے کے خاک روب نے ”لا“ کے جھاڑو سے دنیا کا سارا گردوغبار صاف کر دیا ہے اور اسے حقارت سے دروازے سے باہر ڈال دیا ہے۔

بر امیدِ آن کہ افطار از لقاءُ اللہ کُنَد
در صیام عاشقان از ماسوی اللہ روزہ دار

اللہ کے دیدار سے افطار کرنے کی امید پر انھوں نے عاشقوں کا سا روزہ اختیار کر رکھا ہے جس میں غیر خدا سے مکمل پرہیز ہے۔

---

(۱) لفظ مسعود اور بختیار یہاں اپنے حقیقی معنی کے ساتھ ساتھ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا کی اور حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر کے اسمائے گرامی کی تلمیح اور ان کی صفات سے اتصاف کا کنایہ بھی ہے۔(مدیر)

گفتہ حُوران را طلاقِ بائن و خود کیستند
مشک بویانِ خُتَن ، شَکّر لبانِ قندھار

ان کے ہاں خُتَن اور قندھار کے پری جمالوں کی بھلا کہاں کوئی حیثیت ہوگی، انھوں نے تو حوروں تک کو دائمی طلاق دے رکھی ہے۔

ہر دو عالَم درکنارش داد بخت و او بہ وجد
ساخت زان سان کو فتادش ہر دو عالَم از کنار

قسمت نے دونوں جہان ان کی جھولی میں لا ڈالے مگر انھوں نے وجد کو یوں اپنایا کہ دونوں جہان ان کے دامن سے جھڑ گئے۔

چون کلاہِ تَرک بر فرقِ تو چُست آمد، رواست
گر سر افرازی کنی بر خاصگانِ کردگار

چوں کہ آپ کے سر مبارک پر چار تر کی ٹوپی خوب سجی ہے، اس لیے اب اگر آپ اللہ کے خاص بندوں میں سر بلند ہوں تو بالکل بجا ہے۔

خاندانِ چشتیاں را ہم مُریدی، ہم مُراد
خان و مانِ قُدسیان را ہم مُشیری، ہم مُشار

آپ چشتیوں کے خاندان کے مرید بھی ہیں اور پیرو مرشد بھی، آپ گروہِ ملائک کے مشیر بھی ہیں اور مشار بھی۔

تیغِ محرابی ست محرابِ مصلاّ یت، کز آن
صد ہزار ابلیس را گردن زدی در کارزار

آپ کے مصلّے کی محراب آپ کی خم دار تلوار ہے جس سے آپ نے جہاد بالنّفس میں لاکھوں ابلیسوں کو تہِ تیغ کیا ہے۔

بر درِ قاضئ حاجت، بہرِ تملیکِ بہشت
یک ارادت نامۂ تو بس بوَد روزِ شمار

قیامت کے دن اللہ کی بارگاہ میں حصولِ جنّت کے لیے ایک آپ کی غلامی کی سند ہی کافی ہے۔

ای نظامِ عقدِ حق، خسرو نظامی شد ز تو
پنج گنجش پنج انگشتِ روانِ گنج بار

اے خواجہ نظام! آپ تسبیحِ الٰہی کا دھاگا ہیں، خسرو آپ ہی کی نسبت سے نظامی ہے اور اس کی خزانے لٹاتی پانچ انگلیاں اس کا پنج گنج ہیں۔

مایۂ دیگر ندارم از پیِ فردا مگر

یک نظر گہ گاہی از چشمت ہمان برمن گمار

کل قیامت کے دن کے لیے میرے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے، یہی عرض ہے کہ اپنی چشمِ کرم سے کبھی کبھی مجھ پر بھی ایک نظر ڈال لیا کیجیے۔

بر زبانت چون خطابِ بندہ تُرک اللہ رفت

دستِ تُرک اللہ بگیر و ہم بہ اللہ اش سپار

چوں کہ آپ کی زبان مبارک نے مجھ غلام کو ''تُرک اللہ'' کا لقب عطا کیا ہوا ہے، اس لیے تُرک اللہ کا ہاتھ تھام کر اسے اللہ کے سپرد فرما دیجیے۔

(غرّۃ الکمال میں سے)

[۳]

ہر کہ زِ دل دامن پیران گرفت

گنجِ بقا زین دہِ ویران گرفت

جو کوئی بھی خلوصِ دل سے مشائخ کا دامن تھام لیتا ہے، اسے دنیا کے اس ویران گاؤں سے بقا کا خزانہ مل جاتا ہے۔

این کہ مرا ہست بہ خاطر درون

نقدِ معانی زِ نہایت برون

یہ جو میرے باطن میں معانی و معارف کا بے انتہا سرمایہ ہے

نَے زِ خود این ملکِ ابد یافتم

کز نظرِ مُنعمِ خود یافتم

میں نے یہ یہ ابدی سلطنت از خود حاصل نہیں کی بلکہ یہ میرے مرشد و مربّی کا فیضانِ نظر ہے۔

شیخِ امم، قطبِ حقیقت نظام

خضر و مسیح از دمِ یُحیِی العِظام

امتوں کے شیخ، حقیقت کے قطب خواجہ نظام جو اپنی زندگی بخش سانسوں کی وجہ سے گویا خضر و مسیح زمانہ ہیں۔

چون بہ ہوا بُردہ دو دستِ دعا

گشتہ ہر انگشت کلیدِ سما

جب وہ دعا کے لیے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہیں تو ان کی ہر انگلی آسمان کی کنجی بن جاتی ہے۔

بہرِ دعایش کہ رود بر فراز
در گہ و بی گہ درِ نُہ چرخ باز

جب ان کی دعا اوپر جاتی ہے تو وقت، بے وقت نو آسمانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

ثانی خورشید بہ روی زمین
ثالثِ سعدَین زِ چرخِ برین

وہ روئے زمین پر دوسرے سورج ہیں اور اونچے آسمان کے دو مبارک ستاروں کے ساتھ تیسرا مبارک ستارہ ہیں۔

عین شریعت بہ طریقش در است
شرع اگر عین نباشد، شر است

ان کا طریقۂ سلوک عین شریعت ہے، شرع میں اگر عین نہ ہو تو شر ہی باقی رہتا ہے۔

زیرِ فلک قطبِ زمانہ ہمو است
قطب دو گویند و یگانہ ہمو است

آسمان کے نیچے زمانے کے قطب وہی ہیں، قطب پھر بھی دو کہے جاتے ہیں، وہ ہیں کہ بے مثال اور یگانہ ہیں۔

بر درِ او ہر کہ ارادت نمود
زندۂ جاوید شد، ار مُردہ بود

ان کے آستانے پر جو بھی ارادت بجالایا، وہ مُردہ بھی تھا تو زندۂ جاوید ہو گیا۔

از پیِ گمراہی جان ہا رقیب
و ز پیِ بیماری دل ہا طبیب

وہ گمراہی سے روحوں کی حفاظت فرماتے ہیں اور دلوں کی بیماریوں کے طبیب ہیں۔

مفتخَر از وی بہ غلامی منم
خواجہ نظام است و نظامی منم

مجھے ان کی غلامی کا فخر ہے، آقا خواجہ نظام ہیں اور نظامی مَیں ہوں۔

(مطلع الانوار میں سے)

[۴]

نظام الحق نبی را بازوی راست
کہ چرخِ ازرقش عطفِ مصلاّ ست

خواجہ نظام الحق نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ راست ہیں، نیلا آسمان ان کے لپٹے ہوئے مصلّے کا ایک کونا ہے۔

نگنجیدہ جبین آن یگانہ
درونِ نُہ کلاہِ صوفیانہ

اس بے مثال ہستی کی جبینِ مبارک نو صوفیانہ ٹوپیوں میں بھی نہیں سماتی۔ (ان کے انوار نو آسمانوں میں نہیں سماتے۔)

ز دیوانِ ازل واصل خطابش
ز میراثِ نبی آمد نصابش

انھیں دیوانِ ازل سے واصل کا خطاب ملا ہے اور نبی کریم کے ورثے سے حصّہ نصیب ہوا ہے۔

کراما تش کہ بیش از ممکنات است
بہ معنی توأمانِ معجزات است

ان کی کرامات جو ممکنات کی تعداد سے بڑھ کر ہیں، معنوی طور پر معجزات سے جڑواں تعلّق رکھتی ہیں۔

مُریدانے کہ پیشش دست بستہ
بہ سیلی گردنِ شیطان شکستہ

ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے مریدوں نے تھپڑوں سے شیطان کی گردن توڑی ہے۔

قدم گاہش بہ وہم اندر نیاید
کہ پےَ بر روی دریا بر نیاید

وہم وخیال میں بھی نہیں آسکتا کہ وہ کہاں قدم رکھتے ہیں، سمندر کی سطح پر قدموں کے نشان کہاں ابھرتے ہیں!

نہ تنہا خسرو است از مدح سنجان
کہ مردم تَن بہ تن ، باجان و بُن جان

ان کے مدح خوانوں میں صرف خسرو ہی نہیں ہے بلکہ ساری دنیا دل وجان سے ان کی مدح وستائش کرتی ہے۔

(شیرین وخسرو میں سے)

[۵]

اکنوں قدری دُرِ معانی
ریزم بہ سرِ جنیدِ ثانی

اب مَیں جنیدِ ثانی کے سرِ مبارک پر معانی کے کچھ موتی نچھاور کرتا ہوں۔

قطبِ زمن و پناہِ ایمان
سر حلقۂ جملۂ کریمان

وہ زمانے کے قطب اور ایمان کی پناہ، تمام اہلِ کرم کے سردار۔

در شرع نظامِ دین احمد
یعنی کہ نظامِ دین محمد

شریعت میں دینِ احمد کا نظم و نسق یعنی وہ نظام الدین محمد۔

در حجرۂ فقر بادشاہی
در عالم دل جہان پناہی

وہ فقر کے حجرے میں بادشاہ اور کائناتِ دل میں جہاں پناہ ہیں۔

بر مَہ ز گلیم بُردہ رایت
سلطانِ ممالکِ ولایت

چاند پر اُن کی چٹائی کا جھنڈا گڑا ہے، وہ ولایت کی سلطنتوں کے بادشاہ ہیں۔

شاہنشہِ بی سریرِ و بی تاج
شاہانش بہ خاکِ پای محتاج

وہ بے تخت و تاج شہنشاہ ہیں، بادشاہ ان کی خاکِ پا کے محتاج ہیں۔

در عالم وحدت ایستادہ
بر ہر دو جہان قدم نہادہ

وہ عالمِ وحدت میں ثابت قدم کھڑے ہیں، دونوں جہان ان کے قدموں کے نیچے ہیں۔

بینا ترِ جملہ پاک بینان
بیدار ترین شب نشینان

وہ تمام پاک بیں ہستیوں میں سے زیادہ صاحبِ بصارت و بصیرت ہیں، وہ شب بیدار لوگوں میں سب سے زیادہ بیدار رہنے والے ہیں۔

مَسند ز سپہر بر ترش باد
خسرو چو ستارہ چاکرش باد

ان کی مسند آسمان سے بھی بلند رہے، خسرو بخت و اقبال کے ستارے کی طرح ان کا غلام رہے۔

(مجنون و لیلیٰ میں سے)

[۶]

پناهِ جهان، دین حق را نظام
رهِ قُدس را پیشوای تمام

وہ دنیا کی پناہ اور اللہ کے دین کا انتظام ہیں، پاکیزگی کے راستے کے راہبرِ کامل ہیں۔

جهان زنده از جانِ بیدارِ او
زمین روشن از روز بازارِ او

ان کی روحِ بیدار کی بدولت دنیا زندہ ہے، زمین ان کی شہرت ومقبولیت کے نور سے روشن ہے۔

همه شب ز شب خیزیِ بی ریا
کمند افگن کنگرِ کبریا

وہ رات بھر اپنی بے ریا عبادت سے قصرِ کبریائی پر کمند ڈالتے ہیں۔

زمین و فلک در ولایت حَدَش
ولی گوشۂ بوریا مسندش

زمین اور آسمان ان کی ولایت کی سرحدیں ہیں لیکن ان کی مسند چٹائی کا ایک گوشہ ہے۔

دَم خُلق او چون صبا جان نواز
نوالَش همه وقت مهمان نواز

ان کے حُسنِ اخلاق کی تاثیر خوشگوار ہوا کی طرح روح کو تازگی دیتی ہے، ان کا لطف وکرم ہر وقت مہمان نوازی کرتا ہے۔

زبانش زِ لوحِ سما رانْد حرف
دلش عشق را گنج دانی شگرف

لوحِ محفوظ کی باتیں ان کی زبان مبارک پر ہوتی ہیں، ان کا قلبِ منوّر حیرت انگیز گنجینۂ عشق ہے۔

زِ نظّارۂ رویِ آن آفتاب
همه پاک چشمان دو دیده پُر آب

اس سورج کے چہرے کی زیارت کرنے والے تمام پاک بیں لوگوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں۔

بر او بارِ خَلق ارچه بسیار تر
کسی نیست از وی سَبُک بار تر

اگرچہ ان پر مخلوق کا بوجھ بہت زیادہ ہے لیکن ان سے زیادہ ہلکا پھلکا بھی کوئی نہیں ہے۔

فلک گر بہ عہدش نگردد بہ خیر

فلک را عنان باز پیچد زِ سیر

ان کے زمانے میں اگر آسمان کی گردش خیر و برکت پر مبنی نہیں ہوتی تو وہ اس کی لگام کھینچ کر روک لیا کرتے ہیں۔

جہان زو ہمہ وقت پُر نور باد

زمین را درش بیتِ معمور باد

دنیا ہمیشہ ان کے وجود سے پرنور رہے، زمین کے لیے ان کی درگاہ بیتِ معمور بنی رہے۔

(آئینۂ سکندری میں سے)

[۷]

غوثِ عالَم، نظامِ ملّت و دین

قطبِ ہفت آسمان و ہفت زمین

وہ کائنات کے غوث، دین وملّت کے نظام اور سات آسمانوں اور سات زمینوں کے قطب ہیں۔

رہبرِ پیش بین، محمد نام

زدہ پے بر پےِ محمد گام

وہ بابصیرت راہنما جن کا نامِ نامی محمد ہے، وہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی میں ان کے قدم بہ قدم چلتے ہیں۔

آفتابے ست ز آدمی زادہ

واسمانے ست از زمی زادہ

وہ ایسے سورج ہیں جس نے انسانوں سے جنم لیا ہے، اور ایسا آسمان ہیں جو زمین سے پیدا ہوا ہے۔

سرورانِ سلوک در کُویش

مسح کردہ ز آبِ پا شویش

طریقت کے اکابر ان کے کوچے میں اس پانی سے مسح کرتے ہیں جس میں انھوں نے پاؤں دھوئے ہوتے ہیں۔

چون زِ وجد آمدہ دلش در شور

سمعہ را کردہ کر، زبان را کور

جب ان کا دل وجد کی حالت میں سرمست ہوتا ہے تو سماعت بہری اور بینائی اندھی ہو جاتی ہے۔ [ماورائے حسّ وخبر کیفیت ہوتی ہے]۔

چشمِ مہرش ز پرتوِ جاوید
سنگ را کردہ لعل چون خورشید

ان کی نگاہِ گرم کے دائمی پرتو سے پتھر لعل بن جاتے ہیں جیسے سورج کے پرتو سے۔

درد و درمانش در تہِ فرمان
گنجِ درد و خزینۂ درمان

درد بھی ان کا تابعِ فرمان ہے اور درماں بھی، درد و درماں کا خزینہ ان کے زیرِ نگیں ہے۔

وان مریدانش رہروانِ یقین
ہر یکی والیِ ولایتِ دین

ان کے مریدین یقین کے راستے کے مسافر ہیں، ان میں سے ہر ایک دین کی ولایت کا والی ہے۔

ملکِ وحدت بہ نام ایشان است
بندہ خسرو غلامِ ایشان است

وحدت کا ملک انھی کے نام ہے، ناچیز خسرو انھی کا غلام ہے۔

[ہشت بہشت میں سے]

○○○

حضرت امیر حسن علاسجزی قدّس سرّہ

ترجمہ: حسن نظامی

غلامِ نظامی ایم

تو شاہ و ما اسیرِ کمندِ غلامی ایم — بر یادِ نامِ نیک تو در نیک نامی ایم
تعریفِ تو بہ قاعدۂ خواجگی خوش است — تشریفِ ما ہمیں کہ بہ داغِ غلامی ایم
گفتی چہ حاصل است شما را زِ عافیت — شاہا مپرس ایں لغت از ما کہ عامی ایم
چشمت بہ نیم غمزہ جہانے خراب کرد — آں ترک را بگوے کہ ما اہتمامی ایم
گفتیم پنج بیت بہ یادت چو پنج گنج — ما خود حسن نہ ایم، غلامِ نظامی ایم

(۱) آپ بادشاہ ہیں اور ہم آپ کی غلامی کی ڈور میں بندھے ہوئے ہیں، آپ کے نام مبارک کو خاطر نشیں رکھ کر ہم نیک ناموں میں شمار ہوتے ہیں۔

(۲) خواجگی کے اصول کے مطابق آپ کی مدح سرائی کرنا ہی شایان شان ہے، ہم پر آپ کی غلامی کا ٹھپہ، ہمارے لیے باعث شرف ہے۔

(۳) آپ نے دریافت فرمایا کہ تم عافیت سے ہو؟ حضور! ہم عامی (جاہل) ہیں، ہمیں تو عافیت کی لغت بھی نہیں معلوم!

(۴) آپ کی چشمِ نیم باز نے ایک جہان کو تاراج کر دیا ہے، اس نگاہ ناز سے کہیے کہ ہم بھی (تاراج ہونے کو) تیار بیٹھے ہیں۔ (ع نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں!)

(۵) آپ کی یاد میں ہم نے پانچ شعر مثل پنج گنج (پانچ خزانے) کہے ہیں؛ حسن! اب ہم حسن نہیں (صرف اور صرف) خواجہ نظام کے غلام ہیں۔

○○○

احمد جاوید (لاہور)

نظام الدین محبوب الٰہی

کھلی اپنی حقیقت جب کماہی — ملی قطرے کو بھی دریا پناہی
ہوا جب ذرّگی سے پاک ذرّہ — عطا اس کو ہوئی خورشید جاہی
نسیمِ غیب نے آ کر چمن میں — بہارِ سرمدی پر دی گواہی
شگفتِ گل ہے جیسے کشفِ اسرار — دمیدِ صبح وقتِ خوش نگاہی
مجلّا سبزہ و شمشاد و سنبل — ہوئی صیقل یہ خاکِ زرد و کاہی
ہیں زیرِ تربیت یہ ماہ و خورشید — مربی ہے وہ نورِ لا تناہی
مصفا ہو گیا گلزار سارا — مزکی ہے ہوائے صبحگاہی
ہوئی ہر غنچے کی دستاربندی — چمن میں بھی ہے رسمِ خانقاہی
یہ گلشن بھی ہے گویا گلشنِ چشت — خزاں کی ہے یہاں مطلق مناہی
یہاں تعلیم کرتی ہیں بہاریں — گلوں کو سرخ روئی، کج کلاہی
اُدھر قلبِ چمن میں سایہ گستر — سماوی شان کا اک چترِ شاہی
اور اس کے سائے میں اک خیمۂ سبز — اور اس خیمے میں ماہِ نیم ماہی
ہے اس کا نور جیسے پرتوِ غیب — نہ غافل رہ گیا کوئی نہ ساہی
بنا ہے عالمِ ارواحِ قدسی — جو اب تک تھا جہانِ مرغ و ماہی
چراغِ حجرۂ دل اور یہ رات — شہودی روشنی، غیبی سیاہی
ہر اک طائر یہاں سیّار الی اللہ — ہر اک روضہ ہے جنت دستگاہی
صبا کرتی ہے یاں رفعِ حجابات — فضائے اطلسی ہے انتباہی
سنوگے نفس کے اندر نہ باہر — کوئی لہو و فضول و لغو و واہی

کشش ماہِ انابت کی ہے ایسی فلک کو چھو رہا ہے نخلِ آہی
ہے جس پانی سے باغِ جاں نمو یاب وہ نہری ہے نہ دریائی نہ چاہی
یہاں کثرت نہیں جائے خصومت ہے خار و گل میں ربطِ خیر خواہی
تمامی روئے گیتی پر سے یک لخت ہوئی ناپید بے آب و گیاہی
عدالت سے جمالِ غیب رو کی ہوئی ثابت نگہ کی بے گناہی
ہے ذرّہ ذرّہ ایسا خضر ساماں کہ منزل یاب ہے گم کردہ راہی
یہاں ہے نفس اطمینان حامل ہوئے معدوم اسبابِ تباہی
مدارِ زندگی ہے امرِ آمر حصارِ بندگی ہے نہیِ ناہی
یہ منظر مجملاً آنکھوں نے دیکھا دلِ بے تاب نے تفصیل چاہی
کوئی تو باغباں ہوگا یہاں کا بھلا کس کا ہے یہ دیوانِ شاہی
ندا آمد زِ بالا با ادب باش بگوشِ دل شنو اے مردِ واہی

یہ باغِ عشق ہے اور اس کا ناظم
نظام الدین محبوبِ الٰہی

○○○

پروفیسر معین نظامی (لاہور)

ارمغانِ دہلی

بارگاہِ حضرت سلطان المشائخ میں

(۱)

کس منہ سے کریں بیانِ دہلی   آتی نہیں جب زبانِ دہلی
لاہور میں بیٹھ کر لکھیں گے   کس طرح سے داستانِ دہلی
لگتے ہیں ہمیشہ ہم تو خود کو   لاہور میں میہمانِ دہلی
ہم اپنے وطن میں اجنبی ہیں   یاد آتا ہے آشیانِ دہلی
دلّی کا بنا ہے دل یقیناً   سینے میں ہے ترجمانِ دہلی
خسرو کے سخن سے بھیک لیجے   خسرو، وہ رموز دانِ دہلی
خسرو کی نظر سے دیکھ لیجے   کیسے تھے وہ گُل رخانِ دہلی
''پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ''   کس آن کے تھے بُتانِ دہلی
کچھ میر حسن سے پوچھ لیجے   کیسے تھے وہ مہ وشانِ دہلی
غالب کی نوا سے فیض پائیں   تب ہم بھی لکھیں فغانِ دہلی
کم تر زِ بہار بھی نہیں ہے   اے دیدہ ورو! خزانِ دہلی

(۲)

قربان ترے نصیب کے مَیں　　اے مطلعِ آسمانِ دہلی
ہر ذرّہ ترا ہے رشکِ انجم　　اے مقطعِ خاک دانِ دہلی
دہلی ہے ولایتِ معلّی　　اور اس میں ہے شہ جہانِ دہلی
وہ والیِ کشورِ حقائق　　وہ مُہرِ خطِ امانِ دہلی
ہے ان کے کرم کے زیرِ سایہ　　سلطان ہیں پاسبانِ دہلی
دہلی کہ ہے جانِ مُلکِ معنیٰ　　اور خواجہ نظام جانِ دہلی
وہ مرکزِ علم و معرفت ہیں　　وہ محورِ خواجگانِ دہلی
وہ مظہرِ حسنِ لم یزل ہیں　　وہ شاہدِ کاملانِ دہلی
وہ جوہرِ درد، روحِ رقّت　　وہ دلبرِ دلبرانِ دہلی
محبوبِ دوامِ الٰہی　　سرُ حلقہء عاشقانِ دہلی
مقبولِ قُلوبِ دو جہاں ہیں　　وہ نازشِ عارفانِ دہلی

(۳)

برسوں سے مَیں دیکھتا رہا ہوں　　جاتا ہوُا کاروانِ دہلی
سرمستیِ خاص کے جلو میں　　جاتے ہوئے رہروانِ دہلی
محروم ہوں حاضری سے اب تک　　دیکھا نہیں بوستانِ دہلی
خوابوں میں تو بارہا گیا ہوں　　چوما ہے وہ آستانِ دہلی
ظاہر کی نظر سے بھی خدایا　　دیکھوں مَیں وہ کہکشانِ دہلی
اس خواہشِ بےریا کی دُھن میں　　ہوں آج شکر فشانِ دہلی
نازاں ہوں مُعین آج خود پر　　خوش بخت ہے مدح خوانِ دہلی
درگاہ کی نذر کر رہا ہوں　　یہ شعر ہیں ارمغانِ دہلی
اللہ کرے کہ حشر میں بھی　　ماتھے پہ رہے نشانِ دہلی
رگ رگ میں سماع ہو وہاں کا　　خرقے پہ ہو زعفرانِ دہلی

○○○

ڈاکٹر سید شمیم احمد گوہر (الہ آباد)

اک نظر نظام الدین!

ہے بزم اہل صفا کا گہر نظام الدین
رہوں میں شیدا ترا عمر بھر نظام الدین

ہیں زیر پا سبھی لعل و گہر نظام الدین
مگر ترا وہی مٹی کا گھر نظام الدین

طفیلِ عشقِ رسالت مآب ہر لمحہ
ہے ظلِ رحمتِ شہ قبر پر نظام الدین

خدا نے رتبۂ اعلیٰ عطا کیا ہے تجھے
کہاں کہاں نہیں تیری نظر نظام الدین

وظیفہ پڑھتا ہے نور و ضیا ترے در کا
شب سیاہ بھی جیسے سحر نظام الدین

تو آشنائے رموز شعاع حق و صفا
عروج عشق سے تو با خبر نظام الدین

متاع ذکر الٰہی چمکتی رہتی ہے
ہے مثل شمس و قمر تیرا در نظام الدین

تمام عمر رہ عشق مصطفی میں کٹی
تیرا مقام بہت بالاتر نظام الدین

بقائے دین کی خاطر برائے حب رسول
بہایا تو نے ہے خون جگر نظام الدین

ہیں آستانے پہ فریاد و التجا والے
یہ چاہتے ہیں تری اک نظر نظام الدین

ترے بھکاری ہیں اصحاب مال وزر سارے
جھکائے سامنے شاہوں نے سر نظام الدین

اسیر ہے تری عظمت کا گوہر بیکس
میں ہوں زمیں پہ آسمان پر نظام الدین

○○○

بادۂ کہنہ

تحریر: علامہ فخر الدین زرادی
تحقیق وترجمہ: محمد ذکی

رسالہ اصول السماع: تحقیق، تخریج، ترجمہ

تعارف

اسلامی تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان مختلف ادوار میں مختلف طبقات اور گروہ رونما ہوتے رہے ہیں۔ان تمام گروہوں کی دلچسپیاں اور رجحانات الگ الگ تھے۔ چنانچہ کسی نے فقہ وافتا کے میدان میں قدم رکھا تو کسی نے کتاب وسنت کی خدمت میں پوری زندگی صرف کردی۔ کسی گروہ نے ادب وقواعد کی زلف برہم کوسنوارا تو کسی نے فلسفہ وکلام کی محفلوں کو آباد کیا۔ان تمام گروہوں کے درمیان ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا جس نے اپنے اور اپنے متعلقین کے ظاہر وباطن کی اصلاح کو اپنا نصب العین بنایا اور اپنی پوری زندگی عشق الٰہی اور ذکر خداوندی کی شمعیں روشن کرتے ہوئے گذاردی۔اسی پاک گروہ کو صوفیہ کہا جاتا ہے۔

صوفیہ کے یہاں عشق الٰہی کو ایک غیر معمولی مقام حاصل ہے۔انہوں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ جب تک دل آتش عشق سے فروزاں نہ ہوگا، تجلیات الٰہی اور مشاہدات ربانی سے محروم رہے گا۔ چناں چہ صوفیہ اپنے دلوں کو عشق الٰہی سے معمور رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہے ہیں۔

تدبر قرآن کا شوق ہو یا فہم سنت کا ذوق، ذکر کے حلقے ہوں یا پھر تذکیر کی مجالس، صوفیہ نے ہر ممکن طریقے سے ''والذین آمنوا أشد حبا لله'' پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی ہے۔مختلف اوقات میں منعقد کی جانے والی سماع کی محفلیں ان کی انہی کوششوں کا تسلسل ہیں۔صوفیہ نے جب محسوس کیا کہ جس نیک مقصد کے حصول کی خاطر وہ شب وروز ریاضت اور مجاہدے کرتے رہتے ہیں، وہ نیک مقصد انہیں محافل سماع سے بھی حاصل ہوسکتا ہے تو انہوں نے باضابطہ طور پر اپنی خانقاہوں میں اس کا آغاز کردیا۔بعض مشائخ نے مزامیر کے بغیر سماع سنا تو بعض نے مزامیر کے ساتھ سماع سننے کو ترجیح دی جس پر بہت سے اہل علم کو اعتراض ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موافقین ومخالفین کی طرف سے ایک اچھا خاصہ لٹریچر محض اس ایک مسئلہ پر وجود میں آگیا۔

چشتی بزرگوں کے یہاں عموما سماع کی روایت جاری رہی ہے۔تذکرہ نگاروں کے مطابق تو بعض چشتی بزرگوں کا انتقال تک حالت سماع میں ہوا ہے۔نتیجہ کے طور پر سماع کے باب میں ان کی مخالفت بھی کافی زور وشور کے ساتھ کی گئی۔نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت نظام الدین اولیا جیسی جلیل القدر ہستی کو اپنے موقف کے اثبات کی خاطر بادشاہ وقت کے دربار میں جانا پڑا۔یہی وہ حالات تھے جن کے تناظر میں حضرت نظام الدین اولیا کے ممتاز مرید وخلیفہ حضرت علامہ فخر الدین زرادی نے مسئلہ سماع پر ایک مستقل رسالہ عربی زبان میں تصنیف کیا۔

علامہ زرادی کے اس رسالے پر اب تک باضابطگی کے ساتھ کام نہیں کیا گیا تھا، چناں چہ نہ تو اس کے مختلف نسخوں کا تقابلی جائزہ لیا گیا تھا اور نہ ہی کسی نے اردو زبان میں اس کا عام فہم سلیس ترجمہ کیا تھا۔الحمد للہ! مجلہ الاحسان کے توسط سے شاہ صفی اکیڈمی کو پہلی دفعہ یہ سعادت حاصل ہو رہی ہے کہ مختلف نسخوں کے تقابلی جائزے کے ساتھ اس رسالے کا نہ صرف یہ کہ عربی متن بلکہ اردو ترجمہ تحقیق وتخریج کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

اصل متن اور ترجمے سے پہلے ذیل میں مصنف کے حالات اور رسالے کے سلسلہ میں چند بنیادی باتیں پیش خدمت ہیں۔

تعارف مصنف

آٹھویں صدی ہجری میں جن شخصیات نے اپنے علم وفضل اور جمال وکمال سے ایک عالم کو روشن کیا ان میں ایک نمایاں نام علامہ فخر الدین زرادی کا بھی ہے۔آپ ایک طرف تقوی و پرہیزگاری میں بلند مقام رکھتے تھے تو دوسری طرف مروجہ علوم وفنون میں آپ کی اعلی علمی استعداد کا زمانہ معترف تھا۔آپ کی پیشانی پر نور معرفت ظاہر تھا جو کوئی آپ کو دیکھتا، جان جاتا کہ آپ واصل بارگاہ الہی ہیں۔آپ کا شمار حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے ممتاز خلفا میں ہوتا ہے۔

تعلیم وتربیت

تذکرہ نگاروں نے آپ کی تعلیم وتربیت کے بارے میں بہت زیادہ معلومات فراہم نہیں کی ہے۔البتہ سیر الاولیاء میں صرف اتنا لکھا ہے کہ آپ دہلی میں مولانا فخر الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کا درس لیا کرتے تھے۔

سلطان المشائخ سے ملاقات وبیعت

حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ جن دنوں وہ دہلی میں مولانا فخر الدین ہانسوی کے پاس زیر تعلیم تھے علامہ فخر الدین زرادی اور امیران بورکش بھی ان کے پاس فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کا درس لیا کرتے تھے۔مولانا ہانسوی کی مجلس میں ان دونوں سے زیادہ کوئی طالب علم ذہین اور بحاث نہ تھا۔لیکن ان دونوں کو سلطان المشائخ سے انشراح نہیں تھا۔چنانچہ جب کبھی حضرت نظام الدین اولیا کا تذکرہ

چھڑتا تو یہ دونوں ان پر طعن وتشنیع کرنے لگتے جس سے حضرت نصیرالدین محمود کو بڑی تکلیف ہوتی۔ وہ جواب میں صرف اتنا کہہ کر خاموش ہوجاتے کہ یہ تمام باتیں تم اسی وقت تک کہتے ہو جب تک تم نے ان کو دیکھا نہیں ہے۔

حضرت نصیرالدین فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے کسی طرح ان دونوں کو حضرت سلطان المشائخ کے پاس جانے کے لیے آمادہ کرلیا۔ جب ہم تینوں سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان دونوں سے فرمایا: کہاں رہتے ہو؟

انہوں نے کہا: دہلی میں۔

پھر آپ نے پوچھا: کہاں تعلیم حاصل کرتے ہو؟

انہوں نے کہا: حضرت مولانا فخرالدین ہانسوی کے پاس۔

آپ نے پھر پوچھا؟ کیا پڑھتے ہو؟

انہوں نے کہا: ہدایہ۔

آپ نے پوچھا: سبق کہاں تک پہنچا؟

اس وقت علامہ فخرالدین زرادی حضرت نصیرالدین محمود کے پاس ذرا پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کچھ آگے آئے اور انہوں نے سبق کے بارے میں پوری تقریر کردی اور سبق پر باقی رہ گئے ایک شبہہ کا بھی ذکر کیا اور حضرت نظام الدین اولیا سے اس کو حل کرنے کی گذارش کی۔

حضرت سلطان المشائخ نے شبہہ کو دور کرنے کے لیے نہایت عالمانہ گفتگو کی۔ آپ کے شگفتہ انداز بیان اور علمی تبحر نے علامہ فخرالدین زرادی کو بے حد متاثر کیا۔ آپ مولانا نصیرالدین کے قریب پہنچے اور کہنے لگے میں حضرت سے ابھی بیعت ہونا چاہتا ہوں۔ مولانا نے سلطان المشائخ سے ان کی خواہش کا اظہار کیا۔ سلطان المشائخ نے فرمایا کہ جب اگلی مرتبہ آؤگے تو بیعت کرلیا جائے گا۔

یہ سن کر علامہ زرادی نے مولانا نصیرالدین محمود سے پھر کہا کہ اگر حضرت نے مجھے ابھی بیعت نہیں کیا تو میں اپنے آپ کو ہلاک کرلوں گا۔ اس کے بعد سلطان المشائخ نے ان کو اور امیران بورکش کو اپنے حلقہ ارادت میں داخل فرمالیا۔ (سیرالاولیاء: ۲۱۷)

عبادت وریاضت

آپ نے بیعت ہونے کے بعد اپنی کاپی کتابیں اپنے دوستوں کے حوالے کردیں اور خود سلوک ومعرفت کے منازل طے کرنے کی غرض سے حضرت سلطان المشائخ کی صحبت میں رہنے لگے۔ حضرت کے ساتھ مقدس مقامات پر جاتے اور ان سے فیوض وبرکات حاصل کرتے۔ کچھ دنوں بعد آپ نے حضرت سلطان المشائخ کے گھر کے سامنے ہی گھر لے لیا جس کی وجہ سے مولانا کے لیے حصول فیض اور بھی آسان ہوگیا۔

صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں: ''آپ مجاہدوں میں سخت کوششیں کرتے تھے اور ابتدا ہی سے اس سعادت کے حاصل کرنے کے لیے نہایت مستحکم تھے۔ کاتب حروف بچپن سے لے کر بالغ ہونے تک اس بزرگ کی خدمت میں بہت رہا اور جب بھی خلوت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے دیکھا کہ آپ قبلہ رو بیٹھے ہوئے سر زانوئے مبارک پر رکھے ہوئے یادِ الٰہی میں مشغول ہیں۔ میں نے بہت دفعہ اس کیفیت کا مشاہدہ کیا ہے۔'' (ایضاً:۴۲۱)

علامہ فخر الدین زرادی پوری زندگی سلطان المشائخ کے آستانے سے وابستہ رہے لیکن جب سلطان المشائخ کی وفات ہوگئی تو آپ کا آرام وقرار رخصت ہوگیا اور آپ جنگلوں اور غاروں میں عبادت الٰہی میں مصروف رہنے لگے تا کہ کوئی آپ پر مطلع نہ ہوسکے۔ صاحب سیر الاولیا نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپ عبادت کی غرض سے بند بسنالہ میں واقع ایک پہاڑ کی غیر آباد مسجد میں یادِ الٰہی کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ چند احباب بھی گئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے اس جگہ کو غیر مناسب پایا تو علامہ کو چھوڑ کر آگئے۔ اس کی خبر جب صاحب سیر الاولیاء کے والد کو ملی تو وہ چند مخلصین کے ساتھ علامہ سے ملنے کے لیے اس مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ آپ عین اس جگہ یادِ الٰہی میں مشغول ہیں جو شیروں اور سانپوں کا مسکن ہے۔ ایسے خوفناک مقام پر آپ آٹھ دن سے بھوکے پیاسے عبادت میں مشغول تھے لیکن آپ کے چہرے پر کسی ضعف کے آثار نہ تھے۔ آپ مجرد روح ہو گئے تھے۔ (ایضاً:۴۲۰)

روحانی ارتقا

علامہ فخر الدین زرادی راہ سلوک کے بڑے تیز رو مسافر تھے۔ آپ اس سلسلہ میں اپنے کئی احباب پر فوقیت رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت نصیر الدین محمود رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو روحانی ترقیاں ہم ایک یا دو ماہ میں حاصل کرتے تھے علامہ ان کو ایک گھڑی میں حاصل کر لیتے تھے۔ (ایضاً:۴۲۱)

تبحر علمی

جب حضرت نظام الدین اولیا اپنے ممتاز مریدین کو خلافت عطا فرمانے لگے تو حضرت اخی سراج کا بھی نمبر آیا۔ آپ اس وقت بہت زیادہ ذی علم نہیں تھے۔ لہٰذا حضرت سلطان المشائخ نے ان کو دیکھ کر فرمایا کہ خلافت حاصل کرنے کے لیے جس قدر علم ہونا چاہیے وہ ان کے پاس نہیں ہے۔ جب یہ بات حضرت علامہ فخر الدین زرادی نے سنی تو آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: ''میں ان کو چھ مہینے میں دانش مند بنا دوں گا''۔ اس کے بعد آپ نے ان کو پڑھانا شروع کیا۔ صاحب سیر الاولیاء لکھتے ہیں کہ علامہ زرادی نے حضرت اخی سراج کے لیے علم صرف میں ایک رسالہ بنام ''عثمانی'' بھی تحریر فرمایا تھا۔ (ایضاً:۴۵۱)

بغداد میں ایک شخص نے خواب دیکھا کہ ایک فرشتہ ایک طبق لے کر آسمان سے نیچے اتر رہا ہے۔ اس شخص نے دریافت کیا کہ اس طبق میں کیا ہے؟ فرشتے نے جواب دیا کہ اس میں علم لدنی ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اس کو

فخر الدین زرادی کے سینے میں ڈال دوں۔اس شخص نے پوچھا کہ یہ فخر الدین کون ہیں؟ فرشتے نے جواب دیا کہ وہ ایک دانش مند ہیں جو حضرت نظام الدین اولیا کے مریدین میں سے ہیں۔اس کے بعد وہ شخص کسی طرح علامہ زرادی سے ملاقات کرنے کے لیے بغداد سے دہلی پہنچ گیا۔اس کے پاس دو کتابیں تھیں۔ایک مجمع البحرین۔ دوسری تصریف مالکی۔اس نے علامہ کو یہ دونوں کتابیں ہدیہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہا کہ تصریف مالکی کے بعض مقامات بہت دشوار ہیں۔اوراس کی کوئی بھی شرح اب تک نہیں لکھی گئی ہے۔علامہ نے وہ دونوں کتابیں اس شخص سے لیں اور رات کو عشا کی نماز کے بعد ایک گھنٹے تک تصریف مالکی کا مطالعہ فرماتے رہے۔کتاب میں جس قدر مشکل مقامات تھے علامہ نے مطالعہ کے دوران ان سب کا حل متن کے نیچے تحریر فرما دیا۔

مجمع البحرین کے شائع ہونے سے پہلے مولانا رکن الدین اندرپتی اس کتاب کو علامہ زرادی کے پاس پڑھا کرتے تھے۔حالاں کہ اس وقت تک ہندوستان میں اس کی کوئی شرح دستیاب نہیں تھی۔اس شخص کو جب ان دونوں باتوں کا علم ہوا تو وہ بہت زیادہ متاثر ہوا اور اس نے کہا کہ ایسی علمی قوت اسی شخص کو حاصل ہوتی ہے جس کا سینہ علم لدنی سے آراستہ ہوتا ہے۔(ایضاً:۴۲۳)

اس کے علاوہ بھی آپ کے تبحر علمی کے کئی واقعات آپ کے تذکرے پر مشتمل کتابوں میں موجود ہیں۔

درس وتدریس

گذشتہ سطور میں یہ بات گذر چکی ہے کہ آپ نے حضرت اخی سراج رحمۃ اللہ علیہ کو باضابطہ طور پر تعلیم سے آراستہ کیا تھا۔اس کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیا کے مکان کے قریب ایک مدرسہ تھا جہاں پر آپ تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔حضرت امیر خورد کرمانی سیر الاولیاء میں لکھتے ہیں:''مولانا فخر الدین زرادی بھی چاشت کی نماز کے بعد مجلس میں تشریف لاتے مولانا رکن الدین اندرپتی کو ہدایہ کا سبق دیا کرتے تھے۔''(ایضا:۴۲۳)

ذوق سماع

علامہ فخر الدین زرادی سماع کے سلسلہ میں نہایت باذوق واقع ہوئے تھے۔آپ جب کبھی سماع سنتے تو آپ پر گریہ وزاری کی کیفیت طاری ہوجاتی۔امیر خورد کرمانی لکھتے ہیں کہ ایک رات محفل سماع منعقد کی گئی۔قوال خوش گو اور خوش الحان تھے۔جب سماع شروع ہوا تو علامہ پر سماع کی کیفیت طاری ہوگئی۔آپ نے اس قدر گریہ وزاری کی کہ آپ کی سانسیں رک گئیں۔جب لوگ مجلس وجد وحال سے اٹھے تو میں نے دیکھا کہ علامہ کی پیشانی زرد ہو چکی تھی اور آپ کی آنکھوں سے آنسو کثرت کے ساتھ بہہ رہے تھے۔(ایضاً:۴۲۶)

تصانیف

سیر الاولیا میں آپ کے ذریعے لکھے گئے تین رسالوں کا ذکر ملتا ہے۔ایک ''رسالہ عثمانی'' جو آپ نے حضرت اخی سراج رحمۃ اللہ علیہ کے لیے علم صرف میں تحریر فرمایا تھا۔بقیہ دو رسالے آپ نے اباحت سماع پر لکھے

ہیں جن میں سے ایک رسالہ یہی ہے جو ہم آپ کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔ جب کہ دوسرے رسالے تک ہمیں رسائی حاصل نہیں ہو پائی۔ حضرت میر خورد کرمانی لکھتے ہیں: ''مولانا فخر الدین کو اجتہاد کا درجہ حاصل تھا اور آپ نے اباحت سماع پر دو رسالے لکھے ہیں۔ اور اباحت کے مقدمات اصول فقہ کے مطابق لکھے ہیں۔ جن سے مولانا کے کمال علم اور تبحر کا اندازہ ہوتا ہے۔ (ایضاً: ۴۲۵)

وفات

علامہ فخر الدین زرادی نے اخیر عمر میں حج کرنے کا قصد کیا اور ممبئی سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ پہنچ گئے جہاں آپ نے مناسک حج ادا کیے۔ بعد ازاں آپ نے بغداد جانے کا ارادہ کیا۔ لہٰذا آپ دوبارہ جہاز میں سوار ہو کر بغداد پہنچ گئے۔ وہاں کے علما سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں اور مختلف علمی موضوعات پر تبادلہ خیال بھی ہوا۔ اس کے بعد آپ واپس ہندوستان آنے کے ارادے سے جہاز میں سوار ہوئے۔ جہاز میں شاہی سامان بہت زیادہ تھا جس کی وجہ سے جہاز وسط سمندر میں غرق ہو گیا اور دوسرے تمام لوگوں کے ساتھ علامہ فخر الدین زرادی بھی سن ۷۲۷ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

رسالہ اصول السماع

مجلہ الاحسان ہر سال شاہ صفی اکیڈمی کی جانب سے تواتر کے ساتھ شائع ہوتا آ رہا ہے۔ اس سال جب الاحسان کی اشاعت کا وقت آیا تو اراکین اکیڈمی نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اس دفعہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا کی شخصیت پر ایک خصوصی نمبر نکالا جائے گا۔ چنانچہ سب سے پہلے اراکین نے موضوعات کا انتخاب کیا اور پھر ان موضوعات کو قلم کاروں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ میرے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ میرے حصہ میں حضرت محبوب الٰہی کے خلیفہ اجل علامہ فخر الدین زرادی کے رسالہ اصول السماع کے ترجمہ و تحقیق کا کام آیا۔ میں نے اسے اپنے لیے باعث سعادت جانا اور پھر اس پر کام کا آغاز کر دیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام رسالے کے متعدد نسخوں کی دریافت کا تھا۔ راقم نے متعدد جگہوں پر رسالے کو تلاش کیا اور بفضلہٖ تعالیٰ تین نسخے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان میں سے دو مطبوعہ نسخے تو مجھے انٹرنیٹ سے حاصل ہو گئے جب کہ تیسرا نسخہ مخطوطہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری سے موصول ہوا۔ میں ذیل میں ان تینوں نسخوں کا اجمالی تعارف پیش کر رہا ہوں۔

پہلا نسخہ

یہ نسخہ مولوی غلام محمد خان صاحب کے اردو ترجمے کے ساتھ جھجر شہر میں واقع مسلم پریس سے سن ۱۳۱۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ تقریباً ایک سو تیس سال پرانا یہ ترجمہ بڑا ہی مبہم اور غیر واضح ہے۔ فنی لحاظ سے بھی یہ ترجمہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔

دوسرا نسخہ

یہ نسخہ مولانا ظہیر الدین کیرانوی کے فارسی ترجمے کے ساتھ مطبع محب ہند دہلی سے ۱۳۰۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ مترجم نے ترجمہ میں تشریحی طرز اختیار کیا ہے چناں چہ ترجمہ کے دوران اگر انہیں کوئی مقام مبہم محسوس ہوتا ہے تو اس کی تشریح بھی کر دیتے ہیں۔

تیسرا نسخہ

تیسرا نسخہ مجھے محب گرامی مولانا سید قمر الاسلام صاحب کے توسط سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری سے مخطوطہ کی شکل میں حاصل ہوا۔ سید صاحب کے اس علمی تعاون کے لیے میں ان کا بے حد مشکور ہوں۔ یہ تیسرا نسخہ بھی مولانا ظہیر الدین کیرانوی ہی کے فارسی ترجمہ کے ساتھ موجود ہے اور صحت عبارت اور خوش خطی کے لحاظ سے پہلے دونوں نسخوں سے کافی زیادہ صاف اور عمدہ ہے۔ اس رسالے کو گل محمد سندی نے ۱۳۰۲ھ میں نقل کیا تھا جب کہ رسالہ کی عربی عبارتوں پر اعراب لگانے کا کام عبدالخالق صدیقی قریشی نے انجام دیا ہے۔

رسالہ کا نام

گذشتہ صفحات میں سیر الاولیا کے حوالے سے یہ بات گذر چکی ہے کہ علامہ فخر الدین زرادی نے مسئلہ سماع پر دو رسالے تصنیف کئے تھے۔ لیکن اس اقتباس میں ان دونوں رسالوں کا نام مذکور نہیں ہے۔ تاہم جب ہم نے سیر الاولیا کے دوسرے صفحات کو کھنگالا تو ایک مقام پر ایک رسالہ کا نام مل گیا۔ صاحب سیر الاولیا نے ذکر کیا ہے کہ بادشاہ کے دربار میں حضرت نظام الدین اولیا کو علما کے ساتھ جو مباحثہ پیش آیا تھا اس کی بعض تفصیلات علامہ فخر الدین زرادی کے رسالے ''**كشف القناع عن وجوه السماع**'' کے اندر مذکور ہیں۔(۱) اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اباحت سماع پر لکھے گئے ان کے ایک رسالے کا نام یہی ہے۔ ہم نے جس رسالے پر کام کیا ہے اس میں کہیں بھی اس مباحثہ کا کوئی ذکر نہیں ہے جس سے آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے سامنے موجود اس رسالے کا نام ''**كشف القناع عن وجوه السماع**'' نہیں ہے۔ اب یہاں پر اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے موجود اس رسالے کا درست نام کیا ہے؟ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ خود مصنف نے رسالے کے مقدمہ میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ انہوں نے اپنے رسالے کا نام ''**اصول السماع**'' رکھا ہے۔ مصنف فرماتے ہیں: ''**وصنفت كتابا موسوما بأصول السماع ورتبته على عشرة أصول**''۔ میں نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام اصول السماع رکھا ہے۔ یہ کتاب دس اصول پر مرتب ہے۔ مصنف کی اس

---

(۱) سیر الاولیاء (ص: ۵۷۷) نام کی تصحیح کے سلسلہ میں ہم نے سیر الاولیا کے ایک قدیم ترین نسخے پر اعتماد کیا ہے جس کی عکسی اشاعت محترم خواجہ حسن ثانی نظامی (م ۲۰۱۵ء) نے ۲۰۱۰ء میں کروائی تھی۔ سیر الاولیاء کے مطبوعہ نسخوں میں اس رسالے کا نام ''**كشف المفتاح عن وجوه السماع**'' مذکور ہے جو تصحیف ہے۔

صراحت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس رسالے کا نام اصول السماع ہی ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں رسالے کے جو تین قدیم نسخے دریافت ہوئے ہیں ان کے سرورق پر بھی رسالے کا نام ''اصول السماع'' ہی مرقوم ہے جس سے ہمارے نزدیک یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ رسالے کا نام ''اصول السماع'' ہی ہے اور بعض اہل علم کا اس رسالے کا نام ''کشف القناع عن اصول السماع'' بتانا تسامح سے خالی نہیں ہے۔

منہج تحقیق

ان تینوں نسخوں کو سامنے رکھ کر میں نے ایک نیا متن تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ چناں چہ تحقیق کے دوران ان تینوں نسخوں میں جہاں کہیں اختلافات یا پھر حذف واضافہ پایا گیا اسے میں نے نیچے حاشیہ میں بیان کر دیا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے میں نے نسخوں کے علامتی نام تجویز کئے۔ مثلاً سب سے پہلا نسخہ جو مسلم پریس جھجر سے طبع شدہ ہے میں نے اس کا نام لفظ مسلم کے سین کی مناسبت سے ''س'' تجویز کیا ہے۔ دوسرا نسخہ جو ''مطبع محب ہند دہلی'' سے شائع ہوا ہے میں نے اس کا نام لفظ ''محب'' کے میم کی مناسب سے ''م'' وضع کیا ہے۔ آخری نسخہ جو مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری سے موصول ہوا اس کا نام میں نے علی گڑھ کے عین کی مناسب سے ''ع'' رکھا ہے۔ چنانچہ جو نیا متن تیار کیا گیا ہے اس کی تیاری کے دوران اختلاف نسخ کی صورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اختلاف محض تبدیلی لفظ کا ہے یا پھر حذف واضافہ کا ہے۔ بصورت اول جس لفظ میں اختلاف ہوتا ہے ہم اس پر حاشیہ نمبر لگاتے ہیں اور پھر حاشیہ میں محض نسخے کا علامتی نام ذکر کر کے اختلاف درج کر دیتے ہیں۔ مثلاً اگر نئے متن میں ''زید'' لکھا ہوا ہے اور نسخہ ''م'' میں اس کے برعکس ''زائد'' لکھا ہے۔ تو ہم متن میں موجود مختلف فیہ لفظ پر حاشیہ نمبر لگا کر حاشیہ میں (م: زائد) لکھ دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ باقی دو نسخوں میں لفظ ''زید'' ہی ہے البتہ نسخہ ''م'' میں یہ لفظ ''زائد'' لکھا ہوا ہے۔ اور اگر اختلاف حذف واضافہ کا ہوتا ہے تو ہم متن میں حاشیہ لگا کر نیچے جس قدر حذف واضافہ ہوتا ہے اس کو صراحت کے ساتھ تحریر کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی رسالے میں جہاں بھی اس بریکٹ [] کا ہم نے استعمال کیا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ بریکٹ کے درمیان کا لفظ ہماری جانب سے اضافہ ہے۔

بعض مقامات پر محض کوئی ایک لفظ یا پھر مکمل عبارت محرف شکل میں پائی گئی۔ اس موقع پر اگر وہ عبارت کسی کتاب سے منقول تھی تو ہم نے اسے اصل کتاب سے نقل کر کے لکھ دیا ہے۔ بصورت دیگر عربی لغت وقواعد کے اعتبار سے ہمیں جو بات صحت کے زیادہ قریب معلوم ہوئی ہم نے اسی کو درج کر دیا اور حاشیہ میں اس کی صراحت کر دی۔ بعض مقامات پر بہت معمولی غلطیاں بھی پائی گئیں جنہیں ہم نے صراحت کے بغیر درست کر دیا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر ''قول ذو النون'' لکھا ہوا تھا۔ ہم نے اسے عربی قواعد کے مطابق ''قول ذی النون'' سے تبدیل کر دیا۔ واضح رہے کہ اگر ہمیں تینوں نسخوں میں پائی گئی کسی غلطی کی اصلاح کرنی ہوتی ہے تو ہم اسے حاشیہ میں ''فی الاصل'' سے تعبیر کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ عبارت ان تینوں نسخوں میں اس طرح تھی۔ البتہ غلط ہونے کی وجہ سے ہم نے اس کی تصحیح کر دی ہے۔

ترجمہ میں ہم نے کوشش کی ہے کہ وہ لفظی ہونے کے بجائے عام فہم، سلیس اور واضح ہوتا کہ قاری کو مفہوم تک رسائی حاصل کرنے میں مشقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

شروع میں محض ترجمہ شائع کرنے کا ارادہ تھا لہٰذا راقم الحروف نے آیات واحادیث نیز اقوال علما کی تخریج ترجمہ پر ہی کی تھی۔ بعد میں اراکین کی خواہش پر متن کی تحقیق بھی شامل کر دی گئی۔ چنانچہ فی الحال تخریج، ترجمہ کے ساتھ ہے۔ آئندہ جب اس رسالے کو الاحسان سے الگ کر کے مستقل شکل میں شائع کیا جائے گا تو ان شاء اللہ تخریج کو متن کے ساتھ لاحق کر دیا جائے گا۔

رسالہ اصول السماع کے مشمولات پر ایک نظر

مصنف نے رسالے کو ایک مقدمہ، دس اصول اور ایک خاتمہ پر مرتب کیا ہے۔ پورے رسالے کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بنیادی طور پر چار چیزوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ہم ذیل میں اجمال کے ساتھ ہر ایک پر روشنی ڈال رہے ہیں۔

(۱) فروعی مسائل میں صوفیہ کا مذہب

صوفیہ کے یہاں ایک جملہ ”**الصوفی لا مذهب له**“ کافی شہرت کا حامل رہا ہے۔ اہل علم نے اپنے اپنے طور پر اس جملے کی شرح و وضاحت فرمائی ہے۔ مصنف کے نزدیک اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ صوفیہ کسی معین مذہب میں محصور نہیں رہتے۔ انہیں از روئے تقوی جو مذہب زیادہ محتاط معلوم ہوتا ہے وہ اس میں آسانی کے ساتھ جزوی یا کلی طور پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کتاب وسنت سے استدلال کرتے ہوئے اس بات پر خاصہ زور دیا ہے کہ از روئے شرع کسی معین مذہب کو ہر کسی پر لازم وضروری قرار دینا درست نہیں ہے۔(۱)

(۲) سماع جائز ہے

دین میں اچھی آواز سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اللہ تعالی نے جس قدر انبیا مبعوث فرمائے تھے سب کو اچھی آواز کے ساتھ مبعوث فرمایا تھا۔ داؤد علیہ السلام کی آواز تو اس قدر پرکشش تھی کہ نہ صرف یہ کہ انسان بلکہ چرند پرند تک ان کی آواز سن کر مسحور ہو جاتے تھے۔ لہٰذا اچھی آواز کو یا اس کے سننے کو غلط بتانا عقل ونقل سے پرے ہے۔

اسی طرح اگر اشعار فواحش سے پاک ہوں تو ان کے بھی کہنے یا سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لیے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ سے اشعار سماعت فرمائے ہیں۔ لہٰذا شعر گوئی کو بھی شرعاً ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ مصنف کہتے ہیں کہ جب اچھی آواز سننا بھی جائز ہے نیز شعر کہنا بھی جائز ہے تو اگر ان دونوں کو ملا کر سن لیا جائے تو اس میں کیوں کر قباحت پیدا ہو جائے گی؟

---

(۱) اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو مجلّے میں شامل حضرت مولانا غلام مصطفی ازہری صاحب کے مضمون میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

(۳) مزامیر فی نفسہ مباح ہیں

یہ وہ تیسرا اہم نکتہ ہے جسے مصنف نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ مزامیر فی نفسہ مباح ہیں۔ البتہ! ان کے ساتھ اگر کوئی دوسرا ناجائز وصف شامل ہوجائے تو ان کے اندر حرمت پیدا ہو جاتی ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ احادیث میں جو مزامیر کی ممانعت آئی ہے اس کی وجہ دراصل شراب نوشی کا یاد آ جانا ہے۔ اہل عرب شراب پیتے وقت مزامیر سنا کرتے تھے۔ چنانچہ جب انہیں شراب سے منع کیا گیا تو مزامیر سے بھی منع کر دیا گیا تا کہ مزامیر سن کر پھر سے شراب نوشی کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ احادیث میں جو مزامیر سے منع کیا گیا ہے اس کی علت شراب نوشی کا یاد آ جانا ہے۔ لہٰذا جب یہ یا اسی کے مثل کوئی اور مبنی بر حرمت علت نہ پائی جائے گی تو مزامیر از روئے شرع مباح ہوں گے۔

(۴) تواجد ناجائز نہیں

بسا اوقات سماع سن کر سامع پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور وہ کیف و مستی میں جھومنے لگتا ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ غلبہ حال کے وقت سامع کا حرکت و وجد میں آنا از روئے شرع ناجائز نہیں ہے۔ اس پر مصنف نے متعدد احادیث و آثار پیش فرما کر اپنے موقف کو تقویت پہنچائی ہے۔

ضمنی طور پر اور بھی کئی مسائل زیر بحث آئے ہیں لیکن بنیادی طور پر انہی چار مسائل کو مصنف نے موضوع بحث بنایا ہے۔ ہم نے اصل متن اور ترجمہ دونوں آئندہ صفحات میں پیش کر دیے ہیں۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے باذوق قارئین خود علامہ فخر الدین زرادی کی اس علمی کاوش سے استفادہ کریں۔

آخر میں اپنے احباب میں سے مولانا ناظم اشرف مصباحی، مولانا ساجد الرحمٰن مصباحی اور مولانا عاصم صاحبان کے ساتھ ان تمام لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس نیک کام میں میری معاونت کی۔ اللہ تعالی مجھے اور ان سب کو اپنے نیک بندوں کی صف میں شامل فرمائے۔ آمین!

اگلے صفحات پر رسالہ اصول السماع کا محقق نسخہ ملاحظہ فرمائیں:

رسالہ اصول السماع

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي خص الأولياء بحسن الاستماع وأطرب([1])سرائرهم بلطائف المخاطبات عند السماع وأسمع قلوبهم كلامه القديم بكشف القناع، والصلاة على محمد سيد الأنبياء بالإجماع وعلى آله وأتباعه الذين لهم حسن الاتباع.([2])

اعلم أن أهل السنة والجماعة ثلاث فرق: الفقهاء والمحدثون والصوفية، فالفقهاء سموا المحدثين أصحاب الظواهر؛ لأنهم يعتمدون بمجرد الخبر ويطلبون الإسناد الصحيح؛ وهم سموهم أهل الرأي؛ لأنهم يعملون بالرأي ويتركون الخبر الواحد؛ فعندهم العمل بالدراية مع وجود مخالفة الخبر الواحد عن الثقات جائز وعند المحدثين لا يجوز.

والصوفية أجود الفريقين وأصفاهم لأنهم يتوجهون إلى الله تعالى بترك الالتفات عما سوى([3]) الله تعالى فهم يعملون بالمذهب الأحوط ولا يقبلون المذهب المعين كما قال بعضهم: الصوفي لا مذهب له أي المذهب المعين([4])، ويتمسكون بقوله عليه الصلاة والسلام: اختلاف أمتي سعة في الدين.

فإذا كان الاختلاف توسيعا فاختيار المذهب المعين تضييق، وتضييق المُوَسَّع ممنوع في الدين؛ لأنه حرج في حق المكلف، وكذلك منع النبي صلى الله عليه وسلم الأعرابي حين دعا: اللهم ارحمني ومحمدا ولا ترحم معنا أحدا [بقوله:] لقد تحجّرتَ واسعا أي تضيقت، فثبت اختيار المذهب المعين ليس بشيء وهو طريق العوام، ويؤيده الكتاب والسنة وأجمع عليه المحققون.

فالكتاب هو قوله تعالى: فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (الأنبياء:٧)، فالأمر بالسؤال من غير تعين يدل على أن اختيار المذهب المعين بدعة. وأما السنة فقوله عليه الصلاة والسلام: أصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم، فأمر الاقتداء كأمر السؤال في ترك الاختيار. وأما الإجماع فهو ظاهر لأن النظر في أقوال العلماء المجتهدين واجب حتى يميز العاقل الدليل الراجح من المرجوح، والقويَ من الضعيف لزيادة الرشد في الأصول، وهو طريق طلب([5]) العلم،

([1]) م: أطباب، س: اطاب

([2]) "الذين لهم حسن الإتباع" ساقط فی "س"

([3]) "سوی" ساقط فی "م" و "ع"

([4]) "أی المذهب المعين" ساقط فی "س"

([5]) م و ع: "طالب"

وطلبه واجب بالإجماع لما ذا ورد في الحديث: طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة.

فاختيار المذهب المعين بالتقليد انسداد هذا الباب، والقياسُ كذلك لكونه ترجحا بلا مرجح وحرجا في حق المكلف كما ذكروه، فإذا كان الصوفية في مذهب غير معين فرواية(١) الفقهاء عليهم ليس بحجة فافهم.

واسمع الآن(٢) فها أنا شرعت في توضيح السماع وإباحته وصنفت كتابا موسوما(٣) بأصول السماع ورتبته على عشرة أصول وأعرضت عن زيادة الفضول.

الأصل الأول في بيان حقيقة السماع صيغة ولغة واصطلاحا

السماع لفظ مشترك وهو عند البعض الاسم الجامد كما في تاج الأسامي: السماع السرور، وعند الأكثر هو المصدر بمعنى السمع، واستعمل في المسموع، يقال: هذا الكتاب سماع ومسموع، أما الاصطلاح فهو المسموع المطبوع المجموع من الصوت الحسن والكلام الموزون حتى ينصرف الفهم عند الإطلاق على ذلك، وفي هذا الاصطلاح مراعاة المعنى اللغوي وهو الأصل، والسماع دون الغناء لأنه استماع الأشعار التي تكون في ذكر الغواني مع حسن الصوت، والغواني هي النساء التي تستغنى هي بالحسن عن الزينة كما أشار إليه الشيخ العارف أبو طالب المكي في قوت القلوب: إن الأغاني ما شبب به النساء وذكر فيه الغزل ووصفن به وشهدن منه ودعا إلى اللهو وشوّق إلى اللهو، وقوله حجة لاستفاضة علمه في لغة العرب وكمال ورعه، فالسماع لا يحرم كحرمته أبدا.

ألا ترى(٤) أنه لو أقسم أحد أن لا يأكل اللحم فإن أكل لحم السمك لا يحنث عند أبي حنيفة؛ لأن اسم اللحم ينبئ (٥) عن الالتحام وهي الشدة، والالتحام فيه غير موجود فلا يدخل في حكمه حقيقة، فكذلك السماع يخرج عن حكم الغناء؛ إذ اسمه يُشعر عن ذكر الغواني، فالسماع مطلق والغناء مقيد والمطلق خارج عن حكم المقيد، فإذا كان السماع فارغا عن وصف(٦) الغناء فهو

---

(١) س: فرأيت

(٢) "الآن" ساقط فى "س"

(٣) "موسوما" ساقط فى "س"

(٤) "ألا ترى" ساقط فى "م"

(٥) "ينبئ" ساقط فى "س" و"م"

(٦) س: حكم

مباح بالاتفاق؛ لأنه مجموع من الصوت الحسن و الكلام الموزون، و استماعهما جائز في الشرع؛ إذ كل واحد منها حسن المعنى في عينه.

الأصل الثاني في استماع الصوت الحسن

الصوت الحسن نعمة زادها الله تعالى في خلق الإنسان، فحسن أدائه وهو نعمة من عنده إلى عبده (١) فهو في نفسه حسن و استماعه مستحسن؛ إذ الله تعالى مَنَّ به على العباد كما جاء في التنزيل: وَيَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (الفاطر: ١). قال بعض المفسرين: وهو الصوت الحسن، وقرئ" في الخُلق" وهو من نوادر القراءة، واصطفى الأنبياء عليهم الصلاة و السلام به، قال النبي صلى الله عليه وسلم: مابعث النبي قط إلا وله حسن الصوت، فالتلذذ به شكر النعمة، وهو واجب لقوله تعالى: وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحى: ١١) فالحديث يقتضي وجوب التلذذ.

والصوت القبيح منكر قال الله تعالى: إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ (لقمان: ١٣)، فثبت أن نقيضه مرضي؛ إذ الشيء يتبين بضده، و لأنه معجزة لداؤد عليه السلام وهو آية من آيات الله تعالى، و له تأثير بليغ في القلوب، و كذلك كان يرفع من مجالسه جنائز؛ لما روي عن الثقات أن داؤد عليه السلام كان يسمع قراءته الإنس والجن والوحش والطير إذا (٢) قرأ الزبور، و كان يرفع من مجلسه أربع مأة جنازة ممن قدمات من المستمعين.

وذكر الترمذي في نوادر الأصول بإسناده عن ابن عباس رضي الله عنه أنه قال: داؤد عليه السلام كان (٣) يقرأ الزبور بسبعين صوتا، و كان يقرأ قراءة يطرب منها المحموم (٤)، إذا أراد أن يُبْكِيَ نفسه لم يبق دابة في بر ولا بحر إلا أن يسمعن صوته.

فالصوت الحسن إذا كان معجزة النبي فاستماعه واجب كذلك حكم (٥) استماع السماع (٦)؛ إذ حق المعجزة هو الإظهار والمشاهدة والقبول.

أما قوله عليه الصلاة والسلام: صوتان ملعونان: صوت بكاء عند مصيبة وصوت مزمار عند

---

(١) "عبده" ساقط فى "ع"

(٢) س: "حين" و كلاهما ساقطان فى "م"

(٣) "كان" ساقط فى "س"

(٤) "و كان

نوادر الأصول للحكيم الترمذى (٣/٣٦)

(٥) "حكم" ساقط فى "ع"

(٦) "السماع" ساقط فى "ع" و "م"

نعمة،فهودليل الإباحة لأن مفهوم الخطاب يقتضي إباحته في غير هذه الأحوال وإلا بطل التخصيص، فافهم.

الأصل الثالث في المزامير

المزمار آلة توجد بها الأصوات الموزونة وهي بالنظر إلى نفسها مباحة كما ذكر، وأما الحرمة فلعِلّة أخرى وهو تذكر شرب الخمر كما روي عن الثقات أن النبي صلى الله عليه وسلم إذا حرم الخمر حرم المزامير؛ إذ الناس يضربون وقت شربه، فَحُرِّم ضربه لتذكره إياه، وهو قبيح لمعنى غيره، فإذا كانت هذه العلة مفقودة يفقد الحرمة ضرورة، ولهذا يباح ضربُ الطبل في الحروب، و(١) في الأوقات الخمسة (٢)، فثبت به أن الحكم يتغير بتغير العلة، وإذا كانت النفس منزهة عن اللهو والهوى (٣)وموصوفةً بالصفوة والزكاء ومشتاقةً إلى مشاهدة الله ولقائه، فأصوات المزامير داعية من الكدر إلى الصفا ومُرَقِّعة عن السفل إلى العلا؛ إذ الصوت الحسن قوت الأرواح، وقوتها في سيران عالم الملكوت ويؤيده قول ذى النون المصري رحمة الله عليه حين سئل عن الصوت الحسن فقال: مخاطبات وإشارات أودعها الله تعالى كل طيب وطيبة، فاستماعه لهما مباح لفقدان العلة قياسا على ضرب الطبل في الحروب.

ألا ترى أن النبي صلى الله عليه وسلم جوّز ضرب الدف في النكاح للإعلان كما جاء في الخبر من الصحاح: أعلنوا النكاح ولو بالدف، وفي أيام الأعياد والسرور لحديث آخر لإظهار الطرب، ألا إن في صوته وصفين: الإطراب والإعلان، فالإطرابُ لموزونيته، والإعلانُ لشدته، فبالنظر إلى هذين الوصفين أباح السماع النبيُ صلى الله عليه وسلم وضربُه، فما دونه من المزامير يقاس عليه؛ إذ حرمتها موجودة بوجود العلة، فبفقدانها (٤) مفقودة.

---

(١) كانت هنا "ضرب الشح" فى س و ع "وضرب الشيخ" فى م، وهو -فيما أرى- تصحيف.

(٢) س و م: الحسنة، أما قصة ضرب الطبل عند أوقات الصلوات الخمس فقد رواه الذهبى فى تاريخه: "وفي رمضان قدم السلطان جلال الدولة بعد أن خرج القادر بالله لتلقيه، واجتمعا في دجلة. ثم نزل في دار السلطنة، وأمر أن يضرب له الطبل في أوقات الصلوات الثلاثة. وعلى ذلك جرت الحال في أيام عضُد الدولة وصمصامها وشرفها وبهائها. فثُقل هذا الفعل على القادر بالله وأرسل إليه يكلمه. فاحتج جلالُ الدولة بما فعله سلطان الدولة، فقيل: كان ذلك على غير أصل ولا إذنٍ، ولم تجر العادة بمماثلة الخليفة في هذا الأمر. وتردد الأمر إلى أن قطع الملك ضرب الطبل بالواحدة. فأذن الخليفة ضرب الطبلِ في أوقات الصلوات الخمس." (تاريخ الإسلام للذهبي ٢٨/ ٢٦٢)

(٣) "الهوى" ساقط فى "س"

(٤) س: فتفقد فانها

وبهذا الاستدلال حمل الإمام الغزالي أصوات المزامير على أصوات الطيور التي يكون لها حسن الترنم وأباح استماعها، فبذلك سمع بعض المغلوبين السماع بالمزامير في غلبات الشوق، وأما سماع مشايخنا رضي الله عنهم فبريء عن هذه التهمة فهو مجرد صوت القوال مع الأشعار المشعرة من كمال صنعة الله تعالى.

الأصل الرابع في الشعر

الشعر كلام موزون مشعر عن المعاني الدقيقة يصدر عمن له لطيف الطبع، فهو إذا كان في الموعظة والحكمة وشرح صنع الله تعالى أوقع في قلب السامع، ويمدد (١) الشوق إلى الصانع كما جاء في الخبر: إن من الشعر لحكمة أي ما هو فيه من الفوائد أوقع (٢) بموزونيته، فهي حكمة بالغة لتأثير القلوب، والطبع الموزون من مواهبه تعالى يؤتيه من يشاء، لا صنع فيه للعبد كالصوت الحسن بل هو أشرف منه؛ لأنه صفة مخصوصة للإنسان، وفي الصوت الحسن مشاركة مع الطيور، وما دونها من المزامير فهو أيضا نعمة مخصوصة من عنده تعالى إلى عبده، فلا قبيح في نفسه أصلا.

ألا ترى أن النبي صلى الله عليه وسلم أمر حسان بن ثابت للإنشاء حتى ينشئ الشعر في مجلسه الشريف وينشد، ووضع المنبر حين إنشائه وقال: اهجُ يا حسان وروح القدس معك؛ كما ذكر القشيري هذا الخبر في كتابه بإسناده الصحيح، فإذا كان الشعر من أثر الوحي فلا سبيل لإنكاره أصلا (٣)

ويؤيده قول النبي صلى الله عليه وسلم: إن لله تعالى كنزا تحت العرش للإنسان مفاتيحها ألسنة الشعراء؛ ولهذا سماه النبي صلى الله عليه وسلم الحكمةَ كالشرع ؛ لأن نزوله من مقامه العلى، فثبت أنه حسن لمعنى في عينه كهو، فلا قبيح فيه إلا بعارض في المواضع القبيحة كالفحش والاستهزاء وتزيين المحظورات الشرعية وهجو الرسول والمؤمنين وطعن الدين كما فعل الشعراء الكذابون من (٤) الكفرة والفجرة زمان رسول الله صلى الله عليه وسلم.

وقوله تعالى: وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۔ (الشعراء: ٢١) محمول عليهم لا على الشعراء الذين يكون في أشعارهم (٥) شعائر الدين، إذ أشعار النصيحة مروية عن أكثر الصحابة رضي الله

---

(١) ع: "يمد"

(٢) س: "وقع"

(٣) "أصلا" ساقط فى "س"

(٤) كان هنا "عن" فاستبدلناه بـ "من" لأنه أوفق بالمقام

(٥) س: "شعرهم"

عنهم، والدليل الظاهر عليه أن الأشعار قد أنشد بين يدي رسول الله صلى الله عليه وسلم بل هو أنشدها وهو الدليل الظاهر للإباحة فافهم.

الأصل الخامس في الصوت الحسن والكلام الموزون وفي إباحتهما جميعا

فإذا ثبت أن سماع الصوت الحسن والشعر المشعر من صنعة الله تعالى جائز، فثبت أن السماع مباح؛ إذ اجتماع الحسن مع الحسن يوجب زيادة الحسن فيهما فهو حسن واستماعه مستحسن، ويشير إليه قول النبى صلى الله عليه وسلم: زينوا القرآن بأصواتكم، فإن الصوت الحسن يزيد القرآن حسنا، فالقرآن حسن في نفسه، وأدائه بالصوت الحسن سبب لزيادة الحسن فيه لا يقاعه في قلب السامع، فإذا كان الشعر موافقا لمعناه فيدخل في حكمه أيضا، فهو لا يخلو عن معنيين فإما في الموعظة الحسنة فاستماعه حسن بالاتفاق وإما في صفة الجرد والأمرد والنساء الحسناء فهو محمول على أشعار حسن الحور والغلمان، فاستماعه مستحسن أيضا لتشويق المؤمن إلى الآخرة، والصوت الحسن يؤكده عند الاستماع ويوجب زيادة التشويق إليها (١) وهو حسن ولأنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم قصيدة كعب بن زهير في صدرها ذكر حسن المرأة فتعين استماعها كما قال:

بانت سعاد فقلبي اليوم متبول

إلى هذا المصرع:

هيفاء مقبلة عجزاء مدبرة

وفيه صفة عجزاء، فثبت أن ذكر المصنوعات من الأمرد والنساء جائز فى الشرع (٢) واستماعه بالصوت الحسن مستحسن؛ لأنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم بالقبول، وقال: من حفظ هذه القصيدة فله الجنة، وروي (٣) أنه صلى الله عليه وسلم سمعها بالألحان في المسجد، فبهذا الاستدلال أباح المشايخ السماع بالاتفاق.

فأما ضرب اليد على اليد فعند البعض استحسانه لإطراب قلوب المستمعين وإظهار التواجد منهم (٤) وهو (٥) محمول على ضرب الدف كما ذكر (٦)، وروى البعض أنه ضرب

---

(١) س: إليهما

(٢) من الأمرد والنساء جائز فى الشرع ـ ساقط فى "س"

(٣) س: ورواية، م: روية

(٤) "منهم" ساقط فى "س"

(٥) م: فهو

(٦) "كما ذكر" ساقط فى "س"

الأعرابيُ هكذا بين يدي رسول الله صلى الله عليه وسلم عند إنشاد الشعر بالألحان حتى تواجد النبي عليه السلام مع الصحابة رضوان الله عليهم.

الأصل السادس في شروط الإباحة

أجمع الصوفية والمحدثون على أن السماع بالنظر إلى نفسه مباح، والعلة للحرمة التلهيّ. وما روى الفقهاء من الأخبار والآثار في حرمته فهو محمول عليه، وبفقدانها فقد الحرمة ضرورة(١) كما(٢) قال شيخنا نظام الملة والدين قدس الله سره العزيز- وهو مقتدى علماء الدين ويكون له مقام الاجتهاد في عصره-: السماع في نفسه مباح وإنما اختلف حكمه بعارض (٣) في أحد الأمور الأربعة لا بد للسماع منها وهو المسمع والمسموع والمستمع وآلة الاستماع، فالذي في المسمع أن يكون من يسمع مظنة الفتنة، وفي المسموع أن من الشعر ما نهى عن مثله الشرع، وفي المستمع أن يزيده السماع في الهوى ويدعوه إلى التصنع والرياء، وفي الآلة أن يكون شيئا من المزامير، فإذا كان السماع منزها من هذه العوارض فهو مباح بالاتفاق.

وله دلائل من المعقول والمنقول فالمعقول كما ذكرنا، والمنقول فنذكره في الأصول.

الأصل السابع في متمسكاته من الآيات

الأولى:(٤) قال الله تعالى:فَبَشِّرۡ عِبَادِ الَّذِيۡنَ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَيَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَهٗ. (الزمر:١٧) فالقول يقتضي التعميم والاستغراق، والدليل عليه أنه مدحهم باتباع الأحسن: إذ تفضيل الشئ على نفسه لا يجوز، فثبت أن المراد به جنس القول من كلامه تعالى وكلام مخلوقه، ولو كان الألف واللام بدلا من المضاف إليه كما أراد الزاهدي: أي يستمعون قولي فالشعر إذا كان موافقا لمعناه يدخل في حكمه أيضا.

الثانية: قوله تعالى:وَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ(المائدة:٥)،وهو ما يكون به طيب النفس إلا أن يكون حرمته منصوصة، إذ الأصل في الأشياء الطهارة، والسماع أطيبها؛ لأن به طيب القلب وروح الروح فهو أيضا حلال بدلالة النص.

الثالثة: قال الله تعالى: وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَ الۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ.

---

(١) ساقط فى "س"

(٢) "كما" ساقط فى "س"

(٣) "بعارض" ساقط فى "س"

(٤) "الأولى" ساقط فى "س"

(النحل:٧٨)إن الله تعالى مَنَّ به على العباد وهو يشتمل كل المسموعات إلا ما يدعو إلى الفسق، فالسماع الذي ليس له من المحظورات الشرعية بشيئ فهو داخل في حكمه.

أما قوله تعالى: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ (لقمان:٦)(١)، وقوله تعالى: وَأَنْتُمْ سَامِدُوْنَ (٢)، وقوله تعالى: وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ (الأسراء: ٦٤) فهذه النصوص مؤولة، وفيها أقوال المفسرين، قال بعضهم: لهو الحديث هو السحر والكهانة، وفي السمود: هو اللعب والاستهزاء، وفي الصوت: هو الذي يدعو إلى الفساد، وقال بعضهم المراد بها(٣) الغناء، فتعيين قول البعض ليس بواجب كما ذكر. ولئن سلم تأويلهم فالتوفيق بين الأقوال ممكن؛ إذ المراد بها غناء الجاهلية وهي استماع الأشعار التي تكون فيها قصص حروب الكفار وذكر معاشقتهم ووصف أصنامهم، فالأصل أن اللهو واللعب والدعوة إلى الفساد فيه موجود، والدليل عليه آخر آية أولىٰ: ''ليضل عن سبيل الله'' فالسماع الذي يفتح سمع السامعين(٤) ويدعو إلى سبيله تعالى بترك الالتفات عما سواه فهو خارج عن حكمه، ولهذا أول ابن مسعود رضي الله تعالى عنه لهو الحديث بالشعر أيضا واستماع الشعر في نفسه ليس بحرام؛ لأنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم و أنشده الصحابة رضي الله تعالى عنهم، فالحرمة فيه بعارض وهو الاستهزاء في الدين والإضلالُ وتزيينُ الكفر في قلوب المؤمنين كما ذكرنا في شأن الشعراء الضالين، فحكمه سار في الغناء فهو إذا كان فارغا عن هذه العوارض فمباح بالاتفاق.

الأصل الثامن في تمسكاته من الأخبار المشهورة

فمنها ما روى الثقات عن عائشة رضي الله تعالى عنها بالإسناد الصحيح أن أبا بكر رضي الله تعالى عنه دخل عليها وعندها جاريتان تغنّيان وتضربان بدفين ورسول الله صلى الله عليه وسلم مسجى(٥) بثوبه، فنهرهما أبو بكر فكشف رسول الله صلى الله عليه وسلم عن وجهه وقال: دعهما ياأبا بكر فإنها أيام عيد.

وفي رواية أخرى: قال أبو بكر رضي الله تعالى عنه: مزمار الشيطان مرتين، فقال النبي صلى

(١)''وقوله تعالى: ومن الناس من يشترى لهو الحديث ليضل عن سبيل الله'' ساقط فى الأصل إلا أننا أثبتناها لكون التفصيل القادم متفرعا عليها

(٢)''وأنتم سامدون'' ساقط فى ''س''

(٣)''المراد بها'' ساقط فى ''س''

(٤)فى الأصل ''الأغناء'' فاستبدلناه بالسامعين لكونه مطابقا للترجمة الفارسية، أما كلمة 'الأغناء' فلا يصح له معنى ههنا۔

(٥)س: ''متغش''

الله عليه وسلم: دعهما يا أبابكر فإن لكل قوم عيدا وعيدنا هذا اليوم.

فنهر أبي بكر يدل على الحرمة السابقة لعلة التلهي والدعوة إلى الفساد والتي توجد في غناء الجاهلية. وتسليم رسول الله صلى الله عليه وسلم يشير إلى الإباحة اللاحقة وبالنظر إلى الأصل وهو الصوت الحسن والكلام الموزون المشحون من الحكمة والموعظة، وحب الله تعالى وحب الرسول(١)، فإذا كان غناء الجاهلية حراما تهييجا للسكر والأصنام فكان غناء الأشعار التي يكون فيها ذكر الآية المنعمة ونعمائه المودعة منتجا بتزيين الإسلام في القلوب والدعوة إلى دار السلام عند علام الغيوب، وكذلك قال الصوفية: السماع محرك القلوب إلى عالم الغيوب.

فإن قلت: إذا كانت إباحته مقيدة في يوم العيد فكيف يدل على استماعه في غير ذلك الوقت؟ قلت: المراد بالعيد يوم عيد به السرور، والدليل عليه ذكر الأيام ويؤيده قوله تعالى: رَبَّنَا أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّأَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا (المائدة: ١١٤) فالمراد بالعيد إعادة السرور، فثبت أن كل يوم يعود به السرور فهو عيد.

ومنها ما روي عن عائشة رضي الله تعالى عنها قالت: كانت عندي جارية من الأنصار فزوجتها إلى رجل من الأنصار فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم يا عائشة! ألا تغنين هذا الحيَ من الأنصار فإنهم يحبون الغناء.

فهذا الحديث دليل إباحة مطلقة؛ لأن النبي صلى الله عليه وسلم وصف الأنصار بحب الغناء وقد قال الله في شأن أصحابه: وَ لٰكِنَّ اللهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ. (الحجرات: ٧) فلو كان الغناء معصية لكان عليهم مكروها لا محبوبا، فثبت به أن استماعه مستحب في كل الأزمان فلا يخص في الوليمة؛ إذ الحب لا يتعين في وقت دون وقت فيشتمل كل الأوقات فافهم.

وفي إباحته كثير من الأخبار المسندة من حيث لا يحصى عددها ونحن اكتفينا بالحديثين إذ هما كافيان للشهادة.

وما روى الفقهاء من الأخبار عن أبي أمامة وجابر وغيرهما رضي الله تعالى عنهما في حرمته فلا يتصل بصحة الإسناد فلا يعتبر عند المحدثين كما ذكر الشيخ مجد الدين رحمة الله عليه في كتابه الصراط المستقيم ولو اعتبر فلا يعارض حديث عائشة رضي الله عنها؛ لأنها أشهر فقها منهما، ولو تأملت فيهما لعرفت أن كل واحد منهما دليل على إباحة أيضاً.

---

(١) ''الحسن'' ساقط فی ''س''

فالأول ما روي عن أبي أمامة رضي الله عنه أنه قال عليه الصلاة والسلام: ما من رجل يرفع صوته في الغناء إلا بعث الله عليه الشيطانين أحدهما على هذا المنكب والآخر على هذا المنكب.

فالوعيد يرجع إلى رفع الصوت عند الغناء لا إلى استماعه فلا حجة للمنكر في حرمته، إذ هو يزاحمه عند الاستماع فهو ممنوع لمن أجهر فيدل على جواز استماعه، ألا ترى أن الناس أمروا بالاستماع والإنصات عند تلاوة القرآن، إذ التكلم يزاحم الاستماع فافهم.

أما الآخر ما روي عن جابر رضي الله تعالى عنه عن النبي عليه الصلاة والسلام أنه قال عليه السلام: إن إبليس أول من ناح وتغنى، فهو مؤول بالنياح بالرياء والتغني باللهو والاستهزاء، إذ نوحته وغنائه دعوة إلى الرياء واللهو فهو ممنوع بالاتفاق.

أما النوحةُ على فوت العبادة والغناءُ لطيب القلب فلا يشبه فهو مباح كما ثبت، فبهذا يحصل التوفيق بين الأخبار هو الأصل، أما قولهم: الغناء حرام والجلوس فيها فسق والتلذذ بها كفر فهو افتراء محض منه ليس فيه ذوق(١) كلامه عليه السلام، إذ التلذذ بالحرام وإن كان زنا ليس بكفر عند أهل السنة والجماعة. فهذا القول يرجع إلى عقيدة أهل الأهواء فلا يعتقد به.

الأصل التاسع في الآثار المروية عن الثقات

روى الشيخ العارف أبو طالب المكي رحمة الله عليه عن كثير من السلف صحابي وتابعي وغيرهم أن السماع مباح، وسمع كثير من الصحابة والتابعين. وقوله معتبر لوفور علمه وكمال حاله وعلمه بأحوال السلف وقال: إن أنكر هذا السماع مجملا مطلقا غير مقيد ومفصل(٢) يكون إنكارا على سبعين صديقا وإن كنا نعلم الإنكار أقرب إلى طبع القراء المتزهدين، وإنا لا نفعل ذلك لأنا نعلم ما لا يعلمون، وسمعنا من السلف الصالح مالا يسمعون. وقال أيضا: إن المنكر للسماع على الإطلاق من غير تفصيل لا يخلو من أحد الآفات الثلاثة: إما جاهل بالسنن والآثار وإما معسر بما أبيح له من أعمال الأخيار وإما جامد الطبع لا ذوق له وهو كحمار يحمل أسفارا.

وذكر في كتاب البيان في الفقه: روي عن عثمان رضي الله تعالى عنه أنه كان عنده جاريتان تغنيان. فلما كان وقت السحر قال: أمسكا فإن هذا وقت الإسفار، وروى الشيخ أبو عبد الرحمن السلمي بإسناد عن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما أنه سئل عن الغناء فقال: لا بأس به إذا لم يكن معه شراب.

---

(١) س: "رفق"

(٢) س: "مفصلا"

وفي تهذيب الإمام الشافعي أن عمر رضي الله تعالى عنه إذا خلا في داره يترنم بالبيت أو البيتين، فاستأذن عليه عبد الرحمن بن عوف وهو يترنم فقال: أسمعتني يا عبد الرحمن فقال: نعم إذا خلونا منازلنا نقول كما تقول، فثبت بهذا أن الغناء لتطييب النفس مباح وهو متعارف بينهم. وذكر الغزالي عن يونس بن عبد الأعلى أنه قال: قد سألت الإمام الشافعي عن إباحة أهل المدينة السماع فقال: لا أعلم أحدا من علماء الحجاز كره(١) السماع إلا أن يكون منه في الأوصاف منكرا.

أما قول ابن مسعود رضي الله تعالى عنه: الغناء ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء البقل، فهو دليل على إباحته أيضا إذ النفاق لا يصلح إلا في أمر صالح بأن يكون الفاعل نيته فاسدة فالنية الفاسدة يفسد العلم فثبت به أن الغناء في نفسه أمر صالح بالاتفاق.

أما قول عثمان رضي الله عنه: ما تغنيت ولا تمنيت ولا مسست ذكرى بيد يمنى منذ بايعت رسول الله صلى الله عليه وسلم فهو محمول على غناء الجاهلية لتوفيق الآثار بين القولين وهو الأصل؛ ولذلك قال الشيخ: في السماع حلال وحرام وشبهة، فمن سمع بنفس مشاهدةٍ شهوةً وهوى فهو حرام لمشابهة غناء الجاهلية، ومن سمع بطبع على صفة مباح من جارية أو زوجته كان فيه دخول شبهة لهو، ومن سمع بقلب سليم عن اللهو والطبع لاعتبار والانتباه والشوق إلى لقاء الله تعالى فهو حلال بالاتفاق ويومئ إليه أقوال الصوفية.

قال ذو النون: السماع وارد حق يزعج القلب إلى الحق، فمن أصغى إليه بحق تحقق ومن أصغى إليه بنفس تزندق، وكذا قال الشبلي حين سئل عنه: ظاهره فتنة وباطنه عبرة، فمن عرف الإشارة حل له السماع وإلا فقد استدعى الفتنة وتعرض للبلية.

فثبت بها السماع ألطف غذاء الأرواح لأهل المعرفة، وبالنظر إلى نفسه حسن لا قبيح أصلا؛ إذ هو حظ الأرواح وبه هزت الأشباح كما قال أبو علي دقاق: السماع ألطف غذاء الأرواح لأهل المعرفة، ولكن مختلف حكمه بحكم المستمعين، فمن حمله على حق فله حق، ومن حمله على ضده فله كذلك، فهو كالرائحة الشجرية إذا هبت على البستانين يروح المشام بطيبه، وإذا مرت على المزابل يحرق نفسها، فالاحتياط به على قدر المستمعين، ولذلك قال الشيخ: [الناس] فى السماع ثلاثة: مُتَسَمِّعٌ ومُسْتَمِعٌ وسَامِعٌ، فَالْمُتَسَمِّعُ يسمع بوقت، والمستمع يسمع بحال، والسامع يسمع بحق، فصفة المتسمع التواجد، وصفة المستمع الوجد، وصفة السامع الوجود كما سنذكر في هذا الأصل.

---

(١) فى الأصل: أن يكره، والتصحيح من الإحياء: ٢/٢٨٤

الأصل العاشر في بيان حقيقة التواجد

التواجد حركة موزونة تصدر عن المستمع بلا اختياره عند غلبة السماع عليه فهو مستحسن؛ إذ هو يستدعي وجد القلب، والوجد داع إلى وجود المحبوب، ويؤيده قول الني عليه السلام: قال عليه السلام حين أطلق معاوية رضي الله تعالى عنه التواجد على اللعب: يا معاوية ليس بكريم من لم يهتز عند سماع ذكر الحبيب.

و سئل الجنيد رحمة الله تعالى عليه عن التواجد فقال: إن الله تعالى خاطب الأرواح في الميثاق بقوله: ألست بربكم فاستفرغت عذوبة سماع الكلام الأرواح، فلما سمعوا السماع حركهم ذكر ذلك (١) عن ربها بسماع الكلام، فالأرواح إذا سمعوا السماع حرّكهم ذكر ذلك، فالاهتزاز به ليس بمنكر؛ لأن النبي عليه السلام فعل كذا، والصحابة رضي الله تعالى عنهم كذلك.

وقد روي أنه عليه الصلاة والسلام قال لعلي رضي الله تعالى عنه: أنت مني وأنا منك فحجل، وقال لجعفر رضى الله عنه: أشبهت خلقى وخلقي فحجل، وقال لزيد رضي الله تعالى عنه: أنت أخونا ومولانا فحجل، والتحجيل عند الطرب وهو صفة للروح كما يشير الجنيد رضى الله تعالىٰ عنه إليه، وتحريك القلب به، فالروح محرك والقالب(٢) محرك، فإذا كان الروح يهتز بالنغمة والقالب رهينابه، فلا يصدر عن المتواجد إلا الحركة الموزونة إذ النغمة موزونة فلا سبيل لإنكاره؛ لأنه يوجد بلا اختيار المتواجد، فالتواجد دون الرقص إذ هو تحرك باختيار للتصنع وهو فعل السفهاء المتصنعين عند غلبة الهوى فهو حرام بالاتفاق.

أما حركة المتواجدين(٣) فمتنوعة بتنوع الأحوال: حركة تصدر عنه عند الكرب(٤) وهو حركة المذبوح عند الذبح، وحركة توجد بهم عند الطلب، وهي كحركة النون عند مشاهدة اليمِّ عن الساحل، وحركة تنبعث منهم عند الطرب، وهي كحركة الفراش عند لقاء النور، فالكرب للنفس، والطلب للقلب، والطرب للروح، فالنفس به هلك، والقلب سلك، والروح ملك(٥)،

---

(١) فى جميع النسخ: استغربت عن ربها بسماع الكلام والأرواح فإذا سمعوا السماع حركهم ذكر ذلك إلا أن فى "س" فالأرواح والتصحيح من الرسالة القشيرية (٢/٥٠٩) طبعتها دار المعارف بالقاهرة.

(٢) س: والقلب

(٣) س: التواجد

(٤) س: التعب، م: النقب، ع: القلب والذى أثبتناه أوفق بالمقام.

(٥) "فالنفس به هلك، والقلب سلك، والروح ملك" ساقط فى "س"

فهذا الاهتزاز مختص بأهل الكمال كما اهتز النبي صلى الله عليه وسلم مع الصحابة عند سماع هذه القصيدة المملوءة من الحب:

قد لسعت حية الهوى كبدي
فلا طبيب له ولا راقي
إلا الحبيب الذي شغفت به
فعنده رقيتي وترياقي

حتى سقط ردائه عن منكبيه.

فإذا كان التواجد فعل النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه رضي الله تعالى عنهم فهو محمود، وإن كان بالنظر إلى ظاهره لعب كما نسبه معاوية رضي الله تعالى عنه حيث قال: ما أحسن لعبك يا رسول الله، فمنعه النبي صلى الله عليه وسلم كما ذكرنا، وكان له ظاهر وباطن، ظاهره حركات مرئية، وباطنه غلبات مخفية، فهو عند أرباب الصورة هزل؛ إذ هم لا يطلعون على الغلبات السرية، ويحسون الحركة الصورية، وعند أصحاب السر جد؛ إذ هم يغلبون بالمشاهدة السرية ولا يشاهدون الحركة الصورية، فهو الخبر المسند ينبئ عن هاتين الحالتين وهو الصحيح لا شبهة فيه.

أما خلجان صاحب العوارف فيه فمحمول على قول معاوية في إطلاق التواجد على اللعب، فهو شيخ ذاكر شاكر بنعمة الله تعالى لايفتر عن ذكره ليلا ونهارا سرا وجهارا قريب إلى صفوة الملائكة، لكن ليس له من حالة العشق وغلبة السماع شعور؛ إذ ليس بينهما ملازمة مساوية لا يوجد أحد بدون الآخر؛ كما ذكر شيخنا نظام الحق والدين عن الشيخ العارف نجم الدين قدس الله سرهما في فوائد الفؤاد، قال في شأنه: فيه كل نعمة ما هي يمكن للبشر وجودها فهي موجود لهذا الأخ العزيز، الا نعمة الشوق ونعمة السماع، فأثرهما مفقود عنه لقوة الصحو والاشتغال بالتعبد، فخلجانه لا يدل على ضعف هذا الخبر بل يرجع إلى ضعف الحال؛ لأن صاحب قوت القلوب أدرج فيه وهو أقرب إلى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وأعلم بالسنن والآثار وهو يعرف بصحته فافهم.

الخاتمة

اعلم أن مسئلة السماع مختلفة بين الفرق المذكورة كما بيناه، فلا يكون مقيدة بزمان دون زمان، كذلك الإباحةُ والحرمةُ لا يثبتان إلا بالوحي، والوحي بعد نبينا عليه الصلوة والسلام منقطع (١)، فكيف يصح قول المنكر قال عليه ما يستحقه: إن السماع كان مباحا في زمان السلف فالآن

---

(١) س: ''مفقود''

حرام بالاتفاق، إذ الأهل في زماننا مفقود وهو ادعاء الوحي واطلاع الغيب؛ لأن فقد انه لا يتحقق إلا بهما (١) وهو كفر بالاتفاق، فثبت أن به قوام الضلال ولا يقول مثل هذا (٢) إلا المبتدع الضال فافهم واجتنب وانظر في هذه الرسالة بعين الإنصاف حتى يتحقق خلاف الاختلاف.

وفقك الله تعالى وإيانا على متابعة السلف الصالحين بحق نبيه المختار وآله الأطهار.

ترجمہ رسالہ اصول السماع

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اولیائے کرام کو حسن سماعت سے نوازا، سماع کے وقت اسرار و تجلیات سے ان کے باطن میں وجد وکیف پیدا فرمایا اور بے حجاب ان کے دلوں کو اپنا کلام قدیم (٣) سنایا۔ رحمتیں نازل ہوں بالاتفاق تمام انبیا کے سردار حضرت محمد مصطفی پر، ان کی آل اور ان کے متبعین پر جنھوں نے بہترین طرز پر آپ کی پیروی کی۔

مقدمہ

جان لیجیے کہ اہل سنت و جماعت کے تین گروہ ہیں۔ فقہا، محدثین اور صوفیہ۔ فقہا محدثین کو اصحاب ظواہر کہتے ہیں؛ اس لیے کہ محدثین محض خبر واحد پر اعتماد کرتے ہیں اور سند صحیح کے طالب ہوتے ہیں۔ دوسری طرف محدثین فقہا کو اہل رائے کہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہا قیاس اور رائے پر عمل کرتے ہیں اور خبر واحد کو ترک کر دیتے ہیں۔(٤) چناں چہ فقہا کے نزدیک خبر واحد کے ہوتے ہوئے درایت پر عمل کیا جاتا ہے جب کہ محدثین کے یہاں ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

صوفیہ ان دونوں گروہ سے بہتر اور خالص ہیں۔ اس لیے کہ وہ ما سوی اللہ سے اعراض کر کے اللہ کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔(٥)

---

(١) س و م: "بھا"

(٢) م و ع: "ھذہ"

(٣) یہاں کلام قدیم سے مراد الہام ہے جو وحی کا عکس ہے۔ الہام سے حاصل شدہ علم ظنی ہوتا ہے؛ اسی لیے صوفیہ فرماتے ہیں کہ جب کبھی کسی کے دل پر الہام ہو تو لازم ہے کہ اسے کتاب وسنت پر پیش کیا جائے اگر موافق ہو تو قبول کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

(٤) احناف بلاشبہہ خبر واحد کو قبول کرتے ہیں۔ البتہ انہوں نے خبر واحد کے ظنی ہونے کی وجہ سے اس کی قبولیت کے لیے ایک معیار مقرر کیا ہوا ہے۔ پس اگر خبر واحد اس معیار پر پورا اترتی ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں ورنہ رد کر دیتے ہیں۔ احناف کے مطابق اگر خبر واحد کتاب اللہ، سنت متواترہ اور اجماع کے خلاف نہ ہو، یوںہی خبر واحد سے حاصل ہونے والے معانی عموم بلوی کے خلاف نہ ہوں نیز خود راوی کا عمل اس حدیث کے خلاف نہ ہو تو خبر واحد کو قبول کیا جائے گا۔ احناف کی ان قیود سے بعض اہل علم نے یہ سمجھا کہ احناف اپنی رائے کو خبر واحد پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب کہ ان قیود سے احناف کا مقصد یہ تھا کہ دین کے نام پر کسی چیز کو قبول کرنے میں حد درجہ احتیاط برتا جائے تا کہ دین کے اندر کوئی ایسی بات شامل نہ ہو جائے جو درحقیقت دین نہ ہو۔

(٥) علامہ فخر الدین زرادی قدس سرہ نے اپنے زمانے کے عام محدثین وفقہا کے عام احوال کے مطابق یہ بات کہی ہے، ورنہ ارباب فقہ وحدیث میں بھی اتقیا واصفیا کی کوئی کمی نہیں ہے۔

فقہی مسائل میں صوفیہ کا مذہب

صوفیہ مذہب محتاط پر عمل کرتے ہیں اور کسی معین مذہب کو قبول نہیں کرتے۔ جیسا کہ بعض صوفیہ نے کہا بھی ہے: **الصوفی لا مذهب له.** صوفی کا کوئی معین مذہب نہیں ہوتا۔

صوفیہ اپنے اس موقف کی تائید میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے استدلال کرتے ہیں: **اختلاف أمتي سعة في الدين.** (۱) میری امت کے اختلاف سے دین میں وسعت و گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

جب امت کا اختلاف وسعت و گنجائش کا سبب ہے تو کسی معین مذہب کو اختیار کرنا یقیناً تنگی پیدا کرے گا۔ حالاں کہ ہمارے دین میں کسی وسیع و کشادہ چیز میں تنگی پیدا کرنے سے منع کیا گیا ہے، اس لیے کہ اس سے امت حرج و مشقت میں مبتلا ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اعرابی کو منع فرمایا تھا جس نے یہ دعا مانگی تھی: **اللهم ارحمني ومحمدا ولا ترحم معنا أحدا.** اے اللہ! صرف مجھ پر اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی اور پر رحم نہ فرما۔ آپ نے اس سے فرمایا: **لقد تحجرت واسعا.** (۲) تم نے اللہ کی وسیع رحمت کو تنگ کر دیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ ایک معین مذہب اختیار کرنا کوئی ضروری چیز نہیں ہے بلکہ یہ عامۃ الناس کا طریقہ ہے۔ کتاب وسنت سے اسی موقف کی تائید ہوتی ہے اور محققین نے بھی اسی امر پر اتفاق کیا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: ''**فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون.**'' (سورۃ الانبیا: ۷) اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے دریافت کرلیا کرو۔

آیت مبارکہ میں بغیر کسی تعیین کے سوال و استفسار کا حکم دینا یہ بتاتا ہے کہ مذہب معین اختیار کرنا بدعت ہے۔

حدیث سے اس پر استدلال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''**أصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم.**'' (۳) میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ تم ان میں سے جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پا جاؤ گے۔

---

(۱) بعینہ انہی الفاظ کے ساتھ یہ حدیث نہیں ملی۔ تاہم اسی سے ملتی جلتی ایک دوسری حدیث علما کے یہاں بے حد مشہور ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: **اختلاف أمتي رحمة.** اس حدیث کے بارے میں حافظ زین الدین عراقی لکھتے ہیں: **ذكره الْبَيْهَقِيّ فِي رسَالَتِه الأشعرية تَعْلِيقا وأسنده فِي الْمدْخل من حَدِيث ابْن عَبَّاس بِلَفْظ ''اخْتِلَاف أَصْحَابِي لكم رَحْمَة'' وَإِسْنَاده ضَعِيف.** امام بیہقی نے اس حدیث کو اپنے رسالے الاشعریۃ میں تعلیقا ذکر کیا ہے اور المدخل میں حضرت ابن عباس سے مسندا ذکر کیا ہے۔ لیکن حدیث یہ ہے: میرے اصحاب کا اختلاف تمہارے لیے رحمت ہے۔ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ (المغنی عن حمل الاسفار: ۱/۳۶) یہ روایت اگرچہ عندالمحدثین ضعیف ہے تاہم صوفیہ کے موقف کی تائید کتاب وسنت کے ان نصوص سے ہوتی ہے جن میں دین میں حرج و مشقت نہ ہونے کی بات کہی گئی ہے، مثلاً اللہ تعالی فرماتا ہے: **وما جعل عليكم في الدين من حرج.** (الحج: ۲۲) اور اللہ نے تمہارے لیے دین میں حرج نہیں رکھا۔ لہٰذا اس نوعیت کے نصوص کے پیش نظر بھی صوفیہ اپنے مذہب محتاط پر عمل کر سکتے ہیں۔

(۲) صحیح البخاری (۶۰۱۰)

(۳) جامع بیان العلم وفضلہ (رقم: ۱۷۶۰)

اس حدیث میں صحابہ کرام کی غیر متعین طور پر اقتدا کرنے کا حکم بالکل اسی طرح دیا گیا ہے جس طرح قرآن مجید میں غیر متعین طور پر سوال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی معین مذہب اختیار کرنا ضروری نہیں ہے۔

اس سلسلے میں محققین کا اجماع بالکل ظاہر ہے۔اس لیے کہ اگر کوئی عاقل اصول کے معاملے میں زیادہ صحیح بات تک پہنچنا چاہے تو اسے علمائے مجتہدین کے اقوال میں غور وفکر کر کے راجح و مرجوح اور قوی وضعیف دلائل کے درمیان امتیاز کرنا ہوگا۔یہ عمل طلب علم کا ذریعہ ہے اور علم کی طلب بالاتفاق واجب ہے۔کیوں کہ حدیث میں وارد ہے:"**طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة۔**"(۱)

علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔پس بطور تقلید کسی معین مذہب کو اختیار کرنا علم کے اس دروازے کو بند کرنا ہے۔قیاس بھی اسی بات کا متقاضی ہے۔اس لیے کہ بطور تقلید کسی معین مذہب کی پیروی کو ضروری قرار دینا ترجیح بلا مرجح ہے اور مکلف کے حق میں حرج ومشقت کا باعث ہے جیسا کہ اہل علم نے ذکر کیا ہے۔

جب گزشتہ تقریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ صوفیہ کسی معین مذہب پر کلیۃ انحصار نہیں کرتے تو کسی بھی مذہب کے فقہا کی رائے ان کے خلاف دلیل وحجت نہیں بن سکتی۔اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب آگے کی گفتگو ملاحظہ کریں۔

آنے والے صفحات میں مسئلہ سماع کی حقیقت واباحت کے تعلق سے تحقیق پیش کی جا رہی ہے۔میری اس تصنیف کا نام اصول السماع ہے جسے میں نے حشو وزوائد سے احتراز کرتے ہوئے دس اصول پر مرتب کیا ہے۔

اصل اول: صیغہ، لغت اور اصطلاح کے اعتبار سے لفظ "سماع" کی تحقیق

لفظ سماع متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔بعض کے نزدیک یہ اسم جامد ہے جیسا کہ تاج الاسامی میں مرقوم ہے:"السماع السرور۔" سماع خوش ہونے کو کہتے ہیں۔لیکن اکثر کے نزدیک یہ مصدر ہے جس کا معنی "سننا" ہے۔لفظ سماع بمعنی مسموع بھی استعمال کیا جاتا ہے۔چنانچہ کہا جاتا ہے:"**ھذا الکتاب سماع و مسموع۔**" یہ کتاب سنی گئی ہے۔(لفظ سماع یہاں "مسموع" کے معنی میں ہے۔)

اصطلاح میں سماع سنے جانے والے اس نغمہ کو کہتے ہیں جو اچھی آواز اور موزون کلام سے مل کر بنا ہو اور اسے ایک خاص انداز میں پڑھا گیا ہو۔یہ اصطلاحی مفہوم اس قدر معروف ہے کہ جب لفظ سماع بولا جاتا ہے تو ذہن اسی کی طرف متبادر ہوتا ہے۔لفظ سماع کے اس اصطلاحی مفہوم میں معنی لغوی کی رعایت کی گئی ہے اور یہی اصل ہے۔

سماع اور غنا کا باہمی فرق

واضح رہے کہ سماع غنا سے مختلف ہے۔اس لیے کہ غنا (گانا) اچھی آواز کے ساتھ ان اشعار کے سننے کو کہتے

---

(۱) یہ حدیث سنن ابن ماجہ میں حدیث نمبر ۲۲۴ کے تحت موجود ہے۔لیکن اس میں حدیث کا آخری جز "ومسلمة" موجود نہیں ہے۔

ہیں جو غوانی (خوب صورت خواتین) کے تذکرے پر مشتمل ہوں۔ عربی زبان میں غوانی ان خواتین کو کہا جاتا ہے جو اپنے انتہائی حسن و جمال کی وجہ سے زیب و زینت سے بے نیاز ہوں۔ جیسا کہ عارف باللہ شیخ ابوطالب مکی نے قوت القلوب میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''إن الأغاني ما شبب به النساء و ذكر فيه الغزل و وصفن به و شهدن منه و دعا إلى الهوى و شوّق إلى اللهو۔''(۱)

اغانی وہ غزلیہ اشعار ہیں جن میں خواتین کے خدوخال نیز ان کے حسن و جمال کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہو کہ وہ خیال میں نظر آنے لگیں اور سننے والے کی طبیعت خواہشات نفسانی اور لہو ولعب کی طرف مائل ہونے لگے۔

امام ابوطالب مکی کا یہ قول حجت ہے۔ اس لیے کہ آپ عربی لغت اور کمال پرہیزگاری میں شہرت رکھتے ہیں۔ پس غنا کی حرمت کی وجہ سے مطلق سماع ہرگز حرام نہیں ہوگا۔

فقہی نظیر سے استدلال

کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اگر کسی شخص نے قسم کھائی کہ وہ ''**لحم**'' (گوشت) نہیں کھائے گا۔ بعد ازاں اس نے مچھلی کا گوشت کھالیا تو ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ اس لیے کہ لفظ لحم میں ''**التحام**'' کا معنی موجود ہے اور ''**التحام**'' شدت کو کہتے ہیں جو مچھلی کے گوشت میں نہیں پائی جاتی۔

جس طرح مثال مذکور میں لحم نہ کھانے کی قسم میں مچھلی کا گوشت شامل نہیں ہوگا اسی طرح سماع غنا کے حکم میں داخل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ لفظ غنا میں خوب صورت خواتین کے ذکر کا مفہوم موجود ہے۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ سماع مطلق ہے اور غنا مقید ہے، اور مطلق مقید کے حکم سے خارج ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی سماع میں غنا کی صفت نہیں پائے جائے گی وہ بالاتفاق مباح ہوگا۔ اس لیے کہ سماع تو محض اچھی آواز اور موزون کلام کے مجموعہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ دونوں چیزیں فی نفسہ اچھی ہیں؛ اس لیے ان کے سننے میں از روئے شرع کوئی قباحت نہیں ہے۔

اصل دوم: اچھی آواز سننے کا حکم

اچھی آواز وہ نعمت خداوندی ہے جس کو اللہ تعالی نے خلقت انسانی میں بطور اضافہ رکھا ہے۔ نطق و گویائی کا حسن اللہ کی طرف سے بندے کو عطا کردہ ایک نعمت ہے۔ لہٰذا اچھی آواز فی نفسہ حسن ہے اور اس کا سننا بھی مستحسن ہے۔

قرآن مجید میں بندوں پر احسان جتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **''ویزید فی الخلق ما یشاء۔''**

---

(۱) اصل نسخوں میں یہ عبارت محرف شکل میں موجود تھی۔ تصحیح متن کے پیش نظر عبارت کو اصل ماخذ سے لیا گیا ہے۔ قوت القلوب، ج:۲، ص۱۰۱، ط: دار الکتب العلمیۃ ۲۰۰۵ء

(الفاطر:۱) اللہ تعالیٰ تخلیق میں جو چاہتا ہے اور جیسا چاہتا ہے اضافہ فرماتا ہے۔ بعض مفسرین کا نقطہ نظر بھی یہی ہے کہ آیت کریمہ میں جس اضافہ کی بات کی گئی ہے اس سے مراد اچھی آواز ہے۔ آیت کریمہ میں وارد لفظ **الخَلق** کو **الخُلق** بھی پڑھا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک نادر قراءت ہے۔

انبیائے کرام اور حسن صوت

انبیائے کرام کو بھی حسن صوت کی نعمت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ''**ما بعث نبی قط إلا و له حسن الصوت**۔''(۱) ہر نبی کو اچھی آواز کے ساتھ مبعوث کیا گیا۔ اچھی آواز سے لطف اندوز ہونا اس نعمت خداوندی کا شکر ادا کرنا ہے اور نعمت خداوندی کا شکر ادا کرنا قرآن مجید کے مطابق واجب ہے۔ فرمان الٰہی ہے: ''**و أما بنعمة ربک فحدث**'' (سورۃ الضحیٰ :۱۱) اور آپ اپنے رب کی نعمتوں کا خوب تذکرہ کریں۔ مذکورہ آیت وحدیث کے تناظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حسن صوت سے لطف اندوز ہونا واجب ہے۔

بری آواز ناپسندیدہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے: **إن أنکر الأصوات لصوت الحمیر** (لقمان:۳۱) بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔ اس آیت سے سمجھ میں آتا ہے کہ بری آواز کے برخلاف اچھی آواز ایک پسندیدہ شے ہے؛ کیوں کہ شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔

لحن داؤدی

اچھی آواز کے پسندیدہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ نیز اچھی آواز اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی بھی ہے جس کی دلوں پر بڑی گہری تاثیر ہوتی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام جب حاضرین کو اپنی آواز سنایا کرتے تھے تو بہت زیادہ پر اثر اور پر کشش ہونے کی وجہ سے آپ کی مجالس سے جنازے اٹھا کرتے تھے۔ ثقہ راویوں سے مروی ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام زبور پڑھا کرتے تھے تو جن وانس اور چرند و پرند آپ کی آواز سنا کرتے تھے۔ ان کی آواز اس قدر عمدہ اور پر تاثیر تھی کہ ان کی مجلس سے وفات یافتہ سامعین کے چار سو جنازے اٹھتے تھے۔ حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں حضرت ابن عباس کی روایت سے درج ذیل عبارت نقل کی ہے:

> ''**کان داؤد علیه السلام یقرأ الزبور بسبعین صوتا یلون فیها و کان یقرأ قراءة یطرب منها المحموم، و کان إذا أراد أن یبکی نفسه لم تبق دابة فی بر و لا بحر إلا سمعن لصوته**۔''

(نوادر الاصول (۳/۳۶) ''حضرت داؤد علیہ السلام ستر لہجوں میں زبور کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ہر لہجہ دوسرے سے مختلف ہوتا تھا۔ تلاوت اس قدر دل آویز اور پر کشش ہوتی تھی کہ بیمار شخص بھی سن

---

(۱) یہ حدیث الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ امام ترمذی کی الشمائل المحمدیۃ میں حدیث نمبر ۳۰۳ کے تحت ان الفاظ میں موجود ہے: ما بعث اللہ نبیا إلّا حسن الوجه حسن الصوت، و کان نبیّکم صلی اللہ علیه و سلم حسن الوجه حسن الصوت و کان لا یرجّع.

کر جھوم اٹھتا تھا۔ آپ جب کبھی خود پر گریہ وزاری طاری کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو خشک وتر میں موجود ہر جاندار آپ کی آواز سنتا تھا۔''

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر اچھی آواز کسی نبی کو بطور معجزہ عطا کی گئی ہو تو اس کا سننا واجب ہے۔ اس لیے کہ یہ معجزے کا حق ہے کہ اسے ظاہر کیا جائے، دیکھا جائے اور قبول کیا جائے۔

حدیث میں ہے: ''صوتان ملعونان: صوت بکاء عند مصیبة و صوت مزمار عند نعمة۔''(۱)

دو آوازیں ملعون ہیں: ایک مصیبت کے وقت رونے کی آواز، دوسری نعمت کے وقت مزمار کی آواز۔

یہ حدیث بھی اس امر پر دلالت کر رہی کہ اچھی آواز کا سننا مباح ہے۔ اس لیے کہ حدیث کا مفہوم مخالف اس بات کا متقاضی ہے کہ اگر بالفرض مذکور بالا دونوں صورتیں نہ پائی جائیں تو اچھی آواز کا سننا جائز ہو؛ ورنہ حدیث میں موجود تخصیص باطل ہو کر رہ جائے گی۔ فافہم!

اصل سوم: مزامیر کی تحقیق

مزمار اس آلے کو کہتے ہیں جس سے موزون آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ موزون آوازوں کے متعلق ذکر کیا جا چکا ہے کہ وہ فی نفسہ مباح ہیں۔ جہاں تک مزامیر سے نکلنے والی موزون آوازوں کی حرمت کا مسئلہ ہے تو وہ ایک علت پر مبنی ہے۔ وہ علت شراب نوشی کا یاد آجانا ہے۔ جیسا کہ ثقہ راویوں نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شراب کو حرام کیا تو مزامیر کو بھی حرام کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب لوگ شراب نوشی میں مشغول ہوا کرتے تھے تو اس کے ساتھ مزامیر بھی بجایا کرتے تھے۔ چنانچہ شراب نوشی کے ساتھ مزامیر کو بھی حرام کر دیا گیا تاکہ مزامیر بجانے پر شراب نوشی کی یاد نہ آنے لگے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مزامیر ایک خارجی علت کے باعث قبیح اور ناپسندیدہ ہیں۔ پس جب کبھی یہ علت نہ پائی جائے گی تو یقیناً حرمت بھی نہ پائی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے موقع پر نیز پانچوں اوقات میں ڈھول بجانا مباح ہے۔(۲) معلوم ہوا کہ علت کے بدلنے سے حکم بدل جائے گا۔

سماع صوفیہ

جب نفس، لہو ولعب سے منزہ اور طہارت و پاکیزگی سے آراستہ ہو، ساتھ ہی لقائے الٰہی اور مشاہدۂ حق کا اشتیاق بھی دل میں مچل رہا ہو، اس وقت مزامیر کی آواز اسے بشریت کی کدورت سے نکال کر روحانیت کی طرف اور پستی سے کھینچ کر بلندی کی طرف لے جانے والی ہوگی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اچھی آواز ارواح کے لیے غذا ہے اور یہ عالم ملکوت کی سیر کرنے لیے بھی معاون ہے۔ ہماری اس بات کی تائید حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے ہوتی ہے۔

---

(۱) مسند بزار (ح: ۷۵۱۳) بہ الفاظ: قَالَ رَسُولُ اللہِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: صوتان ملعونان في الدنیا والآخرة: مزمار عند نعمة ورنة عند مصیبة

(۲) خلیفہ قادر باللہ کے زمانے میں نمازوں کے اوقات میں لوگوں کو ڈھول بجا کر آگاہ کیا جاتا تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تاریخ الاسلام، ذہبی (۲۸ / ۲۶۲)

ان سے اچھی آواز کے بارے میں سوال ہوا تو انھوں نے فرمایا: ''**مخاطبات و اشارات اودعها الله کل طیب وطیبة**''۔[۱] یہ وہ مخاطبات واشارات ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہر پاکیزہ مرد وعورت کے اندرودیعت فرمایا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ طاہر و پاکیزہ مرد وزن کے لیے روح کو غذا پہنچانے کی خاطر اچھی آواز کو سننا مباح ہے۔ کیوں کہ یہاں بھی مزامیر کی حرمت کی علت ویسے ہی مفقود ہے جیسے جنگ میں بجائے جانے والے ڈھول میں مفقود ہے۔ (پس جس طرح جنگ میں ڈھول بجانا جائز ہے ویسے ہی روح کو تقویت پہنچانے کی غرض سے مزامیر سے نکلنے والی اچھی آوازوں کو سننا جائز ہے۔ اس لیے کہ دونوں صورتوں میں حرمت کی علت جو کہ شراب نوشی کا یاد آجانا ہے مفقود ہے۔)

ذرا غور کیجیے! نکاح کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے اعلان کی خاطر دف بجانے کو جائز قرار دیا ہے۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں وارد ہے: **أعلنوا النكاح ولو بالدف**[۲] نکاح کا اعلان کرو اگرچہ دف سے ہو۔

اسی طرح بعض دوسری احادیث میں نبی کریم ﷺ نے مسرت وشادمانی کے موقع پر خوشی کا اظہار کرنے کے لیے بھی دف بجانے کی اجازت دی ہے۔ دراصل دف کے اندر دو وصف پائے جاتے ہیں: ایک مسرت انگیزی، دوسرا اعلان۔ دف کی آواز سن کر انسان کے اوپر خوشی اور مستی کی کیفیت اس کی آواز کی موزونیت کی وجہ سے طاری ہوتی ہے اور دف کے اندر اعلان کی خوبی اس کی آواز میں شدت کے باعث پائی جاتی ہے۔ انہی دونوں اوصاف کی طرف نظر کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے دف کے سننے اور بجانے کو جائز قرار دیا ہے۔

اسی استدلال کے ذریعہ امام غزالی نے مزامیر سے نکلنے والی آواز کو پرندوں کی مترنم آواز پر محمول کرتے ہوئے جائز قرار دیا ہے۔ اور اسی بنا پر بعض مغلوب الحال بزرگوں نے غلبۂ شوق میں مزامیر کو سنا ہے۔ جہاں تک ہمارے مشائخ کے سماع کی بات ہے تو وہ اس تہمت سے پاک ہے۔ ہمارے مشائخ جس سماع کو سنا کرتے تھے وہ محض قوال کی آواز میں سنے جانے والے وہ اشعار تھے جو اللہ کی کمال تخلیق پر دلالت کرتے تھے۔

اصل چہارم: شعر گوئی کی شرعی تحقیق

شعر لطیف الطبع شخص سے صادر ہونے والا وہ موزون کلام ہے جو دقیق معانی پر دلالت کرتا ہے۔ اگر شعر کے اندر حکمت وموعظت اور اللہ تعالیٰ کی صنعت وتخلیق کا ذکر ہو تو ایسا شعر سامع کے دل میں اتر جاتا ہے اور باری تعالیٰ کے لیے محبت واشتیاق کو بڑھا دیتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے: **إن من الشعر لحكمة.**[۳] حدیث کا مطلب

---

(۱) الکوکب الداری فی مناقب ذی النون المصری: ص ۸۴

(۲) متعدد فقہائے کرام نے اس حدیث کو بعینہ انہی الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ لیکن کتب حدیث میں یہ الفاظ قدرے اختلاف کے ساتھ مذکور ہے۔ مثلاً امام ترمذی کے الفاظ یہ ہیں: أعلنوا هذا النكاح، واجعلوه في المساجد، واضربوا عليه بالدفوف۔ (ح:۱۰۸۹)

(۳) السنن الصغیر للبیہقی (۳۳۶۹)

یہ ہے کہ بعض اشعار کے اندر مفید باتیں ہوتی ہیں جو اشعار کی موزونیت کے باعث سیدھے دل میں اتر جاتی ہیں۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اشعار کی موزونیت دلوں کو متاثر کرنے کے سلسلہ میں ایک عظیم حکمت کا درجہ رکھتی ہے۔

موزون طبیعت ایک عطیہ ربانی ہے، اللہ جسے چاہتا ہے محض اپنے فضل سے عطا فرماتا ہے۔جس طرح کوئی شخص محض اپنی محنت وکوشش سے اچھی آواز حاصل نہیں کرسکتا ویسے ہی موزون طبیعت کو حاصل کرپانا بھی اس کے ارادہ واختیار سے باہر ہے بلکہ موزون طبیعت اچھی آواز سے بھی زیادہ اعزاز وشرف کی بات ہے۔اس لیے کہ اچھی آواز انسان کے علاوہ پرندوں بلکہ مزامیر میں بھی پائی جاتی ہے لیکن طبع موزون ایک ایسی بیش بہا نعمت ہے جس سے صرف انسان کو سرفراز کیا گیا ہے۔طبع موزون چوں کہ اللہ تعالی کی طرف سے عطا کی گئی ایک خصوصی نعمت ہے لہٰذا یہ کبھی بھی فی نفسہ قبیح اور ناپسندیدہ نہیں ہوسکتی۔

ذرا غور کیجئے! حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی مجلس مبارک میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو شعر کہنے کا حکم دیا۔چنانچہ حضرت حسان رضی اللہ تعالی عنہ کے لیے منبر تیار کیا گیا جس پر کھڑے ہوکر آپ نے اشعار سنائے۔اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت حسان سے فرمایا تھا: **اهج يا حسان! وروح القدس معك.** (۱) اے حسان! کفار ومشرکین کی ہجو کرو! جبریل تمہارے ساتھ ہیں۔اس حدیث کو امام قشیری نے اپنی کتاب میں سند صحیح کے ساتھ ذکر کیا ہے۔جب حضرت جبرائیل کے مدد کرنے کے باعث شعر میں وحی تک کا اثر پالیا گیا تو اس کا انکار کرنا ہرگز درست نہیں ہوسکتا۔

اس موقف کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے: **إن لله تعالى كنزا تحت العرش للإنسان، مفاتيحها ألسنة الشعراء.** (۲) انسان کے لیے عرش کے نیچے اللہ کا ایک خزانہ ہے جس کی کنجیاں شعرا کی زبانیں ہیں۔اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شریعت کی طرح شعر کو بھی حکمت قرار دیا ہے۔چوں کہ اس کا نزول بھی ایک اعلی مقام سے ہوتا ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعر شرع کی طرح فی نفسہ ایک اچھی چیز ہے۔شعر کے اندر قباحت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے قبیح مقامات پر استعمال کیا جاتا ہے۔مثلا اشعار کے ذریعہ فحش گوئی کی جائے، کسی کا تمسخر کیا جائے، شرعی ممنوعات کو آراستہ کرکے پیش کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اہل ایمان کی ہجو کی جائے یا دین میں عیب نکالا جائے۔جیسا کہ عہد نبوت میں جھوٹے غیر مسلم شعرا نے کیا تھا۔

---

(۱) مسند احمد بن حنبل (۱۸۶۷۸) بہ الفاظ: **يا حسان اهج المشركين، فإن جبريل معك، أو إن روح القدس معك.**

(۲) یہ حدیث نہیں ملی۔

قرآن مجید میں اللہ نے فرمایا ہے: وَ الشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ (سورۃ الشعراء: ۲۲۴) اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ یہ آیت انھیں شعرا کے حق میں نازل ہوئی ہے۔اس آیت میں وہ شعرا داخل نہیں ہیں جن کے اشعار میں دینی شعائر کا ذکر پایا جاتا ہے۔اس لیے کہ خود اکثر صحابہ کرام سے پند ونصائح پر مشتمل اشعار مروی ہیں، اس سے بھی واضح دلیل یہ ہے کہ خود نبی کریم ﷺ کی مجلس میں اشعار پڑھے گئے ہیں بلکہ خود نبی کریم ﷺ نے بھی اشعار پڑھے ہیں۔ فافہم!

اصل پنجم: اچھی آواز اور موزون کلام کی اباحت کا بیان

جب یہ ثابت ہو گیا کہ اچھی آواز اور اللہ تعالی کی صنعت وتخلیق پر دلالت کرنے والے اشعار کو سننا جائز ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ سماع (جو دونوں کے مجموعہ کا نام ہے) بھی جائز ہے۔اس لیے کہ جب ایک اچھی شے دوسری اچھی شے کے ساتھ ملتی ہے تو اس سے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ پس سماع ایک اچھی چیز ہے جس کا سننا بھی اچھا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے اس فرمان میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے: زینوا القرآن بأصواتکم (۱) قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو؛ کیوں کہ اچھی آواز قرآن کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن فی نفسہ حسن ہے اور جب قرآن کریم کو اچھی آواز کے ساتھ پڑھا جاتا ہے تو قوت تاثیر کی بنا پر قرآن کے حسن میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو اشعار اپنے معنی کے لحاظ سے قرآن مجید کے موافق ہوں گے ان کا حکم بھی وہی ہوگا جو اچھی آواز کے ساتھ کی جانے والی تلاوت کا ہے۔

اچھے اشعار سے متعلق ایک تفصیل یہ بھی ہے کہ اشعار یا تو اچھی نصیحتوں پر مشتمل ہوں گے تو ان کا سننا بالاتفاق مستحسن ہے۔ یا پھر نوخیز جوانوں اور خوب صورت خواتین کے اوصاف پر مشتمل ہوں گے تو ان کا سننا بھی مستحسن ہے کیوں کہ یہ اُن اشعار پر محمول ہوں گے جن میں حوران بہشت اور غلمان جنت کے حسن وجمال کا تذکرہ ہو۔اس طرح ان کے سننے سے بندہ مومن کے اندر آخرت کا شوق پیدا ہوگا۔ علاوہ ازیں جب ان اشعار کے ساتھ اچھی آواز بھی شامل ہو تو جذبے میں زور پیدا ہوگا اور اس سے آخرت کی طرف مزید اشتیاق پیدا ہوگا جو اپنے آپ میں ایک اچھی چیز ہے۔ [یہ دلیل اس صورت میں ہے جب کہ ان اشعار کا مقصود تذکیر آخرت ہو۔]

ان اشعار کی اباحت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت کعب بن زہیر کا قصیدہ سماعت فرمایا۔ جس کے آغاز میں ایک خاتون کے حسن وجمال کا ذکر ہے۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کے اشعار سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت کعب بن زہیر نے جو اشعار کہے ہیں، ان میں خاص طور سے ’’بانت سعاد فقلبی الیوم متبول‘‘ سے ’’ھیفاء مقبلة وعجزاء مدبرة‘‘ تک ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ ان

---

(۱) سنن ابی داؤد (۱۴۶۸)، سنن ابن ماجہ (۱۳۴۲)، سنن نسائی (۱۰۱۵)

اشعار(۱) میں صفت ''عجزاء'' کا ذکر ہوا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نوخیز جوان اور خواتین کے اوصاف کا ذکر کرنا شریعت میں جائز ہے۔ نیز اچھی آواز کے ساتھ ان کا سننا بھی مستحسن ہے اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے اس قصیدے کو شرف قبولیت سے نوازتے ہوئے نہ صرف سماعت کیا بلکہ یہ بھی فرمایا: **من حفظ هذه القصيدة له الجنة.** (۲) جس نے اس قصیدے کو یاد کرلیا اس کے لیے جنت ہے۔ روایت میں تو یہاں تک آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس قصیدے کو خوش الحانی کے ساتھ مسجد میں سماعت فرمایا تھا۔ (۳) اسی استدلال کے باعث مشائخ نے بالاتفاق سماع کو مباح قرار دیا ہے۔

تالیاں بجانے کا حکم

جہاں تک (سماع کے دوران) تالیاں بجانے کا معاملہ ہے تو بعض مشائخ نے اسے مستحسن قرار دیا ہے؛ اس لیے کہ اس سے سامعین کے دلوں کو فرحت محسوس ہوتی ہے اور ان سے تواجد کا اظہار ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ تالیاں بجانا دف بجانے کی طرح ہے۔ (چنانچہ جس طرح دف بجانا جائز ہے ویسے ہی تالیاں بجانا بھی جائز ہے۔)

بعض نے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نے نبی کریم ﷺ کو خوش الحانی کے ساتھ اشعار سناتے ہوئے تالیاں بجائیں یہاں تک نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کو وجد آ گیا۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اصل ششم: اباحت سماع کی شرطوں کا بیان

صوفیہ اور محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ سماع فی نفسہ مباح ہے۔ اس میں حرمت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے اندر لہو کی آمیزش ہوجاتی ہے۔ فقہا سماع کی حرمت کے سلسلہ میں جو اخبار و آثار نقل کرتے ہیں وہ بھی اسی پر محمول ہیں۔ چنانچہ جب کبھی سماع لہو سے خالی ہوگا تو بدیہی طور پر اس کی حرمت ختم ہوجائے گی۔ جیسا

---

(۱) قصیدہ بانت سعاد کے ابتدائی اشعار درج ذیل ہیں:

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِي اليَوْمَ مَتْبولُ ... مُتَيَمٌ إثرَها لَمْ يُفْدَ مَكْبولُ

وما سُعَادُ غَدَاةَ البَيْنِ إذ رَحلوا ... إلاّ أغنُّ غضِيضُ الطَّرْفِ مَكحول

هَيْفَاءُ مُقْبِلةً عَجْزَاءُ مُدْبِرَةً ... لا يشتكي قِصَرٌ مِنْهَا ولاَ طُولُ

ترجمہ: (۱) سعاد جدا ہوگئی ہے جس کی وجہ سے آج میرا دل بے پناہ بے قرار ہے اور اس کے نقش پا میں ایسا قید ہے کہ اس کا فدیہ بھی نہیں دیا جاسکتا۔

(۲) سعاد صبح جدا ہونے کے وقت جب اپنی قوم کے ساتھ روانہ ہوئی تو اس وقت ایسی معلوم ہوتی تھی کہ جیسے ہرنی کی طرح اپنی پیاری آواز میں گنگناتی ہو اور نگاہیں شرم و حیا کے سبب جھکی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں سرمہ تھا۔

(۳) وہ سامنے سے پتلی کمر والی نظر آتی ہے اور پیچھے سے بڑے کولھوں والی دکھتی ہے۔ نہ اس کی کوتاہ قامتی کی شکایت کی جاسکتی ہے نہ درازی قد کا عیب لگایا جاسکتا ہے۔

(۲) یہ روایت نہیں ملی۔

(۳) سیرت ابن ہشام (۲/ ۵۱۵)، دلائل النبوۃ از بیہقی (۵/ ۲۱۱)

کہ ہمارے شیخ حضرت نظام الملۃ والدین قدس اللہ سرہ العزیز جو علمائے دین کے پیشوا اور اپنے عہد کے مجتہد تھے، فرماتے ہیں:

''سماع فی نفسہ مباح ہے۔ سماع کے لیے چار چیزیں ضروری ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی خلل واقع ہو تو حکم بدل جائے گا۔ وہ چار چیزیں یہ ہیں: مسمع (سنانے والا)، مسموع (سنا جانے والا کلام)، مستمع (سننے والا) اور آلہ سماع۔ اگر مسمع محل فتنہ ہو یا مسموع ایسے اشعار پر مشتمل ہو جن سے شریعت نے منع کیا ہے یا کلام سن کر مستمع کی نفسانی خواہشات میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہو یا پھر ریا کاری اور تصنع کے جذبات ابھرنے لگتے ہوں، یا آلہ سماع مزامیر میں سے ہو تو اس صورت میں سماع کا حکم بدل جائے گا۔ لیکن جب سماع ان غیر شرعی امور سے پاک ہو تو بالاتفاق جائز ہوگا۔''(۱)

حضرت شیخ نے جو گفتگو کی ہے اس پر عقلی و نقلی دلائل موجود ہیں۔ عقلی دلائل تو وہی ہیں جن پر ہم ماسبق میں گفتگو کر چکے ہیں۔ نقلی دلائل آگے آ رہے ہیں۔

اصل ہفتم: قرآنی آیات سے اباحت سماع پر دلائل

پہلی آیت: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ (الزمر: ۱۷-۱۸) پس آپ میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجئے جو باتیں سنتے ہیں اور ان میں سے جو اچھی ہوتی ہیں ان کی پیروی کرتے ہیں۔

آیت کریمہ میں وارد لفظ ''القول'' عموم واستغراق کا تقاضہ کرتا ہے (یعنی اس میں کلام الٰہی اور کلام مخلوق دونوں شامل ہوں۔) اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قول احسن کے اتباع کرنے والوں کی تعریف کی ہے۔ (تو اگر ''القول'' سے صرف کلام الٰہی مراد لیں تو اس صورت میں قول اور قول احسن دونوں سے کلام الٰہی مراد گا۔) حالاں کہ یہ باطل ہے۔ اس لیے کہ شے خود سے نہیں بلکہ کسی دوسری شے سے افضل ہوا کرتی ہے۔

اس پوری گفتگو سے یہ ثابت ہوا کہ لفظ ''القول'' سے جنس قول مراد ہے جس میں کلام الٰہی اور کلام مخلوق دونوں شامل ہیں۔ اور اگر (بر سبیل تنزل) ''القول'' کے الف لام کو مضاف الیہ (یعنی یاء) کا متبادل مان لیا جائے جیسا کہ زاہدی نے مراد لیا ہے تو پھر آیت کریمہ کا معنیٰ ''یستمعون قولی'' ہوگا۔ (اس تفسیر کے مطابق لفظ ''القول'' سے صرف کلام الٰہی مراد ہوگا) اس صورت میں (اگرچہ لفظ ''القول'' میں کلام مخلوق شامل نہیں ہوگا، تاہم)

---

(۱) یہاں پر لفظ ''بالاتفاق'' خاص طور پر توجہ کا متقاضی ہے۔ آلات سماع کے سلسلہ میں اہل علم کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کی حرمت کے قائل ہیں اور بعض اس کی اباحت کی طرف گئے ہیں۔ خود مصنف بھی انہیں علما میں سے ہیں جو آلات سماع کے جواز کے قائل ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق مزامیر فی نفسہ مباح ہیں۔ ان کے اندر حرمت کسی خارجی علت کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ تفصیل کے لیے رسالہ کی ''اصل سوم'' ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ جب سماع دیگر ممنوعات شرعیہ کے ساتھ مزامیر سے بھی خالی ہو تو بالاتفاق مباح ہوگا لیکن اگر مزامیر سماع میں شامل ہوں تو بالاختلاف مباح ہوگا۔

وہ اشعار جو کلام الٰہی کے معانی پر مشتمل ہوں گے وہ ضرور کلام الٰہی کے حکم میں داخل ہو جائیں گے۔

دوسری آیت: اللہ تعالی کا فرمان ہے: **أحل لکم الطیبات۔** (المائدۃ:۵) اور تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔

طیب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نفس کو اچھی لگے۔ چنانچہ آیت کریمہ کے مطابق نفس کو اچھی لگنے والی وہ تمام چیزیں حلال ہوں گی جن کی حرمت پر کوئی واضح نص موجود نہ ہو؛ اس لیے کہ چیزوں کے سلسلہ میں اصل حکم طہارت و پاکیزگی کا ہے۔ سماع سب سے پاکیزہ چیز ہے؛ اس لیے کہ اس سے دل کو راحت اور روح کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ لہذا آیت کریمہ کے مطابق سماع بھی حلال ہوگا۔

تیسری آیت: اللہ تعالی کا فرمان ہے: **وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔** (النحل:۱۸) وہی اللہ ہے جس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ تم بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے کانوں کا ذکر فرما کر بندوں پر احسان جتلایا ہے۔ اللہ تعالی کا یہ احسان ان تمام چیزوں کو شامل ہے جنھیں بندہ اپنے کانوں سے سنتا ہے۔ سوائے ان چیزوں کے جو فسق کی طرف دعوت دیتی ہیں۔ چنانچہ وہ سماع جو شرعی ممنوعات سے خالی ہو وہ بھی اللہ کے احسانات کے زمرے میں داخل ہوگا۔

ازالہ شبہات

بعض لوگوں نے قرآن کریم کی چند آیات سے سماع کی حرمت پر استدلال کیا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. (لقمان:۶) اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو بیہودہ کلام خریدتے ہیں تاکہ بغیر علم کے لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں۔

وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ۔ (النجم:۶۱) اور تم غفلت کے کھیل میں پڑے ہو۔

وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ. (الاسراء:۶۴) اور جس پر بھی تیرا بس چل سکے تو اسے اپنی آواز سے ڈگمگا لے۔

ان آیات کی تفسیر میں مفسرین کے ایک سے زائد اقوال موجود ہیں۔ (اور اگر برسبیل تنزل ان سے وہی معنی مراد لیا جائے جو منکرین سماع مراد لیتے ہیں) تو اس صورت میں یہ آیات از روئے تحقیق مؤول ہیں۔

مفسرین کے اقوال

بعض مفسرین نے ''لہوالحدیث'' کی تفسیر سحر و کہانت، ''سمود'' کی تشریح لعب اور استہزا سے کی ہے۔ لفظ ''صوت'' کے سلسلہ میں مفسرین کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس سے مراد وہ آواز ہے جو فساد کی طرف داعی ہو۔ بعض دوسرے مفسرین کے مطابق ان تمام الفاظ سے مراد ''غنا'' ہے۔

المختصر! جب مذکورہ بالا الفاظ کی تفسیر میں مفسرین کے متعدد اقوال موجود ہیں تو بعض مخصوص مفسرین (جوان الفاظ سے غنا مراد لیتے ہیں) کے قول کو ہی واجب العمل قرار دینا ایک غیر ضروری بات ہے۔

اگر بعض مفسرین کی تاویل تسلیم کر لی جائے اور ان الفاظ سے غنا ہی مراد لیا جائے تب بھی ہمارے نزدیک نصوص کے تعارض کو اس طور پر دفع کرنا ممکن ہے کہ غنا سے دور جاہلیت کا غنا مراد لے لیا جائے۔ دور جاہلیت میں ایسے اشعار کو سنا جاتا تھا جن میں کفار کی جنگوں، معاشقوں اور ان کے بتوں کا تذکرہ شامل ہوتا تھا۔ (حاصل یہ کہ اس تفسیر کے مطابق بھی) حرمت غنا کی اصل لہو ولعب اور دعوت فساد قرار پائے گی۔ ہمارے اس دعوے پر پہلی آیت کا آخری جز ''**لیضل عن سبیل اللہ**'' دلیل ہے۔

چنانچہ وہ سماع جو دیدہ عبرت اور گوش نصیحت کو کشادگی عطا کرتا ہو نیز ماسوا سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتا ہو وہ کیوں کر غنائے مذکور کے حکم میں داخل ہوسکتا ہے؟ چوں کہ زمانہ جاہلیت کے اشعار لھو ولعب پر مشتمل ہوتے تھے اسی لیے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لہوالحدیث کی تشریح شعر سے کی ہے۔

اشعار سننا فی نفسہ حرام نہیں ہے۔ اس لیے کہ خود نبی کریم ﷺ نے اشعار سنے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سنائے ہیں۔ شعر میں حرمت کسی امر عارض کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ (مثلا) دین کا مذاق اڑانا گمراہی پھیلانا یا اہل ایمان کے سامنے کفر کو آراستہ کر کے پیش کرنا ہے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں گمراہ شعرا کے تناظر میں ہم اس بارے میں گفتگو کر چکے ہیں۔ چناں چہ جو حکم شعر گوئی کا ہے بعینہ وہی حکم غنا کا بھی ہے۔ (یعنی غنا فی نفسہ حرام نہیں) پس جب کبھی غنا ناجائز چیزوں سے خالی ہوگا تو بالاتفاق مباح ہوگا۔

فصل ہشتم: اباحت سماع پر احادیث سے استدلال

پہلی حدیث: ثقہ راویوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ حضرت عائشہ کے پاس تشریف لائے۔ اس وقت وہاں دو لڑکیاں کچھ گا رہی تھیں اور دف بجا رہی تھیں اور رسول اللہ ﷺ چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ جب حضرت ابوبکر نے ان دونوں لڑکیوں کو ڈانٹا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنا چہرہ کھول کر فرمایا: **دعهما يا أبا بكر فإنها أيام عيد.** (۱) اے ابوبکر! لڑکیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو! اس لیے کہ یہ خوشی کے ایام ہیں۔

ایک دوسری روایت میں اس طرح آیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے دو دفعہ شیطانی مزامیر کا لفظ بھی کہا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **دعهما يا أبابكر فإن لكل قوم عيدا و عيدنا هذا.** (۲) اے ابوبکر! لڑکیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو! اس لیے کہ ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور ہماری عید آج کا یہ دن ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری: ۹۸۷

(۲) صحیح البخاری: ۲۹۰۶

حضرت ابو بکر کا لڑکیوں کو گانے بجانے سے منع کرنا بتا رہا ہے کہ وہ لہو اور دعوت فساد جو دور جاہلیت کے گانوں میں عموماً پائے جاتے تھے، پر مشتمل ہونے کی وجہ سے پہلے حرام تھا۔

دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس عمل کو برقرار رکھنے کی اجازت دینا یہ بتا رہا ہے کہ یہ عمل اپنی اصل کی طرف نظر کرتے ہوئے مباح ہے۔ وہ اصل یہاں پر اچھی آواز کا ایسے موزون کلام کے ساتھ پایا جانا ہے جو حکمت وموعظت اور اللہ ورسول کی محبت پر مشتمل ہے۔

زمانہ جاہلیت کے گانے کی حرمت اس وجہ سے تھی کہ اس میں نشہ کی طرف جذبات کو ابھارا جاتا تھا نیز بتوں کے اوصاف بیان کئے جاتے تھے۔ اس کے برخلاف وہ گانا کہ جس میں اللہ کی عطا کردہ نشانیوں اور نعمتوں کا ذکر ہو تو اس سے تو دلوں میں اسلام مزید ثابت و مستحکم ہوتا ہے نیز اللہ کی جنت کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے صوفیہ نے کہا ہے کہ سماع سے دلوں کو عالم غیب کی طرف تحریک ملتی ہے۔

اعتراض: حدیث مذکور سے تو فقط اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سماع کی اباحت عید کے دن کے ساتھ مقید ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ دیگر اوقات میں بھی سماع سننا جائز ہے؟

جواب: عید سے مراد ہر خوشی کا دن ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث مذکور میں لفظ ''ایام'' کا ذکر کیا ہے۔ ہمارے اس نقطہ نظر کی تائید کلام الٰہی سے بھی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: **ربنا أنزل علينا مائدة من السماء تكون لنا عيدا الأولنا وآخرنا۔ (المائدۃ: ۱۱۴)**

اے ہمارے رب! ہم پر آسمان سے خوان نعمت نازل فرما دے کہ (اس کے اترنے کا دن) ہمارے لیے عید ہو جائے، ہمارے اگلوں کے لیے بھی اور ہمارے پچھلوں کے لیے بھی۔

اس آیت میں وارد لفظ ''عید'' کا مفہوم بالاتفاق ''اعادہ خوشی'' ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ دن جو خوشی لے کر آئے اسے عید کہا جا سکتا ہے۔

دوسری حدیث: اس سلسلہ میں ایک اور روایت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔ آپ فرماتی ہیں: میرے پاس قبیلہ انصار کی ایک لڑکی تھی جس کی شادی میں نے قبیلہ انصار ہی کے ایک شخص سے کرا دی۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **ألا تغنين هذا الحيّ من الأنصار فإنهم يحبون الغناء.** (۱)

اے عائشہ! کیا تم خواتین گاؤ گی نہیں؟ یہ محلہ انصار کا ہے اور یہ لوگ گانا پسند کرتے ہیں۔

یہ حدیث سماع کی مطلق اباحت پر دلالت کر رہی ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کے بارے

---

(۱) صحیح ابن حبان (۵۸۷۵) بہ الفاظ: ''**عن عائشة، قالت: كان في حجري جارية من الأنصار، فزوجتها، قالت فدخل علي رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم عرسها، فلم يسمع غناء ولا لعبا، فقال: يا عائشة، هل غنيتم عليها؟ أو لا تغنون عليها؟ ثم قال: إن هذا الحي من الأنصار يحبون الغناء**''

میں فرمایا ہے کہ انہیں گانا ناپسند ہے۔ جب کہ اللہ تعالی نے صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا ہے: وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَ زَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ وَ کَرَّہَ اِلَیۡکُمُ الۡکُفۡرَ وَ الۡفُسُوۡقَ وَ الۡعِصۡیَانَ. (الحجرات: ۷) لیکن اللہ نے تمھیں ایمان کی محبت عطا فرمائی اور اسے تمہارے دلوں میں آراستہ فرمادیا اور کفر، نافرمانی اور گناہ سے تمھیں متنفر کردیا۔

پس اگر نغمہ مطلق معصیت اور گناہ ہوتا تو انصار کو ہرگز پسند نہیں ہوتا، بلکہ ناپسند ہوتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نغمات کو سننا صرف ولیمے کے موقع پر ہی نہیں بلکہ تمام اوقات میں مستحب ہے۔ اس لیے کہ انصار کے نزدیک گانے کا پسندیدہ ہونا کسی مخصوص وقت کے ساتھ مقید نہ تھا۔

سماع کی اباحت کے سلسلہ میں اور بھی بے شمار مستند احادیث موجود ہیں۔ ہم نے محض دو حدیثوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ اس لیے کہ شہادت کے لیے دو حدیثیں کافی ہیں۔

احادیث حرمت پر مصنف کا موقف

فقہا نے سماع کی حرمت پر جو احادیث حضرت ابو امامہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما وغیرہ سے نقل کی ہیں وہ صحیح الاسناد نہ ہونے کی وجہ سے محدثین کے یہاں معتبر نہیں ہیں۔ علامہ مجد الدین نے الصراط المستقیم میں اس کی صراحت کی ہے۔(۱)

اور اگر بالفرض ان احادیث کو از روئے سند معتبر مان بھی لیا جائے تب بھی وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا سے مروی احادیث سے متعارض نہیں ہوسکتیں؛ اس لیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا از روئے تفقہ ان دونوں صحابہ سے زیادہ شہرت رکھتی ہیں۔

منکرین سماع کی طرف سے پیش کردہ دونوں احادیث پر اگر آپ دقت نظر کے ساتھ غور فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مخالفین جن احادیث کو حرمت سماع کی دلیل بناتے ہیں درحقیقت ان سے سماع کی اباحت ثابت ہوتی ہے۔ تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائیں!

پہلی حدیث: حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالی عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما من رجل يرفع صوته في الغناء إلا بعث الله عليه الشيطانين أحدهما على هذا المنكب والآخر على هذا المنكب.(۲)

(۱) علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے سفر السعادۃ کے خاتمہ میں فرمایا ہے: **وباب ذم السماع لم يرد فيه حديث صحيح.** سماع کی مذمت کے باب میں ایک بھی صحیح حدیث وارد نہیں ہوئی ہے۔ (سفر السعادۃ: ۲۷۷، مرکز الکتاب للنشر، ۱۹۹۷) واضح رہے کہ بعض اہل علم سفر السعادۃ ہی کو الصراط المستقیم سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) معجم کبیر، طبرانی (۷۷۴۹) بہ الفاظ: **"والذي بعثني بالحق ما رفع رجل عقيرته بالغناء إلا بعث الله عز وجل عند ذلك شيطانين يرتقدان على عاتقيه، ثم لا يزالان يضربان بأرجلهما على صدره - وأشار إلى صدر نفسه - حتى يكون هو الذي يسكت"**

جو شخص غنا کے وقت آواز بلند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اوپر دو شیطان بھیجتا ہے۔ ایک شیطان اس کے دائیں کندھے پر اور دوسرا بائیں کندھے پر سوار ہو جاتا ہے۔

اس حدیث میں جو وعید بیان کی گئی ہے اس کا تعلق سماع نغمہ کے بجائے آواز بلند کرنے سے ہے۔ منکرین سماع کے لیے اس حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے کیوں کہ آواز بلند کرنا غور سے سننے میں دشواری پیدا کرتا ہے، لہٰذا حکم ممانعت اس کی طرف متوجہ ہوگا جو شخص آواز بلند کرے۔ رہا سماع کا سننا تو اس حدیث سے تو اس کی اباحت ہی ثابت ہوتی ہے۔

ذرا غور کیجئے! تلاوت قرآن کے وقت لوگوں کو غور سے سننے کے ساتھ خاموش رہنے کا بھی حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ گفتگو کرنے کی وجہ سے سماعت کا حق ادا نہیں ہو پاتا۔

دوسری حدیث: حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **إن إبليس أول من ناح وتغنى.** (۱) سب سے پہلے رونے اور گانے والا ابلیس ہے۔‘‘

اس حدیث میں جس رونے کی بات کی گئی ہے اس سے مراد ریا کاری کے ساتھ رونا ہے اور جس گانے کی بات کی گئی ہے اس سے مراد بطور لہو و تمسخر گانا ہے۔ اس لیے کہ ابلیس کا رونا اور گانا ریا کاری اور لہو کی طرف دعوت دینے کے لیے ہوتا ہے۔ ریا کاری اور لہو کی نیت سے رونا یا گانا علما کے نزدیک بالاتفاق ممنوع ہے۔

رہا عبادت کے فوت ہو جانے پر گریہ و زاری کرنا نیز دل کو فرحت و مسرت بخشنے کے لیے گانا تو یہ مباح ہے۔ جیسا کہ ماقبل میں یہ بات ثابت کی جا چکی۔

ہماری اس تحقیق سے دونوں طرح کی احادیث کے درمیان تطبیق پیدا ہو جاتی ہے۔ از روئے قواعد بھی یہی اصل ہے [کہ متعارض نصوص کے درمیان تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ غنا حرام ہے نیز محفل غنا میں بیٹھنا فسق اور لطف اندوز ہونا کفر ہے۔ ہماری نظر میں یہ بات نہ صرف افترائے محض ہے بلکہ کلام نبوی کے ذوق سے عاری ہونے کی بھی دلیل ہے۔ اس لیے کہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک ایک حرام شے سے لطف اندوز ہونا اگرچہ وہ زنا ہی کیوں نہ ہو، کفر نہیں ہے۔ یہ قول اہل ضلالت کے عقیدے پر مبنی ہے جسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اصل نہم: سماع کے سلسلہ میں مستند علما کے اقوال

عارف باللہ حضرت ابو طالب مکی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سارے اسلاف؛ صحابہ و تابعین وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ سماع مباح ہے اور بہت سارے صحابہ و تابعین سے نغمہ سننا ثابت ہے۔ حضرت ابو طالب مکی کا یہ قول

(۱) احیاء العلوم میں بلا سند مذکور ہے۔ حافظ عراقی نے کہا ہے: لم أجد له أصلا (المغنی عن حمل الاسفار ص: ۷۵۷) اس معنی کی ایک حدیث دیلمی نے حضرت علی سے بلا سند نقل کی ہے: أول من تغنى ابليس ثمَّ زمر ثمَّ حدى ثمَّ ناح (مسند الفردوس: ۱/ ۲۷)

معتبر ہے؛ کیوں کہ وہ کثرت علم، کمال تقوی اور احوال سلف سے خوب شناسائی رکھتے ہیں۔

انہوں نے یہ بھی کہا ہے:

''اگر تفصیل وتقیید کے بغیر علی الاطلاق سماع کا انکار کر دیا جائے تو اس سے ستر صدیقوں پر انکار لازم آئے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ سماع کا انکار متزہد ومتقشف علما وقرا کی طبیعت کے عین موافق ہے، لیکن ہم ایسا نہیں کرتے اس لیے کہ اس سلسلہ میں ہم وہ باتیں جانتے ہیں جن سے یہ لوگ بے خبر ہیں۔ یونہی ہم نے سماع کے بارے میں سلف صالح سے وہ باتیں سنی ہیں جن سے یہ لوگ کوسوں دور ہیں۔'' (قوت القلوب، ص:۱۰۹۸)

حضرت ابوطالب مکی مزید فرماتے ہیں:

''بغیر کسی تفصیل کے مطلق سماع کا انکار کرنے والا تین آفتوں میں سے کسی ایک آفت میں ضرور گرفتار ہے۔ یا تو وہ سنن وآثار سے بے خبر ہے، یا جائز اور نیک کاموں میں تنگی پیدا کرنے والا ہے، یا پھر بے ذوق اور خشک طبیعت کا حامل ہے۔'' (۱) وہ بالکل اس گدھے کی طرح ہے جو کتابیں اٹھائے پھرتا ہے۔

البیان فی الفقہ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کے حوالے سے منقول ہے کہ ان کے پاس دو باندیاں تھیں جو گایا کرتی تھیں۔ جب صبح کا وقت ہو جاتا تو آپ ان سے کہتے: **أمسكا فإن هذا وقت الإسفار.** (۲) ٹھہر جاؤ! صبح کا وقت ہو گیا ہے۔

حضرت ابوعبد الرحمن سلمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے غنا کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: **لا بأس به إذا لم يكن معه شراب.** نغمہ سننے میں کوئی حرج نہیں ہے بہ شرطے کہ مجلس شراب نوشی نہ ہو۔ (۳)

التہذیب فی الفقہ الشافعی میں مسطور ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ اپنے گھر میں تنہا ہوتے تو ایک یا دو اشعار ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ اسی طرح کے اشعار پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں حضرت عبد الرحمن بن عوف نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت عمر نے ان سے دریافت کیا کہ اے عبد

---

(۱) یہ عبارت اختلاف الفاظ کے ساتھ عوارف المعارف میں موجود ہے۔ البتہ صاحب عوارف نے اسے حضرت ابوطالب مکی کی طرف منسوب نہیں کیا ہے۔ عبارت یہ ہے: **فهو أن المنكر للسماع على الإطلاق من غير تفصيل لا يخلو من أحد أمور ثلاثة إما جاهل بالسنن والآثار وإما مغتر بما أتيح له من أعمال الأخيار وإما جامد الطبع لا ذوق له** (عوارف المعارف ۲/ ۱۴)

(۲) البیان فی مذھب الامام الشافعی، از ابوالحسین یحییٰ العمرانی۔ ہمارے پیش نظر نسخے میں عبارت معمولی اختلاف کے ساتھ اس طرح درج ہے: **وعن عثمان أنه كان عنده جاريتان تغنيان، فلما كان وقت السحر قال لهما: أمسكا فإن هذا وقت الاستغفار** (۱۳/ ۲۹۳) قارئین ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ اصول السماع میں ''الاستغفار'' کی جگہ ''الاسفار'' موجود ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اسی کی رعایت کی ہے۔

(۳) یہ روایت نہیں ملی۔

الرحمن! کیاتم نے مجھے اشعار پڑھتے ہوئے سنا؟ حضرت عبدالرحمن نے جواب دیا: ہاں! ہم بھی جب اپنے گھروں میں تنہا ہوتے ہیں تو آپ ہی کی طرح اشعار گنگناتے ہیں۔(۱)

اس سے دو باتیں اخذ ہوتی ہیں: پہلی یہ کہ خوش طبعی کے لیے گانا مباح ہے۔ دوسری یہ کہ یہ عمل صحابہ کے درمیان متعارف تھا۔

امام غزالی نے یونس بن عبدالاعلی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے امام شافعی سے اہل مدینہ کے سماع کو مباح کہنے کے سلسلہ میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

لا أعلم أحدا من علماء الحجاز كره السماع إلا أن يكون منه في الأوصاف منكرا۔

میرے علم میں علمائے حجاز میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو ناجائز و منکر وصف سے خالی سماع کو ناپسند کرتا ہو۔(احیاء العلوم: (۲ / ۲۸۴)

حضرت عبداللہ ابن مسعود کا یہ قول کہ ''گانا دل میں ایسے ہی نفاق پیدا کرتا ہے جیسے پانی سبزہ اگاتا ہے'' خود سماع کے مباح ہونے کی دلیل ہے، اس لیے کہ کسی بھی درست کام کے اندر نفاق اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ فاعل کی نیت صحیح نہ ہو؛ کیوں کہ فساد نیت فساد عمل کا سبب بنتا ہے۔ اس سے متفقہ طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ غنا فی نفسہ ایک جائز اور مباح عمل ہے۔

اسی طرح ایک حدیث حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ سے بھی مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ما تغينت ولا تمنيت ولا مسست ذكري بيديمني منذ بايعت رسول الله صلى الله عليه وسلم (۲)

جب سے میں رسول اللہ ﷺ سے بیعت ہوا ہوں تب سے نہ تو میں نے نغمہ سنجی کی، نہ جھوٹ بولا اور نہ ہی دائیں ہاتھ سے اپنے عضو مخصوص کو مس کیا۔

اس حدیث میں جس نغمہ سے حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ انکار کر رہے ہیں اس سے مراد زمانہ جاہلیت کا گانا ہے۔ ہماری اس توجیہ سے دونوں طرح کے نصوص کے درمیان تطبیق پیدا ہو جائے گی۔ اور اصل بھی یہی ہے کہ متعارض نصوص کے درمیان تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

اسی وجہ سے حضرت ابو طالب مکی نے سماع کی تین قسمیں کی ہیں:

(۱) حلال (۲) حرام (۳) اور مشتبہ۔

جو سماع شہوت و ہوائے نفس کے ساتھ سنا جائے وہ غنائے جاہلیت سے مشابہت رکھنے کی وجہ سے حرام

---

(۱) التہذیب فی فقہ الامام الشافعی از ابو محمد حسین بن مسعود بغوی (۸ / ۲۸۸) دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۷ء

(۲) سنن ابن ماجہ: ۳۱۱

ہے۔جوسماع خوش طبعی کے لیے مباح طرز پر بیوی یا باندی سے سنا جائے،اس میں لہو کا شبہہ ہےلیکن جو سماع لہواور خوش طبعی کے بجائے پاک دل کے ساتھ محض اس لیے سنا جائے تاکہ عبرت ونصیحت حاصل ہو نیز لقائے الٰہی کا شوق فزوں تر ہو، وہ بالاتفاق مباح ہے۔(۱) صوفیہ کرام کے اقوال سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: سماع حق تعالیٰ کی طرف سے وراد ہونے والی ایسی شے ہے جو اللہ کے لیے دل کو بے چین کر دیتی ہے۔پس جو شخص حق کے ساتھ سماع سنتا ہے وہ حق والا ہےاور جو نفس کے ساتھ سنتا ہے وہ زندیق ہے۔(احیاءعلوم الدین، ۲/ ۲۹۲)

اسی طرح حضرت شبلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے جب سماع کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: سماع اپنے ظاہر کے لحاظ سے تو فتنہ ہےلیکن اپنے باطن کے لحاظ سے سراسر عبرت ونصیحت ہے۔پس جو شخص سماع کے اشارات سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو اس کے لیے سماع حلال ہےاور جو شخص اس سے قاصر ہو اس کے لیے سماع فتنے اور مصیبت کا باعث ہے۔(احیاءعلوم الدین، ۲/ ۲۹۲)

ان تمام اقوال سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سماع اہل معرفت کی ارواح کے لیے ایک لطیف ترین غذا ہے نیز یہ کہ سماع فی نفسہ حسن ہے اس میں اپنی اصل کے لحاظ سے ذرا بھی قباحت نہیں ہے۔کیوں کہ سماع سے ارواح کو خوراک اور اجسام کو حرکت حاصل ہوتی ہے۔جیسا کہ حضرت ابوعلی دقاق نے بھی فرمایا ہے کہ سماع اہل معرفت کی ارواح کے لیے لطیف ترین غذا ہے۔(۲) لیکن اس کا حکم سننے والوں کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔پس جو شخص سماع کو حق پر محمول کرے گا اس کے لیے سماع سننا حق ہےاور جو شخص سماع کو باطل پر محمول کرے گا اس کے سماع کا حکم بھی ویسا ہی ہوگا۔سماع درختوں سے بہنے والی ان ہواؤں کی طرح ہے جو باغیچوں سے گزرتی ہیں تو مشام جاں کو فرحت وسرور عطا کرتی ہیں۔لیکن جب ان کا گزر کسی گندگی کے ڈھیر سے ہوتا ہےتو مشام کو بے انتہا تکلیف پہنچتی ہے۔پس سننے والوں کی استعداد کے مطابق احتیاط برتنا چاہیے۔

اسی لیے شیخ [ابوعلی دقاق] فرماتے ہیں کہ ”سماع سننے والے تین طرح کے ہیں: متسمّع، مستمع اور سامع۔ متسمّع وہ ہے جو وقت کے ساتھ سنتا ہے۔مستمع وہ ہے جو حال کے ساتھ سنتا ہے۔سامع وہ ہے جو حق کے ساتھ سنتا ہے۔“(۳) متسمع سماع سنتا ہےتو تواجد پایا جاتا ہے۔مستمع جب سماع سنتا ہےتو اس سے وجد کا ظہور ہوتا ہےاور جب سامع سماع سنتا ہےتو اس پر وجودی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔تفصیل آئندہ فصل میں ملاحظہ فرمائیں!

---

(۱) قوت القلوب، دارالتراث، ص:۱۰۹۰

(۲) یہ عبارت الرسالۃ القشیریۃ میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے: وقیل: السماع لطف غذاء الأرواح لأهل المعرفة (الرسالة القشيرية: ۵۰۹) مطابع مؤسسة دار الشعب، ۱۹۸۹

(۳) رسالہ قشیریہ میں یہ قول حضرت ابوعلی دقاق کی طرف منسوب ہے۔ملاحظہ فرمائیں: الرسالۃ للقشیریۃ (۲/ ۵۱۸)

فصل دہم: تواجد کی حقیقت کا بیان

تواجد وہ موزون حرکت ہے جو غلبہ سماع کے وقت سننے والے سے بلا اختیار صادر ہو جاتی ہے۔ یہ ایک مستحسن چیز ہے۔ اس لیے کہ تواجد سے دل میں وجد پیدا ہوتا ہے اور وجد سے محبوب کے وجود کا احساس حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے اس موقف کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ ایک موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ نے تواجد کو ''لعب'' پر محمول کیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یا معاویۃ لیس بکریم من لم یھتز عند ذکر الحبیب (۱)

اے معاویہ! وہ شخص کریم نہیں ہے جس کے اندر محبوب کا ذکر سن کر حرکت پیدا نہ ہو۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے تواجد کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالی نے عالم ارواح میں روحوں سے میثاق لیتے ہوئے فرمایا تھا: **ألست بربکم**۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ارواح نے جب یہ کلام سنا تو اس کی حلاوت وشیرینی سے خوب خوب حظ اٹھایا۔ پس لوگ جب کبھی سماع سنتے ہیں تو کلام الٰہی کی وہی پرانی یاد ان کے اندر تحریک پیدا کر دیتی ہے۔ (۲) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سماع سن کر جسم پر حرکت طاری ہو جانا کوئی قابل انکار چیز نہیں ہے۔ اس لیے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہ سے بھی یہ فعل ثابت ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ سے فرمایا: **أنت منی وأنا منک فحجل**۔ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ حضرت علی نے جیسے ہی یہ سنا آپ ایک خاص انداز میں رقص کرنے لگے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالی عنہ سے فرمایا: **أشبھت خَلقی وخُلقی فحجل**۔ تم ظاہری شکل وشباہت اور اخلاق میں میری طرح ہو۔ حضرت جعفر نے جب یہ سنا تو آپ بھی خوشی سے رقص کرنے لگے۔

روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ تعالی عنہ سے فرمایا: **أنت أخونا ومولانا فحجل**۔ تم ہمارے بھائی اور محبوب ہو۔ حضرت زید نے جب یہ فرمان نبوی سنا تو خوشی سے رقص کرنے لگے۔ (۳) احادیث مذکورہ میں جس ''**تحجیل**'' کا ذکر کیا گیا ہے یہ اسی وقت صادر ہوتی ہے جب انسان

---

(۱) عوارف المعارف، دار المعارف (۳۶/۲)

(۲) الرسالۃ القشیریۃ (۵۰۹/۲)

(۳) مسند احمد بن حنبل (ح: ۸۵۷) بہ الفاظ: **عن علي قال: أتيت النبي - صلى الله عليه وسلم - وجعفر وزيد، قال: فقال لزيد: أنت مولاي، فحجل! قال: وقال لجعفر: أنت أشبهت خلقي وخلقي، قال: فحجل وراء زيد! قال لي: أنت مني وأنا منك، قال: فحجلت وراء جعفر!**۔ اس حدیث کی اسنادی حیثیت بیان کرتے ہوئے مسند احمد بن حنبل کے محقق علامہ احمد شاکر نے کہا ہے: **إسناده صحيح**۔ حدیث مذکور کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ لیکن امام بخاری کی روایت میں ''**فحجل**'' کا اضافہ نہیں ہے۔ نیز اس میں ''أنت مولای'' کی جگہ ''أنت أخونا ومولانا'' مرقوم ہے۔ (صحیح البخاری: ۲۶۹۹)

خوشی کے کیفیت سے سرشار ہوجاتا ہے۔(۱) یہ عمل روح کی صفت ہے جیسا کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔قلب کے اندر اسی کی وجہ سے حرکت پیدا ہوتی ہے۔

جب روح کے اندر حرکت پیدا ہوتی ہے تو قالب پر بھی اس کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جب نغمہ سن کر روح متحرک ہوتی تو چونکہ قالب روح کے ماتحت ہے لہٰذا نغمے کی موزونیت کے باعث صاحب وجد سے بھی موزون حرکات صادر ہونے لگتی ہیں۔ اس پر انکار نہیں کیا جا سکتا؛ اس لیے کہ یہ تمام حرکات متواجد سے بلا اختیار صادر ہوتی ہیں۔

تواجد اور رقص: واضح رہے کہ تواجد اور رقص دو مختلف چیزیں ہیں۔رقص ان حرکات کو کہا جاتا ہے جو بطور تصنع بالاختیار صادر ہوتی ہیں۔ یہ سفہا کا عمل ہے جسے وہ خواہشات نفسانی سے مغلوب ہو کر انجام دیتے ہیں۔ یہ بالاتفاق حرام ہے۔رہا تواجد تو اس کی حرکات اختلاف حال سے مختلف ہوتی ہیں۔

متواجد سے صادر ہونے والی حرکت کبھی تو ''کرب'' یعنی شدت حال پر مبنی ہوتی ہے۔اس صورت میں متواجد کی حرکت ذبح کیے جا رہے جانور کی حرکت کے مشابہ ہوتی ہے۔کبھی متواجد کی حرکت ''طلب'' پر مبنی ہوتی ہے۔اس صورت میں متواجد کی حرکت اس مچھلی کی حرکت کے مانند ہوتی ہے جو ساحل سے سمندر کو دیکھ لیتی ہے۔ کبھی متواجد کی حرکت ''طرب'' یعنی مسرت قلبی پر مبنی ہوتی ہے۔اس صورت میں متواجد کی حرکت اس پروانے کے مثل ہوتی ہے جو روشنی کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ پس ''کرب'' نفس سے، ''طلب'' قلب سے اور ''طرب'' روح سے تعلق رکھتا ہے۔وجد کی وجہ سے نفس فنا ہوتا ہے۔قلب منازل سلوک طے کرتا ہے اور روح بہت ساری خوبیوں کی حامل ہوجاتی ہے۔

بر بنائے وجد وشوق حرکت وجنبش صادر ہوجانا اہل کمال کا خاصہ ہے۔جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے اس وقت حرکت وجنبش صادر ہوگئی تھی جب آپ نے محبت والفت سے لبریز اس قصیدے کو سماعت فرمایا:

قد لسعت حية الهوى كبدى
فلا طبيب له ولا راقى
الا الحبيب الذى شغفت به
فعنده رقيتى وترياقى

---

(۱) حدیث مذکور میں وارد لفظ ''حجل'' کی تفسیر کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں: وحجل بفتح المهملة وكسر الجيم أي وقف على رجل واحدة وهو الرقص بهيئة مخصوصة. ترجمہ: لفظ ''حَجِل'' میں حاء مفتوح اور جیم مکسور ہے۔اس کا معنی ہے ''وہ ایک پیر پر کھڑا ہوا''۔ یہ ایک مخصوص ہیئت کے ساتھ کیا جانے والا رقص ہے۔ فتح الباري از ابن حجر: ۷/ ۵۰۷۔علامہ زرادی نے اسے باب تفعیل سے قرار دیا ہے۔از روئے لغت ان کی بات بھی درست ہے۔لغت میں یہ فعل باب سمع اور باب تفعیل دونوں سے مستعمل ملتا ہے۔

(۱) محبت کے سانپ نے میرے جگر کو ڈس لیا ہے۔کوئی بھی طبیب یا جھاڑ پھونک کرنے والا اس کا علاج نہیں کر سکتا۔

(۲) میرا علاج تو میرا محبوب ہی کر سکتا ہے جس کی محبت میں، میں مغلوب ہو چکا ہوں۔اسی کے دست شفا میں میرا تریاق اور علاج ہے۔

یہ اشعار سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر پر اس قدر حرکت طاری ہوئی کہ آپ کی چادر مبارک آپ کے شانے سے نیچے آ گئی۔(۱)

تواجد چونکہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے لہٰذا وہ فی نفسہ محمود ہے۔اگر چہ ظاہری طور پر''لعب''معلوم ہوتا ہے۔جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ نے کہا بھی تھا: **ما احسن لعبک یا رسول اللہ**۔یارسول اللہ! آپ کا''لعب'' کتنا بہترین ہے۔چنانچہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا شبہہ دور کرنے کے لیے اسی موقع پر ان کی اس بات کی تردید کر دی تھی۔جیسا کہ ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں۔

تواجد کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔تواجد اپنے ظاہر کے لحاظ سے نظر آ رہی حرکات کا مجموعہ ہے۔لیکن اپنے باطن کے اعتبار سے سراسر نظر نہ آنے والا غلبۂ شوق ہے۔

پس جو لوگ محض ظاہری شکل وصورت میں الجھ کر رہ جاتے ہیں انہیں تواجد ایک غیر سنجیدہ عمل معلوم ہوتا ہے۔اس لیے کہ ان کی نظر باطنی غلبہ شوق تک نہیں پہنچ پاتی۔وہ لوگ تو صرف ظاہری حرکات کو دیکھتے ہیں،لیکن جو لوگ ارباب باطن ہوا کرتے ہیں انہیں تواجد سراسر ایک سنجیدہ عمل معلوم ہوتا ہے۔کیوں کہ وہ خود مشاہدہ باطنی میں مغلوب ہوتے ہیں اور ان کی نظر محض ظاہری حرکات تک محدود نہیں ہوتی۔

مذکورہ بالا مسند حدیث جو بلاشبہہ ایک صحیح حدیث ہے،اس میں ان دونوں حالتوں کو بیان کر دیا گیا ہے۔

اس حدیث کی صحت کے سلسلہ میں صاحب عوارف المعارف نے تردد کا اظہار کیا ہے۔ان کے اس تردد کی وجہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ کا تواجد کو''لعب'' سے تعبیر کر دینا ہے۔

صاحب عوارف المعارف ایک ذاکر اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر گزار بزرگ تھے۔رات دن اپنے ظاہر و باطن میں اللہ کو یاد کیا کرتے تھے۔اپنے مقام ومرتبے کے لحاظ سے اللہ کے منتخب فرشتوں سے قریب تھے۔لیکن ان تمام خوبیوں کے باوصف آپ عاشقانہ احوال اور غلبہ سماع کا ذوق نہیں رکھتے تھے۔اس لیے کہ ان دونوں چیزوں کے درمیان ایسا تلازم نہیں ہے کہ ایک کے بغیر دوسری نہ پائی جائے۔بالکل اسی طرح کی بات

---

(۱) یہ پوری روایت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی نے عوارف المعارف میں اپنی سند کے ساتھ نقل کی ہے۔البتہ اس روایت کو لکھ کر آپ نے اپنا خلجان بھی ظاہر کر دیا ہے۔چناں چہ فرماتے ہیں: **ویخالج سری أنه غیر صحیح، ولم أجد فیه ذوق اجتماع النبی صلی اللہ علیه وسلم مع أصحابه۔۔۔ویأبی القلب قبوله، واللہ اعلم بذلک** (عوارف المعارف: ۱۲۳، دارالکتب العلمیة)

ہمارے شیخ حضرت نظام الحق والدین نے فوائد الفواد میں عارف باللہ شیخ نجم الدین قدس اللہ سرہما کے حوالے سے ذکر کی ہے۔ نجم الدین کبریٰ فرماتے ہیں:

شوق اور سماع کے علاوہ ہر وہ نعمت جو کسی بشر کے پاس پائی جاسکتی ہے وہ ہمارے اس عزیز بھائی (شیخ سہروردی) کے پاس موجود ہے۔ البتہ یہ دونوں نعمتیں محویت اور عبادت میں حد درجہ مشغولیت کے باعث ان کے پاس نہیں ہیں۔(۱)

پس اگر صاحب عوارف کو اس حدیث کی صحت کے سلسلہ میں تردد لاحق ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب عوارف اس قسم کے احوال کا ذوق نہیں رکھتے۔ چنانچہ انہوں نے حدیث کے سلسلہ میں اپنے تردد کا اظہار کر دیا۔ ورنہ تو خود حضرت ابو طالب مکی نے اس روایت کو قوت القلوب میں درج کیا ہے۔ صاحب قوت القلوب نہ صرف یہ کہ عہد رسالت سے زیادہ قریب ہیں بلکہ سنن وآثار اور ان کی صحت سے بھی زیادہ واقف ہیں۔(۲) فافہم

خاتمہ

یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں کر لیں کہ مسئلہ سماع مذکورہ گروہوں کے درمیان (شروع ہی سے) مختلف فیہ ہے، جیسا کہ ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ چنانچہ اباحت سماع کو کسی مخصوص زمانے کے ساتھ مقید قرار دینا درست نہیں ہے۔ نیز یہ کہ اباحت وحرمت دو ایسی چیزیں ہیں جو صرف وحی سے ثابت ہوتی ہیں اور نبی کریم ﷺ کے بعد وحی کا نزول ناممکن ہے۔

پس منکر علیہ مایستحقّہ- اسے وہ ملے جس کا وہ مستحق ہے- کے لیے یہ کہنا کیوں کر درست ہوسکتا ہے کہ سماع زمانہ سلف میں تو مباح تھا، مگر چونکہ ہمارے زمانے میں اس کے اہل مفقود ہیں لہٰذا اب حرام ہے۔ اتنی بڑی بات چونکہ وحی کے بغیر نہیں کہی جاسکتی، لہٰذا ایسی بات زبان سے نکالنا وحی اور اطلاع غیب کا دعوی کرنا ہے جو بالاتفاق کفر ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ قائل کا یہ قول ضلالت وگمراہی پر مبنی ہے۔ ایسی بات وہی کہہ سکتا ہے جو بدعتی اور گمراہ ہو۔

ہماری اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں اور ایسے دعووں سے اجتناب کریں اور اس رسالے کا انصاف کی نظر سے مطالعہ کریں تاکہ مسئلہ سماع کے متعلق جو اختلافات پیدا ہوگئے ہیں ان میں کمی آسکے۔ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبر اور ان کی طیب وطاہر آل کے طفیل آپ کو اور ہمیں سلف صالحین کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔

---

(۱) فوائد الفواد، ج:۱، مجلس:۳۱

(۲) قوت القلوب میں یہ روایت ہمیں نہیں ملی۔

کتابیات

۱۔القرآن الکریم

۲۔احیاء العلوم، ابوحامد محمد بن محمد غزالی (۵۰۵ھ) دار المعرفۃ، بیروت

۳۔اخبار الاخیار مترجم، عبد الحق محدث دہلوی (۱۰۵۲) ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی

۴۔البیان فی مذہب الامام الشافعی، ابوالحسین یحی شافعی (۵۵۸ھ) دار المنہاج، جدہ

۵۔التہذیب فی فقہ الامام الشافعی، ابو محمد حسین مسعود بغوی (۵۵۶ھ) دار الکتب العلمیہ، بیروت

۶۔الشمائل المحمدیۃ، محمد بن عیسی ترمذی (۲۷۹ھ) المکتبۃ التجاریۃ، مکہ مکرمہ

۷۔الفردوس بماثور الخطاب، شیرویہ بن شہردار دیلمی (۵۰۹ھ) دار الکتب العلمیۃ، بیروت

۸۔المغنی عن حمل الاسفار، حافظ زین الدین عراقی (۸۰۶ھ)، دار ابن حزم، بیروت

۹۔جامع بیان العلم وفضلہ، ابن عبد البر قرطبی (۴۶۳ھ) دار ابن الجوزی، دمام، سعودی عرب

۱۰۔دلائل النبوۃ، ابوبکر بیہقی (۴۵۸ھ) دار الکتب العلمیۃ، بیروت

۱۱۔سنن ابن ماجہ، ابن ماجہ، محمد بن یزید قزوینی (۲۷۳ھ) دار احیاء الکتب العربیۃ

۱۲۔سنن ابی داؤد، ابوداؤد سجستانی (۲۷۵ھ) المکتبۃ العصریۃ، بیروت

۱۳۔سنن ترمذی، محمد بن عیسی ترمذی (۲۷۹ھ) مطبع مصطفی البابی، مصر

۱۴۔سنن نسائی، ابوعبد الرحمن نسائی (۳۰۳ھ) مکتبۃ المطبوعات الاسلامیۃ، حلب، شام

۱۵۔سیرت ابن ہشام، عبد الملک بن ہشام (۲۱۳ھ) شرکۃ الطباعۃ الفنیۃ

۱۶۔سیر الاولیا، فارسی مخطوطہ، امیر خورد کرمانی (۵۲۷ھ) ناشر: خواجہ حسن ثانی نظامی، نئی دہلی

۱۷۔سیر الاولیا مترجم، امیر خورد کرمانی (۵۲۷ھ) ناشر: خواجہ حسن ثانی نظامی، نئی دہلی

۱۸۔صحیح ابن حبان، محمد بن بستان بستی (۳۵۴ھ) مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت

۱۹۔صحیح البخاری، محمد بن اسماعیل بخاری (۲۵۶ھ) دار طوق النجاۃ، بیروت

۲۰۔عوارف المعارف، شہاب الدین سہروردی (۶۳۲ھ) دار المعارف، قاہرہ

۲۱۔فتح الباري، ابن حجر عسقلانی شافعی (۸۵۲ھ) دار المعرفۃ، بیروت

۲۲۔قوت القلوب، ابوطالب مکی (۳۸۶ھ) دار الکتب العلمیۃ، بیروت

۲۳۔قوت القلوب، ابوطالب مکی (۳۸۶ھ) مکتبہ دار التراث، قاہرہ

۲۴۔مسند احمد بن حنبل، احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) دار الحدیث، قاہرہ، مصر

۲۵۔مسند بزار، ابوبکر احمد بزار (۲۹۲ھ) مکتبۃ العلوم والحکم، مدینہ منورہ

۲۶۔معجم کبیر، ابوالقاسم طبرانی (۳۶۰ھ) مکتبہ ابن تیمیہ، قاہرہ، مصر

○○○

ڈاکٹر عارف نوشاہی

سِیَرالاولیاء

تنقیدی و تحقیقی تدوین واشاعت کی ضرورت

میر خُرد کرمانی کی **سیر الاولیاء**، متقدم مشائخ چشتیہ بالخصوص خواجہ نظام الدین اولیاء (۶۳۶-۷۲۵ھ) کے حالات وملفوظات پر ایک مستند، معیاری اور قدیم ماخذ ہے جو تا حال کسی محقق تدوین اور اشاعت سے محروم چلا آ رہا ہے۔ اس مضمون کا بنیادی مقصد اہل تحقیق کو اس اہم کتاب کے دستیاب مخطوطات کی نشان دہی کرنا اور انھیں موجودہ معیارات کے مطابق اس کی تنقیدی و تحقیقی تدوین وترتیب کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ ضمنی طور پر مصنف اور اس کے خاندان کے مختصر حالات بھی درج کیے گئے ہیں۔

مصنف: سید مبارک عرف میر خرد کرمانی

مصنف کا اصل نام محمد اور لقب ''میر خُرد'' یا ''امیر خُرد'' تھا۔ ان کے والد، نورالدین مبارک بن محمد تھے۔ مصنف کے دادا محمد بن محمود اپنے وقت کے بزرگوں اور سادات علوی سے تھے۔ وہ اپنے وطن کرمان (ایران) سے تجارت کی غرض سے لاہور آئے اور وہاں سے اجودھن جا کر حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر (م: ۶۶۴ھ) کی قدم بوسی کی۔ وہاں سے پھر لاہور واپس آئے اور ملتان جا کر اپنے چچا سید احمد کرمانی کے ہاں قیام کیا۔ محمد بن محمود کرمانی کا کئی سال تک یہی معمول رہا۔ وہ کرمان سے لاہور آتے، اجودھن جاتے اور وہاں سے ملتان چلے جاتے اور کچھ عرصہ ان شہروں میں قیام کرتے۔ اس آمد و رفت میں وہ بابا فرید گنج شکر سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ کرمان میں اپنی خاندانی جائداد اور تجارت چھوڑ دی اور بابا صاحب کے مرید ہو کر یادِ حق میں مشغول ہو گئے۔ بابا صاحب کی وفات کے بعد، وہ خواجہ نظام الدین اولیا کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے حلقۂ یاران میں داخل ہوئے۔ محمد بن محمود کرمانی کی وفات ۷۱۱ھ/ ۱۲-۱۳۱۱ء میں ہوئی اور وہ دہلی میں جوار روضۂ خواجہ نظام الدین میں چبوترۂ یاران میں آسودۂ خاک ہیں۔

خود مصنف دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں انھیں خواجہ نظام الدین اولیا سے بیعت کروا دیا گیا۔ وہ شیخ کی محافل اور مجالس میں شرکت کرتے تھے۔ ان کی روحانی تربیت میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (۷۵۷ھ) کا بھی حصہ ہے اور وہ ان کی خدمت میں بھی جاتے رہے ہیں۔ مصنف کا ۷۷۰ھ/ ۶۹-۱۳۶۸ء میں انتقال ہوا اور وہ دہلی میں روضہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے جوار میں دفن ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی نے **نظامی بنسری** میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے جوار میں مدفونین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بری کے گنبد کے پاس ایک غار کے اندر سید محمد کرمانی اور ان کے صاحبزادوں اور پوتوں کے مزارات ہیں جہاں انھوں نے کتبے لگوا دیے ہیں۔ (ص ۱۵۸)

مصنف نے اپنے خاندان، بھائیوں، ایک بیٹے اور چچا زادوں کے بعض واقعات موقع محل کی مناسبت سے کتاب میں درج کیے ہیں۔ **سیر الاولیاء** کے باب سوم کے ''نکتۂ ششم'' میں خصوصیت کے ساتھ یہ معلومات ملتی ہیں۔ مصنف کے اپنے حالات بھی جستہ جستہ، بین السطور مل جاتے ہیں جنھیں کتاب سے نکال کر مصنف کا زندگی نامہ ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے یہی کام کیا ہے اور اپنی کتاب **دبستان نظام** کے باب پنجم میں مصنف کے جامع حالات اور **سیر الاولیاء** پر ایک سیر حاصل تبصرہ لکھا ہے۔ اگرچہ فرخی صاحب کا اسلوب ادبی اور انداز داستان گوئی کا ہے لیکن کوئی بات غیر مستند نہیں ہے۔

سیر الاولیاء کے علاوہ، ہمیں اس مصنف کی کسی دوسری تصنیف کا علم نہیں ہے اور شائد انھوں نے کوئی کتاب تصنیف کی بھی نہیں ہے۔ کم از کم **سیر الاولیاء** سے پہلے اگر کچھ تصنیف کیا ہوتا تو کسی بہانے اس کا ذکر ضرور **سیر الاولیاء** میں لاتے۔ مصنف شاعر طبع تھے اور **سیر الاولیاء** میں انھوں نے جابجا اپنے فارسی اور چند عربی اشعار داخل کیے ہیں۔ پروفیسر معین نظامی اور عظمیٰ عزیز خان نے یہ اشعار وہاں سے الگ کر کے **سلطان عشق** کے نام سے مرتب اور اردو ترجمہ کیے ہیں۔ ۱۰۳ صفحات کی ضخامت کا یہ مجموعۂ کلام، ۲۰۰۸ء میں مسند علی ہجویری اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

کتاب: سیر الاولیاء

یہ کتاب، جس کا پورا نام **سیر الاولیاء فی محبت الحق جلّ وعلا** ہے، مصنف نے پچاس سال کی عمر میں تصنیف کی۔ لیکن مصنف کا سال ولادت معلوم نہ ہونے کے باعث تاریخ تصنیف کا تعین مشکل ہے۔ ایک جگہ ضمناً یہ لکھا ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء کی وفات کو تیس سے کچھ اوپر سال گذر چکے ہیں (ص: ۲۵۱ طبع اسلام آباد)۔ چونکہ حضرت خواجہ کی وفات ۷۲۵ھ میں ہوئی تھی، لہذا اس واقعہ کا اندراج ۷۵۵ھ سے بعد کا ہی ہوسکتا ہے۔ دوسرا اس میں خواجہ نصیر الدین محمود کی تاریخ وفات (۱۸ رمضان المبارک ۷۵۷ھ) کا ذکر ہوا ہے (ص: ۲۵۲، طبع اسلام آباد) لامحالہ یہ کتاب اس کے بعد ہی تصنیف ہوئی ہے۔ مصنف نے اسے دس ابواب پر تقسیم کیا ہے جن میں

سلسلہ ٔچشتیہ کے متقدم مشائخ کے حالات ہیں تاہم کتاب کا غالب حصہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے حالات و فرمودات سے متعلق ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں مسائل تصوف بھی بیان ہوئے ہیں۔

سیرالاولیاء کا فارسی متن اب تک چار بار چھپ چکا ہے:

۱۔ ۱۸۶۰ء، دہلی۔ مجھے اس ایڈیشن کی تفصیل نہیں ملی۔ پروفیسر عبدالعزیز ساحر نے اس کا ذکر بغیر ماخذ کے کیا ہے۔

۲۔ شعبان ۱۳۰۲ھ/مئی ۱۸۸۵ء، مطبع محب ہند، دہلی، بہ اہتمام چرنجی لال جینی رئیس قدیم محلہ درگاہ خواجہ نظام الدین اولیاء، سنگی چھاپہ ہے۔ ابتدا میں ناشر کا دیباچہ اور فہرست مضامین کے ۱۰ صفحات الگ ہیں۔ اس کے بعد کتاب کا متن شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۵۹۲ پر ختم ہوجاتا ہے۔ یہ اشاعت، **سیرالاولیاء** کے ایک قلمی نسخے مکتوبہ ۱۷ شعبان ۱۲۱۸ھ پر مبنی ہے جس کے کاتب شیخ بدرالاسلام فخری نظامی تھے اور انھوں نے یہ نسخہ میاں جان محمد کی فرمائش پر کتابت کیا تھا۔ میاں جان محمد شاہ علی حکیم بن شاہ حامد بن شاہ کلیم اللہ کے مریدوں سے تھے۔ کاتب ، شیخ بدرالاسلام نے اپنے منقول عنہ نسخے سے **سیرالاولیاء** کے ایک قلمی نسخے کی گم شدگی، بازیافت، اس سے مزید نقل کی تیاری اور تقابل کی روداد بھی نقل کی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ سید محمد حسن بن سید فضل اللہ کا مرقومہ ایک بہت پرانا نسخہ سید عبداللہ بن سید خیر اللہ کے خاندان میں چلا آرہا تھا۔ نسخے کے کاتب اور اس کے مالک سید عبداللہ، خواجہ سید ابابکر کی اولاد سے ہیں جو خواجہ نظام الدین اولیا کے بلاواسطہ ہمشیرہ زاد تھے۔ یہ نسخہ کسی وجہ سے کتب خانے سے گم ہوگیا، لیکن کچھ عرصے کے بعد محض اتفاق سے بازار میں ایک کتب فروش سے بازیافت ہوگیا اور اسے منہ مانگی قیمت دے کر واپس لے لیا گیا۔ سید عبداللہ نے اس نسخے سے شیخ نور محمد نقشبندی سے ایک اور نقل تیار کروائی کیونکہ شیخ نور محمد فارسی نثر و نظم کے محاورے سے واقف تھے اور نستعلیق خط صاف لکھ لیتے تھے، چنانچہ انھوں نے بخط جلی اس کی نقل شروع کر دی۔ [خواجہ حسن نظامی نے **نظامی بنسری** میں لکھا ہے کہ چرنجی لال کے نسخے کی صحت میرزا مظہر جان جاناں کے مرشد سید نور محمد بدایونی نقشبندی نے کی تھی] اسی دوران ایک صاحب حبیب اللہ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کاش ان کے پاس بھی **سیرالاولیاء** کا کوئی نسخہ ہوتا۔ اتفاق سے انھیں بازار سے ایک نسخہ مل گیا، لیکن یہ بہت بدخط اور غلطیوں سے بھرا تھا۔ حبیب اللہ نے سید عبداللہ سے بات کی کہ وہ اپنے نسخے کا ان کے نسخے کے ساتھ تقابل و تصحیح کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ رمضان ۱۱۵۰ھ میں تقابل شروع کیا گیا۔ اس دوران مختلف مالکوں سے **سیرالاولیاء** کے ۹ نسخے جمع ہوگئے جو سب کے سب مغلوط تھے، کیا عربی اور کیا فارسی عبارتیں، کچھ بھی صحیح نہ تھا۔ اشعار اور احادیث میں بہت غلطیاں تھی۔ ان کی تصحیح کی گئی اور دو صحیح المتن نسخے تیار ہوگئے۔ ایک سید عبداللہ کا اور دوسرا حبیب اللہ کا۔ یہ پوری رُوداد دہلی ایڈیشن کے صفحہ ۵۹۳ تا ۵۹۶ اور اسلام آباد ایڈیشن کے صفحہ ۶۰۳ تا ۶۰۶ موجود ہے۔

اس ایڈیشن کے ابتدا میں چرنجی لال کا یکم مئی ۱۸۸۵ء کا نوشتہ، دو صفحے کا فارسی مقدمہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھیں ایک عرصے سے خواہش تھی کہ خواجہ نظام الدین اولیاء کی سوانح عمری معرض تحریر میں لائی جائے۔ ملکہ وکٹوریہ کہ ۴۷ ویں سنہ جلوس (۱۸۸۴ء) میں انھوں نے سید شاہ ظہور علی قاضی زادہ درگاہ خواجہ نظام الدین سے **سیر الاولیاء** کا ایک قدیم نسخہ قیمت ادا کر کے خریدا۔ خاص اس کتاب کی اشاعت کی خاطر چرنجی لال نے فیض بازار دہلی میں ایک مطبع ''فیض ہند'' قائم کیا۔ ایک کاتب سید عبداللطیف ساکن سبزی منڈی (دہلی) کو کتابت کے لیے ملازم رکھا جس نے اس کتاب کی کاپیاں کتابت کیں۔ تصحیح و مقابلہ کے لیے یکے بعد دیگرے کئی مولوی اور منشی حضرات مقرر کیے گئے۔ خود چرنجی لال نے بھی کتابت شدہ کاپیوں کے پروف پڑھے۔ چرنجی لال کو سید ظہور علی سے جو پرانا نسخہ ملا تھا اس پر شیخ فخر الدین نظامی چشتی دہلوی کا دستخط بھی تھا اور وہ بہت درست نسخہ تھا۔ لیکن نسخہ چھپنے کے بعد کچھ اور مآخذ سے مزید باتیں معلوم ہوئیں جنھیں علیحدہ پرچیوں پر طبع کر کے کتاب کے متعلقہ مقامات پر چسپاں کیا گیا۔ اصل نسخے میں چند مقامات پر سقم بھی تھا لیکن وہ بعینہٖ رہنے دیا گیا تا کہ ناشر پر الحاق و تحریف کا الزام نہ لگے۔ چرنجی لال نے اس اشاعت میں جو، جو اہتمام کیا وہ یہ ہے:

الف: بعض عربی عبارات کا فارسی ترجمہ کروا کر داخل کیا؛

ب: ادق الفاظ کے معانی حاشیے پر درج کیے؛

ج: بزرگوں اور جگہوں کے نام جلی قلم سے لکھوائے؛

د: یاے معروف اور یاے مجہول کا امتیاز روا رکھا؛

ہ: نون غنہ کی بھی رعایت کی گئی اور نقطہ نہیں ڈالا گیا؛

و: ابتدا میں فہرست مضامین تیار کروا کر لگائی گئی؛

ز: کتاب بخط نستعلیق کتابت کروا کر اس کے دو چھاپے نکالے۔ ایک سری رامپوری قیمتی اور سفید کاغذ پر، دوسرا موٹے ولایتی کاغذ پر۔ اس پورے کام پر آٹھ ماہ کا عرصہ اور زر کثیر صرف ہوا۔

چرنجی لال کے اس ایڈیشن کے بارے میں فیروز الدین احمد فریدی کی رائے ہے: ''اس مطبوعہ ایڈیشن کے نہ صرف بعض فقروں بلکہ کئی پورے صفحات کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہرگز امیر خرد کرمانی کی تحریر نہیں بلکہ بعد میں ہونے والے اضافے ہیں۔۔۔ یہ اضافی فقرے یا صفحات صرف عوام الناس میں ہی نہیں بلکہ کئی فاضل مورخین اور محققین کی نظروں میں بھی امیر خرد کرمانی کی تحریر اور **سیر الاولیاء** کا جزء سمجھے جاتے رہے ہیں۔ یہ امیر خرد کرمانی پر ظلم ہے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اس ظلم کی نشان دہی کر دی جائے۔'' اس کے بعد انھوں نے ایشیاٹک سوسائٹی کولکتہ کے مخطوطے کی مدد سے چند مثالوں سے ان الحاقات اور اضافات کی نشان دہی کی ہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی **سیر الاولیاء** (دہلی، عکسی اشاعت ۲۰۱۰ء) کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ ان کے والد خواجہ حسن نظامی نے اس نسخہ (چرنجی لال کا نسخہ؟) کو دوبار چھاپا ہے۔لیکن راقم الحروف ان اشاعتوں کی تفصیل سے بے خبر ہے۔

چار مختلف مترجمین (غلام احمد بریان، اعجاز الحق قدوسی، عبداللطیف، نامعلوم) نے چرنجی لال ایڈیشن کی بنیاد پر **سیر الاولیاء** کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ تراجم بار بار شائع ہوتے رہے ہیں۔ان کی تفصیل پروفیسر ساحر نے دی ہے۔

۳۔ ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء میں، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد اور مؤسسہ انتشارات اسلامی [اسلامک بُک فاونڈیشن]، لاہور نے باہمی اشتراک سے دہلی ایڈیشن کی عکسی اشاعت کا اہتمام کیا۔اس اشاعت پر راقم السطور نے فارسی زبان میں چار صفحات کا دیباچہ لکھا، جس میں مصنف کے مختصر حالات، کتاب کا چند سطری تعارف اور اس کے دستیاب پانچ مخطوطات کے کوائف ہیں۔

۴۔ نومبر ۲۰۱۰ء، بہ اہتمام خواجہ حسن ثانی نظامی، درگاہ خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی، ۸۱۹+۱۷۷ صفحات۔ یہ دراصل نیشنل میوزیم، دہلی میں محفوظ **سیر الاولیاء** کے ایک مخطوطے کی ہو بہو عکسی اشاعت ''**سیر الاولیاء قدیم فارسی نسخہ**'' عنوان سے ہوئی ہے۔اس اشاعت پر چار صفحات پر مشتمل خواجہ حسن ثانی نظامی کی ''گزارشات'' ہے، جسے اردو سے ہندی اسلوب کی نامرغوب فارسی میں پروفیسر شعیب اعظمی نے ترجمہ کیا ہے۔اس کے بعد ص ۵ تا ۱۷۷ ''اقتباس نظامی بنسری'' از خواجہ حسن نظامی بطور اردو مقدمہ لگایا گیا ہے۔اس میں خواجہ نظام الدین اولیا سے متعلق **سیر الاولیاء** سے مستفاد بہت سی معلومات اور مواد آ گیا ہے۔کتاب کے ناشر نے ایک بات کا دھیان نہیں رکھا۔قلمی نسخوں میں رکابہ ہمیشہ جُفت صفحے پر ہوتا ہے، دہلی میوزیم کے نسخے میں بھی ایسا ہی ہے۔لیکن زیر بحث اشاعت میں کاپیاں جڑواتے وقت، مخطوطے کے رکابے والے صفحات کو طاق صفحات پر رکھ دیا گیا ہے۔دوسری بات یہ کہ مخطوطات پر عرض دیدے کی یادداشتیں ہمیشہ نسخے کے سرورق (ظَہر) پر لکھی جاتی ہیں۔دہلی میوزیم کے نسخے پر تحریر عرض دیدے کی یادداشتیں جو یقیناً سرورق پر تھیں، کتاب کے اختتامی صفحہ (819) پر چھاپی گئی ہیں۔یہ بھی خلافِ قاعدہ ہے۔ناشر نے اس اشاعت میں فہرست مضامین/ ابواب لگانے کی زحمت نہیں کی!

☆☆☆

متذکرۃ الصدر اشاعتوں میں سے کوئی بھی **سیر الاولیاء** کے علمی، عرفانی اور ادبی مرتبے کے شایان شان نہیں ہے۔راقم نے اس کی اوّلین اشاعت (۱۸۶۰ء) نہیں دیکھی۔لیکن دوسری اور تیسری اشاعت (جسے اشاعت ِواحد کہنا چاہیے) پرانی طرز کی اشاعت ہے جس میں نہ پیراگراف بندی ہے، نہ رموزِ اوقاف سے کام لیا گیا ہے۔ایک متن ہے جو اول تا آخر پیہم نقل ہوتا چلا گیا ہے۔اسی طرح چوتھی اشاعت (۲۰۱۰ء) بھی محقق اشاعت نہیں ہے، بلکہ بجائے خود ایک قلمی نسخہ ہے۔

سیر الاولیاء کے جو دو اردو ترجمے دستیاب ہیں (غلام احمد بریاں اور اعجاز الحق قدوسی) وہ بھی چرنجی لال ایڈیشن پر مبنی ہیں۔مولانا قدوسی اس ایڈیشن میں کم از کم اشعار کی غلط نویسی سے متنبہ کرتے ہیں۔

سیر الاولیاء کی تاریخ چشتیہ میں جو اہمیت ہے، وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کتاب کو مروّجہ اصول تحقیق کے مطابق تدوین کر کے شائع کیا جائے۔قدیم نسخوں کو بنیاد بنا کر ایک درست متن تیار ہو۔اس پر عالمانہ مقدمہ لکھا جائے جس میں مصنف کے حالات، کتاب کی اہمیت، بالخصوص معاصر چشتیہ مآخذ کے درمیان اس کی وجہ امتیاز، اور کتاب کے مآخذ پر سیر حاصل گفتگو کی جائے۔متن میں جو وضاحت طلب امور ہیں، ان کی بطور تعلیقات وضاحت کی جائے۔آیات و احادیث اور اشعار کی تخریج ہونی چاہیے۔مفید اشاریے بنائے جائیں۔

۱۸۸۵ء میں جب چرنجی لال **سیر الاولیاء** چھاپ رہے تھے تو ان کے پاس ایک ہی قلمی نسخہ تھا۔اب گذشتہ سو سال، سوا سو سال میں **سیر الاولیاء** کے متعدد نسخے دریافت ہو چکے ہیں اور کسی بھی قابل محقق کے لیے اس کی تدوین اور تقابل و تصحیح کا کام سہل ہو گیا ہے۔ چرنجی لال کی اشاعت کے بعد سے **سیر الاولیاء** کی محقق اشاعت کا خیال ہمیشہ سے دردمندوں کے دل میں رہا ہے۔خواجہ حسن نظامی کے والد سید عاشق علی نظامی تو چرنجی لال کی اشاعت پر باقاعدہ روئے اور شرمندگی سے موت کی تمنا کرتے رہے۔ کہتے تھے جو کام ان کے کرنے کے تھا وہ ایک ہندو کر گزرا۔خواجہ حسن نظامی نے بھی اعلان کیا تھا کہ **نظامی بنسری** کی اشاعت کے بعد، بہت جلد **سیر الاولیاء** کا اصل فارسی متن اردو ترجمے سمیت بہت صحت اور صفائی کے ساتھ شائع کر دیا جائے گا۔لیکن اس کی اشاعت میں اُس زمانے میں کاغذ کی نایابی اور گرانی آڑے آئی۔خواجہ حسن نظامی کے فرزند خواجہ حسن ثانی کو بھی اپنے باپ دادا کی طرح **سیر الاولیاء** کی محقق اشاعت کا خیال تھا۔انھوں نے پچاس سال کی محنت سے **سیر الاولیاء** کے چھ نسخے بھی جمع کر لیے،لیکن وہ گلہ کرتے ہیں کہ انھیں تصوف کا مذاق رکھنے والے فارسی دان دانشور، میسر نہ آ سکے جو تصحیح و مقابلہ کا کام کرتے۔آخر کار انھوں نے ایک قدیم قلمی نسخے کی ہو بہو عکسی اشاعت کو غنیمت جانا۔

۱۹۹۷ء کے لگ بھگ، پروفیسر ڈاکٹر ساجد اللہ تفہیمی، استاد شعبۂ فارسی، جامعہ کراچی نے کراچی یونیورسٹی کو **سیر الاولیاء** کی تدوین کا منصوبہ پیش کر کے مالی اعانت حاصل کی اور کام شروع کیا۔دہلی اشاعت کے علاوہ، دو خطی نسخے (تفصیل نامعلوم) ان کے پیش نظر تھے۔آدھا کام کر چکے تھے کہ ۲۰۰۱ء میں ملازمت سے سبک دوشی کا وقت آن پہنچا۔کام مکمل نہ ہو سکا اور مالی اعانت واپس کر دی گئی۔ جتنے حصے پر تفہیمی صاحب کام کر چکے ہیں وہ اسی وقت ٹائپ ہو گیا تھا۔بقیہ کام ان کی علالت، دیگر مصروفیات، ترجیحات، نسخوں کے مقابلے اور پروف خوانی کے لیے کسی اہل شخص کی عدم دستیابی کے باعث رُکا پڑا ہے اور مشکل ہے کہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔اب جب کہ **سیر الاولیاء** کے قدیم تر متعدد قلمی نسخے دسترس میں ہیں، بہتر یہی ہو گا ان کی بنیاد پر از سرِ نو تدوین کا کام کیا جائے۔

☆☆☆

سیر الاولیاء کے مخطوطات

راقم السطور کے علم میں جو نسخے آئے ہیں، انھیں تاریخ وار یہاں متعارف کروایا جاتا ہے۔ پہلے مکمل نسخوں کا ذکر ہے، بعد میں نامکمل نسخوں کا۔ مکمل نسخوں سے مراد ایسے نسخے ہیں جو کاتب کے قلم سے بطور مکمل متن نقل ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے کچھ نسخوں کے اول و آخر یا درمیان سے کچھ اوراق مرورِ زمانہ سے ضائع ہو چکے ہیں۔ نامکمل نسخوں سے مراد ایسے نسخے ہیں جو بطور انتخاب یا ناقص نقل ہوئے ہیں۔

الف: مکمل نسخے

۱۔ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، شمارہ ۹۹، مکتوبہ ۱۲ جلوس اکبر بادشاہ (مطابق ۹۷۴ھ)، ۴۵۱ ورق۔

۲۔ سنٹرل لائبریری پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ PfII38/2031، یہ نسخہ راقم السطور نے دیکھا ہے۔ ابتدائی حصہ، ورق ۳۳۲ تک قدیم خط میں ہے، قیاساً نویں یا دسویں صدی ہجری کا خط ہے۔ اس کے بعد ورق ۳۳۹ تک جدید خط میں قادر بخش کاتب راجندر پریس پٹیالہ کے ہاتھوں تکمیل ہوئی ہے۔ اس کا خط نستعلیق بہت شاندار اور خوب صورت ہے۔ پہلے صفحے پر لوح بھی ہے اور اولین دو صفحات منقش ہیں۔ ظہر یہ پر شمسہ بنایا گیا ہے جس کے اندر کتاب کا نام **سیر الاولیاء** مرقوم ہے۔ یہ نسخہ کسی زمانے میں دیوان صاحب [نام ندارد] نے ملا محمد افضل لاہوری کو پیش کیا تھا۔ مجموعی طور پر قابل توجہ نسخہ ہے۔

۳۔ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کولکتہ، شمارہ D218، ۳۶۰ ورق، یہ نسخہ شروع اور درمیان سے ناقص ہے۔ ایوانف: 243 نے اس کی تاریخ کتابت ۱۰۴۰ھ، بقلم عبدالوہاب بن شہاب قنوجی بتائی ہے، لیکن اس نسخہ کے آخر میں سلاطین دہلی کی تاریخ پر مشتمل ایک ضمیمہ ہے جو فیروز شاہ تغلق کی وفات (۷۸۹ھ) کی خبر پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے اختتام پر تاریخ کتابت ۲۰ رمضان ''یک ہزار یزدہ [کذا] سال از ہجرت'' درج ہے جسے ۱۰۱۱ھ پڑھا جا سکتا ہے لیکن ایوانف نے ۱۰۱۳ھ لکھا ہے۔ اس کے بعد چند صفحات پر مشتمل نعمت اللہ نوری کی تحریر ہے جس میں وہ کہتے ہیں انھیں جب **سیر الاولیاء** میں سلطان المشائخ کے اجداد میں سے خواجہ علی الحسینی البخاری اور سلطان المشائخ کے جدّ مادری خواجہ عرب الحسینی البخاری کا شجرہ نظر نہ آیا تو انھوں نے اپنے اجداد بزرگوار خواجہ عرب کے شجرے کا اضافہ کر دیا۔ اس اضافہ کی تاریخ ۴ جمادی الاولی ۱۰۴۰ھ ہے جسے ایوانف نے پورے مخطوطے کی تاریخ کتابت کے طور پر پیش کیا ہے۔ فیروز الدین احمد فریدی نے اسی الحاق پر بحث کی ہے۔

۴۔ نیشنل میوزیم، دہلی، تاریخ کتابت نہیں ہے۔ لیکن اس نسخے پر عرض دیدہ کی یادداشتیں ہیں جس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نسخہ کسی شاہی یا نوابی کتب خانے میں رہ چکا ہے۔ ان یادداشتوں کے ساتھ ایک مہر بھی ثبت ہے جو عکس میں پڑھی نہیں جا سکتی۔ یادداشتیں بھی مشکل سے پڑھی جاتی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ ۱۴ صفر سنہ ۳، جمع محمد میر۔

۲۔سیر الاولیاء، کاغذ۔۔۔کرمخوردہ معہ جلد، واقعہ ۱۴ محرم سنہ احد

۳۔۲۱ ذی القعدہ سنہ ۳ عرض دیدہ شد

۴۔سیر الاولیا ۱۹ رمضان سنہ ۱۰۶۸۔۔۔مقرر شد۔۔۔

۵۔بتاریخ ۲ شہر شوال سنہ ۴ جلوس والا۔۔۔مقرر شد۔۔۔

ان یادداشتوں میں جن سنہ جلوس کا ذکر آیا ہے وہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہو سکتے ہیں۔اورنگ زیب ۱۰۶۸ھ میں تخت نشین ہوا تھا اور یہ نسخہ اس سے پہلے کا کتابت شدہ ہے۔نسخہ بے حد واضح، خوش خط نسخ میں ہے اور آسانی سے قرائت کیا جاسکتا ہے۔یہی وہ نسخہ ہے جو بہ اہتمام خواجہ حسن ثانی نظامی، دہلی سے ۲۰۱۰ء میں عکسی شائع ہوا، جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔انھوں نے اس نسخے کی عمر ۶۲۰ سال لکھی ہے۔معلوم نہیں اس تخمین کی بنیاد کیا ہے؟

۵۔نیشنل لائبریری آف پاکستان، اسلام آباد، شمارۂ فہرست ۳۲، مکتوبہ شوال ۱۰۷۷ھ، بہ قلم عنایت ولد سید فضیل، بمقام اجمیر، ۲۵۷ ورق، یہ نسخہ پہلے پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، لاہور کے ذاتی کتب خانے میں رہ چکا ہے۔

۶۔برٹش لائبریری، لندن، ذخیرہ انڈیا آفس، دہلی کلیکشن، شمارہ D.P.668، مکتوبہ ۱۰۹۳ھ، عمدہ صاف نستعلیق، ۳۰۲ ورق، نسخہ کے اختتام پر ایک یادداشت میں بتایا گیا ہے کہ یہ نسخہ شیخ بولاقی بن شیخ آبرو محمد، ۲۴ محرّم ۱۰۹۷ھ کو نسخے کے کاتب، اسد اللہ بیگ سے لائے تھے۔شیخ بولاقی کی مہر بھی ظہریہ پر ثبت ہے جس میں سال ۱۰۹۶ھ کندہ ہے۔

۷۔نیشنل میوزیم آف پاکستان، کراچی، شمارہ N.M.1963-261، تاریخ کتابت اور کاتب کا نام نہیں ہے، قیاساً گیارہویں صدی ہجری، خوش خط نستعلیق، جدولیں، لوح، ۳۳۷ ورق۔راقم السطور نے ۱۹۷۸-۷۹ء میں جب میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست نگاری کی تو یہ مخطوطہ مجھے دستیاب نہیں ہوا تھا۔میرے پیشرو فہرست نگار محمد اشرف مرحوم نے اسے دیکھا تھا اور اپنی انگریزی فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۸۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری، جواہر میوزیم کلیکشن، شمارہ: جواہر فارسیہ ۳۸۸، مکتوبہ ۲۱ رمضان ۳۰ جلوس محمد شاہ عالم (ثانی؟، مطابق ۱۱۰۳ھ)، ۲۷۲ ورق۔

۹۔سنٹرل لائبریری پنجاب یونیورسٹی، لاہور، شمارہ PpfII3A، یہ نسخہ راقم السطور نے دیکھا ہے۔اس پر مکمل تاریخ کتابت درج تھی لیکن اس پر مُہر لگنے کی وجہ سے اب تاریخ پڑھی نہیں جاتی۔حاشیے پر تاریخ کتابت ۱۱۴۴ھ درج ہے۔مکتوبہ محمد برہان ولد میاں ملا سلیمان، قوم نیلگر، ساکن قصبہ قبولہ، درقریہ سعد اللہ پور باغبان۔۳۴۶ ورق، یہ خوش خط نستعلیق میں صاف ستھرا نسخہ ہے۔عربی عبارات خط نسخ میں ہیں۔اشخاص کے اسما شنگرفی روشنائی میں ہیں۔گویا پورے اہتمام سے لکھا گیا ہے۔نسخہ دو حصوں میں مجلد ہے۔نسخے پر ''محمد حسین بن مولوی سیف الرحمان صدیقی مہی ۱۳۲۴ھ'' عبارت کی مُہر ثبت ہے۔یہ پیرزادہ محمد حسین عارف (۱۸۵۶-

۱۹۲۸ء) ہیں جو دہلی میں سیشن جج تھے۔ان کا ذخیرۂ مخطوطات، ۱۹۲۹ء میں پنجاب یونیورسٹی نے خرید لیا تھا۔یہ نسخہ اسی ذخیرے کا ہے۔پیرزادہ محمد حسین **سیر الاولیاء** کے بہت مدّاح تھے اور کہتے تھے کہ میر خرد اور مولانا جامی دو ایسے مصنفین ہیں جو واقعات لکھنے میں بوجہ عقیدت کسی جانب داری سے کام نہیں لیتے ۔یہ بات خواجہ حسن نظامی نے **نظامی بنسری** میں لکھی ہے۔

۱۰۔خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، شمارہ ۶۱۷۰، بارہویں صدی ہجری، نستعلیق، ۱۴۳ ورق۔

۱۱۔مملوکہ حسن علی مرحوم، محلہ رنگ پورہ، سیالکوٹ، مکتوبہ ۱۲۰۳ھ، بقلم محمد عبادت بن حبیب احمد، نستعلیق، ۳۰۵ ورق۔

۱۲۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری، یونیورسٹی کلیکشن، شمارہ: فارسیہ اخبار ۲۶/۴، مکتوبہ ۲۱ ذیقعدہ ۱۲۱۰ھ، بقلم میر مظفر علی، معمولی نستعلیق، ۲۵۰ ورق۔

۱۳۔کتابخانۂ آستان قدس رضوی، مشہد، شمارہ ۶۵۷۴۳، مکتوبہ ۹ محرّم ۱۲۲۹ھ، بمقام شاہ جہان آباد، کشمیری کاغذ، ۳۲۲ ورق۔

۱۴۔ بنارس ہندو یونیورسٹی لائبریری، واراناسی، شمارہ 73y7، مکتوبہ (۷-۱۲۳۶-۳ھ) ۲۲-۱۸۲۱ء، اس کے ساتھ **فوائد الفواد** کا نسخہ بھی ہے، ۲۸۸ ورق۔

۱۵۔کتب خانہ درگاہ عالیہ چشتیہ، احمد آباد گجرات، مکتوبہ ۱۲۸۸ھ بمقام حیدرآباد، ۲۴۳ ورق۔اس نسخے کی مائیکروفلم، مرکز میکروفیلم نور ایران- ہند، دہلی میں بشمارہ ۱۳۵ محفوظ ہے۔

۱۶۔مملوکہ مولانا غلام فرید، چشتیاں، ضلع بہاول نگر، پاکستان، مکتوبہ ۱۲۸۸ھ، بقلم قطب الدین بن جلال بن نظام الدین فضلی، نستعلیق، ۲۷۷ ورق۔

۱۷۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری، سلیمان کلیکشن، شمارہ: فارسیہ ۶/۲۰۹، مکتوبہ ۱۴ ربیع الثانی ۱۲۹۷ھ، بقلم سید محمد قاسم علی، معمولی نستعلیق، ۳۱۸ ورق۔

ب: نامکمل نسخے

۱۸۔برٹش لائبریری، لندن، شمارہ Or.1746، مکتوبہ تقریباً ۱۸۵۰ء (۱۲۶۶ھ)

۱۹۔ اسٹیٹ گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری، حیدرآباد، (سابقہ کتب خانہ آصفیہ)، شمارہ 939، مکتوبہ ۱۲۷۷ھ، صرف باب نہم ہے۔

۲۰۔قومی کتب خانہ، برلن، شمارہ 586، باب پنجم ناقص الآخر اور باب ششم کا کچھ حصہ ہے۔

احمد منزوی نے **فہرستوارۂ کتاب ہای فارسی** میں ''کشمیر یونیورسٹیہ ۹۱'' لکھ کر **سیر الاولیاء** کے ایک نسخے کی طرف اشارہ کیا ہے۔فہرستوارہ کے مآخذ میں کہیں ''کشمیر یونیورسٹیہ'' نہیں ہے بلکہ ''کشمیر تحقیق'' ہے جس سے

مراد فہرست **نسخہ ہای خطی کتابخانہ شعبۂ تحقیق و اشاعت کشمیر** (مطبوعہ دہلی، ۱۹۸۶ء) ہے، لیکن اس میں کہیں **سیر الاولیاء** کے نسخے کا ذکر نہیں ہے۔اسی طرح غلام رسول بٹ کی مرتبہ **فہرست مخطوطات ریسرچ لائبریری شعبہ عربی فارسی مخطوطات سنٹر اف سنٹرل ایشین اسٹڈیز کشمیر یونیورسٹی** (مطبوعہ سری نگر، ۱۹۸۹ء) میں بھی **سیر الاولیاء** کا ذکر نہیں ہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی **سیر الاولیاء** (دہلی، ۲۰۱۰ء عکسی اشاعت) کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے پچاس سال کی محنت سے **سیر الاولیاء** کے چھ نسخے جمع کیے۔لیکن انھوں نے ان نسخوں کی کیفیت نہیں لکھی۔صرف یہ لکھا ہے کہ ان کا باہم جا بجا اختلاف ہے۔راقم السطور مارچ ۱۹۸۸ء میں، دہلی میں خواجہ حسن ثانی نظامی مرحوم کے لطفِ خاص سے ان کا چند شب کے لیے مہمان بنا تھا۔مخطوطات سے میری دل چسپی کو جان کر وہ اندرون خانہ سے اپنے مملوکہ قلمی نسخے نکال کر مہمان خانے میں لائے اور مجھے دکھائے (جن کا ذکر میں نے اپنی کتاب **سیہ بر سفید**، مطبوعہ تہران، ۲۰۱۱ء ص ۱۵۶-۱۵۸ کیا ہے)۔ان میں کوئی نسخہ **سیر الاولیاء** کا نہ تھا۔ممکن ہے جو چھ نسخے انھوں نے جمع کیے تھے وہ اصل کی بجائے عکسی ہوں۔واللہ اعلم۔

☆☆☆

مآخذ و مراجع و مواد برائے مزید مطالعہ

احمد منزوی، **فہرستوارۂ کتاب ہای فارسی**، تہران، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، ۱۳۶۷ شمسی، ج ۳، ص ۲۱۸۶

احمد منزوی، **فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان**، اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، ۱۹۹۰ء، ج ۱۱، ص ۸۰۵-۸۰۶

اسلم فرخی، **دبستان نظام**، لاہور، پاکستان رائٹرز کواپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۷ء، طبع دوم، ص ۳۸۷-۴۳۳

اعجاز الحق قدوسی (مترجم سیر الاولیاء)، ''امیر خورد مصنف سیر الاولیا ء کے سوانح''، بطور مقدمہ، **سیر الاولیاء**، اردو ترجمہ، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۶ء طبع چہارم، ص ۳۵-۴۷

امجد علی، **فہرست مخطوطات مولانا آزاد لائبریری**، علی گڑھ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۱۹ء، ج ۱، ص ۳۶۰

امیر خُرد کرمانی، محمد بن مبارک، **سیر الاولیاء**، اسلام آباد / لاہور، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان و مؤسسہ انتشارات اسلامی، ۱۹۷۸ء، مختلف صفحات، بالخصوص صفحات ۲۱۸-۲۱۹

بشیر حسین، محمد، **فہرست مخطوطات شفیع**، لاہور، دانشگاہ پنجاب، ۱۹۷۲ء، ص ۹۴-۹۵

حسن ثانی نظامی، خواجہ، ''گزارشات''، فارسی ترجمہ شعیب اعظمی، در **سیر الاولیاء قدیم فارسی نسخہ**، دہلی، ناشر خواجہ حسن ثانی نظامی، ۲۰۱۰ء ص ۱-۴

حسن نظامی، خواجہ، ''اقتباس نظامی بنسری'' در **سیر الاولیاء قدیم فارسی نسخہ**، دہلی، ناشر خواجہ حسن ثانی نظامی، ۲۰۱۰ء ص ۵-۱۷

ساجد اللہ تفہیمی کے ساتھ عارف نوشاہی کا بذریعہ ٹیلی فون مکالمہ، کراچی، مورخہ ۱۷ جنوری ۲۰۲۰ء

ظفیر الدین، محمد، **تعارف مخطوطات کتب خانہ دارالعلوم دیوبند**، شائع کردہ دارالعلوم دیوبند، ۱۹۷۳ء، ج ۲، ص ۵۱ - ۵۲

عارف نوشاہی، ''پیشگفتار در احوال و آثار سید محمد بن مبارک کرمانی''، **سیر الاولیاء**، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان و مؤسسہ انتشارات اسلامی، لاہور، ۱۹۷۸ء

عارف نوشاہی، **فہرست نسخہ ہای خطی فارسی کتابخانۂ مرکزی دانشگاہ پنجاب لاہور (پاکستان)**، تہران، مرکز پژوہشی میراث مکتوب، ۲۰۱۲ء، ج ا، ص ۵۵۶ - ۵۵۷

عارف نوشاہی، **فہرست نسخہ ہای خطی فارسی موزۂ ملی پاکستان کراچی**، اسلام آباد، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ۱۹۸۳ء، ص ۲۸۷

عبد الحق محدّث دہلوی، **اخبار الاخیار فی اسرار الابرار**، تصحیح و توضیح علیم اشرف خان، تہران، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸۷ - ۱۸۸

عبد العزیز ساحر، ''چشتی ملفوظات: کتابیاتی فہرست''، **تصفیہ**، کاکوری، جلد ۵، شمارہ ۱ - ۲، جنوری - دسمبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۷ ۴ - ۴ ۷ ۴

عتیق الرحمان، محمد، **مرآۃ العلوم**، پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۲۰۱۰ء، ج ۵، ص ۸۶

عطا خورشید، تحریری اطلاعات متعلقہ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ بذریعہ واٹس اپ

غلام سرور لاہوری، مفتی، **خزینۃ الاصفیاء**، کان پور، مطبع منشی نول کشور، نومبر ۱۹۱۴ء، ج ا، ص ۳۶۶

فیروز الدین احمد فریدی، ''سیر الاولیا''، **معارف**، اعظم گڑھ، ج ۱۸۲، شمارہ ۴، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۹۰ - ۳۰۵

محمد اقبال مجددی، ''تقدیم''، **سیر الاولیاء** تالیف سید محمد بن مبارک کرمانی ''میر خورد''، اردو ترجمہ غلام احمد بریاں، لاہور، الکتاب، ۱۹۷۸ء (بلا صفحہ شمار)

محمد اقبال مجددی، ''امیر خرد''، در **دانشنامہ زبان و ادب فارسی در شبہ قارہ**، زیر نظر فرہنگستان زبان و ادب فارسی، تہران، فرہنگستان زبان و ادب فارسی، ۲۰۰۵ء، ج ا، ص ۶۰۷ - ۶۰۸

محمود حسن قیصر امروہوی، **مرآۃ التصوف (تصوف پر اہم مخطوطات کی جزوی فہرست)**، زیر نگرانی سید محمد حسین رضوی، علی گڑھ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۳

مرکز میکروفیلم نور ایران - ہند، ''**فہرست میکروفیلم نسخہ ہای خطی فارسی و عربی کتابخانہ درگاہ عالیہ چشتیہ احمد آباد**''، در **فہرست میکروفیلم نسخہ ہای خطی عربی و فارسی کتابخانہ ہای گجرات**، دہلی، مرکز میکروفیلم نور ایران - ہند، ۲۰۰۱ء، ص ۸۷

مسعود فریامنش، ''سیر الاولیا'' در **دانشنامہ زبان و ادب فارسی در شبہ قارہ**، زیر نظر محمد رضا نصیری، تہران، فرہنگستان زبان وادب فارسی، ۲۰۱۶ء، ج ۴، ص ۱۳۷-۱۳۹

مصطفی درایتی، **فہرستگان نسخہ ہای خطی ایران (فنخا)**، تہران، سازمان اسناد و کتابخانہ ملی جمہوری اسلامی ایران، ۱۳۹۱ش، ج ۱۸، ص ۵۹۶

معین نظامی و عظمیٰ عزیز خان، ''پیش لفظ'' **سلطان عشق** (فارسی کلام سید محمد بن مبارک کرمانی)، مرتبہ معین نظامی و عظمی عزیز خان، لاہور، مسند علی ہجویری اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء، ص ۷-۱۵

فہرست آصفیہ، ج ۱، ص ۴۴۴

–Amrit Lal Ishrat, *A Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts in the Banaras Hindu Unviersity Library*, Banaras Hindu Unviersity,Varanasi, n.d. p.150

–Ivanow, Wiladimir, *Concise Descriptive Catalogue of the Persian manuscripts in the collection of the Asiatic Society of Bengal*, Calcutta, 1985 reprint.pp.86-87

–Muhammad Ashraf, *Persian Manuscripts in the National Museum of Pakistan at Karachi*, Karachi, 1971, p.192

–Storey,C.A. *Persian Literature: A bio-bibliographical Survey*, London, Luzac & Company,1972,Vol.1.Part2,pp.941-944

http://www.bl.uk/manuscripts/Viewer.aspx?ref=mss_eur_e207!9_f127r



پس منظر

اصغرعلی مصباحی

ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کا ورود مسعود

ہندوستان ان مبارک ومسعود ملکوں میں سے ایک ہے جہاں اسلام پہلی صدی ہجری ہی میں آچکا تھا اور ۹۳ھ ہجری میں محمد بن قاسم نے سندھ سے ملتان تک اسلام کے دائرے کو وسیع کردیا تھا۔اس کے بعد ۴۱۷ ہجری میں سلطنت غزنویہ کی بنیاد ہندوستان میں قائم ہوئی اور ۵۸۲ ہجری تک اس سلطنت کے حکمراں ہندوستان کے علاقوں پر قابض رہے۔ پھر سلطان شہاب الدین محمد غوری (۶۰۲ھ) نے خسرو ملک کو ۵۸۲ ہجری میں گرفتار کر کے سلطنت غزنویہ کا خاتمہ کردیا اور ہندوستان کے اکثر حصوں پر قبضہ کر کے ۵۸۹ ہجری میں دہلی کو اسلامی دارالسلطنت میں تبدیل کردیا۔اب باضابطہ ہندوستان میں اسلامی شعائر وقوانین کا نفاذ ہونے لگا اور مدارس و مساجد اور خانقاہیں قائم ہونے لگیں اور علما،صوفیہ اسلام کی دعوت وتبلیغ کرنے لگے۔

ہندوستان میں دورِ تصوف کا آغاز

تصوف کے بیشتر سلاسل ہندوستان کی فتح سے پہلے معرض وجود میں آچکے تھے۔لیکن متحدہ ہندوستان میں سب سے پہلے شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی جنیدی کے مرید وخلیفہ شیخ حسین زنجانی اوراس کے بعدان کے برادر طریقت حضرت شیخ علی بن عثمان معروف بہ داتا گنج بخش ہجویری (۴۶۵ھ) ۴۳۱ ہجری میں اپنے شیخ کے حکم پر غزنین سے لاہور تشریف لائے (۱)

آپ سے پہلے بھی چند صوفی بزرگ سرزمین ہندوستان تشریف لاچکے تھے لیکن انہوں نے باضابطہ صوفی روایت کا آغاز نہیں کیا، بلکہ یہ سعادت آپ کے حصے میں آئی اورآپ نے باضابطہ صوفی روایت کا آغاز فرمایا۔اس وقت ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی کا دور حکومت تھا لیکن آپ حکومت کی جانب توجہ کیے بغیر لوگوں کی اصلاح وتربیت میں لگے رہے۔آپ نے اپنی دعوت وتبلیغ کے ذریعے بہت سے غیر مسلموں

(۱) آپ حضرت شیخ ابوالحسن علی حضرمی کے مرید تھے جن کو حضرت شیخ ابوبکر شبلی سے ارادت تھی اور شیخ ابوبکر شبلی کو حضرت جنید سے بیعت تھی۔ بزم صوفیہ،ص:۱۹

کو دولت ایمان سے سرفراز کیا، بالخصوص تصوف کے اسرار ورموز سے لوگوں کو روشناس کیا، تصوف میں رواج پانے والے بہت سے غلط مراسم کی آپ نے اصلاح فرمائی اور قرآن وسنت سے مربوط کر کے مسائل تصوف کو اپنی مشہور زمانہ کتاب ''کشف المحجوب'' میں پیش کیا جو آج تصوف کی معتبر ومستند کتاب کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان مقبول ومعروف ہے۔ آپ نے پانچویں صدی ہجری میں ہندوستان کے اندر تصوف کی احیا وتجدید اور نشر واشاعت کی اور اسلام وتصوف کی روشنی کو لاہور کے اطراف واکناف میں پھیلایا۔

سلسلہ چشتیہ کا تعارف

سلسلۂ چشتیہ کے نویں امام وشیخ حضرت خواجہ ابواسحاق شامی چشتی (۳۲۹ھ) اصلاً تو شام کے رہنے والے تھے لیکن آپ نے چشت کو اپنی دعوت وتبلیغ کا مرکز بنایا۔ چشت افغانستان میں ایک مشہور شہر ہے۔ جس وقت آپ یہاں قیام پذیر تھے، اس وقت آپ کے دل میں مرید ہونے کا ارادہ پیدا ہوا، چنانچہ آپ چشت سے بغداد آئے اور حضرت شیخ ممشاد علو دینوری (۲۹۸ھ) کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے، شیخ نے آپ سے فرمایا:

چہ نام داری؟ گفت: ابواسحاق شامی، گفتند بعد ازیں ترا ابواسحاق چشتی گویند کہ شما خواجہ چشت ہستید واسلام چشت از شما است۔(۱) یعنی تمہارا کیا نام ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ابواسحاق شامی! شیخ نے فرمایا کہ اب تم کو ابواسحاق چشتی کہیں گے کہ تم چشت کے خواجہ ہو، تم ہی چشت میں اسلام پھیلاؤ گے۔ ''مرآۃ الاسرار'' میں اتنا اور اضافہ ہے کہ حضرت شیخ نے فرمایا ''جو لوگ آپ کے سلسلے میں داخل ہوں گے ان کو بھی قیامت تک لوگ چشتی کہیں گے(۲)۔ ابتدا میں چشتی کا اطلاق صرف پانچ حضراتِ مشائخ پر ہوا: اول حضرت خواجہ ابواسحاق چشتی - دوم حضرت خواجہ ابومحمد چشتی - سوم حضرت خواجہ محمد چشتی - چہارم حضرت خواجہ ابویوسف چشتی - پنجم حضرت خواجہ مودود چشتی (۳) لیکن اس کے بعد لفظ چشتی اس سلسلے کا عنوان بن گیا اور حضرت ابواسحاق شامی اس سلسلے کے بانی قرار پائے۔

ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کا ورود

سلسلۂ چشتیہ کے سب سے پہلے بزرگ جن کی سرزمین ہند تشریف آوری کی اطلاع ملتی ہے وہ خواجہ ناصح الدین ابومحمد بن ابواحمد چشتی (۴۱۱ھ) ہیں۔ آپ چوتھی صدی ہجری کے آواخر یا پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان تشریف لائے تھے لیکن آپ سے اس وقت اجراء سلسلہ کی کوئی روایت نہیں ملتی، بلکہ تقریباً پونے دوسو برس بعد جب حضرت خواجہ معین الدین اجمیری (۶۳۲ھ) چھٹی صدی ہجری میں اجمیر تشریف لائے تو اس سلسلے کا آغاز ہوا۔ آپ نے اس سلسلے کو بام عروج پر پہنچایا، اس لیے آپ کو سلسلہ چشت کا بانی ثانی کہا جاتا ہے۔

---

(۱) لطائف اشرفی، فارسی، حصہ اول، ص:۳۴۶

(۲) مرآۃ الاسرار، ص:۳۷۱

(۳) مرآۃ الاسرار، ص:۳۷۱

آپ کی ولادت ۵۳۵ ہجری میں سجستان/سیستان میں ہوئی، آپ کا پورا نام معین الدین حسن ہے۔آپ کی نشو ونما خراسان میں ہوئی۔جب آپ پندرہ سال کی عمر کو پہنچے تو والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔اس کے بعد ایک مجذوب سے ملاقات ہوئی جس کی نگاہِ کیمیا نے آپ کے دل کی دنیا بدل دی، چنانچہ آپ بخارا اور سمرقند پہنچے جہاں آپ نے قرآن مجید حفظ کیا اور علوم ظاہری کی تعلیم میں مشغول رہے۔سمرقند سے نکل کر عراق کی طرف روانہ ہوئے ،قصبہ ہارون میں حضرت شیخ عثمان ہارونی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔اخبار الاخیار میں ہے کہ آپ بیس سال تک شیخ ہارونی کی خدمت اور صحبت میں رہے اور سفر وحضر میں شیخ کا بستر اور دیگر چیزیں اٹھاتے۔(اخبار الاخیار، فارسی، ص: ۴۳)

آپ نے کثرت سے روحانی اسفار کیے۔جب آپ اپنے مرشد کے ساتھ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کو گئے تو آپ کو بارگاہ رسالت ﷺ کی جانب سے ہندوستان جانے کی بشارت ملی۔چنانچہ آپ اپنے مرشد سے جدا ہوئے اور سب سے پہلے سنجان آئے۔پھر مقام جبل پہنچے جہاں سے بغداد آئے۔وہاں سے چل کر ہمدان تشریف لائے۔پھر تبریز ہوتے ہوئے مہنہ آئے۔پھر خرقان، استرآباد، ہری، سبزوار، حصار اور بلخ ہوتے ہوئے غزنین پہنچے جہاں سے ہندوستان کا رخ کیا۔(بزم صوفیہ۔ص:۵۹ / ۶۰ بحوالہ سیر العارفین)

سرزمین ہندوستان میں سب سے پہلے لاہور تشریف لائے جہاں آپ نے داتا علی ہجویری کے مزار پر چند دن قیام فرما کر دہلی آئے اور پھر دہلی سے اجمیر پہنچے جہاں پر رائے پتھورا کی حکومت تھی۔امیر خورد نے آپ کے اجمیر وارد ہونے کی تفصیل لکھی ہے کہ ''حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا کہ جب حضرت شیخ معین الدین طاب اللہ مضجعہ اجمیر میں تشریف لائے، اس وقت پتھورا کا دارالسلطنت اجمیر میں تھا۔جب حضرت خواجہ معین الدین نے اجمیر میں سکونت اختیار کرلی تو پتھورا اور اس کے درباریوں کو یہ بات ناگوار گزری، لیکن جب انہوں نے شیخ کی عظمت وکرامت کو دیکھا تو ان میں مجال دم زدن نہ تھی۔الغرض ایک مسلمان جو حضرت شیخ معین الدین قدس سرہ العزیز کے وابستگان میں پتھورا کے پاس ملازم تھا، پتھورا نے اس مسلمان کو نہایت تکلیفیں پہنچانا شروع کیں۔اس مسلمان نے حضرت خواجہ معین الدین سے اس کی شکایت کی۔حضرت خواجہ معین الدین نے اس مسلمان کی سفارش پتھورا سے کی۔لیکن پتھورا پر آپ کے فرمانے کا کچھ اثر نہ ہوا، اور وہ اس ظلم سے باز نہ آیا، اس نے اپنے مصاحبوں سے کہا کہ یہ آدمی اس جگہ آیا ہے اور غیب کی باتیں بتاتا ہے اور ہم پر حکم چلاتا ہے۔جب اس کی یہ باتیں اس بادشاہ اسلام [خواجہ معین الدین] تک پہنچائی گئیں تو آپ کی زبانِ مبارک سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ ''پتھورا کو ہم نے زندہ گرفتار کر کے لشکر اسلام کے حوالے کر دیا ہے''۔اسی زمانے میں سلطان معز الدین سام [سلطان شہاب الدین غوری] انار اللہ برہانہ غزنی سے اجمیر پہنچا اور پتھورا کا مقابلہ لشکر اسلام سے ہوا، وہ سلطان معز الدین کے ہاتھوں زندہ گرفتار ہوا۔(سیر الاولیا،ص:۱۲۹)

حضرت خواجہ کی اجمیر آنے کی تاریخ

حضرت خواجہ قدس سرہ اجمیر کس سن میں تشریف لائے اس میں مؤرخین مختلف ہیں۔ خزینۃ الاصفیا اور تاریخ فرشتہ نے آپ کی آمد کی تاریخ ۱۰ رمحرم ۵۶۱ ہجری لکھی ہے اور سیر العارفین نے ۶۰۲ ہجری تحریر کیا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ۵۸۸ ہجری آپ کی تشریف آوری کی تاریخ لکھی ہے لیکن ان تمام مختلف روایتوں کا جائزہ لینے کے بعد علامہ وحید احمد مسعود نے تحقیق سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت خواجہ ۵۸۷ ہجری میں اجمیر تشریف لائے۔ یہی تاریخ میرے نزدیک بھی تحقیق کے زیادہ قریب ہے، آپ رقم طراز ہے: ''بہر حال تاریخی واقعات سے حضرت والا کے اجمیر تشریف لانے کے صحیح وقت اور سال کے متعلق تزک جہانگیری اور اکبر نامہ کا بیان مطابق واقعات ہو کر موزوں، واضح اور صحیح ہے کہ محمد غوری کی آمد سے پیشتر ۵۸۷ ھ میں تشریف لائے جب کہ اس نے قلعہ بھٹنڈہ فتح کرلیا تھا اور جب تراوڑی کی دونوں لڑائیاں ہوئیں تو حضرت والا اجمیر میں تشریف فرما تھے۔ بیرون ولایت نہ کہیں گئے اور نہ متعدد مرتبہ اجمیر آئے۔ اب صاف واضح ہے کہ سرزمین اجمیر کو حضرت والا کے قدوم میمنت لزوم کا شرف (۵۸۷ ھ مطابق ۹۲-۱۱۹۱ء) میں حاصل ہوا۔ اور اس کے بعد اگر اجمیر سے باہر گئے تو حدود ہند میں ہی گئے'' (سیرت خواجہ معین الدین چشتی، ص: ۱۱۳)

حضرت خواجہ کی آمد سے قبل اجمیر کے سیاسی حالات

جس وقت حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہ نے اجمیر میں قیام فرمایا اس وقت وہاں رائے پتھورا کی حکومت تھی۔ رائے پتھورا راجپوت گھرانے سے تھا۔ اس وقت اجمیر ہندوؤں کا مذہبی مرکز تھا، اس نے اجمیر کو سیاسی مرکز بنادیا تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ ''۵۸۷ ھ میں جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ پرتھوی راج نے ترائن (حال تلونڈی) کے مقام پر جو تھانیسر سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ایک منظم فوج کے ساتھ بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سلطان کو شکست فاش دی۔ اگلے سال ۵۸۸ ھ میں سلطان نے بڑی تیاری اور نئے عزم کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ دوبارہ حملہ کیا۔ پرتھوی راج تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی میدان میں لایا۔ ۱۵ راجپوت راجگان اپنی فوجوں کے ساتھ تھے، پرتھوی راج نے شکست کھائی۔ گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا۔ اس طرح سے راجپوتوں کی آزاد سلطنت اور ہندوستان کی قدیم فرمانروائی کا خاتمہ ہوا'' (تاریخ دعوت وعزیمت، ص: ۲۶ در حاشیہ)

سلطان الہند خواجہ غریب نواز کے دو ممتاز خلیفہ ہوئے۔ ایک حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی۔ آپ نے ان کو دہلی منتقل کیا، کیوں کہ آپ ہی کے زمانے میں اجمیر کی مرکزیت ختم ہوگئی تھی اور دہلی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنی دوراندیشی اور حکمت بالغہ کے پیش نظر حضرت خواجہ قطب صاحب کو دہلی روانہ فرمایا۔ اور دوسرے حضرت صوفی حمید الدین سوالی ناگوری۔ آپ نے ان کو ناگور کی ولایت عطا فرمائی۔

ناگور میں سلسلہ چشتیہ کا ارتقا

سلطان التارکین حضرت صوفی حمید الدین ناگوری علیہ الرحمہ کے توسط سے سلسلہ چشتیہ ناگور پہنچا۔ آپ کا نام محمد ابن احمد ابن محمد ہے اور لقب حمید الدین، سلطان التارکین، سوالی، صوفی، ناگوری ہے۔ آپ کی پیدائش دہلی میں ۵۸۹ھ میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد ماجد شیخ احمد ابن محمد لاہور سے دہلی تشریف لائے تھے، جو نہایت دین دار، پاک باز، متقی و پرہیز گار تھے۔

آپ کا سلسلۂ نسب حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ آپ کی والدہ حضرت بی بی خدیجہ حسینی سیدہ تھیں۔ آپ کی والدہ محترمہ بھی اپنے زمانے کی نہایت بزرگوار، صالح، نیک اور پاکباز خاتون تھیں۔ آپ نے اپنے استاذ مولانا شمس الدین حلوائی سے علوم شریعت وطریقت حاصل کیا۔ ان کے علاوہ آپ نے شیخ حمید الدین خوئی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے بھی استفادہ کیا، بلکہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے بعد جس شخصیت کو سب سے زیادہ خواجہ معین الدین چشتی سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا وہ آپ ہیں۔ آپ برسوں خواجہ صاحب کی خدمت میں رہے اور روحانی فیض اٹھاتے رہے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے آپ کو خرقہ خلافت عطا کیا۔

اگر آپ اپنے مرشد حضرت خواجہ صاحب کی وفات کے معاً بعد ناگور آ گئے ہوں گے تو گویا آپ نے ۴۰؍ سال ناگور میں سلسلہ چشتیہ کی آبیاری کی، اور مخلوقِ خدا کو خدا کا راستہ دیکھایا۔ آپ نے نہ صرف اپنے وعظ ونصیحت کے ذریعہ بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے جانے کا فریضہ انجام دیا بلکہ آپ نے اپنی تصنیف وتالیف کے ذریعے بھی لوگوں کی رشد وہدایت کا کام کیا۔ مرآۃ الاسرار میں ہے ’’سلسلہ چشتیہ میں سب سے پہلے بزرگ جنھوں نے ہندوستان میں حقائق ومعارف پر کتابیں لکھی ہیں، آپ ہیں‘‘ (مرآۃ الاسرار، ص:۶۷۸)

تصوف وسلوک، شریعت وطریقت تفسیر وحدیث فقہ اور علم الفرائض آپ کی دلچسپی کے خاص موضوعات تھے۔ آپ کی چند نگارشات جنھیں آج بھی علما وصوفیہ کے درمیان نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں: رسالہ اصول الطریقت، رسالہ چہار منزل، رسالۃ السماع، رسالۃ العشق، رسالہ آیات القرآن، رسالہ سوال وجواب، رسالۃ السلوک، فتاویٰ حمیدیہ، شرف الانوار اور فارسی زبان میں دیوان حمید کے نام سے آپ کا شعری مجموعہ بھی تھا۔

آپ کے خلفا میں شیخ عبداللہ، یاسین ترک، سید حیدر، نصیر الدین خوئی اور ابوبکر کھالی نہایت معروف ہیں۔ آپ ۲۹ ربیع الاول ۶۷۳ ہجری بروز پیر واصل بحق ہوئے۔ آپ کا مزار پرانوار راجستھان کے شہر ناگور میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔ آپ نے ۸۴؍ سال کی عمر پائی، جس میں سے ۴۰؍ سال آپ نے سلسلہ چشتیہ کی نشر واشاعت میں لگایا اور سرزمین ناگور میں سلسلہ چشتیہ کا ارتقا اور فروغ کا سہرا اپنے سر باندھا۔

دہلی میں سلسلہ چشتیہ کا ورود

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین نے اسلام کی دعوت وتبلیغ اور سلسلہ چشتیہ کی اشاعت کے لیے اپنے خاص خلیفہ حضرت قطب الدین بختیار کا کی اوشی کو دہلی روانہ کیا۔آپ کا نام بختیار، لقب قطب الدین اور عرف عام میں آپ کو لوگ خواجہ کا کی کہتے تھے۔آپ اوش میں پیدا ہوئے ۔آپ کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے تمام تذکرہ نگار خاموش ہیں جب کہ تاریخ وفات تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے ۶۳۳ ہجری تحریر کیا ہےاور صاحب مرآۃ الاسرار نے وفات کے وقت آپ کی کل عمر ۵۰ / ۵۲ / ۶۴ / ۷۵ رقم کیا ہے(۱) اور ساتھ ہی مرآۃ الاسرار میں یہ بھی درج ہے کہ آپ ۱۸ سال کی عمر میں مرید ہوئے (۲) اور آپ اپنے مرشد کے ساتھ ۵۸۷ھ میں ہندوستان آئے اور آپ کی وفات ۶۳۳ھ میں ہوئی ،اس لحاظ سے وفات کے وقت آپ کی کل عمر شریف ۶۴ درست معلوم ہوتی ہے ،اور اسی سے آپ کی تاریخ ولادت ۵۶۹ھ بھی متعین ہو جاتی ہے۔ ڈیڑھ سال کی عمر میں آپ کے والد محترم انتقال فرما گئے ،اس لیے آپ کی تعلیم وتربیت کا فریضہ آپ کی والدہ محترمہ نے انجام دیا۔آپ ظاہری و باطنی علوم سے جب فارغ ہوئے تو بغداد پہنچے۔سیر الاولیا میں ہے کہ ’’یہ بزرگ ماہ رجب ۵۲۲ھ (۱۱۲۸ء) کو مسجد امام ابو اللیث سمرقندی بغداد میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی ، شیخ اوحد الدین کرمانی، شیخ برہان الدین چشتی اور شیخ محمد صفاہانی کے سامنے حضرت خواجہ معین الدین سجزی کی بیعت سے مشرف ہوئے‘‘(۳)

اس کے بعد مختلف مقامات کی آپ نے سیر وسیاحت فرمائی اور بہت سے کبار مشائخ سے فیض یاب ہوئے۔ جب آپ کو پتہ چلا کہ خواجہ معین الدین حسن سجزی ہندستان تشریف لے گئے ہیں تو آپ نے بھی ہندوستان کا قصد کیا اور ملتان ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔دلیل العارفین کے مطابق آپ اپنے مرشد گرامی خواجہ معین الدین قدس سرہ کے ساتھ اجمیر پہنچے وہاں سے شیخ نے آپ کو دہلی بھیجا (۴) جب آپ دہلی آئے ،اس وقت وہاں کا بادشاہ سلطان شمس الدین التمش تھا۔اس کو بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی ۔اسے اگر کسی بزرگ کے بارے میں پتہ چلتا تو فوراً اس کی زیارت کرتا۔قطب صاحب کا بھی اس نے بہت ہی زیادہ اعزاز واکرام کیا اور آپ کے لیے اس نے دعوت وتبلیغ کی راہیں ہموار کیں ۔ چنانچہ دلیل العارفین کے مطابق آپ ۱۶ جمادی الاخری ۶۳۲ ہجری کو دہلی تشریف لائے (۵) اور آپ کی وفات ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ ہجری کو ہوئی ،اس لحاظ سے آپ نے وہاں تقریباً ۹ ر مہینے کی قلیل مدت میں

---

(۱) مرآۃ الاسرار،ص: ۶۹۴

(۲) مرآۃ الاسرار،ص: ۶۸۵

(۳) سیر الاولیا،ص: ۱۳۱، یہاں تاریخ بیعت ۵۲۲ھ کتابت کی غلطی ہے کیوں کہ خواجہ صاحب اس وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔

(۴) دلیل العارفین، فارسی،ص: ۵۵ / ۵۶

(۵) دلیل العارفین، فارسی،ص: ۵۶

سلسلہ چشتیہ کی خوب نشر و اشاعت کی ۔ اگر چہ آپ کے زمانے کے علمائے سو نے آپ کی دعوت وارشاد کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوششیں کیں لیکن اپنے پیرومرشد حضرت خواجہ غریب نواز کی تلقین وہدایت اور عنایات وتوجہ سے آپ دہلی میں صبر وضبط کے ساتھ اپنے مشن میں لگے رہے یہاں تک کہ ایک ایسا بھی وقت آیا کہ آپ کے پیہم دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں دہلی ہندوستان کا ایک روحانی مرکز بن گیا۔ لوگ قلبی و روحانی تسکین کے لیے دہلی کا رخ کرنے لگے۔ آپ کے بعد آپ کے خلفا نے اس امانت کو سنبھالا ۔ آپ کے ۹ / ۱۰ رخلفا ہوئے اور سب نے اپنی استطاعت بھر دعوت وتبلیغ کا کام کیا لیکن اس سلسلے میں آپ کے دو خلفا قابل ذکر ہیں:

۱۔ شیخ بدرالدین غزنوی ۲۔ بابا فریدالدین مسعود گنج شکر

شیخ بدرالدین غزنین کے رہنے والے تھے ۔ وہاں سے لاہور اور پھر لاہور سے دہلی آئے اور شیخ قطب الدین بختیار اوشی کی ارادت سے مشرف ہوئے (۱) آپ ایک بہترین واعظ تھے ۔ آپ کی مجلس میں اکابر اولیا اور علما شریک ہوا کرتے تھے ۔ آپ نے دہلی میں رہ کر اپنے مرشد کی وفات کے بعد حتی المقدور سلسلہ کی اشاعت اور دعوت وتبلیغ کا کام کیا لیکن سلطان شمس الدین التمش کے انتقال کے بعد دہلی کے حالات بد سے بدتر ہو گئے ۔ اس لیے سلسلہ کی نشر واشاعت کا کام تیزی کے ساتھ آگے نہ بڑھ سکا، لیکن آپ کے متعلق یہ کہنا کہ شیخ قطب صاحب کی وفات کے بعد امرا وسلاطین کی دعوتوں اور صحبتوں میں آپ اپنا وقت صرف کرنے لگے، اس لیے سلسلہ کی اشاعت کا کام نہ ہو سکا۔ یہ درست نہیں ہے جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس بات کو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کی جانب منسوب کر کے لکھا ہے کہ ''شیخ بدرالدین رحمہ اللہ نہایت ذی مرتبہ بزرگ تھے، لیکن قطب صاحب کے وصال کے بعد وہ دار السلطنت کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے ۔ ان کا زیادہ وقت دعوتوں اور امرا کی صحبتوں میں صرف ہونے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ہاتھوں سلسلہ کی نشوونما نہ ہو سکی بلکہ شیخ نظام الدین اولیا رحمہ اللہ کے سجادۂ مشیخت پر جلوہ افروز ہونے تک دہلی میں چشتیہ سلسلہ کا چراغ مدھم پڑ گیا۔ شیخ نظام الدین اولیا رحمہ اللہ نے ایک دن دبے الفاظ میں شیخ بدرالدین غزنوی کے متعلق فرمایا: ''شیخ بدرالدین سخت بزرگ بود فاما ہر گاہ کہ در شہر در آمد و بخلق مشغول شد کار او چگونہ پیش رود'' (تاریخ مشائخ چشت، ص: ۱۵۵/ ۱۵۶)

نظامی صاحب کا سلطان المشائخ کے مذکورہ جملے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ شیخ بدرالدین غزنوی امرا وسلاطین کی دعوتوں اور صحبتوں میں شرکت کی وجہ سے سلسلہ کی نشوونما کا کام نہ کر سکے تو یہ بالکل درست نہیں ہے کیوں کہ سلطان المشائخ نے اپنے مذکورہ جملے کے ذریعہ شیخ بدرالدین پر دبے لفظوں میں تنقید نہیں کی بلکہ واضح لفظوں میں شیخ کی مدح کی ہے۔ وہ اس لیے کہ صاحب سیر الاولیا نے سلطان المشائخ کا مذکورہ جملہ ''نکتہ دوم در بیان کرامت شیخ بدرالدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ'' کے تحت ذکر کیا ہے اور سلطان المشائخ شیخ بدرالدین کی خضر سے ملاقات کا ذکر فرما رہے ہیں اور

(۱) فوائد الفؤاد، ص: ۳۸۵ / ۳۸۷

ساتھ ہی یہ بھی فرما رہے ہیں کہ شیخ بدرالدین کی مجلس وعظ میں حضرت خضر علیہ السلام تشریف رکھتے تھے اور آپ نے ایک مرتبہ اپنے والد کی خواہش پر انہیں خضر علیہ السلام کو دکھانے کی کوشش بھی کی۔ اس کے بعد فرمایا:

''شیخ بدرالدین سخت بزرگ بود فاما ہر گاہکہ در شہر در آمد و بخلق مشغول شد کار او چگونہ پیش رود''

اس کے متصل ہی سلطان المشائخ کا یہ جملہ بھی مرقوم ہے:

''و نیز می فرمود اگر کسے بزرگے را بیند و باز غایب شود از نظر ایں قوت مہتر خضر را باشد'' (سیر الاولیا فارسی، ص:۱۶۶)

یعنی آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی کسی بزرگ کو دیکھے اور پھر وہ نظر سے اوجھل ہو جائے تو یہ عظیم قوت صرف خضر علیہ السلام کو حاصل ہے۔

لہٰذا سلطان المشائخ کے اس ارشاد ''شیخ بدرالدین سخت بزرگ بود فاما ہر گاہکہ در شہر در آمد و بخلق مشغول شد کارِ او چگونہ پیش رود'' کا مفہوم یہ ہے کہ شیخ بدرالدین بہت بڑے بزرگ تھے لیکن وہ شہر میں رہ کر جب خلق کے ساتھ مشغول ہوئے تو ان کی روحانی ترقی رک گئی۔ اس ارشاد کا مفہوم یہ ہرگز نہیں ہے کہ خلق کے ساتھ مشغولیت کی وجہ سے سلسلہ کا کام رک گیا جیسا کہ سیاق و سباق سے عیاں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کے زمانے میں سلسلہ کو عروج نہ مل سکا۔ دہلی کے اندر چشتیہ سلسلہ کو بام عروج پر لے جانے کا سہرا سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی کے سر جاتا ہے۔ اسے ہم آئندہ صفحات میں بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ!

چنانچہ حضرت شیخ بدرالدین غزنوی اپنی حیات تک سلسلے کا کام کرتے رہے۔ بالآخر ۶۵۷ھ میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور اپنے شیخ کے پائنتی کی جانب مدفون ہوئے۔ (خزینۃ الاصفیاء جلد اول فارسی، ص:۲۸۵)

صوبہ متحدہ پنجاب میں سلسلہ چشتیہ کی نشو و نما

حضرت خواجہ بختیار کاکی کے خلیفہ خاص حضرت بابا فریدالدین گنج شکر ہیں، جنہوں نے اجودھن کو اپنی دعوت و تبلیغ اور سلسلہ چشتیہ کی نشو و نما کے لیے مرکز بنایا۔ آپ کا نام مسعود، اور لقب فریدالدین تھا لیکن بابا فرید کے نام سے آپ مشہور تھے۔ پاکپٹن کا پرانا نام اجودھن تھا۔ پاکپٹن موجودہ پاکستان کے صوبہ پنجاب کا ایک ضلع ہے۔ اس کا مرکزی شہر پاکپٹن ہے۔ آپ کی ولادت قصبہ کھتوال ضلع ملتان میں ہوئی۔ آپ کی ولادت و وفات کی تاریخ میں بڑا اختلاف ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

''مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین و شجرۂ چشتیہ باقوال معتبر ششصد و ہفتاد می فرمایند'' (۱)

مخبر الواصلین، تذکرۃ العاشقین اور شجرۂ چشتیہ نے معتبر اقوال کے ساتھ ۶۷۰ھ تاریخ وفات بتایا ہے۔

۶۷۰ھ میں صرف ۵؍دن شامل ہیں کیوں کہ آپ کی وفات ۵؍محرم سہ شنبہ کو ہوئی تھی اور فوائد الفؤاد کے مطابق

---

(۲) خزینۃ الاصفیا جلد اول فارسی، ص:۳۰۳

۹۳ ؍سال آپ کی کل عمر شریف تھی (۱) اس لحاظ سے آپ کی تاریخ ولادت ۵۷۶ ھ ہوتی ہے، لیکن صاحب بزم صوفیہ نے سیر الاولیا، اخبار الاخیار، جواہر فریدی اور سفینۃ الاولیا کے حوالے سے تاریخ وفات ۵ ؍محرم ۶۶۴ ھ کو صحیح کہا ہے (۲) آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے ملتان پہنچے اور وہاں جید علما سے اکتساب فیض کیا۔ اس کے بعد آپ حضرت بختیار کاکی سے خرقہ خلافت حاصل کی۔ اس وقت سیر العارفین کے مطابق آپ کی عمر ۱۸ ؍سال تھی (۳) آپ دہلی میں اپنے مرشد کی صحبت میں ریاضت ومجاہدہ کرنے کے بعد ہانسی آئے۔ پھر یہاں سے اجودھن آئے اور اسی کو اپنی جائے سکونت بنایا اور اخیر عمر تک یہیں آپ نے قیام کیا اور یہیں آپ کا وصال بھی ہوا۔ آپ نے یہاں ۲۷ ؍سال گذارے اور سلسلہ چشتیہ کی نشر واشاعت فرمائی، بلکہ آپ کے توسط سے سلسلہ چشتیہ کو ایک نئی زندگی ملی۔ آپ ہی کے دو ممتاز خلیفہ حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت شیخ علاء الدین صابر کلیری سے دو سلسلے وجود میں آئے جو پورے ہندوستان میں پھلے اور پھولے، بلکہ ایک سلسلہ جمالیہ آپ کے خلیفہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی سے بھی چلا جو بعد میں سلسلہ نظامیہ میں مدغم ہو گیا۔ لیکن سلسلہ نظامیہ اور صابریہ آج بھی پورے ہندو پاک میں موجود ہے اور لاکھوں لوگ ان سے وابستہ ہیں۔ صابریہ سلسلے کا مرکز کلیر ہوا جب کہ نظامیہ کا دہلی۔ اس سے پہلے بھی سلسلہ چشتیہ دہلی میں آچکا تھا جیسا کہ ماقبل میں بیان ہو چکا لیکن سلسلہ نظامیہ آنے کے بعد سلسلہ چشتیہ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور ایک عالم اس سلسلے سے فیض یاب ہوا۔ یہ نظامیہ سلسلہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے۔

شیخ نظام الدین اولیا اور سلسلہ چشتیہ کی نشاۃ ثانیہ

سلطان المشائخ دہلی سے تین بار اپنے مرشد سے فیوض و برکات حاصل کرنے کے لیے اجودھن تشریف لے گئے (۴) جب آپ اپنے مرشد کی خدمت میں تھے تو آپ فرماتے ہیں کہ ’’ایک دن آپ [شیخ شیوخ العالم بابا فرید قدس سرہ] نے مجھے طلب کیا۔ یہ رمضان المبارک کی ۱۳ ؍تاریخ اور سنہ ۶۶۹ ھ تھا۔ آپ نے فرمایا: نظام تمہیں یاد ہے جو میں نے تم سے کہا تھا؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! فرمایا: کاغذ لاؤ تاکہ خلافت نامہ لکھا جائے۔ چنانچہ کاغذ لایا گیا اور آپ نے خلافت نامہ لکھا (۵) اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ تم ایسے درخت ہو گے جس کے سائے میں مخلوق آرام پائے گی (۶) چنانچہ آپ اجودھن سے دہلی آئے اور یہاں کے مختلف علاقوں کے دورے کیے

---

(۱) فوائد الفواد، آٹھویں مجلس، ص: ۲۳۰

(۲) بزم صوفیہ، ص: ۱۶۰

(۳) سیر العارفین، ص: ۴۸

(۴) سیر الاولیا، ص: ۲۲۸

(۵) سیر الاولیا، ص: ۲۲۸، خلافت کی تاریخ ۶۶۹ ھ درست نہیں ہے کیوں کہ بابا فرید کی وفات ۶۶۴ ھ میں ہو چکی تھی، اس لیے درر نظامی۔ ص: ۱۴۰، کے مطابق خلافت کی تاریخ ۶۶۰ ھ ہی درست معلوم ہوتی ہے۔

(۶) سیر الاولیا، ص: ۲۲۹

،بالآخر غیاث پور میں سکونت اختیار کر لی اور یہاں مخلوقِ خدا کی رشد و ہدایت میں منہمک ہو گئے اور چند ہی عرصہ میں خلق کا ہجوم ہو گیا، جیسا کے بابا صاحب نے فرمایا تھا بعینہ ویسا ہی ہوا کہ مخلوقِ خدا اپنی حاجات میں آپ کی طرف رجوع کرنے لگی۔ لوگ آپ کے پاس اپنی مصیبت و پریشانی لے کر آتے اور آپ سب کی مصیبت و پریشانی کا حل فرماتے، حتی کہ امرا و سلاطین وقت اپنی مصیبت کے لمحات میں آپ سے دعا کی درخواست کرواتے اور آپ ان کے لیے بھی دعا فرماتے۔ آپ بڑے پیمانے پر لنگر عام کا انتظام و انصرام فرماتے جس سے ہر کوئی شکم سیر ہوتا۔ اس کے ذریعہ بھی لوگ اور بالخصوص غیر مسلم آپ سے مانوس ہوتے اور آپ کے دست حق پرست پر توبہ و رجوع کرتے اور بڑے سے بڑا گنہگار آپ کی خدمت میں آتا اور توبہ کر کے آپ کے حلقۂ اردات میں شامل ہو جاتا۔ آپ کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا اور آپ ہر خاص و عام کو اپنی بیعت میں قبول کر لیتے تھے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سطح کے لوگ دین سے جڑ گئے۔

صاحب تاریخ دعوت و عزیمت نے تاریخ فیروز شاہی کے حوالے سے لکھا ہے: ''عہد علائی کے آخری چند سالوں میں شراب، معشوق، فسق و فجور، فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے پایا۔ بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے تھے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہو سکتے تھے۔ بازار والوں سے جھوٹ بولنے، کم تولنے اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا۔ اکثر طالب علموں اور بڑے بڑے لوگوں کی رغبت جو شیخ کی خدمت میں رہتے تھے، تصوف اور احکام طریقت کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف ہو گئی تھی۔ قوت القلوب، احیاء العلوم، ترجمہ احیاء العلوم، عوارف المعارف، کشف المحجوب، شرح تعرف، رسالہ قشیری، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ، لوائح ولوامح قاضی حمید الدین ناگوری، فوائد الفؤاد میر حسن سجزی کے بہت سے خریدار پیدا ہو گئے تھے۔ زیادہ تر لوگ کتب فروشوں سے سلوک و حقائق کی کتابوں کے بارے میں دریافت کرتے تھے۔ کوئی پگڑی ایسی نہ تھی جس میں مسواک اور کنگھی لٹکی نظر نہ آتی تھی۔ صوفیوں کی کثرت خریداری کی وجہ سے لوٹے اور چرمی طشت گراں ہو گئے تھے۔ حاصل کلام یہ کہ خداوند تعالی نے شیخ نظام الدین کو پچھلی صدیوں میں شیخ جنید اور شیخ بایزید کے مثل پیدا کیا تھا۔'' (تاریخ دعوت وعزیمت، ص:۱۴۶)

غرض کہ آپ نے اپنے عہد مبارک میں معرفت و سلوک اور تصوف کا بازار گرم کر رکھا تھا، جس کے سبب لاکھوں لوگ دامن تصوف سے وابستہ ہو گئے، آپ نے تصوف کو از سر نو منظم کیا اور اس کے اندر در آنے والی خرابیوں کا ازالہ فرمایا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے اپنے خلفا کی ایک بڑی تعداد تیار کر کے ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلا دیا، جیسا کہ گلزار ابرار میں آپ کے متعلق لکھا ہے: بہت تھوڑے عرصہ میں آپ کی درویشی اور مرید پروری، رہنمائی و رہبری کا شہرہ تمام دنیاوی آبادی کے ہر ایک گوشہ میں اور ہر ایک کے کان میں پہنچ گیا اور ناقصوں کی تکمیل اور کاملوں کی تائید کے واسطے ہر ایک سمت میں اور ہر ایک صوبہ میں آپ کے ہادی اور ولی خلفا میں سے

ایک خلیفہ پہنچ گئے (۱) چنانچہ آپ کے جو خلفا جس علاقے میں گئے وہاں انہوں نے تصوف کی دکان سجا دی، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس وقت پورے ہندوستان میں تصوف کا بول بالا ہو گیا۔

سلطان المشائخ تقریباً دہلی میں ۵۵ رسال سلسلہ چشتیہ کی نشر و اشاعت کر کے ۸۹ رسال کی عمر میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

آپ کے بہت سے خلفا ہوئے، بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱- مولانا شمس الدین یحیٰ، آپ ایک بہترین عالم دین تھے۔ آپ کے متعلق سیر الاولیا میں لکھا ہے کہ ''طالب علمی کے زمانے سے تمام شہر میں مباحث علمی، حاضر جوابی، مقدمات کے وارد کرنے اور الزامی جواب میں مشہور تھے۔ الغرض مولانا شمس الدین کا علم و تبحر اس درجہ کو پہنچا کہ شہر کے اساتذہ آپ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے اور آپ کی شاگردی اختیار کرتے۔ شیخ نصیر الدین محمود نے اوائل عمر میں آپ سے کچھ کتابیں پڑھی تھیں اور آپ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا'' (۲) آپ نے دہلی میں رہ کر سلسلہ کی خدمات انجام دی اور ۷۴۷ھ میں فوت ہوئے۔

۲- شیخ قطب الدین منور، آپ علم و عقل، عشق و وفا، زہد و قناعت اور صفتِ آہ و زاری سے متصف اور مشہور تھے۔ آپ کے والد شیخ برہان الدین بن شیخ جمال الدین ہانسوی تھے۔ آپ ہر سال ہانسی سے سلطان المشائخ کی صحبت میں تربیت حاصل کرنے کے لیے آتے۔ سلطان المشائخ کی وفات کے بعد ہانسی ہی میں اپنے خلوت کدے میں ذکر و اذکار میں مشغول رہا کرتے۔ آپ کی وفات ۷۶۰ھ میں ہوئی۔ (خزینۃ الاصفیا، فارسی، جلد اول، ص: ۳۶۰)

۳- مولانا حسام الدین ملتانی، آپ زہد و ورع کے پیکر تھے، علم فقہ سے آپ کو خاص دلچسپی تھی۔ سلطان المشائخ فرماتے تھے کہ شہر دہلی ان کی نگہبانی میں ہے۔ جب سلطان محمد تغلق نے لوگوں کو شہر دہلی سے دیوگیر کی طرف روانہ کیا تو مولانا حسام الدین گجرات چلے گئے اور وہیں رحمت حق سے جا ملے (سیر الاولیا، ص: ۴۱۵)

۴- مولانا فخر الدین زرادی، آپ ظاہری و باطنی دونوں علوم کے جامع تھے۔ آپ کو وجد و سماع سے بھی خاص شغف تھا۔ سلطان محمد تغلق کے فرمان کے مطابق آپ دیوگیر گئے۔ وہاں سے حج کے لیے روانہ ہوئے اور واپسی میں آپ جس جہاز پر سوار تھے وہ ڈوب گیا۔ اسی کے ساتھ آپ بھی ہمیشہ کے لیے زیر آب ہو گئے۔ یہ واقعہ ۷۴۸ھ میں پیش آیا (خزینۃ الاصفیا، فارسی، جلد اول، ص: ۳۵۱)

۵- مولانا علاء الدین نیلی، آپ اودھ کے اکابر علما میں سے تھے۔ کشاف وغیرہ کا درس دیتے تھے جس میں اودھ کے بڑے بڑے علما شریک ہوتے تھے۔ آپ کو اگرچہ سلطان المشائخ کی جانب سے خلافت و اجازت

---

(۱) گلزار ابرار، ص: ۸۳

(۲) سیر الاولیا، ص: ۲۷۲،۳

حاصل تھی لیکن آپ نے کسی کو مرید نہیں کیا۔آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ وعظ ونصیحت،تعلیمات تصوف اورلوگوں کی اصلاح وتربیت میں بسر ہوتا۔آپ کی وفات سرزمین دہلی میں ۷۶۲ھ میں ہوئی اور سلطان المشائخ کے مقبرے میں دہلیز کے گنبد کے سامنے اندرونی چبوترے کے پاس مدفون ہوئے (خزینۃ الاصفیا، فارسی،جلداول،ص:۳۶۱)

۶ -مولانا وجیہ الدین یوسف ،آپ سلطان المشائخ کے بہت ہی محبوب خلیفہ تھے۔آپ نے مالوہ میں سلسلہ چشتیہ کا کام کیا۔آپ کے علاوہ یہاں شیخ کمال الدین،مولانا مغیث الدین وغیرہ نے بھی سلسلہ کی خدمات انجام دی۔آپ کی وفات ۷۲۹ھ میں ہوئی (ایضا،ص:۳۴۲)

۷ -مولانا سراج الدین عثمان معروف بہ اخی سراج،آپ سلطان المشائخ کے مشہور خلفا میں سے ہیں۔آپ عنفوان شباب ہی میں سلطان جی کے دامن سے وابستہ ہوگئے تھے۔مولانا فخر الدین زرادی نے ۶ رمہینے کے اندر آپ کو علوم ظاہری سے آراستہ کیا اور سلطان جی نے آپ کو خلافت دے کر بنگال بھیج دیا۔آپ نے بنگال اور اس کے اطراف، بہار اور آسام میں سلسلہ چشتیہ کی خدمات انجام دی اور ۷۵۸ھ میں آپ کی وفات ہوئی (ایضا،ص:۳۵۸)

۸ -مولانا شہاب الدین امام،آپ کو سلطان المشائخ کی امامت کرنے کا شرف حاصل تھا۔آپ نے بھی محمد تغلق کے فرمان پر دکن کا رخ کیا اور وہاں سلسلہ کو فروغ دیا۔پھر آپ دہلی واپس آگئے اور یہیں آپ کی وفات ہوئی۔

(سیر الاولیا،ص:۳،۲۷۲)

۹ -حضرت برہان الدین غریب،آپ کا شمار علمائے عصر اور کاملین مشائخ میں ہوتا تھا۔جب آپ دہلی سے دیوگیر[دکن] پہنچے تو وہاں آپ کو بڑی مقبولیت ملی اور بہت سے افراد آپ کے دامن کرم سے وابستہ ہوئے۔آپ نے یہاں چشتیہ سلسلہ کی آبیاری کی اور ۷۴۱ ہجری میں آپ فوت ہوئے (خزینۃ الاصفیا، فارسی،جلداول،ص:۳۴۸)

۱۰ -خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی ،آپ نے دہلی ، اودھ، پنجاب اور گجرات میں سلسلہ چشتیہ کی اشاعت کی۔حضرت سلطان المشائخ کے دیگر خلفا سے سلسلے کا اتنا کام نہیں ہوا جتنا آپ سے ہوا۔دہلی میں آپ ہی نے حضرت سلطان المشائخ کے تشکیل کردہ نظام تعلیم وتربیت کو سنبھالا۔آپ نے دہلی کے ابتر حالات کا سامنا کرتے ہوئے جس ہمت واستقلال کے ساتھ سلسلے کا کام کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔آپ کی بارگاہ میں عقیدت مندوں کا ہمیشہ ہجوم رہتا اور آپ ہر ایک سے ملاقات کرتے اور ہر ایک کی تربیت فرماتے۔

آپ کا نام محمود اور لقب نصیر الدین محمود تھا۔آپ علوم ظاہری وباطنی کے جامع تھے۔سیر العارفین کے مطابق آپ نے ۴۳ سال کی عمر میں سلطان المشائخ سے شرف بیعت حاصل کیا(۱) اس کے بعد اپنے وطن اودھ سے دہلی وقتا فوقتا آتے رہتے لیکن اپنی والدہ ماجدہ کی وفات کے بعد مستقل طور پر دہلی میں رہائش اختیار کرلی اور جس دن سلطان المشائخ نے اس دار فانی کو الوداع کہا اس دن چراغ دہلی کو خرقۂ خلافت عطا کرکے ارشاد فرمایا: ”شمارا

(۱) سیر العارفین،ص:۱۲۶

دردہلی باید بودو جفائے مردم می باید کشید" آپ دہلی میں رہیں اور لوگوں کے ظلم وستم برداشت کریں(۱) گویا سلطان المشائخ کی جانب سے یہ اشارہ تھا کہ آپ کو دہلی میں لوگوں کی جانب سے ظلم وستم کا سامنا ہوگا، لہٰذا آپ کو اس سے گھبرانا نہیں ہے بلکہ اس کا مقابلہ کرنا ہے اور آپ نے ایسا ہی کیا۔ محمد بن تغلق کی جانب سے آپ کو بہت پریشان کیا گیا لیکن آپ اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق ڈٹے رہے اور سلسلہ کی ترویج واشاعت اور مخلوقِ خدا کی وعظ و نصیحت میں کمی آنے نہیں دیا، بالآخر آپ سلسلہ چشتیہ کی خدمت اور اس کی توسیع ،نشرواشاعت کر کے ۷۵۷ ہجری میں اپنے مالک حقیقی سے جاملے (سیر الاولیا،ص: ۳۹۵)

آپ نے اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا، لیکن آپ کے بہت سے خلفا ہوئے۔ خزینۃ الاصفیا کے مطابق آپ کے خلفا کے اسمائے گرامی یہ ہیں: میر سید محمد گیسو دراز، میر سید محمد بن جعفر المکی الحسینی، ملک زادہ احمد ،مولانا معین الدین عمرانی، میر سید علاء الدین برادرزادہ مخدوم جلال الدین جہانیاں جہاں گشت، شیخ یوسف، محمد وجیہ ادیب، سید علاء الدین کشوری، قاضی محمد ساوی فاضل، شیخ سلیمان رودولی، شیخ محمد متوکل کشوری، شیخ دانیال، شیخ قوام الدین (۲) قاضی عبد المقتدر، مولانا خواجگی، مولانا احمد تھانیسری، شیخ زین الدین، شیخ صدر الدین حکیم، شیخ سعد اللہ کیسہ دار وغیرہ (خزینۃ الاصفیاء جلد اول فارسی،ص: ۳۵۷)

آپ کے خلفا میں سے دو خلیفہ حضرت میر سید محمد گیسو دراز اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت بہت مشہور ہوئے اور ان دونوں سے آپ کا سلسلہ خوب پھیلا۔ حضرت میر سید محمد گیسو دراز کے مورث اعلی ہرات سے دہلی آئے تھے۔ آپ کی پیدائش یہیں پر ۷۲۱ھ میں ہوئی تھی (۳) کچھ دنوں کے لیے آپ دیوگیر چلے گئے تھے لیکن پھر دہلی لوٹ آئے اور ۱۶/رجب ۷۳۶ھ میں حضرت چراغ دہلی سے بیعت ہوئے (۴) اور سیر محمدی کے مطابق بوقت وفات حضرت خواجہ چراغ دہلی نے آپ ہی کو اپنا جانشین بنایا(۵) اگرچہ دیگر محققین کی رائے یہ ہے کہ چراغ دہلی نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں کیا۔ آپ علوم ظاہری و باطنی دونوں سے آراستہ تھے۔ آپ دہلی میں تقریباً ۴۴/ سال قیام کرنے کے بعد گلبرگہ تشریف لائے اور یہیں سلسلہ کی اشاعت میں لگ گئے، یہاں پر آپ ۲۲/سال تک مخلوق کی رشد وہدایت میں لگے رہے اور ۱۰۵/سال ۴/مہینے، ۱۲/دن کی عمر میں ۱۶/ذیقعدہ ۸۲۵ھ میں آپ نے وفات پائی۔ (سیر محمدی فارسی،ص:۲۹)

آپ کے بعد آپ کے خلفا نے سلسلہ چشتیہ کو آگے بڑھایا۔ آپ کے بہت سے خلفا ہوئے جیسے مولانا علاء

---

(۱) خزینۃ الاصفیا، فارسی، جلد اول،ص: ۳۳۷

(۲) حضرت چراغ دہلی سے آپ کو صرف شرفِ بیعت حاصل تھا، خلافت آپ کو مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے ملی تھی۔

(۳) سیر محمدی فارسی،ص:۱۱

(۴) سیر محمدی فارسی،ص: ۳

(۵) سیر محمدی فارسی،ص:۲۱، ۲۲

الدین گوالیاری، قاضی نور الدین اجودھنی، مولانا معین الدین توہانی، شیخ صدر الدین، قاضی اسحاق محمد، قاضی سلیمان محمد، قاضی علیم الدین بن شرف وغیرہ (تفصیل کے لیے دیکھیے: سیر محمدی فارسی، ص: ۱۳۲، باب ہفتم)

سلسلہ چشتیہ کی دوسری شاخ - چشتیہ صابریہ

حضرت مخدوم علاء الدین صابر رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد بابا فرید قدس اللہ سرہ کے حکم سے سرزمین کلیر، ضلع سہارن پور تشریف لائے۔ آپ کا نام علی احمد، لقب علاء الدین اور صابر تھا۔ آپ ہرات میں ۶۱۴ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ۸ رسال کی عمر میں ۶۲۲ ہجری میں آپ کی والدہ بی بی ہاجرہ آپ کو لے کر حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر کی خدمت میں ہانسی آئیں اور آپ کو سپرد کر گئیں۔ (۱) آپ کی والدہ بابا فرید کی سگی بہن تھیں اور آپ بابا فرید کے بھانجے اور داماد تھے (سیر الاقطاب فارسی، ص: ۱۷۸)

بابا فرید نے آپ کو علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ کیا اور ۶۴۶ ہجری میں آپ کو خلافت دے کر بمقام کلیر بھیج دیا (۲) کلیر اس وقت علما اور مشائخ کی آماجگاہ تھا، اس لیے لوگ آپ کی طرف بہت کم التفات کرتے تھے۔ آپ نے یہاں روحانیت کی تبلیغ کرنا شروع کی اور اپنے سلسلے کا اجرا کیا لیکن آپ کے دور میں سلسلے کو عروج نہ مل سکا اور یہ سلسلہ گمنامی کے پردے میں چلا گیا۔ آپ خود بھی گمنامی کو پسند کرتے تھے اور ہمیشہ استغراقی کیفیت میں رہتے تھے۔ کلیر میں آپ نے ۳۳ رسال تک لوگوں کی رشد و ہدایت اور سلسلے کی ترویج و اشاعت کی اور یہیں آپ کی وفات بھی ہوئی۔ آپ کی تاریخ وفات کے سلسلے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ خزینۃ الاصفیا نے معارج الولایت کے حوالے سے آپ کی تاریخ وفات ۶۹۰ھ لکھا ہے (۳) جبکہ صاحب سیر الاقطاب نے ۶۶۴ھ لکھا ہے (۴) اور علامہ وحید احمد مسعود نے آپ کی تاریخ وفات ۶۷۹ھ/ ۶۶۹ھ بتلایا ہے (۵)

آپ کے بعد آپ کے صرف ایک خلیفہ ہوئے، جنہوں نے آپ کے سلسلے کی اشاعت کی، علامہ وحید احمد مسعود نے ''صابری سلسلہ'' میں لکھا ہے کہ: حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی آپ کے تنہا اور واحد خلیفہ تھے (۶) جنہوں نے پچیس سال اور ان کے خلیفہ حضرت جلال الدین کبیر الاولیا نے انچاس برس فرائض خلافت اپنے مخصوص طرز سے ادا کیے، پھر کبیر الاولیا کے خلیفہ حضرت شیخ العالم احمد عبد الحق ردولوی نے ۷۶۵ھ سے ۷۸۳ھ تک ردولی کو مرکز بنا کر نئی شان سے سلسلہ کی خدمت و توسیع کی (صابری سلسلہ، ص: ۶)

---

(۱) سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، وحید احمد مسعود، ص: ۲۵۴

(۲) سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، وحید احمد مسعود، ص: ۲۵۴

(۳) خزینۃ الاصفیاء فارسی، جلد اول، ص: ۳۱۹

(۴) سیر الاقطاب، فارسی ص: ۱۸۴

(۵) سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، وحید احمد مسعود، ص: ۲۵۴

(۶) صابری سلسلہ، ص: ۵

آپ کے زمانے میں حالات بہت زیادہ خراب تھے۔سیاسی ہما ہمی کا دور دورہ تھا۔لوگ مذہب سے بیزار ہوتے جا رہے تھے بلکہ لوگ ہندو مذہب اور اسلام مذہب کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر رہے تھے۔بھکتی تحریک زوروں پر تھی۔ایسے وقت میں شیخ احمد عبدالحق ردولوی نے خلوت چھوڑ کر جلوت کو اختیار کیا اور لوگوں کی اصلاح وتربیت کے لیے ایک خانقاہ قائم کی جو آج خانقاہ چشتیہ صابریہ سے متعارف ہے۔علامہ وحید احمد مسعود نے آپ کے متعلق لکھا ہے:

صابری خلفا میں وہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے ردولی میں پہلی مرتبہ صابری خانقاہ بنائی، زبردست لنگر جاری کیا اور حضرت غریب نواز اور حضرت بابا فرید گنج شکر کے اصول پر پہلے شریعت پر عمل کرنے کی تاکید کی پھر طریقت کے اصول سکھائے ، اس طرح ظاہری و باطنی طور پر حق کی اشاعت کر کے صابری سلسلہ کو مقبول بنایا، چونکہ انہوں نے سلسلہ کی تعلیم وتبلیغ میں تجدید فرمائی ہے، لہٰذا صابری سلسلہ کے مجدد دراصل وہی ہیں (صابری سلسلہ،ص:۹)

جب آپ اپنے مرشد کی بارگاہ میں پہنچے تو انہوں نے آپ کو خرقۂ خلافت دے کر فرمایا:''از خدا خواستہ ام کہ سلسلہ ما از تو جاری شود''ہم نے خدا سے دعا کی ہے کہ ہمارا سلسلہ تم سے جاری ہو۔اس پر تبصرہ کرتے ہوئے صاحب خزینہ نے لکھا کہ:

وہمچناں بوقوع آمد کہ ہزاران ہزار از خلفائے نامدار و مریدان صدق شعار بتوجہ آں مقتدائے روزگار بدرجہ ولایت وخلافت رسید و در ہر اقلیم و دیار رسیدند و از عرب وعجم جائے ملکی نماند کہ در آنجا خلیفہ از خلفائے شیخ احمد نرسیدہ باشد۔(خزینۃ الاصفیاء جلد اول فارسی،ص:۳۸۵،۳۸۶)

یعنی بعینہ ایسا ہی ہوا کہ ہزاروں ہزار خلفائے نامدار اور مریدان صدق شعار آپ کی توجہ سے ولایت وخلافت کے درجہ پر پہنچے اور عرب وعجم میں کوئی ایسا ملک نہیں جہاں آپ کے خلفا نہ پہنچے ہوں۔

آپ کا وصال ۸۳۷ھ میں ہوا۔آپ کے خلیفہ آپ کے صاحب زادے شیخ عارف (۸۸۲ھ) ہوئے اور شیخ عارف کے خلیفہ ان کے صاحب زادے شیخ محمد (۸۹۸ھ) ہوئے۔ان دونوں نے شیخ العالم کے مشن،طرز تعلیم واصول کی بڑی خوبی سے اشاعت کی۔حضرت شیخ محمد ردولوی کے خلیفہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی ہوئے جن سے سلسلہ چشتیہ صابریہ خوب پھیلا۔آپ کو خلافت اور صحبت اگرچہ شیخ محمد سے حاصل تھی،لیکن عالم معاملہ میں شیخ احمد عبدالحق کی روحانیت سے مستفید ہوتے تھے۔آپ علوم ظاہری و باطنی دونوں کے جامع تھے اور ساتھ ہی سماع سے بھی خاص شغف تھا۔آپ ردولی میں خدمت خلق کا فریضہ انجام دینے کے بعد ۸۹۶ھ میں شاہ آباد ضلع انبالہ چلے گئے، یہاں آپ کی بڑی شہرت ہوئی، پھر ۹۳۲ھ میں گنگوہ شریف آ کر سکونت اختیار کر لی، یہاں آپ کی پہلے سے بھی زیادہ شہرت ہوئی اور سارے ہندوستان میں آپ کے کمالات کا چرچہ ہونے لگا اور ایک جہان آپ سے فیض یاب ہوا۔(تلخیص از مرآۃ الاسرار،ص:۱۱۸۹)

صاحب اخبار الاخیار کے مطابق آپ کی وفات ۹۴۵ھ میں ہوئی (۱) آپ کے مرید وخلیفہ شیخ رکن الدین اور حضرت جلال الدین تھانیسری ہوئے۔ مؤخر الذکر کے مرید وخلیفہ حضرت نظام الدین بلخی ہوئے، ان کے مرید وخلیفہ حضرت شیخ ابوسعید گنگوہی ہوئے، ان کے بہت سے خلفا ہوئے جن میں حضرت محب اللہ الہ آبادی بہت مشہور ہوئے، اور ان سے سلسلہ صابریہ کی ترویج واشاعت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ اسی طرح اس سلسلے کے متاخرین میں حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ ہوئے جن سے یہ سلسلہ ہندوستان کے تمام اطراف واکناف میں پھیلا، بلکہ آپ کے توسط سے یہ سلسلہ بلاد عرب تک جا پہنچا اور وہاں بھی اس سلسلے کی خوب اشاعت ہوئی۔

سلسلہ چشتیہ کا نیا دور

حضرت چراغ دہلی کے بعد شمع سلوک ومعرفت کی لو مدھم سی ہوگئی تھی، کچھ نفوس قدسیہ نے اپنے اپنے زمانے میں اس کی تجدید واحیا کے لیے کوششیں بھی کیں، لیکن اس میدان میں کامیابی کا سہرا دور متاخرین میں حضرت شاہ کلیم اللہ شاہجہان آبادی کے سر جاتا ہے۔ آپ نے تصوف ومعرفت کا بازار اس طرح گرم کیا کہ بابا فرید، خواجہ نظام اور حضرت چراغ دہلی کے ادوار کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ نظام تصوف میں آپ نے اصلاحات فرمائیں، اور غلط تصورات وخیالات، معمولات ومراسم کا ازالہ فرمایا، اور روح تصوف کی بازیافت کی اور اسے حیات نو بخشا۔ آپ اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ معقولات ومنقولات میں یکساں دسترس رکھتے تھے۔ آپ کی ولادت ۱۰۶۰ھ میں ہوئی۔ ظاہری علوم آپ نے اپنے زمانے کے اکابر علما سے حاصل کیا۔ باطنی علوم اور تزکیۂ نفس کے لیے حضرت شیخ محی الدین ابو یوسف یحییٰ چشتی مدنی کے در دولت پر مدینہ منورہ پہنچے، ان کے دست اقدس میں اپنا ہاتھ دیا اور پھر ریاضت ومجاہدات کی وادی عبور کرنے کے بعد خرقہ خلافت سے مشرف ہوئے۔ ہندوستان واپس آئے اور دہلی کے بازار خانم میں معرفت و سلوک اور علم وعرفاں کی دکان لگادی۔ چند ہی دنوں میں آپ کا شہرہ ملک کے اطراف واکناف میں پہنچ گیا اور طالبان علوم نبوت اور سالکین راہِ طریقت کا ہجوم ہونے لگا۔ آپ سب کو علم ویقین کی راہیں دیکھاتے اور رشد وہدایت کی منزلیں طے کرواتے اور سلسلہ عالیہ چشتیہ کی تبلیغ فرماتے۔ آپ نے سلسلہ عالیہ چشتیہ کی ترویج واشاعت کے لیے دور دور تک اپنے خلفا روانہ کیے جنھوں نے سلسلے کی زبردست اشاعت کی، بالخصوص آپ نے اپنے مرید خاص حضرت نظام الدین اورنگ آبادی کو خرقۂ خلافت دے کر دکن روانہ فرمایا، انہوں نے وہاں سلسلہ چشتیہ کے مشن کو پھر سے زندہ کیا اور کارہائے نمایاں انجام دیا، اسی طرح آپ کے صاحبزادے اور جانشین حضرت فخر الدین فخر جہاں نے بھی سلسلہ چشتیہ کی مثالی خدمات انجام دی۔ حضرت شاہ کلیم اللہ شاہجہان آبادی نے اپنی پوری زندگی سلسلہ چشتیہ اور اسلام کی خدمت میں صرف کر کے ۱۱۴۲ھ (۲) میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

---

(۱) اخبار الاخیار، فارسی، ص: ۴۴۵

(۲) مکتوبات کلیمی، ص: ۲

دیگر سلاسل پر سلسلہ چشتیہ کا فیضان

مشائخ چشتیہ نے حسب استطاعت سلسلے کی نشر واشاعت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ان کے علاوہ دوسرے سلاسل کے مشائخ نے بھی اس سلسلہ عالیہ چشتیہ کی نشر واشاعت میں حصہ لیا۔ ماضی میں طالبین وسالکین کا یہ دستور رہا ہے کہ انہیں جن مشائخ سے بھی سلوک ومعرفت کی راہیں ملتیں ان کی صحبت اختیار کرتے اور ان سے فیوض و برکات حاصل کرتے، ان کو اس سے قطعاً بحث نہیں ہوتی کہ وہ کس سلسلے کے ہیں، جیسا کہ آج ہمارا رویہ کچھ اسی طرح ہے کہ ہمارے بیچ اگرچہ ناقصوں کو کامل اور کاملوں کو رہنمائی کرنے والے مشائخ ہوں لیکن وہ اگر ہمارے سلسلے کے نہیں ہیں تو ہم ان سے فیض حاصل نہیں کر سکتے، یہ مشربی تعصب ہمارے اسلاف میں نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ ایک شخص بہت سے مشائخ سے بیعت ہوتا تھا اور خرقہ حاصل کرتا تھا بلکہ بانی سلسلہ سہروردیہ حضرت شیخ ضیاء الدین ابونجیب سہروردی (۵۶۳ھ) نے بھی حضرت محبوب سبحانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی (۵۶۱ھ) کی صحبت سے فیض حاصل کیا جب کہ آپ شیخ وجیہ الدین ابوحفص (۵۲۶ھ) کے مرید وخلیفہ تھے، اور سلسلہ سہروردیہ کو بام عروج بخشنے والے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (۶۳۲ھ) نے بھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی صحبت میں رہ کر بے شمار فیوض وبرکات حاصل کیے۔ (خزینۃ الاصفیا، فارسی، ج:۲، ص:۱۴-۱۵، ملخصاً)

اسی سلسلے کی ایک نمایاں شخصیت حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت قدس سرہ بھی سلسلہ چشتیہ سے فیض یاب ہوئے بلکہ آج بھی آپ کا چشتی فیضان جاری ہے۔ آپ نے اولاً اپنے والد ماجد حضرت سید احمد کبیر سے بیعت اور خرقہ حاصل کیا جو سہروردی سلسلے کے شیخ تھے، اس کے بعد آپ کو حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین سہروردی سے خرقہ خلافت حاصل ہوا، پھر شیخ مکہ عبداللہ یافعی کی ایما پر دہلی آئے اور حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے اجازت وخلافت حاصل کی۔ آپ درجنوں مشائخ طریقت سے اجازت وخلافت رکھتے تھے۔ لطائف اشرفی میں ہے:

> ”او را از قطب العالم شیخ رکن الدین ابوالفتح بن صدرالدین بن بہاء الدین زکریا ملتانی، جریان سلسلہ حضرت مخدوم جہانیاں از دو خانوادہ است، یکے از طرف حضرت شیخ رکن الدین دوم از طرف شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی۔ (لطائف اشرفی اول، فارسی، ص:۳۹۱)
>
> یعنی آپ کو قطب العالم شیخ رکن الدین ابوالفتح بن صدرالدین بن بہاء الدین زکریا ملتانی سے بیعت و خلافت حاصل تھی، حضرت مخدوم کا سلسلہ دو خانوادے سے جاری ہوا، ایک شیخ رکن الدین سے جبکہ دوسرا شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے۔

آپ اکثر لوگوں کو سلسلے سہروردیہ میں بیعت کرتے تھے کیوں کہ اصلاً آپ سلسلہ سہروردیہ کے شیخ تھے۔ اسی طرح حضرت حمید الدین ناگوری سہروردی سلسلے کے شیخ تھے جیسا کہ خزینۃ الاصفیا میں ہے ”بشرف ملازمت شیخ

شہاب الدین عمر سہروردی مشرف شدہ مرید گشت وتا یک سال کسب سعادت نمودہ خرقہ خلافت حاصل کرد‘‘(۱) یعنی شیخ حمید الدین ناگوری نے شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی خدمت سے مشرف ہوئے ،اور مرید ہوئے اور ایک سال میں فیض حاصل کر کے خرقہ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ بلکہ آپ قاضی صاحب کے متعلق فرماتے تھے کہ ’’**خلفائی فی الهند كثير منهم حميد الدين من أعظم خلفائی**‘‘(۲) یعنی ہندوستان میں میرے بہت سے خلفا ہیں، ان میں حمید الدین میرے سب سے بڑے خلفا میں سے ہیں۔لیکن اس کے باوجود آپ نے سلسلہ چشتیہ کے چشمہ صافی سے سیرابی حاصل کی۔ حضرت قاضی حمید الدین نے حضرت خواجہ بختیار کاکی سے نعمت اور خلافت بھی حاصل کی۔ لطائف اشرفی میں ہے: حضرت قاضی حمید الدین ناگوری از خلص خلفائے ولایت مآب حضرت خواجہ اند(۳) یعنی حضرت قاضی حمید الدین ولایت مآب حضرت خواجہ قطب کے مخلصین خلفا میں سے ہیں۔

خلاصہ

سلسلہ چشتیہ کا ورود ہندوستان کے اندر پانچویں صدی کے اوائل میں حضرت خواجہ ناصح الدین ابو محمد بن ابو احمد چشتی کے توسط سے ہو چکا تھا لیکن ہندستان میں اس سلسلہ عالیہ کی نشر و اشاعت کا سہرا حضرت خواجہ غریب نواز کے سر جاتا ہے۔آپ کے بعد آپ کے خلفاء و مریدین بالخصوص آپ کے خلیفہ اعظم و جانشین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور ان کے خلفاء نے اس سلسلے کو بام عروج تک پہنچایا۔ حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، حضرت مخدوم صابر پاک، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے اسمائے گرامی اس سلسلے میں بطور حرز جاں لیے جاتے ہیں، جن سے پورا برّ صغیر ہند و پاک مستفیض و مستنیر ہوا اور ہو رہا ہے۔

کتابیات

۱- اخبار الاخیار، فارسی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی

۲- بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبد الرحمن، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ یوپی۔

۳- تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

۴- تاریخ مشائخ چشت، خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین دہلی

۵- تذکرہ نوری یعنی مدائح حضور نور، قاضی غلام شبر قادری بدایونی، مرتب، اسید الحق قادری، تاج الفحول اکیڈمی

۶- تذکرہ علمائے ہند، فارسی، مولوی رحمان علی، مطبع منشی نوکشور لکھنؤ، بار دوم ۱۹۱۴ء

۷- حیات شیخ عبد الحق دہلوی، خلیق احمد نظامی، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

۸- خزینۃ الاصفیاء جلد اول فارسی، از مفتی غلام سرور، مطبع ثمر ہند لکھنؤ، سال طباعت ۱۲۹۰ ہجری

---

(۱) خزینۃ الاصفیاء جلد اول فارسی، ص: ۳۰۹

(۲) خزینۃ الاصفیاء جلد اول فارسی، ص: ۳۱۰

(۳) لطائف اشرفی اول، فارسی، ص: ۳۶۸

۹- دلیل العارفین، فارسی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، مطبع مجتبائی واقع دہلی، سن اشاعت ۱۳۱۱ھ

۱۰- درر نظامی، موسومہ گفتار محبوب، حضرت علی محمد جاندار، مترجم: محمد یسین علی، ادارہ: پیغام القرآن، لاہور- ۲۰۱۲

۱۱- سوانح حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر، وحید احمد مسعود، پاک اکیڈمی وحید آباد کراچی

۱۲- سیر الاقطاب فارسی، ص: ۱۵۰، اللہ دیا ابن شیخ عبد الرحیم، مطبع منشی نول کشور

۱۳- سیر الاولیا، امیر خورد کرمانی، مترجم: حضرت مولانا اعجاز الحق قدوسی، ناشر: خواجہ حسن ثانی نظامی

۱۴- سیر الاولیا فارسی، از میر خورد، مطبع محب ہند واقع فیض بازار دہلی

۱۵- سیر العارفین، حامد بن فضل اللہ جمالی، مترجم: محمد ایوب قادری، مرکزی بورڈ گلبرگ لاہور

۱۶- سیر محمدی فارسی، مولانا محمد علی سامانی، یونانی دواخانہ پریس سبزی منڈی، الہ باد

۱۷- سیرت خواجہ معین الدین چشتی، وحید احمد مسعود، ناشر: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، کراچی، پاکستان

۱۸- صابری سلسلہ، وحید احمد مسعود شیخو پور بدایوں، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، جولائی ۱۹۷۱ء

۱۹- فوائد الفؤاد، مترجم: حسن ثانی نظامی، طباعت: ایم- آر- پرنٹرز نئی دہلی، سنہ اشاعت جنوری ۲۰۰۷ء

۲۰- گلزار ابرار، محمد غوثی شطاری ماندوی، مترجم: فضل احمد جیوری، ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی سن اشاعت ۲۰۱۶

۲۱- لطائف اشرفی اول، فارسی، مولانا نظام الدین یمنی، مکتبہ سمنانی، فردوس کالونی کراچی پاکستان

۲۲- مرآۃ الاسرار، شیخ عبد الرحمن چشتی، مترجم: کپتان واحد بخش سیال چشتی، مکتبہ جام نور، دہلی، سن، ۱۴۱۸ھ

۲۳- مکتوبات کلیمی، مرتب: سید محمد قاسم صاحب کلیمی، مطبع مجتبائی دہلی، سن اشاعت: ۱۳۱۵ھ

۲۴- نفحات الانس من حضرات القدس فارسی، نور الدین عبد الرحمن جامی، مطبع، ناشر، سن اشاعت ندارد

○○○

احمد جاوید (پٹنہ)

سلطان المشائخ کا عہد

(سیاسی، سماجی اور معاشی تناظر میں)

سلطان المشائخ محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین (۱۲۳۶ء۔ ۱۳۲۵ء) بدایوں میں پیدا ہوئے۔ کوئی بیس سال کی عمر میں حصول علم کے لیے دہلی کا سفر کیا۔ چار پانچ سال بعد علم سلوک و معرفت کی طلب میں اجودھن (پنجاب) گئے، شیخ الاسلام خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر (۱۱۷۹ء۔ ۱۲۶۶ء) کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، تیس بتیس کی عمر میں شیخ نے ان کو اپنی خلافت و نیابت سے سرفراز کیا، ایک عرصہ تک درس و تدریس کا کام کیا، پھر رشد و ہدایت اور خدمت خلق کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ خلق خدا کی اصلاح احوال کا بیڑہ اٹھایا، سرزمین ہند پر مختلف اقوام بالخصوص ہندو اور مسلمانوں کے مابین پچھلی کئی صدیوں سے چلی آ رہی دوریوں بلکہ منافرت و مغائرت کی جڑوں (۱) کو کاٹنے کی سعی کی، ملک کے دور دراز دیار و امصار میں اپنے خلفا بھیجے (۲)، خود بھی مشقتیں برداشت کیں، سلاطین و حکام سے فاصلہ رکھ کر خدا کے بندوں کو خدا سے جوڑا، عام لوگوں پر توجہ دی مگر کسی پر اپنا دروازہ بند نہیں کیا، کمال حکمت و دانائی سے ذہنوں کو بدلا، دلوں میں خدا اور خلق خدا کی محبت و عظمت پیدا کی اور تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے تو برصغیر کی تہذیب و ثقافت، زبان و ادب اور سیاست و معیشت میں وہ جوہری تبدیلیاں آ چکی تھیں جن کے مظاہر یہاں آج تک زندگی کے ہر شعبے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ آپ کا زمانہ تاریخ کا ایک انتہائی پرآشوب دور ہے جب دنیا چنگیز اور ہلاکو کے حملوں سے تہہ و بالا تھی۔

عہد وسطی کے بکھرے ہوئے ہندوستان کو ہندوستان بنانے میں اگر کسی ایک شخص کا کردار سب سے زیادہ ہے تو وہ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) ہیں۔ اس ملک کو ایک متحدہ و مشترکہ سیاسی و جغرافیائی شناخت بلاشبہ شمس الدین ایلتتمش، غیاث الدین بلبن اور علاء الدین خلجی جیسے بادشاہوں نے دی لیکن لوگوں کے دلوں کو صوفیہ نے جوڑا۔ ٹالسٹائی نے اپنی کتاب 'مذہب کیا ہے؟' میں برتھولٹ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ

قرونِ وسطیٰ میں جن چیزوں نے انسانی فکر کو متاثر کیا وہ دو تھیں؛ طاقت اور مذہب۔ طاقت کا اثر ونفوذ محدود تھا، مذہب کا لامحدود۔ طاقت وقوت سے انسان کے جسم کو قابو کیا جاسکتا ہے لیکن اقلیم دل کی فتح ممکن نہیں۔ مذہب کی حکمرانی انسان کے ان بنیادی جذبات پر تھی جہاں اس کی فکر ونظر کے سانچے ڈھلتے تھے اور جہاں اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی تھی۔(۳)۔عہدِ وسطیٰ کے مسلم سلاطین اور صوفیۂ اسلام اس حقیقت کا بہت ہی روشن اور زندہ ثبوت ہیں۔ معاصر مؤرخین نے گرچہ ایرانی اساطیری طرز پر تاریخیں لکھیں، سلاطین کے جنگی کارناموں کو شرح وبست کے ساتھ بیان کیا، زندگی کے دوسرے شعبوں کا حال اور ان میں خود بادشاہوں کی دلچسپیوں اور کاموں تک کو بہت کم توجہ دی لیکن اس کے باوجود منہاج السراج، ابن بطوطہ اور ضیاء الدین برنی شیخ الاسلام خواجہ فریدالدین گنج شکر اور خواجہ نظام الدین (علیہما الرحمۃ والرضوان) کے غیر معمولی اثرات کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکے اور ان سے وابستہ بعض ناقابلِ یقین سنسنی خیز حکایات تک تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ یہ وہ مشائخ ہیں جنھوں نے سلاطین سے ہمیشہ دوری رکھی۔ درباروں کے طور طریقوں، سلاطین کی سوچ اور اِن کی روش فکر وعمل میں زمین وآسمان کا فرق تھا، اس کے باوجود عوام اور امرا یہاں تک کہ مرکز اقتدار تک میں ان کے غیر معمولی اثر ورسوخ کے کیا معنی ہیں اور منہاج السراج جیسے درباری مؤرخ نے کیوں لکھا کہ دہلی کے مسلمانوں پر خواجہ نظام الدین کا اس قدر اثر تھا کہ دنیاوی امور میں بھی ان کے نقطۂ نظر میں ایک ٹھوس عملی تبدیلی آگئی تھی ان باتوں کو عہدِ وسطیٰ کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کو نگاہوں میں رکھے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا۔ آپ کو اس کے لیے اس دور کے سلاطین اور علما وفقہا (۴) کے مختلف طبقات سے ان کے رشتوں کا سرد وگرم بھی جاننا ہوگا، یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ کیا محرکات وعوامل تھے کہ یہ اس جانب متوجہ ہوئے، اور یہ بھی کہ یہ 'بے سلاح وسپاہ اقتدار' بادشاہوں کی شوکت وجبروت پر کیوں کر غالب آیا؛ ورنہ ان کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔

(۱)

بنی نوعِ انسان نے تہذیب کے پر پرزے نکالے تو ضروریاتِ زندگی کے تبادلے کا سلسلہ شروع ہوا اور بتدریج بین الاقوامی تجارت ناگزیر ہوگئی۔ دنیا کے دوسرے خطوں کے لوگوں کی طرح ہندوستان کے لوگ بھی دنیا کے مختلف حصوں کا سفر کرتے تھے لیکن دوسری تیسری صدی عیسوی میں منوسمرتی کے احکامات نے ہندوستان کی صورتِ حال یکسر بدل دی۔ برہمنوں کے لیے بیرونِ ملک کا سفر کرنے پر سخت پابندیاں عاید تھیں۔ ان کا فرض تھا کہ 'ایسے ہی ملک میں رہیں جہاں موج کی گھاس اگتی ہو اور جہاں سیاہ ہرن پائے جاتے ہوں، سمندر پار کرنا ان کے لیے بالکل ہی ممنوع تھا۔ ان کو تنبیہ کی گئی کہ وہ ایسے ملکوں میں نہ جائیں جہاں حکومت چنڈال یا نیچ قوموں کے ہاتھوں میں ہو۔ منوسمرتی نے یونانی، ترکی اور ایرانی باشندوں کو ان نیچ قوموں میں گنا ہے' (۵)۔ ہندوستان کے تجارتی تعلقات عرب، ایران اور وسط ایشیا کے ملکوں سے پرانے تھے۔ اسلام کے ظہور سے پہلے ہی ہندوستان کی

بین الاقوامی تجارت غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ ان ممالک میں اسلام پھیلا تو یہ بین الاقوامی تجارتیں بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئیں۔ اس سے اس ملک کے لوگوں کا بہت فائدہ تھا۔ ہندوستان کو اپنی پیداواروں کے بدلے سونا چاندی ملتا تھا۔ ہندو راجا خواہشمند رہتے تھے کہ مسلمان تاجران کے شہروں میں رہیں لیکن ہندو دھرم اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ ملیچھوں کو اپنے شہروں کے اندر رہنے دیں۔ اس لیے بعض ہندو راجاؤں نے ان کو شہر کی فصیلوں سے باہر زمینیں دے دیں جہاں انہوں نے اپنی بستیاں بسائیں۔ عرب تاجروں کے بیانات، سیاحوں کے سفرناموں اور بعض دوسری پرانی کتابوں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ غوری کے حملوں سے قبل شمالی ہندستان کا ایسا سب سے مشہور شہر قنوج تھا جہاں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی (٦)۔ سنجان (گجرات) وہ پہلا شہر تھا جس نے مدینہ کے بعد دنیا کی پہلی آئینی ریاست دیکھی۔ فضل بن ماہان، محمد بن فضل اور ماہان بن فضل کی حکومت (۸۱۳ - ۸۴۱ء) اوران کے دارالحکومت سندان کا ذکر آپ کو عرب سیاحوں اور مصنفوں کے یہاں ہندوستان کے ایک اہم صنعتی وتجارتی شہر اور بندرگاہ کی حیثیت سے ملتا ہے۔ مشہور جغرافیہ داں ابوالحسن علی مسعودی نے 915ء میں کامبے، چیمبور، تھانہ، سوپارا، سنجان اور بھروچ میں مسلمانوں کو کثیر تعداد میں آباد پایا تھا۔ جنوب میں کرنگانور، مالابار، کالیکٹ اور کولم کے مسلمانوں کا مقامی راجاؤں کے درباروں میں غیر معمولی اثر ورسوخ تھا۔ یہ شہر فطری طور پر تجارتی سرگرمیوں کے مراکز کے ساتھ ساتھ علوم وفنون اور صنعت وحرفت کے مراکز بھی بنتے گئے۔ اس وقت ان کی رونقیں اور بڑھ گئیں جب مسلم ملکوں میں جنگ وجدال سے تنگ آ کر ہنرمندوں، تاجروں اور علما ومشائخ نے ہندوستان کا رخ کیا لیکن پہلے تو محمود غزنوی کے حملوں سے ان کو نقصان پہنچا، ہندو مسلمانوں میں دوریاں بڑھ گئیں جس کا ذکر البیرونی نے بڑے دکھ کے ساتھ کیا ہے؛ پھر بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کی جنگوں کے نتیجے میں یا تو یہ بستیاں غائب ہو گئیں یا پھر شہروں سے ملا دی گئیں اور اب ان کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔ شہر بداؤں بھی اس ملک میں مسلمانوں کی ان آبادیوں میں سے ایک تھا جو سرزمین ہند پر مسلم فاتحین کی آمد سے بہت پہلے آباد ہوئیں، بتدریج صنعت وحرفت، تجارت ومعیشت، علم وادب اور سیاست وثقافت کے مراکز بن گئیں؛ اور تہذیب وتمدن کی ایک نئی کروٹ کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

(۲)

خواجہ نظام الدین محمد بن احمد بن علی البخاری ۲۴ رصفر ٦۳٦ ھ کو بداؤں (اب 'بدایوں') میں پیدا ہوئے۔ یہ غالباً دہلی کے پہلے خود مختار مسلم بادشاہ سلطان شمس الدین محمود بن التتمش (۱۲۱۱ء۔ ۱۲۳٦ء) کی حکومت کا آخری سال تھا جس کی انتظامی صلاحیتوں، درویشانہ زندگی اور فاتحانہ جاہ وجلال نے اس سلطنت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا لیکن اس کے بعد دارالسلطنت اقتدار کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ پانچ سال میں تین بادشاہ (رکن الدین فیروز، رضیہ اور بہرام شاہ) آئے گئے اور چوتھا (علاءالدین مسعود) بھی بہ مشکل چار سال تخت نشیں رہا۔ آپ نے ہوش سنبھالا تو

سلطان ناصر الدین محمود کا زمانہ تھا، اس کے بعد کم از کم آٹھ بادشاہوں کا زمانہ پایا جن میں بلبن، کیقباد، جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، مبارک خلجی، غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق شامل ہیں۔ آپ کے آبا واجداد بخارا کے رہنے والے تھے، چنگیز خاں کے حملوں کے وقت لاہور آئے، بعد میں آپ کے دادا سید علی بخاری اور نانا سید عرب بداؤں آ بسے۔ آپ وسط ایشیا، ایران اور عرب کی قوموں اور قبائل کے اختلاط وارتباط سے وجود میں آنے والی نئی تہذیب و تمدن کی اس نسل سے تھے جو سرزمین ہند میں پیدا ہوئی، یہیں پلی بڑھی پروان چڑھی اور اس ملک کی سیاست و ثقافت کی ایک اور کروٹ میں بنیاد کا پتھر بنی۔ بداؤں کی فضا اس کے لیے بہت معقول تھی۔ یہ ابتدا میں ہی علم وادب اور تصوف وروحانیت کا گہوارہ بن گیا تھا۔ امیر خسرو نے اس کو مدینۃ الاولیا لکھا ہے۔ خواجہ فریدالدین گنج شکر نے التمش کے دور میں خواجہ حسن شیخ شاہی سے ملاقات کی غرض سے بداؤں کا سفر کیا تھا۔

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین کے بیانات میں ان کے بچپن اور نوجوانی کے بداؤں کا جتنا کچھ ذکر ہے، اس سے بداؤں کی تہذیبی زندگی کی ایک جھلک نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے یا پھر اس دور کے علماومشائخ کی کتب ورسائل اور ان کی ذاتی زندگی کے کوائف سے کچھ مدد ملتی ہے ورنہ تاریخ بادشاہوں کے جنگی کارناموں سے آگے نہیں بڑھتی۔ ترائن کی دوسری جنگ (۱۱۹۲ء) میں محمد غوری کی فتح کے فی الفور بعد قطب الدین ایبک نے قنوج اور بداؤں (۱۱۹۶ء) کو بھی قبضے میں لے لیا تھا اور اس شہر نے سلطنت دہلی کے شمالی علاقہ جات کے دار الحکومت کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اس لیے ہندوستان میں عہد مملوک کی فتوحات اور سلطنت دہلی کے تشکیلی دور کی تاریخ میں بداؤں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں کے تین صوبیدار قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش اور رکن الدین فیروز سلطنت دہلی کے بادشاہ ہوئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کا بھی بداؤں سے گہرا تعلق تھا کہ وہ التمش کا آزاد کردہ غلام اور اس کے خاندان کا حصہ تھا۔

خواجہ نظام الدین نے اپنے ملفوظات 'فوائد الفواد' میں جن بزرگوں کا ذکر کثرت سے کیا ہے، ان میں حدیث کی مشہور کتاب 'مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ' کے مؤلف امام رضی الدین صغانی، شیخ جلال الدین تبریزی اور مولانا علاء الدین اصولی سرفہرست ہیں، ضمناً اور بھی کئی علماومشائخ کا ذکر آیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ شیخ رضی الدین بداؤں کے تھے، وہاں سے کوئل (علی گڈھ) آ گئے تھے۔ اس کے بعد حج کو گئے اور وہاں سے بغداد۔ پھر وہ دہلی آئے۔ آپ نے 'مشارق الانوار' کے تعلق سے امام صغانی کے اس قول پر بات کرتے ہوئے کہ "یہ کتاب میرے اور خدا کے درمیان حجت ہے"، فرمایا کہ اگر ان کو کسی حدیث میں دقت آتی تھی تو وہ رسول خدا کو خواب میں دیکھتے اور صحیح کر لیتے۔ آپ نے ان کے شاگرد کے شاگرد مولانا کمال الدین زاہد سے 'مشارق الانوار' کا درس لیا تھا۔ مختلف علوم و فنون میں امام صغانی کی ۵۶ کتابیں ہیں جن میں سے ۱۵ کتب ورسائل حدیث میں، ۳/فقہ، ۲ علوم القرآن، ۴/ آثار صحابہ اور تذکرہ وتواریخ، ۵/تصوف وتزکیہ اور ۲۶/کتب ورسائل لغت وادب میں ہیں۔ ان کی مشہور کتاب

'العباب الزاخر واللباب الفاخر' کے تعلق سے امام سیوطی نے کہا ہے کہ ''صحاح کے بعد سب سے بڑی، سب سے محکم اور ضخیم کتاب جو لغت میں تالیف کی گئی ابوالحسن علی بن سیدہ اندلسی کی الضریر ہے، پھر رضی صغانی کی العباب''۔ مجمع بحوث الاسلامیہ اسلام آباد نے تحقیق جدید کے ساتھ اس کتاب کو ۴۰ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ پورے عالم اسلام میں ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی۔ امام صغانی نے لاہور، غزنہ، بغداد، مکہ مکرمہ، عدن اور دہلی میں قیام کیا۔ عباسی خلیفہ ناصر الدین اللہ نے غالباً ۶۱۵ھ میں بغداد سے ان کو اپنا سفیر بنا کر بادشاہ التمش کی طرف بھیجا۔ پھر مستنصر باللہ نے اپنا سفیر بنا کر ملکہ ہند رضیہ بنت التمش کے دور میں دوبارہ دہلی بھیجا۔ ان کی وفات ۱۹ر شعبان ۶۵۰ھ (۱۲۵۲ء) میں بغداد میں ہوئی۔ اس وقت خواجہ نظام الدین کی عمر چودہ پندرہ سال رہی ہوگی۔

شیخ جلال الدین تبریزی سلطان شمس الدین التمش کے دور (۱۲۱۰۔۱۲۳۶ء) میں دہلی آئے اور وہاں سے بداؤں جہاں چند سال قیام کیا، پھر سنارگاؤں لکھنوتی (بنگال) کی طرف چلے گئے۔ غالباً ۱۲۴۴ء میں انتقال کیا (جب خواجہ نظام الدین آٹھ دس سال کے رہے ہوں گے) اور دیوٹالا (موجودہ تبریز آباد، بنگلہ دیش) میں دفن ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے بارے میں خواجہ نظام الدین نے بداؤں کے لوگوں سے سنا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ مرید بہت کم کرتے تھے۔ یہ بھی فرمایا کہ میں نے ایک خط کی نقل دیکھی ہے جو انہوں نے عربی میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے یہ جملہ نقل کیا تھا: **من احب أفخاذ النساء لایفلح ابداً**۔ اور ضیعہ کا لفظ بھی کہا تھا جس کے معنی زمین، کھیت، گاؤں وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ عربی الفاظ مجھے یاد نہیں رہے لیکن معنی یہ ہیں کہ جس نے اپنا دل زمین سے لگایا وہ دنیا کا غلام ہو گیا۔ یہ ذکر بھی کیا کہ شیخ تبریزی جب ہندوستان آئے اور دہلی میں رہنے لگے تو شیخ الاسلام نجم الدین صغری کو یہ ناگوار گزرا اور ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ شیخ کو ہندوستان کی طرف روانہ کیا گیا۔ وہ بداؤں میں ایک دن اپنے دہلیز خانہ میں بیٹھے تھے۔ ایک دہی بیچنے والا دہی کی ہانڈی سر پر لیے ہوئے سامنے سے گزرا۔ وہ بداؤں کے قریب ایک گاؤں مواس کا رہنے والا تھا جس کو کاٹیہر (کٹھیر) کہتے تھے۔ یہاں بہت ڈاکو (قطاع الطریق) رہتے تھے اور یہ دہی بیچنے والا بھی ڈاکو تھا۔ اس نے شیخ جلال الدین کے روئے مبارک کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اس کا دل بدلنا شروع ہو گیا۔ پھر اس نے شیخ کو تیز نظر سے دیکھا اور کہا کہ ایسے لوگ دین محمدی میں ہوتے ہیں۔ فوراً ایمان لے آیا۔ شیخ نے اس کا نام علی رکھا۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر گیا اور واپس آ کر ایک لاکھ جیتل (۱) خدمت میں پیش کر دیا۔ شیخ نے قبول کیا اور کہا کہ یہ رقم اپنے پاس رکھو اور جہاں میں کہوں خرچ کرو۔ اس رقم سے شیخ کسی کو سو جیتل دیتے تھے کسی کو پچاس، کسی کو کم کسی کو زیادہ لیکن کم سے کم بخشش پانچ جیتل ہوتی تھی۔ (کٹھیر دراصل موجودہ روہیل کھنڈ کے خطہ کو کہتے تھے جو راجپوتوں اور ان کی لوٹ مار کے لیے مشہور تھا)۔

---

(۱) ایک سکہ جو درم یا فلس کا پچیسواں حصہ ہوتا ہے۔

مولانا علاء الدین اصولی جن کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ تہہ کیا، آپ نے فرمایا کہ بڑے بزرگ آدمی تھے لیکن کسی پیر کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ اگر کسی پیر سے مرید ہوتے تو شیخ کامل حال ہوتے۔ یہ بھی فرمایا کہ اپنے لڑکپن میں مولانا اصولی بداؤں کے ایک کوچے سے گزر رہے تھے۔ شیخ تبریزی اپنے دہلیز خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شیخ کی نظر مولانا پر پڑی تو آپ نے ان کو بلایا اور جو جامہ خود پہنے ہوئے تھے وہ ان کو پہنا دیا۔ مولانا کے تمام اوصاف اسی برکت سے تھے۔ مولانا نے ایک بڈھی لونڈی خریدی۔ ایک صبح مولانا جاگے اور دیکھا کہ بڑھیا آٹا پیس رہی ہے اور روتی جاتی ہے۔ پوچھا کہ کیوں رو رہی ہو؟ اس نے جواب دیا کہ کٹیھر میں اپنا بیٹا چھوڑ آئی ہوں۔ مولانا نے پوچھا کہ اگر میں کٹیھر کے راستے پر اس حوض تک لے جاؤں جو یہاں سے ایک کوس ہے تو کیا تم وہاں سے اپنے گاؤں کا راستہ جانتی ہو۔ اس نے کہا ہاں جانتی ہوں۔ صبح کے وقت مولانا اس کو حوض تک لے گئے اور وہاں چھوڑ دیا۔ اس واقعہ کو بیان کرتے وقت خواجہ نظام الدین کی آنکھیں بھر آئیں اور کہا کہ علمائے ظاہر ان باتوں کے منکر ہیں لیکن یہ سمجھنا ممکن ہے کہ مولانا نے کیا کیا۔ یہ ذکر بھی آیا ہے کہ ملک یار کو جامع مسجد بداؤں کا امام مقرر کیا گیا۔ اس بات پر کہ وہ اس عہدے کے لائق ہیں یا نہیں ہر شخص رائے دیتا تھا۔ مولانا اصولی نے سنا تو فرمایا کہ اگر ان کو جامع مسجد بغداد کا امام بھی مقرر کیا جائے تو وہ عہدہ بھی ان کی اہلیت کے مقابلے میں حقیر ہوگا۔

خواجہ نظام الدین نے بداؤں سے دہلی کا قصد کیا تو وہ ایک طالب علم تھے، ان کے کندھوں پر والدہ اور بہن کی ذمہ داری بھی تھی اور کچھ مال و اسباب بھی نہ تھے۔ والدہ اور بہن کو دہلی شہر کی ایک سرائے میں اتارا، خود ایک تیر بنانے والے کے کمرے میں رہنے لگے۔ یہاں اس وقت ایک جیتل کی دو سیر میدے کی روٹی بکتی تھی، دو جیتل کا ایک من خربوزہ ملتا تھا لیکن اکثر فاقے کی نوبت رہتی تھی۔ آپ کی والدہ کی عادت تھی کہ جب گھر میں غلہ نہ رہتا تو کہتی تھیں کہ آج ہم خدا کے مہمان ہیں۔ دہلی میں اس زمانے میں بہت سے دولت مند ترک امرا تھے۔ ان میں سے کسی نے آپ کی طالب علمی کے زمانے میں آپ کا ہاتھ تھاما نہ آپ خود کسی دولت مند کے دروازے پر گئے۔ آپ کے سب مددگار مزدور پیشہ لوگ تھے۔ ان واقعات کی روشنی میں آپ اس دور کی معاشرتی زندگی کی ایک دھندلی سی تصویر بنا سکتے ہیں لیکن جب تک اس نظام حکومت اور اس انقلاب کی حقیقت و ماہیت آنکھوں پر روشن نہ ہوگی جو یہاں شمال مغربی سرحدوں سے داخل ہوا اور اب کسی طوفان کی صورت آگے بڑھ رہا تھا، یہ تصویر واضح نہ ہوگی۔

(۳)

تیرہویں صدی عیسوی میں سرزمین ہند پر ترکوں نے قدم رکھا تو وہ اپنے ساتھ وہ نظام حکومت لائے، اس تہذیب و تمدن کے عناصر لے کر آئے جس کیلیے دنیا کی تاریخ میں عباسیوں اور سلجوقیوں کا بغداد جانا جاتا ہے۔ ان کے پاس ایک وسیع تر سلطنت کا تصور تھا، ایک ایسے ملک کا تصور جس میں بہت سی قومیں، بہت سی ملتیں بستی تھیں۔ وہ ایک وسیع و عریض ملک میں حکومت و انتظامیہ (ایڈمنسٹریشن) کا مضبوط ڈھانچہ کھڑا کرنے اور تعلیم کا ایک ایسا

نظام چلانے کا تجربہ رکھتے تھے، جس سے انتظامیہ کو اہل افراد مل سکیں۔ ان کے سامنے بغداد و نیشاپور سے سمرقند و بخارا تک پھیلے مدرسوں کا نظام تھا۔ انہوں نے جہاں اس سرزمین پر قلعے تعمیر کرائے، چھاؤنیاں بنائیں، مسجدیں اور اس کے بلند و بالا مینار بنوائے، وہیں ملک کے طول و عرض میں مدرسے بھی قائم کئے، بیمارستان اور سرائیں بھی بنوائیں، بڑے بڑے تالاب، باغات، پل اور سڑکیں بھی تعمیر کرائیں (۸)۔ ان کے پاس نگرانی، محاسبہ اور عدلیہ کا ایک مضبوط نظام تھا؛ اور ان سب پر مستزاد قانون کی حکمرانی کا انقلابی تصور تھا۔

ہندوستان میں ترکوں کی کامیابی کی اس سے بھی بڑی وجہ خود ہندوستان کی سماجی بناوٹ، اس کا ذات پات پر مبنی نظام اور حکمراں طبقات کے مظالم کی چکی میں پستے لوگ تھے۔ بقول پروفیسر محمد حبیب ''اسی کے نتیجے میں ترکوں نے بڑی آسانی سے راجپوتوں کی جگہ حاصل کرلی''۔ شہروں کے حدود وسیع تر ہو گئے۔ چنڈالوں کو شہروں میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ وہ فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ ملازمتوں کے دروازے ان پر کھل گئے۔ راجپوتوں اور برہمنوں کا اجارہ ختم ہو گیا۔ دستکاروں، مزدوروں اور پیشہ ور قوموں کی حالت بہتر ہونے لگی، کام کی راہیں سب پر کھل گئیں؛ اور ''منوسمرتی کے وہ فیصلے کالعدم ہو گئے جن میں برہمنوں کو بعض سزاؤں سے ہمیشہ کے لیے بری کر دیا گیا تھا اور ان کو سزائے موت جیسی سزائیں نہیں دی جاسکتی تھیں'' (۹)۔ ہر علاقے اور ہر شہر میں قاضی مقرر کیے گئے جن کی عدالت میں بڑے سے بڑا حاکم اور ایک عام آدمی برابر تھا۔ ہندوستان کے لوگوں کے لیے یہ ایک ایسا تجربہ اور ایک ایسی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تھا جس نے اسلام پر لوگوں کے دلوں کے دروازے بھی کھولے، ان کی تنی ہوئی مٹھیوں کو ڈھیلی، کھنچی ہوئی تلواروں کو کند اور کھولتے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا بھی کیا اور فاتح افواج کی راہیں بھی آسان کیں۔

ہندوستان کے راجے مہاراجے بہت چھوٹے چھوٹے علاقوں کے حاکم تھے۔ پھر یہ آپس میں برسرِ پیکار بھی تھے۔ اجمیر کا راجا پرتھوی راج چوہان ایک ناتجربہ کار و عاشق مزاج نوجوان تھا۔ ترائن کی پہلی جنگ (۱۱۹۱ء) میں تو راجپوتوں کی متحدہ طاقت غوری کو پسپا کرنے میں کامیاب رہی لیکن چند ہی ماہ بعد اسی مقام پر وہ بری طرح ہارا اور گرفتار کرلیا گیا۔ اس بار راجا جے چند نے محمد غوری کا ساتھ دیا کیونکہ چوہان نے اس کی بیٹی کو زبردستی اپنے محل میں داخل کرنے کے لیے قنوج پر حملہ کیا تھا (۱۰)۔ یہ حال اجمیر اور قنوج کے علاقوں کا ہی نہ تھا، کم و بیش شمال و جنوب ہر علاقے کا تھا۔ اس ملک کے باشندے اب تک فاتحین کو مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کو لوٹتے، مارتے، آبادیاں ویران اور فصلیں تباہ کرتے دیکھتے آئے تھے لیکن نئے حکمرانوں کی فوجیں ان کی حفاظت پر مامور تھیں؛ امن، انصاف اور خوشحالی کی ضمانت دے رہی تھیں؛ اور یہ عام لوگوں کے لیے ہی نہیں تھا، ہتھیار نہ اٹھانے والے راجا مہاراجہ (ملِک) کے لیے بھی تھا۔ وہ بھی ان کے حلیف اور باجگذار بن سکتے تھے۔ منگولوں کے حملے کی شکل میں دنیا پر ان ہی دنوں ایک نئی مصیبت نازل ہوئی، کسی میں طاقت نہیں تھی کہ ان کا سامنا کرتا، وہ جدھر کا رخ کرتے سیلاب کی طرح سب کچھ بہالے جاتے۔ پورے چین، وسط ایشیا اور ایران و افغانستان تک کے علاقوں میں انہوں نے ناقابل تصور تباہی مچائی لیکن

ہندوستان کے لوگوں نے دیکھا کہ ان کے نئے حکمراں اپنی جانوں کی قربانیاں دے کر ان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جزیے اور خراج کی شکل میں وہ ان سے جو کچھ لے رہے ہیں وہ بھی فوج اور انتظامیہ کے اخراجات پورے کرنے کے بعد ان کی فلاح پر خرچ کرتے ہیں۔ التمش نے اپنی مغربی سرحدوں سے فوجیں اس وقت تک نہیں ہٹائیں، جب تک کہ چنگیز خاں کی موت (۱۲۲۷ء) کی خبر نہ آ گئی۔ علاء الدین خلجی نے بھی اپنی مضبوط اقتصادی اور غیر معمولی فوجی قوت کے ساتھ یہی کیا ورنہ ہلاکو اور قتلغ کی یلغاروں کو یہاں کون روک سکتا تھا۔

ہندوستان میں راجا اور پرجا کے رشتے اور مزاج کو اس ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جنوب کے ہندو راجے مہاراجے جلال الدین خلجی کے دور سے سلطنت دہلی کے باج گذار تھے۔ سمندر کے کنارے ہونے اور محنت کش دستکاروں، تاجروں اور کسانوں سے بھاری محصولات لینے کی وجہ سے یہاں وہ دولت کے انبار پر بیٹھے تھے اور وہ سلطنت کے خزانے کو بہ شکل خراج بھاری دولت ادا کرتے تھے لیکن ان کی حکومت کے کاموں میں عوام کی بھلائی کا کوئی جذبہ نہ تھا، عام لوگوں کی زندگی مشکلات سے گھری ہوئی تھی، اور اکثر قحط پڑنے کی وجہ سے عام لوگ بھوک پیاس سے مر رہے تھے۔ صوفیوں کی ایک جماعت نے ہاتھ بڑھایا، قحط اور بھوک کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے بڑے تالاب اور نہریں کھودنے لگے، لنگر جاری کیے اور شفاخانے قائم کئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے قحط زدہ علاقے سرسبز وشاداب ہو گئے۔ اب مقامی راجا کی نظر بد اس جانب اٹھی، وجے نگر کے راجا نے زرعی زمین اور آبی ذخائر پر ٹیکس لگانا چاہا تو انہوں نے مزاحمت کی۔ اس طرح یہاں ایک خودمختار ریاست وجود میں آ گئی جو صحیح معنوں میں خلق خدا کے خادموں کی حکومت تھی۔ اس سرکشی کی خبر دہلی پہنچی تو فوج بھیجی گئی لیکن سلطان غیاث الدین تغلق کا گورنر علاء الدین حسن بہمنی دکن پہنچا اور اسے صورت حال کا علم ہوا تو اس نے اس سے کچھ خاص تعارض نہ کیا جس کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا تھا اور مقامی حکمراں نذیر الدین اسماعیل شاہ بھی بعد میں اس کے حق میں اقتدار سے دست بردار ہو گیا۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ سلطنت دہلی کے قیام کے کوئی سو سال بعد (حضرت سلطان المشائخ کی زندگی کے آخری برسوں میں) بھی اس ملک کی سیاسی حالت کیا تھی اور مسلمانوں کی فتوحات کا راز کیا تھا؟

(۴)

مسلم فاتحین کے کارناموں کو دیکھنے کے دو پیمانے ہیں۔ ایک قرآن وسنت، اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا طریقہ؛ دوسرا حالات زمانہ، ملکی ومعاشرتی ماحول اور رائج الوقت نظام۔ آپ ان کو پہلے پیمانے پر تولتے ہیں تو ان میں ہزار خرابیاں نظر آتی ہیں، دوسرے کو سامنے رکھتے ہیں تو ہزاروں خوبیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اسلام کی تاریخ کے مطالعہ میں آپ پاتے ہیں کہ پہلے خلافت کا زوال ہوا، پھر جلد ہی امارت کی وہ شکل بھی ناپید ہو گئی جو عربوں کے غلبہ سے بچی ہوئی تھی۔ عباسیوں پر عربی تہذیب کا رنگ تو تھا لیکن اس میں عجمی اثرات کی غیر معمولی آمیزش تھی۔ اس دور میں دو بڑی تبدیلیاں آئیں، صوبائی حاکموں نے اپنے منصبوں کو موروثی بنا لیا اور خلیفہ

کو یہ تسلیم کرنا پڑا۔ دوسری تبدیلی ترکوں کی آمد تھی جو خلیفہ کے محافظ کی حیثیت سے ملازم رکھے گئے تھے اور خلیفہ پر حاوی ہوتے چلے گئے (۱۱)۔ عباسیوں کے دورِ زوال میں ایک برائے نام مرکزی اقتدار باقی تھا لیکن ایران، افغانستان اور وسط ایشیا میں بہت سی خود مختار سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں جو خلیفہ بغداد سے اسی طرح کی نسبت رکھتی تھیں جیسا تعلق آج کل دنیا بھر کی قومیں اقوام متحدہ سے رکھتی ہیں، اس کے منشور پر دستخط کرتی ہیں، خواہ عمل کریں نہ کریں؛ اور سلامتی کونسل ان کے افعال و کردار اور ان کی فوجی و غیر فوجی کارروائیوں پر محض اطمینان یا ناراضگی کا اظہار کیا کرتی ہے۔ ایسا پہلا خود مختار بادشاہ محمود غزنوی تھا جس کو عباسی خلیفہ نے یمین الدولہ کا لقب دیا اور جس نے اپنے نام کے ساتھ سلطان کا لاحقہ لگایا۔ یہی وہ دور ہے جب خطہ عجم (ایران و ماوراء النہر) میں ایک قومی بیداری پیدا ہوئی جس کو مؤرخین ایران کی نشاۃ ثانیہ کا نام دیتے ہیں۔ ماضی کے ایران کی عظمت کو بیان کرنے کی ذمہ داری مصنفوں نے سنبھالی، رودکی اور فردوسی جیسے شاعروں نے جہاں تک تاریخ دستیاب تھی، اس کے کرداروں کو غیر معمولی عظمتوں سے مزین کیا، ان سے آگے شاعرانہ تخیل سے کام لیا۔ اس کے بعد یہاں کی سیاسی فضا بالکل بدل گئی اور اب 'ایک ایسا نیا سیاسی ادارہ وجود میں آ گیا جو خلافت سے بالکل مختلف تھا۔ نئے حکمرانوں نے اپنے لیے خلیفہ یا امیر المومنین کے بجائے سلطان کا لفظ اختیار کیا تاکہ لفظ کے لغوی معنی سے فائدہ اٹھا کر 'نیابت خداوندی' کا دعوی کر سکیں' (۱۲)۔ اس کے پیچھے کارفرما اسباب و عوامل بہت سے ہیں۔ ان کا جائزہ لیتے ہوئے عہد وسطی کی تاریخ و سیاست پر گہری نگاہ رکھنے والے محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی جیسے مؤرخین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چونکہ وسیع و عریض ریاست کی تنظیم کے لیے کوئی ہدایت نہیں چھوڑی تھی، اس لیے ایسا ہوا، موضوع روایات کے ذریعے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی گئی"۔ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے لیکن اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ "بعد میں غزنویوں اور پھر ترکوں کے ساتھ شہنشاہیت کا وہی تصور ہندوستان آیا جس میں کیقباد اور جمشید سے سکندر تک تمام کرداروں کو نئے سانچے میں ڈھال دیا گیا تھا" (۱۳)۔ میں سمجھتا ہوں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین نے بڑی ریاست کی تنظیم کا ایک ابتدائی نمونہ بھی چھوڑا تھا اور شہری سطح کی حکومت کی تنظیم کی ہدایات بھی اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود تھیں (۱۴) جو بنیادی طور پر کمیونٹی گورنمنٹ اور سیلف رول کا طریقہ دیتی ہیں۔ خلافت کے زوال کے بعد اہل طاعت و تقویٰ نے اس طریقہ کو از سر نو عملی صورت میں دریافت کیا اور بے سلاح و سپاہ اصفیائے امت علما و مشائخ نے متوازی طور پر اسے آگے بڑھایا۔ ان کے سامنے اسلام کو اس کی اصل صورت میں بچانے کا چیلنج تھا، طریقۂ محمدیہ کو لوگوں تک پہنچانے اور اگلی نسلوں کو منتقل کرنے کی ذمہ داری تھی جس کو انھوں نے قبول کیا، اپنے معاشرے میں اسلام کے از سر نو احیا کی جدوجہد اور اصلاح احوال کی تحریک وہاں سے شروع کی جہاں سے مکہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وسلم نے ابتدا کی تھی۔ وقت کے ساتھ یہ ایک تحریک بن گئی اور تیرہویں چودھویں صدی عیسوی میں اس تحریک کا ایک سب سے اہم ستون سلطان المشائخ خواجہ نظام

الدین ہیں جو ہندوستان میں تاریخ کا ایک نازک ترین عبوری دور تھا۔ دوسرے سلاسل تصوف اگر کوفہ، بصرہ اور بغداد کی فضا میں سانس لیتے تھے تو مشائخ چشتیہ نیشا پور اور خراسان و ماوراءالنہر کے دوسرے شہروں نیز افغانستان اور ہندوستان سے زیادہ گہرا تعلق رکھتے تھے، عجمی معاشرت اور فکر و فلسفہ کے مزاج داں تھے اور یہی اس خطہ میں ان کی فتوحات کا راز تھا جواب بھی اتنا ہی معقول و مؤثر (relevant) ہے۔

مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے زوال کے ساتھ ہی ان کا ایک طبقہ کھڑا ہو گیا تھا جس نے خود کو اقتدار کی کشمکش، درباروں کی سیاست اور جنگ و جدال سے دور رکھ کر ذاتی اور اجتماعی زندگی میں دین کی حفاظت اور اسلام کے اعلیٰ معیار کے حصول کی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ لوگ اس زوال سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان کے سامنے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کا یہ نمونہ تھا کہ جب سرداران مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چچا ابو طالب کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ آپ ان کی کچھ باتیں مان لیں اور اس کے بدلے حکومت و دولت جو چاہیں لے لیں، وہ آپ کو اپنا بادشاہ بنانے کو تیار تھے تو آپ نے یہ کہہ کر ان کی پیشکش ٹھکرا دی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے میں سورج بھی رکھ دیں تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ پیشکش قبول نہیں کریں گے۔ عہد وسطی کے ہندوستان میں تو مسلمانوں کی ساری کی ساری سیاست اور فتوحات اسی لین دین اور سمجھوتے کا نتیجہ تھیں۔ اب راستے دو ہی تھے۔ یا تو اس نظام کا حصہ بن جاتے، اس 'کلمہ گو شہنشاہیت' سے سمجھوتہ کر لیتے جو لوگوں پر مسلط تھی یا طریقہ محمدیہ کے ساتھ کھڑے ہوتے اور اس ملک کے لوگوں کے اصلاح احوال کی جدوجہد کرتے۔ ایک صورت، دوہری زندگی اپنانے کی بھی تھی کہ اجتماعی زندگی میں آپ اس نظام کا حصہ بنے رہیں اور ذاتی زندگی، عبادتگاہوں اور گھر کی چہار دیواری میں تقویٰ و طہارت کی مورت بن جایا کریں۔ آپ کو عہد وسطی کے مسلم معاشرے میں ان تینوں کے نمونے بکثرت ملتے ہیں لیکن خواجہ نظام الدین، ان کے شیوخ اور خلفا نے اس متبادل کو اپنایا جو قربانیاں مانگتا تھا اور جو اس ملک اور معاشرے کی ضرورت تھی ؛ یہاں تک کہ آپ کے سر کی قیمت لگا دی گئی لیکن پائے استقامت متزلزل نہ ہوا۔

(۵)

معزّالدین غوری (۱۱۴۹ء۔ ۱۲۰۶ء) کا تعلق افغانستان کے پشتون قبیلہ سور سے تھا۔ غور ایک بہت ہی دشوار گزار اور انتہائی سرد خطہ تھا۔ یہ قبیلہ اور یہاں کے لوگ کب اسلام لائے یہ تو کسی کو نہیں معلوم لیکن مغربی محققین کی کوششوں سے ''غور اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں کی جو تمدنی تصویر ہم تک پہنچی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں مہایانہ بدھ مت کا اثر غالب تھا'' اور اسلام پہنچا تو ''یہاں کے مسلمانوں کی بیشتر تعداد کرامیہ فرقہ سے تعلق رکھتی تھی'' (۱۵) جس کا عقیدہ تھا کہ ایمان صرف زبانی اقرار کا نام ہے، اس کے لیے یقین اور عمل کی ضرورت نہیں، خدا کا جسم ہے اور عرش کے اوپر اس کا ایک خاص مقام ہے۔ جس طرح مہایان مت میں بدھ کنول پر براجمان تھا، اب اللہ عرش پر بٹھا دیا گیا تھا۔ گویا ذہنی و فکری طور پر ان میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔

فیروز کوہ (غور) کے سلطان سیف الدین سوری نے آخری غزنوی بادشاہ سلطان بہرام شاہ کو شکست دے کر غزنی کو فتح کیا تھا۔ غور کے تخت پر غیاث الدین بیٹھا تو اس نے اپنے چھوٹے بھائی معزالدین کو شہاب الدین محمد غوری کے نام سے اپنا نائب بنا کر غزنی کے تخت پر بٹھایا۔ غزنوی سلطنت کے زوال کے بعد غوریوں کا مذہب بھی فقہ حنفی ٹھہرا کہ یہاں کے علما و مشائخ کے ساتھ ساتھ اس وسیع و عریض سلطنت کی اکثر آبادی حنفی تھی۔ محمد غوری نے ایک بہت ہی مضبوط فوج بنائی، جس میں افسروں کی اکثریت اعلیٰ نسل کے ترک غلاموں کی تھی۔ اس نے پہلے سلطنت غزنویہ کے علاقوں کو فتح کیا، پھر ہندوستان کی طرف بڑھا، جس کے لیے درہ خیبر کے مشہور روایتی راستہ کے بجائے درہ گومل کی راہ اختیار کی۔ پہلے اوچ اور ملتان کو فتح (۱۱۷۵ء) کیا (جو اس وقت اسماعیلیوں کا گڑھ تھا اور یہ مصر کی فاطمی خلافت کے ساتھ تھے جبکہ غوری بغداد کی عباسی خلافت کو تسلیم کرتے تھے)۔ پھر پشاور (۱۱۷۹ء)، دیبل (۱۱۸۲ء) اور لاہور کو فتح (۱۱۸۶ء) کیا جہاں غزنوی خاندان کی بچی کھچی حکومت رہ گئی تھی۔ دریائے جہلم اور سندھ کے درمیان کھوکھر نامی ایک قوم آباد تھی۔ پوری قوم صرف اس ایک بات کے جواب میں مسلمان ہوگئی کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو بادشاہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔

محمد غوری نے اب اپنے جرنیلوں کو زیادہ بڑی اور زیادہ تربیت یافتہ فوج تیار کرنے کا حکم دیا۔ ترائن یا تراوڑی کی جنگ میں اس کی فوج کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ چھ ماہ کے وقفہ سے تراوڑی یا ترائن میں ہونے والی دوسری جنگ (۱۱۹۲ء) میں پرتھوی راج چوہان کی شکست کے بعد محمد غوری کے سپہ سالاروں نے جلد ہی قنوج، دوآبہ (بداؤں)، اودھ (۱۶)، مالوہ، اجین اور بنگال تک کے علاقے فتح کر لیے۔ ۱۲۰۴ء (۵۹۸ھ) میں وہ اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کی موت کے بعد سلطنت کا حکمراں بنا اور واپس دارالحکومت غزنی کو لوٹ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خراسان و ترکستان میں خوارزم شاہی سلطنت قائم ہو چکی تھی اور اس سے غوریوں کی لڑائیاں جاری تھیں۔ ۱۲۰۶ء (۶۰۱ھ) میں وہ خوارزم تک پہنچ گیا جہاں اس کی شکست ہوئی اور یہ مشہور ہے کہ وہ اس جنگ میں کام آ گیا۔ اس وقت تاج الدین یلدوز غزنی، ناصرالدین قباچہ ملتان، قطب الدین ایبک دہلی، شمس الدین التمش بداؤں اور بختیار خلجی بنگال و بہار کے صوبیدار تھے اور محمد غوری کی موت کے بعد یہ عملاً خودمختار ہو گئے تھے لیکن قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، الغ خان بلبن اور بختیار خلجی نے سلطنت کو مضبوطی کے ساتھ سنبھالا اور اپنی حکمت و دانائی سے بغاوتیں کچل دیں۔ یہ سب کے سب ترک نسل کے تھے۔ گویا اب اقتدار کی باگ ڈور براہ راست ترکوں کے پاس آ گئی۔ بے شک یہ اسلام کے تصور مساوات اور اس کی روایات کا نقطۂ عروج تھا جب برعظیم جنوبی ایشیاء کی تاریخ نے ایک نئی کروٹ لی اور غلاموں کو سلطان اور محکوموں کو حکمراں بنا دیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ یہ نویں صدی عیسوی کا نیا 'ظاہرہ' تھا جب غلاموں کی ایسی تعلیم و تربیت کرائی گئی جیسی شہزادے شہزادیوں کی کرائی جاتی تھی اور وہ نہ صرف فوج اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے

بلکہ وزیر اور بادشاہ تک ہوئے اور اسی طرح ان کے علم وفضل کا ڈنکا دور دور تک بجتا تھا جو کبھی غلام تھے۔(۱۷) لیکن اسی کے ساتھ یہ ایک بہت ہی مضبوط طبقاتی نظام تھا جس پر جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا وسط ایشیا اور افغانستان کی قبائلی روایات اور ایرانی اساطیر و دساتیر کا غلبہ تھا۔ جن کے مظاہر آپ التتمش سے علاء الدین خلجی اور تغلق تک اس عہد کے ہر بادشاہ کے کردار میں بھی دیکھتے ہیں، حکومت کے منصب داروں اور علما و مشائخ میں بھی پاتے ہیں؛ اور عوام الناس یا عام زندگی کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

ایک تو حکمراں طبقہ کا نسلی غرور انہیں کسی اور کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ دوسرے سلاطین و امرا آسانی سے کسی پر بھروسہ بھی نہیں کر سکتے تھے، حتیٰ کہ خود اقتدار کے مرکز میں بھی شہ مات کا کھیل جاری رہا کرتا تھا۔ اپنی طاقت کے استحکام کے لیے ہر ترک امیر کوشش کرتا تھا کہ مسلمانوں کے بااثر طبقات کی حمایت حاصل کرے جن میں علما و مشائخ کا طبقہ بھی شامل تھا، یہ مسجدیں بنواتے تھے، امام مقرر کرتے تھے، قرآں خواں ملازم رکھتے اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ اپنی سیاسی قوت کو مضبوط کریں۔ التتمش اور بلبن شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے لیکن ان کے دربار میں مصلا دار، مصحف دار اور قلم دار کی طرح شرابدار کا عہدہ بھی برقرار تھا۔ التتمش، ناصرالدین محمود اور بلبن کی خواجگان چشت سے عقیدت و احترام بہت مشہور ہے اور یہ ایک حد تک درست بھی ہے، شیخ الاسلام فریدالدین مسعود گنج شکر کے نکاح میں جو خواتین آئیں، ان میں ایک بی بی حزبارہ سلطان ناصرالدین محمود کی بیٹی تھی لیکن چشتی صوفیہ کی تعلیمات سے ان سلاطین کی کیا نسبت ہوسکتی تھی، اس کو اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ بلبن نے مرتے دم تک دربار میں ساسانی طمطراق کا میلہ لگائے رکھا۔ التتمش اور بلبن کا تقویٰ اس کے بیٹوں کے کام نہ آیا۔ امیر خسرو اور امیر حسن سجزی جیسے ترک امرا بھی اپنی اعلیٰ تعلیم اور شرافت کے ساتھ نسبتاً چھوٹے عہدوں پر مامور ہوتے تھے۔ خلجیوں کے اقتدار میں آنے کے ساتھ وقت نے ایک کروٹ ضرور لی، علاء الدین خلجی نے اس طبقہ کی طاقت کو کم کیا، غیر ترک اور ہندنژاد اشخاص کو اقتدار میں شریک کیا، انہیں عہدے دئے لیکن نتیجہ باہمی کشمکش کی صورت میں سامنے آیا۔ بادشاہ ترکوں کے مقتدر طبقہ کی خواہش اور مزاج کے خلاف جیسے ہی کوئی قدم اٹھاتا یا کوئی اصلاح متعارف کراتا، بغاوتیں اور سازشیں شروع ہو جاتیں۔ دوسری طرف یہی امرا اسی رنگ میں رنگ جاتے تھے جس رنگ میں بادشاہ کو دیکھتے تھے۔ ''علاء الدین خلجی جس تقویت پر نئے دین کی داغ بیل ڈالنے پر آمادہ ہوگیا تھا، وہ اس کے چار امیر الغ خاں، ظفر خاں، نصرت خاں اور الپ خاں ہی تھے'' (۱۸)۔ عہد بنی امیہ سے ہی مسلمانوں کا ذہن آہستہ آہستہ اس کو قبول کرتا جارہا تھا کہ اسلامی اخلاقیات کے عام اصولوں کا حکمرانوں پر اس طرح اطلاق نہیں ہوتا جس طرح ایک عام انسان پر ہوتا ہے، خصوصیت کے ساتھ وہ قوانین جو شراب، زنا اور قتل سے متعلق ہیں۔ عجمی شہنشاہیت میں یہ حکمراں طبقہ کے حقوق کا حصہ سمجھ لیے گئے، یہاں تک کہ بادشاہوں کو سجدے کیے جانے لگے، اور نماز روزے تک کی باضابطہ رخصت دی گئی۔

(۲)

سلطنت دہلی میں بادشاہ کے اختیارات گرچہ لامحدود تھے ،وہ سلطنت کی کل افواج کا سالار اعظم اور حکومت کا منتظم اعلیٰ تھا لیکن اقتدار کا اصل مرکز امرائے دربار تھے جن کی تعداد عموماً چالیس ہوا کرتی تھی ، اس لیے یہ امرائے چہلگان کہلاتے تھے، بادشاہ کے نامزد کردہ ترک سرداروں کی یہی مجلس (Council of Lords) فیصلے کرتی اور بادشاہ اس کے فیصلوں پر عمل کیا کرتے تھے۔ ان میں سپہ سالاروں اور صوبیداروں کے علاوہ علمائے دین اور قضاۃ شامل تھے۔ امیر الامراء، امیر العساکر، صدر الصدور اور قاضی القضاہ کے عہدے سب سے اہم تھے۔ امیر الامرا کا عہدہ سلطان کے بعد سب سے بااختیار منصب تھا۔ شیخ الاسلام کا منصب بہ ظاہر ایک سب سے محترم مقام و مرتبہ تھا اور گرچہ بعض ریاستوں میں یہ جملہ امور دینیہ کا ذمہ دار ہوتا تھا لیکن یہاں یہ ذمہ داریاں صدر الصدور کے پاس تھیں۔ قطب الدین محمد بن احمد مدنی (شیخ عبدالقادر جیلانی کے بھانجے تھے)، شیخ نجم الدین صغری، شیخ جمال الدین بسطامی اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اس منصب پر فائز کیے گئے۔ سلطان ناصر الدین محمود اور بلبن نے یہ منصب شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر کو پیش کیا جنھوں نے اپنے 'مسلک ترک کلی' کی وجہ سے قبول نہیں کیا لیکن خلق خدا میں آپ کا یہ لقب بہت مقبول و مشہور تھا۔ صدر الصدور خطیبوں، اماموں، مساجد اور درسگاہوں کے منتظمین کا تقرر کرتا تھا۔ اس کی ذمہ داری تھی کہ سلطنت کے وظائف کے لیے سلطان سے ناموں کی سفارش کرے۔ اس کا محکمہ دیوان رسالت کہلاتا تھا اور منبر وعظ اور مسند درس دونوں پر اسی کا اقتدار تھا۔ حکومت کے بنیادی شعبوں میں سلطنت بالعموم قوانین شریعت کے ماتحت تصور کی جاتی تھی اور نظام حکومت میں منصب قضا، صدارت، وزارت، نظامت ، تولیت، مشرف (Accountant)، مستوفی ممالک(Auditor General) وغیرہ اہم تھے۔ بادشاہ کے دفتر میں مختلف صیغے اور ان کے سربراہ ہوا کرتے تھے، مثلاً خاصدار، مصحف دار، قلم دار، شرابدار، ملکِ باریک ۔ یہ صیغے صوبیداروں کے دفاتر میں بھی ہوتے تھے۔ مقامی سطح پر ہر شہر میں ایک حاکم ہوا کرتا تھا جو اکثر قاضی بھی ہوتا تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی نے بازار کی نگرانی و نظام تقسیم، حکام کے محاسبہ اور خفیہ نگرانی کے محکمے بھی قائم کیے۔

سلطنت کے بانی قطب الدین ایبک کی تعلیم و تربیت نیشاپور میں قاضی فخر الدین عبدالعزیز کوفی کے گھر میں ہوئی تھی جو امام ابوحنیفہ کی اولاد میں تھے۔ قاضی صاحب اپنے اس غلام کو بہت چاہتے تھے اور اس کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت اپنے بیٹوں کے ساتھ کی تھی۔ وہ تیر اندازی اور گھڑسواری میں جتنا طاق تھا، قرآن کا بھی اتنا ہی اچھا قاری تھا۔ نظام سلطنت کے بنیادی نقوش اسی نے وضع کیے لیکن سلطنت کا پہلا خودمختار حکمراں اور اس نظام حکومت کا اصل معمار سلطان شمس الدین التتمش تھا جس کا لڑکپن مدینۃ العلم بخارا اور نوجوانی عباسیوں کے دارالخلافہ بغداد میں گزری تھی جہاں وہ شیخ شہاب الدین ابوحفص عمر سہروردی اور شیخ اوحدالدین کرمانی جیسے مشائخ

کی خدمت میں رہا تھا اور ان سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے یہاں تقریباً ۲۵ سال تک حکومت کی اور ''مختلف النوع متضاد اور بعض صورتوں میں مضمحل صلاحیتوں کو ایک ایسے معاشرے کی تعمیر میں لگا دیا جس کے بغیر ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کی بنیادیں استوار نہیں ہو سکتی تھیں۔ حوض شمسی اور قطب مینار محض تعمیری کارنامے نہیں تھے، وہ زبردست تہذیبی نشانیاں تھیں جو تمدن کے ایک نئے دور کے آغاز کا اعلان کرتی تھیں'' (۱۹)۔

یہ سلطان شمس الدین التمش ہی تھا جس نے ہندوستان میں پہلی بار شہری انتظامیہ اور فوج کی باضابطہ اور الگ الگ تنظیم و تشکیل کی اور سلطنت کے طول و عرض میں مختلف محکموں کے دفاتر قائم کر کے ہندوستان کو ایک مضبوط ڈور میں پرو دیا۔ اس نے ہندوستان کو ایک جدید مملکت بنایا؛ اس کی معیشت کو منظم کیا، چاندی (ٹنکا) اور تانبے (جیتل) کے نئے سکے جاری کئے۔ اس کی سوچ کی نہج کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی موت (۱۲۳۶ء) سے پہلے اپنے بیٹوں کے بجائے اہل اور ذی شعور بیٹی کو جانشین مقرر کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ ہندوستان کی پہلی خاتون حکمراں رضیہ سلطنت کے رسوم و قیود کے بجائے دین کی روح کو اہمیت دیتی تھی۔ اس کا عورت ہونا اور ترکوں پر اس کا ایک حبشی غلام کو ترجیح دینا یا ایک ہندو نو مسلم کو اہم عہدہ دینا ترک امیروں اور سپہ سالاروں کی غیرت کو گوارا نہ ہوا اور وہ ایک بغاوت کی سرکوبی کے دوران ماری گئی لیکن رضیہ نے اپنے چار سال کے محدود دور حکومت میں بڑی تعداد میں درسگاہیں قائم کیں، تحقیق و تدوین کے مراکز کھلوائے اور ان مدرسوں کو جاگیریں دیں جہاں قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ فلسفے کی تعلیم بھی ہوتی تھی، اس نے فلسفہ، فلکیات و نجوم اور ادب و قواعد میں ہندو علما کے کاموں کا مطالعہ شروع کرایا۔

انتظامی امور میں بھی اس نے کئی اصلاحات متعارف کرائیں، جن میں اجتماعی قضا کا نظم بہت اہم تھا۔ دارالسلطنت میں اس نے قاضیوں کی ایک مجلس مقرر کی جس کے ارکان قاضی سعیدالدین کردی، قاضی نصیرالدین کاسالیس، قاضی جلال الدین اور قاضی کبیرالدین لشکر تھے۔ رضیہ کے بعد اس کے بھائی بہرام شاہ اور علاءالدین مسعود نے اقتدار سنبھالا، پھر التمش کے ایک اور بیٹے ناصرالدین محمود کو سلطان بنایا گیا۔ یہ بھی ایک بے حد مذہبی، متقی، پرہیز گار اور بڑا عالم فاضل شخص تھا اور خوش قسمتی سے اسے غیاث الدین بلبن جیسا زیرک اور بارعب وزیر (امیر الامراء) مل گیا۔ نتیجے میں ایک بار پھر سلطنت دہلی کی شان و شوکت لوٹ آئی اور حکومت کو وہی استحکام حاصل ہو گیا جو التمش کے دور میں تھا۔ ناصرالدین محمود ۱۲۴۶ء سے ۱۲۶۶ء تک مسلسل 20 سال تخت نشین رہا۔ اس کے بعد غیاث الدین بلبن نے ۱۲۶۶ء سے ۱۲۸۶ء تک مسلسل 21 سال زمام اقتدار سنبھالی اور محمود کے دور میں بھی اصل حکمراں بلبن ہی تھا۔ اس کی شخصیت بہت ہی بارعب و پرجلال تھی۔ وہ امور سلطنت کا ایک بہت ہی ماہر منتظم، بہترین سپہ سالار، عالم اور عالموں کا قدرداں، التمش کی طرح دیندار اور ذہین و شجاع حکمراں تھا۔ منگولوں کے ہاتھوں غلام بنا کر بیچ دیے گئے الباری ترک قبیلہ کے سردار کے معصوم بچے بلبن کی پرورش

اور تعلیم وتربیت غزنی میں خواجہ جمال الدین البصری نے کی تھی جن سے التتمش نے اسے خریدا تھا۔اس نے ملک بھر میں نظم ونسق کی نگرانی کیلیے سراغ رسانی کا مضبوط نظام قائم کیا اور سلطنت کی حدود میں ایسا امن وامان اور عدل وانصاف یقینی بنایا جس کی مثال تاریخ میں بہت ہی کم ملتی ہے۔دہلی کو ان جرائم پیشہ قبائل سے محفوظ کرنا اوران کی سرکوبی جو اطراف کے جنگلوں میں بستے اورلوٹ مار کرتے تھے، اس کی ایک بڑی کامیابی تھی۔ مشائخ وفقرا سے سلطان محمود اور بلبن دونوں کو کیسی عقیدت تھی اس کا اظہار اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے کہ ملتان کو جاتے ہوئے سلطان اجودھن میں رکا اوراس کے وزیر بلبن نے شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر کی خدمت میں آکر کچھ نقد اور چار مواضعات کی مثال سامنے رکھ دی۔شیخ نے نقد تو قبول کرلیا اور کہا کہ ان کو درویشوں پر یکجا خرچ کروں گا لیکن گاؤں کی مثالیں واپس لے جائیں،ان کے بہت طلب گار ہیں، یہ ان کو دے دیجیے۔

یہ بلبن کی بادشاہت کا چھٹا سال تھا۔۱۱ر رمضان ۶۶۹ھ (۲۴ر اپریل ۱۲۷۱ء) کو شیخ الاسلام خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر نے اجودھن میں 'نظام الملّت والدین محمد بن احمدؒ (خلافت نامہ کے الفاظ) کو اپنی نیابت وخلافت سے سرفراز کیا۔آپ نے دہلی واپس آنے سے قبل شیخ سے درس وتدریس جاری رکھنے کی اجازت لے لی تھی جو دہلی میں آپ کا مشغلہ تھا۔یہاں آپ کم وبیش دس سال مختلف مکانات میں رہے۔جن میں سے دوسال برج دہلی (قطب مینار) کی فصیل سے متصل ایک تین منزلہ مکان عمادالملک راوت عرض کا تھا جو بلبن کا وزیر جنگ (عریض المما لک) اور امیر خسرو کا نانا تھا۔ان کے والد امیر سیف الدین لاچین کے انتقال کے بعد خسرو اوران کے دو بھائیوں کی تعلیم وتربیت اسی کے ذمہ تھی۔

سید محمد محمود کرمانی جو حضرت گنج شکر کے مریدوں میں تھے، دہلی آئے تو ان کا خاندان بھی اسی مکان کی نچلی منزل میں مقیم تھا۔شیخ بدرالدین اسحاق کی وفات کے بعد ان کے بچوں سید محمد اور سید موسی کو بھی آپ نے بلوالیا۔آپ اورآپ کے متعلقین یہاں سے جس مکان میں منتقل ہوئے اس میں صرف ایک ماہ رہے۔پھر سرائے رکابدار میں رہے۔پھر ایک اور مکان میں منتقل ہوئے۔اس کے بعد شمس الدین شرابدار، اس کے بیٹے اوراقربا جو آپ کے معتقدین تھے،اپنے مکان میں لے آئے،اس مکان میں آپ کئی سال تک رہے لیکن آپ دہلی میں رہنا نہیں چاہتے تھے،سکون کی تلاش میں تھے اورکسی دیہات میں سکونت اختیار کرنا چاہتے تھے۔پٹیالی جانے کا خیال آیا جہاں خسرو رہتے تھے،بسنالہ گئے لیکن وہاں کوئی مکان گروی یا کرایہ پر بھی نہیں مل سکا۔بالآخر ایک اشارہ غیبی پر غیاث پور آئے جہاں بہت کم آبادی تھی لیکن جب بلبن کے پوتے اور اس کے جانشین معزّ الدین کیقباد (جلوس 1286ء) نے کیلوکھرلی گاؤں کے قریب دریائے جمنا کے کنارے محلات تعمیر کرائے جہاں سے غیاث پور صرف ایک میل تھا تو یہ دونوں گاؤں بھی شہر میں شامل ہوگئے اوراب یہاں بھی ملوک، امرا اور دوسرے لوگوں کے آنے جانے سے مجمع ہونے لگا۔

عہد بلبن تک حکومت اور فوج کے اعلیٰ عہدوں پر صرف ترک اور وسط ایشیاء و مغربی ایشیاء کی مختلف نسلوں کے ان کے وفادار مسلمان ہی فائز ہوا کرتے تھےلیکن جب پنجاب کی ایک بہت ہی چھوٹی سی ریاست سامانہ کا حاکم جلال الدین خلجی اقتدار (۱۲۹۰ء) میں آیا جو ایک ترکی النسل افغان سردار تھا لیکن ترکوں کی نخوت سے ناراض افغان سرداروں اور ہندنژاد مسلمانوں کی مدد سے اقتدار میں آیا تھا تو یہ بندوبست ختم ہوگیا۔ اب حکومت اور فوج کے اعلیٰ عہدوں پر ہندی الاصل افراد بھی فائز ہونے لگے۔ جلال الدین نے امیر خسرو کو اپنا مصحف دار بنایا۔ شیخ کی شہرت شاہی دربار تک پہنچ گئی تھی لیکن تنگی معاش بدستور قائم تھی۔ فاقہ کشی کے اس دور میں سلطان نے اس پیغام کے ساتھ کچھ فتوح بھیجے کہ اگر شیخ راضی ہوں تو ان کے خدمت گاروں کے لیے چند گاؤں مقرر کردوں لیکن آپ نے گاؤں لینے سے انکار کردیا۔ اس سے قبل بھی دوبار آپ ایسا کر چکے تھے، پہلی بار تو کسی نے دو باغ اور بہت سی زمین کا کاغذ تملیک اس کی زراعت کے اسباب و آلات کے ساتھ بھیجا تھا اور اس کے قبول نہ کرنے پر آپ کے چند اکابر ساتھیوں کے سوا اکثر متعلقین ناراض ہو گئے تھے۔ دوسری بار جب کیقباد نے اپنے ایک مصاحب خواجہ سرا کافور سے کہلوایا تھا کہ وہ ہر جمعہ کو بلبن کے ثواب کے لیے دو تنکے پیش کیا کرے گا۔ اسی طرح سلطان جلال الدین خلجی آپ سے ملنا چاہتا تھا لیکن باوجود خواہش کے اجازت نہ ملی تو اس نے امیر خسرو کے ساتھ طے کیا کہ بغیر اجازت آپ کی خدمت میں آئے لیکن جیسی ہی یہ خبر آپ کو ملی، آپ اجودھن کی زیارت کو روانہ ہو گئے۔

علاء الدین خلجی نے زمام اقتدار سنبھالا تو اس نے باضابطہ اور مستقل افواج تشکیل دی، فوج کے افسران اور سپاہیوں کی نقد تنخواہوں کا انتظام کیا اور مہنگائی پر کنٹرول کے لیے ایک مؤثر اقتصادی پالیسی متعارف کرائی، بازاروں پر کنٹرول کا نظام قائم کیا اور تجارتی کمپنیاں بنائیں جن کو سلطنت کے خزانے سے قرض دئے جاتے تھے۔ پھر ان دونوں طاقتوں (مضبوط اقتصادی نظام اور طاقتور فوج) کی بدولت سرزمین ہند کے جنوبی کونے (بحر ہند کے ساحل) سے تبت کے پٹھاروں اور خلیج بنگال سے غزنی تک پورے جنوبی ایشیاء کو ایک پرچم اور ایک مرکز کے زیر نگیں کر کے ایک اتنی بڑی سلطنت قائم کی جو تاریخ نے نہ پہلے کبھی دیکھی تھی، نہ پھر کبھی دیکھی۔ راجپوت باغیوں سے خلجی کی جنگوں کو کچھ لوگ بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں حالانکہ اس کا زیادہ بڑا کارنامہ جنوب کی فتوحات ہیں۔ یہ دہلی کا پہلا سلطان تھا جس نے وندھیاچل کی پہاڑیوں کو پار کر کے جنوب اور جنوب مغرب کا رخ کیا۔ اس وقت اس خطہ میں چار قدرے بڑے اور بہت سے چھوٹے موٹے رجواڑے تھے۔ مغرب میں دیوگری کے یادو، مشرق میں وارنگل کے کاکاٹیہ، کرشنا ندی کے جنوب میں دوارسمدر کے ہویسلا اور مدورا کے پانڈیا۔ صرف چھ سال کے اندر یہ ریاستیں، سب کی سب سلطنت کا حصہ بن گئیں۔ اب یہ راجے مہاراجے خلجی سلطنت کے دست و بازو تھے اور وصال کہلاتے تھے۔ دیوگری کو وہ ۱۲۹۴ء میں ہی فتح کر چکا تھا جب کڑا (مالوہ۔ موجودہ مدھیہ پردیش و چھتیس گڑھ کے بیشتر علاقے) کا گورنر تھا۔

علاء الدین خلجی کا دور (۱۲۹۶ء۔۱۳۱۶ء) اگر صرف کسی دو باتوں کے لیے یاد رکھا جائے گا تو یہ اقتصادی استحکام اور مذہبی رواداری کا فروغ ہے؛ اور اگر اس عہد کے صرف دو بڑے کرداروں کو چننا ہو تو یہ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین والملت اور سلطان علاء الدین خلجی ہیں۔ علاء الدین خلجی نے جس حکمت وشجاعت سے منگولوں کے حملوں کا مقابلہ کیا، تاریخ میں اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ اس کی اس کامیابی میں اس کے انتہائی دلیر سپہ سالار ظفر خاں کا بڑا ہاتھ تھا۔ کہاوت مشہور ہے کہ منگولوں کے پیاسے گھوڑے ظفر خاں کو دیکھ لیتے تھے تو پانی پینے سے انکار کر دیتے تھے۔ منگولوں (چغتائی خاں کی افواج) کا پہلا حملہ (۱۲۹۷ء جارن منجوڑ) اس لیے ناکام ہو گیا کہ ظفر خاں نے ان کو ریگستان میں گھیر لیا تھا۔ اگلے سال منگول زیادہ طاقت کے ساتھ واپس آئے اور وہ دہلی کے بہت قریب پہنچ گئے۔ اس بار ان کے لشکر کی تعداد دو لاکھ سے زائد تھی اور ان کی کمان وسط ایشیاء کے ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے والا سپہ سالار قتلغ خاں کر رہا تھا۔ لیکن علاء الدین خلجی نے ہمت نہیں ہاری، درباریوں کے مشوروں کے خلاف اس نے آگے بڑھ کر منگولوں پر حملہ کر دیا اور ظفر خاں نے ایک بار پھر ان کو شکست دی۔ تیسری بار منگولوں نے اس وقت حملہ کیا جب علاء الدین خلجی چتوڑ (۱۳۰۳ء) کی جنگ میں مصروف تھا۔ یہ اس کے لیے بہت نازک اور مشکل وقت تھا کہ وہ باغی راجپوتوں کا مقابلہ کرے یا منگولوں کا لیکن اس نے اس بار بھی ہمت سے کام لیا اور منگولوں کی ۱۲۰۰۰ گھڑسوار فوج بغیر کسی خون خرابہ کے واپس چلی گئی۔

اس واقعہ کو تذکرہ نگاروں نے سلطان المشائخ کی کرامت میں شمار کیا ہے اور ظاہر ہے کہ لوگوں میں اس کی شہرت رہی ہوگی، اسی لیے کتابوں میں جگہ پا گئی۔ کتب تذکرہ میں ہے کہ خوف کے مارے شہر کے اطراف کے لوگ بھی شہر میں پناہ لے چکے تھے اور آپ نماز جمعہ کے لیے مسجد گئے تو آپ کے گرد لوگوں کا بہت ہجوم ہوا، نکلنے میں بہت وقت لگا؛ اور یہ کہ اگلے ہی دن خبر آئی کہ راتوں رات یہ فوج واپس چلی گئی، پھر سب نے سکون کا سانس لیا۔ منگولوں نے اس کے بعد بھی متعدد حملے کئے لیکن انہوں نے دہلی کا رخ پھر کبھی نہیں کیا، امروہہ اور پنجاب کی طرف آئے لیکن اس بار بھی سلطان تیار تھا، اس نے ان کی سرکوبی کیلیے اپنے دو آزمودہ کار سپہ سالار غازی ملک محمد اور ملک کافور کی قیادت میں فوجیں بھیجیں جنہوں نے منگولوں کو مبہوت کر دیا اور وہ وسط ایشیاء کی جانب واپس چلے گئے۔ ۱۳۰۶ء میں وہ ایک بار پھر آئے۔ ملتان کے نزدیک دریائے سندھ کو عبور کیا اور سیلاب کی طرح ہمالہ کی جانب بڑھنے لگے۔ پنجاب کے گورنر ملک غازی (۲۰) نے انہیں روکا اور تقریباً پچاس ہزار منگولوں کو قیدی بنا لیا جن میں ان کا سردار بھی شامل تھا۔

منگولوں کا آخری حملہ ۸۔۱۳۰۷ء میں ہوا۔ اس بار بھی وہ کسی طرح دریائے سندھ عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن پھر علاء الدین خلجی کی فوجوں نے ان کو آ لیا اور وہ تہہ تیغ کر دیئے گئے۔ ۱۳۰۸ء کے بعد منگولوں نے پھر کبھی ہندوستان کا رخ نہیں کیا۔ ٹھیک ان ہی دنوں منگولوں کا پورے جنوب مغربی ایشیا کو روند

دینا، بغداد کی تباہی (۵۸۔۱۲۵۷ء)، شام ومصر پر ان کے حملے، جنگ عین جالوت (۱۲۶۰ء) میں مسلمانوں کی تباہ کن شکست، پھر مسلمانوں کے خلاف یوروپی اقوام (فرانس) کا اتحاد اور اس کے بعد کے واقعات نگاہوں میں ہوں تب ہی اس دور کے ہندوستان کی سیاست و معیشت کی صحیح تصویر نگاہوں میں آسکتی ہے۔ ان ممالک سے ہر دن ہر طبقہ کے ہزاروں لوگ اسی طرح ہندوستان آرہے تھے جس طرح شام اور عراق کے لوگ اس اکیسویں صدی میں ترکی اور یوروپ کے ملکوں یا روہنگیے بنگلہ دیش اور ہندوستان میں پناہ لے رہے ہیں۔فرق یہ ہے کہ دنیا نے ابھی پناہ گزیں جیسی اصطلاحات وضع نہیں کی تھی اور اللہ کی زمین اللہ کے بندوں پر تنگ نہیں ہوئی تھی۔اس ماحول میں خواجہ نظام الدین کی خانقاہ کا کردار اور آپ کی عظمت کیا ہے؛ اور آپ مصیبتوں کے ماروں کا کتنا مضبوط سہارا تھے، اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ خود تو سوکھی روٹی اور پانی سے افطار کرتے لیکن ہر دن ہزاروں افراد آپ کے جماعت خانہ میں کھانا کھاتے اور فقرا اس در سے تونگر بن کر اٹھتے۔تصور کیجیے کہ ایک دن میں پانچ لاکھ تنکے (چاندی کے سکے) کون لٹاتا ہے۔

سیاسی اور مذہبی ہر دو لحاظ سے ''علاء الدین خلجی ہندوستان کے حکمرانوں میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے خود کو جمہور کا ایک فرد سمجھا، اس کی زندگی کا سب سے سیدھا سادہ اصول فلاح عام تھا جس پر وہ ایمان رکھتا تھا جس کا ذکر اس نے قاضی حمید ملتانی سے گفتگو کے دوران کیا تھا۔خدمت خلق کا تصور اس کے یہاں عوام کی مادی بہبود ہی کا پابند ہے۔اس نے لشکر جرار ترتیب دے کر منگولوں کے حملے روک دئے، راجپوتوں کو فتح کرلیا، دکن کے راجاؤں سے ان کی دولت چھین لی اور اشیا کی قیمتیں مقرر کرکے عوام کو سہولتیں بہم پہنچائیں۔اس نے سلطان محمود یا دیگر فرمانرواؤں کی طرح اسلام کی خدمت کا دعوی بھی کبھی نہیں کیا لیکن وہ حضرت شیخ نظام الدین اولیا کا بڑا احترام کرتا تھا۔اس نے خود علما کو سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا نہ ان کو اس کی اجازت دی کہ وہ سیاست میں دخیل ہوں، مصیبت زدہ لوگوں کی اس نے مدد کی لیکن مدد کو کبھی تماشہ بننے نہیں دیا۔مذہبی اکابر کے یہاں نہ خود گیا نہ ان کو دربار میں آنے کی دعوت دی'' (۲۱)۔ یہی زمانہ سلطان المشائخ کی خدمات اور آپ کی شہرت و مقبولیت کا عہد عروج بھی ہے۔آپ حکام کا اپنے جماعت خانہ میں آنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن کسی پر اپنا دروازہ بند بھی نہ کرتے تھے۔بعض مؤرخین آپ سے علاء الدین خلجی کی حمایت کا افسانہ منسوب کرتے ہیں لیکن سوائے اس کے کہ اس کی معاشرتی اصلاحات کی وجہ سے آپ کے جماعت خانہ میں اسے اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا تھا، اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ بادشاہ اور آپ کا ایک دوسرے کے بارے میں کوئی ایک فقرہ بھی کسی مستند روایت میں نہیں ملتا۔

علاء الدین خلجی کے انتقال کے بعد سلطان المشائخ کوئی دس سال اور اس دنیا میں رہے۔سلطنت کی سیاست میں یہ شورشوں، بغاوتوں اور جانشینی کے لیے ایک کے بعد ایک قتل کا دور تھا۔اس میں بھی بیچ کے دو تین

سال سلطان المشائخ اور آپ کے مریدین ومتوسلین کے لیے زیادہ صبر آزما تھے۔ یہاں آپ سے متعلق دو قضیے کا ذکر بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو بادشاہ قطب الدین مبارک خلجی کی حرکتیں اور اس کا انجام؛ دوسرے تغلق کی ناراضگی، سماع کے مسئلہ پر محضر اور بادشاہ کی حادثاتی موت سے منسوب فسانے ۔علاء الدین نے اپنے بیٹے خضر خاں کو ولی عہد نامزد کیا تھا لیکن پھر ناراض ہوکر اسے گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ پہلے علاء الدین کا سپہ سالار ملک کافور اس کی موت کے بعد تخت پر بیٹھا لیکن امرا کی حمایت اسے بھی حاصل نہ ہوسکی اور چند ماہ کے اندر قتل کر دیا گیا۔ پھر علاء الدین کے چھ سال کے بیٹے شہاب الدین عمر کو تخت نشین اور اس کے بڑے بھائی قطب الدین مبارک کو اس کا نگراں مقرر کیا۔ مبارک جلد ہی اسے قید کر کے خود سلطان بن بیٹھا۔ قطب الدین مبارک بھی اپنی حکومت کے ابتدائی دو سال مذہبی امور میں غیر جانبداری کی روش پر قائم رہا لیکن پھر سازشیں رنگ لائیں، اس نے اپنے ان تین اندھے بھائیوں کو جو گوالیار کے قلعے میں قید تھے، قتل کر دینے کا حکم دیا تو اس نے حضرت نظام الدین سے بھی جھگڑنا ضروری سمجھا، اس لیے کہ خضر خاں ایک زمانے میں آپ کا مرید تھا۔ آپ کو حکومت کے معاملات میں کچھ دلچسپی نہ تھی۔ پھر بھی وہ آپ کو اس میں گھسیٹ لینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ پہلے تو اس نے جامع مسجد بنوائی اور مسجد تیار ہوگئی تو علما و مشائخ کو دعوت دی کہ جمعہ کی نماز یہیں پڑھیں۔ آپ نہیں گئے۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ آپ کے یہاں فتوح (۲۲) بہت آتے ہیں اور یہ زیادہ تر اس کے افسر بھیجتے ہیں، اس نے افسران کو اس سے روک دیا۔ حالانکہ یہ اس کی غلط فہمی تھی، آپ بڑے افسران کی فتوح اکثر قبول ہی نہیں کرتے تھے۔ فتوح زیادہ تر عوام الناس سے آتے تھے، اس لیے بادشاہ کے حکم کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ خبر پھیلی تو لوگوں نے زیادہ لانا شروع کر دیا۔ آپ نے جماعت خانے کا خرچ دوگنا کر دینے کا حکم دے دیا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مبارک خلجی کے دور میں آپ کے مطبخ اور خیرات میں دو ہزار تنکے ہر روز خرچ ہوتے تھے۔ اب آپ کو قانونی گرفت میں لانے کی کوشش کی جانے لگی۔ بادشاہ برابر کہتا تھا کہ' جو میرے پاس شیخ نظام الدین کا سر لائے گا، اسے ایک ہزار سونے کے تنکے انعام میں دوں گا'۔ دہلی اور اطراف ومضافات میں بدمعاشوں کی کمی نہیں تھی لیکن کسی کی اس سونے کو لینے کی خواہش نہیں ہوئی۔ دہلی کے علما و مشائخ چاند رات کو مبارکباد دینے کے لیے سلطان کے دربار میں جایا کرتے تھے، یہ ایک قدیم روایت تھی لیکن آپ کبھی نہیں گئے، اپنے خادم اقبال کو بھیج دیا کرتے تھے۔ چار سال تک خود مبارک خلجی کو کبھی اس پر اعتراض نہ ہوا لیکن اب اس نے اس کو اپنی توہین سمجھا کہ آپ اپنے بجائے نوکر کو بھیج دیتے ہیں۔ اس نے طے کیا کہ آنے والی چاند رات کو اگر شیخ نظام الدین خود نہ آئے تو ان کو بادشاہی حکم سے بلائے گا لیکن آپ اس بار بھی نہیں گئے۔ یہ ۷۲۰ھ کے جمادی الاول کی پہلی رات تھی جب خسرو خاں نے مبارک خلجی کو قتل کر کے اس کا سر شاہی محل کی دوسری منزل سے نیچے پھینک دیا۔

خسرو خاں جو علاء الدین خلجی کی گجرات کی مہمات کے دوران شاہی فوج میں شامل ہوا تھا اور اس کی دکن

کی فتوحات میں اس کا بڑا ہاتھ تھا، سلطان ناصر الدین خسرو کی حیثیت سے اس نے امرائے سلطنت اور علما و مشائخ کے پاس بڑی بڑی رقمیں بھیجیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین کی خدمت میں پانچ لاکھ تنکا بھیجا۔ کوئی دو ماہ بعد ملک غازی (والی ملتان)، اس کے بیٹے محمد غازی (عرف جونا ملک - والی سندھ) اور جونا خان (والی سامانہ) کی فوجوں نے اس 'ہندو بچہ' اور اس کے قبیلہ برادو کو اس کے کیے کی سزا دی۔ غازی ملک (سلطان غیاث الدین تغلق) کی تخت نشینی (۱۳۲۰ء) کے بعد اس کے سامنے بیت المال کا حساب و کتاب آیا تو اس نے یہ رقوم سب سے واپس طلب کیں۔ دوسرے علما و مشائخ نے تو واپس کر دیا لیکن خواجہ نظام الدین ایسا نہ کر سکے کیونکہ ان کا معمول تھا کہ جو کچھ بھی آتا، اگلے دن کے لیے کچھ بھی اٹھا نہ رکھتے۔ بادشاہ کو جب یہ بتایا گیا تو وہ ناراض ہو گیا کہ کیا شیخ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ بیت المال کی رقم ہے جبکہ خواجہ نظام الدین سبھی بادشاہوں کو ایک جیسا سمجھتے اور ان کے خزانہ کا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر حرام جانتے اور اس کو فقرا میں لٹا دیتے تھے۔ بادشاہ نے مزید کچھ باز پرس نہیں کی کیونکہ وہ جلال الدین خلجی کے زمانے سے سلطنت کا ملازم تھا اور آپ کے معمولات سے واقف تھا۔ علماء و مشائخ کے جھگڑوں میں اس کی ویسی ہی غیر جانبداری کی روش تھی جیسی علاء الدین خلجی کی تھی۔ علما کا ایک گروہ سماع کے خلاف تھا اور یہ کوئی نیا اختلاف نہ تھا۔ قاضی جلال الدین لوالجی (نائب حاکم مملکت در شرع) اور شیخ زادہ حسام الدین فرجام (۲۳) نے اس معاملے کو تغلق کے سامنے پیش کیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ شیخ آج کل سب سے بزرگ صوفی ہیں لیکن وہ سماع کو جائز رکھتے ہیں اور ان کی وجہ سے سماع کا بہت رواج ہو گیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ایک محضر ہو اور بادشاہ دونوں کے دلائل سن کر طے کرے کہ کیا حکم جاری کرنا چاہیے۔ بادشاہ کو یہ بات معقول معلوم ہوئی۔ شیخ کو دعوت دی گئی، شہر کے مشہور امرا اور علما و مشائخ بھی بلائے گئے۔ مولانا فخر الدین زرادی اور قاضی محی الدین کاشانی بھی بن بلائے آپ کے ساتھ ہو لیے۔ محضر شروع ہونے سے پہلے ہی قاضی جلال (نائب حاکم مملکت) نے شیخ کو تنبیہ کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے ان کی سب باتیں صبر سے سنی لیکن جب اس نے یہ کہا کہ ''اگر اس کے بعد تم نے دعوت سماع کی اور سماع سنا تو میں حاکم شرع ہوں تم کو سزا دوں گا'' تو سلطان المشائخ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: ''معزول ہو تم اس شغل سے جس کے گھمنڈ پر تم ایسی باتیں کرتے ہو''۔ پھر حسام الدین فرجام نے موضوع پر گفتگو شروع کی اور اس نے سماع پر بہت سے اعتراضات کیے۔ حاضرین آپ کا جواب سننا چاہتے تھے لیکن شور و غل بہت تھا۔ بادشاہ نے بار بار کہا کہ غلبہ مت کرو، سنو شیخ کیا کہتے ہیں۔ ابھی آپ کی تقریر مکمل نہ ہوئی تھی کہ اس جلسہ میں ایک غیر جانبدار مبصر شیخ علم الدین (شیخ بہاء الدین زکریا کے نواسہ) داخل ہوئے اور بادشاہ نے ان سے چند سوال کیے جن کا جواب سماع کے حق میں جاتا تھا۔ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قاضی لوالجی نے کہا کہ 'بادشاہ کو امتناع سماع کا حکم دینا چاہیے چونکہ یہ امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے'۔ شیخ نے کہا کہ 'میں نہیں چاہتا کہ بادشاہ اس معاملے میں کوئی حکم جاری کرے'۔ بادشاہ نے آپ کی نصیحت قبول کی اور تعظیم و تکریم کے ساتھ دربار سے رخصت کیا۔ بادشاہ نے اس

کے کوئی بارہ دن بعد قاضی جلال الدین کو اس عہدے سے موقوف کر دیا۔لیکن بادشاہ کی حادثاتی موت کو سامنے رکھ کر مخالفین نے کئی افسانے گڑھ لیے جو تاریخ کا حصہ بن گئے۔مشہور ہے کہ بادشاہ نے اپنی بنگال کی مہم سے واپسی سے پہلے شیخ کو دہلی چھوڑ دینے کو کہا تھا اور واپسی میں دہلی میں داخل ہونے سے پہلے جس حادثے میں اس کی موت ہوگئی، وہ سازش تھی۔عبدالقادر بدایونی اور دوسرے مورخین نے اس حادثہ کو خواجہ نظام الدین، محمد بن تغلق اور اس کے وزیر تعمیرات ملک احمد ایاز تلنگانی کی سازش لکھا ہے لیکن یہی مورخین اس حادثہ کی الگ الگ کہانیاں بیان کرتے ہیں، کوئی لکھتا ہے کہ لکڑی کی عمارت میں آگ لگ گئی تھی، کسی نے عمارت کے ہاتھیوں کی دھمک سے گر جانے کا قصہ بیان کیا ہے اور کسی نے بلند دروازہ کی بلندی معمول سے کم ہونا اور اس سے بادشاہ کا سر ٹکرا جانا اس کی موت کا سبب بیان کیا ہے۔قرین قیاس ہے کہ مخالفین نے ان افسانوں کو پھیلایا اور عقیدت مندانہ گل افشانیاں بھی شامل ہوگئی ہوں گی لیکن کسی معاصر ماخذ میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔اسی واقعہ کے تعلق سے مشہور ہے کہ جب شیخ سے کہا جاتا تھا کہ بادشاہ دہلی پہنچ رہا ہے تو آپ کہتے: 'ہنوز دہلی دور است'۔اگر اس میں کچھ سچائی ہوتی تو امیر خورد کرمانی اس کا ذکر ضرور کرتے جبکہ محضر کی تفصیلات مولانا فخر الدین زرادی کے رسالہ کشف القناع من وجوہ السماع میں موجود ہے اور وہیں سے امیر خورد نے سیر الاولیا میں بھی نقل کیا ہے۔

سلطان غیاث الدین تغلق کی موت کے کوئی چھ ماہ بعد ہی ۱۸ ربیع الثانی ۷۲۵ھ/ ۳ اپریل ۱۳۲۵ء کو حضرت سلطان المشائخ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔معاصر شواہد کے مطابق آپ کی قبر انور پر سلطان محمد بن تغلق نے ایک بہت بڑا گنبد تعمیر کرایا اور فیروز شاہ تغلق نے دوسری عمارتیں بنوائیں۔'فتوحات فیروز شاہی' (۲۴) میں اس مقبرے کا ذکر کچھ اس طرح کیا گیا ہے کہ گویا وہ عالیشان شاہی مقبروں کا مقابلہ کرتا ہے۔بے شک اللہ جس کو چاہتا ہے، لوگوں کے دلوں میں بھی اس کی محبت ڈال دیتا ہے۔دنیادار علما و مشائخ اور حاسدین نے جن سلاطین کو سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا سے بدگمان کرنے کی سازشیں کیں، ان ہی کے دلوں میں آپ کا ایسا احترام و عقیدت ہمارے لیے ناقابل فہم نہیں ہے۔

(۷)

التتمش اور بلبن سے محمد بن تغلق (۱۳۵۱ء) تک ہندوستان کی سیاست، سماج اور معیشت نے کئی کروٹیں لیں۔تبدیلیوں کی سمت و رفتار کو سمجھنے کے لیے چند واقعات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

ایک، پوری تاریخ میں پہلی بار محمد تغلق کے جانشین کے لیے پرامن انتقال اقتدار ممکن ہوا جب امرائے سلطنت نے اس کے ۴۵ سالہ عالم فاضل خداترس چچازاد بھائی ملک فیروز بن رجب (۱۳۰۹ء-۱۳۸۸ء) پر تخت نشین ہونے کے لیے دباؤ ڈالا جو ایک عبادت گزار شخص تھا، انہوں نے اس سے کہا کہ 'شریعت کے اصولوں پر حکومت کرنا اور خلق خدا کی ضروریات پوری کرنا بھی عبادت ہی ہے' اور اس نے ان کی یہ درخواست قبول کی جبکہ

خواجہ جہاں ملک احمد ایاز تلنگانی نے محمد بن محمد تغلق کی تاجپوشی کر دی تھی جو ایک ماہ بعد فیروز شاہ تغلق کے حق میں دست بردار ہو گیا۔

دو، نئے بادشاہ نے جنگی مہمات کے بجائے رعایا کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی میں دلچسپی لی، سماجی و مذہبی اصلاحات پر توجہ دی۔ مثلاً اس نے دکن کی بہمنی سلطنت کے ساتھ کوئی تعارض نہ کیا جو صوفیوں کی فلاحی ریاست سمجھی جاتی تھی اور خود مختار ہو گئی تھی۔

تین، اسے مذہب حنفی کا سخت پابند اور رسومات و خرافات مخالف مانا جاتا ہے لیکن اس نے ہندوستان کی اخلاقی و معاشی صورت حال کے پیش نظر چور کا ہاتھ کاٹنے اور زانی کو سنگسار کرنے جیسی سزائیں معطل کر دیں۔

چار، محنت کشوں، کسانوں اور دستکاروں کی غربی کو سرکاری سرمایے سے دور کرنے کا منصوبہ بنایا، کاشت کی زمین پر لگان میں تخفیف کی، بوڑھے ملازموں کے لیے پنشن کا نظم کیا، مسلسل بغاوتوں اور جنگوں کی وجہ سے غلاموں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اور یہ طبقہ ملکی معیشت پر بوجھ بن گیا تھا، ان کو ہنر مند بنانے کے لیے منصوبے بنائے اور مختلف قسم کے ہنر سکھانے کا انتظام کیا۔

پانچ، بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے کی مہم چلائی، آبپاشی کے نئے انتظامات کیے، دریائے جمنا اور ستلج سے چار نہریں نکلوائیں جس سے کھیت لہلہانے لگے، باغات لگوائے اور نئے شہر بسائے۔ اس نے جو مساجد، مدارس، سرائیں، حمام، پل اور سڑکیں بنوائیں؛ اور دوسرے رفاہی کام کرائے ان کی تعداد ۸۴۵ تک شمار کی گئی ہے۔ اس کے لگوائے ہوئے باغات کی تعداد ۱۲۰۰ رہے جبکہ، فیروز آباد، حصار، فتح آباد اور جونپور اسی کے بسائے ہوئے شہر ہیں۔

فیروز شاہ پر بنگال کی مہم سے واپسی کے دوران کٹک پر حملہ کرنے اور جگن ناتھ مندر کو توڑنے کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن اس میں اس کے سوا کچھ حقیقت نہیں ہے کہ اس نے جاج نگر کے راجا گج پتی پر چڑھائی کی اور اس نے ایک مختصر جنگ کے بعد اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

عین ممکن ہے کہ اس جنگ کے دوران مندر کو کوئی نقصان پہنچا ہو ورنہ ایبک سے فیروز شاہ تغلق تک اس پورے عہد سلطنت میں ''اگر کہیں کسی نے جنوں کی گزراں لہر میں کسی مندر کو نقصان پہنچایا تو ان سلاطین نے ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے ان کو دوبارہ تعمیر کرا دیا۔ لنگ کی پرستش سے ابتدا میں سخت نفرت کا اظہار کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ ان کو اس کی بھی اجازت مل گئی''۔ ترکوں نے مذہبی رواداری سے کام لیا۔ یہاں تک کہ ''نہ تو مندروں کی دیوداسیوں کی اصلاح کا رخ کیا نہ ہندوؤں کے قبیح رسم و رواج میں کسی طرح کی مداخلت کی'' (۲۴)۔

تغلقوں کا دور آتے آتے سلاطین کے حرم میں کثرت سے ہندو عورتیں داخل ہونے لگیں اور راجپوتوں کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ اس نے سلطنت کے مجموعی کردار اور نظام حکومت کو بڑے پیمانے پر متأثر کیا۔ محمد بن تغلق کی

تعقل پسندی بہت مشہور ہے، وہ خود فلسفہ ومنطق کا بڑا عالم تھا، اس نے سیاست اور معیشت میں کئی تجربے کئے، نئے نئے قلعے اور راجدھانیاں تعمیر کرائیں، دارالحکومت دکن کے پہاڑوں کے بیچ دولت آباد لے گیا جس سے دہلی اجڑ گئی، وہاں کا موسم موافق نہ آیا جس سے بہت سے امرا اور سپاہی فوت ہو گئے۔(فوائد الفواد کے مولف امیر حسن علا سجزی کی قبر بھی وہیں ہے)۔

ایسے ہی امور میں اس کی ناکامی نیز مجرموں اور حکام کو سخت سزائیں دینے کی وجہ سے سر پھرا مشہور ہے لیکن ایک تو اس نے امور سلطنت میں ہندو مسلمانوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی، دوسرے غیر مسلموں کے مذہبی امور میں مداخلت سے خود کو دور رکھا۔ یہ اسی کے دور میں ممکن تھا کہ دیوگری کے راجا رام دیوٹھا کر کا بھتیجا ہر دیوٹھا کر (خواجہ جہاں ملک احمد ایاز تلنگانی) سلطنت کا امیر الامرا؛ اور ایک اور نو مسلم، وارنگل کا سابق قلعہ دار ناگا یا گن وبھودو (ملک مقبول خاں) سلطنت کا امیر العساکر (سپہ سالار) اور وزیر مالیات ومنتظم اعلیٰ ہوسکتا تھا جس کو فیروز شاہ 'بھائی' کہہ کر پکارتا تھا اور فتوحات فیروز شاہی میں خود اس نے ذکر کیا ہے کہ دہلی کا اصل حکمراں تو خان جہاں (ملک مقبول خاں) ہے۔ سلطنت کو آگے چل کر اس کی قیمت چکانی پڑی۔ ملکی اور ترک امرا کی کشمکش نے ملک کی فضا کو مکدر کر دیا، یہاں تک کہ ہندوستان میں عہد وسطی کے اس عہد زریں میں دنیا کی یہ سب سے دولت مند سلطنت تیمور لنگ کے حملے کا مقابلہ نہ کر سکی اور اس ملک کو علاء الدین خلجی اور اس کے سپہ سالاروں (جن میں تغلق اور محمد بن تغلق بھی شامل تھے) نے منگولوں کی جس تباہی سے بچایا تھا، فیروز شاہ تغلق کے جانشینوں کی جماعت اس سے دہلی کو نہ بچا سکی۔

تہذیب وتمدن اور زبان ثقافت نے اس عہد میں کیا کروٹ لی، اس کو دیکھنے کے لیے بھی امیر خسرو کی شخصیت، ان کی شاعری اور ان کے معاصرین ومتبعین کی علمی وادبی خدمات کو سامنے رکھنا چاہیے اور سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین کو زیادہ متوازن اور صحیح سیاق وسباق میں سمجھنے کے لیے بھی۔ خسرو کے گیت اور دوہے اس زبان کے اولین نمونے اور مثنوی 'چنداین' (۱۳۷۹-۸۰ء) اس زبان کی اولین کتاب ہے جو آگے چل کر اردو، ہندی کہلائی۔ منتخب التواریخ کے مصنف عبدالقادر بدایونی کے بقول دہلی کے مشہور صوفی شیخ تقی الدین واعظ ربانی چنداین کے ابیات منبر کے اوپر پڑھا کرتے تھے (۲۴)۔ اس کا مصنف ملا داؤد ڈل مئو (اودھ) کے قاضی ملک الامرا ملا مبارک کا فرزند، خواجہ نصیر الدین اودھی چراغ دہلی کے بھانجے اور جانشین خواجہ زین الدین کا مرید وشاگرد اور امیر خسرو کا متبع ہے۔ مصنف خود ایک حکمراں خاندان کا فرد، بادشاہ فیروز شاہ تغلق کے وزیر خان جہاں مقبول خاں اور اس کے بیٹے خان جہاں جونا شاہ کا مقرب تھا۔ وہ اس میں بادشاہ اور خان جہاں کی تعریف اس لیے کرتا ہے کہ اس کی حکومت میں ترک اور ہندو شیر وشکر ہیں۔

امیر یمین الدین ابوالحسن خسرو آپ کے ان شاگردوں میں تھے جن کو آپ نے بچپن میں بھی تعلیم دی تھی

جب درس و تدریس آپ کا مشغلہ تھا اور وہ بہت کم سنی میں آپ کے مرید ہو گئے تھے۔ لیکن خسرو کی روش شیخ کی روش سے بظاہر بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ آپ کبھی کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں گئے جبکہ دربار کی ملازمت خسرو کا پیشہ ہی تھا۔ یہ بھی اس واقعہ کا قابل غور پہلو ہے کہ آپ روک دیتے تو طے تھا کہ وہ انکار نہ کرتے لیکن ایسا نہ کیا۔

خسرو نے سب سے پہلے بلبن کے بھتیجے علاء الدین کشلی خاں (ملک چھجو) کی نوکری کی اور اس کے قصیدے لکھے۔ پھر بلبن کے بڑے بیٹے سلطان محمد خان کے ساتھ ملتان گئے۔ وہ منگولوں کے ایک حملے میں شہید ہو گیا، ایسا مرثیہ کہا کہ جس کی نظیر نہیں ملتی، ہندوستان کی فارسی شاعری کا شاہکار ہے۔ پھر امیر علی سرجاندار کی نوکری کر لی، اس کے بعد کیقباد کے حکم سے مثنوی 'قران السعدین' لکھی۔ کیقباد کی موت کے بعد سلطان جلال الدین خلجی نے ان کو اپنا مصحف دار مقرر کیا۔ خسرو نے جلال الدین خلجی کی جنگی مہمات پر مثنوی 'مفتاح الفتوح' لکھی۔ علاء الدین خلجی کے زمانے میں مشہور کتاب 'خزائن الفتوح' لکھی جس میں فتوحات دکن کا زیادہ تفصیلی ذکر ہے۔

علاء الدین نے اپنے بیٹے خضر خاں کو اس کے بچپن میں اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ وہ حضرت نظام الدین کا مرید تھا۔ اس نے درخواست کی وہ اس کے اور دول رانی کے عشق کے بیان میں مثنوی لکھیں اور آپ کو اس نے اس کہانی کا ایک مسودہ بھی دیا۔ آپ یہ مثنوی لکھ رہے تھے کہ حالات بدل گئے۔ اول تو خضر خاں شیخ کی تعلیمات کو بالکل ہی بھول گیا، دوسرے سلطان نے اس سے خفا ہو کر حکم دے دیا کہ اس کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا جائے۔ مبارک خلجی تخت پر بیٹھا تو خسرو اس کے دربار کے بھی شاعر تھے۔ مبارک خلجی کو قتل کر کے خسرو خاں دو ماہ تک تخت نشیں رہا۔ صرف اس زمانے میں امیر خسرو کا دربار سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مبارک کے دور میں ممکن نہ تھا کہ خسرو اس کے بھائیوں کے قتل کی دردناک داستان لکھتے۔ اب تین سو اشعار سے زیادہ بڑی کہانی (دول رانی خضر خاں) لکھی۔

غیاث الدین تغلق تخت نشیں ہوا تو خسرو پھر دربار کے شاعر بن گئے۔ خسرو کے چار دیوان ہیں، نظامی گنجوی کی پانچ مثنویوں کے جواب میں مثنویاں ہیں اور چار جلدوں میں 'اعجاز خسروی' فارسی نثر کی بڑی مشکل کتاب ہے۔ گیت اور دوہے الگ ہیں۔

وہ ادب ہی نہیں موسیقی سے بھی بہت گہری دلچسپی رکھتے تھے اور اس میں بھی ان کی خدمات غیر معمولی اور عہد ساز ہیں۔ خسرو شہزادہ الغ خاں کے ساتھ بنگال کی مہم میں شامل تھے کہ خواجہ نظام الدین کی علالت کی خبر واپسی کے دوران ترہت (موجودہ مظفر پور و اطراف کا علاقہ) میں ملی۔ وہ لشکر کو چھوڑ کر دہلی آ گئے مگر مرشد سے ملنا مقدر نہ تھا اور اسی سال ۱۸ر شوال کو ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ خسرو کا یہ دوہا بہت مشہور ہے:

گوری سوئے سیج پر سو مکھ پر ڈارو کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چھو دیس

حواشی

(۱) ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (۱۰۴۹۔ ۹۷۳ء) کی کتاب 'الہند' (۱۰۳۰۔ ۱۰۱۷ء) اسی موضوع پر ان کی تحقیق کا نتیجہ ہے اور مصنف نے ہندو مسلمانوں میں مغائرت کے اسباب میں محمود غزنوی اور اس کے باپ امیر سبکتگین کے کارناموں کو بھی شمار کیا ہے۔

(۲) خلفا کی تعداد ۷۰۰ سے زائد بتائی جاتی ہے جن میں ۴۵ کے قریب مشہور و معروف اولیاء ہیں۔ سیر الاولیا میں امیر خورد کرمانی نے ۹ رخلفا کا نام دیا ہے۔ پھر ۲۰ را کابر مریدوں کے نام دیے ہیں۔ وہ حضرت سلطان المشائخ کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ اصل خلافت نامے تو چار یا پانچ ہیں، باقی سب رسمی ہیں۔

(۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی رمقدمہ رسلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات رص ۳ رندوۃ المصنفین، دہلی رطبع اول اپریل ۱۹۵۸ء

(۴) علماء و مشائخ کی جماعتیں دو طرح کی تھیں، ایک دیندار اور دوسرے دنیا دار جو بادشاہوں کی خوشنودی میں کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتے تھے۔ خود منہاج السراج کا شمار بھی دوسری قسم کے علما میں تھا؛ اور اس وقت تک درباری اور غیر درباری علما کا یہ فرق بہت نمایاں ہو چکا تھا۔ شیخ نجیب الدین متوکل نے خواجہ نظام الدین کو اسی لیے مشورہ دیا تھا کہ قاضی مشو چیزے دیگر شو (قاضی مت بنو، کچھ اور بنو)۔

(۵) پروفیسر محمد حبیب رحضرت نظام الدین اولیا: حیات و تعلیمات رباب ا (شہر بداؤں) ص ۲۲

(۶) ایضاً رص ۲۳ بحوالہ تاریخ قنوج (انگریزی) مصنفہ ڈاکٹر آر ایس ترپاٹھی

(۷) خیر المجالس، مجلس پنجاہ و ششم، ص ۱۹۰

(۸) سلطان شمس الدین التتمش کی اولین تعمیرات میں شمسی تالاب بہت مشہور ہے۔

(۹) سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات مصنفہ پروفیسر خلیق احمد نظامی رتعارف ص ۱۲

(۱۰) پرتھوی راج چوہان 1179ء میں صرف 13 سال کی عمر میں تخت نشیں ہوا تھا۔ اس کے راج میں موجودہ راجستھان اور ہریانہ کا اکثر علاقہ تھا۔ غوری کے مقابلے ڈھائی سو راجاؤں کی طاقت اس کے ساتھ تھی لیکن یہ اتحاد جلد ہی بکھر گیا۔ قنوج کے راجا جے چند کی بیٹی سنیوگتا سے اس کا عشق اس کے درباری شاعر چند بردائی کی تخلیق 'پرتھوی راج راسو' کا مرکزی مضمون اور ملک کی مشہور لوک کتھاؤں میں سے ایک ہے۔

(۱۱) ایران میں صفوی اور ہندستان میں سید اور لودی خاندانوں کے علاوہ مسلمان بادشاہوں کے سارے خاندان ترک نسل کے تھے۔

(۱۲) پرفیسر محمد حبیب رسلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مصنفہ خلیق احمد نظامی رتعارف رص ۲۰ (ندوۃ المصنفین، دہلی)

(۱۳) بلبن جیسا نماز روزے کا پابند اور صوفیہ کا معتقد بادشاہ خود کو افراسیاب کی اولاد کہنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

(۱۴) بدقسمتی سے مدینۃ الرسول کی اس ریاست اور اس کے آئین (میثاق مدینہ) کا ذکر تک مسلمانوں کی سیاسی زندگی سے صدیوں غائب رہا جس کے سربراہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور جو آئین خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھوایا تھا۔ ابھی دو دہائی قبل تک متداول کتب حدیث وفقہ میں اس آئین کا یکجا متن تک دستیاب نہ تھا۔

(۱۵) پروفیسر خلیق احمد نظامی رمقدمہ رسلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات رص ۱۲

(۱۶) سلطان محمد غوری نے 1199ء میں قاضی حسن محمود کو اس علاقہ کا حاکم بنا کر بھیجا تھا جس میں اودھ کا علاقہ جونپور کی سرحد تک شامل تھا۔ یہ علاقہ 'بارہ جنگلہا' کہلاتا تھا۔ قاضی حسن محمود نے ایک شہر آباد کرایا اور اس کا نام سلطانپور بہ معنی بڑا شہر رکھا۔ بعد میں التتمش نے قاضی حسن محمود کو اس صوبے کا والی مقرر کیا جس میں بنارس اور جونپور تک کے علاقے بھی شامل تھے۔

(۱۷) مشہور محقق دیمیتری گٹاس اور اسٹینڈ فورڈ انسائیکلو پیڈیا آف فلاسفی نے گیارہوں صدی سے چودھویں صدی عیسوی کے زمانہ کو عربی اور اسلامی فلسفہ کا عہد زرین قرار دیا ہے۔

(۱۸) پروفیسر خلیق احمد نظامی/مقدمہ/سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات/ص ۲۰/ندوۃ المصنفین، دہلی/طبع اول اپریل ۱۹۵۸ء بحوالہ فوائدالفواد ص ۸۷ و ۹۷ اور تاریخ فیروز شاہی/ص ۲۶۳

(۱۹) ایضاً ص ۱۰۰۔۱۰۱۔ (۲۰) یہی ملک غازی ۱۳۲۰ء میں خسرو خاں (سلطان ناصرالدین خسرو) کو شکست دے کر سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے دہلی کے تخت پر بیٹھا۔

(۲۰) سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات/پروفیسر خلیق احمد نظامی/ندوۃ المصنفین، دہلی/طبع اول اپریل ۱۹۵۸ء ص ۲۴

(۲۱) فتوح کے معنی وہ چیز ہے جو کوئی شخص بغیر مانگے ہوئے دے جائے۔ شرط یہ بھی ہے کہ درویش کے دل میں خیال نہ گزرے کہ اسے فلاں شخص سے فلاں چیز کی امید ہو سکتی ہے۔ شیخ کے دل میں شروع زمانے میں بھی دنیا کی طلب نہ تھی۔ پھر شیخ الاسلام شیخ فرید سے تعلق ہوا جن کا مسلک ترک کلی تھا۔

(۲۲) یہ شخص خواجہ فریدالدین گنج شکر کی اولاد میں اور آپ کا پروردہ تھا۔

(۲۳) یہ سلطان فیروز شاہ تغلق کی خودنوشت ہے جس میں ان تمام مساجد، مزارات اور عمارتوں کے تفصیلات بھی درج ہیں جو اس کے عہد میں تعمیر ہوئیں۔ (۲۴) ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتحپوری/ملا داؤد اور چنداین/ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

کتابیات

۱۔ تاریخ فیروز شاہی/ضیاء الدین برنی/بہ تصحیح سر سید احمد/۲۰۰۵ء/سر سید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۔ حضرت نظام الدین اولیا: حیات و تعلیمات/پروفیسر محمد حبیب/۱۹۷۲ء/جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

۳۔ خیر المجالس/ملفوظات خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی/حمید قلندر/ترجمہ احمد علی بن محمد علی/واحد بک ڈپو، کراچی۔۲

۴۔ سیر الاولیا/سید محمد بن مبارک علوی کرمانی المدعو بہ امیر خورد/ترجمہ: غلام احمد بریاں/۱۹۷۸ء/مشتاق بک کارنر، اردو بازار، لاہور

۵۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات/پروفیسر خلیق احمد نظامی/طبع اول ۱۹۵۸/ندوۃ المصنفین، اردو بازار، دہلی/الجمعیۃ پریس، دہلی

۶۔ طبقات ناصری/منہاج الدین عثمان بن سراج الدین المعروف بہ قاضی منہاج سراج/انجمن تاریخ افغانستان، کابل

۷۔ فوائد الفواد/خواجہ امیر حسن علا سجزی دہلوی/ترجمہ: حسن ثانی نظامی/خواجہ ہال بستی حضرت نظام الدین، دہلی/۲۰۰۷ء

۸۔ کتاب الہند/ابوریحان محمد بن احمد البیرونی/ترجمہ سید اصغر علی/۱۹۴۱ء/انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی

۹۔ میثاق مدینہ کا آئینی تجزیہ/پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری/۲۰۰۰/ڈاکٹر فریدالدین اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لاہور

۱۰۔ نظامی بنسری/خواجہ حسن نظامی/چھٹی اشاعت ۲۰۰۹/خواجہ حسن ثانی نظامی/خواجہ ہال، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

○○○

سید عینین علی حق

سلطان المشائخ کی والدہ
رابعۂ عصر حضرت مائی صاحبہ

جب سے دنیائے فانی کا وجود خداوند کریم نے قائم کیا ہے۔تبھی سے اپنے برگزیدہ بندوں کا ظہور فرماتا رہا۔لاکھوں کی تعداد میں پیغمبروں اور ہادیوں کو بھیجا تاکہ وہ خدا کی وحدانیت کا اعلان کریں۔پیغمبروں کے ساتھ ساتھ ان کی ماؤں ، بہنوں اور بیویوں نے بھی اہم کارنامے انجام دیے۔اس صنف نازک کے ذریعہ خدمت خلق اور تبلیغ اسلام کے واقعات اظہر من الشّمس ہیں،جنھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمانوں میں ابتدا سے ہی ایک گروہ ایسا بھی موجود تھا،جس نے تمام مقاصد دنیوی سے قطع نظر اپنا نصب العین صرف یاد خدا، صدق وصفا اور سلوک و احسان کے مختلف طریقوں پر عمل پیرا رہا۔اسلامی تعلیمات کا دائرہ عرب ممالک میں وسیع تر ہوگیا تو صوفیۂ کرام کا بڑا قافلہ دیگر ممالک کے مختلف شہروں میں منتقل ہونے لگا اور تبلیغ اسلام میں مصروف ہوگیا۔

ان صوفیۂ کرام کو مختلف ناموں سے پکارا گیا اور آخر میں ان کو صوفی اور ان کے گوشۂ اختصاص کو ’مسلک تصوف‘ بھی کہا جانے لگا۔ساتھ ہی ساتھ برا بھلا بھی کہا گیا۔لیکن صوفیہ کرام کا اصل نظریہ وہی ہے جو اسلاف صالحین وصحابہ اور تابعین کا تھا۔یعنی حق وہدایت کی پیروی،عبادت وریاضت اور تمام دنیاوی خرابیوں سے قطع تعلق کر کے خدا اور خدا کے رسول سے لو لگانا۔ان صوفیۂ کرام کا حرص وطمع سے بے نیاز ہونا اور ماسوا سے خلوت اختیار کرنا وغیرہ ہی دین کی احسانی تعلیمات ہیں۔

بزرگان دین نے جس طریقے سے کفر کی تاریکیوں میں ڈوبے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کی ،وہ انھی کا حصہ تھا۔ان بزرگان دین کے حوالے سے مطالعہ کیا جاتا ہےتو ان کی والدہ ماجدہ کا ذکر خیر آنا لازمی ہے، کیوں کہ بزرگوں کے اندر رحمانی اخلاقیات کی تربیت ان کی ماؤں نے ہی کی ہوتی ہے۔

اسی طریقے سے حضرت محبوب الٰہی کا ذکر ہوتا ہے تو ان کی والدہ محترمہ رابعۂ عصر حضرت بی بی زلیخا مائی صاحبہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔آپ کے شوہر حضرت سید احمد بخاری کا جب انتقال ہوا تو آپ نے اپنی پیشانی مبارک پر شکن نہیں آنے دیا اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کو شفقت مادری کے ساتھ ساتھ شفقت پدری سے بھی نوازا۔

حضرت مائی صاحبہ کے خاندانی پس منظر کے حوالے سے بات کی جائے تو آپ کے آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے اور ترک وطن کر کے غزنی تشریف لائے۔غزنی سے آپ کے والد بزرگوار لاہور آئے اور ٦٠٦ ہجری میں بدایوں آ گئے۔حضرت بی بی زلیخا مائی صاحبہ کے والد خواجہ عرب بخاری اور آپ کے خسر خواجہ سید علی یعنی حضرت نظام الدین اولیا کے دادا اور نانا دونوں ہی ہم جد تھے۔اور دونوں ہی بخارا، غزنی اور لاہور ہوتے ہوئے ہندوستان کے بدایوں میں آ کر سکونت اختیار کی تھی۔آپ کا تعلق حسینی سادات گھرانے سے تھا۔آپ کا نسب نامہ والد ماجد کی جانب سے مولائے کائنات حضرت علی سے جا کر ملتا ہے:

١-حضرت بی بی زلیخا

٢-بنت سیدنا خواجہ عرب

٣-بن سیدنا ابو لمفاخر محمد اظہر

٤-بن سیدنا حسن

٥-بن سیدنا علی مشہدی

٦-بن سیدنا احمد مشہدی

٧-بن سیدنا ابی عبداللہ

٨-بن سیدنا علی اصغر

٩-بن سیدنا جعفر ثانی

١٠-بن سیدنا امام علی ہادی نقی

١١-بن سیدنا امام محمد نقی

١٢-بن سیدنا امام علی رضا

١٣-بن سیدنا امام موسیٰ کاظم

١٤-بن سیدنا امام جعفر صادق

١٥-بن سیدنا امام محمد باقر

١٦-بن سیدنا امام علی زین العابدین

۱۷-بن سیدنا امام حسینؑ

۱۸-بن سیدنا امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰ

۱- سیدنا احمد (والدمحترم شیخ نظام الدین اولیاء)

۲-بن سیدنا علی

۳-بن سیدنا عبداللہ

۴-بن سیدنا حسن

۵-بن سیدنا علی مشہدی

۶-بن سیدنا احمد مشہدی

۷-بن سیدنا ابی عبداللہ

۸-بن سیدنا علی اصغر

۹-بن سیدنا جعفر ثانی

۱۰-بن سیدنا امام علی ہادی نقی

۱۱-بن سیدنا امام محمد تقی

۱۲-بن سیدنا امام علی رضا

۱۳-بن سیدنا امام موسیٰ کاظم

۱۴-بن سیدنا امام جعفر صادق

۱۵-بن سیدنا امام محمد باقر

۱۶-بن سیدنا امام علی زین العابدین

۱۷-بن سیدنا امام حسین

۱۸-بن سیدنا امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰ

حضرت خواجہ سید عرب اور حضرت خواجہ سید علی کے بہت ہی اچھے مراسم تھے ۔جس کی بنیاد پر حضرت خواجہ سید عرب نے اپنی ولیہ صاحبزادی بی بی زلیخا کا نکاح حضرت خواجہ سید علی کے نورنظر حضرت خواجہ سید احمد بخاری سے کر دیا۔حضرت نظام الدین اولیا کے والد سید احمد بخاری اور والدہ ماجدہ حضرت بی بی زلیخا مائی صاحبہ دونوں ہی خدا کے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔حضرت مائی صاحبہ کو عظمت و کرامت اور قرب الٰہی کے سبب انہیں 'رابعۂ عصر' کہا جاتا تھا۔

حضرت نظام الدین اولیا کی ولادت بہ سعادت ۲۷ /صفر ۶۳۶ ہجری کو ہوئی ۔اور نام سید محمد رکھا گیا

۔حضرت مائی صاحبہ آپ کو پیار سے 'بابا نظام' کہا کرتی تھیں۔خواجہ نظام بہت چھوٹے تھے، تعلیمی سلسلے کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ مائی صاحبہ کے شوہر حضرت خواجہ سید احمد سخت علیل ہو گئے، اسی دوران حضرت مائی صاحبہ نے ایک شب خواب دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ 'اپنے خاوند سید احمد یا فرزند سید محمد (حضرت نظام الدین) میں سے کسی ایک کو اختیار کرو۔آپ نے اپنے فرزند کا انتخاب کیا۔آخر کار علالت کے بعد حضرت بی بی زلیخا کے شوہر سید احمد بخاری کچھ ہی دنوں بعد وصال فرما گئے اور پانچ برس کی عمر میں ہی حضرت نظام الدین اولیا شفقت پدری سے محروم ہوئے۔شوہر کے انتقال کے بعد بی بی زلیخا کو بے حد تنگی کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ حضرت نظام الدین اولیا اور دختر سیدہ بی بی جنت کے علاوہ خاندان میں کوئی نہ تھا، جو کفالت کرتا۔

سلطان المشائخ جب ۱۶ / برس کے ہوئے تو بدایوں شریف سے دہلی لے کر آ گئیں تا کہ بہتر طریقے سے ان کی تعلیم و تربیت ممکن ہو سکے۔حضرت مائی صاحبہ ان خواتین میں تھیں جنہیں صبر و تحمل، تقویٰ اور پرہیز گاری وراثت میں ملی تھی، جنھوں نے نامساعد حالات کے باوجود سلسلہ چشتیہ کے عظیم المرتبت بزرگ سیدنا محبوب الٰہی کی پرورش و پرداخت کی اور رشد و ہدایت کا سلسلہ دراز ہوا۔

حضرت مائی صاحبہ دہلی تشریف لانے کے بعد حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے برادر حقیقی حضرت نجیب الدین متوکل کے دولت کدے سے کچھ ہی فاصلے پر قیام پذیر ہوئیں۔جس گھر میں آپ کا قیام ہوتا ہے، وہ گھر مشہور زمانہ سہروردیہ سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی صاحبزادی بی بی حور اور بی بی نور کا ہوتا ہے۔جسے ادھ چینی یا آئی آئی ٹی گیٹ کہا جاتا ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں اہم شخصیات اور خدا کے پسندیدہ بندے مدفون ہیں۔حضرت محبوب الٰہی کی والدہ بی بی زلیخا کے حوالے سے عرصہ دراز تک لوگوں کو معلومات نہیں تھی، جس کی وجہ سے اکثر و بیشتر لوگ اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے گریز کیا کرتے تھے کہ محبوب الٰہی کی والدہ ماجدہ مائی صاحبہ ادھ چینی میں ہی مدفون ہیں۔اس گستاخی کی واحد وجہ یہ ہے کہ ان صالحات کا ذکر نہیں ملتا۔ہندوستان کی مذہبی تواریخ میں ہزاروں صوفیہ اور مشائخ کے حالات زندگی و کرامات دستیاب ہو جاتے ہیں، لیکن ان بزرگ خواتین کے تفصیلی تذکرے نہیں مل پاتے۔اب تک کوئی مفصل کام بزرگ خواتین کے حوالے سے نہیں ہو سکا ہے۔یہ بات واضح ہے کہ ماؤں کی گود اور ان کی تعلیم و تربیت سے ہی ولی اللہ پیدا ہوئے ہیں۔خواجہ غریب نواز، بابا فرید الدین گنج شکر، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، خواجہ باقی باللہ، شیخ احمد سرہندی وغیرہ جیسے باکمال صوفیہ و صالحین کی فکری و علمی پرورش و پرداخت ماؤں کی آغوش میں ہوئی۔

حضرت امیر خسروؒ، والدہ کے مرتبے کے حوالے سے فرماتے ہیں:

بہشت، زیر قدم ہائے، مادر است مدام

دو جوئے شیر ازو، بیں رواں، نشانِ بہشت

ان بزرگ خواتین کے متعلق موادفراہم نہیں ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی رہی ہے کہ خواتین کی زندگی اور روحانی جدوجہد کی تفصیلات مہیا کرنے کے ذرائع نہ تھے کیوں کہ قرون وسطیٰ میں پردے کا خاص نظام قائم تھا، دور حاضرہ کی طرح بے پردگی اور بے حیائی نہیں تھی، جس کی وجہ سے خدا پرست خواتین کے احوال دستیاب نہیں ہوتے۔ خدارسیدہ خواتین کے حوالے سے قلم کو جنبش دینے والوں میں شیخ ابوعبدالرحمن سلمی شاید اول مصنف ہیں۔ انہیں وجوہات کے سبب حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی والدہ حضرت بی بی زلیخا مائی صاحبہ کے متعلق بھی زیادہ مواد دستیاب نہیں ہے۔ عرصہ دراز تک بٹوارے کے سبب اس علاقے میں موجود درگاہیں ویران پڑی رہیں، بعد میں حالات ساز گار ہوئے تو یہ درگاہیں آباد ہوئیں۔ حضرت مائی صاحبہ کی درگاہ وسیع وعریض مقام پر تھی، لیکن ناجائز قبضوں کے سبب درگاہ کا رقبہ کافی کم رہ گیا ہے۔ لیکن تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر درگاہ کی قدیمی شکل وصورت برقرار نہ رہی۔ مائی صاحبہ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے سلطان ناصر الدین محمود کے دورِ اقتدار میں جمادی الثانی ۶۴۸ھ بمطابق ۱۲۵۰ء وفات پائی۔ جب کہ آپ کے مزار اقدس پر ۳۰ جمادی الاولیٰ ۶۵۸ کا کتبہ موجود ہے، اور اہم مصنفین کے مطابق وفات کا سال طے نہیں ہے۔ مائی صاحبہ کے حوالے سے مختصراً اور تکرار کے ساتھ ذکر خیر واقعات دارالحکومت مصنفہ بشیر الدین احمد، سیر الاولیا مصنفہ خواجہ امیر خورد کرمانی، اخبار الاخیار مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، نظامی بنسری مصنفہ خواجہ حسن نظامی وغیرہ جیسی معتبر کتابوں میں بھی موجود ہے۔

اب سلطان المشائخ کی زبانی رابعہ عصر حضرت بی بی زلیخا مائی صاحبہ کے تعلق سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضرت محبوب الٰہی فرماتے ہیں میری والدہ ایک خدارسید خاتون اور مقبول الٰہی تھیں، جب بی بی زلیخا کو کوئی کام پیش آتا تھا تو وہ اس کام کے انجام کو خواب میں دیکھ لیا کرتی تھیں۔ آپ کو اللہ کی طرف سے تصرف واختیار حاصل تھا۔ اکثر سیدہ بی بی زلیخا محبوب الٰہی کے پاؤں دیکھتی اور فرماتیں کہ میں تجھ میں نیک بختی کی علامت وسعادت پاتی ہوں۔

سیدہ بی بی زلیخا کی نفس کشی کا عالم یہ تھا کہ آپ چلہ کش ہوتیں اور اپنے حجرہ میں صرف چالیس دانہ لونگ رکھتی اور ایک کوزہ میں پانی، جب افطار کا وقت ہوتا ایک دانہ لونگ اور قدرے آب کوزہ سے افطار کرتی اور پھر نیت روزہ کر لیتی۔ حضرت سیدہ بی بی زلیخا کو جب کوئی ضرورت پیش آتی تو ۵۰۰ رمرتبہ درود شریف پڑھ کر اپنا دامن دراز کرتیں اور جو طلب کرتی حاصل ہوجاتا۔ آپ اس قدر مقبول بارگاہ تھیں کہ جب گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو فرماتیں آج ہم اللہ کے مہمان ہیں، آپ کی اس بات سے محبوب الٰہی کو ایک خاص ذوق حاصل ہوتا اور آپ ہمیشہ اللہ کا مہمان ہونا پسند فرماتیں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ آپ کی کنیزہ غائب ہوگئی آپ نے مصلّٰی بچھا کر فرمایا کہ میں تب تک اللہ کی بارگاہ میں دامن پھیلائے رکھوں گی جب تک کنیزہ واپس نہ آجائے، عین اسی وقت ایک شخص دروازے پر آیا اور آواز دی کہ کنیزہ جو بھاگ گئی تھی، حاضر ہے آیئے اسے لے جایئے۔

حضرت محبوب الٰہی کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی ضرورت پیش آتی تو آپ والدہ کی مزار پر حاضر ہوکر اپنی غایت عرض کرتے اور امید سے قبل ضرورت پوری ہوجاتی۔ایک بار جب سلطان قطب الدین نے محبوب الٰہی کو ایذا دینا چاہا تو آپ مزار پہ حاضر ہوئے اور کہا کہ بادشاہ مجھے ایذا دینا چاہتا ہے، اگر وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہوگیا تو میں کبھی آپ کی زیارت کے لیے نہ آسکوں گا نہایت ناز و ادا کے ساتھ معروضہ پیش کرکے گھر آ کر بیٹھ گئے۔ دوسرے ہی دن صبح یہ خبر عام ہوئی کہ بادشاہ کو اس کے مقرب خاص خسرو خاں نے قتل کرکے لاش محل سے باہر پھینک دیا۔ (اخبارالاخیار، صفحہ ۵۸۷)

حضرت محبوب الٰہی کا یہ معمول تھا کہ ہر ماہ کا چاند دیکھ کر پہلی تاریخ کی صبح میں آپ والدہ کی قدم بوسی کرتے تھے ایک بار جمادی الاول کی پہلی تاریخ کو حضرت محبوب الٰہی قدم بوس ہوئے تو سیدہ بی بی زلیخا نے فرمایا کہ آئندہ ماہ کس کے قدموں پر سر رکھو گے۔ یہ سن کر حضرت محبوب الٰہی مضطرب و بے چین ہوگئے اور سمجھ گئے شفقت مادری کے سایہ سے محرومی کا وقت قریب ہے۔ جب جمادی الثانی کا چاند نظر آیا تو فرمایا مجھ غریب کو کس کے سپرد کریں گی فرمایا کل بتاؤں گی۔ صبح نمودار ہونے سے قبل شب کے اخیر حصہ میں آپ نے حضرت محبوب الٰہی کو طلب کیا اور آپ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا۔ اے اللہ اسے تیرے حوالہ کیا اور یہ کہتے ہوئے یکم جمادی الثانی کو اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

بات ختم کرنے سے قبل آئی آئی ٹی گیٹ ادھ چینی کا بھی تعارف کرانا اشد ضروری سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ یہ خطہ کافی متبرک ہے اور یہاں کئی اہم بزرگان دین آرام فرما ہیں۔

حضرت شیخ نجیب الدین متوکل چشتی

اس مقامِ مقدس میں ایک اہم درگاہ شیخ العالم حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے برادرِ حقیقی اور خلیفہ حضرت شیخ نجیب الدین متوکل کی بھی ہے۔ آپ کا شمار جلیل القدر اولیا کرام اور عالم باعمل میں ہوتا ہے۔ حضرت محبوب پاک فرماتے ہیں ''شیخ نجیب الدین متوکل ۷۰ سال تک شہر میں رہے اور اس طویل عرصے میں آپ کی معیشت کا کوئی مستقل ذریعہ نہ تھا۔ ان کی اولاد اور ان کے متعلقین متوکل تھے۔'' (سیراولیاء، خواجہ امیر خورد کرمانی)

سیر الاولیا کے مطابق محبوب الٰہی فرماتے ہیں آپ عید کی نماز ادا کرنے کے لیے گھر کی ہر ایک چیز خدا کی راہ میں صرف کرکے جایا کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچتی تھی کہ گھر میں فاقہ ہوتا اور حضرت خضر غیب سے کھانا لایا کرتے اور گھر کے لوگ تناول فرماتے۔ حضرت خضر فرماتے تھے، تمہارے توکل کا نقارہ عرش پر فرشتے بجا رہے ہیں۔ حضرت نجیب الدین متوکل اس حیثیت سے بھی قابل صد احترام ہیں کہ آپ نے محبوب الٰہی کی تعلیم و تدریس کا فریضہ انجام دیا اور بابا فرید الدین گنج شکر کے یہاں پاک پٹن شریف روانہ کیا۔ لیکن صد افسوس اس پایہ کے بزرگ سے دہلی کے عوام آشنا نہیں۔ آپ کی درگاہ لوگوں کی بے توجہی کے سبب خستہ حال پڑی ہوئی ہے۔

حضرت بی بی زینب عرف بی بی جنت صاحبہ

اسی ادھ چینی میں محبوب الٰہی کی ہمشیرہ حضرت زینب بھی اپنی والدہ بی بی زلیخا کے برابر میں ہی آرام فرما ہیں۔آپ کا بھی مفصل تذکرہ کسی کتاب میں نہیں ملتا، البتہ حضرت محبوب الٰہی اور مائی صاحبہ کے ذیل میں مختلف کتابوں میں مختصراً اور رسمی طور پر ذکر مل جاتا ہے۔آپ کی پاک دامنی اور روحانی فیوض و برکات کا کیا کہنا بلاشبہ نیک صالح اور خدا پرور خاتون تھیں۔

حضرت بی بی حور و حضرت بی بی نور

واقعات دارالحکومت، سیر المنازل، نظامی بنسری وغیرہ جیسی کتابوں سے ثابت ہے کہ آپ دونوں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی بیٹیاں تھیں اور حضرت بی بی زلیخا مائی صاحبہ کی عقیدت مند و خدمت گار اور بہت ہی عزیز شاگردہ بھی تھیں۔ان دونوں کی بزرگی کا کیا کہنا، جب رابعۂ عصر مائی صاحبہ فرماتی ہیں ''تم دونوں آخرت میں بھی مرے ساتھ رہوگی۔'' ان باتوں کے بعد حضرت بی بی حور بی بی نور کی کرامات کے حوالے سے گفتگو کرنا سورج کو چراغ دیکھانے کے مترادف ہوگا۔آپ دونوں کی تاریخ وفات کہیں درج نہیں، مگر مائی صاحبہ کی درگاہ آج بھی سرکاری ریکارڈ میں آپ ہی کی ملکیت ہے۔

حضرت بی بی رقیہ

آپ شیخ العالم حضرت خواجہ محبوب الٰہی کی بھانجی تھیں، یعنی حضرت زینب عرف بی بی جنت کی صاحبزادی ہیں، آپ مائی صاحبہ کی پائتی میں مدفون ہیں۔وقف بورڈ، عقیدت مند حضرات اور خانقاہی نظام سے تعلق رکھنے والے صاحبزادگان کو ان درگاہوں کی جانب اپنی خصوصی توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے تاکہ غیروں کی نظر بد سے ان درگاہوں کو بچایا جاسکے۔

کتابیات

۱-انوار اولیا(کامل)،مرتبہ سید رئیس جعفری ندوی، اشاعت ۱۹۸۵ء

۲-حضرت نظام الدین اولیا: حیات اور تعلیمات، پروفیسر حبیب، نظام اردو خطبات ۱۹۷۰، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ء

۳-دلی کے آثار قدیمہ، مرتبہ خلیق انجم، ۲۰۰۹ء

○○○

نورین علی حق

سلطان المشائخ کے پیر و مرشد
شیخ الشیوخ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر

شیخ الاسلام والمسلمین حضرت شیخ فرید الدین مسعود اجودھنی المعروف بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ(۱)

---

(۱) سیر الاولیا ص ۱۷۲۔ ۱۷۳ پر درج ہے: ''واضح رہے کہ سن ولادت حضرت شیخ الشیوخ فرید الحق والدین مسعود گنج شکر ۵۶۹ھ (۷۴۔ ۱۱۷۳ء) اور آپ کی وفات کا سن ۶۶۴ھ (۶۶۔ ۱۲۶۵ء) تھا۔ آپ کی عمر ۹۵ سال ہوئی۔ ۵۸۴ھ (۸۹۔ ۱۱۸۸ء) میں آپ حضرت خواجہ قطب الدین قدس اللہ سرہما العزیز سے بیعت ہوئے۔

مولانا سید عبدالحی حسنی اپنی تصنیف نزہۃ الخواطر میں حضرت شیخ کبیر کی سن ولادت کے حوالے سے رقم طراز ہیں: ''ولد الشیخ فرید الدین مسعود بھا فی سنۃ تسع و ستین و خمس میئۃ'' (ص ۱۲۷) اور سن وفات کچھ یوں درج کرتے ہیں: ''مات فی خامس محرم الحرام سنۃ اربع و ستین و ست مئۃ، ولہ خمس و تسعون سنۃ، کما فی سیر الاولیا'' (ص ۱۲۸)

بزم صوفیہ مصنف سید صباح الدین عبدالرحمان کے ص ۱۲۲ پر خزینۃ الاصفیا کے حوالے سے شیخ کبیر کی ولادت باسعادت ۵۸۴ھ درج ہے۔ اسی صفحے کے حاشیے پر درج ہے ''خزینۃ الاصفیا جلد ا ص ۲۸۸ مگر سیر الاولیا میں ۵۶۹ھ مرقوم ہے۔ (ص ۹۱)۔''

حضرت کی تاریخ وفات پر بحث کرتے ہوئے بزم صوفیہ کے مصنف سید صباح الدین عبدالرحمان ص ۱۴۰ پر رقم طراز ہیں: ''فوائد الفواد (ص ۵۳) میں ہے کہ حضرت بابا فرید گنج شکر کی وفات ترانوے سال کی عمر میں ہوئی، اگر سال ولادت ۵۸۴ھ صحیح تسلیم کرلیا جائے تو سال وفات ۶۸۷ھ قرار پاتا ہے، مگر اس میں تذکرہ نویسوں کا سخت اختلاف ہے۔ سیر الاولیا، اخبار الاخیار اور سفینۃ الاولیا میں ۵ محرم روز سہ شنبہ ۶۶۴ھ، تاریخ فرشتہ میں ۶۶۰ھ، سیر الاقطاب میں ۶۹۰ھ، خزینۃ الاصفیا میں بحوالہ مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین میں ۶۷۰ھ درج ہے۔''

تاریخ دعوت و عزیمت جلد سوم کے مصنف مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی نے شیخ کبیر کی ولادت ۵۶۹ھ درج کی ہے۔ (ص ۳۷) تاریخ وفات ۵ محرم سہ شنبہ ۶۶۴ھ درج کی ہے اور حاشیے میں لکھا ہے ''صاحب سیر الاولیا نے متعدد مقامات پر ۶۶۹ھ کے ایسے واقعات نقل کیے ہیں، جو حضرت خواجہ کی زندگی سے متعلق ہیں۔ بعض مقامات پر حضرت خواجہ نظام الدین کی تحریر کا حوالہ ہے کہ حضرت خواجہ نے مجھ سے یہ فرمایا، فلاں ہدایت کی۔ اگر ان سنین کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو سن وفات ۶۶۴ھ جو عام طور پر مشہور اور زیادہ تر کتابوں میں مذکور ہے، مشکوک ہوجاتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ حضرت خواجہ کی وفات اس کے بعد ہوئی، بعض دوسری کتابوں میں بعد کے سنین درج ہیں، ان میں قرین قیاس ۶۷۰ھ ہے، جو خزینۃ الاصفیا میں بحوالہ مخبر الواصلین و تذکرۃ العاشقین درج ہے۔ (تاریخ دعوت و عزیمت جلد سوم ص ۴۵)

کی خدمات جلیلہ اوراصلاح مریدین وعوام نا قابل فراموش ہیں ۔آپ کی ذات والاصفات کے ذریعہ غیر منقسم ہندوستان کے دوردراز علاقوں تک سلسلہ چشتیہ کا نور پھیلا اور ہندی عوام نورتوحید سے آشنا ہوسکے۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اہم بات کہی ہے کہ ’’جس طرح حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے مؤسس وبانی ہیں، خواجہ فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ اس کے مجدداوراس سلسلہ کے آدم ثانی ہیں۔‘‘ (تاریخ عوت وعزیمت جلد سوم، ص:۳٦)

مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی نے حضرت بابا فرید گنج شکر کو سلسلہ چشتیہ کا مجدداورآدم ثانی اس لیے کہا ہے کہ حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے دومرید خاص سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور پیکر جلال حضرت خواجہ علاء الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلہ چشتیہ فروغ پاسکا اورآج بھی پورے برصغیرایشیا میں سلسلہ نظامیہ اورصابریہ کی متعدد شاخیں ہیں، جو سلسلے کے فروغ واشاعت کو یقینی بنارہی ہیں۔ بابا فریدالدین گنج شکر کے حوالے سے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے کچھ اقوال بھی ہیں،جن سے پتہ چلتا ہے کہ بابا فرید گنج شکر پران کی بھی خصوصی توجہ تھی۔فرمایا:

’’فرید شمع است خانوادۂ درویشاں روشن خواہد کرد‘‘(۱)۔

ایک جگہ بابا فرید گنج شکر کے شیخ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا کی کوسلطان الہند نے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

’’بابا قطب الدین شاہبازے عظیم دردام آوردکہ بجز سدرۃ المنتہی آشیانہ نمی گیرد‘‘(۲)

داداپیر کی یہ دوپیشن گوئیاں سچ ثابت ہوئیں اوردرویشوں کا خانوادہ ،خانوادۂ چشت روشن بھی ہوااور دنیانے دیکھا کہ بابا فریدالدین گنج شکر کا مقام ومرتبہ کیا ہے۔

حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے کوائف اورحالات،سفروحضراورخدمات کی مکمل ومعتبرتفصیل تقریبانا پید ہے ۔زیادہ تر کتابوں نے زیادہ تر کرامات پرانحصار کیا ہے۔ ان میں چندایک کتابیں ہیں،جنھوں نے احوال وواقعات کو چھان پھٹک کرمعتبر احوال اخذ کیے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر کتابوں میں ایک ہی طرح کے واقعات نظرآتے ہیں۔معتبر کتب احوال سے بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی جوابھر کرسامنے آتی ہے ۔وہ ایک موحد،مبلغ، پرعزم ،اعلی افکارسے لیس،استاذ،شہرت سے دورونفور شیخ مرتاض،مسترشدین کی اصلاح میں منہمک شخصیت اورشخصیت سازکی ہے۔

---

(۱) انوارالفریدص ۳۲۵،سیرالاقطاب مترجم ص۱۸۹،سیرت پاک حضرت فریدالدین مسعود،ارتضی شاہ،ص:۱۲۸

(۲) سیرت پاک حضرت فریدالدین مسعود،ارتضی شاہ،ص:٦۱۲۔تذکرہ خاصان خدا،خواجگان چشت کا ذکر جمیل،مصطفائی بیگم ص ۱۸۳

شہرت سے دوری

صوفی تاریخ میں شہرت کو ناپسند کرنے والے صوفیہ میں حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر کا بڑا مقام ہے، انھوں نے نہ صرف اپنے لیے شہرت کو ناپسند کیا بلکہ اپنے مریدین و مسترشدین اور خلفا و پیر بھائیوں کو بھی اس سے احتراز کا مشورہ دیا اور اپنے اس مشورے پر عمل کرایا۔صاحب سیر الاولیا کے مطابق مسلسل مجاہدوں کے بعد ایک مرتبہ بابا فرید گنج شکر نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے عرض کیا کہ اگر فرمان ہو تو ایک چلہ کرلوں۔یہ بات پیرومرشد پر گراں گزری، آپ نے فرمایا اس کی ضرورت نہیں۔ان چیزوں سے شہرت ہوتی ہے۔آپ نے التماس کیا کہ خواجہ کو معلوم ہے کہ مجھے شہرت سے کوئی غرض نہیں۔حضرت گنج شکر فرماتے ہیں کہ ''مجھے ساری عمر اس بات سے پشیمانی رہی کہ میں نے کیوں ایسی بات کی، جو حضرت خواجہ پر گراں گزری۔'' (سیر الاولیا،ص ۱۴۲۔مرأۃ الاسرار،ص:۱۹۰)

شاید یہیں سے ایک مزاج بن گیا کہ نہ خود شہرت کو پسند کریں گے اور اپنے مسترشدین کو بھی اس سے دور رکھیں گے۔شیخ الاسلام والمسلمین کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد تو بہت سے ایسے صوفیہ ہیں، جنھوں نے شہرت کو اپنی دنیاوی کامیابی کا زینہ بنایا اور شہرت کی وجہ سے انھیں فائدہ بھی ہوا۔اس کے برعکس حضرت بابا فرید گنج شکر نے ہمیشہ شہرت سے خود کو دور رکھا اور شہرت سے بچنے کے ذہن نے ہی انھیں دہلی میں قیام پذیر نہ رہنے دیا۔وہ کبھی دہلی میں تو کبھی ہانسی اور کبھی اجودھن اور کھتوال میں قیام پذیر ہوتے رہے۔ ہانسی ،اجودھن ،کھتوال یہ سارے مقامات اس زمانے میں بھی ہندوستان کے مرکزی شہروں سے دور تھے اور آج بھی دور ہیں ۔بابا فرید شہرت سے دوری کی بار بار تاکید فرماتے تھے ۔ تاکہ کبر ونخوت سے دوری قائم رہے اور ان کے مسترشدین عجب کے قریب بھی نہ پہنچ سکیں۔

''ایک مرتبہ حضرت قطب الموحدین (۱) کے پاس درویشی کا مسئلہ پیش ہوا۔آپ نے فرمایا کہ درویش کو پردہ پوش ہونا چاہیے نیز درویش کے لیے چار چیزیں لازمی ہیں۔اول یہ کہ وہ اندھا بن جائے، تاکہ لوگوں کے عیوب نظر نہ آئیں۔دوسرے کانوں سے بہرا بن جائے تاکہ کوئی برائی نہ سننے پائے۔تیسرے زبان کو بند کرلے تاکہ کوئی نہ کہنے والی بات نہ کہے۔چوتھے لنگڑا بن جائے تاکہ خواہش پر کہیں نہ جاسکے،جس میں یہ چار خصلتیں نہ پائی جائیں وہ درویشی کے قابل نہیں۔'' (تذکرہ خاصان خدا،خواجگان چشت کا ذکر جمیل،مصطفائی بیگم،ص:۱۸۸)

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے یہی وہ اصول ہیں، جنھوں نے نہ صرف انھیں بلکہ ان کے مریدین کو بھی منفرد شناخت دی، بابا فرید نے خود ان تمام باتوں پر عمل کیا، جو ان کے شیخ حضرت قطب الاقطاب نے فرمائیں، اس لیے انھیں سلطان المشائخ جیسا مرید بھی ملا، جس نے ان کے متصوفانہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا

(۱) یہاں قطب الموحدین سے مراد حضرت بابا فرید گنج شکر ہیں۔

اور شیخ کبیر کے اقوال و اعمال کو اپنے دانتوں سے پکڑے رکھا۔ شہرت اور نمائش سے بچنے کے لیے نہ صرف انھوں نے نثری نصیحت کی بلکہ اپنے اشعار میں بھی اپنے اس نظریے کو پیش کیا۔ چوں کہ شہرت سے دور رہنا معمولی بات نہیں ہے۔ نفس اس کا تقاضا بھی کرتا ہے اور ہر زمانے میں دنیا بھی اس کی طلب گار رہی ہے۔ شاید اسی لیے بابا فرید جا بجا شہرت سے بچنے کی تاکید فرماتے رہے۔

اشلوک نمبر ۱۱۸ میں فرماتے ہیں:

فرید درویشی گاکھڑی، چوپڑی پریت

اکن کنھے چالی اے درویشادی ریت

اے فرید! اصلی درویشی کا طریق بڑا کٹھن ہے۔ یہ لمبے لمبے جبوں اور ہزار دانہ تسبیحوں والی درویشی جو عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے۔ دکھاوے کی پریت جیسی ہے۔ یہاں کتنے لوگ ایسے ہیں، جنھوں نے اصل درویشی کی ریت کو صحیح طور پر چلایا اور نبھایا ہے؟ کم، بہت کم۔ (کلام بابا فرید گنج شکر، ص:۸۶)

سلاطین سے بے نیازی

حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں شہرت، نمائش اور خود پسندی کے خلاف تاکیدیں کیں وہیں انھوں نے ہمیشہ خود کو اور اپنے متعلقین ورفقا، مریدین وخلفا کو بھی بادشاہوں سے دور رکھا۔ اس کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ انھیں بادشاہوں سے کسی طرح کی کوئی ذاتی دشمنی تھی یا بادشاہت کو وہ اپنے لائق سمجھتے تھے، اس لیے بادشاہوں کو حسد کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور ان سے دور رہتے اور اپنے لوگوں کو دور رکھتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ بادشاہوں سے قربت ونزدیکی اصل درویشی سے مانع ہے اور سالک کو ارفع ترین منازل تک رسائی سے دور رکھتی ہے ۔ چوں کہ بادشاہوں سے قربت انسان کو تملق باز بناتی ہے، جھوٹ بولنا سکھاتی ہے، انسانوں میں کبر ونخوت پیدا کرتی ہے اور خود کو اعلیٰ بتاتی ہے۔ اس لیے وہ جڑ ہی کاٹ دی جائے، جس سے علائق دنیوی کا خدشہ پیدا ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ''اصل الاصول درویشی حضوریٔ قلب (۱) ہے اور حضوریٔ قلب اسی وقت حاصل ہوتی ہے، جب کہ اکل حرام اور ارباب دنیا سے مکمل پرہیز کیا جائے۔'' (تذکرہ خاصان خدا، خواجگان چشت کا ذکر جمیل، ص:۱۸۸)

صرف ارباب دنیا اور بادشاہوں سے دوری ہی کو بابا صاحب نے ضروری نہیں سمجھا، انھوں نے بادشاہوں کے بچوں سے بھی درویشوں کو دوری اختیار کرنے کی تاکید کی ۔ **لو اردتم بلوغ درجة الکبار فعلیکم بعدم الالتفات الی ابناء الملوک** (۲) بابا فرید کا نظریہ ہے کہ اگر کوئی درویش درویشی کے اعلیٰ منازل طے کرنا چاہتا ہے تو شہزادوں سے دور رہے کہ شہزادوں کی قربت بادشاہ کی قربت کا سبب بن سکتی ہے۔

---

(۱) اصطلاح تصوف میں حضوریٔ قلب کا مطلب قلب کا خلق سے بے تعلق ہو کر حق تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔

(۲) سیر الاولیا، ص:۱۵۲، تاریخ مشائخ چشت، ص:۱۸۷، نزہۃ الخواطر، ص۱۲۸

آپ کے پیر بھائی شیخ بدرالدین غزنوی (۱) التمش کے انتقال کے بعد ملک نظام الدین خریطہ دار (۲) سے وابستہ ہو گئے تھے اور خریطہ دار نے شیخ غزنوی کے لیے خانقاہ بنائی تھی، جس میں وہ رہنے لگے تھے۔خریطہ دار کی تباہی کے دنوں میں شیخ غزنوی بھی محفوظ نہ رہ سکے اور پریشانی کی حالت میں انھوں نے بابا فرید سے دعا کی درخواست کی۔اس پورے واقعے کو فوائد الفواد نے نقل کیا ہے،فوائدالفواد کے علاوہ یہ واقعہ سیر العارفین اور سیر العارفین کے حوالے سے بزم صوفیہ اور بزم صوفیہ کے حوالے سے تاریخ دعوت وعزیمت نے بھی نقل کیا ہے۔شیخ غزنوی کی درخواست پر بابا صاحب کا جواب قابل ملاحظہ ہے کہ انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ان کا پیر بھائی ناراض ہوجائے گا اور رشتے میں کڑواہٹ پیدا ہوجائے گی۔انھوں نے شیخ غزنوی کو ان کے اسلاف کا طریق کار یاددلاتے ہوئے۔جواب دیا:

''ہرکہ برسیرت وسنت پیران خودنرودواوہم چنیں باشدیعنی چوں پیران ما راررسم خانقاہ نبوداوعلاحدہ خانقاہی کندبنشیند ازیںنہا بیند۔'' (فوائدالفواد،ص:۱۳۵)

انھوں نے اپنے اور شیخ بدرالدین غزنوی کے پیران سلاسل کا طریقہ یاددلایا ہے کہ ہمارے شیوخ کسی سے خانقاہ بنواکراس میں نہیں بیٹھا کرتے تھے۔بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ یہاں 'قل الحق ولو کان مرا' پر عمل کرتے ہوئے سچ اور تلخ بات کہہ رہے ہیں۔

حضرت بابا فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ میں جس درجہ بے نیازی تھی،اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل امر ہے۔اگر کبھی کسی مجبوری کے تحت بادشاہ کو خط لکھنا پڑا تب بھی خط کا اسلوب ایک موحد،ایک بے نیاز صوفی،ایک باوقار انسان کا ہوتا تھا،جوظاہر ہے کہ بادشاہی عہد کے خلاف طریق کار تھا،مگروہ طریقہ بندگان خدا کا طریقہ تھا۔تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن بابا فرید کا معتقد تھا اور انھی کی دعا سے اسے بادشاہت بھی ملی تھی۔حضرت نے ایک مرتبہ ایک شخص کے اصرار پر بادشاہ کو ایک خط لکھا۔وہ خط آج بھی تمام صوفیہ

---

(۱) صاحب نزہۃ الخواطر شیخ بدرالدین غزنوی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔''الشیخ الصالح الفقیہ بدرالدین الغزنوی ثم الدھلوی،احدکبارالمشایخ الچشتیہ۔قدم لاھورفی صغرسنہ، واشتغل بالعلم وقرأعلی اساتذۃ عصرہ،ثم دخل دھلی،وسمع نبأفتنۃ التترفی بلادہ،وبلغہ أن اباہ وأمہ قتلافی تلک الفتنۃ،فألقی عصاہ بدھلی وسکن بھا۔أخذالطریقۃ عن الشیخ قطب الدین بختیارالاوشی،ولازمہ فمافارقہ مدۃ حیاتہ،وتولی الشیاخۃ بعدہ بمدینۃ دھلی۔أخذعنہ الشیخ امام الدین المتوفی سنۃ ثمانین وسبع مئۃ۔ و اتت وفاتہ فی حالۃ التواجدعلی سنۃ شیخہ، بدارالملک دھلی، فی سنۃ سبع وخمسین وست مئۃ، کمافی خزینۃالاصفیا۔'' (ص۸۷)

(۲) ملک نظام الدین خریطہ دار ہیبت خان کا لڑکا تھا،التمش کے عہد میں محکمۂ مالیات میں اعلی عہدے دار تھا اور شیخ بدرالدین غزنوی کے عقیدت مندوں میں تھا،خریطہ دار کے حوالے سے تلاش بسیار کے باوجود اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوسکیں یا میری نظر وہاں تک پہنچنے سے قاصر رہی،جہاں خریطہ دار کا ذکر ہے۔

کے لیے قابل عمل ہے:

''رفعت قضیته الی اللہ ثم الیک، فان اعطیته فالمعطی ھو اللہ، و انت المشکور، و ان لم تعطیه شیئا فالمانع ھو اللہ، انت المعذور''(۱)

ترجمہ: میں نے اس کے معاملے کو اللہ کے حوالے کر دیا ہے پھر تیرے ذمہ اگر تو اسے عطا کر دے تو درحقیقت اللہ ہی عطا کرنے والا ہوگا اور تم کو اجر ملے گا اور اگر تم اسے کچھ نہ دو تو واقع میں نہ دینے والا اللہ ہی ہوگا اور تو معذور ہوگا۔

یہ خط بنیادی طور پر سفارشی ہے، مگر اس میں کوئی ایک لفظ سفارشی نہیں ہے۔ شاید اسی طرح کے اسلوب کو پیغمبرانہ اور صحابیانہ اسلوب کہتے ہیں، اس اسلوب کی ابتدا یہاں سے ہوئی تھی کہ **انترک سنة حبیبی لھٰولاء الحمقاء**۔ (کیا میں ان بیوقوفوں کی خاطر اپنے محبوب کی سنت کو ترک کر دوں؟) جہاں نہ بادشاہت اور نہ بادشاہ کی مرعوبیت ہے نہ دبدبہ بلکہ ایک موحد کی پرتاثیر زبان کا اثر صدیاں گزر جانے کے باوجود باقی ہے۔ یہ شان بے نیازی فاقہ کش زندگی ہی حاصل کرسکتی ہے، جس کے رگ وریشے میں جاہ ومنصب، مقام ومرتبے اور مال ودولت کے لیے کوئی جگہ ہی نہ ہو اور اسی عملی زندگی کو دیکھ اور برت کر کوئی سلطان جی بنتا ہے اور جب ان کے عہد کا بادشاہ خلجی ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوتا ہے تو وہ عقبی دروازے سے گھر سے باہر نکل جاتے ہیں۔

درج بالا عربی خط اصرار کی وجہ سے غصے اور ناراضگی میں نہیں لکھا گیا ہے۔ بابا صاحب نے خدا کے علاوہ کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز ہی نہیں کیا۔ ان کا نظریہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی شئی خدا کے علاوہ کسی سے طلب نہیں کرنی ہے۔ بابا صاحب کی خصوصیت یہی ہے کہ ان کا ظاہر و باطن، نثر و نظم سب ایک ڈھرے پر چلتے ہیں۔ ان کے نظریات کہیں متصادم نہیں ہوتے۔ اشلوک نمبر ۴۲ میں فرماتے ہیں۔

بار پرائے بینا سائیں مجھے نہ دیہہ
جے توں ایویں رکھسی، جیو سریروں لیہہ

ترجمہ: اے فرید! پرائے در پر بیٹھنا اور خدا کے سوا کسی اور سے کچھ مانگنا خدا مجھے نہ دے لیکن اے پروردگار! اگر تو اسی طرح مجھے دوسروں کے دروازے پر ڈالنا چاہتا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ تو میری جان میرے تن سے نکال لے تاکہ میں دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی ذلت سے بچ جاؤں۔ (کلام بابا فرید گنج شکر، ص:۴۷)

---

(۱) سیر الاولیا ص ۱۴۷، اخبار الاخیار، مصنف شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مترجمین مولانا سبحان محمود، مولانا محمد فاضل، ادبی دنیا، دہلی ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۳، نزہۃ الخواطر ص ۱۲۸، تاریخ دعوت وعزیمت جلد سوم ص ۱۴۱ پر مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اس عبارت کا اردو ترجمہ لکھا ہے اور حاشیہ پر اخبار الاخیار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اصل رقعہ فصیح عربی میں ہے۔ اس مکتوب کی عربی عبارت میں کہیں کسی مصنف نے لفظ قضیہ استعمال کیا ہے اور کسی نے قصہ، نزہۃ الخواطر کے مصنف سید عبدالحی حسنی نے لفظ قصہ استعمال کیا ہے۔

بے نیازی کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ سلطان ناصر الدین محمود کا نائب السلطنت غیاث الدین بلبن چار گاؤں کا فرمان اور نقد لے کر آپ کی خدمات میں حاضر ہوا۔ آپ نے دریافت فرمایا یہ کیا ہے؟ غیاث الدین نے کہا ''یہ کچھ نقد ہے اور یہ جاگیر کا فرمان سلطانی۔'' آپ نے تبسم فرمایا اور کہا: نقد دے دو اور فرمان واپس لے جاؤ کہ اس کے طالب بہت ہیں، یہ کہہ کر ساری رقم اسی وقت درویشوں میں تقسیم کر دی۔''(۱)

چشتی بزرگوں کا یہ بے نیازانہ رویہ ہی عوام کو ان سے قریب اور بادشاہوں کو دور کرتا رہا ہے۔ نائب السلطنت کا خود چل کر آپ کی بارگاہ میں حاضر ہونا اور چار گاؤں کی جاگیر پیش کرنا، اسے واپس کرنا اور نقد لے کر بلا تاخیر درویشوں میں تقسیم کر دینا تو موضوع بحث ہے ہی، اسی کے ساتھ اس عبارت میں ایک جملہ کہ جاگیر کا فرمان واپس لے جاؤ، اس کے طالب بہت ہیں، سب سے زیادہ موضوع بحث ہے۔ یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس زمانے میں بھی علما اور صوفیہ کی ایسی خاصی تعداد تھی، جو جاگیروں اور بادشاہ کی قربت کے خواہاں اور متمنی ہوتے تھے۔ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں، لیکن اس زمانے سے اب تک عمومی طور پر چشتی بزرگوں اور خانقاہوں نے جاگیر داری اور بادشاہی التفات سے خود کو دور رکھا۔

غریب عوام سے قربت

بابا صاحب نے بادشاہوں اور شہزادوں سے جتنی دوری اختیار کی، اس کے برعکس جب بھی کسی عام آدمی نے آپ سے مدد طلب کی یا آپ سے آپ تک نہ پہنچ پانے کی شکایت کی تو آپ نے اسے صدائے غیبی سمجھ کر عوام سے خود کو قریب کیا۔ حالاں کہ بابا صاحب عبادتوں، ریاضتوں، چلۂ معکوس (۲)، طے (۳) کے روزوں اور اپنی فاقہ مستیوں میں اتنے مصروف ہوتے تھے کہ حرم اور اولاد کی بھی فکر نہیں ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنی پوری کائنات خدا کے نام وقف کر دی تھی۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا سب خدا کے لیے تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ ایک مرتبہ اہلیہ نے جب بتایا کہ آپ کا ایک بیٹا فاقے کی وجہ سے جاں کنی کے عالم میں ہے۔ شیخ شیوخ العالم نے سر مراقبے سے اٹھا کر فرمایا ''بندہ مسعود کیا کرے، اگر حق تعالی کی تقدیر یہی ہے۔''(۴) لیکن کبھی بھی بابا صاحب کسی عام انسان کی دل شکنی نہیں کرتے تھے۔ عوام کی دل جوئی، ان کی حوصلہ افزائی اور ان کے لیے جائے قیام تبدیل کرنا انھیں گوارا تھا۔ اسی کو کہتے ہیں دلوں پر حکمرانی کرنا، جو آج تک بابا صاحب کے ساتھ عمومی طور پر متقدمین

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیر الاولیا، مصنف خواجہ امیر خورد کرمانی نظامی، مترجم خواجہ اسلام الدین نظامی، سیما آفسیٹ پریس، دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵۸۔ تاریخ دعوت و عزیمت جلد سوم، مصنف مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص ۴۰۔۴۱

(۲) پیر میں رسی باندھ کر کنویں میں رات بھر عبادت کرنے کو چلۂ معکوس کہا جاتا ہے

(۳) طے کا روزہ اسے کہتے ہیں، جس میں صرف پانی سے افطار کیا جاتا ہے، طے کا روزہ کم از کم تین دن کا ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک سال کا، متقدمین صوفیہ کے یہاں اس کا رواج تھا۔

(۴) سیر الاولیا/خواجہ امیر خورد کرمانی نظامی، ص: ۱۴۰

چشتی بزرگوں کو حاصل ہے۔ جب کہ ناصر الدین محمود اپنے نائب السلطنت الغ خان یعنی غیاث الدین بلبن کے ساتھ اوچ اور ملتان کے سفر پر روانہ ہوا تو اجودھن میں پور الشکر بابا صاحب کی زیارت کے لیے حاضر ہوا۔ عوام وخواص کا ازدحام تھا۔ اسی ازدحام میں ایک بوڑھے فراش کا یہ واقعہ دیکھیں:

''تا یکے فراشے پیرے بیامد و از مریداں کہ گرد بر گرد ایستادہ بودند بگذشت، در پائے شیخ افتاد و پائے مبارک بگرفت و بکشید تا ببوسد، شیخ را دشوار آمد۔ آں فراش گفت: شیخ المشائخ حضرت شیخ فریدالدین تنگ می آئی۔ شکر نعمت خدائے تعالیٰ باز یں بگذار، چو آں فراش ایں سخن بگفت شیخ نعرہ بزد، آں فراش را بنواخت بسیار معذرت کرد۔'' (ایضاً ص ۱۵۸، تاریخ مشائخ چشت، ص: ۱۶۰)

بیٹے کے لیے تو یہ حکم ہوا کہ اگر خدا نے یہی تقدیر لکھی ہے تو فرید کیا کرسکتا ہے۔ دوسری طرف ایک بوڑھا فراش جب مریدوں اور خدام کے حلقے کو پار کرتا ہوا آپ کے قدم مبارک تک پہنچا اور اس نے بوسہ دیا، آپ پریشان ہوئے تو اس نے کہا کہ آپ خدا کا شکر ادا کریں تو آپ نے نعرہ مارا اور ضعیف سے معذرت بھی کی۔ اس کے حال پر نوازش بھی فرمائی۔ بابا صاحب کا یہی انداز درویشانہ انھیں نہ صرف ان کے زمانے میں بلکہ بعد میں بھی دیگر صوفیہ اور درویشوں سے انھیں منفرد بناتا ہے۔ چشتی صوفیہ ہمیشہ عملی وقولی اعتبار سے 'الخلق عیال اللہ' پر عمل کرتے رہے ہیں۔ اسی لیے وہ عوام کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

قطب المشائخ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی رحلت کی خبر پر جب آپ دہلی تشریف لائے اور شیخ کے خالی سجادے کو رونق بخشی تو یہاں عوام کا آپ سے ملنا اور آپ تک رسائی حاصل کرنا ذرا مشکل ہوگیا۔ دہلی میں قیام کو ابھی تین دن ہی ہوئے تھے کہ ہانسی سے سرہنگا نامی شخص آپ کی زیارت کے لیے دہلی وارد ہوا۔ اس نے کئی بار آپ تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ایک روز بابا صاحب باہر نکلے تو سرہنگا آپ کے قدموں سے جالگا اور رونے لگا۔ اس نے کہا کہ آپ ہانسی میں تھے تو ہم بآسانی زیارت کرلیا کرتے تھے۔ آپ تک پہنچنا اب مشکل ہوگیا ہے تو آپ نے ہانسی کا سفر یہ کہتے ہوئے اختیار کرلیا کہ ''میرے پیر نے جو نعمت مجھ کو عطا فرمائی ہے، وہ شہر اور بیابان میں برابر ہے (اس کے لیے جگہ کی کوئی قید نہیں)۔''

(سیر الاولیا، خواجہ امیر خورد کرمانی نظامی، ص: ۱۴۸)

جہاں کہیں انھیں نام ونمود اور نمائش کا احساس ہوتا اور انھیں محسوس ہوتا کہ ان کی شہرت ہو رہی ہے، لوگوں کا ازدحام بڑھ رہا ہے تو وہ اس جگہ کو ترک کردیتے۔ انھیں عوام کے قریب رہنا تو گوارا تھا لیکن اپنے نفس کو شہرت کا خواہاں بنانا گوارا نہیں تھا، جہاں بے اعتدالی کا احساس ہوتا وہیں وہ اپنی اور اپنے مریدین وخلفا کی گرفت کرتے۔

آج معاملہ پوری طرح تبدیل ہوگیا ہے۔ بابا صاحب کے لیے اس زمانے کا تصور بھی مشکل تھا۔ آج سارا نظم واہتمام مریدوں کے ذمہ ہوتا ہے، سارے اخراجات خود مرید برداشت کرتے ہیں اور پیران طریقت

آسائش سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔لیکن باباصاحب اوران کا کنبہ پیلواور جنگل میں اگنے والی اشیاپر اکتفا کرتے، مریدین ومتوسلین اور معتقدین کے لیے کھانے کا نظم ہوتا، جس کی پوری تفصیل سیر الاولیا میں درج ہے۔

سلطان جی نے فرمایا کہ ''درویشانہ روٹی اوران چیزوں پر جو وہاں کے جنگل میں اگتی ہیں، مثلا پیلواوراس جیسی دوسری چیزیں ان پر قناعت فرماتے تھے۔لیکن اس کے باوجود لوگوں کی آمدورفت کی کوئی حدنہ تھی، پھربھی آپ کے گھر کا دروازہ تقریبا آدھی رات تک کھلا رہتا اور خدا کے فضل وکرم سے کھانا ہروقت تیار رہتا، ہرآنے جانے والا کھانا کھاتا، کوئی شخص آپ کی خدمت میں آتا، جو چیز بھی اس کا مقدر ہوتی اسے حاصل کرتا، عجیب رزق اور عجیب زندگی تھی، جو ہر شخص کو میسر نہیں ہوتی۔'' (ایضا،ص ۱۳۷۔۱۳۸)

آج ہم اس رویے کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ خودتو روکھی سوکھی روٹی کھائیں اور مریدوں تک کھانا پہنچائیں۔ یہ توسوچنا بھی ہمارے لیے مشکل بلکہ ناممکن ہے۔لیکن باباصاحب ایسا کرتے تھے۔ باباصاحب کا مریدین ومتوسلین اور معتقدین سے دلی اور قلبی لگاؤ ہی تھا کہ آپ کے گھر پر افطار کا انتظام نہیں ہوتا لیکن اپنے نظام کو سفر کے خرچ کے لیے ایک سلطانی دیتے۔(اس دور کا سکہ تھا،تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں سیر الاولیا ص ۱۴۰)

باباصاحب ترک دنیا کے اس مرتبے پر فائز تھے، جہاں کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔جو کچھ آتا وہ سب مریدین وزائرین اور حاضرین کی ذات پر خرچ کر دیتے۔انھوں نے اپنی حیات مبارکہ کے ذریعے دنیا کے لیے ایسے نقوش چھوڑے ہیں، جوانمٹ ہیں،اس کی مثال پیش کرنا مشکل ہے،جس سے ایک طرف ان کے ترک دنیا کے عملی نظریہ مخفی نہیں ہے تو وہیں اس میں غریب عوام کی محبت اور الفت بھی پوشیدہ ہے۔وہ مستقبل کے لیے کچھ بھی اٹھا نہیں رکھتے تھے۔سب کچھ عوام ودرویشوں پر خرچ کر دیتے۔صورت حال یہ تھی کہ جب آپ کا انتقال پر ملال ہوا تو تجہیز وتکفین کا انتظام بمشکل ہوسکا۔

> ''ترک دنیا کی مناسبت سے آپ (سلطان المشائخ) نے شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز کا یہ واقعہ بیان کیا۔آپ کے پاس جوسونا چاندی اور نعمتیں آتی تھیں،آپ سب خرچ کر دیتے تھے۔یہاں تک کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو تجہیز وتکفین کا انتظام کرنا مشکل ہوگیا۔چناں چہ وہ پکی اینٹیں، جو قبر کے اندر لحد کے لیے ہوتی ہیں۔موجود نہ تھیں اس کے لیے اس دروازے کو جو پکی اینٹوں کے ذریعہ لگایا گیا تھا، اکھاڑا گیا اور وہ پکی اینٹیں لحد میں لگائی گئیں۔'' (فوائد الفواد،ص:۳۹۹)

ایک طرف آنے والوں کے لیے کھانے اور تحفے کا انتظام اور دوسری طرف قبر کے لیے پکی اینٹوں کا انتظام نہ ہونا یہ نہ صرف ترک دنیا ہے، بلکہ یہ ترک دنیا کی معراج بھی ہے اور آئندہ نسل کے لیے درس عمل بھی۔

صوفیہ بالخصوص متقدمین چشتی بزرگوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ طول طویل تقریریں نہیں فرماتے، عمل کر کے دکھاتے ہیں،جس سے صاحب معاملہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔چند ایک جملوں میں سامنے والے

کوسوچنے پر مجبور کر دینا، یہ طاقت زبان میں نہیں ہوتی، کسی کا عمل ہی ایسا کرنے پر مجبور کر سکتا ہے اور یہ خصوصیت بابا صاحب میں بکمال وتمام موجود تھی۔ حضرت قاضی حمید الدین ناگوری کے نواسے مولانا شرف الدین ایک مرتبہ بابا صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ انھوں نے اپنی لونڈی کا کاڑھا ہوا رومال اور اس کا سلام آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ ''خدا اسے آزادی دے۔'' (ایضا،ص ۳۵۸) یہ سنتے ہی مولانا سوچنے لگے اور بالآخر اس لونڈی کو بابا صاحب کے پاس قیام کے دوران آزادی دے دی۔

تصوف رویے کا ہی نام ہے، تصوف اعلی اخلاق کے مظاہرے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، نظریاتی بحثوں سے تصوف کی تفہیم ممکن ہے نہ تصوف کے اصولوں کا اظہار، تصوف سماج، معاشرے، غربا اور دبے کچلے عوام کی فکر کرتا ہے اور یہ فکر نظریاتی نہیں عملی ہے۔ جس کا مظاہرہ بابا صاحب کی زندگی کے ہر لمحے سے ہوتا ہے۔

عصبیت سے پاک اور جلوت وخلوت میں فرد فرید

ہر زمانے اور ہر دور میں علاقائی، مذہبی، مسلکی اور ذات پات کی عصبیت پائی جاتی ہے۔ ان علائق سے بھی بابا صاحب کی روح مصفی ومجلی تھی۔ کبھی بھی انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی، نہ یہ دیکھا کہ فلاں شخص میرا نہیں کسی اور کا مرید ہے تو اس پر کیوں توجہ کروں، انھوں نے انسانوں کو اپنے خالق کی مخلوق جان کر سب کے ساتھ یکساں رویہ اختیار کیا۔ ''ایسا شخص جو آپ کی خدمت میں کبھی نہ آیا تھا، وہ آتا، یا وہ شخص آتا کہ جس سے آپ کئی سال سے آشنا ہوتے تو دونوں ہم نشینی میں برابر ہوتے اور دونوں کی طرف آپ برابر توجہ فرماتے۔ دونوں سے ملاقات میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔'' (سیر الاولیا/خواجہ امیر خورد کرمانی نظامی، ص:۱۳۸)

اگر سرہنگا نے آپ تک رسائی کی سبیل نہ نکل پانے کی شکایت کی تو اس کے لیے بھی دہلی کو خیر آباد کہہ دیا۔

کسی شخص کے نیک و بد ہونے کا پیمانہ اسلام نے یہ طے کیا ہے کہ اس کے ساتھ سفر وحضر میں رہا جائے تب اس کے حق میں یا اس کے خلاف فیصلہ کیا جائے۔ بابا صاحب کے ساتھ رہنے والے ان کے داماد اور خلیفہ حضرت مولانا بدر الدین اسحاق کے حوالے سے سلطان المشائخ فرماتے ہیں:

> ''وہ فرماتے تھے کہ میں خادم تھا اور آپ مخدوم، جو کام ہوتا مجھ سے فرماتے، خلوت وجلوت میں آپ کی یکساں بات ہوتی، خلوت میں کوئی ایسی بات نہ کہتے اور کسی ایسے کام کا حکم نہ دیتے کہ آپ جلوت میں بعینہ وہ نہ کہہ سکیں، یعنی آپ ظاہر و باطن میں ایک روش رکھتے تھے اور یہ زمانے کے عجائبات میں سے ہے۔'' (ایضا،ص ۱۳۸)

سلطان جی کا آخری جملہ قابل توجہ ہے۔ اور یہ زمانے کے عجائبات میں سے ہے، یعنی اس زمانے میں بھی جلوت وخلوت میں یکساں ہونا عام نہیں تھا، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اِس زمانے کی طرح اُس زمانے میں بھی لوگ جلوت وخلوت میں مختلف ہوتے تھے۔

فرید جوڑتا ہے کاٹتا نہیں

بابا صاحب کی پوری زندگی اوران کے ملفوظات سے شاہد ہیں کہ آپ نے کبھی بھی اختلاف وانتشاراورفساد فی الارض کو پسند نہیں فرمایا، کسی نے بدتمیزی کی تو اسے معاف کر دیا اور اپنے اعمال صالحہ سے اسے معتقد بنایا، انھوں نے ہمیشہ جوڑنے کی بات کی، علمی اختلاف سے اوپر اٹھ کر کسی نے آپ کی شان میں گستاخی کی تو اس سے بھی ناراض نہیں ہوئے ، نہ ہی قطع تعلق کو روا جانا، سیر الاولیا، فوائدالفواد اور دیگر کتابیں آپ کے اخلاق حسنہ سے بھری پڑی ہیں، ولا تفرقوا کے خدائی حکم پر ہمیشہ عمل کرتے ہوئے اپنے مریدین ومعتقدین کو بھی اس کا عادی بنایا اور اپنے اس رویے سے آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی ایک مثبت ، پائیدار اور مستحکم پیغام دیا کہ کسی بھی صورت میں اختلاف وانتشار اور فساد فی الارض کو ہوا نہ دینا ۔ بابا صاحب کا یہ عمل آج کی خانقاہوں کے لیے حرزجاں ہونا چاہیے، جسے ترک کر کے ہم دنیا میں خوار ہوئے ہیں۔

”آپ نے بتایا کہ ایک شخص نے شیخ الاسلام فریدالدین قدس سرہ العزیز کی خدمت میں ایک قینچی نذر کی۔ حضرت شیخ الاسلام نے وہ چھری واپس کردی اور فرمایا: میرے پاس قینچی نہ لاؤ، سوئی لاؤ۔ قینچی کاٹنے والا آلہ ہے۔ سوئی جوڑتی اور پیوندکاری کرتی ہے۔“ (فوائدالفواد، ص: ۴۲۳)

بابا صاحب کا یہ واقعہ آج کی دنیا کے لیے ایک منشورحیات ہے، جہاں صرف آلۂ حرب خریدے جاتے ہیں اور معصوم عوام بھوک سے بلکتے اور سسکتے ہیں، ان خانقاہوں کے لیے بھی اس کی حیثیت کچھ کم نہیں ، جو آپسی اختلافات کو ہوا دیتے ہوئے ایک دوسرے کو کافر ومشرک قرار دیتی ہیں، بابا صاحب نے صرف اس واقعے سے ہی اتحاد کا پیغام عام نہیں کیا ہے، وہ بار بار اپنے مسترشدین ومعتقدین اور متوسلین کو اختلاف سے دور رہنے اور کسی کا دل دکھانے سے باز رہنے کی تاکید فرماتے تھے۔ ”جب میں تائب ہو کر شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز سے وابستہ ہو گیا تھا تو آپ نے کئی بار ارشاد فرمایا کہ مخالفوں اور دشمنوں کو راضی کرنا چاہیے۔ آپ حق داروں کو ان کا حق دے کر انھیں راضی کرنے پر بہت زور دیتے تھے۔“ (ایضا،ص ۲۸۶)

ماضی کی بہ نسبت آج اس پیغام کو اور اس اقتباس کو زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اقتباس تحریری شکل میں زیادہ بہتر انداز میں عام نہیں ہوسکتا ، جتنا عملی طور پر انجام دینے میں اثر انداز ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی اور قدم نہیں اٹھائے گا، انھیں اقدام کرنے پڑیں گے، جو کسی طور بھی بابا صاحب سے انسلاک کا دعوی کرتے ہیں۔

شریعت، طریقت اور حقیقت کی تشریح

حضرت بابا فرید گنج شکر کے ملفوظات کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ وہ بڑے بڑے شرعی اور متصوفانہ مسائل کو بہت آسانی اور سائل کے علمی مبلغ کو پیش نظر رکھتے ہوئے حل فرما دیا کرتے تھے، پندارِ علم کے قیدی کے سامنے سکوت اختیار کرتے ،علم کی نمائش کرنے والے کی اصلاح مدبرانہ انداز میں کرتے مگر دل دکھانے سے پرہیز

کرتے اور اگران کے متعلقین میں سے کوئی کسی عالم ظاہر کو علمی معاملے میں خاموش کر دیتا تو معذرت خواہی کا حکم صادر کرتے ،آپ کے ملفوظات میں آپ کے علمی وفور اور علوم وفنون پر آپ کے عبور کی بھی کافی باتیں آئی ہیں۔ شریعت، طریقت اور حقیقت کے مابین کیا فرق ہے، بہت آسانی کے ساتھ آپ نے اس گتھی کو حل کیا ہے۔

''شیخ الاسلام فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز فرمایا کرتے تھے کہ زکوٰۃ تین نوع کی ہوتی ہے۔ زکوۃ شریعت، زکوۃ طریقت اور زکوۃ حقیقت۔ زکوۃ شریعت وہ ہے، جو دوسو درہموں میں پانچ درہم دی جاتی ہے، زکوۃ طریقت یہ ہے کہ دوسو درہموں میں پانچ درہم رکھ لیے جائیں اور باقی دے دیے جائیں اور زکوۃ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ دے دیا جائے کچھ نہ رکھا جائے۔'' (ایضا،ص ۲۲۶)

باباصاحب کی علمی موشگافیوں کے شہ پارے فوائدالفواد میں بکھرے پڑے ہیں، جن سے باباصاحب کی عمیق علمی نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ زکوۃ کی تشریح میں زکوۃ طریقت اور زکوۃ حقیقت کو وسیع نظر سے دیکھنا چاہیے تاکہ ہر چیز میں شرعی احکام اور عزیمت کا فرق واضح ہوجائے۔ زکوۃ طریقت تو عزیمت ہے اور زکوۃ حقیقت عزیمت کی بھی انتہا ہے، جہاں خود باباصاحب فائز تھے۔ اسلامی تاریخ میں شعب ابی طالب، ہجرت کی رات بستر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مولائے کائنات کی استراحت، صلح حضرت حسن، شہادت کربلا، مدینہ منورہ چھوڑ کر اجمیر تشریف آوری اور دہلی چھوڑ کر اجودھن میں چلۂ معکوس یہ ساری مثالیں عزیمت کی انتہا ہیں۔

بابافرید کی شاعری میں متصوفانہ نظریات

حضرت بابافریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ جہاں پایے کے عالم وصوفی، مصلح ومربی اور نظریہ ساز چشتی داعی ومبلغ اسلام ہیں وہیں وہ ایک بڑے اور پنجابی کے پہلے شاعر بھی ہیں۔ ''ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پنجابی شاعری کے بانی ہیں یعنی پنجابی زبان میں شاعری کا آغاز ان کے ان چھوٹے چھوٹے بولوں سے ہوتا ہے، جنھیں اشلوک کہا جاتا ہے۔'' (کلام بابافرید گنج شکر،ص:۱۷)

حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح ان کی زندگی کے مکمل حالات وکوائف اور تبلیغی سرگرمیاں ان کے ترک دنیا کی نذر ہوگئیں۔ اسی طرح اردو والوں نے ان کی فارسی و پنجابی شاعری کو بھی لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ بھلا ہو گرونانک جی اور شیخ فرید ثانی کا، جنھوں نے ان کے پنجابی کلام کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے اقدام کیے اور گروگرنتھ میں کلام کو شامل کر دیا، اس طرح یہ کلام دست برد سے محفوظ ہوگیا، اچھا ہی ہوا کہ حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو لکھی اگر وہ پنجاب میں پنجابی لکھتے تو اردو صوفی ادبی شہ پاروں کی طرح یہ کلام بھی من گھڑت، غیر معتبر اور ناقابل استناد قرار پاتا۔ چوں کہ باباصاحب کے پرپوتے اور جانشیں حضرت شیخ ابراہیم فریدی فرید ثانی نے باباصاحب کے کلام گرونانک دیو جی کے سپرد کر دیے، انھوں نے کلام کو گروگرنتھ میں شامل کر لیا اور فریدیوں کے ساتھ سکھوں کے لیے بھی یہ کلام مستند قرار پایا، اس لیے حافظ صاحب کو اعتراف کرنا پڑا۔ ''شیخ فارسی اور پنجابی کے شاعر ہیں اور کچھ حصہ

ان کے کلام کا اب تک محفوظ ہے۔‘‘(۱) سچ ہے کہ گرو گرنتھ صاحب میں شمولیت کی وجہ سے کلام فرید امر ہو گیا اور ہم کلام فرید کے داخلی و خارجی حسن وثبات اور اس کے موضوعات سے واقف ہو سکے۔ بابا صاحب کا کلام اپنے پیغام کے اعتبار سے ،معنیاتی نظام کی وجہ سے ،ترک دنیا، دنیا کی بے ثباتی ،اسلام کی تبلیغ، اخلاقی اقدار، صبر وقناعت، عاجزی وانکساری، نماز کی پابندی کی تاکید، خدا کی وحدانیت کے اعلان کی تکرار، عبادت وریاضت پر توجہ مرکوز کرنے اور دنیا میں جینے کا سلیقہ سکھانے کی وجہ سے لافانی ہے، اس کے لافانی ہونے کے داخلی شواہد بہت ہیں، شاید اسی لیے اس کے خارجی تحفظ کی ذمہ داری خدا نے بابا گرونانک کو دے دی۔

بابا صاحب اپنے پورے پنجابی کلام میں کہیں کسی اور کو مخاطب نہیں کرتے ،وہ خود بڑے عابد وزاہد ہیں، مسجد میں قیام فرماتے ہیں، اس کے باوجود وہ خود کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فریدا بے نمازا کتیا، ایہہ بھلی نہ ریت
کدے وی چل نہ آیوں پنجے وقت مسیت

یہی وہ طریقہ ہے، جسے صوفیانہ رویہ یا صوفی طریقہ کہا جاتا ہے، جو دوسروں پر فتویٰ بازی کی اجازت نہیں دیتا۔ خود کو مخاطب کرتے ہوئے علی الاعلان کہتا ہے۔ سب سکھین میں چنز موری میلی، خود کلامی کی تکنیک سے صوفیوں نے جتنا کام لیا ہے، دنیا میں شاید ہی اس کی دوسری کوئی مثال ملے ۔خود کلامی کے ذریعہ بابا صاحب دنیا کے انسانوں کو بیدار کرتے ہیں، پیغام دیتے ہیں ۔انھیں خدا کی طرف مراجعت کی ترغیب دیتے ہیں ۔خود کلامی کا یہ طریقۂ کار ہندوستانی شاعری کو بابا صاحب نے عطا کیا ہے اور خود کلامی کے لیے کن موضوعات کو اختیار کرنا چاہیے، جو اثر انداز ہوں، انھوں نے اپنے کلام سے اس کا سلیقہ بھی سکھایا۔ تصوف نے احتساب ذات کو جتنی اہمیت اور اولیت دی ہے، ان اشعار سے اس کا بھی احساس ہوتا ہے ۔ان خود کلامیوں کی زیریں لہریں احتساب ذات کی دعوت دیتی ہیں، جو بالخصوص چشتیوں کے لیے بنیادی متصوفانہ کلید ہے۔

فریدا من میدان کرٹوئے ٹبے لاہ
اگے مول نہ آوسی دوزخ سندی بھاہ
اٹھ فریدا، وضو ساج، صبح نماز گزار
جو سر سائیں نہ نویں، سو سر کپ اتار
اٹھ فریدا ستیا، جھاڑو دے مسیت
توں ستا، رب جاگدا، تری ڈاہڈے نال پریت
فریدا برے دا کر بھلا، غصہ من نہ ہنڈھاء

(۱) پنجاب میں اردو، ص: ۲۳۵

دیہی روگ نہ لگ ای، پلے سبھ کجھ پاء

فریدا جے توں عقل لطیف کالے لکھ نہ لیکھ

اپنے گریواں میں سرنیواں کے دیکھ

فرہدا! کوٹھے منڈپ ماڑیاں، ایت نہ لائیے چت

مٹی پئی اتولویں کوئی نہ ہوسی مت

فریدا! خاک نہ نندیئے، خاکو جیڈ نہ کوء

جیوندیاں پیراں تلے مویاں اپرہوء

باباصاحب نے اپنی شاعری میں بھی سب سے زیادہ اتباع شریعت، اخلاقی اقدار کی بحالی اور دنیا کی بے ثباتی پر توجہ مرکوز کی ہے۔ معاصر خام صوفیہ کو پیش نظر رکھ کر ایک ڈنڈے سے سب کو ہانکنے والے مفتیان شرع متین کو یہ معلوم ہی نہیں کہ باباصاحب سب سے زیادہ وحدانیت اور اتباع شریعت پر زور دیتے ہیں۔ وہ بغیر تحقیق کے سارے صوفیوں کو اتباع شریعت میں کمزور قرار دے کر بیسویں صدی کے اپنے مقتدا کے فتاویٰ کے مجموعوں میں کھوجاتے ہیں۔ باباصاحب کہتے ہیں، جوسر سائیں نہ نویں، سوسر کپ اتار۔ جو سر خدا کے سامنے جھک نہ سکے اسے کاٹ دو، جوامت مسلمہ کو نماز کے قیام پر متحد و متفق نہ کر سکے۔ انھیں کیا معلوم کہ باباصاحب تارک الصلوۃ کو کن الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔

فریدا! بے نماز اکتیا، ایہہ بھلی نہ ریت

فتووں کے مجموعوں سے سر اٹھا سکیں تو عوام کو بتائیں کہ باباصاحب تارک الصلوۃ کو کتے کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ اتباع شریعت کسے کہتے ہیں، صحیح معنوں میں ہمیں صوفیۂ چشت کے ملفوظات سے اس کا علم ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کو سب پر تھوپنے کے زعم خودی سے فرصت ہو تو بابافرید کی سوانح، ملفوظات اور ان کی شاعری کو پڑھنے کا موقع ملے۔ بابافرید کی پوری شاعری دراصل تصوف کا منظوم منشور ہے، جو کچھ انھوں نے اپنے مریدین وخلفا کو نصیحت کی اور جن کاموں پر مامور کیا۔ ان کاموں کو پہلے خود کیا اور وہی اپنی شاعری میں بھی بیان کیا۔

آسرا دھنی منجھاہ، کوء نہ لاہو کڈھ توں

دے ایوں کاج ہتھاہ، دریا نے سچا دھنی

ترجمہ: مجھے آسرا ہے تو اپنے رب کا آسرا ہے۔ اس کے سوا کوئی میری کشتی کو کنارے نہیں پہنچا سکتا۔ اے فرید! تو یوں ہی ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ سچے رب کے سہارے کو پکڑ اور سب سہاروں سے بے نیاز ہو جا۔

یہ نظریہ انھوں نے صرف اپنے اشلوک میں پیش نہیں کیا ہے۔ سیر الاولیا کی ایک روایت ہے کہ ''باباصاحب کو ایک بیماری لاحق ہوئی۔ ایک روز آپ نے چند قدم چلنا چاہا، عصا ہاتھ میں لے کر اس کے سہارے روانہ ہوئے۔ کچھ دور چل کر عصا ہاتھ سے پھینک دیا۔'' (سیر الاولیا/خواجہ امیر خورد کرمانی نظامی، مترجم خواجہ اسلام الدین نظامی)

بابا فرید کے اعمال، اقوال اور شاعری میں جو یکسانیت ہے، وہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر میں پائی جاتی ہو۔عمومی طور پر شعرا و ادبا اگر تصوف اور خانقاہ سے بھی وابستہ ہیں تو ان کی شاعری و نثر کا رنگ مختلف اور تصوف پر کتابوں اور مضامین و مقالات کا رنگ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ بابا صاحب کے اعمال واقوال اور شاعری بھی ہمارے لیے لائق عمل ہیں، جہاں اختلاف نہیں اتحاد عمل پایا جاتا ہے۔

حضرت شیخ فریدالدین مسعود اجودھنی چشتی کو ہندوستانی صوفیہ میں بڑا اہم مقام و مرتبہ حاصل ہے۔آپ کے خلفا اور مریدین سے بھی عوام کو کافی فائدہ پہنچا ہے اور ہندوستان میں دین اسلام کی جڑیں مضبوط و مستحکم ہوئی ہیں۔ بابا صاحب نے مصطلحات تصوف اور نظری تصوف کو عملی روپ دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ جن کاموں کو آج بہت مشکل بلکہ ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ وہ سارے کام انسانوں کے ہی کرنے کے ہیں۔

انھوں نے عوام کو دین کی دعوت دی، خواص کو دین پر اور دین کے تقاضے کے مطابق چلنے پر ابھارا، طالبان عرفان کو معرفت کی راہ کا سالک بنایا، شاگردوں کو کتابیں پڑھائیں، شریعت کی غیر مشروط پابندی کے ساتھ مسترشدین کی اصلاح و تربیت کی، قومی یکجہتی کے نظریے کو استحکام بخشا، تعصب و تفریق کو راہ تصوف کے منافی قرار دیا، ترک دنیا کی روش عام کرنے کی کوشش کی، دنیا کی بے ثباتی کو اپنے اعمال و اقوال سے ثابت کردیا، اخلاقی قدروں کو عروج بخشا، اپنے خلفا کی ایسی تربیت کی کہ وہ کبھی کسی بادشاہ وقت کے سامنے سرنگوں نہ ہوئے، آج بھی غیر منقسم ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں نظامی و صابری دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کام کر رہے ہیں۔

حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، جن سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

کتابیات

۱۔پنجاب میں اردو، مصنف حافظ محمود شیرانی، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۱۹۸۸

۲۔تاریخ عوت و عزیمت جلد سوم، مصنف مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مجلس نشریات اسلام، کراچی

۳۔تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۳ء

۴۔تذکرہ خاصان خدا، خواجگان چشت کا ذکر جمیل، مصطفائی بیگم

۵۔سیر الاولیا (اردو)، ناشر: خواجہ اسلام الدین نظامی، سیما آفسیٹ پریس، دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۶۰

۶۔سیرت پاک حضرت فریدالدین مسعود، ارتضی شاہ، عظیم اینڈ سنز پبلشرز، لاہور

۷۔فوائد الفواد، مرتب: امیر علا سجزی، ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۶ء

۸۔کلام بابا فرید گنج شکر، مرتب و مترجم پروفیسر محمد یونس حسرت، ایم ایم پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۹ء

۹۔نزہۃ الخواطر، مصنف سید عبدالحی الحسنی، دار ابن حزم، بیروت، ۱۹۹۹ء

ooo

شخص و عکس

ڈاکٹر جہاں گیر حسن مصباحی

حیات سلطان المشائخ-مہد سے لحد تک

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ ہندوستان میں چشتی سلسلۂ طریقت کے چوتھے عظیم ترین بزرگ تسلیم کیے جاتے ہیں۔مؤرخین کے مطابق حضرت شیخ شیوخ العالم خواجہ فرید الدین گنج شکر معروف بہ ’’بابا صاحب‘‘ قدس سرہٗ نے سلسلۂ چشتیہ کو بکمال وتمام منظم فرمایااور سلطان المشائخ قدس سرہٗ نے اُس سلسلے کو عروج وکمال بخشااور ہمہ جہت ترقی عطافرمائی۔

یکتائے روزگار علما ومشائخ نے آپ کے مقام ومرتبے کا مکمل خیال رکھا ہےاور آپ کے ساتھ اکرام واحسان کا معاملہ فرمایا ہے جیسا کہ شمس الملک حضرت مولانا شمس الدین رحمہ اللہ کا معمول تھا کہ جب کوئی اُن کے درس میں ناغہ کرتا/ تاخیر سے پہنچتا تو فرماتے کہ مجھ سے ایسی کیا خطا ہوگئی ہے کہ تم نے ناغہ کیا ہے یا دیر سے آئے، لیکن جب کبھی سلطان المشائخ درس میں غیر حاضر رہتے/کسی دن دیر سے درس میں پہنچتے تو شمس الملک رحمہ اللہ آپ سے فرماتے:

آخر کم ازان کہ گاہی گاہی

آئی و بہ ما کنی نگاہی(۱)

ترجمہ: آخر اتنا تو کرو کہ کبھی کبھی آؤ اور ہم پر ایک نگاہِ توجہ ڈال جاؤ۔

دراصل روز اَول سے ہی سلطان المشائخ قدس اللہ سرہٗ مقبولانِ بارگاہ کی صف میں شامل ہو چکے تھے اور کاتبِ تقدیر نے آپ کو اپنا محبوب بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا،بس دنیا میں اس کا ظہور ہونا باقی تھا، چنانچہ اِس فیصلے کا ظہور اُس وقت ہوا جب آپ شیخ کبیر بابا فرید قدس سرہٗ کی خدمت میں پہنچے۔جیسا کہ شیخ محمد اکرام بیان کرتے ہیں کہ شیخ کبیر خواجہ فرید الدین نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ہم نے ایک جال لگایا ہے۔اُس میں زیادہ تر چڑیاں

---

(۱) فوائد الفواد، جلد:۲،مجلس:۲۲

آئی ہیں، لیکن اُن میں ایک شہباز بھی آ پھنسا ہے (اور شہباز سے حضرت شیخ کی مراد خواجہ نظام الدین اولیا تھے، جو آپ کی عظمت وجلالت کی روشن دلیل ہے)۔

مزید آپ سے پہلی ملاقات کے وقت شیخ کبیر خواجہ فرید الدین گنج شکر کا اِس طرح فرمانا بھی آپ کی رفعت وبلندی کی واضح دلیل ہے کہ

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

ترجمہ: تیری جدائی کی آگ نے بہت سے دلوں کو کباب کر دیا تھا اور تیرے اشتیاق کے سیلاب نے بہت سی جانوں کو بے قرار و مضطرب کر رکھا تھا۔(آب کوثر،ص:۲۲۸)

شیخ جمال الدین ہانسوی رحمہ اللہ اُن مستند بزرگوں میں سے ایک ہیں جن پر شیخ کبیر بابا فرید قدس اللہ سرہٗ کو کامل اعتماد تھا، اور اِس حد تک اعتماد تھا کہ شیخ جمال الدین ہانسوی رحمہ اللہ نے جب مخدوم علاء الدین صابر کلیری کا خلافت نامہ پھاڑ دیا اور یہ خبر شیخ کبیر تک پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ جمال کا پھاڑا ہوا فرید نہیں سی سکتا۔ لہٰذا مخدوم علاء الدین رحمہ اللہ کو دہلی کے بجائے کلیر کا علاقہ مرحمت ہوا۔(۱) لیکن جب سلطان المشائخ، شیخ جمال الدین کے پاس خلافت نامے کی تصدیق کے لیے پہنچے تو وہ آپ سے بڑی خندہ روئی کے ساتھ ملے اور بے انتہا مہربانیاں فرمائیں اور یہ شعر پڑھا:

خدائے جہان را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس

ترجمہ: اللہ رب العالمین کا ہزار ہا شکر کہ گوہر، گوہر شناس کے پاس پہنچ گیا۔(سیر الاولیاء(فارسی)،ص:۱۱۶-۱۱۷)

اِن کے علاوہ شیخ نجیب الدین متوکل، شیخ رکن الدین ملتانی، مخدوم جہاں شرف الدین یحی منیری، مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی قدست اسرارہم جیسے عظیم مشائخ نے بھی آپ کے کمال و جمال کا اعتراف کیا ہے اور عظمت کی نگاہ سے آپ کو دیکھا ہے۔

مزید برآں وحیدانِ عصر علما و دانشوروں نے بھی آپ کو عظیم ترین القابات وخطابات سے یاد کیا ہے، جیسا کہ امیر خورد سید محمد کرمانی رحمہ اللہ آپ کا تذکرہ اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

آں برہان الحقائق، آں سرور اولیاے دیں، آں پیشواے اصفیاے عالم یقین، آں عالم علوم ربانی، آں کاشف اسرار رحمانی، آں بظاہر و باطن آراستہ، آں والہ صفات حق جل وعلیٰ، آں عاشق ذات باری تعالیٰ، آں صورت لطافت، آں بکثرت بکامیاں اولیا معروف یعنی سلطان المشائخ نظام الحق والحقیقۃ والشرع

---

(۱) آب کوثر،ص:۲۲۴

والدین وارث الانبیاء والمرسلین سید سلطان الاولیاء نظام الدین محمد محبوب الٰہی بن سید احمد بن سید علی بخاری چشتی دہلوی قدس اللہ سرہٗ۔(سیر الاولیاء(فارسی)، باب اول، ص:۹۱، مطبع محب ہند، دہلی، ۱۳۰۲ھ)

طوطیِ ہند امیر خسرو رحمہ اللہ نے آپ کی شان عظمت کچھ یوں بیان فرمائی ہے:

قطب عالم نظام ملت و دین

کافتاب کمال شد رخ او

وز جنید و ز شبلی و معروف

یادگارے است ذات فرخ او

ترجمہ: قطب عالم خواجہ نظام الدین اولیا کا چہرۂ انور کامل آفتاب نما تھا۔ وہ جنید و شبلی اور معروف کرخی (رحمہم اللہ) کی یادگار رہتے تھے۔(سیر الاولیاء(فارسی)، باب اول، ص:۹۱)

شیخ ابو جعفر مکی قدس اللہ سرہٗ بیان فرماتے ہیں کہ یہ فقیر ایک دن حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ دریائے نیل میں کشتی پر سوار تھا۔ اللہ کے محبوب ترین اولیا کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی، اسی درمیان خضر علیہ السلام نے فرمایا:

’’شیخ عبد القادر جیلانی اور شیخ نظام الدین بدایونی مقام معشوقیت پر فائز تھے۔‘‘

پھر اُنھوں نے فرمایا کہ واللہ! نظام الدین بدایونی اور عبد القادر جیلانی کے جیسا اولیا میں نہ کوئی آیا اور نہ کوئی آئے گا۔(بحر المعانی، ص:۲۱۳-۲۱۴)

غرض کہ جس طرح گلاب کے وجود پر پھلواری رشک کناں رہتی ہے اور اُس سے جو خوشبوئیں نکلتی ہیں وہ بھی رشک آور ہوتی ہیں۔ بعینہٖ سلطان المشائخ کی ذات والا صفات ہے کہ آپ کے وجود مسعود پر ایک طرف ایک کائنات نازاں ہے تو دوسری طرف آپ کے فیضان و برکات کا ٹھاٹھیں مارتا ایک سمندر ہے جس میں اپنے بیگانے، جن و بشر، مرد و عورت اور چھوٹے بڑے سبھی غوطہ لگاتے ہیں اور قدرت بھر اپنی اپنی مرادیں پاتے ہیں، اور چوں کہ انبیا و مرسلین بکمال وتمام اُسوہ حسنہ کے مالک ہوتے ہیں اور علمائے ربانی انبیا و مرسلین کے وارث ہوتے ہیں، لہٰذا سلطان المشائخ اِس لحاظ سے بھی قابل صد رشک ہیں کہ آپ کی زندگی بہر صورت اُسوۂ حسنہ کی عکس جمیل نظر آتی ہے اور ہر سطح پر پوری انسانی برادری کے لیے رہبر و رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔

ذیل میں آپ کی سیرت وسوانح پر ایک نظر ڈالی جا رہی ہے:

اہل خاندان اور اُن کی ہندوستان آمد

’’بخارا‘‘ وسط ایشیا کا ایک مشہور اور تاریخی شہر ہے۔ یہ شہر ہمیشہ سے علوم وفنون اور زہد وتقویٰ کا منبع وسرچشمہ رہا ہے۔ سلطان المشائخ کے اَجدادِ کرام خواجہ علی حسین بخاری اور خواجہ عرب بخاری اُسی علمی وتہذیبی شہر کے باشندے تھے۔ نیز دونوں تجارت پیشہ بزرگ تھے اور آپس میں برادرانہ رشتہ بھی رکھتے تھے کہ دونوں کے

جداعلیٰ ایک تھے۔ جب منگولوں نے ۱۱۱۵ء میں ''بخارا'' پر حملہ کیا اور اُس پر اپنا سکّہ جمالیا تو بہت سے خاندان ''بخارا'' سے ہجرت کر گئے۔ بیشتر خاندان نے ملک ہندوستان کا رُخ کیا کہ اُس وقت ہندوستان دیگر ممالک کے بالمقابل امن وآشتی کا ملک مانا جاتا تھا۔ چنانچہ خواجہ علی حسین بخاری اور خواجہ عرب بخاری بھی ہجرت کر کے ہندوستان پہنچے اور ''لاہور'' میں قیام کیا۔ اِسی شہر لاہور میں آپ کے والد بزرگوار خواجہ احمد بن خواجہ علی حسین بخاری اور والدہ حضرت بی بی زلیخا بنت خواجہ عرب بخاری پیدا ہوئیں۔ پھر چوں کہ لاہور ایک سرحدی علاقہ تھا اور وہاں آئے دن کچھ نہ کچھ شورشیں اُٹھتی رہتی تھیں اِس لیے کچھ دنوں کے بعد خواجہ علی بخاری اور خواجہ عرب بخاری رحمہا اللہ لاہور سے بھی کوچ کر گئے اور بدایوں پہنچے اور پھر ہمیشہ ہمیش کے لیے بدایوں ہی کو اپنا مستقل مسکن ومستقر بنالیا۔

بدایوں اُس وقت ریاستی وصوبائی مرکز تھا جہاں ممتاز عمائدین سلطنت، علمائے اُمت اور رہبران شریعت رہتے تھے۔ نیز علوم وفنون اور تربیت وتزکیہ کے لحاظ سے بھی اُسے ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی اور اِسی امتیازی وصف کے سبب بدایوں ''قبۃ الاسلام'' کہلاتا تھا۔ (مقدمہ فوائد الفواد (مترجم)، ص:۳۶)

ولادت باسعادت

خواجہ عرب بخاری علم دوست ہونے کے ساتھ صاحب ثروت بھی تھے، لیکن اولاد کے اعتبار سے غریب واقع ہوئے تھے۔ خواجہ عبداللہ نامی ایک ہی صاحبزادہ اور ایک ہی صاحبزادی بی بی زلیخا اُن کے پاس تھیں۔ اُدھر خواجہ علی بخاری کے لڑکے خواجہ احمد کی شرافت ونجابت نے خواجہ عرب بخاری کو کافی متاثر کیا اور اُنھوں نے اپنی صاحبزادی بی بی زلیخا کا نکاح خواجہ احمد بن علی حسین بخاری کے ساتھ کر دیا، اور پھر ایک دن وہ بھی آ گیا کہ بی بی زلیخا اور خواجہ احمد کے گلشن حیات میں **''سید محمد''** کی کلکاریاں گونج اُٹھیں، یعنی ۲۴ر صفر ۶۳۶ھ/ ۴ر اکتوبر ۱۲۳۸ء کو بدھ کے دن ''بدایوں، محلہ پٹنگی ٹولہ'' میں سلطان المشائخ پیدا ہوئے۔ (نظامی بنسری، ص:۳۸۷)

نام، لقب اور عرفیت

پیدائشی نام ''محمد'' رکھا گیا، جب کہ لقب وعرف ''نظام الدین'' سے مشہورِ عالم ہوئے۔ لقب وعرف کے تعلق سے پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''حضرت برہان الدین غریب (م:۷۳۸ھ/ ۱۳۳۷ء) نے فرمایا: ہمارے خواجہ نظام الدین ایک دن بدایوں میں اپنے گھر میں بیٹھے تھے، کسی شخص نے آپ کے سامنے آ کر آواز دی: مولانا نظام الدین! حضرت نے سوچا کہ میرا لقب تو ''نظام الدین'' نہیں ہے، اور اُس گھر میں کوئی دوسرا نظام الدین بھی نہیں ہے، پھر یہ کسے پکار رہا ہے؟ اس کے بعد جب آپ گھر سے باہر نکلے تو جو بھی ملتا تھا، وہ نظام الدین کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ اُس دن سے نظام الدین ہمارے خواجہ کا لقب ہو گیا۔..''

پھر بعد کے زمانے میں آپ کا لقب نظام الدین والملۃ نظام الاولیاء ہوا، اور آخری ترکیب

میں سے صرف اولیا اسم مبارک کا جز و بن کر رہ گیا۔(۱) ''نظام الدین اولیا'' کے ساتھ ''محبوب الٰہی'' بھی اسم مبارک کا ایک حصہ قرار پایا۔

شجرۂ نسب

آپ نجیب الطرفین حسینی سید ہیں۔ آپ کا شجرۂ نسب پدری اور مادری دونوں چوتھی پشت میں سید حسن بن سید میر علی تک پہنچتا ہے اور ایک ساتھ ضم ہوجاتا ہے اور پھر منبع خلائق، جان عالم، سرور کائنات جناب **محمد** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جاملتا ہے۔ مثلاً:

✿ **پدری شجرۂ نسب یہ ہے:** سید خواجہ احمد بن سید خواجہ علی بن سید عبداللہ بن سید حسن بن سید میر علی...

✿ **مادری شجرۂ نسب یہ ہے:** بی بی زلیخا بنت سید خواجہ عرب بن سید محمد بن **سید حسن بن سید میر علی** بن سید میر احمد بن سید میر ابی عبداللہ بن سید میر علی اصغر بن سید جعفر بن سید علی امام بن سید علی ہادی تقی بن امام سید محمد جواد بن امام علی موسیٰ رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام علی زین العابدین بن سیدنا امام حسین بن امیر المومنین سیدنا علی و بن سیدہ فاطمہ بنت **محمد** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ (سیر الاولیاء (فارسی)، باب اول، ص: ۹۷-۹۸)

تعلیم و تربیت اور دیگر واقعات

سلطان المشائخ کی والدہ ایک خدا ترس خاتون تھیں اور اپنے بابا نظام کے رگ و پے میں بھی خدا ترسی کی خواہاں تھیں اور آپ کی ذات کو خشیت الٰہی کا ایک تناور درخت دیکھنا چاہتی تھیں اس لیے وہ جب بھی اپنے نور نظر سے باتیں کرتیں تو ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتیں جن سے دل میں عشق الٰہی کا جذبہ پیدا ہو، اور دنیاداری کا خاتمہ ہوجائے۔ طفولیت کے زمانے میں بارہا ایسا ہوتا تھا کہ گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا اور فاقہ کشی پر مجبور ہونا پڑ جاتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ والدہ ماجدہ کا معمول تھا کہ جس دن ہمارے گھر کچھ کھانے پکانے کو نہ ہوتا تو فرماتیں: ''آج ہم سب اللہ کے مہمان ہیں۔'' مجھے یہ بات سن کر بڑا ذوق آتا۔ ایک دن کوئی اللہ کا بندہ ایک تنکہ غلّہ (۲) گھر میں دے گیا، جس سے متواتر کچھ دنوں تک روٹی ملتی رہی، میں تنگ آگیا اور اس آرزو میں رہا کہ والدہ ماجدہ کب یہ فرمائیں گی کہ ''آج ہم سب اللہ کے مہمان ہیں۔'' آخر وہ غلّہ ختم ہوا، اور والدہ ماجدہ نے فرمایا: ''آج ہم سب اللہ کے مہمان ہیں۔'' یہ سن کر مجھے ایسا ذوق اور ایسی فرحت حاصل ہوئی کہ وہ بیان نہیں ہوسکتا۔ (سیر الاولیاء (فارسی)، باب اول، ص: ۱۱۳)

سلطان المشائخ نے تقریباً باغ زندگی کی کل پانچ/ چھ بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور آپ شفقت پدری سے محروم ہوگئے۔ امیر خورد سید محمد کرمانی کے مطابق: سلطان المشائخ ابھی کم سن اور نوعمر ہی تھے کہ والد بزرگوار خواجہ احمد بن علی بخاری بیمار پڑ گئے اور ایسے سخت بیمار ہوئے کہ اپنے معبود حقیقی سے

---

(۱) مقدمہ فوائد الفواد، (مترجم) ص: ۳۷-۳۸، بحوالہ نفائس الانفاس قلمی نسخہ، ندوۃ العلماء، لکھنو

(۲) غالباً دس سیر/ دس کیلو اناج، کیوں کہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں ایک تنکہ دس سکّہ ہوتا تھا۔

جا ملے اور شہر بدایوں میں مدفون ہوئے، اور اس طرح والد بزرگوار کے وصال کے بعد تعلیم وتربیت کی تمام تر ذمہ داری آپ کی والدہ ماجدہ بی بی زلیخا معروف بہ مائی صاحبہ رحمہا اللہ کے سر آ گئی۔ چوں کہ آپ کی والدہ ماجدہ بڑی نیک، پاکباز، دین دار، انتہائی باہمت اور باحوصلہ خاتون تھیں اِس لیے غربت و افلاس اور اقتصادی و مالی دقتوں کے باوجود اُنھوں نے آپ کی تعلیم وتربیت کا کامل انتظام فرمایا اور حصول تعلیم میں آپ کی ہر ممکن معاونت فرمائی۔

آپ کسی قدر بڑے ہو گئے تو آپ کی والدہ ماجدہ نے قرآن کریم پڑھنے کے لیے مکتب میں بٹھایا، اور پھر یہ کہ آپ کا حافظہ قوی اور ذہن سلیم تھا لہٰذا تھوڑی مدت ہی میں قرآن کریم مکمل کر لیا۔ (سیر الاولیاء (فارسی)، ص:۹۵)

اِس طرح ناظرہ تعلیم کی تکمیل آپ نے بدایوں کے ایک مشہور اور بزرگ قاری محترم شادی مقری کی نگرانی میں فرمائی۔ (خواجہ نظام الدین اولیا، ص:۵۹)

اس کے بعد صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں بھی محلے ہی کی مسجد میں پڑھیں۔ نیز اَوسط درجے کی کتابوں کا درس بدایوں کے ممتاز علما سے لیا۔ اُن میں سب سے نمایاں شخصیت مولانا علاء الدین اصولی کی تھی۔ اُن سے دوسری کتابوں کے علاوہ فقہ کی مشہور کتاب ''قدوری'' کا درس بھی لیا۔ (مقدمہ فوائد الفواد (مترجم)، ص:۳۹)

دستار بندی اور بشارت عظمیٰ

سلطان المشائخ قدوری جیسی فقہ کی معتبر اور بڑی کتاب ختم کرنے والے تھے کہ شفیق وکریم اُستاذ مولانا علاء الدین اُصولی نے کہا: چوں کہ تم ایک معتبر اور عظیم کتاب مکمل کرنے والے ہو، لہٰذا تمھیں اپنے سر پر دستار باندھنی چاہیے۔ جب آپ نے یہ قصہ اپنی مشفقہ والدہ کو بتایا تو اُنھوں نے اپنے دست خاص سے سوت کاتا، اُسے بنوایا اور ایک دستار تیار کی۔ پھر آپ نے کتاب مکمل کر لی تو والدہ ماجدہ نے ایک عمدہ دعوت کا اہتمام کیا اور چند بزرگان دین اور علمائے اہل یقین کو اُس مبارک تقریب میں مدعو کیا۔ اس مبارک تقریب میں شیخ جلال الدین تبریزی (متوفی:۶۴۱ھ) کے مرید خواجہ علی (۱) بھی شریک تھے۔ یہ اُس وقت کے مشہور ومعروف باکرامت بزرگ تھے۔ جب سب کھانا کھا چکے تو آپ اپنے ہاتھ میں دستار لیے تشریف لائے تا کہ تقریب میں موجود بزرگان دین کے سامنے دستار بندی کی رسم ادا ہو۔ چنانچہ خواجہ علی نے دستار کا ایک سِرا خود اپنے ہاتھ میں لیا اور دوسرا سِرا آپ کے ہاتھ میں دیا، پھر آپ نے اپنے سر پر دستار باندھی۔ اِس سے پہلے آپ نے خواجہ علی رحمہ اللہ کے قدم پر اپنا سر مبارک رکھا، خواجہ علی نے آپ کے حق میں دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمھیں علمائے دین کے زمرے میں شامل کرے اور اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے۔ اس کے بعد آپ نے محفل میں شریک دوسرے صادقین کی بھی قدم بوسی

---

(۱) بدایوں میں خواجہ علی نام کے دو بزرگ تھے، ایک کا نام علی مولا بزرگ تھا اور ایک کا نام علی مولا خورد، اور سلطان المشائخ قدس سرہٗ کی محفل دستار میں جو مدعو تھے وہ علی مولا بزرگ تھے۔ (خیر المجالس، مجلس:۵۶)

فرمائی اور اُن بزرگوں سے دعائیں حاصل کیں۔(سیر الاولیاء (فارسی)، باب:۱،نکتہ:۳،ص:۹۵-۹۶)

خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی بیان کرتے ہیں کہ دستار باندھنے کے بعد سلطان المشائخ نے اپنا سر کئی بار مولانا کے قدموں پر رکھا۔ علی مولا نے جب یہ ادب و آداب دیکھا تو (مولانا علاء الدین اُصولی سے) ہندوی زبان میں کہا: ''ارے مولانا! یہ بڑا ہوسی۔'' یعنی اے مولانا! یہ مرد بزرگ ہوگا۔ پھر دوبارہ فرمایا: ''یہ نیک اور بزرگ ہوگا۔'' مولانا علاء الدین اُصولی نے اُن سے پوچھا: آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں کہ ''یہ بزرگ ہوگا۔'' اُنھوں نے فرمایا کہ میں اس میں دو چیزیں دیکھ رہا ہوں، اور ہندوی زبان میں کہا: ایک یہ کہ ''جو منڈا سا باندھی سو پائن نہ پسری؟'' یعنی جو اپنے سر پر دستار باندھ رکھا ہو وہ کسی کے قدموں پر کیسے گر سکتا ہے؟ اور دوسرے یہ کہ اس کی دستار ریشم کی نہیں بلکہ اُس کی دستار سادہ ہے، لہٰذا یہ بزرگ ہوگا۔(خیر المجالس (فارسی)، مجلس:۵۶)

اور خواجہ علی مولا (۱) کی بشارت اور اُن کی دعا کی تکمیل یوں ہوئی کہ سلطان المشائخ نے علم و عرفان اور تزکیہ و تصفیہ کی ایک ایسی نہر جاری فرمائی کہ جس میں شاہ و گدا، اَمیر و غریب اور سیہ کار و گنہگار سبھی اُس زمانے میں بھی غوطہ لگاتے تھے اور آج بھی غوطہ لگاتے ہیں اور طہارت و تقویٰ کی اعلیٰ ترین نعمت پا کر باہر نکلتے ہیں۔

دستار کے بعد بھی سلطان المشائخ نے بدایوں میں مزید تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور مولانا علاء الدین اصولی رحمہ اللہ سے علم لغت کی تعلیم حاصل فرمائی۔

مشائخ بدایوں سے استفادہ

سلطان المشائخ قدس سرہٗ بدایوں میں تقریباً سولہ سال کی عمر تک حصول تعلیم میں مشغول رہے، اور اِس دوران آپ نے موقع بہ موقع وہاں کے متعدد علما و مشائخ سے استفادہ بھی فرمایا، مثلاً:

---

(۱) خواجہ علی مولا اَہیر قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ جس وقت شیخ جلال الدین تبریزی بدایوں پہنچے تو ایک گھر میں قیام کیا۔ علی مولا اپنے سر پر دہی کا مٹکا رکھے اُدھر سے گزرے۔ شیخ تبریزی دروازے پر بیٹھے تھے۔ جب علی مولا کی نظر شیخ تبریزی پر گئی تو دہی کا مٹکا اپنے سر اُتار کر شیخ کے سامنے رکھ دیا اور اُن کے قدموں پر گر پڑے۔ شیخ نے اُن کے دہی کو قبول فرمایا، دوستوں کو طلب کیا اور پیالہ و چمچہ منگوایا، پھر سب نے ایک ساتھ اُس دہی میں سے کھایا۔ اس کے بعد شیخ نے علی مولا سے گھر لوٹ جانے کے لیے کہا۔ اس پر علی مولا نے کہا کہ میں کہا جاؤں؟ مجھ کو کلمہ پڑھائیں تاکہ میں مسلمان ہو جاؤں۔ شیخ نے کلمہ پڑھایا اور علی مولا مسلمان ہو گئے۔ پھر اُنھوں نے کہا کہ میرے پاس بکثرت مال ہے، حکم ہو تو گھر جاؤں اور اُس میں سے کچھ اپنی اہلیہ کو دے آؤں، اور باقی مال آپ کی خدمت میں لے آؤں، تاکہ آپ جس کام میں چاہیں اُسے خرچ کریں۔ شیخ نے کہا: اچھا جاؤ۔ علی مولا گھر گئے اور اپنی اہلیہ سے کہا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں، تو بھی مسلمان ہوتی ہے یا نہیں؟ اس پر اُن کی اہلیہ اُنھیں بُرا بھلا کہنے لگی اور بولی: میں مسلمان نہیں ہوتی۔ علی مولا نے اپنا جمع شدہ مال لے لیا اور اُس میں سے کچھ اپنی اہلیہ کو دے کر کہا: آج کے بعد تو میری ماں اور بہن جیسی ہے، اب تیرا میرا کچھ تعلق و رشتہ نہیں۔ پھر اپنے مال کے ساتھ شیخ کے پاس آ گئے۔ شیخ نے فرمایا کہ مال اپنے پاس رکھو، اور جس جگہ پر میں کہوں خرچ کرو۔ حضرت علی مولا زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، فقط پنج وقتہ نماز ادا کر لیا کرتے تھے مگر اعلیٰ مقام پر فائز تھے، تمام علما و مشائخ اُن سے فیض حاصل کیا کرتے اور اُن کی قدم بوسی کیا کرتے تھے۔(خیر المجالس (فارسی)، مجلس:۵۶)

۱۔شیخ نظام الدین ابوالموید (متوفی:۶۷۲ھ): عظیم بزرگ اور مستجاب الدعوات درویش تھے۔ان کی بزرگی سے متعلق سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک بار برسات نہیں ہوئی۔اُن سے اصرار کیا گیا کہ بارش کے لیے دعا فرمائیں۔وہ منبر پر آئے۔بارش کی دعا پڑھی اور آسمان کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا: یااللہ! اگر تو نے بارش نہ برسائی تو میں آئندہ کسی آبادی میں نہیں رہوں گا'' اور منبر سے اُتر آئے۔اللہ تعالیٰ نے رحمت کی بارش فرمادی۔اس کے بعد سید قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے ملاقات کی اور یہ بات کہی کہ ہمارا آپ کے بارے میں پختہ اعتقاد ہے اور ہم جانتے ہیں کہ آپ کو حق تعالیٰ سے پورا نیاز حاصل ہے۔لیکن یہ آپ نے کیا کہا کہ اگر تو نے بارش نہ برسائی تو میں آئندہ کسی آبادی میں نہیں رہوں گا۔اگر بارش نہ ہوتی تو آپ کیا کرتے؟ شیخ نظام الدین ابوالموید نے کہا کہ میں جانتا تھا کہ اللہ بارش برسائے گا۔اس پر سید قطب الدین نے دریافت کیا کہ آپ یہ کیسے جانتے تھے؟ بولے کہ ایک بار میر سید نورالدین مبارک نوراللہ مرقدہٗ سے شمس الدین (التمش) کے سامنے اونچی اور نیچی جگہ بیٹھنے کے لیے جھگڑا ہوا تھا۔میں نے ایسی باتیں کہی تھیں جن سے ان کو تکلیف ہوئی تھی۔جس وقت مجھ سے بارش کی دعا کے لیے کہا گیا تو میں اُن کے روضے پر گیا اور کہا کہ مجھ سے بارش کی دعا کے لیے کہا گیا ہے اور آپ مجھ سے رنجیدہ ہیں۔اگر آپ مجھ سے راضی ہوجائیں تو میں دعا مانگوں اور اگر آپ راضی نہیں ہوں گے تو میں دعا نہیں مانگ سکوں گا۔اُن کے روضے سے آواز آئی کہ میں نے آپ سے صلح کرلیا،آپ جائیں اور دعا مانگیں۔(فوائدافواد،جلد:۴،مجلس:۴۶)

شیخ نظام الدین انتہائی اچھے واعظ بھی تھے اور اُن کا وعظ بڑا ہی پُرتاثیر ہوتا تھا۔ایک بار خواجہ امیر حسن سجزی نے سلطان المشائخ سے دریافت کیا کہ آپ نے اُن کا وعظ سنا ہے؟ فرمایا کہ ہاں! لیکن میں اُن دنوں بچہ تھا۔معانی کی سمجھ کچھ خاطر خواہ نہیں تھی۔ایک دن اُن کے وعظ میں پہنچا تو اُنھیں دیکھا کہ مسجد میں آئے اور جوتیاں جو پیروں میں پہن رکھی تھیں،اُتار کر ہاتھ میں لے لیں اور مسجد میں آکر دو رکعت نماز پڑھی۔میں نے کسی کو نماز میں اُن کی طرح نہیں دیکھا۔دو رکعتیں بڑے آرام سے پڑھیں اور منبر پر تشریف لے گئے۔ایک قاری تھے جنھیں قاسم کہتے تھے،اچھا پڑھتے تھے۔اُنھوں نے ایک آیت پڑھی۔

اس کے بعد شیخ نظام الدین ابوالمؤید نے آغاز فرمایا (اور ایک رباعی یہ کہہ کر پڑھی) کہ میں نے اپنے بابا کے ہاتھ سے لکھا ہوا دیکھا ہے۔ابھی اُنھوں نے دوسرا فقرہ بھی نہیں کہا تھا کہ پہلے فقرے ہی کا لوگوں پر ایسا اثر ہوا کہ سب رونے لگے۔اُس وقت اُنھوں نے یہ دو مصرعے پڑھے:

بر عشق تو و بر تو نظر خواہم کرد
جاں در غمِ تو زیر و زبر خواہم کرد(۱)

---

(۱) فوائدافواد،جلد:۴،مجلس:۴۶

میں تمھیں اور تمہارے عشق کو دیکھوں گا اور تمہارے غم میں اپنی جان کو زیروزبر کردوں گا۔

۲۔قاضی القضاۃ قاضی منہاج سراج (۶۴۳ - ۷۱۲ھ): قاضی موصوف خلیق انسان، جلیل القدر درویش اور مشہور زمانہ عالم وفاضل تھے۔ وجد وسماع کا خاصہ ذوق رکھتے تھے۔ جب آپ قاضی شہر ہوئے تو سماع کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ خواجہ امیر حسن سجزی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ قاضی منہاج بڑے صاحب ذوق انسان تھے۔ ایک بار شیخ بدرالدین غزنوی رحمہ اللہ کے گھر اُنھیں بلایا گیا اور وہ دن سوموار کا تھا۔ اُنھوں نے وعدہ کیا کہ وعظ سے فراغت کے بعد آجاؤں گا۔ غرض کہ جب وعظ سے فراغت مل گئی تو وہاں پہنچے اور محفل سماع میں شریک ہوئے اور دستار اور لبادہ جو پہن رکھا تھا اُسے ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ اُس وقت شیخ بدرالدین غزنوی کی نظم جو اُنھوں نے ''آتش گرفت'' کی ردیف میں کہی ہے، وہ پڑھی جارہی تھی، اور ایک دو شعر زبان سے ارشاد فرمائے، اُن میں سے یہ شعر یاد رہ گیا:

نوحہ میکرد بر من نوحہ گر در مجمعے
آہ ازیں سوزم بر آمد نوحہ گر آتش گرفت (۱)

ترجمہ: ایک نوحہ گر لوگوں کے سامنے مجھ پر نوحہ کررہا تھا۔ آہ! اُس سے میرا سوز ایسا نکلا کہ نوحہ گر کے اندر بھی آگ بھڑک اٹھی۔

قاضی منہاج پیر کے دن وعظ بھی دیا کرتے تھے۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں تقریباً ہمیشہ اُن کی مجلس وعظ میں جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے یہ شعر پڑھا:

لب بر لب لعل دلبراں خوش کردن
واہنگ سر زلف مشوش کردن
امروز خوش است ولیک فردا خوش نیست
خود را چوں خسی طعمہ آتش کردن (۲)

ترجمہ: حسین معشوقوں کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھنا اور اُن کے بکھرے زلفوں سے کھیلنا آج تو بہت اچھا لگتا ہے لیکن کل اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ جب خود کو گھاس کی مانند آگ (جہنم) کا لقمہ بنانا ہوگا۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ یہ اشعار کچھ اس طرح پڑھے کہ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی اور بڑی دیر تک میں بے خود رہا۔

غرض کہ قاضی منہاج سراج فقط ایک صاحب ذوق مرد اور سماع کے دلدادہ نہ تھے بلکہ وہ ایک تجربہ کار

---

(۱) فوائد الفواد، جلد: ۴، مجلس: ۴۶

(۲) اخبار الاخیار (فارسی)، طبقہ: ۲، ص: ۱۵۲

شخص اور وسیع النظر انسان اور اُمورِ مملکت میں پوری دسترس رکھنے والے تھے۔

۳۔خواجہ شاہی موئے تاب: بدایوں کے مشہور مجذوب درویشوں میں سے ایک تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوری شیخ شاہی موئے تاب کو ''روشن ضمیر'' کہا کرتے تھے۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ بدایوں میں ایک بزرگ تھے جن کو شیخ شاہی موئے تاب رحمۃ اللہ علیہ کہا جاتا تھا۔ ایک دفعہ اُن کے دوست اُنھیں سیر وتفریح پر باہر لے گئے اور کھیر پکائی۔ جب کھانا سامنے لگایا گیا تو خواجہ شاہی موئے تاب بولے کہ اس کھانے میں خیانت ہوئی ہے۔ شاید دو آدمیوں نے اس میں سے کچھ دودھ دوستوں کے سامنے لانے سے پہلے پی لیا تھا اور یہ درویشوں میں بڑی خطا سمجھی جاتی تھی۔ غرض کہ جب خواجہ شاہی نے کہا کہ ایسا کیوں ہوا کہ دوستوں کے سامنے کھانا لانے سے پہلے کسی نے اس میں سے کچھ کھالیا، تو وہ بولے کہ دیگ میں سے دودھ ابل کر باہر گر رہا تھا۔ ہم نے تو باہر گرنے والے دودھ کو لیا ہے اس کا کیا کرتے، گرنے دیتے؟ ناچار اُسے پی لیا۔ خواجہ شاہی نے کہا کہ نہیں!! اس طرح سے دودھ پینا غلط تھا، بہتا تھا تو بہنے دیتے۔ چنانچہ اُن کا یہ عذر نہیں سنا گیا، وہ پیچھے چلے گئے۔ وہاں دھوپ تھی۔ دھوپ میں کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ اُن کا پسینہ بہہ بہہ کر گرنے لگا۔ اُس وقت خواجہ شاہی نے کہا کہ حجام بلاؤ۔ پوچھا گیا کہ آپ کیا کریں گے؟ جواب دیا کہ جس قدر پسینہ میرے دوستوں کا بہا ہے، اس سے کہوں گا کہ اتنا خون میرا نکال دے۔

سلطان المشائخ جب اس بات پر پہنچے تو فرمایا کہ شاباش!! محبت ہو تو ایسی ہو، اور انصاف کا خیال رکھا جائے تو اس طرح رکھا جائے۔ (فوائد الفواد، جلد: ۳، مجلس: ۲)

وہ کس بلند پایہ بزرگ تھے اس تعلق سے سلطان المشائخ ایک حکایت بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ شیخ نظام الدین ابوالمؤید رحمۃ اللہ علیہ کو بیماری لاحق ہوئی تو اُنھوں نے خواجہ شاہی موئے تاب کو بلوایا اور کہا کہ کچھ دعا کرو کہ میری صحت اچھی ہو جائے۔ خواجہ شاہی نے کہا کہ آپ تو خود بزرگ ہیں، مجھ سے یہ فرمائش کیوں کر رہے ہیں؟ میں تو ایک بازارو آدمی ہوں مجھ سے اس بارے میں کچھ نہ کہیں۔ شیخ نظام نے اُن کی ایک نہ سنی اور کہا کہ تم دعا کرو اور توجہ کرو تا کہ میں صحت پا جاؤں۔ خواجہ شاہی بولے کہ اچھا تو پھر میرے دو دوستوں کو بھی بلا لیجیے۔ اُن میں سے ایک کا لقب شرف تھا جو بڑا صالح مرد تھا اور دوسرا ایک درزی تھا۔ غرض کہ دونوں بلائے گئے۔ خواجہ شاہی اُن دونوں سے بولے کہ شیخ نظام الدین نے مجھے اس کام کا حکم دیا ہے، اب تم میرا ساتھ دو۔ شیخ کے سر سے سینے تک میرے ذمے، نیچے کے اعضا سینے سے ایک پاؤں تک ایک کے ذمے اور دوسرے پیر تک دوسرے کے ذمے۔ اس طرح اُن تینوں نے توجہ دینی شروع کی اور شیخ نظام الدین کی بیماری صحت میں بدل گئی۔ (فوائد الفواد، جلد: ۳، مجلس: ۲)

بدایوں میں مخلوق کی ایک بڑی تعداد خواجہ شاہی کی طرف رجوع کرتی تھی۔ سب لوگ اُن کے پاس عقیدت سے آتے تھے، اور جہاں بھی جاتے بھیڑ لگ جاتی تھی۔ شیخ شاہی کا رنگ سیاہ تھا۔ اسی زمانے میں ایک درویش مسعود نخاسی بدایوں میں رہتے تھے۔ جب وہ خواجہ شاہی کو مجمع اور بھیڑ کے ساتھ دیکھتے تو کہتے:

’’کلومیاں! تم نے حمام خوب گرم کر رکھا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جل جاؤ۔‘‘

اور ایک دن ہوا بھی ایسا ہی کہ خواجہ شاہی موئے تاب رحمۃ اللہ علیہ ایام جوانی میں جل گئے اور اُسی کے سبب ۶۴۲ھ/ ۱۲۴۴ء میں فوت ہوئے۔(فوائد الفواد، جلد: ۴ مجلس: ۳۶)

۴۔خواجہ عزیز کرکی: باکمال درویش اور بدایوں کے کوتوال تھے۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ درویشوں کا نیاز مند بڑا ہی خوب شخص تھا۔ وہ کرک کے رہنے والے تھے، اسی لیے کرکی کہلائے۔ شیخ ضیاء الدین کا مرید تھے جو بدایوں میں رہتے تھے۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ سردی کی راتوں میں گرم تنور کے اندر اتر جاتے اور دوسرے دن صبح باہر نکلتے تھے۔

مزید فرماتے ہیں کہ ایک دن میں بدایوں کی امریوں (آموں کے باغوں) کی طرف جسے لکھی آلو کہتے ہیں، گیا ہوا تھا۔ یہ عزیز کوتوال ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا اور دسترخوان بچھا رکھا تھا۔ جب اُس نے مجھے دور سے دیکھا تو آواز دی اور کہا کہ مرحبا آیئے! میں ڈرنے لگا کہ کہیں تکلیف نہ پہنچائے۔ جب میں اُس کے پاس گیا تو مجھے پوری تعظیم کے ساتھ اپنے پہلو میں بٹھایا۔ کھانا کھا کر میں واپس آ گیا۔(فوائد الفواد، جلد: ۴ مجلس: ۳۶)

اِن مشائخ عظام کے علاوہ بھی آپ نے دیگر معروف وغیر معروف قدسی صفات بزرگوں اور مجاذیب سے ملاقات کی اور اُن کی صحبت سے فائدہ اُٹھایا۔ مثلاً: خواجہ مسعود نخاسی، شیخ ابوبکر موئے تاب، عزیز بشیر، شیخ شوریدہ وغیرہ۔ اِن تمام بزرگوں کا تذکرہ فوائد الفواد میں ملتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی کا سفر

سلطان المشائخ نے بدایوں میں ناظرہ سے ابتدائی فقہ اور علم لغت تک کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ۶۵۲ھ/ ۱۲۵۴ء میں ’’دہلی‘‘ کا رُخ کیا جو علم وفضل اور کمال وہنر کا ممتاز مرکز بنا ہوا تھا اور یوں سولہ سال کی عمر میں آپ بدایوں سے دہلی آ گئے۔(سیر الاولیاء (فارسی)، باب اول، ص: ۹۷-۹۸)

جس عہد میں آپ دہلی پہنچے وہاں سلطان ناصر الدین محمود کی حکومت قائم تھی اور غیاث الدین بلبن عہدۂ وزارت پر فائز تھا۔ اُس وقت دہلی میں بڑے بڑے نامور اَساتذۂ فن موجود تھے۔ اُن میں شمس الملک مولانا شمس الدین استاذ الاساتذہ کی حیثیت رکھتے تھے اور سلطنت کے اہم ترین امور میں مصروفیت ومشغولیت کے باوجود اُس زمانے کے علما کی طرح درس وتدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے، چنانچہ آپ حضرت مولانا شمس الدین کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے(۱) اور اُن سے خوب علمی وفنی استفادہ کیا، مثلاً اُن سے ’’مقاماتِ حریری‘‘ پڑھی جو عربی ادب کی مشہور ترین کتاب ہے اور قاسم بن علی بن محمد حریری بصری کی تصنیف لطیف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ماہر حدیث وحید عصر مولانا کمال الدین زاہد رحمہ اللہ (۶۸۴ھ) سے

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت، جلد: ۳، باب: ۲، ص: ۵۶

''مشارق الانوار'' پڑھی جوایک ہندوستانی عالم مولانا رضی الدین صغانی (م:۶۵۰ھ/ ۱۲۵۲ء) کا مرتب کردہ عظیم مجموعہ ہے۔ یہ اولین ایسا مجموعہ ہے جس میں ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' سے حذف اسناد کے ساتھ دو ہزار دو سو چھیالیس (۲۲۴۶) احادیث جمع ہیں۔ ''مشارق الانوار'' برصغیر میں اپنے زمانے کا بہت ہی معروف و مشہور اور معتبر و معتمد مجموعہ ہے۔ (آب کوثر،ص:۲۲۹)

سلطان المشائخ نے دہلی میں تقریباً تین- چار سال تک مسلسل حصول تعلیم کے لیے جد و جہد کیا اور تمام علوم متداولہ میں بکمال و تمام وافر حصہ پایا۔ یہاں تک کہ دورانِ طالب علمی ہی میں آپ ''بحاث'' اور ''محفل شکن'' جیسے مقتدر خطابات سے مشہور و معروف ہو گئے تھے۔ (سیر الاولیاء (فارسی)،ص:۱۰۱)

شیخ کبیر بابا فرید سے تحصیل علم

سلطان المشائخ نے کچھ کتابوں کا درس باضابطہ طور پر شیخ الاسلام فرید الدین گنج شکر سے بھی لیا۔ آپ خود بیان فرماتے ہیں کہ میں نے چھ سیپارے شیخ کبیر قدس اللہ سرہٗ العزیز سے پڑھے ہیں اور تین کتابیں اور بھی پڑھی ہیں۔ ایک کتاب کو سنا ہے اور دو پڑھی ہیں۔ جس دن میں نے یہ درخواست کی کہ میں آپ سے قرآن پڑھنا چاہتا ہوں تو فرمایا کہ پڑھو۔ اس کے بعد جمعہ کے دن عصر کے وقت تک جب کہ فرصت رہتی تھی، میں کچھ پڑھا کرتا۔ غرض کہ چھ سیپارے شیخ سے پڑھ لیے۔ جب میں نے پڑھنا شروع کیا تو مجھ سے فرمایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ پڑھو۔ جب میں نے پڑھنا شروع کیا اور وَلَا الضَّآلِّیْنَ پر پہنچا تو فرمایا کہ ''ضاد'' کو اِس طرح پڑھو جیسے میں پڑھتا ہوں۔ ہر چند کہ میں نے چاہا کہ اسی طرح پڑھوں جیسے شیخ پڑھ رہے ہیں، لیکن نہ ہو سکا۔ پھر فرمایا کہ کیسی فصاحت اور بلاغت تھی۔ حضرت ''ضاد'' کو اِس طرح پڑھتے تھے کہ کوئی اور نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس وقت فرمایا کہ ''ضاد'' خاص رسول علیہ السلام پر نازل ہوا ہے۔ دوسروں کے لیے نہیں تھا۔ پھر فرمایا کہ رسول علیہ السلام کو ''رسول الضاد'' کہتے ہیں۔ پھر اِن الفاظ میں ذکر فرمایا کہ ''رسول الضاد'' یعنی وہ جن پر ''ضاد'' نازل ہوا۔ واللہ اعلم (۱)

پھر شیخ شہاب الدین سہروردی (متوفی: ۶۳۲ھ) کی مشہور تصنیف ''عوارف المعارف'' کے چھ ابواب اور عقائد میں حضرت ابوشکور محمد بن عبدالسعید سالمی کی کتاب ''التمہید فی بیان التوحید'' اول سے آخر تک سبق در سبق آپ نے شیخ کبیر بابا فرید قدس سرہٗ سے پڑھی۔ (۲) اس کے علاوہ شیخ حمید الدین ناگوری (م:۶۴۳ھ/ ۱۲۵۴ء) کی تصنیف ''لوائح'' کا درس بھی اُن سے لیا۔ (مقدمہ فوائد الفواد (مترجم)،ص:۶۳)

شیخ کبیر اور لذت حسن بیان

شیخ کبیر کے درس میں آپ کو جو لذت و لطف ملتا تھا ایک زمانہ گزر جانے کے بعد بھی آپ اُسے محسوس

---

(۱) (فوائد الفواد، جلد:۴، مجلس:۳۲)

(۲) سیر الاولیاء (فارسی)،ص:۱۰۵

کرتے رہے۔فرماتے ہیں: میں نے عوارف کے پانچ ابواب شیخ کبیر فریدالدین سے پڑھے ہیں۔آپ جونکات اورحقائق ومعارف بیان فرماتے تھے اس طرح کا بیان کسی اور سے ہرگزممکن نہیں۔ بارہا لوگ شیخ کے حسن بیان میں پوری طرح سے محو ہوجاتے،اوردل چاہتا کہ اگر اُسی وقت دم نکل جائے تو بڑا ہی اچھا ہو۔(۱) پیرومرشد سے درس لینے کا یہ واقعہ میرے خیال سے پہلے سفر میں ہی پیش آیا ہوگا۔

ملازمت کا ارادہ اور شیخ متوکل کا جواب

چوں کہ سلطان المشائخ کے گھریلو حالات انتہائی عسرت میں گزر رہے تھے،اس لیے جب آپ نے اپنا رسمی تعلیمی کورس مکمل کرلیا تو والدہ ماجدہ نے آپ سے فرمایا کہ جاؤ اب ملازمت کے لیے کوشش کرو،تاکہ گھریلو حالات میں کچھ آسانی پیدا ہوجائے اور معاشی تنگی دور ہو۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں: ایک دن میں شیخ نجیب الدین متوکل کی خدمت بیٹھا تھا۔ میں اُن سے مخاطب ہوا، اورعرض کیا کہ ایک مرتبہ اس نیت سے سورہ فاتحہ پڑھیں کہ میں قاضی بن جاؤں۔شیخ نجیب الدین خاموش رہے۔ مجھے ایسا لگا کہ شاید سن نہیں پائے ہیں۔دوسری بارعرض کیا کہ ایک مرتبہ اس مقصد سے سورہ فاتحہ پڑھیں کہ میں کسی جگہ کا قاضی بن جاؤں۔پھربھی اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، پھرجب میں نے تیسری بارعرض کیا تو اُنھوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا:''قاضی مشو چیزی دیگر شو۔''یعنی قاضی نہ بنو کچھ اور بنو۔

یہ سن کرآپ نے فرمایا کہ شیخ نجیب الدین متوکل کو قضا کے کام سے کس قدر نفرت تھی کہ اس کے لیے فاتحہ پڑھنا بھی گوارا نہ کیا۔(۲) اُس کے بعد آپ نے بھی عہدۂ قضا(جسٹس بننے) کا خیال دل سے بالکل نکال دیا۔

شیخ کبیر بابا فرید سے غائبانہ عشق

سلطان المشائخ قدس سرہٗ جب بدایوں میں زیرتعلیم تھے تو اُسی زمانے میں آپ کو شیخ کبیر بابا فرید سے جنون کی حدتک عشق ہوگیا۔اِس تعلق سے آپ نے خود ہی تفصیل سے ذکر فرمایا ہے،اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں کم و بیش بارہ سال کا رہا ہوں گا۔لغت پڑھتا تھا۔ابوبکرخراط (قوال) نامی ایک شخص میرے استاذ کی خدمت میں آیا اوراُس نے شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی رحمہ اللہ کے مناقب بیان کرتے ہوئے کہا کہ اُن کے یہاں کی چکی پیسنے والی خادمائیں بھی ذکر کرتی ہیں اوراسی طرح کی بہت ساری اچھی اچھی باتیں بیان کیں مگر میرے دل پر اِس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔اُس نے پھر کہنا شروع کیا کہ میں وہاں سے اجودھن گیا اور ایسے ایسے بادشاہ (بابا فرید) کو دیکھا۔

غرض کہ شیخ فریدالدین قدس سرہٗ کے مناقب سنتے تو میرے دل میں اُن کی سچی محبت اورارادت بیٹھ گئی۔ حال یہ ہوگیا کہ ہرنماز کے بعد میں دس بار کہتا: شیخ فریدالدین اوردس بار کہتا: مولانا فریدالدین۔پھر یہ محبت ایسی

---

(۱) فوائدالفواد،جلد:۲،مجلس:۲۶

(۲) فوائدالفواد،جلد:۲،مجلس:۲۶

بڑھی کہ میرے سارے دوستوں کو خبر ہوگئی اور یہ ہونے لگا کہ اگر مجھ سے کچھ پوچھتے اور چاہتے کہ مجھے قسم دیں تو کہتے: شیخ فرید کی قسم کھاؤ۔ (فوائد الفواد، جلد: ۴، مجلس: ۲۲)

پھر بدایوں سے دہلی سفر کے دوران عوض نامی ایک بوڑھے شخص ہمراہی رہے۔ راستے میں اگر شیر، چور اور اُچکے کا خطرہ لاحق ہوتا تو وہ کہتے: اے پیر! تشریف لائیں اور اے پیر! ہم آپ کی پناہ میں یہ دشوار گزار گھاٹیاں طے کر رہے ہیں۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ پیر سے آپ کی مراد کیا ہے؟ تو اُنھوں نے جواب دیا کہ میں شیخ شیوخ العالم فریدالدین سے کہہ رہا ہوں۔ یہ سن کر میرے دل میں شیخ شیوخ العالم کی محبت اور زور پکڑ گئی۔ غرض کہ ہم دہلی پہنچے اور شیخ کے برادر اَصغر شیخ نجیب الدین متوکل رحمہ اللہ کے پڑوس میں اترے۔(۱) شیخ نجیب الدین متوکل رحمہ اللہ کی صحبت وسنگت نے بھی شیخ کبیر کی محبت کے اضافے واستحکام میں سونے پہ سہاگہ کا کام کیا اور وہ آپ کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئے کہ اُنھوں نے آپ کی مشفقانہ سرپرستی فرمائی۔ پھر اُن کے بے نظیر کردار، خداترسی، توکل واستغنا، شان فقر ودرویشی اور تحصیل علم کے شوق نے آپ کی ذہنی تربیت اور تشکیل مزاج میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

دہلی سفر کی یہ حکایت سلطان المشائخ نے خواجہ امیر حسن سجزی سے بھی بیان فرمائی جس میں اتنا اضافہ ہے کہ اِس سفر میں ایک دوسرے شخص بھی ساتھ رہے جن کا نام مولانا حسین خنداں تھا، اور بقول سلطان المشائخ:

''مقصود این حکایت این مقرر شد کہ چون خدا تعالیٰ این دولت روزی می کند، این چنین اسباب پیدا می شود۔'' (۲)

یعنی اِس حکایت کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دولت قسمت میں لکھی تھی، اس لیے اس طرح کے اسباب پیدا ہوگئے۔

دورانِ تعلیم بے چینی اور اضطرابی کیفیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطان المشائخ پورے انہماک سے طلب علم میں مصروف تھے اور ہر طرح کی سستی اور کاہلی سے پاک وصاف تھے لیکن اس کے باوجود آپ کا دل مضطرب رہتا اور طبیعت اکثر وبیشتر متوحش ہوجاتی تھی۔ ایک دن فرمایا کہ جوانی کے دنوں میں جب لوگوں کے ساتھ میرا اُٹھنا بیٹھنا تھا، ہمیشہ دل پر مجھے گرانی محسوس ہوتی تھی باوجودیکہ میں سب کے ساتھ حصول علم اور بحث ومباحثہ میں مشغول رہتا۔ میں دوستوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ میں ہمیشہ تمہارے درمیان نہیں رہوں گا، میں کچھ ہی دنوں تک تمہارے یہاں کا مہمان ہوں۔

خواجہ امیر حسن بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یہ قصہ شیخ الاسلام فریدالدین کی خدمت میں حاضر

---

(۱) سیر الاولیاء (فارسی)، ص: ۱۰۰

(۲) فوائد الفواد، جلد: ۴، مجلس ۲۲

ہونے سے پہلے کا ہے؟ فرمایا: ہاں! (تاریخ دعوت وعزیمت، جلد: ۳، باب: ۲، ص: ۵۸)

سلطان المشائخ کے اساتذہ

ا۔ شادی مقری: مشہور عالم خواجگی مقری لاہوری کے مرید صادق تھے اور قراءت سبعہ کے ماہر تھے۔ صاحب دل اور ولی صفت انسان تھے۔ اُن سے جو کوئی بھی ایک صفحہ قرآن پڑھ لیتا تھا اُسے حفظ قرآن کی دولت نصیب ہوجاتی تھی۔ جیسا کہ سلطان المشائخ فرماتے ہیں:

شادی مقری کو سات قرأتوں کے ساتھ قرآن یاد تھا۔ باصلاحیت اور صاحب کرامت تھے۔ اُن کی ایک کرامت یہ تھی کہ جوبھی اُن سے ایک صفحہ قرآن پڑھ لیتا اللہ تعالیٰ اُسے پورا قرآن پڑھنا میسر فرماتا۔ میں نے بھی اُن سے ایک سیپارہ پڑھا تھا اور اُس کی برکت سے قرآن یاد ہوگیا۔(۱) شادی مقری کا وصال ۶۵۸ھ کو بدایوں میں ہوا۔

۲۔ مولانا علاء الدین اصولی: نہایت زندہ دل اور صاف دل آدمی تھے۔ البتہ! اُنھوں نے کسی کا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ اگر کسی سے مرید ہوجاتے تو کامل حال شیخ ہوتے۔ جس وقت مولانا علاء الدین بچے تھے اور بدایوں کی گلیوں میں سے کسی گلی میں جارہے تھے تو شیخ جلال الدین تبریزی گھر کی دہلیز پر بیٹھے تھے۔ جب اُن کی نظر مولانا پر پڑی تو اُن کو بلایا اور جو لباس خود شیخ تبریزی پہنے ہوئے تھے، وہ اُن کو پہنا دیا۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ (مولانا اصولی کے) سارے اوصاف اور اخلاق اُسی کی برکت سے تھے۔

مزید مولانا علاء الدین کی دانشمندی اور بحث کے دوران انصاف پیش نظر رکھنے کی بابت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مشکل لفظ آتا، یا اس کے کسی نکتے کا جواب دیتے تو یہ بھی کہتے کہ میری تسلی کے مطابق یہ معنی حل نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے بارے میں کہیں اور بھی بحث و تحقیق کرلینا۔ یہ کیسے انصاف کی بات ہے!! کچھ ایسے ہی معنی کی مناسبت سے ایک حکایت بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار مولانا علاء الدین ایک نسخے کا مقابلہ کررہے تھے۔ ایک نسخہ اُن کے ہاتھ میں تھا اور ایک نسخہ میرے ہاتھ میں، کبھی وہ پڑھتے میں دیکھتا، اور کبھی میں پڑھتا وہ دیکھتے۔ شروع میں یہ ہوتا رہا۔ پھر میں ایک مصرع پر پہنچا جو ناموزوں بھی تھا اور اُس کے معنی بھی نہ نکلتے تھے۔ اس کے بارے میں بہت غور وفکر کیا مگر مشکل حل نہ ہوئی۔ اس درمیان ایک شخص جن کو مولانا ملک یار کہتے تھے، وہ آگئے۔ مولانا علاء الدین اصولی نے کہا کہ اس مصرعے کی صحت اُن سے پوچھیں گے۔ اس کے بعد یہ مصرع مولانا ملک یار کو سنایا اور اُنھوں نے مصرع جس طرح پڑھا، وہ موزوں بھی تھا اور بامعنی بھی۔ دل کو اطمینان ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا علاء الدین نے مجھ سے کہا کہ ملک یار نے یہ بات اپنے ذوق کی بنا پر کہی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ذوق کے معنی اُس دن مجھے سمجھ میں آئے، میں صرف ذوق حسی سے واقف تھا، اس

---

(۱) فوائد الفواد، جلد: ۴، مجلس: ۲۷

دن معلوم ہوا کہ معنوی ذوق کیا ہوتا ہے۔ (فوائد الفواد، جلد: ۴، مجلس: ۳۴)

۳۔ شمس الملک مولانا شمس الدین: اصل نام عبد الرحمٰن تھا، شمس الدین سے مشہور تھے، جب کہ شمس الملک لقب پایا۔ یکتائے روزگار اور باکمال عالم تھے اور انتہائی خلیق وظریف انسان تھے۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ شمس الملک رحمہ اللہ کا طریقہ تھا کہ اگر اُن کا کوئی شاگرد ناغہ کرتا/ اُن کا کوئی دوست مدتوں کے بعد آتا تو وہ کہتے کہ میں نے کیا ایسا کیا تھا کہ تم نہیں آئے۔ پھر تبسم کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر کسی سے خوش طبعی کرتے تب بھی یہی کہتے کہ میں نے کیا ایسا کیا کہ تم نہیں آئے۔ کچھ بتاؤ تو سہی کہ میں پھر وہی کروں۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر میری غیر حاضری ہوتی یا میں دیر سے پہنچتا تو میں سوچتا کہ مجھے بھی ایسا ہی کچھ کہیں گے مگر مجھ سے کہتے:

آخر کم ازان کہ گاہ گاہی
آئی وبہ ما کنی نگاہی

ترجمہ: آخر اتنا تو کرو کہ کبھی کبھی آؤ اور ہم پر ایک نگاہِ توجہ ڈال جاؤ۔

یہ کہتے ہوئے آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور (اُن کے اِس محبتانہ ومشفقانہ انداز و اطوار کو یاد کرکے) رونے لگے۔

شاگرد ہونے کے باوجود شمس الملک، آپ کو بڑی قدر وعزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک بار حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ جس زمانے میں آپ شمس الملک کے پاس جایا کرتے تھے، وہ آپ کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور اُن کے لیے جو جگہ خاص تھی وہاں آپ کو بٹھاتے تھے، (کیا یہ سچ ہے؟) آپ نے فرمایا: ہاں! چھجے پر جہاں وہ بیٹھتے تھے وہاں قاضی فخر الدین ناقلہ/ مولانا برہان الدین باقی کے سوا کوئی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ لیکن مجھ سے خاص اُسی جگہ کے لیے کہتے کہ بیٹھو۔ میں کہتا کہ وہ تو آپ کی جگہ ہے مگر وہ کوئی عذر نہ سنتے اور مجھے لازماً اُسی جگہ بٹھاتے۔ حضرت شمس الملک اُس زمانے میں مستوفی (Accountant) کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ (فوائد الفواد، جلد: ۲، مجلس: ۲۲)

۴۔ مولانا کمال الدین زاہد: باکمال تقویٰ وطہارت اور دیانتداری جیسے اوصاف سے بخوبی متصف تھے اور نابغۂ روزگار محدث تھے۔ علم فقہ میں بھی باکمال وصاحب درک تھے کہ آپ کا سلسلہ تلمذ ایک واسطے سے فقیہ اعظم علامہ برہان الدین مرغینانی صاحب ہدایہ رحمہ اللہ تک پہنچتا ہے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

غیاث الدین بلبن کی خواہش وتمنا تھی کہ وہ مولانا کمال الدین کو امام مقرر کرے اور اُن کی امامت میں نماز ادا کیا کرے۔ اسی کے پیش نظر مولانا کمال الدین کو بلایا اور اُن سے کہا کہ آپ کے علمی کمالات وفضائل اور دیانتداری پر پختہ یقین واعتقاد ہے۔ برائے کرم امامت کا عہدہ قبول فرمالیں تو

میں آپ کا ممنون رہوں گا اور مجھے اپنے نماز کے قبول ہونے پر پورا یقین ہو جائے گا۔ حضرت مولانا کمال الدین نے جواب دیا کہ میرے پاس تو ایک ہی نماز باقی رہ گئی ہے، اب میرے پاس کچھ نہیں بچا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہ بھی میرے پاس نہیں رہے؟ یہ جواب مولانا کمال الدین نے کچھ اِس بارعب اور پُرجلال انداز میں دیا کہ سلطان غیاث الدین خاموش ہو گیا اور پھر معذرت چاہتے ہوئے مولانا کمال الدین کو رخصت کر دیا۔ (اخبار الاخیار (فارسی)، طبقہ: ۲، ص: ۱۳۷)

مولانا موصوف کا اصل نام محمد بن احمد ماریکلی تھا لیکن مولانا کمال الدین زاہد کے نام سے مشہورِ زمانہ تھے۔ ان کا وصال ۶۸۴ھ/ ۱۲۵۸ء میں ہوا۔

۵۔ مولانا امین الدین محدث تبریزی: سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب کیقباد (سلطان معز الدین) نے کیلوکھری میں سکونت اختیار کی اور لوگوں کی آمد و رفت اس طرف بکثرت ہونے لگی، تب مجھ کو خیال ہوا کہ اب یہاں سے چلے جانا چاہیے اور سوچا کہ کل جو میں اپنے استاذ مولانا امین الدین محدث کی فاتحہ سوم میں شریک ہونے جاؤں گا تو شہر ہی میں رہ جاؤں گا۔ (درر نظامی موسوم بہ گفتار محبوب، باب: ۲۱، عزلت نشینی کے بیان میں، ص: ۱۸۸)

مولانا امین الدین محدث تبریزی کے تعلق سے مجھے اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ! سلطان المشائخ کی شخصیت و علمیت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ جیسے باکمال و ممتاز شاگرد نے جس اُستاذ سے درس لیا ہو اُس اُستاذ کا مقام و مرتبہ کیا ہو گا۔

پہلی بار اجودھن (پاک پٹن) حاضری اور بیعت و خرقہ

سلطان المشائخ اجودھن حاضر ہونے سے پہلے دہلی میں شیخ کبیر بابا فرید کے برادر حقیقی شیخ نجیب الدین متوکل سے متعارف ہو چکے تھے اور کچھ مدت اُن کے ساتھ قیام بھی کیا تھا، اُن کی صحبت اور گفتگو نے شیخ کبیر کی محبت جس کا آغاز بارہ سال کی عمر میں دورانِ طالب علمی بدایوں میں ہوا تھا اُس کو اور بھی مہمیز کر دیا۔ پھر بھی لاکھ کوششوں کے باوجود شیخ کبیر بابا فرید سے ملاقات کی کوئی سبیل نہیں نکل پا رہی تھی، کیوں کہ ایک تو والدہ ماجدہ ضعیفی کے عالم میں تھیں جنھیں تنہا چھوڑنا مناسب نہیں تھا اور دوسرا یہ کہ بیوہ بہن اور اُن کے بچوں کی کفالت کی ذمے داری بھی آپ کے سر تھی۔ لیکن ایک صبح فجر کے وقت کسی نے مسجد کے مینارے سے یہ آیت تلاوت کی کہ اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ﴿۱۶﴾ (حدید) (کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ سبحانہ کی یاد کے لیے رِقّت کے ساتھ جھک جائیں۔) جب یہ آیت کانوں سے ٹکرائی تو وجد و شوق کی کیفیت حدوں سے آگے نکل گئی۔ اہتمام سے احرام باندھا، مسجد میں نوافل ادا کیے، والدہ ماجدہ سے اجازت طلب کی اور ۶۵۵ھ مطابق ۱۲۵۷ء میں اجودھن کے سفر پر روانہ ہو گئے، اور شیخ کبیر بابا فرید کی بارگاہ میں حاضری دی۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب میں شیخ کبیر قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے دیکھتے ہی

حضرت شیخ نے یہ شعر پڑھا:؎

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

ترجمہ: اے نیک بخت! تیری جدائی وفرقت کی آگ نے دلوں کو کباب کردیا تھا اور تیرے اشتیاق کے سیلاب نے جانوں کو بے قرار ومضطرب کر رکھا تھا۔

مزید فرماتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ قدم بوسی کے اشتیاق کو کچھ تفصیل سے بیان کروں مگر شیخ کبیر کے رعب وجلال کے سبب قوت گویائی نے ساتھ نہیں دیا۔ صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ قدم بوسی کی بڑی تمنا تھی۔ شیخ نے جب دیکھا کہ میں کافی مرعوب ہوں تو فرمایا: لِکُلِّ دَاخِلٍ دَھْشَۃٌ۔ (فوائد الفواد، جلد:۱، مجلس:۲۸)

یعنی ہر نیا آنے والا کچھ یوں ہی مرعوب ہوتا ہے۔

شیخ کبیر نے آپ کی بڑی خاطر فرمائی اور آپ کے لیے جماعت خانے میں چارپائی بچھانے کا حکم دیا۔ لیکن جب چارپائی بچھادی گئی تو آپ نے اپنے دل میں سوچا کہ میں اس پر ہرگز آرام نہ کروں گا۔ کتنے معزز مسافر، کتنے حافظ کلام اللہ، کتنے عاشقان الٰہی زمین پر سو رہے ہیں، میں چارپائی پر کیسے لیٹوں؟ یہ خبر منتظم خانقاہ مولانا بدرالدین اسحاق کو پہنچی تو اُنھوں نے کہلوا بھیجا کہ تمھیں اپنے دل کی کرنا ہے یا شیخ کے ارشاد کی تعمیل؟ آپ نے کہا کہ شیخ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا، شیخ بدرالدین اسحاق نے فرمایا کہ جاؤ چارپائی پر سوجاؤ۔ (سیر الاولیاء (فارسی)، ص:۱۰۷)

اسی سفر میں شیخ کبیر بابا فرید نے آپ کو بتاریخ ۱۵ر رجب المرجب مرید کیا اور خرقۂ ارادت سے مشرف فرمایا۔ شرف بیعت کے وقت آپ کی عمر بیس سال کی تھی۔

قصۂ بیعت

سلطان المشائخ نے جب بیعت کی خواہش کا اظہار کیا تو شیخ کبیر قدس اللہ سرہٗ نے اُسے قبول فرمالیا اور پہلے سورۂ فاتحہ پڑھوائی، پھر سورۂ اخلاص پڑھوائی۔ اس کے بعد آمن الرسول کی تلاوت کروائی، اس کے بعد فرمایا کہ کہو:

> ’’میں نے اُس فقیر (شیخ کبیر) اور اُس کے خواجگان اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، اور عہد کرتا ہوں کہ اپنے پیر اور آنکھوں کو محفوظ رکھوں گا اور شریعت کا پابند رہوں گا۔‘‘

جب آپ نے یہ الفاظ دہرا لیے تو شیخ کبیر نے قینچی لے کر آپ کے بالوں کی ایک لٹ داہنی طرف سے قطع کی اور اپنا ایک کُرتا اپنے ہی ہاتھوں سے پہنایا۔ (مقدمہ فوائد الفواد (مترجم)، ص:۶۱)

بیعت کر لینے کے بعد شیخ کبیر نے شیخ بدرالدین اسحاق سے فرمایا کہ مولانا! تم بھی دہلی کے ہو، اور مولانا نظام الدین بھی دہلی کے ہیں، ان کو اپنا مہمان بناؤ اور ان کو پیر کے آداب سکھاؤ، اس طرح آپ شیخ بدرالدین اسحٰق کے مکان پر ٹھہرے۔ (نظامی بنسری، ص:۵۹)

بیعت کے سال ایک دن شیخ کبیر ایک عجیب باطنی کیفیت میں بیٹھے تھے اور ایک پرچہ اُن کے ہاتھ میں تھا جس میں ایک دعا لکھی تھی، اُسے آپ کو یاد کرنے کا حکم دیا اور خلافت دینے کی بات کہی۔ جیسا کہ سلطان المشائخ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ جب میں ابتدائی عہد میں تحصیل علوم کر رہا تھا اور اس میں خوب مستغرق تھا تو ایک دن شیخ شیوخ العالم نے فرمایا: نظام الدین! تمھیں یہ دعا یاد ہے؟(۱) میں نے عرض کیا کہ مجھے یاد نہیں ہے، اس پر شیخ شیوخ العالم نے فرمایا کہ اس دعا کو یاد کرلو اور کچھ دنوں تک اس پر مداومت کرو۔ اگر ایسا کرلو گے تو میں تمھیں اپنا جانشیں بنالوں گا اور خلافت کا معزز وممتاز عہدہ تمہارے حق میں تفویض کردوں گا۔ (سیر الاولیاء (فارسی)، ص:۱۱۶)

والدہ ماجدہ کا وصال اور اِستمداد

سلطان المشائخ اپنی والدہ محترمہ سے متعلق فرماتے ہیں کہ میری والدہ کو اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں اِس قدر رسائی حاصل تھی کہ جب اُنھیں کوئی حاجت پیش آتی تو اُس کا انجام وہ خواب میں دیکھ لیا کرتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی حاجت پیش آجاتی تو آپ پانچ سو مرتبہ درود شریف کا ورد کرتیں، اور دامن پھیلاتے ہوئے دعا کرتیں تو ویسا ہی ہوتا جیسا کہ آپ چاہتی تھیں۔ (اخبار الاخیار (فارسی)، ذکر بعضے از نسای صالحات، ص:۵۹۲)

مزید فرماتے ہیں: میری ماں کے وصال کا وقت قریب آیا تو میں نے پوچھا کہ آپ مجھے کس کے سہارے چھوڑے جارہی ہیں؟ بولیں کہ میں صبح بتاؤں گی، اور ہاں! تم جاؤ، نجیب الدین متوکل کے مکان میں سو رہو۔ صبح ہوئی تو خادمہ دوڑتی بھاگتی آئی اور کہا کہ جلدی چلیے مخدومہ بلا رہی ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو ماں نے مجھ سے پوچھا: تمہارا سیدھا ہاتھ کون سا ہے؟ میں نے اپنا سیدھا ہاتھ آگے کردیا۔ ماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

’’یا اللہ! میں اِسے تمہارے سپرد کرتی ہوں۔‘‘ (اخبار الاخیار (فارسی)، ذکر بعضے از نسای صالحات، ص:۵۹۴)(۲)

اور پھر وہ جاں بحق ہوگئیں۔ میری ماں کے اِس ایک جملے نے کہ ’’یا اللہ! میں اِسے تمہارے سپرد کرتی ہوں‘‘ مجھے اتنی خوشی دی کہ اگر وہ میرے لیے سونا سے بھرا ہوا گھر بھی چھوڑ جاتیں تو مجھے اتنی خوشی نہیں ملتی۔ (حوالہ سابق)

وفات کے بعد جب کبھی آپ مشکلات میں ہوتے/ کچھ حاجتیں پیش آجاتیں، تو آپ اپنی والدہ ماجدہ کے مزار پر جاتے اور اپنا مقصد بیان کردیتے، چنانچہ اُمید سے پہلے ہی آپ کی حاجتیں پوری اور دقتیں دور ہوجاتی تھیں، جیسا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

> منقول ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی کا بیٹا سلطان قطب الدین، سلطان المشائخ سے نزاع کے درپے ہوا۔ نزاع کا پہلا سبب یہ تھا کہ سلطان قطب الدین نے اپنے قلعہ میں ایک مسجد تعمیر کروائی اور پہلی بار جمعہ قائم کروایا تو تمام علما ومشائخ کو حکم دیا کہ اُس کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کریں۔ اِس کے جواب میں

---

(۱) متن دعا سیر الاولیاء، ص:۱۱۶ پر ملاحظہ کریں

(۲) سیر الاولیاء، باب:۱، نکتہ:۴، ص:۱۵۲

سلطان المشائخ نے کہلوا بھیجا کہ ہمارے قیام گاہ کے قریب ایک مسجد ہے اور اُس کا حق زیادہ ہے کہ ہم اُس قریبی مسجد میں نماز ادا کریں، اور آپ اُس کی مسجد کو نہیں گئے اور اپنی جگہ اپنے ایک خادم خاص خواجہ اقبال کو بھیج دیا۔ ایک دوسرا سبب اُس کا غرور تھا کہ تمام علما و مشائخ اور ائمہ اکابر بادشاہ کے بلانے پر گئے اور سلطان المشائخ کیوں نہیں گئے۔ حاسدین نے بادشاہ کے سامنے اِس کا مطلب یہ نکالا کہ سلطان المشائخ، بادشاہِ وقت سے دشمنی رکھتے ہیں اِس لیے نہیں آئے۔ اس طرح سلطان نے آپ کو زَک پہنچانے کا ارادہ کیا اور اِس کی خبر آپ تک پہنچی تو آپ نے کچھ نہیں کہا، بلکہ آپ اپنی والدہ ماجدہ کی زیارت کو گئے اور اُن کی قبر پر عرض کیا کہ بادشاہِ وقت مجھے زک پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے، اگر وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گیا تو میں آپ کی زیارت کو نہیں آ پاؤں گا، اور اپنا عریضہ انتہائی پسرانہ ناز و ادا کے ساتھ رکھا اور گھر واپس آ گئے۔ پھر دوسرے دن صبح ایک خبر مشتہر ہوگئی کہ سلطان قطب الدین کے مقرب خاص خسرو خاں نے اُس کو قتل کر دیا ہے اور اُس کی لاش بیرونِ محل پھینک دیا ہے۔

(اخبار الاخیار (فارسی)، ذکر بعضے از نسای صالحات، ص: ۵۹۲ - ۵۹۳)

بی بی زلیخا عرف مائی صاحبہ کا وصال ۳۰ جمادی الاولیٰ ۶۵۸ھ کو دہلی میں ہوا۔

درس وتدریس کا شغل

سلطان المشائخ کے شاگردوں میں طوطی ہند حضرت امیر خسرو، امیر خورد سید محمد کرمانی، خواجہ امیر حسن سجزی خواجہ نوح اور مولانا قطب الدین منور مشہور اور قابل ذکر ہیں، آپ نے اُن خوش نصیبوں کی تعلیم وتربیت بھی فرمائی، (غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی اور حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمہما اللہ) کی طرح باضابطہ درس وتدریس سے منسلک تو نہیں رہے لیکن تعلیم کی تکمیل اور اُس سے فراغت کے بعد اپنے طور پر وقتاً فوقتاً درس وتدریس کی طرف توجہ فرمایا تھا۔ جیسا کہ خواجہ امیر حسن سجزی بیان کرتے ہیں کہ خواجہ نوح جو سلطان المشائخ سے قرابت کا شرف رکھتے تھے (۱۳ رشوال ۷۱۲ھ کا ذکر ہے کہ وہ آپ کے) سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور آپ سے ''مشارق الانوار'' پڑھ رہے تھے، اور آپ مختلف احادیث کی وضاحت بھی فرمارہے تھے، اسی درمیان اِس حدیث پاک کا بیان آیا کہ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہو، اس کے منھ میں تھوک یا بلغم آئے اور وہ اس کو تھوکنا چاہے تو اسے چاہیے کہ قبلہ کی طرف نہ تھوکے اور نہ دائیں جانب کہ اس جانب فرشتہ رہتا ہے۔ بائیں جانب یا پیر کے پاس اس طرح تھوکے کہ عمل کثیر نہ ہو، صرف اتنا کرنے سے نماز خراب نہیں ہوتی ہے۔ (۱) مزید حضرت ابوہریرہ والی حدیث پاک کہ جنبی غسل کا حاجتمند ہوتا ہے نجس نہیں ہوتا۔ نیز ایک اور حدیث پاک کہ جب شیطان عورت کی شکل میں کسی شخص کے سامنے آئے اور اُس کا دل اُس کی طرف مائل ہو تو وہ اپنی بیوی سے جا ملے تا کہ وہ شیطانی وسوسے سے محفوظ اور سلامت

---

(۱) فوائد الفواد، جلد: ۲، مجلس: ۳۸

رہے وغیرہ کی وضاحت اور تشریح بیان فرمائی۔ (فوائد الفواد، جلد: ۲، مجلس: ۳۸)

اِس کے علاوہ درس و تدریس کے تعلق سے خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

سلطان المشائخ دہلی میں تعلیم دینے کا شغل رکھتے تھے کہ آپ کا گزر بسر اُسی سے پورا ہوتا تھا، حضرت بیس سال کی عمر سے پینتیس سال کی عمر تک طلبا کو تعلیم دینے کا کام کرتے رہے۔ پھر جب خلافت لے کر آئے اور معتقدین کی کثرت ہونے لگی اور روحانی مجاہدات بھی بڑھ گئے تو تعلیم کا یہ شغل خود بخود ترک ہو گیا ہوگا، اور یہ میں نے حسب ذیل واقعات سے سمجھا ہے:

- سیر الاولیاء میں حضرت (سلطان المشائخ) کا ایک بیان درج ہے کہ میں بہار اسٹیٹ کے فلاں شخص کے ہاں اُن کے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے جانا چاہا تھا اور اُن صاحب کا بھی یہ ذکر ہے کہ حضرت نے فرمایا ہے، اُن کا خط بھی حضرت کے پاس آیا تھا جو غالباً حضرت کے خط کے جواب میں بہار کے رہنے والے نے لکھا ہوگا۔ (نظامی بنسری، ص: ۳۷۴)
- ۶۵۹ھ میں جب حضرت بابا صاحب نے سلطان المشائخ کو دہلی کی خلافت دی تو حضرت نے دریافت کیا کہ میرا شغل درس و تدریس ہے اس کو جاری رکھوں یا بند کر دوں؟ حضرت بابا صاحب نے جواب دیا: درویش کے لیے علم بہت ضروری چیز ہے۔ تم تعلیم دینے کا شغل جاری رکھو اس کے بعد جو چیز غالب آئے گی اس سے مغلوب چیز خود ترک ہو جائے گی۔ (حوالہ سابق، ص: ۳۷۵)

ایک شبہہ کا ازالہ

خواجہ حسن نظامی نے سلطان المشائخ کے تدریسی شغل پر جو آخر الذکر دلیل ذکر کی ہے میرے خیال سے وہ محل نظر ہے، کیوں کہ خلافت دینے کے بعد شیخ کبیر بابا فرید نے آپ کے دریافت کرنے پر تعلّم (حصول تعلیم) کا شغل جاری رکھنے کی اجازت دی تھی نہ کہ تدریسی شغل کی۔ جیسا کہ امیر خورد سید محمد کرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

بعد ازاں بخدمت شیخ شیوخ العالم عرضداشت کردم: فرمان شیخ چیست، ترک تعلم گیرم و بہ اوراد و نوافل مشغول شوم؟ شیخ شیوخ العالم فرمود کہ من کسے را از تعلم منع نکنم آنہم کن اینہم کن تا غالب کہ آید، درویشی را قدرے علم باید۔ (سیر الاولیاء (فارسی)، ص: ۱۰۷)

ترجمہ: بیعت کے بعد میں نے شیخ شیوخ العالم کی خدمت میں عرض کیا کہ شیخ کا کیا فرمان ہے ترک تعلیم کر دوں اور اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاؤں؟ شیخ شیوخ العالم نے فرمایا کہ میں کسی کو تعلیم سے منع نہیں کرتا۔ تعلیم بھی جاری رکھو اور اوراد و نوافل بھی کرتے رہو، یہاں تک کہ ایک دن اُن میں سے ایک چیز خود بخود غالب آ جائے گی، درویشی کے لیے کچھ علم لازم ہے۔

اور یہ بات اس لیے بھی وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ بیعت و ارادت اور خلافت کے بعد بھی سلطان المشائخ

حصول تعلیم کا اعلیٰ رجحان اور خاصہ ذوق رکھتے تھے کہ شیخ کبیر بابا فرید سے آپ نے عوارف، تمہید از ابوشکور سالمی، لوائح اور تقریباً چھ سیپارے مع تجوید تعلیم حاصل کی تھی۔

پھر یہ کہ ''درویشی راقدرے علم باید'' کی بنیاد پر خواجہ اخی سراج رحمہ اللہ کی خلافت پر روک لگادی گئی تھی، پھر جب اُنھوں نے قابل قدر تعلیم حاصل کرلی تو خلافت نامہ جاری فرمایا۔

سند خلافت واجازت اور جانشینی

پھر جب کامل چار سال کے بعد تیسری بار سلطان المشائخ ۶۵۹ھ مطابق ۱۲۶۱ء میں اجودھن پہنچے تو شیخ کبیر بابا فرید نے آپ کو خلافت واجازت عطا فرمائی اور سند خلافت کی تصدیق کے لیے ہانسی مولانا جمال الدین رحمہ اللہ کے پاس جانے کا حکم فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک دن شیخ نے مجھے بلایا۔ یہ رمضان کی تیرہویں تاریخ تھی اور ۶۵۹ھ کا اخیر زمانہ تھا۔ شیخ نے فرمایا: نظام الدین! جو کچھ میں نے تم سے کہا تھا یاد ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جی یاد ہے! فرمایا کہ اچھا ایک کاغذ لاؤ اجازت نامہ لکھ دوں، تو میں کاغذ لے کر حاضر ہوا، آپ نے اجازت نامہ تحریر فرمایا اور اس کے بعد فرمایا کہ اسے مولانا جمال الدین ہانسوی کو دکھاؤ اور دہلی میں قاضی منتخب الدین کو دکھاؤ۔ اُس وقت آپ کی عمر ۲۴؍ سال تھی۔ (متن سند خلافت واجازت نامہ سیر الاولیاء (فارسی)، ص: ۱۱۷ پر ملاحظہ کریں۔)

مزید آپ فرماتے ہیں کہ جس دن جناب شیخ نے مجھے خلافت عطا فرمائی اُس دن میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اَسْعَدَكَ اللهُ فِي الدَّارَيْنِ وَرَزَقَكَ عِلْمًا نَافِعًا وَعَمَلًا مَقْبُولًا۔

یعنی اللہ سبحانہ تجھے دونوں جہان میں نیک بخت کرے اور علم نافع اور عمل مقبول عطا فرمائے۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ تم ایک ایسا درخت بنو گے جس کے سائے میں ایک خلق کثیر آرام وسکون سے رہے گی۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ استعداد ولیاقت کے لیے مجاہدہ کرنا چاہیے۔

غرض کہ میں اجازت نامہ لے کر رخصت ہوا، اور شیخ جمال الدین رحمہ اللہ کے پاس ہانسی پہنچا اور اُنھیں خلافت نامہ دکھایا۔ وہ بڑی خندہ روئی سے ملے، بے انتہا مہربانیاں فرمائیں اور یہ شعر پڑھا:

خدائے جہان را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس

یعنی اللہ رب العالمین کا ہزار ہا شکر کہ گوہر، گوہر شناس کے پاس پہنچ گیا۔ (سیر الاولیاء (فارسی)، ص: ۱۱۶-۱۱۷)

سلطان المشائخ اور حکم شیخ کی تعمیل

انسانی حقوق کی ادائیگی ایک لابدی امر ہے جس سے کسی بھی صورت نجات ممکن نہیں تاوقتیکہ صاحب حق معاف نہ کردے۔ یہی سبب ہے کہ شیخ کبیر نے اِس سلسلے میں بڑی تاکید فرمائی تھی اور حکم دیا تھا کہ مخالفین کو راضی کرنے کے ساتھ اہل حقوق کو راضی کرنے میں ہرگز پیچھے نہ رہنا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ ارادت وخلافت کے

بعد جب میں دہلی کے لیے روانہ ہوا تو مجھے یاد آیا کہ میرے ذمے ایک بزاز (کپڑا فروش) شخص کا بیس جیتل (نقدی) ہے اُسے دینے ہیں اور ایک کتاب جو میں نے ایک شخص سے ادھار لی تھی وہ کھوگئی ہے اُسے بھی راضی کرنا ہے۔لیکن دہلی پہنچنے کے بعد میرے پاس بیس جیتل جمع نہیں ہوئے کہ اُس بزاز کو پہنچاتا، معاش کی تنگی تھی اس لیے میرے پاس کبھی پانچ جیتل ہوتے اور کبھی دس۔ ایک بار دس جیتل دستیاب ہوئے تو میں اُس بزاز کے گھر پہنچا، میں نے اُس سے کہا کہ تمہارے بیس جیتل میرے ذمے ہیں، لیکن ایک مرتبہ دینے کی سکت میرے پاس نہیں ہے، یہ دس جیتل لے لو باقی دس جیتل ان شاءاللہ بعد میں پہنچا دوں گا۔ بزاز نے جب میری بات سنی تو اُس نے کہا: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم مسلمانوں کے پاس سے آرہے ہو۔ پھر اُس نے وہ دس جیتل رکھے لیے اور مجھ سے کہا کہ جاؤ، میں نے دس جیتل معاف کر دیے۔

اس کے بعد میں اُس شخص کے پاس گیا جس کی کتاب میں نے ادھار لی تھی اور مجھ سے کھوگئی تھی، اُس نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں نے اُس سے کہا کہ جناب! میں نے آپ سے ایک کتاب بطور عاریت لی تھی، وہ مجھ سے کھوگئی ہے، اب میں اُس کی نقل تیار کر کے آپ کو دوں گا۔ میں بالکل اسی طرح لکھوا کر آپ تک پہنچا دوں گا۔ اُس شخص نے کہا کہ ہاں! تم جہاں سے آرہے ہو وہاں کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے، پھر اُس نے کہا کہ میں نے وہ کتاب تمھیں بخش دی۔ (تاریخ دعوت وعزیمت، جلد:۳، باب:۲، ص:۶۹-۷۰)

پیرو مرشد اور مرید وخلیفہ کا تعلق ورشتہ

جب پہلی بار اجودھن (پاک پٹن) گئے اور (غالباً ۶۵۷ھ میں) واپسی کا وقت آیا تو سلطان المشائخ، شیخ جمال الدین ہانسوی اور شمس دبیر پر مشتمل ایک چھوٹے سے قافلے کی شکل میں روانہ ہوئے۔ رخصت کے وقت سب نے شیخ کبیر کی قدم بوسی کی۔ شیخ جمال الدین نے عرض کیا کہ ہمیں کچھ وصیت فرمائیں! اس پر شیخ کبیر نے آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''انھیں خوش رکھنا۔''

لہٰذا شیخ جمال الدین نے راستے بھر آپ کی ہر ضرورت کا خاص خیال رکھا۔

دوران سفر امروہہ نامی ایک گاؤں میں پہنچے جہاں کا حاکم میران نامی ایک شخص تھا اور شیخ جمال الدین کا مرید تھا۔ وہ گاؤں والوں کے ساتھ استقبال کے لیے گاؤں سے باہر نکلا اور بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ آپ سب کو اپنا مہمان بنایا۔ اگلی صبح رخصت کے وقت اُس حاکم نے سب کی سواری کے لیے ایک ایک تازہ دم گھوڑا پیش کیا۔ آپ کو جو گھوڑا ملا تھا وہ کچھ سرکش اور بدمعاش تھا۔ اُس نے آپ کو بہت پریشان کیا۔ اسی بیچ شیخ جمال الدین اور شمس دبیر آگے نکل گئے اور آپ اُن سے کئی میل پیچھے رہ گئے اور یوں آپ تنہا ہو گئے۔ موسم بڑا ہی سخت تھا۔ اُوپر سے پیاس کی شدت بھی تھی، ایسے میں گھوڑا سرکشی کرنے لگا اور آپ کو زمین پر گرا دیا۔ آپ اتنے زور سے گرے کہ بے ہوش ہو گئے اور کافی دیر تک جنگل میں بے ہوش پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ آپ کی

زبان پر بابا فرید کا نام جاری وساری ہے۔

اس پر اللہ سبحانہ کا شکر ادا کیا اور خیال کیا کہ اس سے اُمید ہے کہ ان شاء اللہ وصال کے وقت بھی شیخ کا نام زبان پر جاری وساری رہے گا۔ (مقدمہ فوائد الفواد (مترجم)، ص:۶۵-۶۶)

سلطان المشائخ اور اطاعت شیخ

ایک موقع پر فرمان پیر کی نگہداشت کا ذکر آیا تو فرمایا: ایک بار شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہٗ العزیز ایک دعا ہاتھ میں لیے ہوئے فرمایا کہ کوئی ہے جو اِس دعا کو یاد کرلے؟ میں سمجھ گیا کہ شیخ کا مقصود یہ ہے کہ میں اُسے یاد کرلوں۔ میں نے ادب سے عرض کی کہ اگر حکم ہو تو بندہ اِس دعا کو یاد کرلے۔ لہٰذا شیخ نے وہ مجھے عنایت کردی۔ میں نے عرض کی کہ ایک بار مرشد کے سامنے پڑھ لوں پھر یاد کرنا شروع کروں۔ شیخ نے فرمایا کہ پڑھو۔ جب میں نے پڑھا تو ایک اعراب کی اصلاح فرمائی کہ اِس طرح پڑھو، پھر میں نے اُسی طرح پڑھا جس طرح شیخ نے پڑھا تھا۔ اگرچہ جس طرح میں نے پڑھا تھا وہ بھی بامعنی تھا۔ غرض کہ وہ دعا اُسی وقت میرے دل میں یاد ہوگئی۔ میں نے عرض کی کہ دعا یاد کرلی ہے، حکم ہو تو پڑھوں؟ فرمایا کہ پڑھو۔ میں نے دعا سنائی اور وہ اعراب ویسے ہی پڑھا جیسا کہ شیخ نے اصلاح فرمائی تھی۔

پھر جب شیخ کی خدمت سے باہر آیا تو مولانا بدر الدین اسحٰق نے مجھ سے کہا کہ تم نے اچھا کیا کہ اعراب اسی طرح پڑھے جیسے شیخ نے بتائے تھے۔

اس پر میں نے کہا کہ اگر سیبویہ جو اِس علم (نحو) کا واضع ہے اور وہ سب جو اِس علم کے بانی ہوئے ہیں، آئیں اور مجھ سے کہیں کہ اعراب اُسی طرح ہیں جس طرح تم نے پڑھے تھے۔ پھر بھی میں اسی طرح پڑھوں گا جس طرح شیخ کبیر نے فرمایا ہے۔ یہ سن کر مولانا بدر الدین اسحٰق نے کہا کہ اس قدر آداب شیخ آپ کے سوا کسی کو میسر نہیں۔ (فوائد الفواد، جلد:۱، مجلس:۲۵)

اجودھن دس بار حاضر ہوئے

سلطان المشائخ قدس سرہٗ نے شیخ کبیر کی حیات و ممات میں کل دس بار اَجودھن تشریف لے گئے تھے۔ اجودھن کے علاوہ کسی اور سفر پر جانے کا ذکر نہیں ملتا جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں:

”سہ کرت بخدمت شیخ شیوخ العالم کبیر رفتہ ام ہر سال یکبار بعد ازاں کہ نقل فرمود ہفت بار دیگر رفتہ شدہ است یا شش بار، اما اغلب گماں اینست کہ ہفت بار رفتہ ام چناں کہ در خاطر ہم چنیں مقرر است کہ در حیات و ممات دہ بار رفتہ شدہ است۔“ (سیر الاولیاء (فارسی)، ص:۱۰۷)

ترجمہ: میں شیخ شیوخ العالم کبیر کی خدمت (ظاہری حیات) میں تین بار حاضر ہوا ہوں۔ ہر سال ایک بار، آپ کے انتقال کے بعد سات بار حاضر ہوئی ہے یا چھ بار!! لیکن غالب گمان یہی ہے کہ سات بار حاضری ہوئی

ہے۔لہٰذا یہی یاد پڑتا ہے کہ میں حیات وممات میں کل دس بار اجودھن حاضر ہوا ہوں۔

یعنی تین بار ظاہری زندگی میں اور سات بار شیخ کے وفات پا جانے کے بعد۔

آپ جب دہلی سے اجودھن جاتے تو بالعموم ماہ رجب میں دہلی سے روانہ ہوتے اور رَمضان کا مہینہ اجودھن میں گزارتے۔پھر ماہِ شوال/ ماہ ذیقعدہ میں واپسی ہوتی تھی۔(سیر الاولیاء(فارسی)،ص: ۲۶۴)

تنبیہ: ایک اندازہ کے مطابق اجودھن کا اولین سفر ۶۵۵ھ میں ہوا جس وقت والدہ ماجدہ باحیات تھیں، دوسرا سفر ۶۵۷ھ/ ۶۵۸ھ میں اور تیسرا سفر ۶۵۹ھ کو رمضان میں ہوا، اور شیخ کبیر سے اِسی سال آخری ملاقات رہی۔

دہلی میں مستقل قیام

سلطان المشائخ قدس اللہ سرہٗ سولہ سال کی عمر میں والدہ ماجدہ، ہمشیرہ زینب عرف بی بی رحمت اور خادمہ کے ہمراہ ۶۵۲ھ میں دہلی پہنچے اور تقریباً نواسی (۸۹) سال تک دہلی کے مختلف مقامات پر سکونت اختیار فرمائی۔ مثال کے طور پر پہلے پہل تعلیم کی غرض سے دہلی پہنچے تو (شیخ نجیب الدین متوکل کے پڑوس) سرائے میاں بازار/نمک سرائے میں ٹھہرے، والدہ اور ہمشیرہ کو نمک سرائے میں ٹھہرایا اور خود مقام قوّ اس میں سکونت اختیار کی جو نمک سرائے کے سامنے واقع تھا۔ اسی محلے میں حضرت امیر خسرو بھی (اپنے نانا راوت عرض کے مکان میں) رہتے تھے۔(پھر جب ۶۵۹ھ میں خلافت واجازت ملی اور دہلی واپس ہوئے تو) کچھ دنوں بعد راوت عرض کا مکان خالی ہوگیا، لہٰذا حضرت امیر خسرو کے توسط سے آپ اُن کے نانا راوت عرض کے مکان میں منتقل ہو گئے اور تقریباً دو سال اس مکان میں قیام فرمایا۔اتفاقاً سید محمد کرمانی (امیر خورد کے جد کریم) اپنے متعلقین کے ساتھ اجودھن سے دہلی آئے تو وہ بھی اُسی مکان میں قیام پذیر ہوئے۔امیر خورد سید محمد کرمانی کے والد سید نورالدین مبارک کے بقول: اُس وقت میرے اور خواجہ مبشر کے سوا کوئی اور خادم نہیں تھا۔

شب و روز یوں ہی بسر ہو رہے تھے کہ اِسی درمیان راوت عرض کے لڑکے اپنی جاگیروں سے واپس آئے اور مکان خالی کرانے لگے۔آپ نے مکان کی تلاش میں آدمی کو بھیجا مگر شاہی قربت حاصل ہونے کے زعم میں اُن لوگوں نے اتنی بھی مہلت نہیں دی کہ آپ کوئی اور مکان تلاش کر پاتے۔مجبوراً آپ چھپر دار مسجد میں چلے گئے جو سراج بقّال کے گھر کے سامنے واقع تھی۔سید محمد کرمانی بھی اپنے متعلقین کے ساتھ آپ کے ساتھ ہی آ گئے۔اُس وقت آپ کے پاس سوائے کتابوں کے اور کچھ سامان نہ تھا، چنانچہ سید نورالدین مبارک اور خادم خاص خواجہ مبشر اپنے سروں پر تمام کتابیں اٹھا لائے۔ایک رات اسی بے سروسامانی میں بسر ہوئی۔(سیر الاولیاء(فارسی)،ص:۱۰۸-۱۰۹)

سعد کاغذی کے مکان اور دیگر مقامات پر قیام: دوسرے دن شیخ صدرالدین رحمہ اللہ کے مرید جناب سعد کاغذی نے جب یہ ماجرا سنا تو وہ سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اور انتہائی عزت واکرام اور عاجزانہ اصرار کے ساتھ آپ کو اپنے مکان پر لے گئے، اور اُوپری منزل پر آپ کو ٹھہرایا اور سید محمد کرمانی کے لیے

ایک دوسرے مکان کا انتظام کر دیا۔ ایک ماہ تک جناب سعد کاغذی کے مکان میں آپ کا قیام رہا۔ اس کے بعد سرائے رکابدار کے ایک مکان میں منتقل ہو گئے جو قیصر پل سے متصل تھا اور سرائے کے ایک گوشے میں واقع تھا۔ سید محمد کرمانی نے بھی اپنے متعلقین کے ساتھ اسی سرائے میں ایک کمرہ لیا اور مع متعلقین قیام پذیر ہو گئے۔

پھر کچھ دنوں کے بعد آپ نے سرائے رکابدار کے اُس مکان کو بھی خیر باد کہہ دیا اور محمد میوہ فروش کی دکان سے متصل شادی گلابی کے مکان پر قیام فرمایا۔ اُسی دوران (شاہی امیر) شمس الدین شرابدار کے لڑکے اور اُن کے احباب واقارب آپ کے معتقد ہو گئے اور آپ کو پورے اعزاز واکرام کے ساتھ شمس الدین شرابدار کے مکان میں لے آئے۔ اس مکان میں آپ کئی برسوں تک رہے۔ یہاں راحت وسکون کے ساتھ آپ کی جمعیت خاطر میں بھی کافی ترقی ہوئی۔ نیز اجودھن سے جواَحباب واصحاب دہلی آتے وہ شمس الدین شرابدار کے مکان ہی میں قیام کرتے۔ (سیر الاولیاء (فارسی)، ص:۱۰۸-۱۰۹)

غرض کہ تقریباً گیارہ سال (۶۵۹ھ-۶۷۰ھ) تک سلطان المشائخ کو دہلی کے مختلف مکانات میں سکونت اختیار کرنی پڑی اور متعدد پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن آپ نے ہمہ دم صبر وضبط سے کام لیا، ہمیشہ راضی برضا رہے اور کبھی ایک حرف شکایت بھی زبان پر نہیں لایا۔

درس حدیث کی تکمیل اور سند حدیث

سلطان المشائخ تقریباً ۲۳-۲۴ر سال کی عمر میں جملہ علوم متداولہ کی تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے لیکن تحصیل علم کی طلب ابھی تک آپ کے اندر باقی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ۶۵۹ھ میں خلافت واجازت پا جانے کے بعد بھی بیس سال تک حصول علم حدیث میں مصروف رہے۔ چوں کہ اللہ سبحانہ کو آپ سے دین ودعوت کی عظیم خدمات لینی تھی اور اُس کے لیے اعلیٰ پیمانے پر کافی وشافی علم واِستعداد لابدی تھی، چنانچہ اُس وقت کے مشہور عالم اور ماہر حدیث مولانا کمال الدین زاہد سے باقاعدہ اور منظم طور پر علم حدیث حاصل کیا، اور فن حدیث میں کامل مہارت کے حصول کے بعد محدث عصر مولانا کمال الدین سے آپ نے سند حدیث حاصل کی۔ مولانا کمال الدین اصولی نے اپنے دست خاص سے آپ کے لیے سند نامہ تحریر فرمایا تھا، اور یوں ۲۲ جمادی الاول ۶۷۹ھ میں سند حدیث سے نوازے گئے۔ (خواجہ نظام الدین اولیا، ص:۵۹)

غیاث پور میں قیام خدا کی مرضی تھی

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں میرا دل دہلی میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک دن قتلغ خان تالاب میں بیٹھا قرآن مجید یاد کر رہا تھا کہ میں نے ایک درویش کو دیکھا جو مشغول بحق تھے۔ میں اُن کے پاس گیا اور دریافت کیا کہ کیا آپ اسی شہر میں رہتے ہیں؟ اُنھوں نے کہا کہ ہاں! میں نے دریافت کیا کہ اس شہر

میں آپ کی طبیعت لگتی ہے اور آپ پُرسکون رہتے ہیں؟ اُنھوں نے کہا: نہیں! پھر اُس درویش نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک درویش کمال دروازہ (ایک جگہ کا نام) کے پاس مجھے ملا اور مجھ سے کہنے لگا کہ اگر تم ایمان کی سلامتی چاہتے ہو تو اِس شہر سے نکل جاؤ۔...

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ حکایت سنی تو دل میں حتمی فیصلہ کرلیا کہ اس شہر میں نہیں رہوں گا۔ میرے دل میں چند مقامات کی طرف نکل جانے کا خیال آیا، مثلاً: قصبہ پٹیالی چلا جاؤں، اُن دنوں امیر خسرو پٹیالی میں تھا/ بسنالہ چلا جاؤں کہ نزدیک میں واقع ہے۔ غرض کہ بسنالہ چلا بھی گیا۔ وہاں تین دنوں تک رہا مگر کوئی مکان دستیاب نہ ہوا، نہ کرایہ کا اور نہ گروی اور نہ ہی قیمت پر۔ تینوں دن ایک ایک شخص کا مہمان رہا۔ پھر وہاں سے واپس آ گیا مگر دل میں منتقلی کا خیال گردش کرتا رہا، یہاں تک کہ ایک بار حوض رانی باغ (معروف بہ باغ جسرت سنگھ) میں بیٹھا مناجات کرر ہا تھا کہ خدایا! اس شہر سے دوسری جگہ جانا چاہتا ہوں لیکن اس میں اپنی رائے کو پسند نہیں کرتا بلکہ تیری مرضی جہاں ہو میں وہاں چلا جاؤں۔

آپ فرماتے ہیں کہ ابھی میرا یہ جملہ مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ایک غیبی آواز آئی: ''غیاث پور جاؤ۔'' حالاں کہ اُس وقت تک میں نے غیاث پور کو نہ دیکھا اور نہ اُس کے بارے میں کچھ جانتا تھا کہ غیاث پور کہاں واقع ہے۔ جب میں نے یہ آواز سنی تو اپنے ایک نیشاپوری دوست نقیب کے پاس گیا۔ جب میں اُس کے دولت خانہ پر پہنچا تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ غیاث پور گیا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں خود سے کہا کہ یہ وہی غیاث پور تو نہیں ہے؟

غرض کہ میں اُس کے ساتھ غیاث پور گیا اور وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اُن دنوں غیاث پور اِس قدر آباد نہ تھا بلکہ ایک غیر معروف علاقہ تھا[۱] اور دریائے جمنا کے کنارے واقع تھا جہاں آج ہمایوں کا مقبرہ موجود ہے۔

کچھ دنوں کے بعد کیقباد (سلطان معزالدین) کیلوکھری میں سکونت پذیر ہوا تو اُس زمانے میں حکام و امرا وغیرہ کا آنا جانا شروع ہو گیا، اور مخلوق کی کثرت ہونے لگی۔ پھر خلقت کی جم غفیر کو دیکھتے ہوئے آپ نے غیاث پور سے بھی جانے کا ارادہ کرلیا، اور اِسی فکر و تردد میں تھے کہ ایک نحیف و ناتواں جوان (اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ مردان غیب سے تھا یا کوئی اور) آیا اور آتے ہی کہنے لگا:

آں روز مہ شدی نمی دانستی
کانگشت نمائے عالمے خواہی شد
امروز کہ زلفت دل خلقے بربود
درگوشہ نشستنت نمی دارد سود

---

(۱) سیر الاولیاء (فارسی)، باب: ۱، ص: ۱۱۰-۱۱۱

ترجمہ: جس دن سے تم چاند بنے تھے تمھیں یہ خبر نہیں تھی کہ ایک زمانے کی انگلیاں تمہاری طرف اٹھیں گی؟ اب جب کہ تمہاری زلف نے دنیا کے دلوں کو اَسیر کرلیا ہے، تو اُس کے بعد ایک گوشے میں بیٹھ جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

پھر کہنا شروع کیا کہ اول تو مشہور نہیں ہونا چاہیے اور جب کوئی مشہور ہو جائے تو اِس درجہ مشہور و معروف ہونا چاہیے کہ قیامت کے دن جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے خجالت نہ اُٹھانی پڑے۔ مزید اُس شخص نے کہا کہ یہ کیسی ہمت ہے اور یہ کیسا حوصلہ ہے کہ مخلوق سے الگ ہو کر مشغول بحق ہوں؟ بلکہ اصل ہمت اور حوصلہ یہ ہے کہ مخلوق کے درمیان رہتے ہوئے مشغول بحق رہیں۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب وہ باتیں پوری کر چکا تو میں نے کچھ کھانے کے لیے اُس کے سامنے رکھا لیکن اُس نے نہیں کھایا۔ میں نے اُسی وقت دل میں یہ نیت کر لی کہ غیاث پور ہی میں مقیم رہوں گا۔ جب میں نے یہ نیت کر لی تو اُس نے تھوڑا سا کھایا اور چلا گیا۔ پھر میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔(۱) اس کے بعد آپ نے غیاث پور (بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی) سے جانے کا ارادہ ترک فرما دیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد مولانا ضیاء الدین وکیل عماد الملک نے وہاں ایک عالی شان اور وسیع وعریض خانقاہ کی تعمیر کروادی۔ (نظامی بنسری، ص: ۳۷۳)

مجرد رہنے کا اصل سبب

سلطان المشائخ نے شادی کیوں نہیں فرمائی، اس کے مختلف وجوہات واسباب بیان کیے جاتے ہیں، مثلاً:

۱۔ بعض ملفوظات میں ہے کہ بابا صاحب نے ایک تہہ بند سلطان المشائخ کو عطا فرمائی تو آپ نے کھڑے ہو کر وہ تہہ بند اپنے پاجامے کے اُوپر باندھنا شروع کیا مگر گھبراہٹ میں تہہ بند ہاتھ سے گر گیا۔ یہ دیکھ کر بابا صاحب نے فرمایا: مولانا نظام الدین! تہہ بند مضبوط باندھو، اور اسی سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ شیخ نے مجھے مجرد (غیر شادی شدہ) رہنے کا حکم دیا ہے اس واسطے آپ نے شادی نہیں کی۔ (نظامی بنسری، ص: ۳۷۶)

۲۔ آپ نے صبر سے متعلق مختلف باتیں فرمائی ہیں۔ فوائد الفواد میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا: انسان عورتوں سے الگ رہے تو وہ بڑا صابر ہے اور اگر صبر نہ کر سکے اور شادی کرے تو پھر شادی کے بعد عورتوں سے جو تکلیفیں پیش آتی ہیں اُن پر صبر کرے اور تیسرا صبر یہ ہے کہ عورتوں سے ایذا اُٹھانے کے بعد صبر کرے اور جواب میں عورتوں کو ایذا دے تو پھر اس کے بدلے اللہ کا عذاب برداشت کرے اور اس پر صبر کرے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی نظر اپنے زمانے کی خانگی

---

(۱) سیر الاولیاء (فارسی)، باب: ۴، ص: ۱۱۰-۱۱۱، فوائد الفواد، جلد: ۴، مجلس: ۱۹

زندگی پر بہت گہری تھی اور آپ دیکھتے تھے کہ مسلمانوں کا میلان عورتوں کی طرف حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے، اور آپ یہ بھی محسوس فرماتے تھے کہ عورتوں کی طرف سے مردوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پیش آتی ہیں اور یہ بھی ملاحظہ فرماتے تھے کہ مرد بھی عورتوں پر بہت ظلم کرتے ہیں اس واسطے آپ نے فرمایا کہ ہو سکے تو عورتوں سے الگ رہو اور خواہشات نفسانی کو دباؤ اور صبر کرو، اور نہ ہو سکے تو عورتوں کی جفاؤں پر صبر کرو یعنی ان کی جفاؤں کے سبب عورتوں پر ظلم نہ کرو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا اور اُس کو سہنا پڑے گا۔ (نظامی بنسری، ص: ۳۷۶-۳۷۷)

۳۔ جب شیخ العالم بابا صاحب کی وفات ہوگئی اور مولانا بدرالدین اسحٰق بھی رحلت کر گئے تو حضرت سلطان المشائخ نے اپنے خواجہ تاش مولانا سید محمد کرمانی سے کہا کہ مولانا بدرالدین اسحٰق کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔ اُن کے بچے میرے پیرومرشد کے نواسے ہیں۔ آپ اجودھن جائیں اور اُن بچوں (سید محمد- سید موسیٰ) کو اور اُن کی والدہ (بی بی فاطمہ) کو دہلی لے آئیں۔ چنانچہ سید صاحب پاک پٹن گئے اور اُن سب کو لے آئے۔ اُن کے یہاں آتے ہی قرابت داروں نے یہ چرچا شروع کر دیا کہ آپ نے اپنے پیر کی بیٹی کو بلایا ہے کہ آپ اُن سے شادی کرنا چاہتے ہیں، اور چوں کہ اپنی برادری کو پسند نہیں کرتے اس لیے غیر کفو (غیر خاندان) میں شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ نے جب یہ چرچا سنا تو بہت زیادہ صدمہ ہوا۔ آپ اسی وقت دہلی سے اجودھن چلے گئے اور پھر جب یہی خبر بابا صاحب کی صاحبزادی بی بی فاطمہ تک پہنچی تو اُنھیں بھی بڑا صدمہ ہوا۔ اس صدمے سے وہ بیمار ہوگئیں اور پھر اسی بیماری کے سبب وہ انتقال کر گئیں۔ اس کے بعد آپ اجودھن سے دہلی تشریف لائے۔ (نظامی بنسری، ص: ۳۷۸-۳۷۹)

۴۔ آپ کا شادی نہ کرنا محض اِس وجہ سے تھا کہ اُس وقت دولت کی کثرت اور حکومت کے اختیارات کے سبب مسلمانوں کو عورتوں کی طرف بہت ہی زیادہ رغبت ہوگئی تھی، اور آپ اپنے تجرد کی مثال سے یہ دکھانا چاہتے تھے کہ انسان شادی کے بغیر بھی خوش اور مطمئن رہ سکتا ہے۔ (نظامی بنسری، ص: ۳۷۹)

اِن چاروں اسباب میں سے میرے نزدیک اول الذکر اور آخر الذکر قابل قبول ہیں، جب کہ ثانی الذکر اور ثالث الذکر نا قابل قبول ہیں۔ اول الذکر اِس لیے قابل قبول ہے کہ اس میں شیخ العالم کی اطاعت ہے جو دراصل اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت وتابعداری ہے، اور آخر الذکر اس لیے قابل قبول ہے کہ اس میں ایک اصلاحی ودعوتی پیغام پوشیدہ ہے جو وقت کی اہم ضرورت تھی کہ وہ لوگ جو اُس وقت خواہشات نفسانی میں مبتلا تھے اُس سے باز رہیں، اور یہ بھی یاد رکھیں کہ عورت کی مصاحبت کے بغیر بھی ایک کامیاب اور نا قابل فراموش

زندگی بسر کی جاسکتی ہے، جیسا کہ سلطان المشائخ نے خود بغیر عورت کی مصاحبت وسنگت کے اعلیٰ ترین اور قابل رشک زندگی بسر کر کے بتا دیا۔

بادشاہوں سے بے تعلقی

سلطان المشائخ نے جب سے دہلی میں قیام فرمایا اُس وقت سے تاحین حیات تقریباً کل گیارہ شاہانِ وقت اور سلاطین آئے اور گئے، یہ سب غلام خاندان، خلجی خاندان، تغلق خاندان وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً:

● **غلام خاندان کے سلاطین یہ ہیں:**

۱۔ ناصرالدین محمود(۱۲۴۶-۱۲۶۶)، ۲۔غیاث الدین بلبن(۱۲۶۶-۱۲۸۶)، ۳۔معزالدین کیقباد (۱۲۸۶-۱۲۹۰)، ۴۔شمس الدین کیموراس/ کیومرث(۱۲۹۰)۔

● **خلجی خاندان کے سلاطین یہ ہیں:**

۱۔جلال الدین خلجی(۱۲۹۰-۱۲۹۶ء)، ۲۔علاالدین خلجی(۱۲۹۶-۱۳۱۶ء)، ۳۔شہاب الدین(۱۳۱۶ء)، ۴۔قطب الدین مبارک(۱۳۱۶-۱۳۲۰ء)، ۵۔ ناصرالدین خسروخان(۱۳۲۰ء)،خسروخان، خلجی خاندان سے نہیں تھا بلکہ قطب الدین مبارک کا غلام تھا اور قطب الدین کو قتل کر کے سلطان بنا تھا۔

● **تغلق خاندان کے سلاطین یہ ہیں:**

۱۔غیاث الدین تغلق(۱۳۲۰-۱۳۲۵ء)،محمد تغلق(۱۳۲۵-۱۳۳۵ء)،اور پھر تغلق خاندان کے دیگر سلاطین تخت نشیں ہوتے رہے۔(جامع تاریخ ہند، باب:۳،۴،۵،ص:۲۷۴-۸۷۳)

دہلی میں سلطان المشائخ کی زندگی دوخانوں میں منقسم ہے: ایک ابتدائی ایام جن میں آپ نے انتہائی عسرت بھری زندگی بسر فرمائی، اور دوسرا خلجی عہد حکومت جس میں آپ بڑی ہی فراخی کے ساتھ رہے، نیز اِس عہد میں آپ فضل وکمال کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، اور باوجودیکہ شاہانِ وقت اور سلاطین زمانہ کی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ آپ اُن سے گہرے روابط رکھیں لیکن آپ تنگ حالی اور خوش حالی دونوں ایام میں حکمرانوں سے بالکل بے نیاز و بے تعلق رہے۔اس کے بہت سے شواہد ہیں، مثلاً:

۱۔ جب علاء الدین خلجی تخت نشین ہوا تو اُس وقت سلطان المشائخ کی مقبولیت آسمان کی بلندی پر تھی، اور ایک بڑی تعداد میں عوام الناس اور اُمرا دونوں طبقات آپ کے معتقد ہو گئے تھے۔صبح وشام لنگر جاری رہتا، جہاں لوگ اپنے پرائے، رنگ ونسل اور مذہب وملت میں کسی تفریق کے بغیر آسودگی حاصل کرتے تھے۔اِس قدر بڑے پیمانے پر لنگر کا اِنتظام واہتمام ہوتا دیکھا تو علاء الدین خلجی نے آپ کی مخبری بھی کرائی مگر آپ اِن تمام باتوں سے بے نیاز عبادت الٰہی اور خدمت خلق میں مشغول رہے۔آخر کار آپ کے اخلاص اور خلق دوستی کے

سامنے علاء الدین خلجی کی مخبری دھری کی دھری رہ گئی اور پھر وہ اِس قدر عقیدت مند ہوا کہ اپنے دو بیٹے خضر خاں اور شادی خاں کو ہمیشہ ہمیش کے لیے آپ کی غلامی میں دے دیا۔

خضر خاں اور شادی خاں آپ کی غلامی میں کیسے آئے؟ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ہوا یوں کہ دونوں صاحبزادے جب آپ کے پاس بیعت کی غرض سے پہنچے تو آپ نے اُن دونوں سے کہا کہ پہلے بادشاہ کی طرف سے اجازت نامہ لاؤ۔ چنانچہ علاء الدین خلجی نے اپنے ایک شاہی گورنر کو اپنا وکیل بنایا اور آپ کی خدمت میں بھیجا، جب اُس نے علاء الدین خلجی کی طرف سے اجازت نامہ پیش کیا۔ اس کے بعد آپ نے خضر خاں اور شادی خاں کو بیعت کیا اور خرقہ عنایت فرمایا۔ (مقدمہ فوائد الفواد (مترجم)، ص: ۸۲-۸۴)

۲۔ پھر ایک بار کچھ حاسدین و معاندین کے ورغلانے پر علاء الدین خلجی کو خدشہ لاحق ہو گیا کہ آپ کی مقبولیت سے کہیں حکومت کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟ پس آپ کا اصل ارادہ جاننے کے لیے اُس نے آپ کو ایک خط لکھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کا مال و زر مجھے بخشا ہے اور آپ مخدوم عالمیاں ہیں، میرے لیے بڑی نیک بختی اور سعادت ہوگی کہ جو کوئی مہم پیش آئے/ جن اُمور میں عوام الناس کی بھلائی ہو اُس تعلق سے مجھے مشورہ دیا کریں تاکہ میں آپ کے مشورے اور ہدایات کی روشنی میں عوام کی بھلائی کے لیے کام کروں۔ فی الحال کچھ مسائل درپیش ہیں، وہ میں آپ کو لکھتا ہوں جن میں حکومت ومملکت کی بھلائی پوشیدہ ہو اُس سے مجھے آگاہ فرمائیں۔

چنانچہ سلطان علاء الدین خلجی کا خط جب آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے خط پر نظر ڈالے بغیر اُسے ایک طرف ڈال دیا، اور خضر خاں سے فرمایا: ''درویش کو بادشاہوں سے کیا لینا دینا ہے؟''

پھر فرمایا کہ میں درویش ہوں، شہر سے دور ایک گوشے میں پڑا ہوں، مسلمانوں اور بادشاہ کے حق میں دعا گو ہوں۔ اگر حکومت سے متعلق آئندہ بادشاہ نے مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا کہ اللہ کی زمین وسیع تر ہے۔

خضر خاں نے یہ جواب اپنے والد علاء الدین خلجی کو بتایا تو وہ بڑا خوش ہوا، اور کہا کہ حضرت سے مجھے اِسی جواب کی اُمید تھی۔ کچھ بدخواہوں نے مجھے اُن سے بدظن کرنے کی کوشش کی اور مجھے اُن سے لڑانا چاہا۔

اس کے بعد علاء الدین خلجی نے آپ کی خدمت میں ایک معذرت نامہ بھیجا اور خانقاہ میں آنے کی اجازت طلب کی۔ اس پر آپ نے فرمایا:

''بادشاہ کو آنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں غائبانہ دعا میں مشغول ہوں اور ایسی دعا میں زیادہ اثر ہوتا ہے۔''

پھر جب اُس نے آنے کے لیے زیادہ زور ڈالا تو آپ نے کہلا بھیجا:

''فقیر کے گھر میں دو دروازے ہیں: ایک سے بادشاہ داخل ہوگا تو دوسرے سے میں نکل جاؤں گا۔ (۱)

---

(۱) سیر الاولیاء (فارسی)، باب:۱، ص: ۱۳۳-۱۳۵، اخبار الاخیار (فارسی)، طبقۂ دوم، ص: ۱۰۸-۱۰۹

اِس طرح آپ سے سلطان علاء الدین خلجی کی عقیدت و محبت اور بھی مضبوط ہوگئی جو آخری دم تک قائم رہی اور نتیجے کے طور پر دینی واخلاقی اصلاحات اور عوامی صلاح وفلاح کے کارہائے نمایاں انجام پائے۔

خدمت خلق اور بخشش وعنایات

سلطان المشائخ کی خدمت میں کثرت سے تحفے تحائف آتے تھے مگر آپ کچھ بھی بچا کر نہیں رکھتے تھے، بلکہ ضرورتمندوں میں تقسیم کروادیا کرتے تھے۔ آپ عنایات و بخشش اس طور پر فرمایا کرتے تھے کہ مانو عطاو بخشش کا دریا بہہ رہا ہو۔ نیز آپ کی عطاو بخشش کے انداز بھی بڑے نرالے تھے۔ باوجود کہ عنایت سب کو کرتے تھے مگر کس کو کیا دیا کوئی جان نہیں پاتا تھا۔ شواہد کے طور پر درج ذیل واقعات ملاحظہ کریں، مثلاً:

۱۔ ایک بار ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا، تو آپ نے خواجہ اقبال سے فرمایا کہ اُنھیں شکر کی ایک پڑیا دے دو۔ وہ شخص پڑیا لیا اور چلا گیا۔ گھر پہنچنے کے بعد پڑیا کھولی تو دیکھا کہ اُس میں شکر کی جگہ دس تنکے (سکے) ہیں۔ وہ سمجھا کہ خواجہ اقبال نے یہ پڑیا دھوکے سے مجھے دے دی ہے۔ وہ خانقاہ واپس آیا اور آپ کی خدمت میں وہ پڑیا پیش کی اور کہا کہ حضور! شکر کی پڑیا کی جگہ بھول سے مجھے دس تنکوں کی پڑیا دے دی گئی تھی۔

یہ سن کر آپ مسکرائے اور فرمایا: ''ارے خواجہ! یہ تو اللہ تعالیٰ تمھیں دے رہا ہے، ہم درمیان میں کون ہوتے ہیں؟ تم انھیں رکھو اور جیسے جی چاہے خرچ کرو۔''

۲۔ اسی طرح ایک بار ایک شخص کو آپ نے ولایتی کپڑے کا ایک تھان عطا کیا، تو وہ سونے کے چند سکوں کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا کہ حضور! کپڑے کے تھان میں غلطی سے سونے کے یہ سکے چلے گئے تھے۔ اس سے بھی آپ نے یہی فرمایا: جب اللہ تمھیں دے رہا ہے تو میں کون ہوں؟ یہ تمہارے ہیں، اسے تم خرچ کرو۔

۳۔ ایک بار غیاث پور کے زمانے میں ایک طالب علم خانقاہ میں آیا۔ آپ نے پہلے اُس کو کھانا کھلایا پھر خواجہ اقبال کو حکم دیا کہ ''انھیں آدھا تنکا دے دو۔'' خواجہ اقبال نے کہا کہ اس وقت موجود نہیں ہے، فرمایا: ''کسی سے لے کر دے دو۔''

اس وقت اتفاق سے کہیں بھی تنکا نہیں ملا۔ خانقاہ میں ایک بیل بندھا ہوا تھا، فرمایا کہ اس بیل کو بازار میں بیچ آؤ۔ بیل کو بازار لے جایا گیا لیکن بازار کا وقت نکل جانے کے سبب بیل فروخت نہ ہوسکا۔ طالب علم نے کہا کہ بیل ہی مجھے دے دیجیے، میں بیچ لوں گا۔ بیل ۴-۵ ر تنکے کا تھا۔ حضرت اخی مبارک نے یہ بات آپ کی خدمت میں پیش کی تو فرمایا کہ ''ہاں! اُسے بیل دے کر رخصت کردو۔'' (مقدمہ فوائد الفواد (مترجم)، ص:۷۶-۷۸)

اسی پر بس نہیں بلکہ سلطان المشائخ نے باقاعدہ اپنا ایک اصول بنا رکھا تھا کہ کس کو کتنا وظیفہ دیا جائے۔ لہٰذا غیاث پور اور قرب وجوار میں رہنے والے کو باضابطہ خانقاہ کی طرف سے روز وظیفہ دیا جاتا تھا۔ شہر میں رہنے والے کو ہفتہ وار وظیفہ دیا جاتا تھا۔ آس پاس کے قصبوں اور علاقوں میں رہنے والے کو ماہانہ وظیفہ عطا ہوتا تھا اور دور دراز سے

آنے والوں کے لیے ششماہی یا سالانہ وظیفے مقرر کیے گئے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس جو کچھ بھی آتا اُسے تقسیم فرمادیا کرتے تھے اور اپنے پاس کچھ ذخیرہ نہیں رکھتے تھے۔ بقول سید امیر خورد کرمانی: وفات کے وقت جب لنگر خانے میں کچھ غلہ تقسیم ہونے سے رہ گیا تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ انبار خانوں کے دروازے توڑ ڈالو، یہ غلہ زمین کی مٹی ہے اس کو کیوں رکھا ہے۔ فقیروں کو بلاؤ اور اُن سے کہو کہ یہ سب غلہ لے لیں اور ایک تنکا بھی باقی نہ چھوڑیں۔ چنانچہ جماعت خانے سے سارا سامان نکلوالیا گیا اور خواجہ اقبال کو حکم دیا کہ جو کچھ ہے سب غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کردو، ورنہ کل اللہ سبحانہ کے سامنے تمھیں جواب دینا پڑے گا۔(۱)

اصلاحات ودعوات

سلطان المشائخ تقریباً ۶۶ رسال تک مسند بیعت وارشاد پر متمکن رہے۔ اس بیچ آپ نے محتاجوں، مسکینوں اور بیکسوں کی محض خبر رکھنے اور اُن کی امداد کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُن کے اندر در آئی عملی خرابیوں اور اخلاقی بیماریوں کو بھی دور کیا، اور اُن کی کامل اصلاح فرمائی۔ آپ نے ایک طرف قلب وروح کو پاکیزگی عطا کی تو دوسری طرف سیرت واخلاق کی درستگی کا نسخہ کیمیا عطا فرمایا، اور اس تعلق سے آپ کے نزدیک شاہ وگدا، علما وفقہا، سلاطین وحکمران، عوام وخواص، ملازمت پیشہ واہل صنعت وحرفت سب برابر تھے، کسی کو کسی پر کوئی فوقیت اور امتیاز حاصل نہ تھا۔

پھر ایک ایسے ماحول میں جب کہ دین بیزاری اور نفس پرستی عام ہوچکی تھی، آپ نے لوگوں کے دلوں میں دینی اور عرفانی لہر دوڑادی جسے ہر کسی نے محسوس کیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی اصلاحی وفلاحی کوششوں کے باعث آس پاس کا ماحول حیرت انگیز طور پر اسلام، ایمان، احسان کے رنگ میں رنگ گیا تھا، یعنی سنت رسول اور احکام شریعت کی پاسداری اور اہتمام لوگوں کے معمولات میں بطور خاص شامل تھا۔

مورخین کے مطابق: سلطان علاءالدین خلجی کے عہد حکومت میں سجادۂ تصوف شیخ الاسلام نظام الدین اولیا اور شیخ الاسلام رکن الدین قدست اسرارہما سے آراستہ تھا۔ ایک دنیا اُن نفوس قدسیہ سے روشن ومنور ہوئی اور ایک عالم نے اُن کی بیعت کا ہاتھ پکڑا، گنہگاروں نے توبہ کی، ہزاروں بدکاروں اور بےنمازیوں نے بدکاری سے ہاتھ اُٹھالیا اور ہمیشہ کے لیے پابند نماز ہوگئے اور باطنی طور پر دینی وظائف کی طرف رغبت ظاہر کی، اُن مشائخ کے اخلاق حمیدہ سے اور ترک وتجرید کے معاملات دیکھنے سے دنیا کی حرص ومحبت دلوں میں کم ہوگئی اور اُن کی عبادات ومعاملات کی برکت سے لوگوں کے معاملات میں سچائی پیدا ہوگئی۔ جیسا کہ مشہور مؤرخ مولانا ضیاء الدین برنی رحمہ اللہ جو سلطان المشائخ کے حلقہ ارادت میں داخل تھے، لکھتے ہیں:

اُسی زمانے میں سلطان المشائخ نے بیعت کا عام دروازہ کھول رکھا تھا۔ آپ گنہ گاروں کو خرقہ پہناتے،

---

(۱) (سیر الاولیاء، (فارسی، باب:۱، نکتہ:۵، ص: ۱۵۳)

اُن سے توبہ کراتے اوراپنی مریدی میں قبول کرتے۔ خاص وعام، امیر وغریب، بادشاہ وفقیر، عالم وجاہل، شریف ورذیل، شہری ودیہاتی سب کوتوبہ کراتے اور پاکی کی تعلیم دیتے تھے، اگر شیخ کے کسی مرید سے کوئی لغزش ہوجاتی تو پھرنئے سرے سے بیعت کرتے تھے اور توبہ کا خرقہ عطا کرتے تھے۔

آپ کی وجہ سے مرد وعورت، بوڑھے جوان، بازاری، عامی، غلام اورنوکر سب کے سب نماز ادا کرنے لگے تھے اور زیادہ تر مریدین نماز چاشت واشراق کے پابند بھی ہوگئے تھے، نیک کام کرنے والوں نے شہر سے غیاث پورتک تفریحی جگہوں پر صفّے (چبوترے) قائم کردیے تھے، چھپر ڈال دیے تھے، کنویں کھدوا دیے تھے، پانی کے گھڑے اوروضو کے لیے لوٹے رکھوادیے تھے، چٹائیاں بچھوادی تھیں، ہر صفّے (چبوترے) اور ہر چھپر میں ایک چوکیدار اور ایک ملازم مقرر تھا، تاکہ مرید اور توبہ کرنے والوں کو شیخ کے آستانے تک آنے جانے میں اور نماز کے وقت وضو کرنے میں کوئی دقت اور تردد نہ ہو، چبوترہ اور چھپر میں نفل نماز پڑھنے والوں کا ہجوم دیکھا جاتا تھا اور لوگوں کے درمیان گناہ کم ہوگیا تھا۔ بلکہ اکثر لوگوں کونماز چاشت، اشراق، اوّابین، تہجد کی رکعتیں اوران کے طریقے بھی یاد تھے کہ ان نمازوں میں کتنی رکعتیں ادا کرتے ہیں اور ہر رکعت میں کلام پاک کی کون سی سورت اور کون سی آیت پڑھتے ہیں... اس زمانے میں اکثر لوگوں کے درمیان حفظ قرآن کا ذوق بھی پیدا ہوگیا تھا۔

مشائخ کے اوصاف حمیدہ اوران کے احوال بیان کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ دنیا اور دنیا داروں کا ذکر لوگوں کی زبان پرنہیں آتا تھا، کسی دنیا دار کے گھر کی طرف اپنا رخ نہیں کرتے تھے، کثرت نوافل کی اس قدر پابندی تھی کہ بادشاہ کے محل میں بہت سے امرا، لشکری اور سپاہی جو شیخ کے مرید تھے چاشت واشراق کی نماز ادا کرتے اور ایام بیض کے روزے رکھتے، سلطان علاء الدین خلجی اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ شیخ کا معتقد اور مخلص ہوگیا تھا۔ خواص وعوام کے دلوں نے نیکی کی راہ اختیار کرلی تھی، عہد علائی کے آخری چند برسوں میں شراب نوشی، عشق بازی، فسق وفجور، سٹہ وجوا، فحاشی وعریانی وغیرہ کا نام بھی عام انسانوں کی زبان پرنہیں آتا تھا، کبیرہ گناہوں کولوگ کفر کے مشابہ تصور کرنے لگے تھے، مسلمان ایک دوسرے سے شرم کے سبب سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کا کھلم کھلا مرتکب نہیں ہوتے تھے، بازار سے جھوٹ بولنے اور کم تولنے کا رواج اٹھ گیا تھا، اکثر طالب علموں اور بڑے لوگوں کی رغبت جو شیخ کی خدمت میں رہتے تھے تصوف اور احکام طریقت کی کتابوں کی طرف ہوگئی تھی۔ جیسے: قوت القلوب، احیاء العلوم، عوارف المعارف، کشف المحجوب، رسالہ قشیریہ وغیرہ کے بہت سے خریدار پیدا ہوگئے تھے۔ زیادہ تر لوگ کتب فروشوں سے سلوک وحقائق کی کتابوں کے بارے میں دریافت کرتے تھے، کوئی پگڑی ایسی نہ تھی جس میں مسواک اور کنگھی لٹکتی نظر نہ آتی تھی۔ غرض یہ کہ اللہ سبحانہ نے شیخ نظام الدین کو پچھلی صدیوں کے حضرت جنید بغدادی اور حضرت بایزید بسطامی کے مثل پیدا کیا تھا۔ (تاریخ فیروز شاہی (ملخصاً)، ص: ۳۴۱ تا ۳۴۶ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت، ص: ۱۹۳-۱۹۴)

آخری حالات اور وصال

سلطان المشائخ زندگی کے آخری ایام میں کافی بیمار رہنے لگے تھے اور آپ کی بینائی بھی متاثر ہوتی رہتی تھی۔ آخری ایام میں خدمت گاران کی یہی کوشش رہتی کہ آپ کی خدمت میں حاضر رہیں اور خدمت کے ساتھ کچھ اچھی اچھی باتیں بھی کریں تاکہ آپ کو سکون ملے۔ کبھی کبھی آپ لطائف سننے کی فرمائش بھی کردیتے تھے۔ مثلاً: ایک بار کا ذکر ہے کہ آپ بیمار تھے، خواجہ برہان الدین غریب اور خواجہ بہاء الدین حاضر خدمت تھے۔ آپ نے مولانا بہاء الدین سے فرمایا کہ کوئی لطیفہ سناؤ۔ مولانا نے بیان کرنا شروع کیا کہ ایک شخص بیمار تھا، ڈاکٹر نے اُس سے کہا کہ آبِ گوشت کے سوا کچھ نہیں کھانا۔ چنانچہ اُس کے لیے دو من گوشت منگوایا گیا اور اسی قدر اُس میں پانی ڈالا گیا اور پھر جب پکتے پکتے ایک پیالہ رہ گیا تو وہ آبِ گوشت اُسے پینے کو دیا گیا۔

ڈاکٹر نے اُس سے کہا کہ ''آج تم نے دو من گوشت کھایا ہے۔''

یہ سن کر آپ نے تبسم فرمایا۔ (مقدمہ فوائد الفواد، ص: ۱۰۸-۱۰۹، بحوالہ نفائس الانفاس، ۲۹ رصفر ۷۳۴ھ)

وصال سے چالیس دن پہلے آپ کے معمولات میں واضح طور پر فرق آنا شروع ہوگیا تھا۔ جیسے: آپ پر تحیر کا عالم طاری رہتا، بار بار بے خود ہوجاتے، پھر ہوش میں آجاتے اور فرماتے:

''آج جمعہ کا دن ہے، دوست کو دوست کا وعدہ یاد آتا ہے اور وہ اس میں غرق ہوجاتا ہے۔''

اسی عالم میں دریافت فرماتے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے، نماز ادا کرلوں؟ جواب دیا جاتا کہ آپ نماز ادا کرچکے ہیں، تو فرماتے: ''پھر سے پڑھ لوں۔'' غرض کہ جتنے دنوں تک استغراقی کیفیت طاری رہی، ہر نماز مکرر ادا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ دو باتیں بار بار فرماتے تھے: ''آج جمعہ کا دن ہے، ہم نماز ادا کرچکے ہیں؟''

نیز یہ مصرعہ بھی آپ بار بار پڑھتے تھے: ''می رویم و می رویم و می رویم''

یعنی ہمیں جانا ہے، ہمیں جانا ہے، ہمیں جانا ہے۔ (سیر الاولیاء، (فارسی، باب: ۱، نکتہ: ۵، ص: ۱۵۳)

ایک بار شیخ رکن الدین ملتانی عیادت کو آئے اور فرمایا کہ انبیا و مرسلین کو حیات و ممات میں اختیار دیا گیا ہے، علما و مشائخ وارثین انبیا میں شامل ہیں، اگر آپ بھی کچھ دنوں تک اور دنیا میں رہنے کا ارادہ فرمالیں تو طالبین کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ مگر آپ نے رندھی ہوئی آواز میں فرمایا: آج کل ہر شب رسالت مآب ﷺ کو خواب میں دیکھ رہا ہوں، آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''نظام! اشتیاق تو ما بیشتر است زود بیا در کف ما۔''

یعنی نظام! تم سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے جلدی آؤ اور ہمارے پاس آرام کرو۔ (۱)

سیر الاولیا میں ہے کہ جب سید حسین (۲) نے عرض کیا کہ مخدوم نے کافی دنوں سے کھانا پینا ترک کر رکھا ہے،

---

(۱) (مقدمہ فوائد الفواد، ص: ۱۰۹-۱۱۱)

(۲) سید حسین رحمہ اللہ سید امیر خورد کرمانی کے چچا ہیں۔

تو ایسے میں آپ کا کیا حال ہوگا؟ آپ فرماتے:

''جس کا مشتاق رسالت مآب ﷺ ہوں اُس کو دنیوی کھانا کیسے اچھا معلوم ہوگا!!

اسی بیماری کے زمانے میں خدام نے دریافت کیا کہ مخدوم کے بعد ہمارا کیا ہوگا؟ فرمایا کہ میرے روضے پر اتنا آتا رہے گا جو تم لوگوں کے لیے کفایت کرے گا۔ کسی نے پھر عرض کیا کہ اس کی تقسیم کون کرے گا؟ مراد یہ تھا کہ روضہ کا جانشین وخلیفہ کون ہوگا؟ فرمایا: ''جس کا نصیبہ ساتھ دے گا۔''

بعض خدام نے مولانا شمس الدین دامغانی سے کہا کہ وہ دریافت کریں کہ ہم میں سے ہر ایک شخص نے اپنی اپنی عقیدت کے مطابق آپ کے احاطے میں بلند وبالا عمارتیں بنالی ہیں اور ہر ایک کی یہی خواہش ہے کہ آپ اُس کی عمارت میں مدفون ہوں۔ اگر قضائے الٰہی آجاتی ہے، تو ہم آپ کو کس کی بنائی عمارت میں دفن کریں گے؟ چنانچہ مولانا دامغانی نے عرض کیا کہ آپ کہاں آرام فرمانا پسند فرمائیں گے؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ میں صحرا میں کھلے آسمان کے نیچے مدفون ہوں گا۔ پس آپ کو صحرا میں دفن کیا گیا، جس پر بعد سلطان محمد تغلق نے گنبد کی تعمیر کروائی۔

بالآخر ایک دن طلوع آفتاب کے بعد آپ کی وفات کا وقت قریب آ گیا، اس دار فانی سے کوچ فرمایا اور اپنے مالک حقیقی عز وجل سے جا ملے۔ جب آپ کا وصال ہوا تو ۱۷ربیع الآخر ۷۲۵ھ/ ۲/اپریل ۱۳۲۵ء کی تاریخ تھی اور دن بدھ کا تھا۔ (سیر الاولیا، باب:۱، نکتہ:۵، ص:۱۵۲-۱۵۵)

اس کے بعد جب لحد کھودنے کا معاملہ سامنے آیا تو شیخ رکن الدین ملتانی نے خواجہ اقبال سے دریافت کیا کہ حضرت، مقابرِ یاران پر فاتحہ خوانی کے لیے آتے تھے تو کس مقام پر بیٹھتے تھے؟ خواجہ اقبال نے ایک جگہ بتائی کہ جہاں نارنگی کا درخت لگا ہوا تھا، اور یہ بھی کہا کہ آپ کی نشست اس درخت کے نیچے ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا شیخ رکن الدین نے اسی جگہ پر آپ کی لحد کھدوائی۔

پھر اُسی دن دوپہر میں ظہر کی نماز سے پہلے غیاث پور (بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی) میں مدفون ہوئے۔ شیخ رکن الدین ملتانی اور خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی رحمہما اللہ نے آپ کو لحد میں اُتارا، اور شیخ کبیر بابا فرید قدس سرہٗ کے تبرکات (خرقہ، عصا، مصلا، تسبیح) قبر میں رکھے گئے۔ (مقدمہ فوائد الفواد، ص:۱۰۹-۱۱۱)

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کے نبیرہ شیخ الاسلام رکن الدین نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، اور اس کے بعد فرمایا کہ آج مجھے یقین ہو گیا کہ چار برسوں مجھے تک دہلی شہر میں روکے رکھنے کا اصل مقصد یہی تھا کہ سلطان المشائخ کی نماز جنازہ کی امامت کا شرف مجھے ملنے والا تھا۔ (سیر الاولیاء، (فارسی، باب:۱، نکتہ:۵، ص:۱۵۵)

مرقد انور سے معمول کے مطابق آج بھی چشتی نظامی فیضان جاری وساری ہے۔

درویشی و فقر و کج کلاہی داری　　زیبائی و دارائی و شاہی دارد

کم یافت کسے ز اولیاے امت　　آں رتبہ کہ محبوب الٰہی دارد

کتابیات

۱۔آب کوثر، شیخ محمد اکرام،مطبوعہ:ادارۂ ثقافت اسلامیہ،لاہور، پاکستان،۲۰۰۶ء

۲۔اخبارالاخیارفی اسرارالابرار(فارسی)، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، تصحیح وتوضیح:علیم اشرف خان، ناشر:انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، کتاب خانہ ملی، ایران، ۱۳۸۳ھ

۳۔بحر المعانی،مولف: حضرت شیخ ابوجعفر مکی، ناشر: تقی انور علوی کاکوری، ۲۰۱۰ء

۴۔تاریخ دعوت وعزیمت، سیدابوالحسن ندوی، ناشر: مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد، کراچی، پاکستان

۵۔تاریخ مشائخ چشت،مولف: خلیق احمد نظامی، ناشر: مشتاق بک کارنر، الکریم مارکیٹ، لاہور، پاکستان

۶۔جامع تاریخ ہند،محمد حبیب-خلیق احمد نظامی، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ زبان اُردو، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

۷۔خواجہ نظام الدین اولیا،مولف: پروفیسر عبدالرحمٰن مومن، ناشر: قاضی پبلشر، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء

۸۔خیر المجالس، مرتب: مولانا حمید قلندر، تحقیق وتقدیم: خلیق احمد نظامی، مطبوعہ: شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۹۔دُررِ نظامی موسوم بہ گفتار محبوب، مرتب: علی محمود بن جاندار، مترجم: صاحبزادہ محمد یسین علی، ناشر: ادارہ پیغام القرآن، لاہور، پاکستان، ۲۰۱۲ء

۱۰۔سیر الاولیاء(فارسی)، امیر خورد سید محمد مبارک کرمانی، شایع کردہ: بندۂ ذوالجلال چرنجی لال مالک و مہتمم مطبع محب ہند، فیض بازار، دہلی، ۱۳۰۲ھ

۱۱۔فوائد الفواد(فارسی)، خواجہ امیر حسن علا سجزی، ناشر: ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلشرز، بازار کشمیری، لاہور، پاکستان، ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء

۱۲۔فوائد الفواد(اُردو)، مرتب ومترجم: خواجہ حسن ثانی نظامی، ناشر: درگاہ خواجہ نظام الدین اولیا، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء

۱۳۔نظامی بنسری، مترجم ومرتب: خواجہ حسن نظامی، ناشر: درگاہ خواجہ نظام الدین اولیا، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء



ضیاء الرحمٰن علیمی

کیا علامہ بلخی سلطان المشائخ کے استاذ ہیں؟

پروفیسر نثار فاروقی صاحب نے ترجمہ فوائد الفواد، خواجہ حسن ثانی نظامی کے مقدمے میں ''دہلی میں تعلیم'' کے زیر عنوان صفحہ: ۵۲-۵۳ پر اور ڈاکٹر عاصم اعظمی نے اپنی کتاب محبوب الٰہی میں ''دہلی کا سفر اور مزید تعلیم'' کے زیر عنوان صفحہ: ۱۰۱ پر علامہ برہان الدین محمود ابوالخیر کو آپ کے اساتذہ میں شمار کیا ہے۔ اول الذکر محقق نے حوالے میں اخبار الاخیار، صفحہ: ۶۸، تذکرہ علمائے ہند، رحمان علی صفحہ: ۳۳، نزہۃ الخواطر اور حدائق الحنفیہ، صفحہ: ۲۶۴ کا ذکر کیا ہے۔

ایسے ہی آخر الذکر نے پہلے تو برہان الدین بلخی کا تعارف فوائد الفواد کے حوالے سے پیش کیا ہے اور پھر ایک کتاب ''نظام الدین اولیا''، صفحہ: ۵۳ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ شیخ نظام الدین اولیا نے ان کو اپنے اساتذہ میں شمار کیا ہے۔

میں چوں کہ سیر الاولیاء، نزہۃ الخواطر اور تاریخ دعوت وعزیمت دیکھ چکا تھا اور ان میں سے کسی نے بھی برہان الدین بلخی کا ذکر سلطان جی کے استاذ کے طور پر نہیں کیا بلکہ علامہ کمال زاہد ماریکلی کے استاذ اور سلطان جی کے دادا استاذ کی حیثیت سے ذکر کیا تھا اِس لیے ان دونوں محققین کی تحریروں نے مجھے چونکایا اور میرے اندر مزید تحقیق کی جستجو پیدا ہوئی چنانچہ میں نے ان کی محولہ کتابوں کی طرف رجوع کیا۔

اس حوالے سے میں نے جب پروفیسر نثار فاروقی کی محولہ کتابوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اخبار الاخیار میں جہاں برہان الدین بلخی کا تذکرہ ہے وہاں تو اتنی ہی بات منقول ہے جتنی سلطان جی نے فوائد الفواد میں ذکر کی ہے کہ صاحب ہدایہ سے ان کی ملاقات ہے اور انھوں نے مصنف مشارق سے مشارق کی سند حاصل کی تھی (دیکھیں: طبقۂ اول، شیخ برہان الدین محمود بن ابوالخیر اسعد البلخی، ص: ۸۸)

جہاں علامہ کمال زاہد کا ذکر ہے وہاں یہ لکھا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیا نے مشارق کی سند علامہ کمال زاہد سے حاصل کی تھی اور انھوں نے برہان بلخی سے۔ (دیکھیں: طبقۂ دوم، مولانا کمال الدین زاہد، ص: ۱۳۷)

جہاں سلطان المشائخ کا ذکر ہے وہاں حدیث پڑھنے کا تو ذکر ہے لیکن وہاں نہ تو کمال زاہد کا ذکر ہے اور

نہ برہان بلخی کا (ایضاً، شیخ نظام الحق والدین محمد بدایونی قدس سرہٗ، ص: ۱۰۴)۔

تذکرہ علمائے ہند میں مولانا رحمان علی نے جہاں برہان بلخی کا ذکر کیا ہے وہاں بھی اخبار الاخیار کے بیان کا اعادہ کیا ہے کوئی اضافی معلومات نہیں دی ہے (دیکھیں: حرف باء، شیخ برہان الدین محمود بلخی، ص: ۳۲)

مولانا کمال زاہد کے تذکرے میں ان کا بیان اخبار الاخیار سے بھی مختصر ہے اور اضافی کوئی افادہ نہیں ہے (دیکھیں: حرف کاف، ص: ۱۷۳)

جہاں سلطان جی کا ذکر ہے وہاں بھی برہان بلخی کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ اساتذہ میں صرف شمس الملک کا ذکر ہے اور بابا صاحب سے تلمذ کا ذکر ہے۔ (دیکھیں: حرف نون، مولانا نظام الدین محمد بدایونی قدس سرہ، ص: ۲۴۰)

جہاں پر صاحب مشارق کا ذکر ہے وہاں برہان بلخی کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے چہ جائیکہ سلطان جی کے استاذ کی حیثیت سے ضمناً بھی علامہ بلخی کا ذکر ہو۔ (دیکھیں: حرف حاء، مولانا حسن صغانی لاہوری، ص: ۴۸)

نزہۃ الخواطر میں بھی سلطان جی کے استاذ کی حیثیت سے برہان بلخی کا ذکر کہیں نظر نہیں آیا، جہاں صاحب مشارق کا ذکر ہے وہاں برہان بلخی کا ذکر شاگرد کے طور پر تو ہے لیکن سلطان جی کے ان سے تلمذ کا کوئی ذکر نہیں۔

(دیکھیں: طبقہ: ۷، حرف حاء، ص: ۹۱)

جہاں پر برہان بلخی کا ذکر ہے وہاں بھی سلطان جی کے تلمذ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ (دیکھیں: ج: ۱، طبقہ: ۷، حرف میم)

ایسے ہی جہاں کمال الدین زاہد کا ذکر ہے وہاں برہان بلخی سے ان کے تلمذ کا ذکر ہے اور پھر ضمناً صاحب ہدایہ اور صاحب مشارق سے برہان بلخی کے تلمذ کا ذکر ہے اور پھر کمال زاہد سے سلطان جی کے مشارق پڑھنے کا ذکر ہے لیکن برہان بلخی سے تعلّم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ (دیکھیں: ایضاً، ص: ۱۱۷)

یوں ہی جہاں سلطان جی کا تذکرہ ہے وہاں بھی برہان بلخی سے تلمذ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے بلکہ صرف کمال زاہد سے مشارق پڑھنے کا ذکر ہے (ج: ۲، طبقہ: ۸، حرف میم، ص: ۱۹۳)

جہاں تک فقیر جہلمی کی حدائق الحنفیہ کی بات ہے تو اس میں بھی برہان بلخی سے سلطان جی کے تلمذ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جہاں سلطان جی کا ذکر ہے وہاں کمال زاہد سے آپ کے تلمذ کا ذکر ہے لیکن بلاواسطہ برہان بلخی سے تلمذ کا کوئی ذکر نہیں۔ (دیکھیں: حدیقہ: ۸، شیخ نظام الدین اولیاء، ص: ۳۰۵)

رضی الدین صغانی کے ذکر میں سرے سے برہان بلخی کا ذکر نہیں چہ جائیکہ ان سے سلطان جی کے تلمذ کا ذکر ہو۔ (دیکھیں: ایضاً، حدیقہ: ۷، صغانی، ص: ۲۸۱)

جہاں برہان بلخی کا ذکر ہے وہاں بس انہی معلومات کا اعادہ ہے جو فوائد الفواد میں ہے اور صاحب مشارق سے مشارق پڑھنے کا ذکر ہے سلطان جی کے ان سے تعلّم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ (دیکھیں: ایضاً، برہان الدین محمود بلخی، ص: ۲۹۰-۲۹۱)

کمال الدین زاہد کا اس میں تذکرہ ہی نہیں ہے کہ اس میں کسی ذکر کا امکان ہو۔

خلاصہ یہ کہ فاروقی صاحب نے جتنے حوالے دیے تھے ان میں کہیں بھی برہان بلخی سے سلطان جی کے تلمذ کا ذکر نہیں ہے۔

مجھے ایسا گمان ہوتا ہے کہ پروفیسر نثار فاروقی صاحب کو مولانا کمال زاہد کے تذکرے میں نزہۃ الخواطر کی ایک عبارت سے دھوکا ہوا ہے۔ کمال زاہد کے تذکرے میں مؤلف نزہۃ الخواطر نے برہان بلخی سے ان کے اخذ فقہ وحدیث کا ذکر کیا اور پھر صاحب ہدایہ سے بلخی کے اخذ فقہ کا اور پھر مصنف مشارق سے اخذ حدیث کا ذکر کیا اور پھر معا بعد صاحب تذکرہ کمال زاہد کے بارے میں فرمایا: **وأخذ عنه الشیخ المجاهد نظام الدین محمد البدایونی، وقرأ علیه المشارق وحفظ عنه۔** (حوالہ گزر چکا)

ترجمہ: ان سے شیخ مجاہد نظام الدین محمد بدایونی نے اخذ حدیث کیا، ان سے مشارق پڑھی اور حفظ کی۔

اب ممکن ہے کہ فاروقی صاحب نے أخذ کی ضمیر کمال زاہد کی طرف لوٹانے کی بجائے برہان بلخی کی طرف لوٹا دی ہو اور اس طرح انھوں نے برہان بلخی سے سلطان جی کے تلمذ کا قول کر دیا ہو۔

رہی بات ڈاکٹر عاصم اعظمی صاحب کی تو انھوں نے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے برہان بلخی کی سرخی قائم کی اور پہلے ان کا تعارف فوائد الفواد کے حوالے سے نقل کیا، اس کے بعد ایک سطری عبارت میں لکھا کہ شیخ نظام الدین اولیا نے آپ کو اپنے اساتذہ میں شمار کیا ہے، اس کے بعد حوالے میں لکھا: (نظام الدین اولیاء، صفحہ: ۵۳)

اس پر پہلا ملاحظہ یہ ہے کہ صرف نظام الدین اولیا نام کی کوئی کتاب ان کے مصادر ومراجع کی فہرست میں موجود نہیں ہے۔ ان کے کتب مصادر میں نظام الدین اولیا کے الفاظ سے دو کتابیں ہیں ایک خلیق نظامی کی شیخ نظام الدین اولیا اور دوسرے پروفیسر محمد حبیب کی حضرت نظام الدین اولیا۔ ان میں سے اول الذکر کتاب میں تو برہان بلخی کو نہ آپ کے اساتذہ میں شمار کرایا گیا ہے، اور نہ اس میں یہ لکھا ہے کہ سلطان جی نے ان کو اپنے اساتذہ میں شمار کیا ہے اور نہ ہی صفحہ: ۵۳ پر اِس طرح کی کوئی بات موجود ہے، بلکہ اس صفحے سے سلطان جی کے خانقاہی نظام کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے اور صفحہ: ۳۲ جہاں سے دہلی میں سلطان جی کی تعلیم کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے اس میں کہیں بھی اساتذہ کے ناموں میں برہان بلخی کا ذکر نہیں ہے۔

ثانی الذکر کتاب میں صفحہ: ۵۳ مطبوعہ دہلی یونیورسٹی ۱۹۷۲ء پر برہان کا ذکر ہے لیکن برہان بلخی کا نہیں بلکہ برہان نسفی کا ذکر ہے اور اس میں فوائد الفواد کے حوالے سے ان کا تعارف کرایا گیا ہے لیکن اس کے بعد پروفیسر حبیب صاحب نے صاف لفظوں میں لکھا: لیکن آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ ان کے شاگرد تھے۔

معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اعظمی صاحب کو یہاں دو مغالطے ہوئے، ایک تو یہ کہ پروفیسر حبیب صاحب نے برہان نسفی کا ذکر کیا تھا انھوں بلخی کا ذکر کیا دوسرا یہ کہ حبیب صاحب نے صراحت کر دی کہ سلطان جی نے ان کو اپنے اساتذہ میں شمار نہیں کرایا ہے لیکن اعظمی صاحب نے اس کے برعکس ذکر کیا۔ اب اگر اعظمی صاحب نے نظام

الدین اولیاء نام کی ایسی کسی کتاب کا حوالہ دیا ہو جس کا تذکرہ کتب مصادر میں نہیں ہے تو بات الگ ہوگی، اگرچہ بظاہر اس کا امکان موجود نہیں ہے۔

اس کے برعکس پروفیسر حبیب صاحب نے صفحہ:۵۲ پر اُن کے اساتذہ میں کمال زاہد کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے اساتذہ میں ان دو اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے جن کا ذکر سلطان جی کو عطا کردہ سند میں ہے ان میں ایک برہان بلخی بھی ہیں۔

اس کے علاوہ صفحہ:۲۸ پر انھوں نے صراحت کی ہے کہ سلطان جی برہان بلخی کے شاگرد ہیں۔ گویا اعظمی صاحب کا برہان بلخی کو اساتذہ میں ذکر کرنا وہم پر مبنی ہے۔

ان باتوں کے علاوہ سیر الاولیاء میں کمال زاہد کی عطا کردہ سند حدیث جو آپ کے نسخۂ مشارق سے لی گئی ہے اس میں برہان بلخی سے تلمذ کا ذِکر ایک واسطے سے ہے اور دیگر جن مؤرخین نے کمال زاہد یا سلطان جی کا ذکر کیا ہے ان کے بیان سے ایک واسطے سے ہی برہان بلخی سے تلمذ کا پتا چلتا ہے اور پروفیسر نثار فاروقی سے قبل کسی نے بھی برہان بلخی کا ذکر بحیثیت استاذ نہیں کیا ہے اور فاروقی صاحب نے جو حوالے دیے تھے ان کے حقائق گزشتہ صفحات میں بیان کر دیے گئے ہیں۔

لہٰذا ہماری تحقیق کا خلاصہ یہی ہے کہ علامہ برہان الدین محمود بلخی آپ کے اساتذہ میں نہیں ہیں بلکہ علامہ کمال الدین محمد بن احمد زاہد ماریکلی کے واسطے سے آپ ان کے شاگرد ہیں۔

کتابیات

۱-اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، تصحیح وتوضیح: علیم اشرف خان، انجمن آثار ومفاخر فرہنگی، ۱۳۸۳ھ

۲-تذکرہ علمائے ہند، مولوی رحمان علی، حرف باء، شیخ برہان الدین محمود بلخی، منشی نول کشور، لکھنؤ

۳-حدائق الحنفیۃ، مولوی فقیر محمد جہلمی، حواشی وتکملہ: خورشید احمد خان ایم اے، مکتبہ ربیعہ، کراچی

۴--حضرت نظام الدین اولیا: حیات اور تعلیمات، پروفیسر محمد حبیب، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء

۵--سیر الاولیاء، (فارسی) امیر خورد کرمانی، مطبع: محب ہند دہلی ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۵۸ء

۶--سیر الاولیا، مخطوطہ کا عکسی ایڈیشن، ناشر: خواجہ حسن ثانی نظامی، طبع اول: ۲۰۱۰ء

۷--شیخ نظام الدین اولیا، خلیق نظامی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، دہلی، ۱۹۹۴ء

۸-- فوائد الفواد، امیر حسن علا سجزی، باتصحیح ومقدمہ وحواشی وفہارس: محمد لطیف ملک ایم اے، ملا سراج الدین اینڈ سنز پبلیشرز، لاہور ۱۳۸۶ھ-۱۹۶۶ء

۹--فوائد الفواد، ترجمہ: خواجہ حسن ثانی نظامی، مکتبہ زاویہ، لاہور، ۲۰۰۳ء

۱۰--فوائد الفواد، (مع متن وترجمہ) ترجمہ: خواجہ حسن ثانی نظامی، ناشر: خواجہ حسن ثانی نظامی، ۲۰۰۷ء

۱۱--محبوب الٰہی، ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، فرید بک انسٹال، لاہور ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء

۱۲--نزہۃ الخواطر، عبدالحی رائے بریلوی، دار ابن حزم، بیروت ۱۹۹۹ء/ ۱۴۲۰ھ

○○○

مفتی محمد رضا قادری

سلطان المشائخ - ارباب تاریخ وسیَر کی نظر میں

خواجہ نظام الدین اولیا کا عہد - پس منظر وپیش منظر

ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی کے نصف اول کو عالم اسلام کے لیے تاریک ترین دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی عہد میں عالم اسلام کی تباہی مغلوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہونچی۔ حضرت سلطان المشائخ کی ولادت سے تقریباً ۲۰ رسال قبل منگولیا کے وحشی تاتاریوں کا لشکر اپنے سردار ''چنگیز خان'' کی قیادت میں ''صحرائے گوبی'' سے نکل کر ترکستان، کاشغر، ماوراء النہر، بخارا، سمرقند، خوارزم، ری، ہمذان، قزوین، آذربیجان، مَراغہ، دربند شروان، قبچاق، روس، خراسان، غزنہ، بلخ، ہرات اور تبریز کو تاخت وتاراج کرتا ہوا سلطنت عباسیہ کے دارالسلطنت بغداد (عراق) کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ابن الاثیر کے مطابق مذکورہ تمام بلاد کی تباہی اور ویرانی ۶۱۷ھ میں چنگیز کی قیادت میں ہوئی سوائے قبۃ الاسلام عراق کے۔ وہ ۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء میں اس کے پوتے ہلاکو خان کے ہاتھوں تاراج ہوا۔ (۱) ان تاتاریوں نے اسلامی تہذیب وتمدن کے سارے نشانات مٹا ڈالے، اس قدر خوں ریزی کی کہ مؤرخ ابن الاثیر ابوالحسن علی بن ابی الکرم شیبانی کو لکھنا پڑا:

میں کئی سالوں تک اس حادثہ کے ذکر سے اعراض کرتا رہا اور اس کے ذکر کو ناپسند کرتا رہا اور کش مکش میں مبتلا رہا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ روے زمین پر پیش نہ آیا تو کچھ بھی غلط نہ ہوگا۔

لقد بقيت عدة سنين مُعرضا عن ذكر هٰذه الحادثة استعظاما لها، كارها لذكرها، فأنا أقدم إليه رجلا و أؤخر أخرى ---- فلو قال قائل: إن العالم منذ خلق الله سبحانه و تعالى أدم، و إلى الاٰن، لم يُبتَلَوا بمثلها، لكان صادقا، فإن التواريخ لم تتضمن ما يقاربها و لا ما يُدانيها۔ (الكامل في التاريخ، ج ۱۲،ص: ۶۱۷، ذكر خروج التتر إلى بلاد الإسلام۔)

---

(۱) دیکھیے الکامل في التاریخ، ابن الاثیر، ج ۱۲، ذكر خروج التتر إلى بلاد الإسلام، ثم دخلت سنة سبع عشرة وستمائة، ص ۳۵۸ تا ۴۰۰، مطبوعہ دار صادر، بیروت، ۱۹۸۲ء

شیخ سعدی شیرازی (۵۷۱ھ-۶۹۱) جنھوں نے بچشم خود اس طوفان بلاخیز کو دیکھا تھا اس طرح مرثیہ خوانی کی:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر سقوط ملک مستعصم امیر المؤمنین

تاتاریوں کی اس یلغار سے مسلمانوں کی سات سو سالہ سطوت و شوکت خاک میں مل گئی۔ بڑے بڑے شریف و نجیب خانوادے جان بچا کر دوسرے محفوظ ملکوں کی طرف ہجرت پر مجبور ہوئے۔ مؤرخ ابن الاثیر کے بیان کے مطابق حضرت سلطان المشائخ کا آبائی وطن ''ازبکستان'' میں دریاے زرافشاں کی زیریں گزرگاہ پر ایک شاداب نخلستان میں واقع ''شہر بخاری'' ۶۱۷ھ میں مغلوں کے ہاتھوں تاراج ہوا۔ (الکامل في التاریخ، ج ۱۲، ص: ۶۶۵، ذکر خروج التتر إلی بلاد الإسلام۔)

قبل اس کے کہ یہ آندھی بخاری پہونچتی آپ کے جد اعلی خواجہ سید علی بخاری اور نانا خواجہ عرب بخاری نے ہندوستان ہجرت کی۔ جہاں ان دنوں خواجۂ ہند الولی کی روحانیت کے زیر اثر اور شہاب الدین محمد غوری (م ۱۲۰۵ء)، فرمانرواے غزنہ و خراسان کے ہاتھوں ایک مضبوط و مستحکم مسلم سلطنت وجود میں آچکی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کے لاہور میں قیام کیا، وہاں شورش زیادہ تھی وہاں سے منتقل ہو کر دہلی کے نواح میں واقع ایک مردم خیز خطہ ''بدایوں'' میں سکونت پذیر ہوئے۔ اس وقت ہندوستان کے تخت پر عظیم عالم و صوفی فرماں روا، سلطان شمس الدین التمش چشتی (زمانۂ حکومت ۱۲۱۰ء-۱۲۳۵ء) متمکن تھے۔

بدایوں کی تاریخی و علمی حیثیت

بدایوں وہ شہر تھا جسے راجہ بدّھا نے جو اشوک سمراٹ (۲۷۳-۲۳۲ق م) کا باج گزار تھا اپنا دارالحکومت بنایا تھا، اس وقت بدایوں کا نام ''ویدامئو'' تھا۔ ۳۸۸ھ تا ۴۲۱ھ کے درمیان محمود غزنوی نے ہندوستان پر کئی بار یلغار کی، ۴۰۹ھ میں ایک حملہ کے دوران سلطانی فوج کے کچھ چوپائے اور باربردار جانور راستہ بھٹک کر ویدامئو پہنچ گئے جسے راجہ چندر پال نے اپنی حراست میں لے لیا۔ (مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، محبوب الٰہی، ص: ۲۰، سلسلۂ بیت الحکمت، گھوسی)

بعض تذکرہ نگاروں نے اس شہر پر سید سالار مسعود غازی کے ۴۲۱ھ میں حملے کا ذکر کیا ہے تاہم قدیم تاریخی مصادر سے اس کا ثبوت نہیں ملتا، البتہ قدیم شہدا کے مزارات وہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ بدایوں کے بارے میں اہل علم کا تاثر یہ ہے کہ یہ زمین شہداے اسلام کے خون سے لالہ زار ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصحفی نے کہا تھا۔

قاتل تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں
جس کی گلی گلی میں مزار شہید ہے

کسی زمانہ میں اس شہر پر قنوج کے راجہ جے دیو نے قبضہ کرلیا تھا اور اس کی اولاد نے کئی پشتوں تک حکمرانی کی، اس خاندان کا آخری راجہ دھرم پال ہوا جس کے عہد میں قلعہ کا نام ''کوٹ بھداؤں'' ہوا جو بعد میں ترقی پا کر بداون ہوا اور پھر بدایوں کہلایا۔ فاتح ہندوستان، شہاب الدین محمد اول بن سام کے نائب السلطنت قطب الدین ایبک (عہد ۱۲۰۵ء-۱۲۱۰ء) نے ۵۹۹ھ/ ۱۱۸۸ء میں بھداؤں پر قبضہ کر کے دھرم پال کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح بدایوں مسلم قلمرو میں شامل ہوا۔ (مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی مجبوب الٰہی ص ۲۰ سلسلہ بیت الحکمت گھوسی)

قطب الدین ایبک کے عہد میں جب التمش اس شہر کے گورنر بنائے گئے تو اس شہر کی عظمت میں چار چاند لگ گئے، کیوں کہ وہ خود ذی علم تھے۔ ان کی علما اور معارف پروری نے اس شہر کو علما، صلحا، صوفیہ، فقہا، شعرا اور نابغۂ روزگار شخصیات کا مولد و مسکن بنا کر ''قُبّۃ الاسلام'' کا خطاب عطا کیا، اس کی بنائی ہوئی شمسی جامع مسجد آج بھی اس شہر کی عظمت رفتہ کا پتہ دیتی ہے۔ التمش کے عہد میمون میں پوری دنیاے اسلام سے شریف و نجیب خانوادے اور اہل قلوب اس کی طرف کھینچ کر آنے لگے۔ (۱)

عرب کی سرزمین سے مورث اعلی خانوادۂ عثمانی بدایونی شیخ دانیال قطری (م ۶۱۸ھ/ ۲، ۱۲۲۱ء)، تبریز (ایران) سے شیخ جلال الدین تبریزی سہروردی (م ۱۲۴۴ء) خلیفہ شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی، بخاری سے سید علی و خواجہ عرب بخاری، ترمذ کے شہر ''صغان'' سے محدث جلیل، صاحب مشارق الانوار، امام رضی الدین حسن صغانی (م ۶۵۰ھ) یمن سے سلطان العارفین خواجہ سید حسن شاہی موے تاب ابن سید عزالدین احمد یمنی (۶۳۲ھ) بخشب (ایران) سے شیخ عزیز کوتوال (م ۶۸۸ھ) نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس شہر کو رونق بخش کر رشک بغداد و قرطبہ بنا دیا۔ اس کے بعد بھی سینکڑوں سال تک بدایوں کی سرزمین نے ایسے دُرَر ہاے بے بہا پیدا کیے کہ جن کی چمک دمک نے اہل دل کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔

قبلۂ اہل تمکین، کعبۂ اہل تکوین، غوث زماں، سلطان المشائخ محبوب الٰہی، نظام الملت والدین خواجہ محمد نظام الدین اولیا ابن خواجہ سید احمد ابن خواجہ سید علی بخاری کی ولادت اسی گہوارۂ علم و ادب اور سرچشمۂ فقہ و تصوف میں ۲۷ ؍صفر المظفر ۶۳۶ھ کو بروز چہارشنبہ ہوئی۔ پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت ان ہاتھوں میں ہوئی جو خود بھی یکتاے روزگار تھے، خاندانی مجد و شرافت، طہارت نسبی، سیادت اور بدایوں کی مشکبار روحانی اور علمی فضا نے آپ کی شخصیت کی تعمیر میں جو کردار ادا کیا ہوگا اس کو اہل نظر بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ سب انجمن آرائیاں اسی دولہا کی بارات سجانے کے لیے تھیں جسے دہلی کی پیشانی کا جھومر بننا تھا، جسے ہندوستان کی کشورکشائی

---

(۱) اکمل التاریخ مصنفہ: مولانا محمد یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی، مرقومہ ۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء کے ص ۴۴ پر حاشیے میں تسلیم غوری کے حوالے سے مکتوب ہے: تاریخ بنی حمید فارسی، مصنفہ شاہ شرف علی صدیقی حمیدی مرتبہ ۱۳۲۸ھ کے آخر میں قاضیان شہر بدایوں کی فہرست دی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۶۱۸ھ، (۲، ۱۲۲۱ء) قاضی دانیال قطری عثمانی کا سال وصال ہے۔

کرنی تھی، جن کی ذات سے ہندوستان کو ایک نئی شناخت ملنے والی تھی، دلّی تو دلہن بنی اور دولہا نظام الدین ہے۔ یہ معاملہ بغیر تشبیہ کے ایسے ہی تھا جیسے بعثت مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے شہر مکہ کو کعبہ، حجر اسود، مقام ابراہیم اور چاہ زمزم سے آراستہ کردیا گیا۔

بدایوں میں خواجہ شادی مقری سے قرآن مجید اور قدوری شریف تک ظاہری علوم کی تکمیل متبحر عالم دین علامہ علاؤالدین اصولی تلمیذ شیخ جلال الدین تبریزی سہروردی سے فرما کر ۱۶ ؍سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے۔(۱) دہلی میں مستوفی الممالک شمس الدین خوارزمی سے مقامات حریری، مولانا محمد بن احمد ماریکلی (گجراتی) معروف بہ کمال الدین زاہد (م ۶۸۴ھ؍ ۱۲۸۵ء) سے نجم الدین ابوبکر تواسی کی مسجد میں ''مشارق الانوار'' کا درس لیا۔آپ نے قاضی منہاج السراج جوزجانی ترکستانی مصنف طبقات ناصری کے تذکیری مجالس سے بھی استفادہ کیا۔ ۲۰ ؍سال کی عمر میں اجودھن تشریف لے گئے اور شیخ المشائخ بابا فریدالدین مسعود ابن شیخ سلیمان بن شیخ شعیب کابلی فاروقی، خلیفہ قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خلیفہ برحق سلطان الہند خواجہ غریب نواز قدست اسرارھم کے ہاتھ پر بیعت کی اور ریاضت ومجاہدہ کے بعد درجۂ کمال پر پہونچے۔تقریبا ۷۳ ؍برسوں تک حیات ظاہری میں آپ کا قیام دہلی میں رہا، اس طویل مدت میں نو بادشاہوں کا زمانہ آپ نے پایا۔ ناصرالدین محمود (۱۲۴۶ء-۱۲۶۶ء) کے عہد میں آپ دہلی وارد ہوئے، غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء-۱۲۸۷ء) اور معز الدین کیقُباد (۱۲۸۷ء-۱۲۹۰ء) کے عہد میں مشغول ریاضت رہے۔ جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ء-۱۲۹۵ء) کے عہد میں آپ کی بزرگی کا شہرہ ہوا، علاؤالدین خلجی (۱۲۹۵ء-۱۳۱۵ء) کے عہد میں آپ کی عظمت سلاطین وامرا سب پر آشکار ہوگئی۔ بادشاہ خود معتقد ہوا۔ قطب الدین مبارک (۱۳۱۶ء-۱۳۲۰ء) ناصرالدین خسرو (۱۳۲۰ء ۱۳۲۰ء) اور غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء-۱۳۲۴ء) کے عہد میں آپ کو کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ اور محمد ثالث بن تغلق (۱۳۲۴ء-۱۳۵۱ء) کے عہد میں آپ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

حضرت محبوب الٰہی، اقلیم ولایت کے تاجدار اور اپنے عہد کے سرخیل صوفیہ تھے۔علوم ظاہر و باطن میں یکتائے زمانہ تھے۔آپ بڑے بلند پایہ متکلم اور مناظر تھے بایں سبب آپ کا لقب بحّاث اور محفل شکن پڑ گیا تھا۔ آپ کے نور ولایت کی کرنوں سے نہ صرف برصغیر بلکہ پورا عالم اسلام چمک اٹھا، آپ کی ذات نے ہندوستان میں سلسلۂ چشت اہل بہشت کو عروج کے نقطۂ کمال تک پہونچا دیا۔آپ کے نفَسِ گرم کی تپش نے لاکھوں قلوب کو زندہ

---

(۱) ہمارے عہد کے مشہور عالم دین تذکرہ نگار اور مورخ ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی نے اپنی کتاب محبوب الٰہی میں مولانا اصولی کا سنہ وصال ۹ ؍رجب ۶۲۲ھ تحریر کیا ہے پھر آگے چل کر محبوب الٰہی کا ان سے تعلیم حاصل کرنا تحریر کیا ہے۔ دونوں میں سخت تضاد ہے۔ امکان غالب ہے کہ کاتب سے سہو ہوا ہے۔ کیوں کہ محبوب الٰہی کی پیدائش بقولے ۶۳۴ھ وبقولے ۶۳۶ھ میں ہوئی ہے۔ اسی طرح خواجہ شادی مقری کا سنہ وصال ۷ ؍۲ رجب ۶۳۹ھ تحریر کیا ہے اور ان سے سلطان المشائخ کا ایک پارہ پڑھنا ذکر کیا ہے۔ گو آخر الذکر بات ممکن ہے کہ چار سال کی عمر میں آپ نے ناظرہ پڑھ لیا ہو مگر یہ بھی تامل سے خالی نہیں۔

کردیا، آپ کی نگاہ کیمیا اثر نے عہد ساز شخصیتوں کو پیدا کیا۔ آپ کی روحانی اور اصلاحی تحریک نے برصغیر کے ساتھ وسطی ایشیا پر بڑے گہرے اثرات ڈالے۔ آپ کے ذریعہ برپا کردہ روحانی اور خانقاہی نظام نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا اور امرا و عوام کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کردیا۔

سلطان المشائخ مؤرخین کی نظر میں

اب ہم ذیل کی سطور میں سلطان المشائخ کے بارے میں مؤرخین ہند کی شہادتیں اور ان کے تاثرات پیش کرتے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہوجائے کہ ان حضرات مؤرخین نے حضرت محبوب الٰہی کی ذات کو کس نظر سے دیکھا ہے اور ان کی ذات سے کس قدر متاثر ہوئے ہیں، اور ان کے اثرات کا کس انداز میں جائزہ لیا ہے۔ الاقدم فالاقدم کے طور پر بلحاظ عہد ہم الگ الگ مؤرخین کی آرا قلم بند کررہے ہیں۔

ضیاء الدین برنی کی نظر میں

سلطان المشائخ کے حالات پر سب سے مستند ماخذ فوائد الفواد اور سیر الاولیا ہیں جو آپ ہی کے عہد میں قلم بند کی گئیں البتہ تاریخی نقطۂ نظر سے ''تاریخ فیروز شاہی'' کو ایک غیر معمولی مقام حاصل ہے۔ جو برنی کی تصنیف ہے جس میں اس نے سلاطین ہند کی حکومتوں پر بے لاگ تبصرہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے چونکہ برنی کی آمد و رفت براہ راست حضرت محبوب الٰہی تک ہوتی تھی، وہ ان کی مجلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے، حتی کہ انھیں کے دست گرفتہ بھی تھے۔ لہذا ان کی شہادت ایک چشم دید شاہد کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان حالات کو قلم بند کیا ہے جو آپ کے عہد میں رونما ہوئے اور آپ کی روحانی انقلابی تحریک کے زیر اثر پیدا ہوئے۔ ان کے تبصرے سے بہت سی تمدنی، تاریخی، سماجی، سیاسی اور روحانی انقلابات پر روشنی پڑتی ہے۔ برنی لکھتا ہے:

''ہمدراں ایام شیخ اسلام نظام الدین در بیعت عام کشادہ بود و گناہگاران را خرقہ و توبہ می داد و بارادۂ خود قبول می کردہ الخ''

برنی کی یہ تصنیف فارسی زبان میں ہے، انھوں نے چار صفحات میں حضرت محبوب الٰہی کے ذریعہ برپا کیے جانے والے انقلابات و اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ ہم بخوف طوالت صرف اس کے اردو ترجمے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور یہ ترجمہ پروفیسر عبدالرحمٰن مومن کی کتاب ''خواجہ نظام الدین اولیا'' سے نقل کیا جاتا ہے۔ اصل فارسی عبارت تاریخ فیروز شاہی مصححہ سرسید احمد خان، مطبوعہ سرسید اکیڈمی ۲۰۰۵ء کے صفحہ ۳۴۳ تا ۳۴۶ پر مرقوم ہے۔

''اسی زمانہ میں شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت عام کا دروازہ کھول رکھا تھا۔ گنہگار لوگ ان کے سامنے اپنے گناہوں کا اقبال کرتے اور ان سے توبہ کرتے اور وہ ان کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرلیتے۔ خواص و عوام، مالدار و مفلس، امیر و فقیر، عالم و جاہل، شریف و رذیل، شہری و دیہاتی، غازی و مجاہد، آزاد و غلام ان سب سے وہ توبہ کراتے اور ان کو طاقیہ (ٹوپی) اور مسواک صفائی کے لیے

دیتے۔ ان لوگوں میں سے کثیر تعداد جو خود کو شیخ کے مریدوں میں شمار کرتی تھی بہت سے ایسے کاموں سے پرہیز کرنے لگتی تھی جو کرنے کے لائق نہیں ہوتے۔ شیخ سے مرید ہونے کی شرم لوگوں کو بہت سے گناہوں سے ظاہر اور مخفی طور پر باز رکھتی۔ چنانچہ عام لوگ یا تو دوسروں کی تقلید میں یا خود اپنے اعتقاد کی بنیاد پر عبادت اور بندگی کی طرف راغب ہو گئے تھے اور مرد اور عورتیں، بوڑھے اور جوان، سوداگر اور عام لوگ، غلام اور نوکر اور کم عمر بچے سب نماز پڑھنے لگے تھے۔ ان کے ارادت مندوں کی اکثریت نماز چاشت و اشراق کی پابند ہوگئی تھی۔ مخیر اور فیاض لوگوں نے شہر سے غیاث پور تک متعدد مقامات پر لکڑیوں کے چبوترے بندھوادیے تھے یا چھپر ڈلوادیے تھے اور کنویں کھدوادیے تھے اور پانی کے گھڑے اور مٹی کے لوٹے تیار رہتے تھے اور چھپروں میں بوریے بچھے رہتے تھے۔
ان چبوتروں اور چھپروں میں حافظ اور خادم مقرر کر دیے جاتے تھے تا کہ شیخ کے مریدوں اور نائبوں کو اور دوسرے نیک لوگوں کو ان کے آستانے پر آتے اور جاتے وقت وضو کرنے اور وقت پر نماز ادا کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ ان چبوتروں اور چھپروں میں نفل نماز ادا کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔
گناہوں کے ارتکاب اور ان کے متعلق لوگوں میں بہت کم بات چیت ہوتی تھی بلکہ ان میں اکثر و بیشتر جو گفتگو ہوتی وہ نماز چاشت و اشراق کے متعلق ہوتی اور یہ لوگ یہی دریافت کرتے رہتے کہ زوال، اوابین اور تہجد کی نماز میں کتنی رکعتیں پڑھی جاتی ہیں اور ہر رکعت میں قرآن کی کون سی سورت پڑھنی چاہیے اور یہ کہ پانچوں وقت کی نماز میں نفلوں کے بعد کون سی دعائیں آئی ہیں۔
شیخ کے نئے مرید، ان کے قدیم مریدوں سے اسی قسم کے سوال دریافت کرتے اور روزوں، نفلوں اور کم کھانے کے متعلق معلوم کرتے رہتے تھے۔ اس نیک زمانہ میں کثرت سے لوگ قرآن حفظ کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔۔۔۔ اس بابرکت زمانہ میں لوگوں کا کثرت سے نفل پڑھنا اور اس کو قائم رکھنا اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ سلطانی دربار سے منسلک امرا، سلاح داروں، محرروں، سپاہیوں اور بادشاہ کے غلاموں میں سے بہت سے لوگ جو شیخ کے مرید تھے چاشت اور اشراق کی نماز ادا کرتے تھے اور ایام بیض اور عشرہ ذی الحجہ کے روزہ رکھتے تھے۔ کوئی محلّہ ایسا نہیں تھا جہاں ہر مہینہ، بیس روز کے بعد نیک لوگوں کی مجلس نہ ہوتی اور صوفیہ کا سماع نہ ہوتا اور اس میں گریہ و رقت نہ ہوتی۔ شیخ کے کئی مرید ایسے تھے جو مسجدوں میں یا گھروں میں نماز تراویح میں ختم قرآن کراتے اور ان لوگوں میں سے جو (ان عبادات میں) مستقیم الحال تھے اکثر و بیشتر رمضان میں اور جمعہ اور حج کی راتوں میں قیام کرتے تھے۔ ان بزرگوں میں بہت سے حضرات ایسے تھے جو دو تہائی یا تین چوتھائی رات تمام سال قیام اللیل میں گزارتے اور بعض عبادت گذار تو عشا کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے

تھے۔۔۔۔عہد علائی کے آخری چند سالوں میں اکثر و بیشتر مسلمانوں میں سے کسی کی بھی زبان پر شراب وشباب، فسق وفجور، قمار بازی، فحش حرکات، لواطت یا بچہ بازی کا ذکر تک نہیں آیا تھا۔ بڑے جرائم اور کبیرہ گناہ لوگوں کے نزدیک بمنزلہ کفر ہو گئے تھے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کے مرتکب نہ ہوتے تھے اور خوف و ہراس کی وجہ سے دکانداروں میں جھوٹ، کم تولنا مکاری و دغا، دھوکا دہی اور نادانوں کا روپیہ مار لینا سب قطعی طور پر ختم ہو گئے تھے۔ علم حاصل کرنے والے اور اشراف و اکابر جو شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے زیادہ تر تصوف و سلوک کی کتابوں اور ان صحیفوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے جن میں طریقت کے احکام ہوتے تھے۔ چنانچہ قوت القلوب، احیاء العلوم، عوارف المعارف، کشف المحجوب، شرح تعرف، رسالہ قشیریہ، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ، لوائح ولوامع قاضی حمید الدین ناگوری اور فوائد الفواد کے بہت زیادہ خریدار پیدا ہو گئے تھے۔ صوفیوں کی خریداری کی زیادتی کی وجہ سے لوٹے اور طشت چرمی مہنگے ہو گئے تھے۔ درحقیقت اللہ تعالی نے شیخ نظام الدین کو اس آخر زمانہ میں جنید اور بایزید کی مثل پیدا کیا تھا۔‘‘(۱)

ابن بطوطہ کی نظر میں

آٹھویں صدی ہجری کا مشہور زمانہ سیاح اور مؤرخ ابن بطوطہ (۷۰۳ھ-۷۷۹ھ) جو محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان وارد ہوا۔ اس کا زمانہ حضرت محبوب الٰہی کے زمانے سے بہت قریب ہے۔ بس چند سالوں کا فاصلہ ہے۔ انھوں نے اپنے سفر نامے میں تین مقامات پر حضرت محبوب الٰہی کا ذکر نظام الدین ولی البذاونی کے نام سے کیا ہے۔

محمد تغلق چوں کہ حضرت سلطان المشائخ کا عقیدت مند تھا اور ان سے دعا کراتا رہتا تھا۔ ابن بطوطہ نے شیخ کے اس غلبۂ حال کا ذکر کیا ہے جس میں آپ نے محمد بن تغلق کو ہندوستان کی بادشاہت عطا فرمائی تھی۔ وہ رقمطراز ہیں:

و كان بمدينة دهلي الولي نظام الدين البذواني، و لايزال محمد شاه ابن السلطان يتردد إليه و يعظم خدامه، و يسأله الدعاء۔ و كان يأخذ الشيخ حال تغلب عليه، فقال ابن السلطان لخدامه: ”إذا كان الشيخ في حالة التي تغلب عليه فأعلموني بذلك“ فلما أخذته الحال أعلموه، فدخل عليه، فلما رآه الشيخ قال: ”وهبناه الملك“ (رحلۃ ابن بطوطۃ تحقیق طلال حرب، ص ۴۶۱)

---

(۱) ضیاء الدین برنی، مؤرخ، تاریخ فیروز شاہی، از ص ۳۴۳ تا ۳۴۶، فارسی، مصحح: سر سید احمد خان، مطبوعہ: ۱۸۶۲ء از کلکتہ باہتمام کپتان ولیم ناسولیس ومولوی کبیر الدین احمد۔ برنی کی یہ تاریخ ۷۵۸ھ مطابق ۱۳۵۶ء میں مکمل ہوئی۔ اس میں سلطان ناصر الدین محمود کے بعد سے فیروز شاہ تغلق تک کے سلاطین کے حالات مندرج ہیں۔

ترجمہ: اور شہر دہلی میں اللہ کے ولی نظام الدین بدایونی رہتے تھے۔ محمد بن سلطان غیاث الدین تغلق ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے اور ان کے خدام کی تعظیم کرتے، اور شیخ سے دعا کی درخواست کرتے۔ اور غلبۂ حال میں جا کر شیخ کو تھام لیتے تھے۔ شہزادے نے شیخ کے خدام سے کہا: جب شیخ پر غلبۂ حال ہو تو مجھے بتاؤ۔ جب آپ پر حال طاری ہوا اور آپ مغلوب ہو گئے خدام نے ان کو بتایا، شہزادہ حاضر ہوا، جب شیخ نے اسے دیکھا تو ارشاد فرمایا: ہم نے تمھیں بادشاہت عطا کر دی۔

اس مختصر سے اقتباس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ حضرت سلطان المشائخ اپنے عہد میں دہلی کے سب سے باا ثر اور مقبول شیخ طریقت تھے، یہی وجہ ہے کہ سلطان محمد تغلق اپنے زمانۂ شہزادگی میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر دعا کا خواستگار ہوتا تھا۔ مزید اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ محمد تغلق کی باشاہت حضرت محبوب الٰہی کا عطیہ تھی۔

بدایونی کی شہادت

عہد اکبری کا ایک غیر جانبدار مؤرخ عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی جو نہ درباری تھا نہ دربار سے متاثر، اس نے عہد علائی میں فتوحات کثیر کا ذکر کرتے ہوئے اسے سلطان المشائخ کے وجود کی برکت قرار دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

و در سنہ احدی عشر وسبع مائۃ (۷۱۱ھ) ملک نائب باسی صد و دوازدہ فیل و بست ہزار اسپ و نود و شش ہزار من طلا و صندوقہاے جواہر و مروارید و دیگر غنائم از اندازۂ حساب افزون بدرگاہ آمد گذرانید و امیر خسرو کہ دراں لشکر بود خصوصیات ایں احوال در خزائن الفتوح نوشتہ و ایں فتوحات را بعضے حمل بر استدراج و بعضے بر کرامات سلطان علاؤالدین میکردند و بعضے امن و امان آں عہد را از برکات بے نہایات، سلطان المشائخ نظام الاولیا قدس سرہ می دانستند اھ (منتخب التواریخ ص ۱۹۷)

مفہوم: ۷۱۱ھ میں ملک نائب (ولی عہد) تین ہزار بارہ ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے، چھیانوے ہزار من طلا، ہیرے جواہرات اور مروارید کے صندوق، اور دیگر اموال غنیمت جو شمار سے باہر ہیں لے کر دارالسلطنت واپس ہوا، امیر خسرو جو اس لشکر میں موجود تھے انھوں نے اپنی کتاب ''خزائن الفتوح'' میں ان احوال کی خصوصیات قلمبند کر دی ہیں۔ ایک طبقہ ان فتوحات کو استدراج پر محمول کرتا ہے تو دوسرا طبقہ سلطان علاؤالدین خلجی کی کرامت سمجھتا ہے اور ایک طبقہ اس عہد کے امن و امان کو حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا قدس سرہ کی برکتوں میں سے شمار کرتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی بدایونی نے کئی مقامات پر مؤدب پیرائے میں آپ کا تذکرہ کیا ہے۔ جس سے اس کی سلطان المشائخ سے عقیدت و محبت آشکار ہوتی ہے۔ اس برکت کو علاؤالدین خلجی کی کرامت ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا کیوں کہ وہ لائق کرامات تھا ہی نہیں، یہ بلاشبہ حضرت سلطان المشائخ کے وجود اور ان کے عہد کی برکت ہے۔

قطب الدین مبارک شاہ (۱۳۲۰-۱۳۱۶ء) جو خلجی خاندان کا نہایت منحوس بادشاہ تھا اور حضرت سلطان المشائخ کا دشمن تھا، اس کا بھائی خضر خان حضرت سلطان المشائخ کا مرید تھا۔ خضر خان سے متعلق عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے:

وسلطان قطب الدین بتقریب آنکہ خضر خان مرید سلطان المشائخ نظام الاولیا قدس اللہ سرہ العزیز بود با حضرت شیخ نسبت بی اعتقادی داشت و برغم حضرت او شیخ رکن الدین را از ملتان طلب نمود و شیخزادہ جام را کہ از منکران شیخ بود بخود اختصاص داداھ (منتخب التواریخ، از عبدالقادر بدایونی، ج: اول، ص: ۲۱۰)

ترجمہ: اور قطب الدین (مبارک شاہ) نے اس تقریب میں جس میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ کے مرید خضر خان موجود تھے حضرت شیخ کے ساتھ برا اعتقاد رکھا اور حضرت کے ہوتے ہوئے اس نے شیخ رکن الدین کو ملتان سے طلب کرلیا اور شیخ زادہ جام کو جو شیخ کے مخالفین میں سے تھے خصوصی درجہ دیا۔

ابوالفضل علائی کا بیان

آئین اکبری، عہد اکبری کی تاریخ پر سب سے مستند کتاب مانی جاتی ہے گو یہ کتاب سولہویں صدی عیسوی کی تالیف ہے تاہم بہت سے نادر حقائق اس میں جمع کر دیے گئے ہیں۔

ابوالفضل العلائی نے اپنی کتاب آئین اکبری میں اولیاے ہند کے نام سے باضابطہ ایک عنوان قائم کیا جس میں کبار مشائخ کا ذکر ملتا ہے وہ حضرت خواجہ محبوب الٰہی کے بارے میں لکھتا ہے:

شیخ نظام الدین اولیا نام محمد، ولد احمد دانیال از غزنین بہ بداؤں آمد و شیخ در ششصد سی و دو دو درانجا بزاد، و لختی رسمے علوم اندوخت او را نظام بحاث و محفل شکن میگفتند، در بستگی سالگی با جودھن رفتہ بشیخ مرید گنج شکر آورد و کلید گنجینہ معنی بدست آورد۔۔۔۔۔ (آئین اکبری ص ۲۰۸، ۲۰۹)

ترجمہ: شیخ نظام الدین اولیا محمد ولد احمد دانیال، غزنین سے بدایوں آئے، ۶۳۴ھ میں پیدا ہوئے، مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ ان کو لوگ نظام بحّاث (بہت زیادہ بحث کرنے والا) اور محفل شکن کہا کرتے تھے۔ بیس سال کی عمر میں اجودھن جاکر شیخ فرید گنج شکر کے ہاتھ پر مرید ہوئے اور انھیں کے ہاتھ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

آپ کے ذریعہ بلند پایہ مقام حاصل کرنے والوں میں شیخ نصیر الدین چراغ اور امیر خسرو دہلی میں، شیخ اخی سراج بنگال میں، شیخ وجیہ الدین یوسف چندیری میں، اور شیخ حسام گجرات میں، شیخ برہان الدین غریب، شیخ منتخب اور خواجہ حسن دکن میں نمایاں شہرت کے حامل ہیں۔

تاریخ وفات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''چاشت چہار شنبہ ہژدم ربیع الآخر ہفتصد و بست و پنج از جہاں رفت۔''

۱۸/ربیع الآخر ۷۲۵ھ بروز بدھ، بوقت چاشت آپ خالق حقیقی سے جا ملے۔

سرسید احمد خان کی نظر میں

انیسویں صدی عیسوی کا ممتاز ہندوستانی مفکر اور معمارقوم، محقق، مؤرخ سید احمد خان (پیدائش ۱۷/۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء، وفات: ۲۷/مارچ ۱۸۹۸ء) ولد سید محمد متقی خان بہادر ولد جواد الدولہ جواد علی خان بہادر، بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ان کی کوئی مستقل تحریر حضرت سلطان المشائخ کے حوالے سے نظر سے نہیں گزری البتہ اپنی مشہور زمانہ کتاب ''آثار الصنادید'' میں جس کو انھوں نے سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد دہلی کے آثار قدیمہ، کھنڈرات، مینار، محلات، قلعوں، مساجد، مقابر اور باولیوں کی تاریخ کو محفوظ کرنے کے لیے ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶ء میں مکمل کیا تھا۔ اس میں انھوں نے حضرت سلطان المشائخ سے منسوب باولی حضرت نظام الدین کا ذکر بہت اہتمام سے کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

باولی حضرت نظام الدین: مشہور ہے کہ یہ باولی حضرت نظام الدین نے اپنے جیتے جی قریب ۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء کے بنائی ہے۔ اس باؤلی کا پانی بھی تبرک گنا جاتا ہے اور جن اوترنے اور بھوت بھاگنے اور پیٹ رہنے کی منت سے اس میں نہایا جاتا ہے۔ یہ باولی بہت خوب اور نہایت روشن ہے۔ (سرسید احمد خان، آثار الصنادید ص ۱۸۴)

سلطان المشائخ تذکرہ نگاروں کی نظر میں

امیر حسن علا سجزی کی نگاہ میں

امیر حسن علا سجزی ابن علاؤالدین بدایونی ہاشمی (ولادت ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء) کی تالیف فوائد الفواد حضرت سلطان المشائخ کے حالات کو جاننے کا سب سے مستند ماخذ ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں۔ جن میں ۱۸۸ مجلسوں کا حال درج ہے۔ امیر حسن سجزی نے بہت ہی اہتمام واحتیاط کے ساتھ حضرت کے ملفوظات وارشادات کو قلمبند کیا ہے۔ یہ کتاب ہر دور میں مقبول رہی۔ فوائد الفواد ۷۰۷ھ مطابق ۱۳۰۸ء سے ۱۳۲۲ء کے درمیانی عرصہ میں لکھی گئی۔ اس ملفوظ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو خود صاحب ملفوظات نے حرف بہ حرف سن کر اصلاح فرمائی ہے جس سے اس کا پایۂ استناد بڑھ جاتا ہے۔

حسن سجزی سلطان المشائخ کی پہلی مجلس کا حال اس طرح لکھتے ہیں:

''پہلی مجلس، اتوار ماہ شعبان (اس کی برکتیں عام ہوں) کی تیسری تاریخ سات سو سات ہجری (۷۰۷ھ) پروردگار کی رحمت کے امیدوار بندہ گناہگار حسن علا سجزی کو جو اس تلقین کا لکھنے والا اور ان معانی کا جمع کرنے والا ہے۔ اس شاہ فلک جاہ، ملک دست گاہ کی قدم بوسی کی دولت حاصل

ہوئی۔اسی وقت اس آفتاب روشن ضمیر، قطب کی بے نظیر نظر کے فیض سے اس کے باطن نے چہار طبع کی آلائش کا ترک اختیار کیا۔اوراس کے سر کو اس ناصیۂ اصفیا کی کلاہ چار ترکی سے زینت ملی۔الحمدللہ علی ذلک۔

اس روز فرض نمازوں اور چاشت کی نماز اور چھ رکعت بعد نماز مغرب اور ایام بیض کے روزوں کی تاکید کے بعد زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ تائب، متقی کے برابر ہے۔کیوں کہ متقی تو وہ ہوتا ہے کہ مثلاً اس نے عمر بھر کبھی شراب نہ پی ہو یا اور کوئی گناہ اس سے نہ ہوا ہو۔اور تائب وہ ہوتا ہے کہ گناہ کیا اور پھر توبہ کرلی۔اس کے بعد فرمایا کہ دونوں اس حدیث کے مطابق برابر ہیں: ''**التائب من الذنب کمن لا ذنب له**'' (فوائد الفواد، فارسی، مترجمہ خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی، ص ۱۴۱)

مذکورہ بالا عبارتوں سے ایک طرف امیر علا سجزی کی حضرت محبوب الٰہی سے والہانہ عقیدت کا پتہ چلتا ہے تو دوسری جانب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے مریدوں کو ہمیشہ اعمال صالحہ کی ترغیب دیا کرتے تھے اور ان کے اعمال کی نگہداشت بھی فرمایا کرتے تھے جیسا کہ اس کا ذکر انھوں نے مجلس پنجم میں کیا ہے۔

امیر خورد کرمانی کی نظر میں

امیر خورد سید محمد بن مبارک متوفی ۷۷۰ھ حضرت محبوب الٰہی کے کمسن مرید ہیں۔امیر خورد کے دادا سید محمد کرمانی کے تعلقات حضرت محبوب الٰہی سے اسی زمانے سے قائم ہو چکے تھے جب آپ اجودھن تشریف لے گئے۔وہ اجودھن میں آپ کے ساتھ رہے اور جب آپ غیاث پور دہلی منتقل ہوئے اس وقت بھی وہ ساتھ ساتھ تھے۔لہذا امیر خورد کو حضرت محبوب الٰہی کی محبت ورثے میں ملی ہوئی تھی۔امیر خورد نے جب سیر الاولیا مرتب کی تو ان کی عمر پچاس سال ہو چکی تھی۔اس میں اپنے مشاہدات کے علاوہ، انھوں نے اپنے دادا، والد اور چچا سے سنی ہوئی روایات کو بہت احتیاط کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔یہ واحد ایسی قدیم کتاب ہے جو مشائخ چشت کے حالات پر اطلاع فراہم کرتی ہے۔یہ حضرت محبوب الٰہی کے حالات پر سب سے مفصل اور مستند تذکرہ ہے۔بخوف طوالت اس کتاب سے صرف ایک اقتباس نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

امیر خورد لکھتے ہیں:

راقم الحروف نے ثقہ راویوں سے سنا کہ شیخ نجم الدین اصفہانی ساٹھ سال تک خانۂ کعبہ کے مجاور رہے۔انھوں نے ایک ایسی جگہ گھر بنا رکھا تھا جہاں سے بیٹھے بٹھائے نظر خانۂ کعبہ پر پڑتی تھی، شیخ کامل الحال انسان تھے۔ایک دن مکہ کے مجاوروں نے پوچھا کہ سلطان المشائخ آج زمانے بھر کے مقتدا ہیں وہ مخلوق خدا کو ان کے مقاصد تک پہنچاتے ہیں اس میں کیا حکمت ہے کہ وہ زیارتِ خانۂ کعبہ کو نہیں آتے اور حج کی سعادت سے مستفیض نہیں ہوتے۔شیخ نجم الدین نے فرمایا کہ وہ اکثر

اوقات صبح کی نماز میں خانۂ کعبہ میں حاضر ہوتے ہیں۔اور نماز با جماعت میں ہماری سمت میں شریک ہوتے ہیں۔احتمال یہ کہ اونٹ فرشتہ ہو غیب سے آتا ہو اور سلطان المشائخ کو خانۂ کعبہ لے جاتا ہو۔

(سیر الاولیا، سید محمد بن مبارک کرمانی، ص: ۱۵۳)

امیر خورد کے اس بیان سے یہ روشن ہو گیا کہ خدا کی بارگاہ میں حضرت سلطان المشائخ کا مقام کیا ہے وہ اپنے جسم مثالی کے ساتھ اکثر اوقات فجر کی نماز خانۂ کعبہ میں جا کر ادا کرتے تھے۔

مخدوم احمد یحییٰ منیری کا ارشاد

سلطان المحققین، مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیی منیری فردوسی (م ۷۸۲ھ) کے ملفوظات کو ان کے مرید باصفا حضرت مولانا زین بدر عربی نے معدن المعانی کے نام سے جمع کیا ہے اس میں وہ حضرت مخدوم جہاں رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''مجلس شریف میں شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی بزرگی کا تذکرہ آ گیا۔حضرت مخدوم جہاں عظمہ اللہ نے فرمایا: شیخ نظام الدین کی بزرگی میں کوئی شبہ نہیں، وہ بزرگ ہیں اور ان کے ملفوظ میں ہم نے دیکھا ہے کہ ایک دن امیر حسن نے عرض کیا کہ مجھ کو بڑی بڑی دعاؤں میں کچھ رغبت نہیں ہوتی، شیخ نظام الدین نے فرمایا: سبحان اللہ دعاؤں میں بس اس قدر کافی ہے کہ یہ دعا پڑھیں:

اللھم إني أسئلک أن لا أسئلک سواک۔

(اے اللہ میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ تیرے سوا کسی کو نہ مانگوں۔)

ان کی یہ بات ان کی ہمت کے بلند ہونے کی دلیل ہے۔اگر ان کی ہمت باری تعالی کے علاوہ کسی اور طرف ہوتی تو اس دعا کے علاوہ کوئی دوسری دعا زبان پر آتی۔(معدن المعانی، بیسواں باب، ص ۲۶۱-۲۶۲)

حضرت مخدوم جہاں کی درج بالا باتوں سے حضرت سلطان المشائخ کے علوّ مرتبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ان کی نظر میں ان کی بزرگی میں کوئی شبہ نہیں، نیز صرف بزرگ ہی نہیں بلکہ ان کی ہمت اتنی بلند ہے کہ حق تعالی کے علاوہ کسی طرف التفات نہیں کرتے۔اسی لیے آپ محبوب الٰہی ہوئے۔

مخدوم شعیب فردوسی کا بیان

حضرت مخدوم جہاں کے حقیقی خالہ زاد بھائی، مرید و خلیفہ، سلسلۂ فردوسیہ کے بلند پایہ بزرگ حضرت مخدوم شعیب فردوسی ابن مخدوم جلال منیری ابن مخدوم عبدالعزیز ابن امام تاج فقیہ (ولادت ۱۲/ربیع الآخر ۶۸۸ھ وصال: ۱۲/ربیع الآخر ۸۲۴ھ) جن کے مجاہدات کے احوال شاقہ سن کر لرزہ طاری ہو جائے۔ بارہ سال تک بے آب و دانہ ہندو جوگی سے مناظرہ کے دوران نیپال کے پاٹن کنویں میں بند رہے۔اور بارہ سال بعد زندہ صحیح و سلامت باہر تشریف لائے۔ان کے تفصیلی حالات کا ذکر فقیر کی کتاب ''نیپال میں اسلام کی تاریخ'' میں درج ہے۔

اتنے بلند پایہ بزرگ کی طرف منسوب کتاب مناقب الاصفیا (فارسی) جو سلسلۂ فردوسیہ کے مشائخ پر اطلاع کا سب سے اولین ماخذ ہے، اس میں مرقوم ہے:

''حضرت مخدوم جہاں نے دہلی کا سفر کیا اور مشائخ دہلی سے ملاقات کی اور فرمایا: ''اگر شیخی اینست ما ہم شیخم'' اگر شیخی یہی ہے تو ہم بھی شیخ ہیں۔ پھر شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی۔ اس وقت آپ کی مجلس میں کسی موضوع پر علمی مذاکرہ چل رہا تھا۔ آپ نے پسندیدہ جواب دیے۔ شیخ نظام الدین نے اعزاز و اکرام فرمایا: ایک طشت میں پان پیش کیا اور فرمایا: ''سیمرغست نصیب دام ما نیست'' یہ ایک سیمرغ ہیں لیکن میرے حصہ کے نہیں۔

اس واقعہ سے دونوں ولیوں کی عظمت و بزرگی ظاہر ہوتی ہے۔ مخدوم شعیب اس حوالے سے مزید فرماتے ہیں:

سنا ہے کہ اس کے بعد آپ کے بڑے بھائی نے آپ کے سامنے خواجہ نجیب الدین فردوسی کا تذکرہ کیا۔ آپ کی روش اور مناقب بیان کیے۔ آپ نے فرمایا: قطب دہلی نے پان دے کر رخصت کر دیا اب کسی دوسرے کے پاس کیا جائیں۔'' (مناقب الاصفیا، شعیب فردوسی، ص ۲۶۶)

ان دونوں روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مخدوم جہاں سلطان المشائخ کی ولایت و عظمت کا شہرہ سن کر ہی ان کی بارگاہ میں مرید ہونے کی نیت سے آئے تھے مگر آپ نے پان دے کر رخصت کر دیا۔ کیوں کہ آپ پر یہ امر روشن تھا کہ میرے بھائی خواجہ نجیب الدین فردوسی ۱۲ر سالوں سے خلافت نامہ لکھ کر ان کا بے قراری سے انتظار کر رہے ہیں۔ حضرت مخدوم جہاں کی زبان سے شیخ کے لیے ''قطب دہلی'' کا لفظ ادا ہونا کوئی اتفاق نہیں تھا بلکہ وہ بخوبی واقف ہو گئے تھے کہ اس وقت دہلی کے قطب اور بادشاہِ روحانیت آپ ہی ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خود مخدوم جہاں مرید ہونے سے پہلے ولایت کی اعلیٰ منزل پر فائز تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی نظر میں

گیارہویں صدی ہجری کے عظیم محدث اور بلند پایہ صوفی، محقق علی الاطلاق شیخ عبدالحق محدث دہلوی (ولادت: ۹۵۸ھ - وصال ۱۰۵۲ھ) کو سلطان المشائخ سے اتنی والہانہ محبت تھی کہ ان کے تذکرے میں انھوں نے ساڑھے پانچ صفحات صرف کیے ہیں، جب کہ بڑے سے بڑے بزرگ کا تذکرہ وہ ایک صفحہ یا آدھے صفحہ یا اس سے کم میں کرتے ہوئے گزر گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

شیخ نظام الحق والدین محمد بدایونی قدس سرہ، خلیفہ شیخ فرید الحق والدین، نام او محمد بن احمد بن علی البخاری ست ولقب او سلطان المشائخ و نظام اولیا ست۔ وی از محبوبان و مقربان درگاہ الٰہی ست، دیار ہندوستان مملوست از آثار برکات او۔ (اخبار الاخیار فی اسرار الابرار (فارسی) ص ۶۰)

اخبار الاخیار فی اسرار الابرار کے صفحہ ۶۴ پر رقمطراز ہیں:

''سلطان علاؤ الدین باز بجہت ملاقات الحاح کرد، شیخ فرمودہ فرستاد کہ خانہ ایں ضعیف دو در دارد واگر بادشاہ از یک درآید من از دیگر بیروں روم۔'' (اخبار الاخیار فی اسرار الابرار (فارسی) ص ۶۴)

بادشاہ علاؤ الدین نے پھر ملاقات کے لیے اصرار کیا۔ شیخ نے فرمان بھیجوایا کہ اس فقیر کے گھر میں دو دروازے ہیں اگر بادشاہ ایک دروازے سے آئے گا تو میں دوسرے دروازہ سے باہر چلا جاؤں گا۔ شیخ محقق کی اوپر والی تحریر یہ بتاتی ہے کہ آپ مشائخ کے بادشاہ ہیں اور دین کے نظام ہیں، محبوب بارگاہ الٰہی ہیں اور بلاد ہند، آپ کی برکتوں سے معمور ہے تو دوسری عبارت یہ بتاتی ہے کہ آپ کو بادشاہ وقت کے ملاقات کی کوئی پرواہ نہیں تھی، نہ آپ نے کبھی بادشاہوں کو ملاقات کی اجازت دی۔ شان بے نیازی کی اس سے بڑی مثال اس عہد میں اور کوئی نہیں مل سکتی۔

مفتی غلام سرور لاہوری کا بیان

اب ہم تیرہویں صدی ہجری کے نامور تذکرہ نگار مفتی غلام سرور لاہوری کا بیان تحریر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی مشہور زمانہ تالیف خزینۃ الاصفیا (فارسی) میں مشائخ سلسلۂ سہروردیہ کے ذکر کا التزام کیا ہے اور خوب داد تحقیق دی ہے۔ اس ضمن میں کہیں کہیں دوسرے سلاسل کے مشائخ کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ میرے پیش نظر ۱۹۱۴ء کا مطبوعہ قدیم نسخہ ہے جو انتہائی خستہ ہونے کے سبب کہیں کہیں ناقابل قراءت بھی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے حضرت محبوب الٰہی کی تعریف کرتے ہوئے شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''گلستاں'' سے متعلق ایک ایمان افروز واقعہ تحریر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

نقل ست کہ خواجہ امیر خسرو روزی بخدمت سلطان المشائخ نظام الدین بداؤنی پیر روشن ضمیر خویش حاضر شد، دید کہ آنجناب بمطالعۂ کتاب گلستاں کہ تصنیف شیخ سعدی ست مصروف ست، بخدمت بنشست، چوں شیخ از مطالعۂ کتاب فراغت یافت، عرض کرد کہ اگر ارشاد گردد بندہ ناچیز یک نسخہ کتاب کہ بطرز و طرح کتاب گلستاں باشد تصنیف کند و باسم بہارستاں موسوم باید، فرمود کہ مناسب ست۔

پس در چند ایام کتاب بہارستان تصنیف کرد و بخدمت شیخ آورد، شیخ فرمود کہ ترک اللہ دریں کتاب بسیار داد فصاحت و بلاغت دادی و نامش نیز بہارستان نہادی۔ اما گلستان سعدی گلستانیست کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم دراو سیر میفرماید۔

خسرو چوں ایں بشنید شکستہ خاطر شد۔ چوں شب شد در خواب دید کہ سرور کائنات علیہ السلام والصلاۃ بر تخت نبوت جلوہ گر اند و شیخ سعدی رو برو سلطان المشائخ بجانب راست دست بستہ ایستادہ اند و حضرت شہنشاہ رسالت بمطالعہ کتابی مشغول اند۔ چوں خسرو پیش رفت دید کہ کتاب گلستان سعدیست دانست کہ آں مقبول جناب رسالت علیہ الصلوٰۃ والتحیۃ است اھ (خزینۃ الاصفیا (فارسی) مرقومہ: ۱۲۸۱ھ، ص ۳۹-۴۰)

ترجمہ: منقول ہے کہ خواجہ امیر خسرو ایک دن، اپنے پیر روشن ضمیر، سلطان المشائخ نظام الدین بدایونی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دیکھا کہ آپ شیخ سعدی (ولادت: ۵۷۱ھ-وصال ۶۹۱ھ) کی تصنیف کردہ کتاب گلستان کے مطالعہ میں مشغول ہیں۔ خدمت میں بیٹھ گئے، جب شیخ کتاب کے مطالعہ سے فارغ ہوئے تو عرض کیا: اگر ارشاد فرمائیں تو یہ خاکسار گلستاں کی طرز پر ایک کتاب تصنیف کرے اور نام ''بہارستان'' رکھے۔ سلطان المشائخ نے فرمایا مناسب ہے۔

پھر چند دنوں میں بہارستان نامی کتاب لکھ کر شیخ کی خدمت میں پیش کی۔ شیخ نے فرمایا: اللہ کے بندے! آپ نے اس کتاب میں بہت زیادہ فصاحت و بلاغت کا اظہار کیا ہے اور اس کا نام بہارستان رکھا ہے۔ لیکن سعدی کی گلستاں ایسا چمنستان ہے جس میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیر فرماتے ہیں۔

خسرو یہ جملہ سن کر شکستہ خاطر ہوئے۔ جب رات ہوئی دیکھا کہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام تخت نبوت پر جلوہ افروز ہیں اور شیخ سعدی، سلطان المشائخ کے روبرو دائیں جانب دست بستہ کھڑے ہیں اور شہنشاہ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہیں۔ جب خسرو نے آگے بڑھ کر دیکھا تو یہ پایا کہ یہ گلستان سعدی ہے تب انھوں نے جان لیا کہ یہ کتاب بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مقبول ہے۔

خلاصۂ گفتگو

خواجہ نظام الدین اولیا کی شخصیت علمی و عوامی حلقوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ ان کے بعد آنے والے مورخین اور تذکرہ نگاروں نے خصوصیت کے ساتھ مختلف زاویوں سے ان کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے مشتے نمونہ از خروارے یہاں اس کی نظیر پیش کر دی ہے۔ اللہ نے چاہا تو اس موضوع کو کبھی تفصیل کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

کتابیات

۱-آئین اکبری، سرسید ایڈیشن، لیتھوگرافک پریس، مطبع اسماعیلی طبع اول باہتمام محمد احمد الحق ۱۲۷۲ھ

۲-آثار الصنادید، سرسید احمد خان، مطبوعہ اردو اکادمی دہلی، مطبوعہ ۲۰۱۱ء

۳-اخبار الاخیار فی اسرار الابرار (فارسی)، مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند، یوپی

۴-اکمل التاریخ مصنفہ: مولانا محمد یعقوب حسین ضیاء القادری بدایونی

۵-الکامل فی التاریخ، ابن الاثیر، مطبوعہ دار صادر، بیروت، ۱۹۸۲ء

۶- تاریخ فیروز شاہی، فارسی، ضیاء الدین برنی، مؤرخ، مصححہ: سرسید احمد خان، مطبوعہ: ۱۸۶۲ء از کلکتہ باہتمام کپتان ولیم ناسولیس و مولوی کبیر الدین احمد

۷-خزینۃ الاصفیا (فارسی) مرقومہ: ۱۲۸۱ھ، مطبوعہ نومبر ۱۹۱۴ء، مطبع منشی نول کشور، کان پور، یوپی

۸-رحلۃ ابن بطوطۃ، تحقیق طلال حرب، مطبوعہ: الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۲ء

۹-سیر الاولیا،سید محمد بن مبارک کرمانی،مترجم: ڈاکٹر عبداللطیف،۱۹۹۹ء،صدیقی اینڈ کمپنی

۱۰-فوائد الفواد،فارسی،مترجمہ خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی،،سن اشاعت ۲۰۰۷ء

۱۱-محبوب الٰہی،مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی،سلسلۂ بیت الحکمت،گھوسی

۱۲-معدن المعانی،ملفوظات مخدوم جہاں،شیخ شرف الدین احمد یحیی منیری قدس سرہ،مترجمہ سید شاہ قسیم الدین احمد بلخی فردوسی،ناشر:مکتبۂ شرف خانقاہ معظم،بہار شریف،۲۰۱۱ء

۱۳-مناقب الاصفیا،شعیب فردوسی،مترجمہ مولانا ڈاکٹر محمد علی ارشد فردوسی،ناشر:مکتبۂ شرف،نالندہ،۲۰۰۱ء

۱۴-منتخب التواریخ،از عبدالقادر بدایونی،ناشر: پبلی کیشن ڈویژن،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،مطبوعہ ۲۰۱۸ء،قدیم رسم الخط

نوٹ: محولہ تمام کتب فقیر قادری کے ذاتی کتب خانہ قادریہ میں موجود ہیں۔

○○○

مولانا سید سیف الدین اصدق

سلطان المشائخ رحمت الٰہی کا ایک وسیع شامیانہ

نیکی کی دعوت دینا اور برائیوں سے بچنا بچانا شریعت میں محبوب ومطلوب ہے۔قرآن نے اسی کو'' امر بالمعروف ونھی عن المنکر'' سے تعبیر کیا ہے۔اسی عظیم مقصد کی خاطر اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا اور نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد علمائے ربّانین کو خصوصی طور پر اس کا مکلف ٹھہرایا ہے۔چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:''كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ(سورہ آل عمران:۱۱۰)تم بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی ہدایت) کے لیے میدان عمل میں لایا گیا ہے،تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اور فرمایا گیا:'وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ(سورہ آل عمران:۱۰۴)اور تم میں سے ایک جماعت (اہل علم وفضل) ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی دعوت دے، بھلائی کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے، یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

قرآن کریم میں متعدد آیات کریمہ''امر بالمعروف ونھی عن المنکر'' کی اہمیت پر گواہ ہیں وہیں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ذخیرہ اس پر موجود ہے۔یہاں چند احادیث کی طرف اشارہ کافی ہوگا۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' انسان کو مال اور اہل وعیال کے فتنوں سے محفوظ رکھتا ہے۔(مسلم)

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا اجر وثواب مال صدقہ کرنے کے برابر ہے۔(مسلم)

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' قیامت کے دن انسان کے لیے بشارت اور بھلائی لے کر آئے گا۔(بزاز)

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' پر عمل کرنے والے کو ان تمام لوگوں کے نیک اعمال کے برابر ثواب ملے

گا جنھوں نے اس کے کہنے پر نیک عمل کیا۔(مسلم)

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' برائی سے روکنے کی طاقت نہ ہونے پر برائی سے دلی نفرت بھی انسان کے لیے باعث نجات ہے۔(ابوداؤد)

قرآن وحدیث کی اس روشنی میں حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی حیات مبارکہ نہایت تابندہ و درخشندہ اور''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کی مکمل آئینہ دار نظر آتی ہے۔آپ جس کی بیعت لیتے تھے اسے تمام گناہوں سے توبہ کراتے ،اللہ کے حکم اور رسول کی اطاعت کا عہد لیتے ،بے حیائی ،بد اخلاقی ،ظلم و زیادتی اور حقوق العباد کی پامالی سے بچنے کی تاکید کرتے تھے۔اخلاق حسنہ کی ترغیب دلاتے اور اخلاق رذیلہ یعنی تکبر،کینہ،حسد،بغض،حب مال وجاہ وغیرہ کی اصلاح کی طرف توجہ کرتے تھے۔ذکر الٰہی ،خلق خدا کی خدمت و خیر خواہی ،ایثار وقناعت ،صبر وتوکل اور نفع خلق کی تعلیم دیتے تھے۔آپ کی خانقاہ کا دروازہ بلاتفریق مذہب ہر ایک کے لیے کھلا رہتا تھا،جہاں سے ہر ایک ضرورت مند کی بھوک بھی مٹائی جاتی ،وظیفے بھی عطا ہوتے اور ان کے مسائل بھی حل کیے جاتے تھے۔وہ اپنے مریدوں کے علاوہ ہر آنے جانے والے کو وعظ و نصیحت کرتے ،ان کے دل میں اللہ ورسول کی محبت ،ان کی رضا وخوشنودی کا شوق اور اصلاح حال کا جوش پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ان کی تعلیم وتربیت ،اخلاق واخلاص ،جہد مسلسل اور فیض صحبت کا اثر جو معاشرے اور عام زندگی پر قائم ہوا اسے تاریخ کے صفحات سے لے کر ماتھے کی نگاہوں تک سے دیکھا جاسکتا ہے۔ہندوستان کے مشہور مؤرخ قاضی ضیا الدین برنی سلطان علاء الدین خلجی کے دور کے صوفیہ بالخصوص حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا کے ذریعہ لائے گئے روحانی انقلاب کی کیفیات کچھ اس طرح رقم کرتے ہیں:

''ایک دنیا ان کے انفاس متبرکہ سے روشن ہوئی ،اور ایک عالم نے ان کے بیعت کا ہاتھ پکڑا ،اور ان کی مدد سے گنہگاروں نے توبہ کی ،اور ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے بدکاریوں سے ہاتھ اٹھالیا اور ہمیشہ کے لیے پابند نماز ہوگئے اور باطنی طور پر دینی مشغلہ کی طرف رغبت ظاہر کی ،اور ان کی توبہ صحیح ہوگئی ،عبادات وریاضت ان کا معمول ہوگیا ،دنیا کی حرص ومحبت ان مشائخ کے اخلاق حمیدہ اور ترک وتجرید کے معاملہ کو دیکھنے سے دلوں سے کم ہوگئی ،ان بزرگوں کی عبادت ومعاملات کی برکت سے لوگوں میں سچائی پیدا ہوگئی''۔کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں:''عہد علائی کے آخری چند سالوں میں شراب ،معشوق ،فسق وفجور ،جوا ،فحاشی وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کے زبانوں پر نہیں آنے پایا ،بڑے بڑے گناہ لوگوں کے نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے تھے ،مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سودخوری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہوسکتے تھے ،بازار والوں کے جھوٹے بولنے ،کم تولنے اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا''۔(بحوالہ ہندوستانی مسلمان ایک جائزہ:ص:۴۷)

صوفیۂ کرام خود سے وابستہ افراد کو معاملات کی صفائی ،حق داروں کے حقوق کے تصفیہ ،اور اگر ان کے

ذمہ کسی کے مطالبات یا بقایا ہے تو اس کی ادائیگی کی شدید تاکید کرتے تھے۔

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کو بھی ان کے شیخ حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ نے تاکید فرمائی تھی کہ مخالفین کو خوش کرنے اور اہل حقوق کو راضی کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑنا، چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ جب میں اجودھن سے دہلی چلا تو مجھے یاد آیا کہ مجھ پر ایک شخص کی اتنی رقم باقی تھی اور ایک کتاب کسی سے مستعار لی تھی جو گم ہوگئی تھی۔

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ معاش کی بڑی تنگی تھی، کبھی پانچ جیتل (جیتل یا چیتل تانبے کا وہ سکہ جو اس زمانے میں رائج تھا) ہاتھ آئے اور کبھی دس۔ ایک مرتبہ دس جیتل ملے تو میں اسے لے کر اس شخص کے دروازے پر پہنچا، اس کو آواز دی، وہ باہر آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تمہارے بیس جیتل میرے ذمہ ہیں، ایک مرتبہ تو دینے کی طاقت نہیں یہ دس جیتل لایا ہوں اس کو لے لو، دس ان شاء اللہ اس کے بعد پہنچا دوں گا۔ اس شخص نے یہ سن کر کہا کہ ہاں! معلوم ہوتا ہے کہ تم مسلمانوں کے پاس سے آرہے ہو، اس نے وہ دس جیتل تو لے لیے اور کہا کہ میں نے دس جیتل معاف کیے۔

پھر میں اس شخص کے پاس گیا جس کی کتاب لی تھی، اس نے مجھے پہچانا نہیں، میں نے کہا کہ صاحب میں نے ایک کتاب آپ سے مستعار لی تھی وہ کھو گئی، اب میں اس کی نقل تیار کر کے آپ کو دوں گا، میں بالکل اسی طرح لکھوا کر آپ کو پہنچا دوں گا۔

اس شخص نے کہا کہ ہاں! تم جہاں سے آرہے ہو وہاں کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے۔ (فوائد الفواد، ص: ۱۴)

صوفیہ کرام اور بزرگان دین کی زندگی کے اس باب کی طرف عموماً ہماری توجہ کم ہوتی ہے، ہم ان کی زندگیوں میں کرامات اور حیرت انگیز واقعات کی تلاش میں ہی سرگرداں رہتے ہیں حالاں کہ ولایت کا جوہر کرامت میں نہیں بلکہ استقامت اور حسن معاملات میں ہے۔

ولایت تو بڑی چیز ہے عام انسان کی شرافت بھی عبادات نہیں، معاملات میں مضمر ہے۔ بڑے بڑے عبادت گزاروں کی گاڑیاں معاملات میں آکر پھنس جاتی ہیں۔ یہی وجہ کہ سیرت وتعلیمات صوفیہ میں معاملات کی بہت تاکید نظر آتی ہے، جو عین تعلیمات اسلام اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ہے۔ آج کے دور میں بالخصوص بزرگوں سے عقیدت ومحبت کے دعوے داروں کو ان کی کتاب زندگی کے اس حصہ کا خوب مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ ان کے خلوص وللّٰہیت اور حسن عمل سے کچھ حصہ انھیں بھی مل سکے۔

ہر عمل منسوب ہو جس کا خدا کے نام سے
کوئی اس انسان کو تسخیر کر سکتا نہیں

سماجی خدمات

اللہ کی مخلوق کو نفع پہنچانا اور بلا امتیاز دین و مذہب کی خدمت قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے بخوبی واضح ہوتی ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ـ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَانُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ (سورۃ الدھر:۹/۸) اوراس (اللہ) کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں، اور کہہ دیتے ہیں: ہم تمہیں محض اللہ کے لیے کھلاتے ہیں، تم سے بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔

صحیح البخاری کتاب الایمان میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ''اَیُّ الْاِسْلَامِ خَیْرٌ'' اسلام میں کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟ تو حضور نے فرمایا: □ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَءُ السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ'' کھانا کھلاؤ اور ہر جانے انجانے کو سلام کرو۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث پاک سے تو اسلام میں خدمت خلق کا تصور پوری طرح نکھر کر سامنے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ: ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، اور عرض کی، اے اللہ کے رسول! اللہ کے یہاں محبوب ترین کون ہے؟ اور کون سے اعمال اللہ کو زیادہ پسند ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اَحَبُّ النَّاسِ اِلَی اللّٰهِ، اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ یَكْشِفُ عَنْهُ كُرْبَةً، اَوْ یَقْضِیْ عِنْهُ دَیْناً، اَوْ یَطْرُدُ عَنْهُ جُوْعاً، وَلَاَنْ اَمْشِیَ مَعَ اَخٍ □ لِیْ فِیْ حَاجَةٍ □، اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ □ اَعْتَكِفَ فِیْ □ هٰذَا الْمَسْجِدِ مَسْجِدِ الْمَدِیْنَةِ شَهْراً'' (الترغیب والترھیب:۲۳۲۶) اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے، جو لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہے، مشکل دور کرتا ہے، قرض ادا کردیتا ہے، بھوک مٹاتا ہے اور کسی شخص کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس کے ساتھ چلنا، مجھے مسجد نبوی میں ایک ماہ کے اعتکاف سے بھی زیادہ پسند ہے۔

نزول وحی کی ابتدا میں جو نبی کریم ﷺ پر غیر معمولی رعب اور جلال خداوندی کے اثرات ظاہر ہوئے تھے، تو تسلی کے لیے آپ کی مونس و غم خوار، جاں نثار و فدا کار شریک حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ کی سیرت مبارکہ کے حوالے سے ایک تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ: ''كَلَّا وَاللّٰهِ مَا یُخْزِیْکَ اللّٰهُ اَبَدًا، اِنَّکَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ، وَتَقْرِی الضَّیْفَ، وَتُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ'' (صحیح بخاری، کتاب الوحی) ہرگز نہیں، خدا کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا ہے کہ اللہ آپ کو ذلیل ورسوا کردے، آپ تو رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں، تھکے ماندے کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں، غریب و لاچار کی ضرورتیں پوری کرتیں ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق و سچائی کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں۔

ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان چند جملوں میں گویا حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی پوری سیرت پاک کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ صوفیۂ کرام اور بالخصوص حضرت سلطان المشائخ کی زندگی میں اسی سیرت طیبہ کا جلوہ

دکھائی دیتا ہے۔ بلا شبہ آپ کی رگوں میں دوڑنے والے اس مقدس ومتبرک خون نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی اثر تھا۔ اسی وجہ کر آپ کی خانقاہ شکستہ دلوں کی ایسی پناہ گاہ تھی جس کی نظیر کم ملتی ہے۔ آپ کی آغوش شفقت ایسے تمام لوگوں کے لیے کھلی تھی جن سے خاندان، سوسائٹی اور حکومت تک نے منہ موڑ لیا تھا۔ جن کے اعزہ واقارب اور اولاد تک جواب دے دیتی وہ ان بزرگوں کے قدموں میں آ کر پڑ جاتے، اور گھر کا سارا آرام اٹھاتے، ہر مذہب وملت کا آدمی یہاں اپنے دل کی بے چینی اور دماغ کی الجھن دور کرتا اور غذا اور دوا، محبت اور قدر سب کچھ پاتا۔ آپ کے پیرومرشد حضرت شیخ العالم بابا فریدالدین گنج شکر قدس سرہ نے اپنی خانقاہ سے رخصت کرتے وقت فرمایا تھا کہ: ''تم ایک سایہ دار درخت ہوگے، جس کے سایہ میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی''۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ستر (۷۰) برس تک دہلی اور دور دراز کے گوشوں سے آنے والوں نے اس درخت کی گھنی چھاؤں میں آرام کیا۔

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے زمانے میں کسی شیخ وصوفی کی شہرت آپ سے بڑھ کر نہ تھی، آپ کی خانقاہ میں عوام وخواص کا رجوع اور ایک جم غفیر رہتا۔ خانقاہ کا دروازہ امرا وسلاطین کے لیے تو بند تھا مگر فقرا ومساکین کے لیے ہمہ وقت کھلا رہتا۔ غیر معمولی مرجعیت کے باوجود ہر عامی ومعمولی انسان کا آپ سے ملنا آسان تھا۔ خدام ومریدین کو تاکید خاص تھی کہ کوئی سوالی محروم نہ جائے۔

خود دائم الصوم تھے، لیکن دونوں وقت شاہی دسترخوان اور انواع واقسام کے کھانے وافر مقدار میں چنے جاتے، امیر وغریب، شاہ وگدا، شہری وپردیسی، صالح وگنہگار کسی کی تفریق نہ تھی، سب ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے، لے جانے کی بھی اجازت تھی۔ بعض لوگ کھاتے اور باندھ کر بھی لے جاتے، یہ شاہی دسترخوان اپنی نوعیت میں یکتا تھا اسی دسترخوان پر بیٹھ کر سیکڑوں ہزاروں غربا کو وہ کھانے نصیب ہوتے جن کے انھوں نے نام ہی نام سنے تھے، بڑے بڑے امراء دربار اور اعیان سلطنت کو بھی اس دسترخوان پر حاضری کی آرزو تھی اور اس کھانے کی لذت کو وہ یاد کرتے تھے۔

حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فتوحات کا یہ حال تھا کہ دولت کا دریا دروازے کے آگے بہتا تھا، کوئی دن فتوحات سے خالی نہ ہوتا، صبح سے شام تک لوگ آتے بلکہ عشا تک، مگر لینے والے لانے والوں سے زیادہ ہوا کرتے، اور جو کچھ کوئی لاتا اس سے زیادہ حضرت کی عنایت پاتا'' (خیرالمجالس، ص: ۲۰۲)

ایک مرتبہ جب آپ قیلولہ فرما رہے تھے کہ ایک درویش ملاقات کے لیے آیا، خدام نے اسے منع کردیا۔ ادھر وہ لوٹا اور ادھر آپ نے اپنے پیرومرشد حضرت بابا صاحب کی زیارت کی، اور فرماتے سنا: اگر گھر میں کھلانے کو کچھ نہیں ہے، تو مہمان کے ساتھ حسن رعایت تو ضروری ہے۔ یہ کیسی بات ہے ایک شکستہ دل واپس ہو جائے۔ آپ بیدار ہوئے تو اس شخص پر سخت خفگی کا اظہار کیا جس نے درویش کو لوٹا دیا تھا، فرمایا کہ تیری وجہ سے آج میں نے اپنے شیخ کو غصے میں دیکھا ہے۔ اس کے بعد آپ کی حالت یہ ہوگئی کہ جب قیلولہ سے بیدار ہوتے تو دو

باتیں سب سے پہلے پوچھتے، ایک یہ کہ زوال ہوگیا، دوسرے یہ کہ کوئی آیا تو نہیں، تاکہ اس کو انتظار نہ کرنا پڑے۔(سیر الاولیا:ص:۱۲۶)

مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں: اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیۂ اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں، ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے۔خود سلطان المشائخ کا کیا حال تھا گذر چکا کہ ولی عہد سلطنت خضر خان تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا۔علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا جس میں اسے مال گذاری داخل کرنی پڑتی تھی۔(نظام تعلیم وتربیت،ص:۲۱۴)

غرضیکہ آپ کے اخلاق کریمانہ اور شان جود وعطا کی بنا پر خانقاہ نظامیہ میں ہر طبقے کے لوگوں کا ایک جم غفیر اور ہجوم لگا رہتا تھا۔علامہ اقبال کا یہ شعر اس کی مکمل ترجمانی ہے ؎

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

حضرت محبوب الٰہی خود فرماتے ہیں کہ جو شخص بھی میرے پاس آکر اپنا درد دل بیان کرتا ہے، اس سے کہیں زیادہ تکلیف و درد اور فکر وتردد کا احساس مجھے ہوتا ہے۔اپنے مریدین ومعتقدین کی جماعت کو نصیحت کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا کہ ”مخلوق خدا کی دل داری سے زیادہ بازار قیامت میں کسی سودے کی پوچھ گچھ نہ ہوگی۔(سیر الاولیا،ص: ۲۸۔سیر العارفین)

گویا ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

ایک مجلس میں کسی نے عرض کیا حضور! لوگ آپ کے بارے میں کہتے ہیں کہ شیخ نظام الدین کو بڑا فروغ باطنی حاصل ہے، انھیں اس جہاں کی کوئی فکر ہی نہیں۔آپ نے فرمایا: ایں قدر غم واندوہ کہ مرا ہست ہیچ کس را دریں جہاں نیست، زیرا کہ چندیں خلق می آیند وغم واندوہ خویش می گویند، آں ہمہ بر دل وجان من نشیند عجب دلے باشد کہ غم برادر مسلمانان بشنود ودروے اثر نکند۔(تاریخ مشائخ چشت،ص:۴۹) ترجمہ: جس قدر غم واندوہ مجھے رہتا ہے اس جہاں میں کسی کو نہ ہوگا، میرے پاس اتنی مخلوق آتی ہے، ہر شخص اپنا دکھڑا سناتا ہے، اس کا بوجھ میری جان ودل پر پڑتا ہے، وہ عجب دل ہے کہ مسلمان بھائی کا غم سنے اور اس پر اس کا اثر نہ ہو۔غالباً اس شعر میں حضرت امیرؔ مینائی نے اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

سرکار محبوب الٰہی کے یہ الفاظ تو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں:

یکے خار نہد وتو ہم خار نہی ایں خار خار باشد۔میان مردماں ہم چنیں است کہ بانغزاں نغزای باکوزاں کوزی امامیان درویشاں ہم چنیں نیست کہ بانغزاں نغزیٰ باکوزاں ہم نغزیٰ (تاریخ مشائخ چشت،ص:۴۹) ترجمہ:اگر کوئی کانٹا رکھے اورتو بھی اس کے بدلے میں کانٹا رکھے تو کانٹے ہی کانٹے ہوجائیں گے۔عام لوگوں کا دستورتو یہ ہے کہ اچھے کے ساتھ اچھے اور برے کے بدلے برے ہوتے ہیں،مگر درویشوں کا دستور یہ نہیں ہے۔یہاں نیک اور بد دونوں کے ساتھ نیک ہونا چاہیے۔

آج جب کہ قتل وغارت گری اور دہشت گردی کا بازار گرم ہے،انسان انسان کے خون کا پیاسا ہورہا ہے اور دنیا امن وسکون کے لیے ترس رہی ہے،ایسے میں حضرت محبوب الٰہی کی صرف یہ تعلیم ہی ظلم وتشدد سے دوچار انسانیت کی نجات اور دنیا کو امن وشانتی،اطمنان وسکون اور پیار ومحبت کا گہوارہ بنانے کے لیے بہترین مشعل راہ ہے۔آپ کی فیاضی ،سخاوت اور دریادلی کے شہرے نے سلاطین وقت کو بھی حیرت واستعجاب میں ڈال دیا تھا بلکہ بعض بادشاہوں نے احساس کمتری کا شکار ہوکر آپ کے خلاف نہایت منفی اقدام تک کا ارادہ کرلیا تھا۔آخر یہ کیسی فقیری تھی کہ جس کے سامنے شہنشاہوں کے مال ومنال،جاہ وحشم اور عزت ومراتب ہیچ تھے۔حضرت اقبالؔ کے زبان میں بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے:

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہوتو دیکھ ان کو
یدبیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک

نبی رحمت ﷺ نے نہ صرف مسلمانوں کو آپس میں حسن سلوک سے پیش آنے کی تلقین کی بلکہ غیر مسلموں سے بھی حسن معاشرت کی تعلیم دی،اوراس کا خود بھی عملی مظاہرہ کرکے دکھایا۔غیر مسلم چاہے مہمان ہو یا پھر ہمسایہ ،مسلم ریاست کا شہری ہو یا باہر کا کوئی فرد،رسول گرامی ﷺ نے ان سے ہر حال میں نیک برتاؤ اور روادارانہ رویہ اپنانے کی تلقین وتعلیم دی ہے۔اللہ نے جہاں آپ کو رحمۃ للعالمین فرمایا وہیں آپ نے اپنے عملی نمونہ سے بھی خود کو رحمۃ للعالمین ثابت کیا ہے۔یہود حضور علیہ الصلاۃ والسّلام کی مخالفت میں بہت بڑھے ہوئے تھے اور اپنے شاطر دماغوں سے کوئی نہ کوئی طریقہ آپ یا آپ کے چاہنے والوں کو تکلیف دینے کا ڈھونڈھتے رہتے تھے لیکن رحمت عالم ﷺ نے ہمیشہ ان کو نرمی سے جواب دیا اور اپنے اصحاب کو بھی نرمی کی تلقین فرمائی۔آپ نے اپنے

بدترین دشمنوں کی بدسلوکی اور بدتمیزی کو بھی اپنے حسن اخلاق سے ماند کر دیا۔ وادیٔ طائف اور فتح مکہ کے موقع پر جورحم وکرم، مروت وحلم اور عفوودرگذر کے واقعات ہوئے ہیں، تاریخ انسانی اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔

صوفیہ کرام بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان ہی پیاری سنتوں کو دل وجاں سے اپنا کر انسانوں سے بلا تفریق مذہب وملت، نسل ونسب اور خاندان وقبیلہ محبت کرتے تھے۔ ان کے دکھ درد کو دور کرنے کا والہانہ جذبہ تھا۔ وہ خلق خدا کے لیے ایثار وقربانی کی لذت سے سرشار تھے۔ اس ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ عملی تصویر بن گئے تھے کہ ’’مخلوق خدا کا کنبہ ہے، خدا کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ سب سے بہتر معاملہ کرنے والا ہے‘‘۔ ’’**الخلق عیال اللہ و احبھم الی اللہ احسنھم لعیالہ**‘‘ (الطبرانی: ۱۰۰۳۳) ان کے سامنے حضور علیہ الصلاۃ والتسلیم کی رحمت بھری زندگی کی تصویر ہوتی تھی۔

بالخصوص چشتی بزرگوں نے ہند کی سرزمین پر مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ جس طرح رواداری، بھائی چارگی، حسن معاملات اور محبت وحکمت کا برتاؤ کیا، حقیقتاً یہی چیز اسلام کی روشنی کے پھیلنے کا یہاں ذریعہ بنی۔ اس مذہبی رواداری میں حضرت سلطان المشائخ کی ذات بڑی نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی آپ کی اس سیرت میں موجودہ دور کے اسلامی قائدین کے لیے بھی ایک قابل تقلید نمونہ موجود ہے۔ اس سلسلے میں چند واقعات نذر قارئین ہیں:

راج کمار ہردیو نامی ایک ہندو نوجوان جو دکن کے ایک راجہ کا بیٹا تھا مگر حضرت شیخ المشائخ کی ایک ملاقات اور آپ کی من موہنی باتوں نے اس کا دل جیت لیا تھا۔ وہ اکثر آپ کے پاس آتا اور آپ کی مجلسوں میں بیٹھ کر وعظ ونصیحت سے مستفیض ہوتا۔ اس نے ایک دن حضرت سے پوچھا: حضور! اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کو ایک ماننا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول مان لینا اسلام ہے۔ ہردیو نے کہا: بابا! مسلمان ہونا اتنا آسان ہے تو مجھے بھی مسلمان کر لیجیے۔ حضرت شیخ نے فرمایا: بس! تو مسلمان ہے، نہ تجھے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے کی ضرورت ہے اور نہ تجھے اپنا نام بدلنے کی ضرورت ہے۔ (ماخوذ روزنامچہ راج کمار ہردیو)

یہی راج کمار ہردیو ایک جگہ حضرت محبوب الٰہی کے لنگر کا کچھ اس انداز میں نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے: لنگر کا کھانا آ گیا اور دسترخوان بچھایا گیا تو میں نے اپنے ہندو قرابت داروں سے کہا: کیا تم نے مسلمانوں کا کھانا کھانے کا پرہیز توڑ دیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: مصیبت اور ضرورت سب کچھ کراتی ہے، جلاوطنی کے زمانے میں سب پرہیز ٹوٹ گئے، پھر بھی جہاں تک ہو سکتا تھا مسلمانوں کا کھانا نہ کھاتے تھے، مگر یہ کھانا تو دھرم گرو کے گھر کا ہے۔ یہ تو ہمارے لیے ہمارے گھر کے کھانوں سے بھی زیادہ پاک ہے۔ اس کے بعد ہم سب نے الگ الگ برتنوں میں ایک دسترخوان پر جمع ہو کر کھانا کھایا۔ اس وقت دسترخوان پر چار ہندو اور چار مسلمان تھے۔ (نظامی بنسری، ص: ۱۷۳) علامہ اقبال رحمہ اللہ غالباً اسی مفہوم کی حدیث پاک کو پیش نظر رکھ کر فرماتے ہیں۔

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو، خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

ایک دن ایک مسلمان ،ایک ہندو کو لے کر محبوب الٰہی کی بارگاہ میں حاضر ہوااور کہا کہ یہ میرا بھائی ہے،حضرت شیخ نے پوچھا: ایں برادر تو ہیچ میلے بمسلمانی دارد؟ (کیا تمہارا یہ بھائی مسلمانی سے کچھ رغبت رکھتا ہے؟) اس شخص نے عرض کیا: میں اسی غرض سے لایا ہوں کہ جناب کے نظر التفات سے وہ مسلمان ہوجائے، شیخ کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا: اس قوم پر کسی کے کہنے کا اثر نہیں ہوتا، ہاں! اگر کسی صالح مرد کی صحبت میں آجایا کریں تو شاید اس کی برکت سے مسلمان ہوجائیں۔ (سیر الاولیا، ص: ۳۲۱)

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک طرف نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح امت کے لیے اسلام سے دوری کا غم بھی ہے اور دوسری جانب اللہ کا فرمان پیش نظر ہے کہ ''دین میں کوئی زبردستی نہیں'' (البقرہ: ۲۵۶) یہی وجہ ہے کہ تاریخ صوفیہ میں ایک نظیر بھی ایسی نہیں پیش کی جاسکتی کہ قبول اسلام کے لیے کسی پر ایک ذرا بھی دباؤ بنایا گیا ہو۔

حضرت شیخ المشائخ نے جمنا کے کنارے رہنے والی ایک (ہندو) بوڑھی عورت کو دیکھا کہ وہ ایک کنویں سے پانی نکال رہی ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا: جمنا ندی کا پانی چھوڑ کر اتنی تکلیف ومشقت کیوں اٹھاتی ہو؟ اس نے جواب دیا: حضور! شوہر بیمار ہے اور گھر کا خرچہ مشکل سے چل رہا ہے، جمنا ندی کے پانی سے بھوک زیادہ لگتی ہے، اس لیے ہم کنویں کا پانی پیتے ہیں۔ آپ یہ سن کر رو پڑے اور خانقاہ آکر اپنے خادم خاص اقبال کو کہا کہ غیاث پور میں ایک عورت کے ساتھ یہ معاملہ ہے۔ جاؤ اس سے پوچھو کہ ماہانہ خرچ میں اس کے کتنا خسارہ رہتا ہے! اتنا خرچ اسے خانقاہ سے دیا کرو اور اس سے کہنا کہ وہ جمنا ہی کا پانی پیا کرے۔ (جوامع الکلم قلمی، ۸۷ الف)

اہل وطن سے مذہبی رواداری اور بے تعصبی کے جذبات کا بہترین آئینہ دار حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سے منسوب یہ واقعہ بھی ہے کہ: ایک دن صبح کے وقت اپنے جماعت خانہ کی چھت پر آپ چہل قدمی اور ہواخوری میں مشغول تھے، طبیعت پر کیف وسرور کا غلبہ تھا، سر پر آپ کے ٹوپی ٹیڑھی رکھی تھی اور آپ کے ساتھ آپ کے محبوب مرید حضرت امیر خسرو بھی موجود تھے۔ آپ کی نظر اپنے پڑوس کے کچھ ہندوؤں پر پڑی جو اپنے بتوں کی پوجا پاٹ اور اشنان ودرشن میں مشغول تھے، یہ دیکھ کر آپ کی زبان اقدس سے بے ساختہ نکلا:

ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے

(یعنی ہر قوم نے اپنا ایک دین اور قبلہ گاہ منتخب کرلیا ہے)

یہ سن کر حضرت امیر خسرو نے بھی آپ کی طرف دیکھتے ہوئے برجستہ کہا:

من قبلہ راست کردم بر سمت کج کلاہے

(میں نے بھی راہِ طریقت میں اپنا مرکز توجہ ایک کج کلاہ کو بنالیا ہے) (تاریخ مشائخ چشت)

مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے اس دور میں حضرت سلطان المشائخ کا یہ جملہ ظلم وجبر کی نفی اور اسلام کے تصور رواداری کو پیش کرنے والا ہے۔افسوس یہ ہے کہ تقریباً سوڈیڑھ سو سالوں سے مسلمانوں کے اندر حسن اخلاق، وسعت ظرفی، آپسی رواداری، وسیع المشربی اور انسان دوستی کا تصور ایسا روبہ زوال ہوا کہ جیسے بس! ایک کائنات سمٹ کر رہ گئی۔غیر مسلموں سے مخلصانہ کے بجائے معاندانہ رویہ ہم نے اختیار کیا۔مائل کرنے کے بجائے ہم قائل کرنے پر اتارو ہوگئے۔نفرت کی آگ کو محبت کے پانی سے نہ بجھا کر، خود ہم نفرت کے سوداگر بن گئے۔ دعوتی حکمت کی جگہ ہم نے فتویٰ کی زبان اختیار کر لی۔ان بزرگوں کی وسیع القلبی اور دعوتی مزاج وحکمت ہمیں آج بھی حاصل ہو جائے تو ہندوستانی ماحول میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

چشم فلک نے ہمیشہ دو طرح کی بادشاہی دیکھی ہے۔ایک وہ بادشاہ ہیں جو انسانوں سے اپنی ملوکیت کا خراج لیتے ہیں۔مظلوموں اور بے کسوں کو اپنے تیغ سے ڈرا کر ان پر حکومت کرتے ہیں۔طاقت شاہی اور جبر وتشدد کا مظاہرہ کر کے اپنی فرماں روائی کا سکہ جاری کرتے ہیں۔اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ہر قسم کی خود غرضی، حرص وہوس ، بے انصافی اور وحشت وبربریت کو روا رکھتے ہیں۔ان شاہان کج کلاہ کا ایک ہی مقصود ہوتا ہے کہ ان کی حکومت کسی بھی طرح غیر مستحکم نہیں ہونی چاہیے۔زوال کا خوف انھیں ہر لحظہ جابرانہ عزائم بروئے کار لانے پر مجبور رکھتا ہے۔

دوسری بادشاہی ان درویش خدا مست کی ہوتی ہے جو وحشت وبربریت کے صحراؤں میں محبت کے گلاب اگاتے ہیں۔ظلم وستم کی چکی میں پستی انسانیت کو صبر وقرار کی دولت عطا کرتے ہیں۔کفر وضلالت کے ظلمت کدوں میں ایمان کے چراغ روشن کرتے ہیں ۔اجڑے ہوئے شہروں اور ویران ملکوں کو زندگی کا پیغام عطا کرتے ہیں۔جبر وتشدد اور خود غرضی ومفاد پرستی کی مسموم فضاؤں میں روحانی لطافتوں کی خوشبو تقسیم کرتے ہیں۔ بندوں کو خدا سے ملا کر انھیں آلائش دنیا اور حرص وہوس سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔

دنیاوی سلاطین انسانوں پر حکومت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر ان کی حکومت انتہائی عارضی اور ناپائیدار ہوتی ہے۔یہ جسموں، شہروں اور ملکوں میں حکومت کرتے ہیں جب کہ اولیائے کرام ذہنوں اور دلوں پہ حکومت کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ شہنشاہوں کا اقتدار حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے مگر ان صوفیۂ عظام کی شان وشوکت اور محبت وعظمت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔یہ تلواروں سے نہیں اخلاق مصطفوی اور نگاہ کیمیا گر کی اثر سے دلوں کو فتح کرتے ہیں، اور: ع- جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

خوف ودہشت، جبر وجارحیت اور سفا کی وشقاوت کے ذریعہ سروں کو تو جھکایا جا سکتا ہے مگر دلوں کو جھکانے کے لیے اسلام وایمان، یقین وعرفان اور اخلاق واحسان کے ساتھ جلووں کی کشش، کردار کی پاکیزگی اور سیرت کا جمال چاہیے ۔

صرف سر جھکانے سے سروری نہیں ملتی
دل جہاں پہ جھک جائے وہ مقام عالی ہے

ہندوستان وہ سرزمین ہے جہاں سات سو سال سے زیادہ عرصے مسلمانوں کی سطوت وشوکت کے پرچم لہراتے رہے۔اس کے چپے چپے پر آج بھی اسلامی آثار کے جلوے بکھرے پڑے ہیں،اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سرزمین ''ہند'' کو دنیا کے نقشے پر ابھارنے میں مسلم سلاطین کا اہم رول رہا ہے۔انھوں نے ہر اعتبار سے اس زمین کو بہت کچھ دیا ہے۔اب یہ دوسری بات ہے کہ مسلمانوں کے زوال وانحطاط کے اس دور میں مسلم سلاطین کی کردارکشی کی ایک مہم چل پڑی ہے، تاریخ کو مسخ کیا جارہا ہے،اور وطن عزیز کے جغرافیہ کو تبدیل کرنے کی سازشیں رچی جارہی ہیں۔جب کہ ہماری صورت حال یہ ہے کہ بس! تحریر وتقریر اور ادب وشاعری کی محفلوں میں اپنی عہد زریں کو یاد کرکے واہ واہی اور داد وتحسین کے شورغوغا میں مست ہیں ۔

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ طنز نہ کر
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں

''پدرم سلطان بود'' کے یہ نعرے دراصل مسلمانوں کی لاچاری وبے بسی کی آواز ہے۔لیکن اسی ہندوستان کی سرزمین پر ان صوفیہ اور اولیا نے ایسی حکومت کی کہ ان گدڑی پوشوں اور پھٹی ٹوپی والوں کے سامنے شاہان زمانہ اپنی جبین نیاز خم کیے نظر آئے۔طوطی ہند حضرت امیر خسرو نے اپنے پیر ومرشد سلطان المشائخ کی ہی شان یوں بیان کی ہے ۔

در حجرۂ فقر بادشاہی
در عالم دل جہاں پناہی
شاہنشۂ بے سریر و بے تاج
شاہانش بہ خاک پائے محتاج

مسلم بادشاہوں کے کردار کو مسخ کرنے والوں میں آج تک یہ جرأت نہ ہوسکی کہ وہ ان مقدس ہستیوں کے کردار وعمل پر انگلی رکھ سکیں۔آپ دارالحکومت دہلی جائیں تو دیکھیں ہندوستان کا عظیم فرماں روا ہمایوں انتہائی طویل وعریض جگہ کا احاطہ کیے اپنی قبر میں مدفون ہے۔عوام وخواص وہاں جاتے ہیں مگر بغرض تفریح، وہ آثار قدیمہ اور فن تعمیر کا نادر نمونہ دیکھنے جاتے ہیں۔وہ بادشاہ وقت جس کے دربار میں بڑے بڑے سورماؤں کا پتہ پانی ہوتا تھا ،آج اس کی قبری دربار میں ہرا یرا غیرا سینہ تان کر آرہا ہے۔اکڑ کر گردن اٹھا کر چل رہا ہے۔قبر ہمایوں سے گویا آج یہ سسکیاں صاف سنائی دیتی ہیں ۔

برمزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

لیکن وہیں سڑک کی دوسری جانب ایک تنگ سی گلی جاتی ہے۔جس سے گزر کر ایک خاص مقام تک لوگ چلے جارہے ہیں ۔ جانے والوں میں کسی ذات پات ،رنگ ونسل ،امیروغریب اور دین ومذہب کی قیدنہیں ۔ جی ہاں !وہ سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ کی بارگاہ میں حاضر خدمت ہونے جارہے ہیں۔ جہاں گردنیں خم ہیں،نظریں جھکی ہیں،عقیدتوں کے پھول ہیں،نیازمندی کے نذرانے ہیں۔حوادثات زمانہ نے شاہوں کے نام مٹادیئے ۔ان کے جاہ وحشم کے پرچم سرنگوں ہوگئے،ان کے رعب ودبدبے قصۂ پارینہ بن گئے۔آج نام ورترین شاہوں کے نشانِ مدفن بھی نہیں ملتے ۔مگر متعدد بادشاہوں کی حکومت دیکھنے والے حضرت نظامؒ کی سطوت وشوکت کا پرچم اب بھی لہرارہاہےاوران شاءاللہ رہتی دنیا تک لہراتا رہے گا۔سچ کہا شاعر مشرق علامہ اقبال نے ؎

کافر ہے مسلماں نہ تو شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

ooo

رفعت رضا نوری

سلطان المشائخ کا خانقاہی نظام

تصوف اطاعت و اتباع رسول، تزکیہ نفس، حسن خلق اور خدمت خلق سے عبارت ہے اور جن کے اندر یہ اوصاف موجود ہوں انہیں ہی صوفی کہا جاتا ہے۔ گویا تصوف اسم اور رسم کا نام نہیں بلکہ معنی اور حقیقت کا نام ہے جس میں شریعت کی پاسداری کے ساتھ اضافی عبادات ہیں۔ اہل تصوف کے یہاں صرف مراسم کی پابندی نہیں، بلکہ اصلاً مصالح اور مقاصد شرع کی پابندی، لفظ نہیں بلکہ حقائق و معانی کی دنیا تک رسائی، زاہدانہ تقشّف کے بجائے حکیمانہ جد و جہد، شر کو احسن طریقے سے دفع کرنا شامل ہے۔ ان اوصاف کا حامل صوفی جہاں اپنا مقام اختیار کر لیتا ہے وہی اس کی خانقاہ کہلاتی ہے۔ اور جس جگہ بیٹھ کر وہ بادہ خواروں کو توحید و معرفت کا جام پلاتا ہے وہی اس کا میخانہ کہلاتا ہے۔ خانقاہ عمارتوں کے تسلسل، گنبد و مینار کی چمک اور واردین و نازلین کے ہجوم کا نام نہیں بلکہ اس کارخانے کا نام ہے جہاں اولیا پیدا کیے جاتے ہیں، لفظ بدل سکتے ہیں انہیں رباط، دائرہ، زاویہ اور کہیں تکیہ یا کسی اور لفظ کا لباس پہنایا جاسکتا ہے مگر حقیقت سب کی ایک ہے۔

خانقاہ کیا ہے؟

خانقاہ کی لفظی تشریح میں اہل علم مختلف ہیں، پروفیسر خلیق نظامی نے مصباح الہدایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ لفظ خانگاہ کا معرب ہے جس کے معنی کھانے کی جگہ، جب کہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی قدس سرہ نے فرمایا ''یہ لفظ خان اور قاہ سے مرکب ہے، خان بمعنی خانہ، اور قاہ بمعنی عبادت یا دعا۔ یعنی ''عبادت خانہ''۔ (خیر المجالس مجلس:۷۵)

خلیق نظامی نے آپ کی رائے کو درست قرار دیا ہے۔ ایک بار اسی لفظ پر گفتگو فرماتے ہوئے راقم کے پیرو مرشد شیخ ابو سعید دام ظلہ نے فرمایا کہ ''یہ دو لفظوں سے بنا ہے خان، اور گاہ۔ فارسی میں خان: رئیس، امیر، پیشوا کے معنی میں آتا ہے اور رشد و ہدایت اور لطائف و کشف رکھنے والے اہل اللہ کے لیے لفظ خان آتا ہے۔ اور گاہ؛ جگہ کے معنی میں آتا ہے۔ ترک بادشاہوں کا لقب خان ہوتا تھا۔ اب خانقاہ کا مطلب ہوا: وہ جگہ جہاں اہل ہمت رجال اللہ، ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت کے لیے سکونت اختیار کرتے ہیں مخلوق کی ہدایت و رہنمائی کے لیے

اقامت اختیار کرتے ہیں وہی جگہ ان کی خانقاہ کہلاتی ہے۔ پھر فرمایا کہ یہی لوگ تو حقیقی معنی میں خلق کی جانب بادشاہ بے نیاز اور دین کے پیشوا ہوتے ہیں۔''

خانقاہیت و درگاہیت

یہ ایک حقیقت ہے کہ تبلیغ دین، معاشرے کی اصلاح، خدمت خلق میں صوفیہ کی خانقاہوں اور خانقاہی نظام کا بنیادی کردار رہا ہے، تاریخ کے اوراق پلٹیں تو اندازہ ہوگا اسلام کی شمع بجھانے کے لیے ظلم کی آندھیاں چلی ہیں، اسلام کا رنگ روپ دھار کر یزید و حجاج کی ظلم و زیادتیاں ہوئی ہوں یا غیر اسلامی شکل میں تاتاریوں کی یورش، ہر محاذ پر صوفیہ کی جماعت نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور دینی اقدار کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ مزید طاقت کے ساتھ دعوت و تبلیغ کے کاز کو بھی آگے بڑھایا۔ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ (م ۶۱۸ ھ) نے یورش تاتار کا مقابلہ کرتے ہوئے شہادت کا جام نوش فرمایا، لیکن تاریخ کا دوسرا رخ یہ ہے کہ آپ ہی کے خلفا کی کوششوں سے تاتاری مسلمان ہوئے ،حضرت سیف الدین باخرزی (۶۵۹ ھ) خلیفہ شیخ نجم الدین کبری کے ہاتھ پر ایک سپہ سالار برکہ بن توشی بن چنگیز خان اپنے تمام سپاہیوں کے ساتھ مسلمان ہوگیا اور دین کے محافظ بن گئے، گویا صنم خانے سے کعبے کے محافظ پیدا کرنے والے یہی صوفیہ کرام رہے ہیں۔

دوسری طرف ہمیں یہ دردناک حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ صوفیہ کی جماعت نے اپنے انداز فکر، حسن خلق اور صلح پسندانہ کردار کے ذریعے جس شجر اسلام کو ہرا بھرا رکھنے اور اس کو توانا رکھنے کے لیے اپنا خون جگر صرف کیا تھا، ہم نے اس کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اہل خانقاہ اپنی جن خوبیوں اور اوصاف کی وجہ سے معروف تھے، عہد رسالت سے دوری اور زمانے کی نیرنگیوں کے سبب ایک ایک کر کے سب رخصت ہوتی گئیں، بس نام ہی نام رہ گیا اور حقیقت گم ہوگئی۔

کل خانقاہ اپنے جس پاکیزہ اوصاف کے لیے معروف تھی یعنی رہنماؤں اور پیشواؤں کے رہنے کا مقام، جنہیں قرآن میں **رجال لا تلهيهم تجارة و لا بيع عن ذكر الله**۔ (النور/ ۳۷) سے یاد کیا گیا ہے۔ وہ آج تجارتی آماجگاہ بن گئی ہے۔ عصر حاضر میں جہاں مالداروں کا انتظار کیا جاتا ہے، جہاں تعویذ اور گنڈوں کے نام پر روزی روٹی چلتی ہے، جہاں گمراہوں کو ہدایت دینے کے بجائے چند ٹکوں پہ جنت عطا کی جارہی ہے۔ ایسے سستا سودا بازوں کی وجہ سے خانقاہیت اپنی اصلی حقیقت و معنویت کھو چکی ہے اور وہ پورے طور پر درگاہیت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ آج کی درگاہیت میں حقیقی روحانیت نہیں بلکہ اسی نام پر دنیا کی سودے بازی ہے۔

سلطان المشائخ کا خانقاہی نظام

حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی قدس سرہ نے اپنے حقیقی بھانجے خواجہ تقی الدین نوح کو خاص مریدوں کے سامنے خلافت سے سرفراز فرمانے کے بعد وصیت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

''جو کچھ (فتوحات) تمھیں ملے اسے ذخیرہ نہ کرنا اور اپنے پاس کچھ نہ رکھنا اور خرچ کر دینا۔ اگر تمھارے پاس کچھ نہ ہو تو اپنے دل کو ملول نہ کرنا کہ خدا تم کو بہت دے گا۔ کسی کی برائی نہ چاہنا اور کسی کے لیے بددعا نہ کرنا۔ جفا کا جواب عطا سے دینا۔ بادشاہوں اور حاکموں کی جانب سے گاؤں یا وظیفہ قبول نہ کرنا کہ درویش اپنے اقرار کا پابند ہوتا ہے اور وہ وظیفے لے کر خوار نہیں ہوتا۔ اگر تم نے ان باتوں کی پابندی کی تو شاہان وقت تمھارے دروازے پہ آئیں گے۔'' (سیر الاولیا (مترجم)، ص: ۳۴۶)

اس کا پس منظر تو خاص ہے مگر وصیت کے کلمات اور معانی سب کے لیے درس عبرت ہیں۔ حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی قدس سرہ کے درج بالا وصیت کے کلمات پر غور و فکر کیا جائے اور آپ نے اپنے عہد میں عملی طور پر جس خانقاہی نظام کا اجرا اور نفاذ کیا تھا اس کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ شیخ نے بڑی جامعیت، اختصار اور بصیرت کے ساتھ اپنے خانقاہی نظام کو اپنی مذکورہ وصیت میں سمو دیا ہے۔ موجودہ عہد کے خانقاہی نظام پر غور کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ جن جن چیزوں سے سلطان المشائخ نے منع فرمایا تھا انہیں پہ سارا جھگڑا ہے، سبھی مسندوں کے دعویدار ہیں۔ اکثر درگاہوں میں تولیت کے جھگڑے زوروں پر ہیں۔ خیر کی تبلیغ کے لیے کوئی نہیں جھگڑتا، محض اپنے نفس اور دنیا کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ چند کو چھوڑ کر درگاہوں میں یا تو مجاور ہیں یا گورکن۔ اس معکوس روحانیت نے تصوف کو حقائق و معارف سے نکال کر روایات، رسومات بلکہ خرافات میں گم کر دیا ہے۔

خانقاہیت کی درگاہیت میں تبدیلی اور درگاہیت کی مجاوریت میں تبدیلی نے پورے صوفی نظام (Spiritual System) کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اور الجھاؤ اور بیزاری پیدا کر دی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ہم حقیقی صوفیہ کی زندگی، ان کی سیرت، ان کی حکمت و بصیرت، ان کے اخلاق و اعمال اور ان کے خانقاہی نظام کو دوبارہ زندہ کریں، اور ان کی روحانیت کی بازیافت کے طریقوں پر غور کریں۔ آج ضرورت ہے کہ ہم زمانے کے تقاضوں اور لوگوں کی نفسیات سے ہم آہنگ صوفی سسٹم کو لوگوں کے سامنے عیاں کریں، اہل ہند کے لیے پانچ خواجگان چشت کا خانقاہی نظام یقیناً رول ماڈل ہے خواجہ خواجگاں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ، حضرت قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر قدس سرہ، محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ اور چراغ دہلی حضرت نصیر الدین قدس سرہ۔ برصغیر کے تقریباً تمام سلاسل میں ان خواجگان کا فیضان جاری ہے۔ اس لیے یہ پانچوں حضرات ہمارے لیے حجت و دلیل ہیں۔ ان پانچ نفوس میں حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی قدس سرہ کی خانقاہ کی تفصیلات زیادہ دستیاب ہیں اور مستند بھی، اس لیے آئندہ صفحات میں آپ ہی کی خانقاہی نظام پر روشنی ڈالیں گے۔ آپ کے خانقاہی نظام سے آپ کے پیران عظام کا خانقاہی نظام از خود عیاں ہو جائے گا۔

راہ سلوک کی تربیت

تمام مشائخ کی زندگی اوران کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے ہر مرید کی اس طور پر تربیت کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے راستے پر گامزن رہے، احکامات کی پابندی، فرائض وواجبات، سنن اور مستحبات میں پختگی کے ساتھ راہ حق کا مسافر رہے اور اخلاق رذیلہ سے اپنے کو دور رکھے۔ اگر سالک اوامر کی پابندی اور نواہی سے بچتا ہے، اور مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرتا رہے تو وہ سالک راہ حق ہے، اس حد تک سالک کو چلتے رہنا واجب ہے، حضور سلطان جی نے فرمایا مومن کبھی ایک حال پہ نہیں رہتا ایمانی کیفیات میں اضافہ ہوتے رہنا چاہیے اس لیے سالک کو ہمہ دم ترقی کرتے رہنا چاہیے اگر رک گیا تو واقف ہے اور دوبارہ پچھلی حالت کی طرف لوٹ گیا تو راجع ہے اور گناہوں میں دوبارہ ملوث ہو گیا تو ہالک ہے اسے فوراً تجدید توبہ کر لینی چاہیے۔ مشائخ سب کی نگرانی کرتے ہیں اور حسب حال نظر کرم فرماتے رہتے ہیں اور جس کے لیے جو دوا اور جیسا پرہیز مناسب سمجھتے ہیں انتخاب فرمادیتے ہیں، ان کا کام دلوں کی نگہبانی کرنا اور خود کو یاد حق میں مشغول رکھنا ہے۔ چوں کہ ہر سالک کا شاکلہ بھی جداگانہ ہوتا ہے اس لیے شیخ اسی انفرادی شاکلے کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ فرماتا ہے۔ البتہ درجات کے اعتبار سے کون اعلی ہے اور کون ادنی ہے یہ شیخ کا کام نہیں۔ اس کی حقیقت اللہ بہتر جانتا ہے، قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا۔ (بنی اسرائیل/۸۴) (فرمادیں: ہر کوئی اپنی شاکلہ پر عمل پیرا ہے، اور آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ سب سے سیدھی راہ پہ کون گامزن ہے)

آغاز سلوک کے لیے سید الطائفہ حضرت خواجہ جنید بغدادی نے آٹھ شرطیں بیان فرمائی ہیں جنہیں شیخ قطب الدین دمشقی نے اپنی کتاب الرسالۃ المکیہ میں نقل فرمایا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱-سالک طہارت کا پابند رہے۔ ۲-ہمیشہ روزہ رکھے۔ ۳-اکثر اوقات خاموش رہے۔ ۴-خلوت اختیار کرے۔ ۵-ذکر کی پابندی کرے۔ ۶-تمام واردات کی نفی کرے۔ ۷-اپنے شیخ کے ساتھ اپنے دل کا رشتہ جوڑے رکھے۔ ۸-رب تعالی کی طرف سے جو بھی پہنچے خواہ وہ نقصان دہ ہوں یا نفع بخش ان پر راضی رہے اور اعتراض نہ کرے۔ (الرسالۃ المکیۃ، ص: ۱۰۷ تا ۱۱۹)

سلطان المشائخ محبوب الٰہی قدس سرہ کے خلفا اور مریدین میں سلوک کے مذکورہ سارے اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے اور آپ سے تعلق رکھنے والے نفوس محبت و درد دل سے معمور تھے۔ تقریباً سبھی صوفیہ نے مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کو راہ ہدایت کی اہم کڑی بتائی ہے۔ اس حوالے سے نبی کریم کی سیرت کے واقعات اور آپ کے ارشادات کثرت سے کتب حدیث وسیر میں موجود ہیں، سلطان المشائخ کی زندگی اور اقوال دونوں سنت نبوی کے آئینہ دار ہیں اور آپ اس پہلو پر کافی زور دیتے ہیں، آپ اسے طاعت متعدیہ بتاتے تھے۔ خواجہ امیر حسن علا سجزی جامع فوائد الفواد رقم طراز ہیں:

(ایک بار) کچھ اس کا ذکر ہوا کہ سلوک کی اصل کیا ہے اور جو مغز معانی ہے وہ کیا ہے۔ اس درمیان ارشاد ہوا کہ ایک شخص خواجہ اجل شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا اور مرید ہو گیا۔ (پھر) خواجہ کے فرمان کا منتظر رہا کہ نماز روزے اور اوراد کے سلسلے میں کیا حکم فرماتے ہیں۔ خواجہ نے صرف اتنا فرمایا کہ جو اپنے لیے پسند نہیں کرتے ہو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کرو اور اپنے لیے وہی چاہو جو دوسروں کے لیے چاہتے ہو۔ الغرض یہ شخص واپس چلا گیا اور ایک مدت کے بعد پھر خواجہ اجل شیرازی علیہ الرحمہ کی خدمت میں آیا۔ اور عرض کی کہ اس روز حضور سے مرید ہو کر منتظر تھا کہ خواجہ مجھ سے نماز اور اوراد کے بارے میں فرمائیں گے مگر (کوئی) حکم نہ ہوا۔ آج پھر منتظر ہوں۔ خواجہ نے پوچھا اس روز تمہارا سبق کیا تھا؟ مرید حیران ہوا اور کچھ جواب نہ دیا۔ خواجہ نے تبسم فرمایا اور ارشاد ہوا اس روز میں نے تم سے کہا تھا کہ جو کچھ اپنے لیے پسند نہیں کرتے، دوسرے کے لیے بھی پسند نہ کرو اور اپنے لیے وہی چاہو جو کسی غیر کے لیے چاہتے ہو۔ تمھیں یہ بات یاد نہیں رہی، پس جب پہلی مشق ہی درست نہیں کی تو دوسری مشق کیسے کراؤں؟ (فوائد الفواد، ص:۱۵۹، ۱۶۰)

سلوک کے حوالے سے حضرت سلطان المشائخ کے متعدد ملفوظ فوائد الفواد اور دیگر کتب میں مروی ہیں، سر دست سالک، واقف اور راجع سے متعلق اقتباس درج کرتا ہوں:

سلوک کا ذکر آیا، فرمایا کہ چلنے والا کمال کی طرف رخ رکھتا ہے، یعنی سالک جب تک سلوک میں ہے، کمالیت کا امیدوار ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ سالک ہوتا ہے، اور واقف ہوتا ہے اور راجع۔ چنانچہ سالک تو وہ جو راستہ چلتا ہے۔ اور واقف وہ ہے کہ جس کو وقفہ پڑتا ہے۔ بندے نے عرض کیا کہ کیا سالک کو بھی وقفہ پڑتا ہے؟ فرمایا ہاں! جب سالک کے طاعت میں کوئی فتور پڑتا ہے، جیسے کہ طاعت کا ذوق نہ رہے تو اس کے لیے وقفہ ہوتا ہے۔ اگر جلدی ہوشیار ہو جائے اور حق کی طرف رجوع ہو تو پھر سالک ہو سکتا ہے اور اگر خدا کی پناہ اسی (حال) میں جما رہے تو اس کا خطرہ ہے کہ راجع ہو جائے۔ اس کے بعد اس راہ کی لغزشوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس کی سات قسمیں ہیں۔ اعراض، حجاب، تفاصل، سلب مزید، سلب قدیم، تسلی، عداوت،، ان قسموں کی تفصیل اور تمثیل بھی بیان فرمائی۔ (فوائد الفواد، ص:۱۸۹)

آپ کی سیرت میں یہ واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ مجھے ایک خط دیا گیا جس میں لکھا تھا کہ جب تک اور جتنا ممکن ہو لوگوں کے دلوں کو آرام پہنچاؤ کیونکہ مسلمان کا دل حقیقت میں خدا کے ظہور کا مقام ہے۔ بازار قیامت میں کوئی سامان اتنا مقبول نہ ہوگا جتنا دلوں کو آرام پہنچانا مقبول ہوگا۔ (سیر الاولیا، ۲۴۳)

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ سلوک کے سو درجات ہیں۔ جن میں سترہویں درجے ہی میں کشف و کرامت کا صدور ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر سالک اسی میں رہ جائے تو باقی ۸۳/ درجوں کا حصول کب کرے گا۔ اس لیے فقیر کو اپنی نظر کشف و کرامت تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ (سیر الاولیا، ص:۴۶۹)

منقول ہے کہ ایک مرتبہ شیخ العالم بابا فرید الدین گنج شکر قدس سرہ نے مخصوص حالت میں ارشاد فرمایا کہ:
''سلوک کے راستے پر مستعد رہنے کے لیے مجاہدہ کرتے رہنا چاہیے۔'' سلوک کی راہ میں ہر معاملے میں سنت رسول کی اطاعت واتباع ہی کل اثاثہ ہے۔ سلطان المشائخ نے اپنے اصحاب اور اخوان کو تاکید کی تھی کہ مستحبات و آداب بھی فوت نہ ہوں۔

(سالک کو چاہیے کہ توبہ پر) ''استقامت کے ساتھ اختیار کریں، کیونکہ سلوک کی راہ سے اسی وقت گذارا جا سکتا ہے کہ سالک کا مقصد طلب جاہ وکرامت نہ ہو، اس راہ میں جو استقامت مطلوب ہے وہ رسول اللہ کی اتباع ہے اور اس پر مضبوطی وثابت قدمی اس حد تک ہونی چاہیے کہ کوئی مستحب اور آداب بھی ترک نہ ہونے پائے۔'' (سیر الاولیا، ص:۴۳۹)

سلوک کے حوالے سے آپ کی سیرت اور ارشادات مشائخ عصر کے لیے سراپا مشعل راہ ہیں۔ مشائخ در اصل مسند ارشاد پہ اسی لیے فائز کیے جاتے ہیں تاکہ ناقصوں کو کامل اور کاملوں کو رہنما بنائیں۔ محبوب الٰہی نے کتنے نفوس کے سلوک کی تکمیل کی یہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آپ کی زندگی ہمارے لیے سراپا نمونہ عمل ہے مگر شومی قسمت کہ اہل خانقاہ ان کا نام تو لیتے ہیں مگر وہ ان کی راہ کا مسافر نہیں بننا چاہتے۔ الا ماشاء اللہ۔

علم ومعرفت کا فروغ

علم کی اہمیت وضرورت سے کسی کو انکار نہیں، اس کا حصول دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کے لیے ہر فرد انسانی پر لازم ہے، مشائخ اس پر بہت زور دیتے تھے۔ ہم نے اپنے شیخ مرشد ابوسعید دام ظلہ سے بارہا مجلس میں سنا کہ ''اللہ کسی جاہل کو ولایت نہیں عطا فرماتا اور جسے ولایت عطا فرماتا ہے اسے جاہل نہیں رکھتا۔'' البتہ حصول علم کا ذریعہ کتاب اور استاذ بھی ہو سکتے ہیں اور اللہ چاہے تو **علمناہ من لدنا علما** کے ذریعے اپنی وہب اور عطا سے اس کے سینے کو منور فرمانے پر بھی قادر ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ دونوں سے بیک وقت سرفراز کیا جائے۔ احادیث اور قرآن حکیم میں اس پر بہت زور ہے۔

تمام اولیائے کبار جو بذات خود علم وحکمت کے میدان میں شہ سوار بھی تھے انہوں نے علم پر بہت زور بھی دیا ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین بخاری نے فرمایا کہ کتاب الوصیۃ میں شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ کا ارشاد ہے:

''صاحب زادے تمام احکام میں قرآن کی طرف رجوع کرو، اس لیے کہ قرآن اللہ کی طرف سے سب پر حجت ہے، علم سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹو، فقہ کا علم حاصل کرو، نہ جاہل اور عام صوفی بنو، اور نہ بازاری عالم بنو، اس لیے کہ یہ لوگ دین کے چور اور مسلمانوں کے رہ زن ہیں''۔

(مجمع السلوک، شیخ سعد خیر آبادی، ج ۱، ص:۳۳۶)

سلطان المشائخ محبوب الٰہی قدس سرہ کی خانقاہ میں علم ومعرفت دونوں کا غلغلہ تھا۔اور دونوں پر بہت زور تھا۔خود آپ کی ذات اس معاملے میں نادرزمانہ، یکتا ویگانہ اور مقام اجتہاد پر فائز تھی۔بچپن سے ہی شوق علم اور ذوق فقر غالب تھا، آپ نے تمام مروجہ علوم بلند ہمتی سے حاصل کیے۔اپنے زمانے کے مشاہیر فضلا اور شیوخ سے اکتساب فیض کیا، بدایوں میں زبان وادب ،لغت، بلاغت، معانی اور فقہ واصول کا درس لیا تھا۔ممتاز شخصیت مولانا علاء الدین اصولی رحمۃ اللہ سے قدوری کا درس لیا۔سات قراءتوں کے ماہر باصلاحیت اور صاحب کرامت بزرگ قاری شادی مقری سے ایک سیپارہ قرآن پڑھا۔بدایوں کے بعد آپ نے دہلی جو اس وقت ممتاز علما اور نامور اساتذہ کی جائے اقامت تھی، وہاں کا قصد کیا، شمس الملک مولانا شمس الدین خوارزمی سے ادب اور دینیات کی مزید تعلیم حاصل کی۔حضرت رضی الدین حسن صغانی (۶۵۰م) کی مشارق الانوار سے آپ کو اس حد تک لگاؤ تھا کہ آپ نے پوری مشارق حفظ کرلی تھی، امین الدین محدث تبریزی سے بھی حدیث کی سماعت کی۔محمد بن احمد بن محمد معروف بہ کمال الدین زاہد (۶۸۴ھ) سے نجم الدین تو اسی کی مسجد میں حدیث کی سماعت کی اور باقاعدہ انہوں نے آپ کو لکھ کر سند حدیث عنایت فرمائی، اس کا متن سیر الاولیاء میں درج ہے۔تحصیل علم کا شغل جاری رکھا، کہیں پہ اس کڑی کو ٹوٹنے نہیں دیا۔اپنے پیرومرشد حضرت بابا فرید الدین گنج شکر قدس سرہ سے دونوں علم حاصل کیا۔علم ظاہر بھی اور علم باطن بھی، علم عقائد میں ابوشکور محمد بن عبدالسعید سالمی کی کتاب ''التمہید فی بیان التوحید'' پڑھی۔تصوف میں شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ھ) کی تصنیف ''عوارف المعارف'' کے چھ ابواب پڑھے، اس کے علاوہ قرآن حکیم سنا کر ۶/ پارے کی تجوید درست کی۔اپنے مرشد کے متعلق فرماتے تھے کہ عربی حرف ضاد کا تلفظ جیسا بابا صاحب ادا کرتے تھے وہ ہم میں سے کسی کے بس میں نہیں۔اسی طرح آپ نے شیخ قاضی حمید الدین ناگوری (۶۴۳ھ) کی تصنیف ''لوائح'' بھی بابا صاحب سے پڑھی، بابا صاحب کے نامور خلیفہ حضرت شیخ بدرالدین اسحاق بھی آپ کے استاد اور مربی تھے، انہوں نے آداب طریقت اور رموز طریقت سکھانے میں آپ کی رہنمائی فرمائی، آپ ہمیشہ ان کے لیے سراپا امنت شناس رہے۔آپ فرماتے تھے:

''مجھے مولانا اسحاق سے سخت محبت تھی، تمام معاملات میں جو مجھے پیش آتے تھے مولانا، شیخ کی خدمت میں میری مدد کرتے تھے اور خود بھی میری تربیت فرماتے تھے''۔(مقدمہ فوائد الفواد، ص:۶۴)

علم ظاہر و باطن کی اس جامعیت، کمال اور تبحر کے بعد آپ کو وہ رتبہ ومقام اور حقائق ومعارف سے وہ حصہ وافر ملا جو کبار مخلصین، علمائے راسخین اور صدیقین کو ملتا ہے۔

صاحب سیر الاولیا لکھتے ہیں:

''کسی علم سے متعلق گفتگو ہوتی یا کوئی اشکال پیش آتا، آپ اپنے نور باطن سے ان کا جواب شافی عنایت فرماتے، اہل مجلس حیرت زدہ رہتے اور ایک دوسرے کا منہ تکتے کہ یہ کتابی جوابات نہیں، یہ سراسر الہام ربانی اور فیوض رحمانی ہیں''۔(سیر الاولیا، ص:۲۴۵)

علمی اور عارفانہ رسوخ، اتباع سنت اور استقامت علی الشریعت نے آپ کی ذات کو سلیم و مستقیم بنادیا تھا۔ عام مخلوق، خاص مخلوق، اخص الخواص نفوس نہ صرف آپ سے متاثر ہوئے بلکہ وہ علم و معرفت کی اسی راہ کے مسافر بن گئے، جس پر آپ گامزن تھے، سلطان المشائخ عالم ساز اور ولی ساز تھے۔ چناں چہ مولانا شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی، شیخ شمس الدین یحی اودھی، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا قطب الدین منور، مولانا علاء الدین نیلی، مولانا برہان الدین غریب، مولانا اخی سراج عثمانی، قاضی محی الدین کاشانی، مولانا حسام الدین ملتانی، مولانا شہاب الدین جیسے اہل علم کے علاوہ سیکڑوں جید اور متبحر علما حضرت سلطان المشائخ کے حلقہ ارادت و بیعت سے وابستہ تھے۔

سلطان المشائخ کے مذکورہ خلفا اور دیگر نفوس قدسیہ نے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں علم و معرفت کے میدان میں تا دیر نقوش چھوڑے اور اہل ہند کو راہ ہدایت دکھائی، حقیقی معنی میں دین کیا ہے اس سے آشنا کرایا، اپنے وقت کے نابغہ روزگار اور جید علما نے محبوب الٰہی کے مشن علم و روحانیت کو عروج و دوام بخشا۔ یہ ایک مستقل عنوان ہے کہ ہندوستان کے تقریباً سبھی علمی حلقوں میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے ظاہری اور باطنی فیضان پہنچے ہیں۔ حضرت سلطان المشائخ کے نزدیک علم کی کس قدر اہمیت تھی اس واقعے سے اندازہ لگایئے کہ امیر خورد رقم طراز ہیں:

جب سلطان المشائخ نے اپنے اعلیٰ مراتب پر جن اصحاب کو خلافت عطا فرمانا شروع کیا تو ان نفوس میں اخی سراج عثمان کا نام بھی پیش کیا گیا، آپ نے فرمایا:

> ''اس کام میں سب سے پہلی شرط ہے علم، یہ علم میں اس درجہ حصہ نہیں رکھتے جو اس کے لیے شرط ہے۔ جب یہ بات مولانا فخر الدین زرادی نے سنی تو ان کی زبان سے نکلا کہ میں ان کو چھ ماہ میں دانش مند بنادوں گا، چنانچہ علامہ زرادی نے قواعد، اصول، لغت، فقہ اور تمام ضروری علوم انہیں از بر کرادیے، تب سلطان المشائخ نے ان کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اور لکھنوتی (بہار، بنگال) کی ولایت سونپی اور تاریخی جملہ فرمایا کہ ''یہ آئینہ ہند'' ہیں۔ (سیر الاولیا، ص: ۳۵۰)

اندازہ کیجیے آپ کی خانقاہ میں ایک طرف دعوت و تبلیغ، ریاضت و مجاہدہ چل رہا ہے تو دوسری طرف درس و تدریس کی محفلیں بھی گرم ہیں، وعظ و تذکیر کی مجالس منعقد ہیں، ان میں ہر طرح خواص و عوام شریک ہوتے اور ہر ایک اپنے ظرف کے مطابق مستفیض ہو کر باہر نکلتا اور پھر علم و معرفت کی موتیاں لٹاتا۔ آج کی خانقاہوں میں اگر دوبارہ رونق واپس لانی ہے تو سلطان المشائخ کی خانقاہ کے طرز پر علم کی بساط بچھانی ہوگی، درس معرفت کا آغاز کرنا ہوگا۔ آج کا فساد زدہ معاشرہ اپنی امید کی نگاہ خانقاہوں پہ جمائے بیٹھا ہے، اس لیے اہل خانقاہ کو چاہیے کہ اپنی عظمت رفتہ کی بازیافت کریں اور عصر حاضر سے ہم آہنگ علم و معرفت کا نظام چلائیں۔

خدمت خلق

صوفیہ کرام اخلاق وسیرت نبوی کے مکمل پرتو ہوتے ہیں۔مخلوق کے ساتھ ہمدردی، انفاق ومحبت کا جو جذبہ خلق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتا ہے وہی جذبہ صوفیہ کے اندر موجود ہوتا ہے۔ مال سے محبت انسانی فطرت کا حصہ ہے مگر اللہ کی محبت کو ترجیح دیتے ہوئے اس کی مخلوق پر اس مال کو لٹا دینا قرب خداوندی حاصل کرنے کے لیے نبوی سلوک کا حصہ ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر جب اول مرتبہ جبریل امین وحی لے کر نازل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے راز الٰہی کا افشا کیا۔اور اپنی جان پر بار وحی کی کیفیت بیان فرمائی، تسلی دیتے ہوئے حضرت خدیجہ الکبری نے جو عرض کیا وہ خدمت خلق کے تصور، معنویت، ہمہ گیریت اور گہرائی کو سمجھنے کے لیے کافی ہے: **كَلَّا وَ اللهِ مَا يُخْزِيَكَ اللهُ أَبَدًا ، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ ، وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِ۔**

(صحیح بخاری، باب کیف کان بدء الوحی حدیث: ۳)

اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی ضائع نہیں فرمائے گا، کیوں کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بے کسوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، جس کا کوئی نہیں اس کے لیے آپ کماتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، آسمانی مشکلات ومصائب پر آپ خلق خدا کی مدد کرتے ہیں۔

لفظ لفظ گواہ ہے کہ جوان اخلاق واوصاف کا حامل ہوگا اللہ اس کے مشن کی تکمیل اور اسے فتح وظفر سے سرفراز فرمائے گا۔حضور نے مزید فرمایا: **خیر الناس من ینفع الناس** ۔(کنز العمال) لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔

مشہور حدیث **الخلق عیال اللہ و احب الخلق الی اللہ انفعھم لعیالہ**۔(۱) پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اللہ کے نزدیک ان میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے، جو اس کے کنبے کے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔ یہ لازمی بات ہے کہ جسے اللہ سے حقیقی محبت ہوگی وہ اس کے کنبے سے بھی محبت کرے گا۔ اہل اللہ کا مقصود ومحبوب بالذات اللہ جل شانہ کی ذات ہے۔ اسی کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر وہ مخلوق کی خدمت بلکہ ہر طرح کی بھلائی پر مخلصانہ عمل پیرا بھی رہے ہیں، اور اس کی تلقین بھی کی ہے۔شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ نے فرمایا ”جو شخص خانقاہ میں وارد ہوا اور اس نے علم ومعرفت کا ذائقہ نہ چکھا ہو اور اعلیٰ روحانی مراتب پر فائز نہ ہو تو ایسے شخص کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اہل خانقاہ کی خدمت کرے، یہ خدمت اس کی عبادت سمجھی جائے گی“۔

حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں: بازار قیامت میں کسی سامان کی اتنی پرسش نہ ہوگی جتنی شکستہ دلوں کو راحت پہنچانے کی۔(سیر الاولیا ص: ۲۴۳)

---

(۱) المعجم الاوسط/ حدیث: ۵۵۴۱

مزید فرمایا: جو خدمت کرتا ہے، مخدوم ہو جاتا ہے۔ کوئی خدمت کیے بغیر مخدوم کیسے بن سکتا ہے؟ اس کے بعد زبان مبارک پہ یہ الفاظ آئے۔ من خدم خدم۔ جس نے خدمت کی اس کی خدمت کی گئی۔ (فوائد الفواد: ص ۷۷۴)

امیر خورد کرمانی کے درج ذیل تبصرے کو پڑھیں اور اندازہ کریں کہ آپ کی خانقاہ میں خدمت خلق کو کس انتہائی حد تک انجام دیا جاتا تھا، وہ لکھتے ہیں:

ہر آنے والا خواہ امیر ہو یا غریب، شہر کا ہو یا مسافر جو بھی کوئی بھی آتا اور قدم بوسی کی سعادت حاصل کرتا ،آپ کسی کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے، کپڑے، چپل، تحفے، ہدیے جو آپ کو عالم غیب سے پہنچتا وہ تمام کے تمام آنے جانے والوں میں تقسیم کر دیتے۔ (سیر الاولیا، مترجم، ص: ۲۴۴)

آپ کی خانقاہ غریبوں، مسکینوں، ناداروں کی پناہ گاہ تھی، ہزاروں ہزار افراد آپ کے لنگر سے کھانا کھاتے تھے، جو بھی نذر اور فتوحات آتے تھے انہیں ذخیرہ نہیں ہونے دیتے بلکہ خلق خدا کی ضروریات میں صرف کر دیتے تھے، خادموں کو ہدایت تھی کہ ہر جمعہ کو خانقاہ کی تجرید کر لیا کرو۔ امیر خورد کرمانی فرماتے ہیں:

اگر کسی وقت فتوحات زیادہ آجاتیں تو آپ کے رونے میں اضافہ ہو جاتا اور آپ کوشش فرماتے کہ یہ جلد از جلد تقسیم ہو جائے، چنانچہ وقفہ وقفہ سے کسی کو بھیجتے رہتے کہ دیکھ کر آؤ وہ فتوحات تقسیم ہو گئیں کہ نہیں، جب آپ کو معلوم ہو جاتا کہ سب تقسیم ہو کر ضرورت مندوں کو پہنچ گئیں تب آپ اطمینان کی سانس لیتے۔ ہر ہفتے تجرید فرماتے، یعنی حجروں اور انبار خانوں کو خالی کرا دیتے، حتیٰ کہ جھاڑو دے دی جاتی، اس کے بعد نماز جمعہ کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ (سیر الاولیا، مترجم، ص: ۲۴۶)

حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ کا مخلوق کے ساتھ تو یہ حال تھا۔ اور خود آپ کی ذاتی زندگی کا معاملہ یہ تھا کہ دن میں اکثر روزہ رکھا کرتے تھے، اکثر سحری بھی نہیں کھاتے تھے اور افطار کے وقت معمولی سی غذا لیتے، اخوان جب عرض کرتے کہ اتنا کم کھائیں گے تو ضعیفی میں اضافہ ہو جائے گا، یہ سن کر آپ رونے لگتے اور فرماتے:

”چندیں مسکیناں و درویشاں در کنجہائے مسجد و دو کانہا گرسنہ و فاقہ زدہ افتادہ اند۔ ایں طعام در حلق من چگونہ فرو درود۔ (سیر الاولیا (فارسی)، ص: ۱۲۸)

(کتنے ہی مساکین اور درویش مسجد کے کونوں اور دو کانوں میں بھوکے اور فاقہ زدہ پڑے ہوئے ہیں، بھلا یہ کھانا میرے حلق میں کس طرح اتر سکتا ہے)۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

حضرت سلطان المشائخ کا حال یہ تھا کہ مصیبت زدوں اور غربت و افلاس کے ماروں کا درد اپنا درد سمجھتے تھے حتیٰ کہ محض اللہ کی محبت کی خاطر خلق خدا کی حاجت روائی میں اپنی آنکھوں کی نیندیں تک قربان

کر دیتے۔ حضرت سلطان المشائخ ایک دن قیلولہ فرما رہے تھے کہ ایک درویش نے دستک دی، خانقاہ میں کچھ نہ تھا، خادم نے واپس کر دیا، عین اس وقت محبوب الٰہی کے خواب میں بابا صاحب تشریف لائے، اور فرمایا، اگر تمہارے گھر میں کچھ موجود نہیں ہے تو آنے والے کی بقدر استطاعت خاطر تواضع واجب ہے۔ یہ کہاں آیا ہے کہ یوں ہی خستہ دلوں کو لوٹا دیا جائے۔ (سیر الاولیا، مترجم، ص: ۲۴۴)

آپ قیلولہ سے بیدار ہو گئے، خادم کو طلب کیا، اور ان کو تنبیہ کی، اور فرمایا کہ میں نے شیخ شیوخ العالم کو خواب میں دیکھا آپ اس بات پر مجھ سے ناراض تھے، آئندہ میں اگر قیلولہ میں بھی رہوں تو مجھ کو اطلاع دو۔(۱) آج خدمت خلق اور فلاحی کاموں اور دلوں کو آرام پہنچانے کے حوالے سے ہمارے عہد کا خانقاہی نظام جامد ہو چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدمت وانفاق اللہ کی محبت میں ڈوب کر اور اسی کی رضا کا طالب بن کر کیا جائے۔ تب کہیں سودمند ہے ورنہ اگر مخلوق کو خوش کرنے کے لیے ہے تو اس سے مخلوق کا فائدہ تو ہو جائے گا مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ اللہ نے حقیقت خدمت کو وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ (اللہ کی محبت میں مال خرچ کرنا) سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے متعلق سلطان المشائخ نے فرمایا: بازار قیامت میں دلوں کو آرام پہنچانے سے زیادہ کوئی چیز قیمتی نہیں ہوگی، یہی حقیقت خدمت ہے۔ جس کی بازیافت سے دوبارہ خانقاہوں میں خدمت خلق کے تعلق سے خانقاہی نظام کی روح کو زندہ کیا جا سکتا ہے۔

نظام بیعت اور رجوع الی اللہ

بیعت وارادت، گناہوں سے توبہ، احکام شرع کی پابندی، بدعات سے اجتناب، سنتوں کی پیروی اور شریعت پر استقامت وثبات قدمی کا ایک معاہدہ ہے۔ صوفیہ کرام طالبین سے یہی بیعت لیتے ہیں، اسے بیعت توبہ اور بیعت تقویٰ کہتے ہیں یہ سنت نبوی ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: عقبہ اولی میں ہم کل بارہ مرد تھے۔ ہم نے حضور کے دست اقدس پہ وہی بیعت کی جو حضور نے عورتوں سے لی تھی، اس موقع پہ عورتوں کی بیعت کا ذکر قرآن حکیم کے اندر اس طرح موجود ہے۔ اللہ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰۤی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا وَّ لَا یَسْرِقْنَ وَ لَا یَزْنِیْنَ وَ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (ممتحنہ:۱۲)

(اے نبی! مومن عورتیں آپ کے پاس اس چیز کی بیعت کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک نہیں کریں گی، چوری نہیں کریں گی، بدکاری نہیں کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی اور کوئی ایسا بہتان نہ باندھیں گی جسے خود اپنے ہاتھوں، پیروں کے سامنے گڑھ لیں اور کسی نیک کام میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی

(۱) ایضا: ص: ۲۴۴

نہیں کریں گی، تو آپ انہیں بیعت کرلیں اوران کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں، بے شک اللہ بخشنے والا معاف کرنے والا ہے)۔

اس بیعت کا ذکرامام بخاری نے اپنی صحیح کے اندرکتاب تفسیر القرآن کے ذیل میں تفصیل سے کیا ہے۔ صوفیہ کرام کے یہاں یہی بیعت مروج ہے۔صوفیہ بھی تجدیداسلام کراتے ہیں۔معاصی سے اجتناب کا عہد لیتے ہیں، اوامرکو بجالانے کا حکم دیتے ہیں، استقامت علی الشریعہ پر دوام کی تاکید کرتے ہیں اور ہر ایک کے لیے مغفرت اور ترقی درجات کے لیے دعا کرتے ہیں۔ بیعت میں صاحب طلب اور صاحب قصدو ارادہ مرید کہلاتا ہے۔مطلوب ومقصود اللہ ہے اور پیر وکیل،سفیراور مطلب ہوتا ہے البتہ مطلوب تک پہنچنے کی دشواریوں کو آسان کرنے اورراہ حق کی مشکلات کوحل کرنے کے لیے، برزخ شیخ اور مطلب کی شدیدضرورت پڑتی ہے۔اس لیے مریدومراد کے درمیان شیخ کی کڑی عبث نہیں ہے جیسا کہ بیعت عقبہ میں تمام مرداورخواتین نے اللہ کی رضا کی خاطر رسول گرامی وقار کے دست اقدس پر بیعت کیا۔مشائخ کی بیعت میں مرید دراصل دست نبوی پر ہی بیعت کرتا ہے۔شیخ کا ہاتھ اس دست مبارک کا قائم مقام ہے۔ بیعت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد عہد و پیمان کا پاس ولحاظ رکھتی ہے۔اور ہزاروں بلکہ لاکھوں بندگان خدا کے لیے بیعت تجدیدایمان، انقلاب قلب، اصلاح حال اورانابت الی اللہ کاذریعہ بن جاتی ہے۔

جس زمانے میں سلطان المشائخ محبوب الٰہی نے دہلی میں بساط رشدوہدایت بچھائی بلبن کا پوتامعزالدین کیقباد(۶۸۶ھ تاج پوشی) تخت نشین تھا، جمنا کے کنارے غیاث پور کی زمین تھی، اس کے زمانے میں اسی زمین سے آپ نے رشدو ہدایت کا کام وسیع پیمانے پرشروع کیا۔سلطان علاءالدین خلجی ۶۹۵ھ-۱۲۹۶ میں تخت نشین ہوا، آٹھ نو سال کی مختصر مدت میں حضرت نے دہلی کے معاشرے میں ایسا انقلاب بر پا کیا کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے لوگ آ کر پروانہ واراس شمع ہدایت کے او پر نثار ہونے لگے۔قدیم مشائخ کے یہاں ارادت و بیعت کی سخت پابندیاں تھیں بعض مشائخ کے یہاں تو اتنی سختی تھی کہ طالب صادق جب تک مقام توبہ پہ جم نہیں جاتا اس سے بیعت نہیں لیتے تھے،لیکن سلطان المشائخ نے بیعت کے لیے اذن عام عنایت فرمارکھی تھی، اس کے پیچھے کیا راز تھا؟ عہد سلطنت کے ناموراور مستند مورخ اورحضرت محبوب الٰہی کے مرید مولانا ضیاءالدین برنی (مصنف تاریخ فیروزشاہی) فرماتے ہیں:

> میں ایک دن حضرت سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر تھا، اشراق سے چاشت تک آپ کی روح پرور باتیں سنتا رہا، اس روز کثرت سے لوگ حضرت کے دست اقدس پہ بیعت ہوئے، یہ دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ مشائخ متقدمین نے مرید کرنے میں بڑی احتیاط برتی ہے، اور حضرت نے اس کے لیے اذن عام دے دیا ہے۔اورآپ ہرخاص وعام سب کومرید کرلیتے ہیں۔

سلطان المشائخ میرے اس خطرے سے مطلع ہو گئے فرمایا: مولانا ضیاء الدین! تم ہر طرح کی باتیں پوچھتے ہو یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں تحقیق کیے بغیر آنے والوں کو کیوں مرید کر لیتا ہوں۔ یہ سن کر مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا اور قدموں میں گر کر عرض کیا: عرصہ سے میرے دل میں اشکال تھا اور آج بھی یہ وسوسہ آیا تھا۔ حضرت نے فرمایا:

''حق تعالیٰ نے ہر زمانہ میں اپنی حکمت بالغہ کی ایک خاصیت رکھی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ ہر زمانہ کے لوگوں کی راہ ورسم اور عادتیں الگ ہوتی ہیں، زمانہ اثر انداز ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے لوگوں کا مزاج اور طبیعت گذشتہ زمانہ کے لوگوں کی طبیعتوں سے بالکل مشابہت نہیں رکھتی، بہت کم لوگ اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ اور یہ بات تجربات سے واضح ہے۔ ارادت کی اصل یہ ہے کہ مرید ماسوی اللہ سے منقطع اور مشغول مع اللہ ہو جائے، جیسا کہ کتب تصوف میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ مشائخ متقدمین جب تک طالب ارادت میں انقطاع کلی نہ دیکھ لیتے بیعت کا ہاتھ نہیں بڑھاتے تھے، لیکن سلطان ابوسعید ابوالخیر (م ۱۰۴۹ء) سے لے کر شیخ سیف الدین باخرزی کے عہد تک اور شیخ شیوخ العالم شہاب الدین سہروردی (م ۱۲۳۴ء) کے عہد مبارک سے حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین (۶۶۴ھ) قدس اللہ سرہم کے زمانے تک یہ سب سرآمد روزگار اور آیۃ من آیات اللہ تھے، ان کے دروازوں پہ خلق خدا کا ہجوم ہوا اور ہر طبقے کے لوگوں نے ازدحام کیا، ان بندگان خدا نے اخروی مہلکات کے خوف سے اپنے تئیں ان عاشقان خدا کا دامن تھاما اور ان مشائخ کبار نے بھی ہر خاص وعام کو اپنی بیعت میں قبول کیا اور خرقہ تبرک وتوبہ عطا کیا، اب ہر شخص ان محبوبان خدا کے معاملات پر اپنے کو قیاس نہیں کر سکتا کہ شیخ ابوسعید، شیخ سیف الدین باخرزی ، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ اسرارہم نے جس طرح لوگوں کو مرید کیا، میں بھی مرید کروں! اس لیے کہ اگر خدا کا کوئی محبوب ایک عالم کو اپنے دامن عاطفت میں لے لے تو لے سکتا ہے۔ اب میں تمہارے سوال کا جواب دیتا ہوں کہ میں بیعت لینے میں کیوں زیادہ احتیاط اور تفتیش نہیں کرتا، ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں علی سبیل التواتر سن رہا ہوں کہ بہت سے مرید ہونے والے معصیت سے تائب ہو جاتے ہیں۔ نماز با جماعت ادا کرنے لگتے ہیں اور اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاتے ہیں اگر میں شروع ہی سے اس بات کی شرط رکھ دوں کہ ان میں ارادت کی حقیقت یعنی انقطاع کلی پایا جاتا ہے، کہ نہیں؟ اور ان کو توبہ وتبرک کا خرقہ (جو خرقہ ارادت کی جگہ پر ہے) نہ دوں تو خیر کی اس مقدار سے بھی جو ان اللہ کے بندوں سے وجود میں آرہی ہے یہ محروم ہو جائیں گے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مجھے شیخ کامل ومکمل (حضرت بابا صاحب) سے اس

بات کی جازت حاصل ہے کہ بغیر کسی سفارش، التماس یا وسیلے کے، بغیر کسی تفتیش و کرید کے لوگوں سے بیعت لوں، اور میں دیکھتا ہوں کہ ایک مسلمان بڑی عاجزی، درماندگی اور مسکنت و بے چارگی کے ساتھ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تمام گناہوں سے توبہ کی، میں یہ سمجھ کر کہ اس کی بات سچی ہو، اس کو بیعت کر لیتا ہوں۔ خاص طور پر اس لیے کہ بہت سے معتبر لوگوں سے سنتا ہوں کہ بہت سے بیعت کرنے والے اس بیعت کی وجہ سے معاصی سے باز آجاتے ہیں۔

اثرات ونتائج

سلطان المشائخ محبوب الٰہی کے بیعت عام سے ہر طبقے کو لوگوں کے اندر انقلاب بر پا ہوا، معاشرت، سیاست، صنعت وحرفت، ہر سطح کے خواص وعوام یکساں طور پر متاثر ہوئے، کثرت سے لوگ معصیت سے بچنے لگے، شیخ کی عزت وعظمت وروشن ضمیری کا لحاظ رکھتے ہوئے بہت سی ظاہری اور باطنی برائیوں سے محفوظ رہنے لگے۔ شیخ کی نسبت مریدی نے ان کے اندر خوف خدا، اللہ کے وجود کا احساس جگادیا۔ دینداری، عشق الٰہی، توبہ و انابت، دردوسوز، راست گفتاری، ناپ تول میں دیانت، معاملات میں صفائی وغیرہ جیسے اعلیٰ اسلامی اور ایمانی اقدار ان کے اندر پائے جانے لگے۔ مولانا ضیاء الدین برنی نے علاء الدین خلجی کے عہد میں حضرت سلطان المشائخ کی اصلاحی خدمات اور بیعت کے اثرات کو اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے یہاں ان کو پیش کرنا افادیت سے خالی نہ ہوگا آیئے انہیں کی زبانی سنیے!

''دوسری طرف اسی زمانے میں شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت عام کا دروازہ کھول رکھا تھا، گنہگار لوگ ان کے سامنے اپنے گناہوں کا اقبال کرتے، اوران سے توبہ کرتے اور وہ ان کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل کر لیتے، خواص وعوام، مال دار ومفلس، امیر وفقیر، عالم وجاہل، شریف ورذیل، شہری ودہقانی، غازی ومجاہد، آزاد وغلام، ان سب سے وہ توبہ کراتے اوران کو طاقیہ (کلاہ ارادت) اور مسواک صفائی کے لیے دیتے، ان لوگوں میں سے کثیر تعداد جو خود کو شیخ کے مریدوں میں شمار کرتی تھی، بہت سے ان کاموں سے پرہیز کرنے لگتی تھی جو کرنے کے لائق نہیں ہوتے، اگر شیخ کی خانقاہ میں حاضر ہونے والوں میں سے کسی سے کوئی لغزش ہوتی تو اس کو تجدید بیعت کرنا پڑتی، اور شیخ از سرنو اس سے اقبال گناہ اور توبہ کراتے، شیخ سے مرید ہونے کی شرم لوگوں کو بہت سے گناہوں سے ظاہر اور مخفی طور پر باز رکھتی، چنانچہ عام لوگ یا دوسروں کی تقلید میں یا خود اپنے اعتقاد کی بنیاد پر عبادت اور بندگی کی طرف راغب ہو گئے تھے، اور مرد اور عورتیں، بوڑھے اور جوان، سوداگر اور عام لوگ، غلام اور نوکر، اور کم عمر بچے سب نماز پڑھنے لگے تھے۔ ان کے ارادت مندوں کی اکثریت نماز چاشت واشراق کی پابند ہو گئی تھی، مخیر اور مہربانیاں کرنے والے لوگوں نے شہر سے غیاث پور تک متعدد مقامات پر لکڑیوں کے

چبوترے بنوادیے تھے، یا چھپر ڈال دیے تھے، اور کنویں کھدوادیئے اور پانی کے گھڑے، مٹی کے لوٹے تیار رہتے تھے اور چھپروں میں بوریے بچھے رہتے تھے، ان چبوتروں اور چھپروں میں حافظ اور خادم مقرر کردیے تھے تاکہ شیخ کے مریدوں اور تائبوں کو اور دوسرے لوگوں کو ان کے آستانے پر آتے جاتے وقت وضو کرنے اور وقت پر نماز ادا کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ ان چبوتروں اور چھپروں میں سے ہر ایک میں نفل نماز ادا کرنے والوں کا ہجوم تھا، گناہوں کے ارتکاب اور ان کے متعلق لوگوں میں بہت کم بات چیت ہوتی تھی، بلکہ ان میں اکثر و بیشتر جو گفتگو ہوتی تھی وہ نماز چاشت و اشراق کے متعلق ہوتی، اور یہ لوگ یہی دریافت کرتے رہتے کہ زوال، اوابین اور تہجد کی نماز میں کتنی رکعتیں پڑھی جاتی ہیں؟ اور ہر رکعت میں قرآن کی کون سی سورت پڑھنی چاہیے؟ اور یہ کہ پانچوں وقت کی نماز میں نفلوں کے بعد کون سی دعائیں آئی ہیں؟ آستانۂ شیخ میں نئے آنے والے شیخ کے پرانے مریدوں سے دریافت کرتے کہ رات کے وقت شیخ کتنی رکعتیں پڑھتے ہیں؟ اور ہر رکعت میں کیا پڑھتے ہیں؟ عشا کی نماز کے بعد محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک پر وہ کتنی مرتبہ درود بھیجتے ہیں؟ اور شیخ فرید اور شیخ بختیار دن رات میں کتنی بار درود بھیجتے تھے؟ اور کتنی بار سورہ قل ہو اللہ پڑھتے تھے۔ شیخ کے مرید، ان کے قدیم مریدوں سے اسی قسم کے سوال دریافت کرتے، اور روزوں نفلوں اور کم کھانے کے متعلق معلوم کرتے رہتے تھے۔ اس نیک زمانے میں کثرت سے لوگ قرآن یاد کرنے کا اہتمام کرتے تھے، نئے مرید شیخ کے قدیم مریدوں کی صحبت میں رہتے اور قدیم مریدوں کو بندگی و عبادت، ترک و تجرید، سلوک کی کتابیں پڑھنے اور مشائخ اور بزرگوں کے حالات اور واقعات کا ذکر کرنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ نعوذ باللہ کہ یہ لوگ دنیا اور دنیا داروں کا ذکر اپنی زبان پر لاتے، یا دنیا کے کارخانے کی طرف نظر کرتے، یا دنیا اور اہل دنیا کے قصے سنتے، ان سب چیزوں کو وہ معیوب بلکہ معاصی میں شمار کرتے تھے، اس بابرکت زمانے میں لوگوں کا کثرت سے نفل پڑھنا اور اس کو قائم رکھنا، اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ سلطانی دربار سے منسلک امرا سلاحداروں، محرروں، سپاہیوں اور بادشاہ کے غلاموں میں سے بہت سے لوگ جو شیخ کے مرید تھے، چاشت اور اشراق کی نماز ادا کرتے تھے، اور ایام بیض اور عشرہ ذی الحجہ کے روزے رکھتے تھے، کوئی محلہ ایسا نہ تھا جہاں پر مہینہ بیس روز کے بعد نیک لوگوں کی مجلس نہ ہوتی، اور صوفیہ کا سماع نہ ہوتا اور اس میں گریہ و رقت نہ ہوتی، شیخ کے کئی مرید ایسے تھے جو مسجد میں یا گھر پر نماز تراویح میں ختم قرآن کراتے اور ان لوگوں میں سے جو مستقیم الحال تھے، اکثر و بیشتر رمضان میں اور جمعہ اور مواسم کی راتوں میں قیام کرتے تھے، صبح تک جاگتے اور پلک پر پلک نہیں مارتے تھے۔ ان بزرگوں میں سے بہت سے حضرات ایسے تھے جو دو تہائی یا تین چوتھائی

رات تمام سال قیام اللیل میں گزارتے اور بعض عبادت گزار توعشا کی نماز کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے تھے، شیخ کے مریدوں میں سے چندکوتو میں جانتا ہوں کہ جو شیخ کی نظر کرم کی بدولت صاحب کشف وکرامات ہو گئے تھے، شیخ کے مبارک وجود، ان کے مبارک انفاس کی برکت اوران کی مقبول دعاؤں کی وجہ سے اس علاقے کے اکثر مسلمان عبادات، تصوف اور ترک وتجرید کی طرف مائل اور شیخ سے مرید ہونے کے خواہشمند ہو گئے تھے۔ سلطان علاء الدین بھی اپنے خاندان کے تمام لوگوں کے ساتھ شیخ کا معتقد ہو گیا تھا۔ خواص وعوام کے دل نیکی اور نکوکاری کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ حاشا وکلا کہ عہد علائی کے آخری چند سال میں اکثر وبیشتر مسلمانوں میں سے کسی کی بھی زبان پر شراب وشاہد فسق وفجور، قمار بازی، فحش حرکات، لواطت یا بچہ بازی کا ذکر تک بھی نہ آتا۔ بڑے جرائم اور کبیرہ گناہ لوگوں کے نزدیک بمنزلہ کفر ہو گئے تھے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خوری اور احتکار (ذخیرہ اندوزی) کے مرتکب نہ ہوتے تھے۔ اور خوف وہراس کی وجہ سے دکانداروں میں جھوٹ، کم تولنا، مکاری و دغا، دھوکا دہی اور نادانوں کا روپیہ مارلینا، سب قطعی طور پر ختم ہو گئے تھے۔ علم حاصل کرنے والے اور اشراف واکابر جو شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، زیادہ تر سلوک کی کتابوں اور ان صحیفوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے جن میں طریقت کے احکام ہوتے تھے۔ چنانچہ قوت القلوب، احیاء العلوم، احیاء العلوم کا ترجمہ، عوارف، کشف المحجوب، شرح تعرف، رسالہ قشیریہ، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاہ، لوائح اور لوامع، قاضی حمید الدین ناگوری اور فوائد الفواد امیر حسن علا سجزی کے شیخ کے ملفوظات کی وجہ سے بہت زیادہ خریدار پیدا ہو گئے تھے۔ لوگ کتاب فروشوں سے زیادہ سلوک اور حقائق پر کتابوں کے متعلق دریافت کرتے رہتے تھے۔ اور کوئی عمامہ ایسا نظر نہ آتا جس میں مسواک اور کنگھا لٹکا نہ ہوتا، صوفیوں کی خریداری کی زیادتی کی وجہ سے لوٹے اور چمڑے کی کشتیاں (طشت چرمی) مہنگی ہو گئی تھیں۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے شیخ نظام الدین کو اس آخری دور میں جنید وبایزید کی مثل پیدا کیا تھا۔ اور اپنی ذات کے عشق سے جس کی کیفیت انسانی عقل میں نہیں آسکتی، آراستہ وپیراستہ کیا تھا، شیخ ہونے کے کمالات کی مہر ان کی ذات پر لگادی تھی اور ہدایت کے فن کو ان پر ختم کر دیا تھا۔

زین فن مطلب بلند نامی
کان ختم شد ست بر نظامی (۱)

---

(۱) برنی: تاریخ فیروز شاہی اردو ترجمہ ڈاکٹر سید معین الحق، مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۹ء ص: ۵۰۶۔۵۵۰ بحوالہ مقدمہ فوائد الفواد، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ص: ۷۲۔۷۵

ایک طرف محبوب الٰہی کے برپا کیے ہوئے نظام بیعت کے یہ اثرات تھے کہ لوگ گناہ بھول گئے، شوق علم اور ذوق عبادت بڑھ گیا، لذت روحانیت فزوں ہوگئی، مشائخ کی کتابیں، شیوخ کی صحبت و تربیت سے دل چسپی پیدا ہوگئی، ندامت کے آنسو، محبت کے درد، دل کی آہیں، عشق کا سوز اس درجہ عروج پذیر ہوا کہ ایسا لگتا تھا کہ آسمان کا باب الولایت کھل گیا، اور نظام الدین کو اس منصب جلیل پر بٹھا دیا گیا کہ جسے چاہیں تراش خراش کر ولی بنا دیں۔ وجہ یہ تھی کہ امیر، شیخ اور پیشوا کی نیت درست تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رہنما کی صدق نیت، اخلاص بلکہ جملہ صفات کے اثرات ماتحت پر ہوتے ہیں، **الناس علی دین ملو کھم**۔ آج بیعت وارادت ایک فرسودہ رسم بن کر رہ گئی ہے۔ یا ہے تو محض تبرک کے طور پر رائج ہے۔ وجہ ظاہر ہے چونکہ اہل ہمت شیوخ نہیں ہیں اس لیے اہل ہزیمت مرید پیدا ہوئے ہیں۔ سچے طالب اور پیر دونوں کی کمی ہے۔ مرشد گرامی رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے آدم زادوں کو تراش خراش کر رشک آفتاب و ماہتاب بنایا۔ اس لیے ہمیں جہاں یہ تلاش ہے کہ نصیر الدین چراغ دہلی جیسے مرید و طالب ملے وہیں ہمیں سلطان المشائخ محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ جیسا میخانے کے پیر مغاں کی بھی جستجو ہے۔

خلافت و مشیخت کا مطمح نظر

صاحب اخبار الاخیار نے سلسلۃ الذہب کے مصنف شیخ محمد نور بخش کے حوالے سے شیخ الاسلام خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی (م ۶۶۱ھ) کے ذکر میں لکھا ہے:

> بہاء الدین زکریا ملتانی ہندوستان کے رئیس الاولیا تھے، علوم ظاہری کے متبحر، صاحب احوال ومقامات اور صاحب مکاشفات و مشاہدات تھے، وہ ایک ایسے مرشد کامل تھے جن سے اکثر اولیا کے سلسلے نکلتے ہیں۔ کفر سے ایمان، معصیت سے اطاعت اور نفسانیت سے روحانیت کی طرف ہدایت کرنے میں ان کا بڑا مقام ہے۔ (اخبار الاخیار، مترجم، ص: ۴۷)

خلافت و مشیخت کا یہی مطمح نظر ہوتا ہے جو سلسلۃ الذہب کے مؤلف نے شیخ الاسلام کے لیے بیان کیا، مشائخ کبار سبھی انسانوں کو ایک بلند روحانی زندگی کا پیغام دیتے ہیں۔ اور بذات خود اس کی عملی تصویر بن جاتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک غیر مسلم اسلام کی طرف اور ایک مسلم بے عیب اور صاف ستھری زندگی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی قدس سرہ نے ارشاد و ہدایت اور دعوت واصلاح کو دور دور تک پھیلانے کے لیے، عالی ہمت، بلند مقام، سراپا اخلاص، صاحب اوصاف وکمالات شخصیتوں کی تربیت میں ایسا نمایاں کارنامہ انجام دیا تاریخ جن کی نظیر لانے سے قاصر ہے۔ آپ کی تربیت یافتہ شخصیات میں بہت سے حضرات خلافت واجازت سے سرفراز ہوئے، آپ نے ان سے مجاہدات کرائے، ان کے اوقات کی نگرانی کی، انہیں علم و معرفت کے زیور سے مزین کیا، خلق محمدی کے سانچے میں ڈھالا، بہت سے علما جن کے بحث و

مباحثے، نکتہ آفرینی اور منطقیانہ طرز سے شہر کا ذی علم طبقہ متاثر تھا، ان کی اصلاح فرمائی، ان کی عالمانہ صلاحیتوں کو درست رخ عطا فرمایا۔ بہت سے نفوس جو خلق خدا کی رہنمائی کے اہل تھے تاہم عزلت نشینی اور خلوت گزینی کو ترجیح دیتے تھے، شیخ نے ان کو اجتماعی زندگی اختیار کرنے اور مخلوق کی جفا و خفا برداشت کرنے کی ترغیب دی۔

تفویض خلافت

حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی قدس سرہ کی سیرت، تعلیمات اور آپ کے ملفوظات سے واضح ہوتا ہے کہ آپ خلافت و نیابت سپرد کرنے کے معاملے میں نہ صرف انتہا درجے کے احتیاط پر فائز تھے، بلکہ آپ کا عمل اہل تصوف کے لیے حجت و برہان قرار پایا۔ آپ کے مریدین اور اصحاب میں ایک سے بڑھ کر ایک صلاحیت مند اور علم و فضل کی دولت سے بہرہ ور افراد تھے، مگر باوجود اس کے آپ امانت الٰہی کے سپرد کرنے میں سلف صالحین اور اپنے پیران طریقت کے راستے پر گامزن تھے۔ خلافت عطا کرنے کے شرائط کے ذیل میں مومن ہونا، مرد ہونا، عاقل بالغ ہونا، عالم و قادر ہونا، اور صالح و متقی اور زاہد ہونا ذکر کیا جاتا ہے تا کہ امانت کی متحمل ذات دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کے میدان میں درست طور پر اپنا فریضہ انجام دے سکے، مریدین و طالبان مولیٰ کی حفاظت و صیانت، خدمت خلق، فتوحات کی تقسیم، اخوان سے مشاورت یہ سارے اوصاف خلیفہ کے لیے واجبی تسلیم کیے جاتے ہیں۔

خلافت عطا کرنے کے طریقوں سے متعلق حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ نے فرمایا کہ:

میں نے اپنے خواجہ (بابا فرید گنج شکر قدس اللہ سرہ) سے سنا تھا کہ تفویض خلافت کے تین طریقے ہیں:

۱- پہلا طریقہ: محکم اور بہتر طریقہ ہے جو رحمانی ہے اور جس میں خیر و برکت ہے، وہ یہ ہے کہ پیر کو جس مرید کے متعلق الہام ہو اور حق تعالیٰ بغیر کسی واسطہ کے شیخ کے دل میں ڈالے کہ فلاں کو خلافت دو، اسے خلافت دے۔

۲- دوسرا طریقہ: یہ ہے کہ پیر جس مرید میں اچھی صلاحیتیں دیکھے اس کے بارے میں اجتہاد کرے۔ اجتہاد میں خطا و صواب دونوں کا احتمال ہے۔

۳- تیسرا طریقہ: یہ ہے کہ کسی کی شفارش و عنایت پر شیخ مرید کو خلافت دے۔ اس موقع پر سلطان المشائخ سے پوچھا گیا کہ اس تیسرے کے متعلق جس میں پیر کو انشراح نہ ہو، کیا پھر بھی شیخ کا مجاز ہے؟ فرمایا! یہ کیوں کر جائز ہوسکتا ہے اور اس (خلیفہ) سے بہتری کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ (سیر الاولیا، ص: ۵۴۱)

اسی طرح آپ سے پوچھا گیا وہ کون سے اوصاف ہیں جن کی وجہ سے آدمی خلافت کا مستحق ہوتا ہے؟ آپ نے نے فرمایا:

> ''اس کام کے لیے تو بہت سے اوصاف درکار ہیں البتہ جس زمانے میں میرے خواجہ (بابا فرید گنج شکر قدس سرہ) نے مجھے دولت خلافت سے سرفراز فرمایا تھا ایک دن مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے علم، عقل اور عشق تینوں سے نوازا ہے، اور جو ان تین صفتوں سے متصف ہو اسے مشائخ کی

خلافت سزاوار ہے۔‘‘(سیر الاولیا،ص:۵۴۰)

ظاہر ہے کہ حضرت محبوب الٰہی نے جن نفوس کو خلافت سے سرفراز فرمایا ان میں یہ تینوں خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں، مولانا قطب الدین منور (۷۶۰ھ)، مولانا نصیر الدین محمود (۷۵۷ھ)، مولانا شمس الدین یحی (۷۴۷ھ)، مولانا فخر الدین زرادی (۷۴۸ھ)، مولانا علاء الدین نیلی (م ۷۶۲ھ)، مولانا برہان الدین غریب (م ۷۴۱ھ)، مولانا حسام الدین ملتانی (م ۷۵۳ھ)، مولانا سراج الدین اخی سراج (۷۵۸ھ) مولانا شہاب الدین مولانا وجیہ الدین یوسف (۷۲۹ھ) وغیرہ جیسے جید علما اور معرفت کے شہسوار شامل تھے، آپ نے انہیں امانت خلافت سونپ کر سرزمین ہند کے اندر اسلام اور روحانیت کی دھاک بٹھادی اور جس ذرے کو آپ نے جس جگہ اقامت عطا فرمائی وہ وہیں آفتاب ہدایت اور مہتاب ولایت بن کر چمکا اور پھر پورے ہندوستان میں آپ کے روشن کیے ہوئے چراغ سے چراغ جلتے گئے، جن کی ضیا پاشیوں سے آج بھی خاک ہند کا چپہ چپہ روشن اور منور ہے۔

حضرت مولانا شمس الدین یحییٰ کے خلافت نامہ میں سلطان المشائخ نے جن اوصاف کا ذکر کیا ہے ان سے تفویض خلافت کے لیے کس طرح کی روحانی اہلیت اور استقامت چاہیے۔اس کا اندازہ ہوتا ہے ذیل میں خلافت نامہ کے کچھ حصے کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

’’ثم ان الولد۔۔الخ

معلوم ہونا چاہیے کہ تقوی شعار، محبوب عالم اور اپنے رب کی طرف یکسوئی اختیار کرنے والا فرزند عزیز یعنی شمس الملۃ الدین محمد بن یحییٰ (اللہ تعالیٰ اہل یقین اور پرہیزگاروں پر انوار کی برسات فرمائے۔) جس نے اپنا قصد وارادہ ہماری طرف درست کرلیا ہے اور خرقہ ارادت زیب تن کر لی ہے۔ اور ہماری صحبت سے حظ وافر حاصل کرلیا ہے تو میں ارشاد وہدایت کی اجازت عطا کرتا ہوں۔ جب کہ وہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی واتباع میں ثابت اور مستقیم رہیں، تمام اوقات طاعات میں مستغرق کرلیں، اور نفسانی وسوسوں اور خطرات سے دل کو پاک ومحفوظ رکھیں، دنیا اور اسباب دنیا سے روگردانی اختیار کریں، دنیا اور ابنائے دنیا سے منہ موڑ لیں، اور بالکلیہ تمام علائق سے جدا ہوکر اللہ کی طرف متوجہ ہوجائیں، حتی کہ اس کے دل میں عالم قدس کے انوار تاباں ہوجائیں اور عالم ملکوت کے اسرار ظاہر وروشن ہوجائیں اور اس کے لیے شناخت حق کا دروازہ کھل جائے، (تبھی) وہ اپنے مریدین کو خرقہ پہنائے اور اہل یقین کو اعلیٰ مقامات کی طرف رہنمائی کے لیے انہیں مرشد بنائے، جس طرح کہ مجھے میرے شیخ نے نگاہ خاص سے ملاحظہ کرنے کے بعد اجازت عطا فرمائی تھی اور خرقہ پہنایا تھا۔(سیر الاولیا فارسی،ص:۲۳۰)

اندازہ کریں محبوب الٰہی نے اپنے خانقاہی نظام میں خلافت واجازت دینے کے لیے کتنے سخت شرائط رکھے تھے۔آج تو خلافت ریوڑیوں کی طرح بانٹی جارہی ہے، ہرکس وناکس خلافت کا دعویٰ دار بن بیٹھا ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ احترام ورواداری

ہندوستان ہمیشہ سے مختلف تہذیب وتمدن، رنگ ونسل، زبان وفلسفہ، آداب واطوار اور مختلف کلچر کا مرکز رہا ہے۔ ہر دور میں یہاں کی زمین میں رنگارنگ چیزیں شامل رہی ہیں۔اس کی مثال اس گلستاں کی طرح ہے جس میں نوع بہ نوع، رنگ برنگ پھول کھلے ہیں۔مختلف درخت اور پودے ہیں، درختوں پر لگے پھلوں کا الگ الگ مزہ ہے۔چمن میں ہزار اختلاف ہے اس کے باوجود سبھی اسی گلستاں کے حصے ہیں اور سبھوں نے مل کر گلستاں کی رونق بڑھا رکھا ہے۔ہندوستان میں اسی رنگارنگ کثرت نے اس گلستاں کو جنت نشاں بنایا ہے۔یہاں کبھی اکائیوں کا وجود مٹا نہیں، بلکہ ہر دور میں تمام کثرتیں رہیں مگر ان کثرتوں میں ایک اٹوٹ وحدت باقی رہی، اور یہی وحدت ہندوستان میں قومی یکجہتی، آپسی رواداری، باہمی بھائی چارگی، امن وسکون اور ایک تکثیریت پسند سماج (Pluralistic Society) کو زندہ رکھنے میں تاریخ عالم میں انفرادی مقام اور نشان امتیاز قرار پائی۔اس کثیر الجہات سماج کو وجود میں لانے کے لیے سیاسی حکمران، ارباب علم وادب، صاحبان فکر وفلسفہ، دانش مندان زبان وثقافت اور فنون لطیفہ کے ماہرین کا ہاتھ رہا ہے۔مگر سب سے زیادہ زمینی سطح پر جنھوں نے بےلوث ہوکر کام کیا ہے وہ یہاں کے رشی منی اور صوفی سنت حضرات رہے ہیں۔صوفیہ کے گروہ میں بھی ہندوستان میں خواجگان چشت کا اس سلسلے میں اہم ترین رول ہے۔انہوں نے ہر سطح پر وطنی آہنگی اور رواداری کو عملی طور پر فروغ دیا ہے۔انہوں نے گیان اور علم بانٹنے میں تفریق نہیں کی۔لنگر کھلانے اور ہر طبقے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے میں شرم محسوس نہیں کیا ،حسن سلوک میں اہل وطن کے ساتھ وہی کردار نبھایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے غیر مسلموں کے ساتھ نبھایا، سماجی احترام اور انسانی احترام میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے میں تفریق نہیں کی، ذات پات، چھواچھوت، رنگ ونسل، اونچ نیچ، شریف رذیل غرض کہ ساری عصبیتوں کو صوفیہ نے پاؤں تلے روند دیا، اور ایک معیار قائم کیا اور اسی پر ڈٹے رہے کہ جو مالک کا زیادہ قریبی ہے، اور مالک کی مخلوق کے ساتھ زیادہ مہربان ہے وہی مہان ہے، عارف ہے اور وہی سچا بھگت ہے۔ان سب کے باوجود جب ضرورت پڑی تب انہوں نے وہ کرامتیں بھی دکھائیں جو ساحرین ہند کے لیے عصائے موسوی ثابت ہوئیں اور وہی نتیجہ بھی برآمد ہوا جو ساحرین فرعون کے ساتھ ہوا تھا:

والقی السحرۃ ساجدین، قالوا آمنا برب العلمین، رب موسی وھارون۔ (اعراف: ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۲۳)

(اور سارے جادوگر سجدوں میں گر گئے، اور کہہ اٹھے، ہم تمام جہان کے رب پہ ایمان لائے، جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے)

حضرت سلطان المشائخ کے زمانے کے متعلق عام مؤرخین یہی تبصرہ کرتے ہیں کہ شواہد سے یہ پتا نہیں چلتا کہ بابا فرید اور حضرت خواجہ خواجگاں کی طرح محبوب الٰہی کے یہاں غیر مسلم قوموں نے اسلام کے تئیں وہ دل چسپی دکھائی ہو جو آپ کے پیران عظام کے یہاں دکھائی تھی۔ اس کے پیچھے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں مشائخ صوفیہ نے غیر مسلم اقوام کے تئیں مذہبی رواداری کا اہتمام کیا۔ اسلام کے نام پر کسی پر زور زبردستی نہیں کی۔ مذہب کے نام پر انھوں نے کہیں بھی ظلم کو سپورٹ نہیں کیا۔ ایک سماج کے اندر مختلف اکائیوں کو برداشت کیا۔ تحمل، یکجہتی اور امن وسلامتی کو اپنا طرہ امتیاز بنایا۔ انھوں نے عملی طور پر یہ بتایا کہ آپ کے لیے آپ کا دین ہے اور ہمارے لیے ہمارا دین ہے، ہاں انسان ہونے کے ناطے ہم سب ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہیں۔ دوسری اقوام کے حوالے سے سلطان المشائخ کی جانب منسوب یہ واقعہ عام طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

''ایک دن محبوب الٰہی جماعت خانے کی چھت پہ امیر خسرو کے ساتھ تفریح فرما رہے تھے، جمنا کے کنارے کچھ لوگوں پر نظر پڑی وہ اپنے مذہبی تہواروں میں مصروف تھے آپ نے فرمایا:

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

امیر خسرو نے فوراً ہی دوسرا مصرع کہا:

من قبلہ راست کردم بہ سمت کج کلاہے

(میں نے اپنا قبلہ (اس بادشاہ) کج کلاہ کی طرف سدھ کرلیا۔) (تاریخ مشائخ چشت، خلیق احمد نظامی، ص:۲۹۷)

صوفیہ رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ یہ حضرات اس جذبے سے بھی شدید سرشار ہوتے ہیں کہ دوسروں تک اسلام کی حقیقی تعلیمات پہنچے۔ وہ بھی اللہ ورسول کو پہچانیں، حضرت مولانا نظام الدین اورنگ آبادی (۱۱۴۲ھ) کو حضرت مولانا شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی (۱۱۴۲ھ) نے ہدایت دی تھی کہ:

''ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ باہم صلح ورواداری قائم رکھو، اگر کوئی ہندو تمہاری صحبت سے گرویدگی یا عقیدت کی بنا پر تمہارے پاس آنے جانے لگے اور تم سے ذکر وفکر اور مراقبہ وغیرہ سے متعلق پوچھے تو فوراً بتا دو کیوں کہ ذکر اپنی خاصیت کے سبب اسے اسلام کے بندھن کی طرف کھینچ لے گا''۔

(مکتوبات کلیمی، مترجم، ص:۷۴)

حضرت سلطان المشائخ نے ایک جملے میں یہ بتایا کہ لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ اسے کسی عملی مسلمان کی صحبت میسر آجائے تو رغبت پیدا ہو جائے گی۔ فوائد الفواد میں مذکور ہے کہ '' ایک مسلمان غلام حضرت کی مجلس مبارک میں حاضر ہوا اور ساتھ میں اپنے ایک ہندو دوست کو بھی لایا، خدمت میں عرض گذار ہوا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ حضرت نے اس غلام سے پوچھا یہ بھائی اسلام کی طرف رغبت رکھتا ہے،

غلام نے عرض کیا اسے آپ کی خدمت میں اسی لیے لایا ہوں کہ آپ کی نظر کیمیا اثر سے یہ مسلمان ہو جائے، یہ سن کر حضرت آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا: کسی کے کہنے سننے سے اس قوم کا دل نہیں پھرتا۔ ہاں! اگر کسی صالح مرد کی صحبت میسر آجائے تو امید کی جاتی ہے کہ اس کی صحبت کی برکت سے وہ مسلمان ہو جائے۔'' (فوائد الفواد، ص:۲۴۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت سلطان المشائخ نصف صدی تک مسند وارشاد و ہدایت پر دہلی جیسی مرکزی جگہ پر متمکن رہے۔ اور آپ کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا رہا۔ لنگر سب کے لیے عام تھا، ہندوستان کے دور دراز مقامات سے لاکھوں لوگ آتے تھے اور حضرت خواجہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوتے تھے، امید یہی ہے کہ بڑی تعداد میں لوگوں نے آپ کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا ہوگا، البتہ آپ کے پیران عظام کا جیسا طریقہ تھا کہ وہ اخفائے حال کرتے تھے۔ اظہار سے زیادہ عمل پر توجہ مرکوز کرتے تھے، یہی کچھ آپ کے یہاں بھی ہوا ہوگا۔ فوائد الفواد میں کئی مقامات پر ہندو جوگیوں اور دیگر لوگوں کی ملاقات کا ذکر ہے۔ ایک مرتبہ چھ جوگی حضرت کی خدمت میں آ گئے جماعت خانے کی دہلیز پہ مراقبہ کرنے لگے، حضرت نے سب کو اندر بلایا، سبھوں نے اپنے احوال بیان کیے، اپنے ۳۰، ۴۰، ۵۰ سال تک کے طویل ترین مراقبے میں رہنے کا ذکر کیا۔ اس کے بعد عرض گذار ہوے کہ ہمیں غیبی اشارے سے بتایا گیا کہ دہلی میں ایک بڑے بزرگ موجود ہیں تو ہم نے آپس میں مل کر طے کیا کہ شیخ کا دیدار کریں اور انہیں اپنی عقیدت پیش کریں، اس کے سوا اور کچھ مطلوب نہیں ہے۔ یہاں سے ہم اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ جائیں گے۔ حضرت بہت دیر تک ان سے اخلاق ومحبت کے ساتھ بات کرتے رہے اور پھر انہیں رخصت کیا۔ (مقدمہ فوائد الفواد، ص:۱۰۴)

اسی طرح مولانا یوسف کلاکھیری ایک برہمن کو حضرت کی خدمت میں لائے۔ اس نے بھی مراقبہ کیا، مولانا نے بعد میں ان سے دریافت کیا کہ شیخ کی صحبت میں جا کر تم نے مراقبہ شروع کر دیا؟ تب اس نے کہا کہ:

> میں نے مراقبہ کیا تا کہ دیکھوں وہ کون سی نعمتیں ہیں جس کا عکس حضرت کی گفتگو میں پڑتا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی مگر سراغ نہ ملا اور کسی جانب سے ان نعمتوں کی طرف پہنچنے کا راستہ مجھے نہیں ملتا تھا، ایشور ہی جانتا ہے کہ شیخ کے باطن میں کون سی نعمتیں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی منش (انسان) نہ ان نعمتوں کو پا سکتا ہے نہ ان کا انوبھو (تجربہ) کر سکتا ہے، جب میں نے یہ دیکھا تو اچرج (حیرت) میں پڑ گیا، اب ان سے بات ہی کیا کرتا۔ (قوام العقائد، بحوالہ فوائد الفواد مقدمہ، ص:۱۲۱)

خلیق احمد نظامی اور دیگر مورخین نے لکھا ہے کہ میوات کا علاقہ جو غیاث پور سے جانب جنوب متصلا واقع تھا، جہاں کے رہنے والوں میں رہزنی، چوری، لڑائی عام بات تھی، کچھ عرصہ پہلے اس جانب کے شہر کے دروازے ناصر الدین محمود (۱۲۶۶ء) کے زمانہ میں سر شام ہی بند کر دیے جاتے تھے، غیاث الدین بلبن (م ۱۲۸۷ء) کو کئی بار تادیب کرنی پڑی، حضرت خواجہ نظام الدین کے فیوض و برکات اور ان کی تعلیم و تربیت کے اثرات سے عجیب

تبدیلی آئی اور عین ممکن ہے کہ بڑی تعداد میں میواتیوں نے حضرت کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا ہو۔ فوائد الفواد کے بعض مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے ہندوؤں کو اسلام کی حقانیت کا خوب احساس ہو چکا تھا، بعض مشکلات (مثلاً ذات، برادری، قبیلہ) کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کرتے تھے، دل سے مانتے تھے اور اظہار نہیں کرتے تھے۔ امیر حسن سجزی رقم طراز ہیں:

''حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ جو ہندو کلمہ پڑھے اور اللہ تعالیٰ کو ایک جانے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بھی قائل ہو لیکن جب مسلمان آئیں تو چپ ہو جائے اس کا انجام کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا اس کا معاملہ حق سے ہے خواہ اسے بخشے خواہ عذاب دے۔ پھر فرمایا کہ بعض ہندوؤں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام سچا ہے، لیکن پھر بھی مسلمان نہیں ہوتے۔ (فوائد الفواد، ص:۱۰۶)

آپ کی زندگی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ آپ نے اپنے عہد کے مسلمانوں کی خصوصی تربیت، ان کی اصلاح کی اور انہیں گناہوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مختلف تدبیر اپنائی۔ عملی طور پر اپنی صحبتوں سے انہیں فیض یاب کیا، مولانا ضیاء الدین برنی کے بیان کے مطابق لوگوں میں بہت بڑا انقلاب آیا، دلوں کے احوال پلٹے، اور تعلیمات اسلام پہ عمل کے لیے باہمی مقابلہ شروع ہو گیا۔ حضرت خواجہ خواجگان کے عہد میں اور حضرت بابا صاحب کے عہد میں جو اسلام تیزی سے پھیلا، حضرت سلطان المشائخ نے اپنی مساعی جمیلہ اور ارشاد و ہدایت کے ذریعے نظام اسلام، قوانین اسلام کو ہر شخص پر انفرادی طور پر نافذ کرنے کی کوشش کی اور آپ کی محنت ثمر بار بھی ہوئی، اسی وجہ سے حضرت اپنی گفتگو میں الاسلام یعلو، پر خصوصی توجہ مرکوز کرتے تھے، یعنی بادشاہ سے لے کر رعایا تک، عوام سے لے کر خواص تک ہر بندے کو چاہیے کہ اپنے تمام ارادوں سے نکل کر اسلام کو اپنے اوپر غالب کرے، تعلیمات اسلام اور قوانین اسلام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

اس سے بھی اہم بات یہ تھی آپ نے پورے ہندوستان میں اس پیغام کو عام کرنے کے لیے، روحانیت، مساوات، تعلیمات اور اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے جید خلفا تیار کیے، ان کی شخصیتوں کو تراش کر ہندوستان کے مختلف خطوں میں روانہ فرمایا جو بہت بڑا کارنامہ تھا۔ بنگال میں حضرت خواجہ اخی سراج کو متعین کیا، دکن میں حضرت برہان الدین غریب کو، مولانا حسام الدین ملتانی گجرات تشریف لے گئے، ان نفوس کی وجہ سے یہ علاقے بعد میں مرکز اسلام قرار پائے۔ خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ جب دہلی سلطنت کا مرکزی نظام ختم ہو گیا تو اس کا اثر خانقاہوں پر بھی پڑا مگر اس کے زبردست فائدے وجود میں آئے اور نقصانات کی تلافی بھی ہو گئی۔

''اس لامرکزیت سے بعض شدید نقصانات ضرور ہوئے لیکن ایک ایسا انقلاب آیا جس نے ان نقصانات کی تلافی کر دی۔ اور وہ یہ کہ ان علاقوں (بنگال، مالوہ، دکن، گجرات) میں اسلامی تہذیب و تمدن کی سرگرمیاں بڑھ گئیں، اور اس سے قبل جو تمدنی عظمت صرف دہلی کو حاصل تھی وہ اب بنگالہ، دولت آباد، گلبرگہ، برہان پور، احمد آباد کو بھی حاصل ہو گئی۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص:۱۹۷)

آگے لکھتے ہیں:

بنگال، گجرات ،مالوہ، دکن وغیرہ میں جوآزاد سلطنتیں قائم ہوئیں ان کے پیچھے ایک مضبوط معاشرہ نظرآتا ہے یہ معاشرہ کس طرح وجود میں آیا؟اگرتاریخ کے اشاروں پرغور کیا جائے تومعلوم ہوجائے گا کہ یہ سماجی نظام مشائخ چشت کی کوششوں کا مرہون منت تھا۔انہوں نے علاقوں میں بسنے والے مختلف الخیال اورمختلف المذاہب لوگوں میں اتحادعمل اوراتحادفکر پیدا کیا۔اوران منتشرطبقوں کوایک ایسے سماجی رنگ میں رنگ دیا جس نے ایک مضبوط معاشرہ کی شکل اختیار کرلی۔(تاریخ مشائخ چشت،ص:۱۹۷)

مشربی توسع اور مشائخ کا احترام

مرشد گرامی حضرت داعی اسلام کی صحبت میں بارہا سنا کہ ''**المشائخ کلھم کنفس واحدۃ**'' تمام مشائخ ایک جان کی طرح ہیں۔مسندارشادوہدایت پرفائزسب کا مقصداورمطمح نظرایک ہوتاہےاوروہ ہےخلق خدا کی رہنمائی اورانہیں اللہ تک پہنچانا۔مشائخ کے درمیان آپس میں تعصب وچپقلش نہیں ہوتا بلکہ وہ حددرجہ ایک دوسرے کا احترام وتوقیر کرتے ہیں،البتہ جہاں کسی مسئلے میں اختلاف ہوتاہے وہاں اپنے شیخ کی تحکیم(حکم ماننا) اوردوسرے مشائخ کی تعظیم واجب ہے۔ میرے مرشد نے فرمایا:

یادرکھ اس بات کو تو اے جوان
اولیا سے پر ہے یہ ساراجہان
جس کسی کو دیکھ اپنا شیخ جان
غیریت تو مٹادے میری جان
غیریت اس راہ میں مردود ہے
عینیت ہی اصل اور مقصودہے
اختلافی مسئلے میں اے اخی
پیروی واجب ہے اپنے شیخ کی

قدیم مشائخ کے یہاں نہ صرف مشائخ باہم ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے بلکہ استفادہ کرتے،حتی کہ اپنےنقص کودورکرنے کے لیے ایک دوسرے کی صحبت میں بیٹھتے۔ایک سلسلے کے مشائخ دوسرے سلسلے کے مشائخ کی کتابیں پڑھتے پڑھاتے تھے،یہی روایت قدیم مشائخ کی خانقاہوں کی خصوصیات میں شامل تھی۔حضرت بابا فریدگنج شکرقدس سرہ اورخواجہ بہاءالدین زکریا ملتانی سہروردی کے درمیان باہم انسیت تھی،حضرت بابا صاحب شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ کی عوارف المعارف اپنے سرہانے رکھتے تھے،اورمریدین کودرس دیتے تھے۔حضرت سلطان المشائخ نے عوارف کا درس حضرت بابا صاحب سے لیا،خواجہ بہاءالدین زکریا ملتانی کے

پوتے حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح اور سلطان المشائخ کے مابین حد درجہ خوشگوار تعلقات تھے اور ایک دوسرے کا غیر معمولی احترام کرتے تھے۔ صاحب سیر الاولیا نے دونوں بزرگوں کے درمیان پانچ بار ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اور ملاقات کی قدرے تفصیل بھی لکھی ہیں اور باہمی گفتگو کے چند عارفانہ نکات بھی۔ خواجہ رکن الدین سہروردی قدس سرہ جب دہلی تشریف لاتے تو باوجود کہ آپ شاہی مہمان ہوتے، مگر فرماتے ہیں کہ میں ملتان سے دلی صرف حضرت نظام الدین اولیا کی محبت اور شوق ملاقات میں آتا ہوں۔ شیخ کا استقبال و احترام جس قدر شاہی دربار سے ہوتا تو دوسری طرف اس سے بڑھ کر سلطان المشائخ بھی علما اور عرفا کے ساتھ ان کے لیے چشم براہ ہوتے تھے۔ ایک سفر میں حضرت سلطان المشائخ نے رخصت ہوتے وقت کھانا اور سو اشرفیاں اور اعلیٰ درجہ کے کپڑے حضرت شیخ رکن الدین کی خدمت میں بہ طور نذر پیش کیا۔ اشرفیوں کی طرف دیکھ کر شیخ رکن الدین نے حضرت خواجہ کو مخاطب کر کے فرمایا، **استر ذھبک**۔ تو محبوب الٰہی نے برجستہ فرمایا: **استر ذھبک، و ذھابک، و مذھبک**۔ ایک بار قیام دہلی کے درمیان حضرت شیخ رکن الدین قدس سرہ حضرت محبوب الٰہی کی زیارت کے لیے خانقاہ شریف آئے۔ پاؤں میں کچھ تکلیف تھی حضرت نے ڈولے سے باہر نکلنے کی کوشش کی، تو محبوب الٰہی نے بضد ہو کر روک دیا۔ دونوں سعید روحوں کی باہمی ملاقات کے دوران شیخ رکن الدین کے بھائی شیخ عماد الدین اسماعیل کے دل میں بعض عارفانہ نکات حل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ دونوں بزرگوں سے اجازت لے کر عرض گذار ہوئے کہ؟ ''ہجرت نبوی میں کیا مصلحت تھی''۔ (یعنی اس کا روحانی پہلو کیا تھا۔) حضرت شیخ رکن الدین نے فرمایا: حضور کے بعض کمالات باطنی کی تکمیل ہجرت پر منحصر تھی اس لیے مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ حضرت محبوب الٰہی نے ارشاد فرمایا کہ:

> ''ایک وجہ اس فقیر کے دل میں آتی ہے، لیکن یہ وجہ کسی تفسیر اور کتاب میں میری نظر سے نہیں گزری کہ مدینہ میں رہنے والے ناقص تھے ان کے نقص کو کمال میں تبدیل کرنے کے لیے اللہ نے آپ کو ہجرت کرنے کا حکم دیا تا کہ آپ ناقصوں کو کامل بنا دیں۔'' (سیر الاولیا، ص: ۲۵۶)

اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے ایک بار میرے مرشد گرامی داعی اسلام نے فرمایا: اس میں دونوں بزرگوں کی الگ تشریح میں حکمت و اشارہ یہ تھا کہ میں ملتان سے اس لیے دہلی آیا ہوں تا کہ میرے باقی ماندہ کمالات آپ کے فیض سے حاصل ہو جائیں۔ اور سلطان المشائخ کے جواب میں یہ اشارہ ہے کہ میں ناقص تھا مجھے کمال تک پہنچانے کے لیے آپ کو ملتان سے دہلی بھیجا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قدیم مشائخ کی خانقاہوں میں نہ صرف مشربی توسع تھا بلکہ اخذ و استفادہ، نقص کو کمال میں بدلنا، کمال کو عروج عطا کرنا، باہمی فیض رسانی جیسی خوبیاں شامل تھیں۔ اہل خانقاہ باہمی تفرقہ سے نہیں، بلکہ اپنے روحانی اتحاد سے جانے جاتے تھے اسی لیے وہ سرخ رو تھے اور اہل زمانہ کے لیے سراپا مثال تھے۔ آج اس چیز کی کتنی ضرورت و اہمیت ہے یہ بتانے کی چنداں حاجت نہیں۔

حکمرانوں سے تعلقات

اہل تصوف کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت رہی کہ انہوں نے حکمراں طبقے سے اپنے کو دور رکھا اور اگر بعض صوفیہ نے تعلق رکھا بھی جیسا کہ مشائخ سہروردی کے تذکروں میں مذکور ہے تو ان کی نیت خیر کی تھی۔ انہوں نے عوام کی خیر خواہی اور حکمراں و امرا طبقے کی اصلاح، اعلائے کلمۃ اللہ اور انکشاف حق کی خاطر وابستگی رکھی، خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے حضرت شیخ رکن الدین سہروردی قدس سرہ کے تذکرہ میں مروی ہے کہ وہ کئی بار دہلی تشریف لائے، راستے میں اپنی سواری کو روکتے جاتے تاکہ اہل ضرورت اپنی درخواستیں سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ان کی سواری میں ڈالتے جائیں، بادشاہ سے ملاقات ہوتی تو لوگوں کی درخواستیں سلطان کے سامنے پیش کرتے اور بادشاہ ہر درخواست کو بغور پڑھتا اور اس کے پیچھے اسی وقت حکم صادر فرما دیتا۔ حضرت شیخ رکن الدین واپسی کے وقت تمام درخواستوں کو ساتھ لیتے آتے۔ (سیر العارفین، ص: ۱۲۳)

سلطان فیروز شاہ تغلق (م ۷۵۳ھ)، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت (۷۸۵ھ) کا بڑا قدرداں تھا جب حضرت خواجہ بادشاہ سے ملنے جاتے تو اوچہ اور دہلی کے باشندے اپنی اپنی درخواستیں پیش کرتے اور سلطان ان پر احکام مناسب جاری کر دیتا اس طرح ہزاروں آدمی فائز المرام ہو جایا کرتے تھے۔ (۱)

ان کا دوسرا بڑا مقصد حکمراں طبقے کی اصلاح اور ان کے سامنے حق گوئی ہوتی تھی، غیاث الدین تغلق (۱۳۲۵ء) نے جب دربار سجایا اور سلطان المشائخ کو دربار میں سماع کے مسئلے پر گفتگو کے لیے بلایا تو اس میں حضرت شیخ علم الدین سہروردی نے فیصلہ حق فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: ''جو لوگ سماع دل کی غذا کے لیے سنتے ہیں ان کے لیے مباح اور جو حظ نفس کے لیے سنتے ہیں ان کے لیے حرام ہے۔ بادشاہ حضرت شیخ کا یہ فیصلہ سن کر خاموش ہو گیا اور کوئی حکم بھی صادر نہیں کیا۔'' (سیر الاولیا، ص: ۸۰۴)

البتہ مشائخ چشت نے اول دن سے ہی اپنے کو سلاطین وقت سے بے تعلق رکھا اور ان کے اختلاط سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔ انہوں نے دینی رہنمائی، اسلامی معاشرہ کی اصلاح، درپردہ امرا و اعیان سلطنت کے تزکیہ و تطہیر اور ان میں روحانیت و انابت کی روح پھونکنے میں کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی۔ دنیا کی آلائشوں سے بچتے ہوئے اور اہل دنیا سے بے رغبت رہ کر ان کی اصلاح کرنا، مشائخ چشت کا شعار اور ان کا مقدس ترکہ قرار پایا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے خوب صورت تبصرہ کیا ہے کہ ''ایک طرف وہ دربار کے غلط رجحانات کی اصلاح اور وقت کے فتنوں کے استیصال سے غافل اور غم اسلام سے خالی اور اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل سے بے فکر نہ تھے۔ دوسری طرف وہ ایک اصول اور عقیدے کے طور پر یہ طے کر چکے تھے کہ ان کو دربار سے براہ راست کوئی تعلق رکھنا نہیں ہے۔ (تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ سوم، ۸۱)

(۱) تذکرہ حضرت سید جلال الدین از جناب مولوی سخاوت صاحب، انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا مڈل اسٹ کلچر اسٹڈیز، حیدر آباد، ۱۹۶۲ء

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں خواجگان چشت اسلامی سلطنت کے مؤسس بھی ہیں، اس کو استحکام عطا کرنے والے، مصلح بھی ہیں اور پائیداری (Sustainability) عطا کرنے والے بھی ہیں۔ ظاہری طور پر قطعاً انہوں نے اپنے آپ کو دربار سے ظاہری تعلقات سے الگ رکھا، مگر باطنی طور پر زمام سلطنت انہیں کے ہاتھ میں رہی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کی سلاطین وقت سے کوئی ملاقات ثابت نہیں البتہ جس اخلاص، بےلوثی اور نیک نیتی کے ساتھ آپ نے دعوت اور روحانیت کو زندہ کرنا شروع کیا، آپ کو اس پر غایت درجہ کامیابی ملی، روایات کے مطابق حکمرانوں اور شعبدہ بازوں نے آپ کو تنگ کرنے کی کوشش کی نتیجۃً وہ خود نیست و نابود ہو گئے یا مسخر ہو گئے، مگر خواجہ ہند کا مشن آگے بڑھتا چلا گیا، حضرت قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ کے عہد میں سلطان التمش آپ سے بےحد متاثر مطیع و منقاد تھا حتی کہ آپ کی نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت انہیں ملی، یہ ان کی خوش بختی کی معراج تھی، تمام مورخین التمش کو عادل اور منصف بادشاہ بتاتے ہیں جس کی تربیت باطنی میں حضرت قطب صاحب کا ہاتھ تھا، بابا فرید گنج شکر قدس سرہ کے عہد میں کئی بادشاہ آپ کے عقیدت مند رہے۔ لیکن بابا صاحب کا کوئی تعلق نہیں رہا، ہمیشہ بے نیازی رہی۔

حضرت سلطان المشائخ کے عہد میں آپ کی پیدائش سے لے کر وفات تک پروفیسر نثار احمد فاروقی کے قول کے مطابق:

> ''کہتے ہیں کہ آپ نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ پایا مگر صحیح یہ ہے کہ آپ کی ولادت سے وفات تک دہلی کے تخت پر چودہ بادشاہ بیٹھے اور آپ کے دہلی تشریف لانے کے بعد گیارہ تخت نشین ہوئے، ان میں کم از کم تین حضرت کے معتقد تھے مگر آپ نے کبھی دربار کا رخ نہیں کیا، نہ کوئی جاگیر قبول کی، نہ وظیفہ اور منصب لیا۔'' (مقدمہ فوائد الفواد، از نثار احمد فاروقی، ص: ۱۱۴)

سلطان المشائخ کی بادشاہوں سے اس قدر دوری تھی کہ ان سے ملاقات کے لیے جانا تو درکنار بادشاہ جلال الدین خلجی نیازمندی اور شرف باریابی چاہ رہا ہے مگر پھر بھی آپ نے اجازت نہیں دی۔ اب آپ بتائیں اصل سلطان کون ہے؟ خواجہ نظام الدین اولیا یا دہلی کے تخت پر بیٹھنے والے حکمران؟ البتہ آپ بالواسطہ بادشاہوں کی اصلاح اور عوام کے ساتھ عدل و انصاف قائم کرنے سے غافل بھی نہ رہے۔ بادشاہوں کی اصل کنجی ان کے ہم نشین، مصاحب اور امراء ہوتے ہیں، حضرت سلطان المشائخ نے ان کی نس نس میں اعلیٰ اوصاف و اخلاق، تعلق بالحق اور تعلق بالخلق اور روحانی جذبات، عاشقانہ درد و سوز، غم اسلام غرض تمام انسانی اور روحانی قدریں ایسی داخل کردی تھی کہ معاشرے کی حالت بدل گئی، ہر میدان میں ایک نیا انقلاب بپا ہو گیا اور چند ہی برسوں میں نظام الدین والدنیا کا ظہور ہو گیا، ان اثرات کو تفصیل سے ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب ''تاریخ فیروز شاہی'' میں بیان کیا ہے، پروفیسر نثار احمد فاروقی مؤلف قوام العقائد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”معلوم جہانیان باد امرا و خانان وملوک کہ بخدمت شیخ پیوند داشتند ہر یکے در جامہ قبا سالکان طریقت بودند وحدیث وجدنا فی القباء ماطلبنا فی الکساء، درحق ایشاں سالم و درین راہ جان و مال ہمہ درمیان آوردہ و درحق صرف کردہ۔

مراد اہل طریقت لباس ظاہر نیست کمر بخدمت سلطان ببند وصوفی باش

وایشاں ہر یکے از ینہا بودند اگر شمہ از مشغولی باطن و معاملات ایشاں بیان کردہ آید کتاب مطلوب گردد۔(مقدمہ فوائد الفواد از نثار احمد فاروقی)

دنیا والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ امرا، خان اور ملوک جو حضرت شیخ سے ارادت رکھتے تھے لباس امارت میں سالکان طریقت تھے اور یہ قول کہ جو ہم گڈریوں میں ڈھونڈتے ہیں وہ ہم نے قبا میں پالیا، ان امرا پر پورا صادق آتا تھا وہ اپنا جان و مال سب راہ خدا میں صرف کرتے تھے۔

اہل طریقت کا مطلوب درویشوں کا سا لباس نہیں ہے بلکہ بادشاہ کی خدمت کرو اور صوفی بن کر رہو۔

ان میں سے ہر ایک ایسا تھا کہ ان کی مشغولی باطن اور معاملات کا حال لکھا جائے تو ایک طویل کتاب بن جائے۔

سلاطین سے بے رغبتی، حق گوئی اور درپردہ امرا، اور ہم نشینوں کی تربیت واصلاح کا فریضہ آپ کے خلفا نے بھی انجام دیا۔ حضرت شیخ قطب الدین منور، حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت شیخ حسام الدین ملتانی حضرت شیخ برہان الدین غریب، حضرت شیخ فخر الدین زرادی، حضرت شیخ اخی سراج قدس سرہ کا سامنا بھی سلاطین وقت سے ہوا مگر آپ نے سب کی ایسی تربیت فرمادی تھی کہ اللہ کے خوف کے علاوہ وہ غیر اللہ کے خوف سے بے نیاز تھے، دنیا کی طمع اور لالچ نے کبھی ان کا دامن داغ دار نہیں کیا۔ انہوں نے بادشاہی جاہ وجلال کی نمائش کے موقع پر کلمہ حق کہنے سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھا اور کامل اطمینان کے ساتھ سب کی اصلاح میں زندگی کھپادی، مردان حق کی یہی شان ہے، توحید ان کا مقصد، حق گوئی و بے باکی ان کا طرۂ امتیاز اور استقامت ہی ان کی زندگی ہے۔ حضرت سلطان المشائخ نے اپنے مریدین اور خلفا کے ذریعے کشت ہند پر ایسی بارش نازل فرمائی ہے، جس کے لیے تمام اسلامیان ہند تا قیامت ان کے لیے سراپا سپاس اور منت شناس رہیں گے۔

صحبت مشائخ اور مجالس علم وتزکیہ

مشائخ کے یہاں کی سب سے بڑی قیمتی شئی ان کی صحبت وتربیت، مجلس علم وذکر اور درس تصوف وسلوک ہے۔ خلافت کے شرائط میں یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ بیعت اسی شیخ کے ہاتھ پہ کی جائے گی جس کی صحبت واجازت کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو۔ صحبت کا ثبوت صحابہ کی سراپا زندگی ہے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں دین سیکھا۔ علم الکتاب اور فقہ الکتاب انہیں دونوں کی فہم صحبت رسالت سے ملی، حضور کی صحبت

سے صحابہ کے اندر جو تبدیلی آئی ہر سطح پر دنیا میں اس کے نمایاں اثرات مرتب ہوئے، مشائخ کبار اتباع صحابہ میں خود بھی کسی نہ کسی شیخ کی صحبت و مجلس میں کمال حاصل کرتے ہیں اور پھر اجازت وخلافت کے بعد اپنی صحبت و تربیت کے ذریعے دوسروں کو کمال تک پہنچاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کتابی ایمان کی بہ نسبت صحبت کا ایمان پختہ اور مضبوط ہوتا ہے۔حضرت بابا فریدالدین گنج شکر قدس سرہ کے یہاں عوارف المعارف کا درس ہوتا تھا، ان دروس میں حضرت نکات درنکات نکالتے چلے جاتے تھے۔حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں:

”مجلس میں ایسی لذت اور باتوں میں ایسی تاثیر ہوتی تھی، عذوبت بیان اور لطافت تقریر کا یہ عالم تھا کہ مخاطب کے دل پر اثر کرتا تھا، حلاوت ایسی تھی کہ الفاظ کانوں میں رس گھولتے تھے اور سننے والا سوچتا تھا کہ کاش غایت ذوق وکیفیت میں اس وقت دم نکل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا“۔

(مقدمہ فوائدالفواد،ص:۵۹)

مجلسی گفتگو اور صحبت وتربیت دینے اور سلوک وتصوف کی کتابوں کے درس کا سلسلہ سلطان المشائخ نے نہ صرف باقی رکھا بلکہ ان مجالس میں ایسا رنگ و روغن چڑھایا کہ ان سے مستفیض علما اپنے وقت کے جنید و بایزید کہلائے،حضرت کی خانقاہ میں جہاں بہت ساری خصوصیات نظر آتی ہیں ان میں مرکزی حیثیت آپ کی صحبت میں لوگوں کا بیٹھنا،مجلس علم سے فائدہ حاصل کرنا، دروس تصوف سے عرفان اور روحانیت کی اعلیٰ منزلیں طے کرنا شامل ہے۔آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ دوسری قوموں کو اسلام کی طرف راغب کرنے اور دامن اسلام سے وابستہ ہونے کا سب سے اہم ترین ذریعہ باتوں کے بجائے کسی صالح مرد کی صحبت ہے، راج کمار ہردیو یعنی احمد ایاز نے اپنی ڈائری چہل روزہ میں اعتراف کیا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کی صحبت نے مجھے بصد خوشی ان کی غلامی قبول کرنے پر آمادہ کیا۔حضرت سلطان المشائخ کی مجالس عرفان وروحانیت کے حکمت آفرین نکات تو آپ کے خلفا کی کئی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں البتہ ان میں باضابطہ مستند مجموعے کی شکل میں حضرت امیر حسن علا سجزی نے ”فوائدالفواد“ کے نام سے جمع فرمایا ہے جسے تمام مشائخ اور مؤرخین نے قبول کیا ہے، یہ مجموعہ صوفیہ کے لیے سلوک کا دستورالعمل ہے، حضرت سلطان المشائخ کے کلمات وملفوظات کے متعلق امیر حسن سجزی لکھتے ہیں:

یہ غیبی ہیرے موتی اور لاریبی پھول، خواجۂ راستیں، لقب یافتہ و ما ارسلناک الا رحمۃ اللعالمین، فقیروں اور مسکینوں کے بادشاہ شیخ نظام الحق والشرع والدین متع اللہ المسلمین بطول بقائہ، (آمین) کے خزانہ تلقین اور نہاں خانۂ یقین سے جمع کیے جاتے ہیں۔اور جو کچھ اس شمع محفل ملکوت سے کانوں تک پہنچا، چاہے وہ حضرت کا عین لفظ ہو یا اس کے معانی، اسے اپنی محدود سمجھ کے موافق لکھ لیا۔اور چونکہ اس مجموعے سے دردمندوں کے دل بہت فائدہ اٹھائیں گے۔اس لیے اس کا نام فوائدالفواد رکھا ہے۔اور اللہ ہی مدد کرنے اور اسی پر بھروسہ ہے۔(فوائدالفواد،ص:۱۳۹)

یہی وہ ہیرے موتی اور لاہوتی نغمے تھے جنہیں سن کر ایک عالم جن کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا، وقت کے مشاہیر علما نے اپنی گردن خم کردی۔ استاذ الاساتذہ مولانا شمس الدین اور مولانا صدر الدین ناولی دونوں دہلی میں اپنے وقت کے نامور استاذ مولانا ظہیر الدین بھکری (سندھی) کے جید شاگرد تھے، ایک دن وہ سلطان المشائخ کے علم اور دقت نظری کا امتحان لینے کے لیے حاضر ہوئے جیسے ہی دونوں کی نظر سلطان المشائخ کے جمال پر پڑی، تاب نہ لا سکے ،دونوں نے سر قدموں پہ رکھ دیے۔ سلطان المشائخ نے دونوں سے فرمایا بیٹھ جاؤ، دونوں بیٹھ گئے، کچھ دیر کے بعد سلطان المشائخ نے فرمایا کیا شہر میں رہتے ہو؟ دونوں نے کہاہاں! پھر فرمایا کچھ پڑھتے ہو دونوں نے کہاہاں: ہم مولانا ظہیر الدین بھکری سے اصول بزدوی پڑھتے ہیں۔ جہاں تک ان کا سبق پہنچا تھا اور اس سبق میں ایک ایسا مشکل مقام رہ گیا تھا جو مولانا ظہیر الدین بھکری سے حل نہ ہو سکا تھا، محبوب الٰہی نے اسی مشکل مقام کے متعلق ان سے دریافت کرلیا۔ دونوں کے دونوں حیرت سے ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے اور قدم بوس ہو کر کہنے لگے کہ مخدوم! یہی مشکل مقام ہے جو اس سبق میں رہ گیا تھا۔ جس کے متعلق ہمارے استاذ مولانا ظہیر الدین نے کہا تھا کہ وہ اس مقام کو تحقیق کر کے بتائیں گے، سلطان المشائخ نے مسکرا کر اس مشکل مقام کو ان کی مرضی کے مطابق حل کر دیا۔ جس سے ان کی تشفی ہوگئی، جب وہ دونوں چلنے لگے تو سلطان المشائخ نے ایک تہبند مولانا شمس الدین یحییٰ کو دیا اور دستار مولانا صدر الدین کو دی۔ جب یہ دونوں بزرگ سلطان المشائخ کی ملاقات سے فارغ ہو کر باہر آئے تو آپس میں کہنے لگے کہ ہم نے شیخ کی عظمت و کرامت کے متعلق شہرت سنی تھی آج ان کے کمال کو دیکھ لیا۔ (سیر الاولیا،ص:۳۰۷-۳۰۸)

جب دونوں نے اپنے استاذ سے نفس واقعہ بیان کیا تو استاذ محترم بھی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ اس کے بعد دوسری ہی مجلس میں مولانا شمس الدین یحییٰ حضرت کے مرید ہو گئے، اور پھر بعد میں خلافت سے سرفراز کئے گئے۔ امیر خورد لکھتے ہیں کہ ''یہ وہی ہستی ہیں جو بہت بارعب ہیں۔ یہ مرد خدا صورتا و سیرتا اسلاف کا نمونہ ہے۔ اس زمانے کے تمام لوگ علما و مشائخ ان کے مطیع ومنقاد تھے۔'' (سیر الاولیا،ص:۳۰۸)

حضرت سلطان المشائخ کی مجلس علم و صحبت میں بڑے بڑے علما، زہاد اور عرفا بیٹھتے تھے۔ ان میں ہر ایک کو ان کے حسب حال جواب مل جاتا۔ حضرت سلطان المشائخ کی قلوب پہ بڑی گہری نظر ہوتی وہ خطرات کا بھی جواب دیتے تھے، امیر خورد لکھتے ہیں جب مجلس میں ہوتے تو حق تعالیٰ کی عظمت سلطان المشائخ پر ضوفگن ہوتی تھی۔ (سیر الاولیا،ص:۲۴۵)

مولانا شمس الدین یحییٰ راوی ہیں کہ جس وقت ہم مجلس میں ہوتے ہماری یہ مجال نہ تھی کہ سر اٹھا کر روئے مبارک کو دیکھ سکیں۔ اگر کوئی علمی بات یا کسی علمی مسئلے میں کوئی مشکل پیش آجاتی تو حاضرین مجلس کو باطنی نور سے علم لدنی کی بنا پر ایسا جواب شافی عطا فرماتے کہ وہ آپ کی حسن تقریر سے متاثر ہو کر حیرت میں پڑ جاتے تھے۔ اور آپس میں کہتے تھے کہ آپ کا یہ جواب کتابی نہیں ہے اس کی بنا الہام ربانی اور علم لدنی پر ہے۔ اسی وجہ سے شہر کے بڑے

بڑے عالم، جو اہل تصوف سے تعصب وعناد رکھنے میں مشہور تھے، آپ کے غلام ہو گئے تھے۔ انہوں نے سروری کے سودائے خام کو اپنے سر سے نکال دیا تھا۔ اور آپ کے آستانے پر سر جھکائے ہوئے تھے۔ (سیر الاولیا ص: ۲۴۵)

مشائخ کی صحبت اور ان کی مجلس علم کی وہ کیفیت جو حضرت علامہ شمس الدین یحییٰ نے بیان فرمائی ہے آج بھی جنھیں شیوخ کی صحبت میسر آتی ہے وہ اسی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اللہ کے نبی سے پوچھا گیا اچھا ہم نشین کون ہے حضور نے فرمایا: وہ جس کا دیکھنا تمہیں اللہ کی یاد دلادے، جس کی گفتگو تمہارے علم میں اضافہ کردے اور جس کا عمل تمہیں آخرت کی یاد دلائے۔ اچھا ساتھی وہ ہے کہ جب تو خدا کو یاد کرے تو وہ تیری مدد کرے اور جب تو بھول جائے تو وہ تمہیں یاد دلادے۔ (جامع الصغیر حرف الخاء ص: ۲۲۷ حدیث نمبر: ۴۰۶۳)

یہ مجالس علم وتزکیہ اور صحبت وتربیت کی محفلیں ہمارے مشائخ کی عظیم خانقاہی روایت کا اٹوٹ حصہ رہی ہیں، آج ان کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے اور اگر کسی شیخ کامل کے یہاں ایسی محفلیں گرم ہیں تو اہل علم بلکہ سبھی کو چاہیے کہ ان سے فائدہ اٹھائیں

محفل سماع

حضرت سلطان المشائخ کی خانقاہ بہت سی خصوصیات کا مجموعہ تھی، ان میں ایک خاص چیز حضرت کے یہاں کی محفل سماع بھی ہے۔ چند اہم عناصر کو ہم نے درج بالا صفحات میں ذکر کیا۔ مگر تشنگی باقی رہ جائے گی اگر حضرت کی خانقاہ میں سماع کی محفل کا ذکر نہ کیا جائے۔ حضرت سلطان المشائخ سماع کی حلت کے قائل تھے وہ اس مسئلے میں محققین صوفیہ کی روش پر قائم تھے۔ احادیث مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دلیل کی بنیاد پر سماع سنتے تھے۔ غیاث الدین تغلق کے دربار میں سماع کی حلت پر آپ نے احادیث سے دلیل دی تھی۔ اس مجلس میں خواجہ علم الدین سہروردی نے بطور فیصلہ یہ فرمایا تھا کہ جو روح کی غذا کے لیے سماع سنتے ہیں ان کے لیے جائز ہے اور جو حظ نفس کے لیے سنتے ہیں ان کے لیے ناجائز ہے، سماع سننے کا رواج عالم اسلام میں رہا ہے اور اب بھی ہے، البتہ کہیں دف اور شہنائی کے ساتھ ہے اور کہیں بغیر آلات کے بھی۔ اس کا تاریخی تسلسل خواجہ جنید وشبلی کے عہد ہی سے چلا آرہا ہے۔ اس واقعے سے متعلق تفصیلات سیر الاولیا میں درج ہے، تفصیل کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔

امیر خورد کرمانی نے سلطان المشائخ کے حوالے سے اپنی کتاب سیر الاولیا میں سماع کے اثرات وفوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میں نے سلطان المشائخ کے دست مبارک کا لکھا ہوا دیکھا ہے جسے آپ نے عوارف سے نقل کیا کہ سماع مریدوں، معتقدوں اور اصحاب ریاضت کا حق ہے۔ جب نفس اور تن ہلاک ہونے لگتے ہیں تو وہ بر بنائے حدیث "ان لنفسک علیک حقا یعنی تجھ پر تیرے نفس کا حق ہے تو کچھ زمانہ سماع کے ذریعے آرام لیتے ہیں، پھر انہیں کام میں مشغول کرتے ہیں۔ جب یہ حقیقت ہے تو ان بزرگوں کے

متبعین کے لیے لازم ہے کہ وہ ان کی پیروی کریں اور دنیا سے قطع تعلق کریں کہ اس دنیا کا ظاہر بہت ہی چکنا چپڑا اور شیریں معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا باطن زہر ہلاہل ہے اور یہ دنیا عنقریب جانے والی ہے۔ بالآخر ہمیں ان مشائخ کرام کی نظر سے گزرنا ہے اور حق تعالی کے سامنے جواب دینا ہے۔ جس طریقے سے تم اس راہ میں قدم رکھوگے، حق تعالی تمہارے دلوں سے آگاہ ہے اور تمہارے حالات سے باخبر ہے۔ اپنی زندگی اپنے پیروں کے راستے پہ گذارو، تاکہ ان کے زمرے میں شمار رہو۔(۱)

کتابیات

۱-اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ مترجم مولانا سبحان محمود و مولانا محمد فاضل۔ ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی

۲-الرسالۃ المکیۃ، شیخ قطب الدین دمشقی، شاہ صفی اکیڈمی خانقاہ عارفیہ الہ آباد، ۲۰۱۴

۳-تاریخ ہندوستان (آب کوثر)، شیخ محمد اکرام ۔ ادبی دنیا مٹیا محل دہلی

۴-تاریخ دعوت و عزیمت، مولانا ابوالحسن علی ندوی، حصہ سوم، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

۵-تاریخ مشائخ چشت، خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی

۶-تذکرہ حضرت سید جلال الدین، مولوی سخاوت صاحب، انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا مڈل اسٹ کلچر اسٹڈیز، حیدرآباد، ۱۹۶۲ء

۷-سیر الاولیا (فارسی)، امیر خورد کرمانی، مطبع محب ہند دہلی، ۱۳۰۲ھ

۸-سیر الاولیا (مترجم)، امیر خورد کرمانی۔ ترجمہ مولانا اعجاز الحق قدوسی، ناشر خواجہ حسن ثانی نظامی

۹-سراج المجالس (ترجمہ خیر المجالس) خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی، ترتیب حمید قلندر، ترجمہ: احمد علی بن محمد علی ناشر: واحد بک ڈپو، جونا مارکیٹ، کراچی نمبر ۲

۱۰-سیر العارفین، حامد بن فضل اللہ جمالی، ترجمہ محمد ایوب قادری، ناشر مرکزی اردو بورڈ گلبرگ لاہور

۱۱-عوارف المعارف، شیخ شہاب الدین سہروردی، ترجمہ سید رشید احمد ارشد مطبع غلام علی پرنٹر، لاہور

۱۲-فوائد الفواد، حضرت خواجہ حسن علا سجزی دہلوی، مترجم، طابع و ناشر خواجہ حسن ثانی نظامی، ۲۰۰۷ء

۱۳-مجمع السلوک، شیخ سعد خیر آبادی، ترجمہ: مولانا ضیاء الرحمن علیمی، شاہ صفی اکیڈمی الہ آباد یو پی، ۲۰۱۶

۱۴-نغمات الاسرار فی مقامات الابرار، داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی، ناشر شاہ صفی اکیڈمی الہ آباد، یو پی

○○○

---

(۱) (سیر الاولیا: ص: ۸۰۸)

غلام مصطفی ازہری

سلطان المشائخ بطور محدث وفقیہ

مقدمات

حدیث وفقہ اور تصوف

عصر اول میں فقہ؛ فہم قرآن وحدیث کا نام تھا یعنی ظاہری احکام شرع اور اسباب ومقاصد شرع کے ساتھ ساتھ باطنی آداب، منازل سیر وسلوک اور مراحل جذب وعرفان کے مکمل ادراک کا نام تھا۔ لیکن احوال زمانہ نے علما کے اندر تخصص کا رجحان پیدا کیا۔ ابتدا میں یہ فرق صرف خدمات کی حد تک تھا، بعد کے زمانے میں حصول میں بھی ایک حد تک تخصص ہونے لگا، لیکن علوم اسلامیہ کے مبادیات واصولیات سے کوئی بھی عالم دین جاہل نہیں رہتا۔

فقہ ابتداء دو حصوں میں تقسیم ہوا۔

فقہ اکبر؛ یعنی ایمانیات، علم التوحید والصفات، علم الکلام، اصول الدین

فقہ اصغر؛ یعنی ظاہری احکام شرع، شریعت، قانون شرع

لیکن پانچویں صدی آتے آتے فقہا ومتکلمین کی ایک جماعت میں ظاہر آرائی، مسلکی تعصب اور بے جا بحث وجدل در آئی۔

باطنی آداب ومنازل اور جذب وعرفان کے متخصصین ہر زمانے میں تھے لیکن قرون اولی میں فقہا ومحدثین کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ بعد کے ادوار میں اس فن کے متخصصین نے بھی اس کے خدوخال واضح کیے، اس کے اصول وقواعد وضع کیے، اس کے لیے بھی الگ سے مدارس ومکاتب اور مجالس ومحافل کا انعقاد کیا، اس علم کا نام علم تصوف، علم باطن، علم جذب وسلوک اور علم احسان رکھا گیا۔ اس جماعت میں بھی بعد کے ادوار میں بہت ساری خرابیاں رونما ہوئیں، ایک گروہ پر باطنیت واباحیت کے برے اثرات مرتب ہوئے تو بعض نے زہد وتقشّف کے لبادہ میں دنیا اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

یہ تینوں گروہ ایمانیات واسلامیات اور احسانیات پر عمل کے راستے بتانے والے ہیں۔

اسلامی علوم کے دو ماخذ: قرآن وحدیث

عہد رسالت سے ہی قرآن متواتر ومتداول رہا، اس کے الفاظ کی حفاظت اللہ رب العزت نے خود اپنے ذمہ کرم پر لے رکھا ہے، اس لیے حفظ وتدوین کا مرحلہ بہت آسان رہا۔ صحابہ کرام سے اب تک مفسرین احادیث نبویہ، لغت وقیاس اور اشارات ودلالات کی روشنی میں اس ابدی کتاب کے بحر معانی سے درر وجواہر نکالتے رہے۔

احادیث کے وہ ابواب جو اصول دین سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی متداول ہوئے لیکن وہ احادیث جو فروعی احکام اور آداب واخلاق سے متعلق تھے یا جو عام لوگوں کے فہم سے بالا تھے، ہر ایک کی رسائی ان احادیث تک نہ ہوسکی، سارے صحابہ یکساں طور سے ہر فرعی مسئلہ سے واقف نہیں تھے، بعض کے سینوں میں ایک علم محفوظ تھا تو دوسرے کے پاس دو دوسرا علم، اس لیے عہد صحابہ میں ہی تدوین وتثبیت کا عمل شروع ہوگیا لیکن اس کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی کہ جھوٹ کا دور شروع ہونے سے پہلے ہی تکمیل کے مرحلے تک پہنچ جائے۔

اسی لیے جیسے جیسے لوگ زمانہ رسالت سے دور ہوتے گئے اور ان میں صداقت کا عنصر کم ہوتا گیا، ضعیف الایمان لوگوں کا ایک گروہ احادیث رسول میں ریشہ دوانی کرنے لگا، یہ لوگ اپنے کلام کو یا کسی بڑے کے کلام کو حدیث رسول کی شکل میں پیش کرنے لگے۔ موقع پا کر دشمنان اسلام نے بھی احادیث وضع کیے، اسی لیے علما کی ایک جماعت نے احادیث رسول کو خالص کرنے کے لیے علوم حدیث اور رجال وطبقات کے فنون ایجاد کیے تاکہ احادیث رسول کی حفاظت وصیانت ہوسکے۔ شروع میں یہ جماعت بھی سلف صالحین کے چند نفر پر مشتمل تھی، بعد میں یہ فن مستقل صورت اختیار کرگیا، علما کی ایک بڑی جماعت نے اس خدمت کو انجام دیا، جن کو محدثین اور اہل حدیث کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن بعد کے ادوار میں مقلدین کی ایک جماعت میں بات یہاں تک پہنچی کہ اسانید اور احادیث کا ظاہری معنی ہی سب کچھ ہوگیا، اسی جماعت میں متشدد حنبلیت نے بھی اپنے بال و پر نکالے جنھوں نے متکلمین اشاعرہ، مجتہدین فقہا اور صلحاے امت متصوفہ کو اصحاب الرائے، جاہل اور بے دین کہا بلکہ ضلالت وگمرہی سے متصف کیا۔

ہند وپاک میں فقہ وحدیث اور تصوف

جب فاتحین اسلام اور مسلم سلاطین نے برصغیر ہند وپاک کا رخ کیا تو ان کے ساتھ علما وصلحا کی ایک بڑی تعداد نے اس سرزمین کو اپنے مسکن کے لیے منتخب کیا، ارشاد وتبلیغ کا مرکز بنایا، علم وعمل کا فیضان عام کیا اور بہت سے دینی علوم کی بھی نشر واشاعت کی۔

تمام علوم اسلامیہ کم وبیش تمام ممالک میں متداول تھے، تاہم خدمات اور ذوق وشوق کے تنوع میں ہر ملک کی مقامی اور قومی خصوصیات کا اثر پڑنا بھی ناگزیر تھا۔ ایران میں منطق وفلسفہ کا مذاق غالب تھا اور خراسان وماوراء النہر میں فقہ واصول فقہ اور تصوف کا زیادہ رواج تھا۔ برصغیر ہند وپاک میں مسلم حکمراں ایران سے آئے، علما و

صلحا خراسان وماوراء النہر سے آئے، جس کی وجہ سے یہاں چھٹی صدی سے دسویں صدی ہجری تک فقہ وتصوف کا غلبہ رہا۔ بہت سارے علوم عربیہ اور خاص طور سے علم حدیث کی طرف دسویں صدی ہجری تک مناسب توجہ نہ دی گئی۔

مولانا ابوالحسنات ندوی لکھتے ہیں: ''جیسا کہ ہمارے زمانہ میں منطق وفلسفہ معیار فضیلت ہے، ویسا ہی اس زمانہ میں حنفی فقہ اور اُصولِ فقہ معیارِ فضیلت تھا۔ حدیث میں صرف مشارق الانوار کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا، اور جس خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آجاتی تھی وہ امام الدنیا فی الحدیث کے لقب کا مستحق ہوجاتا تھا۔ اصل یہ ہے کہ اُس زمانہ کے نصابِ تعلیم میں جو خصوصیات نظر آتی ہیں وہ فاتحین کے مؤثر ذوق کا نتیجہ تھا۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا تخت جس قوم نے بچھایا وہ غزنی اور غور سے آئی، یہ وہ بلاد ہیں جہاں فقہ اور اصول فقہ کا ماہر ہونا علم وفن کا طغرائے امتیاز تھا۔ (ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، ص:۹۶، روز بازار، امرتسر)

مولانا ابوالحسنات نے ایک اور مقام پر ترویجِ حدیث کے سلسلے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مساعی کا ذِکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:٭ وہ ہندوستان سے عرب گئے، اور وہاں تین برس رَہ کر علمائے حرمین شریفین سے فن حدیث کی تکمیل کی اور یہ تحفہ ہندوستان کے لیے لائے، انھوں نے اور ان کی اولاد نے برابر اس کی اشاعت کی مگر افسوس ہے کہ ناکامی ہوئی۔ (ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، ص:۱۰۰)

اس سے واضح ہوا کہ ہندوستان میں فلسفہ وکلام اور فقہ وتصوف پر بہت کام ہوا ہے، درس گاہوں میں بھی ان ہی علوم وفنون کا تسلط رہا ہے، لیکن انفرادی طور پر بہت سارے علما ایسے بھی ہوئے جنھوں نے علم حدیث میں مہارت حاصل کی اور اس پر کام بھی کیا اگر چہ ایسے افراد گیارہویں صدی ہجری تک انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

بارہویں صدی سے علم حدیث پر بھی کام ہونے لگا لیکن افسوس کی بات یہ رہی کہ کتب تصوف کو آہستہ آہستہ نصاب سے باہر کردیا گیا۔

تصوف کا ماخذ

تمام علوم وفنون اسلامیہ کی طرح عرفان وسلوک، حقیقت وطریقت اور باطنی اخلاق کا فن جسے تصوف سے موسوم کیا جاتا ہے اس کی بنیاد بھی آیات قرآنیہ کے بعد احادیث نبویہ پر ہی ٹکی ہوئی ہے۔

اگر چہ تصوف کا تعلق باطن سے ہے، جہاں باطن کی صفائی سے ہی بات شروع ہوتی ہے اور باطن کو اخلاق حمیدہ سے مزین کرنا ہوتا ہے تاکہ انوار الٰہی کا ورود ہو جس کا نتیجہ الہام وکشف سے ہوتا ہوا عرفان الٰہی تک پہنچتا ہے۔ اس دوران ارواح اولیا سے کسب فیض، فرشتوں سے ہم کلامی اور انبیا علیہم الصلاۃ والسلام سے بھی ملاقات وفیوض کا سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ یہ ایسے غیبی احوال اور کشفی واقعات ہیں جن کی وجہ سے بہت سارے سالکین کے زبان وقدم میں ثبات نہیں رہ پاتا، ان کے افعال واقوال میں ایسا ابہام وایہام پیدا ہوجاتا ہے کہ جن کا معنی سمجھنا بظاہر بہت ہی مشکل ہوتا ہے، انہی میں سے ایک کلام یہ بھی ہے جو سلطان العارفین بایزید بسطامی کی طرف منسوب ہے:

أَخَذْتُمْ عِلْمَكُمْ مَيِّتًا عَنْ مَيِّتٍ، وَأَخَذْنَا عِلْمَنَا عَنِ الْحَيِّ الَّذِىْ لَا يَمُوْتُ۔

(ذخائر الاعلاق، ص: ۱۵۳)

تم لوگوں نے اپنے علم کو صرف مردوں سے نقل در نقل حاصل کیا ہے جب کہ ہم نے اپنے اس علم کو اس ذات حق سے بھی حاصل کیا ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے اور اس پر کبھی موت طاری نہیں ہوگی۔

حَدَّثَنِىْ قَلْبِىْ عَن رَّبِّىْ. وَأَنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ: حَدَّثَنَا فُلَانٌ , وَأَيْنَ هُوْ؟ قَالُوْا: مَاتَ ،عَنْ فُلَانٍ وَأَيْنَ هُوَ؟قَالُوْا: مَاتَ۔ (الفتوحات المکیۃ، باب: ۵۴ فی معرفۃ الاشارات)

میرا دل تو اپنے رب سے حدیث بیان کرتا ہے/ ہم کلام ہوتا ہے، جب کہ تم صرف یہ کہتے ہو کہ فلاں نے ہم سے حدیث بیان کی، اب سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ فلاں کہاں ہے تو تم جواب دوگے کہ وہ تو مر چکا ہے، پھر تم کہوگے کہ اس نے فلاں سے روایت کی۔ ہم پھر اس فلاں کے بارے میں پوچھیں گے کہ وہ کہاں ہے؟ تو تم جواب دوگے کہ وہ تو مر چکا ہے۔

ان دونوں اقوال کا جس طرح سے ترجمہ پیش کیا گیا ہے اسی سے کافی حد تک ان پر وارد ہونے والا اعتراض خود بہ خود ختم ہو گیا ہے، لیکن ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہ یا اس طرح کے دوسرے اقوال کا مثبت ومنفی پہلو بھی واضح کریں تا کہ تصوف کے مادحین، ناصرین اور اس کے ناقدین ومخالفین دونوں کی رہنمائی ہو سکے۔

غالی جاہل صوفیہ کی ایک جماعت نے ان اقوال کے ذریعہ علم سے بے زاری، فقہا ومحدثین کی توہین اور شریعت ظاہرہ کے تمسخر کو اپنا وطیرہ بنا لیا، حالاں کہ ان اقوال کے قائلین کا مقصود وہ نہیں ہے جو یہ بتا رہے ہیں کیوں کہ محققین صوفیہ نے اپنے کلام میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ اہل اسلام کے کسی فرد کے لیے کتاب و سنت سے بے نیازی ممکن نہیں، سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہ فرماتے ہیں:

من لم يقرأ القرآن وَلَمْ يكتب الحديث لا يقتدى به فى هذا الشأن لأن علمنا مقيد بالكتاب والسنة۔ (الرسالۃ القشیریۃ، ۱/ ۷۹)

جس نے قرآن کی تعلیم نہیں حاصل کی، حدیث نہیں نقل کیا، وہ تصوف میں اقتدا کے لائق نہیں، کیوں کہ ہمارا یہ علم تصوف کتاب وسنت سے ماخوذ ہے۔

اسی طرح آپ کا یہ قول بھی مشہور ہے:

الطرق كلها مسدودة عَلَى الخلق إلا عَلَى من اقتفى أثر الرسول عَلَيْهِ الصلاة والسلام۔ (الرسالۃ القشیریۃ، ۱/ ۷۹)

مخلوق کے لیے سارے راستے بند ہیں مگر ان لوگوں کے لیے جنھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی کی۔

شیخ الشیوخ ابوحمزہ محمد بن ابراہیم بغدادی (۲۶۹ھ) نے فرمایا ہے:

من علم طریق الحق تعَالَی سهل عَلَیْهِ سلوکه، و لا دلیل عَلَی الطریق إِلَی اللہ تعَالَی إلا متابعة الرسول صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی أحواله و أفعاله و أقواله۔ (الرسالۃ القشیریۃ، ۱/ ۱۰۷)

جس نے حق تعالی کے راستے کو جان لیا اس پر سلوک آسان ہو گیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال، اقوال اور افعال کی اقتدا کے بغیر اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔

امام الصوفیہ ابوالقاسم قشیری (۳۷۶ھ-۴۶۵ھ) قدس سرہ نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے:

اعلموا أن شیوخ هذه الطائفة بنوا قواعد أمرهم علی أصول صحیحة فی التوحید، وصانوا بها عقائدهم من البدع و دانوا بما وجدوا علیه السلف۔ (الرسالۃ القشیریۃ، ۱/ ۱۹)

جان لو کہ جماعت صوفیہ کے شیوخ نے اپنے معاملات کی بنیاد عقائد میں اصول صحیحہ پر رکھی ہے، اپنے عقائد کو بدعات سے محفوظ رکھا ہے، سلف صالحین کو جن امور کا پابند پایا ہے ان ہی پر کاربند رہے ہیں۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری قدس اللہ سرہ:

کل وجد لا یشهد له الکتاب و السنة فهو باطل۔ (احیاء علوم الدین، ۲/ ۳۰۲)

ہر وہ وجد جس کی دلیل کتاب وسنت میں نہ ہو وہ باطل ہے۔

اور اس طرح کے بے شمار اقوال بطون کتب تصوف میں وافر مقدار میں موجود ہیں، مقلدین جہلا نے اس کے معنی کو مقصد سے دور کر دیا اور معاندنے اصل معنی سے صرف نظر کرتے ہوئے اباحیت پسند حضرات کے معنی کو اچک کر تصوف پر تیر ونشتر برسائے اور ملحدین ومشککین کے دلوں میں تصوف کے مقام ومرتبہ کو مشتبہ کر دیا۔

اہل تصوف پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ الہام وکشف کا ہی اعلی نوع وحی ہے، پھر وحی وہ بھی سید الانبیا پر، وہ بھی قرآن کی، بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ آفتاب نبوت کی کرن وحی ہے، نبی کریم ظل ذات ہے اور قرآن عکس صفات ہے، اسی سایہ کا سایہ ولایت اور کشف والہام ہے۔ کیا کوئی کشف ومعرفت کے جس مقام پر بھی پہنچ جائے قرآن وسنت کے گرد کو بھی پا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، جہاں مقرب ملائکہ اور رسل دم مار نہیں سکتے، اس وحی کے تقابل کے لیے سوچنا بھی کفر کی دہلیز پر قدم رکھنا ہے، بچکانہ پن، جنون یا پاگل پن ہے، ایسے لوگوں کی ہمت شکنی کے لیے نعت رسول کے طور پر شاعری میں حضور داعی اسلام کے استاذ مرحوم علی ظہیر صاحب کا یہ شعر نذر ہے۔

وہ بقدر آئینہ ہے جلوہ گر، تری آئینے پہ نہیں نظر
تو خدا کو دیکھ کے پہلے آ تو دکھائیں تجھ کو ہم آدمی

اسلام کا خدوخال ظاہری ہو یا باطنی سب کتاب وسنت سے ماخوذ ہے، دین مصطفوی کے ہی اعضا وجوارح اور قلب وروح ایمان، اسلام اور احسان ہیں، ان میں سے کسی سے بے نیازی ممکن نہیں، اس لیے مشائخ صوفیہ کے

ان موہم ومبہم اقوال کے وہ معانی نہیں ہوسکتے جو بظاہر کتاب وسنت سے اعراض کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، چنانچہ علمانے اپنے اپنے طور سے ان کی تشریح وتاویل بیان کی ہے جس کا حاصل یہ ہے:

شیخ محی الدین ابن عربی نے امام فخر الدین رازی کو ایک خط لکھا جس کی عبارت یہ ہے:

اعلم یا أخی وفقنا اللہ وإیاک أن الرجل لا یکتمل عندنا فی مقام العلم حتی یکون علمہ عن اللہ عز وجل بلا واسطۃ من نقل أو شیخ۔ (الطبقات الکبری: عبدالوہاب شعرانی، ص:۱۱)

اے میرے بھائی! یہ جان لو کہ علم کے میدان میں انسان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ استاذ وشیخ یا نقل وروایت کے واسطے کے بغیر اللہ سے بالمشافہ علم حاصل نہ کرے۔ اللہ ہمیں اور تمھیں توفیق بخشے۔

اس عبارت سے واضح ہوا کہ کسب تک ہی محدود رہنا تحصیل علم کا کمال نہیں ہے، کسب سے وہب تک پہنچنا، ظاہری معانی سے باطن تک رسائی حاصل کرنا ہی اصل ہے، نصوص سے فصوص تک، لفظ سے معانی تک، صفت سے ذات تک رسائی ہی مطلوب ومقصود ہے۔ مشائخ صوفیہ نے علم کسبی وظاہری کا رد نہیں کیا ہے بلکہ علمائے ظواہر و رسوم، فقیہان خشک اور بے جا بحث وجدل کرنے والے دانشوروں کے خلاف یہ کلمات کہے ہیں۔

سلطان العارفین بایزید بسطامی کا یہ قول: أَخَذْتُمْ عِلْمَکُمْ مَیِّتًا عَنْ مَیِّتٍ... یا یہ قول: حَدَّثَنِیْ قَلْبِیْ عَنْ رَبِّیْ... سے مراد علم کسبی کی نفی نہیں ہے، نہ کتاب وسنت کے علم سے بے زاری ہے بلکہ جسم جس کو صوفیہ عالم ناسوت کہتے ہیں، سے تحصیل علم کے اکتفا پر عالم ملکوت، بلکہ عالم لاہوت و جبروت سے حصول علم ومعرفت کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی شیخ وولی یا نبی کی روحانیت سے زندگی یا موت کے بعد فیض حاصل کرے یا تجلیات الٰہی کا ورود اس کے قلب پر ہو جس کی وجہ سے اسے کسب کے بغیر یا کسب کے ساتھ وہب وفیض کے ذریعہ جو علم حاصل ہو، وہ بھی کتاب وسنت ہی کا علم ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن کسب پر صرف اکتفا کرنے والوں کے مقابل میں کسب وروحانیت دونوں سے فیضیاب ہونے والے کی فضیلت رہے گی، کیوں کہ محدث یا مجتہد وفقیہ کسی حدیث کے صحت وضعف کا حکم یا کسی مسئلے کا بیان قیاس واجتہاد سے کرتا ہے یہ بطور ظن غالب ہے نہ کہ علی وجہ البصیرۃ لیکن صاحب کشف کسی حدیث کی صحت کا علم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ کر حاصل کرے، یا کسی مسئلے کی تمام صورت اس پر بطور تجلی روشن ہوجائیں تو یہ علم علی وجہ البصیرۃ ھو انہ علی وجہ الظن۔

کیا صوفیہ نے حدیث کے باب میں جھوٹ کو جائز رکھا ہے؟

اس قسم کے خیالات قطعاً غلط ہیں، محققین صوفیہ نے اپنی ہی جماعت کی روایت کردہ احادیث کا رد بھی کیا ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو، شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ نے حدیث خرقہ کو اپنی سند سے بیان کیا ہے پھر خود ہی اس کی صحت پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے:

فهذا الحديث أوردناه مسندا كما سمعناه و وجدناه، و قد تكلم فی صحته أصحاب الحديث، و ما وجدنا شيئا نقل عن رسول الله صلى الله عليه و سلم يشاكل وجد أهل الزمان و سماعهم و اجتماعهم و هيئتهم إلا هذا. و ما أحسنه من حجة للصوفية و أهل الزمان فی سماعهم و تمزيقهم الخرق و قسمتها أن لو صح و الله أعلم. و يخالج سری أنه غير صحيح، و لم أجد فيه ذوق اجتماع النبی صلى الله عليه و سلم مع أصحابه و ما كانوا يعتمدونه على ما بلغنا فی هذا الحديث و يأبى القلب قبوله و الله أعلم بذلک.

(عوارف المعارف، باب ۲۵، فی القول فی السماع تأدبا واعتناء، ص:۲۲۶)

اس حدیث کو ہم نے اپنی سند سے بیان کیا ہے جیسا کہ ہم نے سنا اور پایا۔ لیکن محدثین کو اس روایت کی صحت پر کلام ہے۔ میں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس روایت کے علاوہ ایسی کوئی روایت نہیں پائی ہے جو ہمارے زمانے کے صوفیہ کے وجد وسماع، محافل اور ان کی خاص ہیئت کی مشابہت رکھتی ہو۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو معاصر صوفیہ کے سماع، خرقہ کو ٹکڑے کرنے اور اس کو تقسیم کرنے پر اچھی دلیل ہوتی۔ واللہ اعلم۔ میرے دل میں یہ بات آتی ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ صحابہ کرام کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذوق مجلس کو اس طرح نہیں پاتا ہوں جس طرح اس روایت پر اعتماد کر کے صوفیہ نے اپنی ہیئت بنا رکھی ہے، بلکہ دل اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ واللہ اعلم۔

مرشد گرامی داعی اسلام شیخ ابوسعید ادام اللہ ظلہ علینا فرماتے ہیں:

”جماعت صوفیہ سے منتسب لوگوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے: کبار صوفیہ، صغار صوفیہ، شرار صوفیہ۔ کبار صوفیہ محققین ومشائخ صوفیہ ہیں، یہی لوگ ہمارے لیے حجت ہیں، صغار صوفیہ مقلدین ہیں مقتدی ہیں۔ شرار صوفیہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے جماعت صوفیہ کو بدنام کیا اور غیر تحقیقی امور کو صوفیہ کی طرف منسوب کر دیا۔ کسی بھی محقق صوفی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کذب و بہتان کے انتساب کو جائز نہیں قرار دیا ہے۔“

متقدمین صوفیہ کے اقوال سے بھی مرشد گرامی کی اس بات کی تائید ہوتی ہے، چند اقوال ملاحظہ فرمائیں:

شیخ احمد زروق (۸۹۹ھ) نے جہلا اور غالی مدعیان تصوف کے بارے میں لکھا ہے:

فغلاة المتصوفة كأهل الأهواء من الأصوليين و كالمطعون عليهم من المتفقهين يرد قولهم و يجتنب فعلهم و لا يترک المذهب الحق الثابت بنسبتهم له و ظهورهم فيه۔ (قاعدہ:۳۵)

غالی صوفی کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ہوا پرست اصولی اور قابل مذمت مفتی۔ ان میں سے ہر ایک کی بات رد کر دی جائے گی، ان کی نسبت یا ان کے عمل کی وجہ سے مذہب حق کو ترک نہیں کیا جائے گا۔

علامہ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) نے اپنی کتاب ''تأیید الحقیقة العلیة'' میں لکھا ہے:

وعلمت أیضا أنه قد کثر فیه الدخیل من قوم تشبهوا بأهله ولیسوا منهم فأدخلوا فیه ما لیس منه فأدی ذلک إلی إساءة الظن بالجمیع فوجه أهل العلم للتمییز بین الصنفین لیعلم أهل الحق من أهل الباطل وقد تأملت الأمور التی أنکرها أئمة الشرع علی الصوفیة فلم أر صوفیا محققا یقول بشیء منها وإنما یقول بها أهل البدع والغلاة الذین ادعوا أنهم صوفیة ولیسوا منهم. (ص:۵۷)

آپ نے جان لیا کہ ہر جماعت میں ایسے لوگ داخل ہو گئے ہیں جو اس جماعت سے صرف رسمی یا اسمی مشابہت رکھتے ہیں حالاں کہ وہ اس جماعت کا حصہ نہیں ہیں۔ ان دراندازوں کی وجہ سے پوری جماعت کی شبیہ خراب ہو جاتی ہے، اس لیے اہل علم اصحاب تمیز اہل حق اور اہل باطل کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے بھی ان مسائل پر غور کیا جن کی وجہ سے اصحاب افتا نے صوفیہ پر اعتراض کیا ہے تو میں نے پایا کہ ان میں سے کسی بھی مسئلہ کا قول کسی محقق صوفی نے نہیں کہا ہے بلکہ ایسے اقوال تو صرف اہل بدعت اور مدعیان باطل نے کیے ہیں جن کا صوفیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حدیث اور خاص طور سے موضوع روایت سے متعلق صوفیہ کے منہج پر کئی تحریریں ''مجلہ الاحسان'' کے گذشتہ شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس لیے اس پر مزید گفتگو کرنا مناسب نہیں ہے، باذوق حضرات گذشتہ شماروں کا مطالعہ کریں۔ پھر بھی عام قارئین کے افادے کے لیے ایک بات صاف طور سے واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتی ہے:

تصوف پورا پورا توکل علی اللہ کا نام ہے۔ یہاں موج وحباب اور قطرات و ذرات میں بھی تجلیات الٰہی کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ ہادی ومہتدی اور مرشد ومسترشد سب میں ذات باری کا تصرف ہی مانا جاتا ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی طرف سے نبی اکرم کی طرف جھوٹ منسوب کرنے کے تصور سے ہی دل کانپ جاتا ہے، جب کہ ذات حق کے ظل لاثانی کو قرآن نے یہ پیغام دیا کہ تم اپنی مرضی سے کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے، اللہ جسے چاہے گا ہدایت دے گا۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (قصص:۵۶)

ایسے لوگوں کی طرف سے اصلاح وتقوی اور رشد وہدایت کے نام پر جھوٹ وحیلہ کو فروغ دینا عقل سے دور کی بات لگتی ہے۔

اللہ تعالیٰ صدق نیت اور اخلاص کے ساتھ ساتھ مقتدائے مطلق کی ظاہر و باطن سب میں پیروی کی توفیق دے۔ آمین!

فقہ وتصوف میں کش مکش

رفیق محترم مولانا ذیشان احمد مصباحی نے ایک مرتبہ دوران گفتگو فرمایا کہ محدثین، فقہا یا صوفیہ میں سے کوئی بھی تنہا دین کامل کا نمائندہ نہیں ہے، نبوی سیرت کے مکمل حاملین ہی رہنما و مقتدا ہیں، جو گروہی تشدد اور جماعتی تعصب سے بالاتر ہوتے ہیں، ایسے افراد کی ایک جماعت ہر گروہ میں ہے، جو گروہی تشخص سے الگ ہوتی ہے۔

محققین مشائخ صوفیہ، مجتہدین فقہا اور معتدل ائمہ حدیث وکلام اسی روش پر قائم تھے لیکن ان کے مقلدین نے اہل سنت کے علما کے درمیان ہی تفرقہ اور تشدد کو اس طرح فروغ دیا کہ لگتا ہے کہ ان کے مقتدا علما بھی متعصب اور جدل پسند تھے۔

دونوں جماعتوں کے متاخرین کے درمیان تاثر یہاں تک پہنچا کہ فقہا اور صوفیہ ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابل نبرد آزما رہے ہیں، اصحاب ظاہر اور اصحاب باطن ایک دوسرے سے محاذ آرا رہے ہیں، حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

فقہ کا قیام مسلم امہ کے اعتقادات، عبادات اور سیاسی و اجتماعی معاملات میں اتحاد و اتفاق قائم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ فقہا نے سلطنت اسلامیہ کے ماتحت انسانی معاشرے کو منظم کرنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ فقہا کے رعب و دبدبہ نے مسلم معاشرے کی اجتماعیت کو باقی رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کیا اور سماجی معاملات میں یک گونہ یک جہتی پیدا کرنے میں اہم رول نبھایا۔

دوسری طرف تصوف نے اپنے آپ کو فرد کی تعمیر اور اس کے عقیدہ کو حقیقی معنی تک پہنچانے کی کوشش کی۔ فرد یا جماعت کے ہر عمل کے اندر نیت و اخلاص اور للّٰہیت پیدا کرنے کی کوشش کی، خواہ اس کا تعلق عبادت سے ہو یا معاشرتی کردار سے۔ اس طرح مشائخ صوفیہ کا اثر و رسوخ دینی حلقوں میں قائم ہو گیا۔ یوں ہی فقرا و مساکین کے ساتھ صوفیہ کے حسن سلوک نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔

اس طرح دونوں جماعتوں کے بغیر امت مسلمہ کی بقا کا تصور ممکن نہیں تھا۔ لیکن دونوں جماعتوں کے مقلدین نے اپنے آپ میں کچھ ایسے توہمات پیدا کر لیے جن کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے کی کردار کشی شروع کر دی اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے لگے، جس کے نتیجے میں امت کے اندر انتشار پیدا ہو گیا اور امت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔

گروہ صوفیہ کے لوگوں نے یہ باور کر لیا کہ ہم ہی اہل حقائق ہیں، ہمارے ہی پاس باطنی علوم اور اسرار کا خزانہ ہے اور فقہا ظاہر و رسم پرست ہیں، دین کی حقیقت کا علم صرف اسی گروہ کے پاس ہے، باقی لوگ اس کے حواشی سے ہی بحث کرتے ہیں، کیوں کہ صوفیہ کے اس گروہ کے نزدیک اعمال جوارح مقصود لذاتہ نہیں ہیں، مقصود لذاتہ باطن و معنی ہے۔

اس تنگ نظری کے برخلاف جامع شریعت وطریقت عبدالوہاب شعرانی گروہ فقہا کے سرداران ائمہ اربعہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی اپنے نفس کو ریا، عجب، کبر، حسد یا نفاق میں ملوث پایا پھر بھی انھوں نے مجاہدہ نہیں کیا، نہ اس کے عیوب سے بحث کی۔ کیوں کہ اگر یہ لوگ اپنے آپ کو ان غلاظتوں اور امراض سے محفوظ نہ پاتے تو ضرور تمام علوم سے پہلے ان کے علاج کی طرف توجہ دیتے۔ (لطائف المنن والاخلاق، ص: ۵۳)

جب ائمہ فقہا نفس کے عیوب سے واقف تھے تو پھر انھوں نے اس سلسلے میں کوئی کتاب کیوں نہیں لکھی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

فقہاے مجتہدین نے اس سلسلے میں یعنی تصوف وروحانیت اور امراض قلبیہ پر کتابیں نہیں لکھیں ہیں کیوں کہ ان کے زمانے میں امراض کم تھے، زیادہ تر لوگ ریا ونفاق سے پاک تھے۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان کا زمانہ بھی ان امراض سے محفوظ نہیں تھا لیکن پھر بھی ایسے لوگ کم تھے جن کے عیوب بالکل ظاہر ہوں، اسی لیے زیادہ تر ائمہ مجتہدین نے تابعین اور تبع تابعین کے ساتھ مل کر اپنی ہمتوں کو آفاق عالم میں بکھرے ہوئے ادلہ شرعیہ کو جمع کرنے پر صرف کیا۔ کیوں کہ یہ اس سے زیادہ اہم تھا کہ وہ لوگ بعض لوگوں کے امراض قلبیہ پر توجہ دیتے جس کا تعلق شعار دین سے نہیں ہے اور نہ اس کی حیثیت اصل دین کی ہے۔ (لطائف المنن والاخلاق، ص: ۵۳)

دوسری جانب فقہا کی ایک جماعت نے صوفیہ کے علوم ومعارف کا صاف انکار کر دیا، صرف ظاہری اعمال کو ہی مکمل دین سمجھ لیا، عوام میں صوفیہ کی طرف میلان ہونے کی وجہ سے انھیں ایک موہوم سا خوف ستانے لگا، خاص طور سے فقہاے حنابلہ نے صوفیہ کو اسلام مخالف قرار دیا اور ان کے خلاف فتوے لگائے اور سیاسی اثر ورسوخ کا استعمال کر کے صوفیہ پر ظلم وبربریت کا مظاہرہ کیا۔

اس کے برخلاف مشائخ صوفیہ کی کتابیں مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے فقہا کی اکرام وتعظیم بھی کی ہے اور تقلید بھی کی ہے، اسی طرح فقہا ومجتہدین نے بھی اپنے زمانے کے صوفیہ سے استفادہ بھی کیا ہے اور ان کی تائید وتوثیق بھی کی ہے۔

میں ذاتی طور پر گروہی تشدد کا تو سخت مخالف ہوں بلکہ اہل سنت کے درمیان کسی ایسے گروہی تشخص کا بھی مخالف ہوں جس کا لازمی نتیجہ تعصب وعناد سے جڑتا ہو۔ اس فکر تک پہنچنے میں جہاں احوال زمانہ، کتب علما، مشائخ کی صحبتیں اور روحانی فیضان کار فرما ہیں وہیں نبی اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے لوث محبت ہے جس نے ہر گروہ سے محبت پر ابھارا ہے اور تعصب کی عینک کو اتار پھینکنے پر مجبور کیا۔

دو طرح کے لوگ بہت کم رہے ہیں: ایک ایسے لوگ جنھوں نے ہر مسلک و مشرب سے استفادہ کیا، ہر ایک کی تائید کی اور ہر ایک کو فیض پہنچایا بلکہ ہر گروہ کی خامیوں کی اصلاح بھی فرمائی۔ صحابہ کے بعد تابعین میں ایسے لوگ زیادہ رہے، ان کے بعد ایسے لوگ کم سے کم ہوتے گئے، ان میں جنید بغدادی، امام غزالی، اور متاخرین میں امام شعرانی اور شاہ ولی اللہ کا شمار کر سکتے ہیں۔

ان کے مقابل ایسے لوگ ہیں جنھوں نے تشخص کے ساتھ تعصب کو بھی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا۔ ایسے لوگ بعد کے زمانے میں ظاہر ہوئے، تعداد کے اعتبار سے یہ لوگ بھی کم رہے، لیکن پوری جماعت پر ان ہی کا سیطرہ اور غلبہ رہا، گویا کہ پوری جماعت کو انھوں نے ہی یرغمال بنا رکھا ہے اور مقلدین میں صرف ان ہی کی چلتی رہی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام خالص کے اتباع کی توفیق دے، اسلام اور مسلمانوں کا خادم بنائے، ہمیں محمدی بنائے اور محمدیوں میں حشر کرے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تقلید و تصوف

اجتہاد صرف فقہ سے متعلق نہیں بلکہ ہر علم و فن میں اجتہاد ہوا ہے۔ البتہ ہر فن میں مسکوت کو منطوق سے مربوط کرنے کے الگ اصول وضوابط ہیں۔ اگر فقہا کے قیاسی نتائج کو شرعی علوم میں شمار کیا جاتا ہے تو انھی شرعی نصوص سے ائمہ صوفیہ نے جو عرفانی و وجدانی مسائل مستنبط کیے ہیں ان پر بدعت کا اطلاق کیوں کر درست ہوگا؟ الغرض فقہ، تصوف اور کلام سارے شرعی علوم ہیں اور ان کے ائمہ کو تائید ایزدی حاصل تھی۔ البتہ ایک فن کے ماہرین دوسرے فن کے اصول و مبادی اور اسلوب مناہج سے کما حقہ واقف نہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے پر تنقید کرتے رہتے تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ صرف تصوف ہی نہیں بلکہ ہر فن کی جزئیات کا بڑا حصہ ایسا ہے جس کے متعلق صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صراحتاً حکم منقول نہیں۔ اسی لیے ان میں اختلاف کا ہونا ناگزیر ہے۔

جیسے فقہا میں یہ روش عام ہے کہ وہ ہر فقیہ کو من کل الوجوہ نہیں مانتے۔ اسی طرح صوفیہ میں بھی یہ روش عام ہے کہ وہ تمام صوفیہ کے ہر قول پر سر تسلیم خم نہیں کرتے۔

تاہم جس طرح اختلافات کے باوجود حنفی مالکی شافعی اور حنبلی مکاتب فکر کو اہل حق یا اہل السنہ سمجھا جاتا ہے، اسی طرح قادری چشتی نقشبندی اور سہروردی سلاسل بھی اہل حق ہیں۔

فقہ و تصوف دونوں جگہ اختلافات، بقول شاہ ولی اللہ اور امام شعرانی، صاحب فکر کے فطری رجحانات یا ان کے سماجی حالات کا نتیجہ ہیں جن میں وہ ائمہ گزرے ہیں۔ جیسا کہ انبیا کی شرائع کے اختلاف کا بھی یہی سبب ہے۔

اسی لیے مریدین و متعلقین نے تکملۂ سلوک سے پہلے عموماً اپنے شیخ کے مذہب پر ہی عمل کیا ہے۔ شیخ اگر حنفی ہوتے ہوئے بعض مسائل میں کسی دوسرے مذہب کو راجح قرار دیتا ہے تو مرید اپنے شیخ کی پیروی میں اسی مذہب پر عمل کرتا ہے۔

جیسا کہ عوام نفس الامر میں نہ حنفی ہوتے ہیں نہ شافعی، بلکہ اپنے اس عالم کی پیروی کرتے ہیں جس کو انھوں نے معتمد جان رکھا ہے۔ اگر وہ عالم و مفتی بھی حنفی ہوتے ہوئے کسی مسئلے میں مالکی یا شافعی مذہب پر فتوی دے تو یہ عامی بھی اسی پر عمل پیرا ہوگا۔ اسی طرح مرید بھی ہوتا ہے کہ وہ جس سے ارادت رکھتا ہے ظاہر و باطن میں اس کا پیروکار ہو جاتا ہے۔

مذاہب اربعہ کے متعارف ہونے سے پہلے تمام لوگ ایسا ہی کرتے تھے جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے:

”إن الناس لم یزالوا من زمن الصحابة ﷺ إلى أن ظهرت المذاهب الأربعة یقلدون من اتفق من العلماء من غیر نکیر من أحد۔“ (عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، ص:۲۹)

بے شک لوگ صحابہ کرام کے عہد سے لے کر چاروں مذہبوں کے شائع ہونے تک ان علما کی تقلید کرتے رہے ہیں جن پر وہ اعتماد کرتے اور اس امر پر کسی نے نکیر نہیں کی۔

شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:

یُقرّرہ أَنّ الْعَامیّ إِذا سَأَلَ الْمُفْتِی حادثته فَأَفْتی بِشَیْءٍ یلْزمه الْعَمَل بِهِ وَلَو سَأَلَهُ عَن اعْتِقَاده فِی ذَلِک فَأَخْبر أَنه مُعْتَقد لما یفتیه بِهِ کَانَ عَلَیْهِ أَن یعْتَمد قَوْله وَفِیه احْتِمَال السَّهْو وَالْکذب وَلَکِن بِاعْتِبَار فقهه یتَرَجَّح جَانب الْإِصَابَة وَباعْتِبَار عَدَالَته یتَرَجَّح جَانب الصدْق فِیهِ فَیجب الْعَمَل بِهِ فَکَذَلِک فِیمَا یخبر بِهِ الْعدْل لِأَن جَانب الصدْق یتَرَجَّح بظُهُور عَدَالَته۔ (اصول السرخسی، فصل الحکم (۱/۳۲۸))

یہ بات ثابت ہے کہ عام آدمی جب کسی مفتی سے کوئی مسئلہ دریافت کرے پھر مفتی جو حکم بتائے اس پر عمل کرنا واجب ہے، اور اگر اس آدمی نے مسئلہ مذکورہ میں مفتی کے اعتقاد و رائے کے متعلق سوال کیا تو مفتی نے یہ جواب دیا کہ جو فتوی اس نے دیا ہے وہی اس کے نزدیک معتمد ہے، تو اب بھی اس کے قول پر اعتماد کرنا ضروری ہے اگرچہ اس میں بھی سہو و کذب کا احتمال باقی ہے مگر مفتی کے فہم و اعتقاد کی بنا پر درستگی کے پہلو کو تسلیم کیا جائے گا اور اس کی عدالت پر اعتماد کر کے صدق کے پہلو کو راجح قرار دیا جائے گا، اس لیے اس پر عمل کرنا واجب ہوگا، جس طرح اگر عادل کسی بات کی خبر دے تو ظاہری عدالت کی بنیاد پر صدق کو ترجیح دی جاتی ہے۔ (اگرچہ یہاں بھی جھوٹ کا امکان ہے۔)

ان عبارتوں سے واضح ہو گیا کہ علما و مشائخ کی پیروی عامی و مرید پر لازم ہے۔

اب مسئلہ علما و مشائخ کا ہے کہ کیا ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید ان پر واجب ہے تو اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ علما و مشائخ کی تین حالتیں ہوتی ہیں: تقلید محض، تمیز، اجتہاد۔

الف: جن مسائل میں صحابہ وتابعین اور علما ومشائخ کا اتفاق ہو ان میں تقلید ہی لازم ہے، ان میں بلاضرورت اختلاف، امت کو حرج میں مبتلا کرنا ہے اور خود بھی شذوذ کے وبال سے قریب ہونا ہے۔

ب: جن مسائل میں علما ومشائخ مختلف ہوں، ان میں مفتی ومرشد صاحب تمیز ہوتا ہے، وہ اپنے صواب دید اور دلائل کی روشنی میں جس مذہب پر چاہے فتوی دے، مرید کے احوال کے مطابق جو دوا چاہے منتخب کرے۔ ہاں یہاں بھی اس بات کا ملحوظ رکھنا ضروری کہ بلاضرورت رائج مسئلے میں الگ رائے قائم نہ کرے، تحقیق کے نام پر فتنہ نہ پھیلائے۔لیکن یہ بھی واضح رہے کہ ضرورت کا تعین وہ اپنے صواب دید پر کرے گا، اوراس میں بھی وہ اپنے اجتہاد ہی پر عمل کرے گا، جس میں دوسرے کو اختلاف کی گنجائش ہوگی۔

ج: رہے وہ مسائل جو نو پید ہیں، ان میں اجتہاد وتحقیق سے کس کو انکار ہوسکتا ہے! کیوں کہ ہمارا مذہب اسلام قیامت تک کے لیے کامل واکمل ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب اس میں نئے مسائل میں اجتہاد کی گنجائش ہوگی۔

یہ خیال رہے کہ عام علما ومشائخ تقلید محض ہی کے خانے میں آتے ہیں، دور متاخرین میں اجتہاد کے اہلیت شاذ ونادر بلکہ عنقا رہی ہے، البتہ جزوی اجتہاد کی اہلیت کے حاملین موجود رہے ہیں اور ایک خاصی تعداد صاحبان تمیز کی بھی رہی ہے، دراصل انہی کے اندر جزوی اجتہاد کی لیاقت بھی ہے اور انہی سے متعلق بحث بھی ہے، مقلدین محض کے لیے اجتہاد حرام ہے، اور مجتہدین کے لیے جائز ہے، اگر چہ ان کی تعداد ہر دور میں کم ہوتی رہی ہے۔

الصوفی لا مذهب له کا مفہوم

صوفیہ کے یہاں یہ قول: **الصوفی لا مذهب له** معروف ہے، اس قول کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ صوفی مذاہب اربعہ کے پابند نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ آزاد ہوتے ہیں۔ حالاں کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد امت مسلمہ نے مذاہب اربعہ میں سے کسی نہ کسی مذہب کی پیروی پر اجماع کرلیا ہے۔اسی لیے عام علما کو اس قول کے معنی ومراد کے فہم میں اشکال رہتا ہے۔ محققین صوفیہ نے اس طرح کے اقوال کے جو معانی وتوضیحات پیش کیے ہیں، ان میں سے بعض کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

(۱) صوفی کا مسلک احتیاط ہوتا ہے، اس لیے وہ مذاہب فقہیہ میں کسی ایک معین مذہب کا پیروکار نہیں ہوتا ہے۔اگر کسی مسئلے میں فقہا اور محدثین یا خود فقہا کے مابین اختلاف ہو تو اس صورت میں صوفیہ اس پہلو کو اختیار کرتے ہیں جس میں احتیاط کا پہلو زیادہ ہوتا ہے۔مثال کے طور پر اگر کسی چیز میں اشتباہ کا معاملہ ہو تو اس صورت میں حکم حرمت پر عمل کرتے ہیں اور عدم اشتباہ کی صورت میں اس پہلو پر عمل کرتے ہیں جو جسم پر شاق ہو اور نفس کے لیے دشوار ہو کیوں کہ ان کی نگاہ دراصل قرب مولی اور وصال مولی کے حصول پر ہوتی ہے اس لیے وہ اسی صورت کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں جس کو وہ وصال وقرب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔مخدوم شیخ سعد قدس سرہ نے صوفیہ کے مسلک احتیاط پر عمل کی تفہیم مختلف مثالوں سے کرائی ہے یہاں ان میں سے صرف دو مثال کے ذکر پر اکتفا کیا جارہا ہے:

سورۂ فاتحہ کی قراءت کے بغیر نماز جائز ہونے کے سلسلے میں علما کا اختلاف ہے، اس مسئلے میں صوفیہ احتیاطاً سورۂ فاتحہ ترک نہیں کرتے۔ ایک رکعت وتر میں علما کا اختلاف ہے، صوفیہ ایک رکعت وتر احتیاطاً ادا نہیں کرتے۔ (مجمع السلوک، ۱/ ۲۳۵)

جب کہ اسی قول کی شرح میں شیخ زروق (۸۹۹ھ) نے اس توجیہ کو رد کر دیا ہے کہ صوفی کسی بھی مذہب کے کسی بھی قول کو صرف احتیاط کے پہلو کو سامنے رکھ کر قبول کر لیتا ہے بلکہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ **الصوفی لا مذهب له** کا معنی یہ ہے کہ صوفی ایک ہی مذہب کے کسی ایک ہی قول کو اپنا معین مذہب نہیں بناتا ہے بلکہ اس مذہب کے تمام اقوال میں جو احوط قول ہوتا ہے اس پر عمل کرتا ہے، آپ لکھتے ہیں:

فلا يصح قول من قال: الصوفي لا مذهب له إلا من جهة اختياره في المذهب الواحد، أحسنه دليلاً، أو قصداً، أو احتياطاً، أو غير ذلك مما يوصله لحاله. وإلا فقد كان الجنيد ثورياً، وكان الشبلي مالكيًا، والجريري حنفيا والمحاسبي شافعيا (قواعد التصوف، قاعدہ: ۵۴، ص: ۶۴)

"**الصوفي لا مذهب له**" کا قول اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ یہ مانا جائے کہ یہ قول صرف اور صرف مذہبِ واحد کی مختلف فیہ روایات میں سے، دلیل کے لحاظ سے سب سے مضبوط، مقصد کے اعتبار سے اعلی اور اپنے حال کے لحاظ سے احوط روایت اختیار کرنے کے اعتبار سے ہے۔ [کیوں کہ سارے ائمۂ طریقت اور اساطینِ امت فقہا کے مذہب کے تابع رہے ہیں۔] چناں چہ سید الطائفہ جنید بغدادی امام ابوثور کے مذہب کے تابع تھے، شیخ شبلی مالکی المسلک، شیخ جریری حنفی المسلک اور شیخ محاسبی شافعی المسلک رہے ہیں۔ قدست اسرارہم ورضی اللہ عنہم اجمعین۔

(۲) گروہ صوفیہ کا تعلق ابتداءً مذاہب اربعہ میں سے کسی نہ کسی سے ہوتا ہے لیکن جیسے ہی انھیں کوئی صحیح حدیث ملتی ہے اسی کو وہ اپنا مذہب بنالیتے ہیں، یعنی وہ لوگ امام ابوحنیفہ کا قول: "**إذا صح الحديث فهو مذهبي**" پر عمل کرتے ہیں، یا بلفظ دیگر وہ فقہائے محدثین کے مذہب پر عمل کرتے ہیں۔

مخدوم شیخ سعد قدس سرہ نے مجمع السلوک میں ایک جگہ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی شرح آداب کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ صوفیہ پہلے جس مذہب پر بھی رہے ہوں فقر و طریقت اختیار کرنے کے بعد انھوں نے فقہائے محدثین بلفظ دیگر امام شافعی کا مذہب اختیار کیا، اس کی کیا وجہ ہے؟ اور کیا اس وجہ سے یہ کہا جائے گا کہ ان کے نزدیک حنفیت کی عظمت مسلم نہیں؟

ان سارے پہلوؤں کی جامع وضاحت اور مشائخ طریقت کے دینی امور میں حد درجہ احتیاط کو بتاتے ہوئے مخدوم شیخ سعد لکھتے ہیں:

اس مقام پر کسی کے دل میں یہ خیال نہ گزرے کہ اس سے تو امام اعظم رضی اللہ عنہ کے مذہب میں نقص سمجھ میں آتا ہے۔ ایسا نہیں، امام اعظم کا مذہب فضیلت و بزرگی والا اور پسندیدہ ہے، البتہ مشائخ طریقت نے جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اختیار کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امام شافعی کے مذہب میں تنگی اور دشواری ہے۔(۱)، اور اس جماعت کا یہ طریقہ ہے کہ وہ نفس کو مقہور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دینی امور میں احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر انھوں نے یہ مذہب اختیار کیا ہے، اس کی کوئی اور وجہ نہیں۔(۱/ ۴۰۵)

یہاں مذہب شافعی کے اختیار کرنے کی بات سے صرف یہ مراد ہے کہ صوفیہ امام شافعی کی طرح فقہاے محدثین کے مذہب کو اختیار کرتے ہیں کیوں کہ مخدوم صاحب نے اسی بحث کے اخیر میں ''تقلید کون کرے؟'' کے تحت فیصلہ کن انداز میں یہ بھی بتایا ہے کہ تقلید صرف عوام اور ان فقہا کے لیے جائز ہے جو عوام کی طرح ہیں اور درجہ اجتہاد کو نہیں پہنچے ہیں، جو مجتہد ہیں ان کے لیے اپنی رائے پر عمل واجب ہے، ان کے لیے دوسروں کی تقلید جائز نہیں۔(مجمع السلوک:۱/ ۴۰۸)

چوں کہ صوفیہ واصل عین شریعت ہوتے ہیں اس لیے وہ بھی مجتہدین امت کی طرح براہ راست حدیث سے استفادہ کرتے ہیں۔

یہاں بھی یعنی محدثین کے مذہب پر عمل کرنے کے سلسلے میں شیخ زروق (۸۹۹ھ) نے یہ کہا ہے کہ ایک ہی مذہب کے احوط پر عمل کرنا مراد ہے، آپ لکھتے ہیں:

وقول القائل: مذهب الصوفي في الفروع تابع لأصحاب الحديث، باعتبار أنه لا يعمل من مذهبه إلا بما وافق نصه، ما لم يخالف احتياطا، أو يفارق ورعا، ويلزم ذلك من غير اتهام للعلماء، ولا ميل للرخص۔ (قواعد التصوف، قاعدہ: ۵۴، ص: ۶۴)

''یہ قول جو صوفیہ کی طرف منسوب ہے کہ فروع میں صوفیہ محدثین کے تابع ہوا کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفیہ اپنے مذہب کی اس روایت پر عمل کرتے ہیں جس روایت کو نصِ حدیث کے موافق پاتے ہیں، وہ بھی اس صورت میں کہ اس روایت پر ان کا عمل احتیاط اور زہد وورع کے مخالف ومعارض نہ ہو۔ اس سے بھی علما کے مذاہب پر نہ تو اتہام لازم آتا ہے اور نہ ہی صوفیہ کا رخصت کی طرف میلان لازم آتا ہے۔''

(۳) صوفیہ ابتدائی عہد میں کسی مذہب معین کے ضرور پیروکار ہوتے ہیں، لیکن واصل عین شریعت کبری

---

(۱) یہ بات من کل الوجوہ درست نہیں ہے، ہر مسلک میں بعض مسائل ایسے ہیں جن میں تنگی و دشواری زیادہ ہے جیسے حنفیہ کے نزدیک عصر کا وقت مثل ثانی سے شروع ہونا، جمع بین الصلاۃ کا جائز نہ ہونا، مسئلہ مصاہرت کا ثبوت وغیرہ

ہونے کے بعد مجتہد کی طرح تقلید غیر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں جیسا کہ اس کی تائید و وضاحت امام شعرانی کے درج ذیل عبارات سے بھی ہوتی ہے:

۱- یہ خاص بندے شریعت عظمیٰ کے چشمۂ اول سے براہ راست سیرابی کے معاملے میں مجتہدین امت کے شریک ہوتے ہیں، اگر چہ ان کی نظر ان مجتہدین کے بہ نسبت محدود ہوتی ہے اور زمانی اعتبار سے یہ موخر ہوتے ہیں۔ (میزان الشریعۃ، ص:۵)

۲- ''جس کو بھی ولایت محمدی کا کوئی درجہ ملتا ہے وہ احکام شریعت کو وہاں سے لینا شروع کر دیتا ہے جہاں سے مجتہدین نے لیا ہے اور اس سے تقلید کی گرہ کھل جاتی ہے۔ وہ صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقلد رہ جاتا ہے اور بعض اولیا کے بارے میں جو یہ منقول ہے کہ وہ مثلا شافعی یا حنفی تھے تو ایسا مقام کمال تک پہنچنے سے پہلے تھا۔'' (میزان الشریعۃ، ص:۲۸، ۲۹)

۳- ''میں نے سیدی علی الخواص رضی اللہ عنہ سے ایک بار دریافت کیا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کا امام احمد بن حنبل کی تقلید کرنا یا شیخ محمد شاذلی حنفی قدس سرہ کا امام ابوحنیفہ کی تقلید کرنا کیسے درست ہوگا جب کہ یہ دونوں بزرگ قطبیت کبریٰ کے حوالے سے مشہور ہیں اور اس مقام کا حامل سوائے شارع علیہ السلام کے کسی اور کا مقلد نہیں ہوتا؟ حضرت سیدی علی الخواص رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

ممکن ہے کہ یہ بزرگ مقام کمال تک پہنچنے سے پہلے مقلد رہے ہوں، بعد میں جب وہ اس مقام پر پہنچ گئے ہوں تو اس کے بعد بھی لوگ حنبلی اور حنفی کہتے رہے ہوں جب کہ وہ حقیقت میں تقلید سے باہر آچکے تھے۔'' (میزان الشریعۃ، ص:۳۱)

سلطان المشائخ کے اولوالعزم اور ممتاز خلیفہ علامہ فخر الدین زرادی جو مرتبۂ اجتہاد پر فائز تھے، انھوں نے کشف القناع کے مقدمہ میں اسی بات کی تائید کی ہے، آپ لکھتے ہیں:

صوفیہ مذہب محتاط پر عمل کرتے ہیں اور کسی معین مذہب کو قبول نہیں کرتے۔ جیسا کہ بعض صوفیہ نے کہا بھی ہے: ''الصوفی لا مذهب له۔'' صوفی کا کوئی معین مذہب نہیں ہوتا۔ صوفیہ اپنے اس موقف کی تائید میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے استدلال کرتے ہیں:

اختلاف امتی سعة فی الدین۔ میری امت کا اختلاف دین میں وسعت و گنجائش کا سبب ہے۔

چنانچہ جب امت کا اختلاف وسعت و گنجائش کا سبب ہے تو کسی معین مذہب کو اختیار کرنا تنگی پیدا کرنا ہے۔ حالاں کہ ہمارے دین میں کسی وسعت والی شے کو تنگ کرنا ممنوع ہے۔ اس لیے کہ اس سے مکلف حرج و مشقت میں مبتلا ہوگا۔ (کشف القناع، ص:۷)

(۴) صوفی خالص و مخلص ہوتا ہے، وہ عارف ہوتا ہے، کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو جس میں بھی یہ صفات پا لیے جائیں وہ صوفی ہو جائے گا۔ ''الصوفی لا مذھب له'' کا معنی یہ ہوگا کہ وہ کسی خاص مذہب میں نہیں پایا جاتا بلکہ ان صفات کا حامل خواہ وہ کسی بھی مذہب میں ہو وہ صوفی کہلائے گا۔

اس سلسلے میں آخری بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ مشائخ صوفیہ نے کبھی بھی اپنے زمانہ اور علاقہ میں رائج مذہب کے برخلاف عمل نہیں کیا ہے، صرف بعض مسائل میں تحقیق یا احتیاط کی بنیاد پر اس دیار کے عام علما کے مفتی بہ قول کے برخلاف عمل کیا ہے۔

(۵) اگر اس عبارت میں مذہب سے مراد فقہی مذہب نہ لیا جائے بلکہ صوفی مذہب و منہج سلوک لیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ مقام عرفان حاصل کرنے کے لیے صوفی کا کوئی معین منہج سلوک نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے ہر عمل سے قرب الٰہی کی منزلیں طے کرتا ہے کیوں کہ ''الطرق إلی الله بعدد أنفاس الخلائق۔

سلطان المشائخ اور حدیث

مقدمہ ہی میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ سلطان المشائخ کے زمانہ تک ہندستان میں فقہی روایات کا پایہ بلند تھا، علم حدیث کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں تھی۔ اسی لیے عام روایت کے مطابق سب سے پہلے آپ نے عربی زبان و ادب پھر فقہ و اصول فقہ کی تعلیم شروع کی۔ محبوب الٰہی اپنی علمی صلاحیت، زود فہمی اور اپنی دانشوری کی وجہ سے معاصر طلبا و علما میں ''بحاث'' اور ''محفل شکن'' سے مشہور تھے۔ جب آپ نے اپنے شہر بدایوں پھر اس کے بعد دہلی میں رہ کر زبان و ادب اور علم فقہ میں کامل مہارت اور کلی دست گاہ حاصل کر لی تو اپنے وقت کے جید محدّث شیخ محمد بن احمد ماریکلی المعروف بہ کمال الدین زاہد (۶۸۴ھ) سے مشارق الانوار کا درس لیا اور علم حدیث میں صحت سند، واقعات و روایات کی باریکیوں سے آگاہی حاصل کی اور تحقیق کا فن سیکھا۔

سید کمال الدین زاہد نے سلطان جی کا اجازت نامہ خود سے لکھا تھا، سیر الاولیا میں وہ اجازت نامہ موجود ہے۔ سید کمال الدین زاہد نے علم حدیث، نامور محدث مولانا رضی الدین صغانی (۶۵۰ھ) صاحب ''مشارق الانوار'' کے شاگرد مولانا برہان الدین محمود اسعد بلخی (۶۸۷ھ) اور صاحب شرح آثار النیرین فی اخبار الصحیحین سے حاصل کیا تھا۔ آپ نے اس کے علاوہ کن کتب حدیث کا مطالعہ کیا ہے اس کا علم نہیں ہو سکا، لیکن فقہ، اصول، کلام اور تصوف کی کئی کتابیں آپ کے درس و مطالعہ میں رہی ہیں، ان تمام فنون کی کتابوں میں بھی احادیث کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ آپ کے ارشادات و ملفوظات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے ان سے بھی حدیثیں اخذ کی ہیں۔ اس کے علاوہ ماہر فنون اساتذہ و مشائخ عظام کی مجالس و دروس بھی آپ کے اخذ حدیث کا ذریعہ رہی ہیں۔ ہم اپنے اس مختصر سے مضمون میں فن حدیث میں آپ کے ذوق اور محدثانہ بصیرت کے چند نمونے پیش کرتے ہیں، کسی موقع پر فوائد الفواد کی تمام حدیثوں کی تفصیلی تخریج کا بھی ارادہ ہے فاللہ الموفق۔

تدریس حدیث

سلطان المشائخ کا مشغلہ درس وتدریس رہا ہے البتہ وعظ ونصیحت، تزکیہ وتربیت اور ذکر وفکر کی مشغولیت کی وجہ سے آپ باضابطہ درس وتدریس جاری نہ رکھ سکے، لیکن گاہے بہ گاہے کتب تصوف کے علاوہ مشارق الانوار کا درس دیا کرتے تھے، خواجہ امیر حسن علا سنجری نے ایک مجلس میں درس حدیث کا ذکر کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

خواجہ نوح جو قرابت کا شرف رکھتے تھے، سامنے بیٹھے تھے اور مشارق الانوار پڑھ رہے تھے، سلطان المشائخ اس کی شرح فرما رہے تھے۔ اس حدیث کا بیان چل رہا تھا کہ اگر کوئی نماز پڑھ رہا ہو، اس کے منہ میں تھوک یا بلغم آئے اور وہ اس کو تھوکنا چاہے تو اسے چاہیے کہ قبلہ کی طرف نہ تھوکے اور نہ دائیں جانب کہ اس جانب فرشتہ رہتا ہے۔ بائیں جانب یا پیر کے پاس اس طرح تھوکے کہ عمل کثیر نہ ہو، صرف اتنا کرنے سے نماز خراب نہیں ہوتی۔ (ج: دوم، اڑتیسویں مجلس، ص: ۱۵۱)

اس کے علاوہ سلطان المشائخ نے اس مجلس میں کئی حدیثوں کی شرح فرمائی۔

تخریج وتبصرہ

صحیح بخاری میں یہ حدیث مختلف الفاظ سے مروی ہے، اس مجلس میں مذکور معنی کے الفاظ یہ ہیں: **إِذَا تَنَخَّمَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَخَّمَنَّ قِبَلَ وَجْهِهِ، وَلَا عَنْ يَمِينِهِ وَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهِ، أَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرَى۔**

سامنے یا دائیں جانب تھوکنے کی ممانعت کیوں ہے؟ اس حکم کا سبب نزول کیا ہے؟

ایک وجہ تو خود اس روایت ہی میں مذکور ہے کہا: **إِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى نُخَامَةً فِي جِدَارِ الْمَسْجِدِ، فَتَنَاوَلَ حَصَاةً فَحَكَّهَا....**

رسول اللہ ﷺ نے مسجد کے قبلے والی دیوار میں تھوک دیکھا، آپ نے کنکری سے اسے صاف کیا، پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر مذکورہ کلمات ارشاد فرمائے۔ (۱)

گویا آپ نے قبلہ کی دیوار پر تھوک ہونے کی وجہ سے طبعی کراہت محسوس کی تو آپ نے نظافت و پاکیزگی کی تعلیم دیتے ہوئے لوگوں کو قبلہ کی طرف تھوکنے سے منع فرمایا۔

ایک روایت میں اس کا ایک دوسرا سبب بھی مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: تم میں کون ہے جو یہ پسند کرتا ہو کہ جو شخص اس کا استقبال کرے، اس کے منہ پر تھوکے؟ جب تم نماز میں ہوتے ہو تو اللہ رب العزت اور دائیں جانب کا فرشتہ تمہارا استقبال کرتا ہے، اس لیے نہ قبلہ کی طرف تھوکو، اور نہ دائیں جانب، بلکہ بائیں جانب اپنے قدموں کے نیچے، اور اگر اچانک تھوکنا پڑے تو اس طرح کرو۔ (آپ نے اپنے کپڑے پر تھوکا اور اس کو مل لیا یا کپڑے کے دوسرے حصے سے چھپا دیا۔)

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب لا یبصق عن یمینہ فی الصلاۃ (۴۱۰)

أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَسْتَقْبِلَهُ رَجُلٌ فَيَبْصُقَ فِي وَجْهِهِ، إِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ فَإِنَّمَا يَسْتَقْبِلُ رَبَّهُ عَزَّ وَجَلَّ وَالْمَلَكُ عَنْ يَمِينِهِ، فَلَا يَبْصُقْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا عَنْ يَمِينِهِ، وَلْيَبْصُقْ تَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرَى أَوْ عَنْ يَسَارِهِ، فَإِنْ عَجِلَتْ بِهِ بَادِرَةٌ فَلْيَقُلْ هَكَذَا وَرَدَّ بَعْضَهُ عَلَى بَعْضٍ۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں قبلہ کی طرف تھوکنے کی ممانعت حدیث میں مذکور نہیں ہے بلکہ نماز کی حالت میں قبلہ اور دائیں جانب تھوکنا منع ہے یا مسجد کی دیواروں پر تھوکنا منع ہے۔ آج کے زمانے میں ضرورت محسوس ہو تو ٹیشو پیپر یا رومال استعمال کرنا چاہیے۔

حدیث کے بارے میں احتیاط اور صحیح حدیث کی فضیلت

حدیث کے بارے میں دو احتیاطیں ہیں:

ایک یہ کہ کسی عام آدمی کے قول کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف انتساب نہ کر دیا جائے، اس لیے کہ نبی کا قول وحی الٰہی ہے، ہر مسلمان کا اس کو تسلیم کرنا ضروری ہے، جب کہ امت کے کسی فرد کے قول کی یہ حیثیت نہیں ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (۲) جس نے میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

محدثین نے اپنے منہج کی تعیین میں اسی بات کو زیادہ ملحوظ رکھا ہے۔

دوسری احتیاط یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ موضوع وضعیف کہنے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی بات امت تک پہنچنے سے رہ جائے، کوئی حکمت کی بات چھوٹ جائے، کسی سنت پر عمل نہ کر کے امت ایک بڑے ثواب سے محروم رہ جائے۔ صوفیہ صاحب عمل ہوتے ہیں اسی لیے انھوں نے عمل میں احتیاط کو زیادہ فوقیت دی ہے۔

لیکن معتدل اور منصف وہی شخص ہے جو ان دونوں منہج کو حسن وخوبی سے نبھا لے جائے۔

سلطان المشائخ کے عمل سے ان دونوں منہج کی تائید ملتی ہے:

ایک مجلس میں مولانا سراج الدین حافظ بدایونی حاضر تھے انھوں نے سوال کیا کہ کیا یہ حدیث ہے؟ **من ليس له شيخ فشيخه ابليس**۔ جس کا کوئی پیر نہ ہو اس کا پیر شیطان ہے۔

سلطان جی نے فرمایا کہ یہ مشائخ کا قول ہے۔

مولانا سراج الدین نے پھر پوچھا کہ کیا یہ بھی حدیث رسول ہے؟ **من لم ير مفلحا لا يفلح ابدا**۔ جو کسی فلاح پہنچانے والے کو نہیں دیکھتا وہ کبھی فلاح کو نہیں پہنچ سکتا۔

---

(۱) مسند احمد، از سعید خدری (۱۱۱۸۵)، صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب حک البزاق بالید من المسجد (۴۰۵)

(۲) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۱۰۷) صحیح مسلم، مقدمۃ، باب فی التحذیر من الکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۳)

سلطان جی نے فرمایا کہ یہ بھی مشائخ کا قول ہے۔(ج: چہارم، چھتیسویں مجلس، ص: ۲۹۲)

حالاں کہ ان دونوں کلام کا معنی صحیح ہے لیکن آپ نے اس کا انتساب رسول اللہ کی طرف نہیں کیا جیسا کہ بعض غیر محتاط لوگ کر جاتے ہیں۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ لگانا آسان ہو گیا کہ صوفیہ کی طرف جو یہ اتہام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے حدیثیں گڑھی ہیں وہ کہاں تک درست ہے؟ اور اگر کسی نے کچھ خطا بھی کی ہے تو وہ شرار صوفیہ ہیں اور ایسے لوگوں سے کون سی جماعت بری ہے؟

اسی طرح ایک دوسری مجلس کا قصہ اس طرح ہے:

میں (خواجہ امیر حسن) نے عرض کی کہ یہ جو ایک آدمی پانی پیتا ہے اور دوسرے ہاتھ آگے بڑھائے رکھتے ہیں، کیا یہ سنت ہے؟

سلطان جی نے تامل فرمایا۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے چند لفظ پڑھے اور بولا کہ یہ حدیث ہے کہ جو شخص کسی کے پانی پیتے وقت ہاتھ بڑھاتا ہے وہ ضرور بخشا جائے گا۔

سلطان جی نے زبان مبارک سے ارشاد فرمایا کہ یہ حدیث ان کتابوں میں جو مشہور اور معتبر ہیں نہیں آئی ہے ممکن ہے کہ یہ حدیث ہو۔

پھر فرمایا: اگر حدیث سنیں تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ رسول کی حدیث نہیں ہے بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جن معتبر کتابوں میں حدیث جمع کی گئی ہے، ان میں یہ حدیث نہیں آئی ہے۔(ج: پنجم، دسویں مجلس، ص: ۳۹۶)

آپ کے اس فرمان سے واضح ہوا کہ کسی جلد بازی میں حدیث ہونے کا انکار نہیں کر دینا چاہیے، خاص طور سے ایسی حدیث جس میں عمل کی ترغیب یا منہیات سے ترہیب ہو۔ ہاں! اعتقادات کے باب میں احتیاط ضروری ہے، اسی لیے تو متقدمین محدثین نے صحیح اور موضوع کے درمیان ضعیف کو واسطہ بنایا ہے تاکہ کوئی موضوع روایت وحی کا درجہ حاصل نہ کر لے، اسی طرح بشری خطا کی وجہ سے کسی قول رسول کو موضوع کہہ کر رد نہ کر دیا جائے۔

اسی مجلس میں سلطان المشائخ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی صحیح حدیث کی فضیلت کے بارے میں ایک حکایت بیان فرمائی:

ایک دفعہ مولانا رضی الدین نیشاپوری بیمار ہوئے اور ان کی بیماری نے طول کھینچا، ان کے پڑوس میں ایک عالم رہا کرتے تھے، وہ عیادت کے لیے آئے۔ اس وقت مولانا رضی الدین بحران کی حالت میں تھے، وہ عالم ان کے سرہانے بیٹھ گئے اور یہ حدیث پڑھی: **قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الغیبۃ أشد من الزنا**۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غیبت زنا سے زیادہ سخت گناہ ہے۔ مولانا رضی الدین پر اگرچہ بیماری کا غلبہ تھا مگر انھوں نے اس عالم سے پوچھا کہ

حدیث بیان کرنے کا یہ کون سا موقع ہے کیوں کہ نہ تو اس وقت زنا کا ذکر ہو رہا ہے نہ غیبت کا، پھر کس وجہ سے آپ نے یہ حدیث بیان کی۔ اس عالم صاحب نے جواب دیا کہ میرا مقصد توجیہ اور غیر توجیہ نہیں ہے، میں نے یہ سن رکھا ہے کہ جو کسی بیمار کے سرہانے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں میں سے ایک حدیث پڑھے گا، وہ مریض صحت پائے گا، یہ حدیث متواتر اور صحیح ہے، میں نے آپ کی صحت کی نیت سے پڑھی ہے۔ مولانا رضی الدین نے پھر کچھ نہ کہا اور اس بیماری سے صحت پائی۔ (ج: پنجم، دسویں مجلس، ص: ۳۹۶)

مرید کو عالم و محقق ہونا چاہیے

عام طور سے یہ مشہور ہے کہ مرید و متبع کو اندھا مقلد ہونا چاہیے، لیکن یہ بات بھی مکمل طور سے درست نہیں ہے، ورنہ صاحب وحی کبھی بھی صحابہ سے مشورہ نہیں کرتے بلکہ جمہور کے مشورہ کے برخلاف ایک صحابی کے مشورہ کی موافقت میں قرآن نازل نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو اپنے مریدین میں محدّث (صاحب الہام) کو ڈھونڈنا چاہیے۔ ہر عام میں خاص ہوتا ہے اور کسی خاص پر خاص تجلی ہوتی ہے۔ تجلی جب مل جائے تو اس کو تسلیم کر لینا علم موسوی ہے، اولوالعزم نبی کی شان ہے۔

مدرسہ حنفیہ کی بنیاد ہی مجتہدین پیدا کرنے کے لیے رکھی گئی تھی۔ جہاں امام ابوحنیفہ نے ادب و احترام کے ساتھ اپنے اساتذہ اور ائمہ تابعین بلکہ مجتہدین صحابہ سے اختلاف کیا ہے وہیں ان کے تلامذہ نے ان سے اور ان کے تلامذہ کے تلامذہ نے اپنے اساتذہ سے اختلاف کیا ہے بلکہ ان میں بعض سے تو مستقل مذاہب فقیہ بھی متعارف ہوئے۔

مدرسہ صوفیہ کی خمیر ہی عین شریعت کبری سے گوندھی گئی ہے، جہاں ابتدا ہی انا الحق سے کرائی جاتی ہو وہاں تقلید جامد کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اجتہادی قوت کا فقدان زوال امت کے لیے کافی ہے، لیکن کمال ہے ان مجتہدین و عارفین کا کہ انھوں نے اتباع و اجتہاد کی ایسی بنیاد رکھی کہ جس میں سلف صالحین، ائمہ مجتہدین اور مشائخ عظام کا ادب بھی باقی رہا اور علی وجہ البصارۃ والبصیرۃ اس امت کی رہ نمائی بھی ہوتی رہی۔

مرشد گرامی حضور داعی اسلام فرمایا کرتے ہیں کہ عالم ہی کو مرید ہونا چاہیے تاکہ وہ شیخ کے مبہم و متشابہ کی تقلید کیے بغیر اس کا نور حاصل کر لے، بشریت اور خطائے شیخ کو صرف نظر کر جائے، محکمات اور اشارات پر بلا تاویل عمل پیرا ہو جائے۔

جامع ملفوظات خواجہ امیر حسن علا سجزی کا ذوق حدیث بھی بلند تھا، اسی لیے وہ کبھی کبھی آداب بارگاہ شیخ کو بجا لاتے ہوئے حدیث کا حوالہ یا اس کی فنی حیثیت کے بارے میں سوال کر لیتے تھے، اس کی دو مثال ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی مثال: خواجہ حسن نے ایک مجلس میں سلطان المشائخ سے یہ روایت سنی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے فرمایا: اے عائشہ! سورج کے سامنے مت بیٹھو، اس سے چہرے کی طراوت وتازگی جاتی رہتی ہے۔ اس کے صحیح ہونے میں خواجہ حسن کو تامل ہوا، چناں چہ دوسری مجلس میں شیخ سے عرض کیا کہ بندے نے پچھلی مجلس میں آپ سے یہ روایت سنی تھی، اس پر یہ خیال آیا کہ آپ سے پوچھوں کہ حدیث کیسی ہے؟ سلطان المشائخ سمجھ گئے کہ امیر حسن کو شبہہ ہوا ہے اور ٹھیک ہی ہوا ہے، اس لیے فرمایا:

میں نے یہ روایت حدیث کی کسی کتاب میں نہیں پڑھی ہے بلکہ مولانا علاء الدین اصولی سے سنی ہے جو بدایوں میں میرے استاذ تھے۔ (فوائد الفواد، مجلس: ۳۴، ج: ۳، ص: ۲۷۸)

تخریج وتحقیق: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نہیں ملی، البتہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے ایک روایت مروی ہے: **يَا عَلِيُّ لَا تَسْتَقْبِلِ الشَّمْسَ، فإن استقبالها داء، واستدبارها دواء.** اے علی! سورج کے سامنے نہ بیٹھو، کیوں کہ سورج کے سامنے چہرہ کر کے بیٹھنا بیماری ہے اور پیٹھ کر کے بیٹھنا دوا ہے۔

بوصیری نے اس حدیث کے بارے میں کہا کہ یہ سند مسلسل بالضعفاء ہے

۱-حماد بن عمرو نصیبی وضاع ہے۔ ۲-عبدالرحیم بن واقد ضعیف ہے۔ ۳-سري بن خالد مجہول ہے۔

بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اور سیوطی نے اللآلی میں موضوع کہا ہے۔

اس حدیث کی تائید حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔

ابن عباس کی روایت کو حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے، اس پر کوئی حکم بھی نہیں لگایا ہے، ذہبی نے کہا کہ یہ روایت طحان کی موضوعات میں سے ایک ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوسَ فِي الشَّمْسِ فَإِنَّهَا تُبْلِي الثَّوْبَ، وَتُنْتِنُ الرِّيحَ، وَتُظْهِرُ الدَّاءَ الدَّفِينَ۔

[سخت] دھوپ میں بیٹھنے سے بچو، کیوں کہ یہ کپڑے کو خراب کرتا ہے، ہوا کو متعفن کرتا ہے، چھپے ہوئے بیماری کو ظاہر کرتا ہے۔

ان ہی الفاظ سے ابن عمر کی موقوف روایت ہے، جس کی سند میں عثمان بن ضحاک ضعیف راوی ہے۔

حضرت عائشہ سے ایک روایت سورج میں پانی گرم کرنے سے متعلق ہے: **دَخَلَ عَلَيَّ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ سَخَّنْتُ مَاءً فِي الشَّمْسِ، فَقَالَ: لَا تَفْعَلِي يَا حُمَيْرَاء! فَإِنَّهُ يُورِثُ الْبَرَصَ۔**

نبی کریم ﷺ میرے پاس تشریف لائے، میں نے دھوپ میں پانی گرم کیا، تو آپ نے فرمایا: اے گلابی رنگت والی! ایسا نہ کرو؛ کیوں کہ اس سے برص کی بیماری ہوتی ہے۔(۱)

ابھی اس حدیث سے متعلق درایتاً بحث باقی ہے کہ معاصر سائنس داں اس تعلق سے کیا کہتے ہیں۔

---

(۱) المطالب العالیۃ، باب النھي عن الجلوس في الشمس (۱۱/۲۹) تخریج وتحقیق مطالب عالیہ کے محققین کی رقم کردہ حاشیہ کی بحث کا خلاصہ ہے۔

دوسری مثال: خواجہ امیر حسن علا سجزی نے ایک مجلس میں سلطان المشائخ سے ایک حدیث کی فنی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا کہ یہ حدیث کیسی ہے؟ **اَلسَخِيُّ حَبِيبُ اللّٰهِ وَإِنْ كَانَ فَاسِقًا** (سخی اللہ کا محبوب ہے، اگر چہ وہ فاسق ہو۔) آپ نے جواب دیا کہ لوگ تو ایسا بیان کرتے ہیں۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ اربعین میں یہ حدیث آئی ہے، سلطان المشائخ نے فرمایا: ''آن چہ در صحیحین است آن صحیح است۔''

یعنی صحیحین میں جو حدیث مذکور ہے اس پر بلا تامل حکم صحت لگایا جاتا ہے، اس کے علاوہ دوسرے کتب حدیث میں کوئی روایت آئے تو اس کی سند میں غور وفکر کیے بغیر کوئی حکم لگانا جلد بازی ہوگی۔

تجزیہ: سلطان المشائخ کے قول کا جو مفہوم میں نے پیش کیا ہے اس سے کافی حد تک یہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ کیا بخاری و مسلم کی صحیحین میں جو بھی حدیث ہے وہ سب صحیح ہے؟ کیا واقعی ایسا ہی ہے جیسا کہ ان کتابوں کے مصنفین نے دعوی کیا ہے کہ ہم اس کتاب میں صرف صحیح روایت ہی پیش کریں گے؟

جمہور محدثین نے ان کے اس دعوے کو درست مانا ہے، ان کی ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ امت کے درمیان ان دنوں کتابوں کو جو قبولیت عامہ حاصل ہے وہ کسی دوسری کتاب کو نہیں۔

درست قول یہ ہے کہ معلقات کے علاوہ سند متصل سے مروی احادیث مجموعی طور سے سب صحیح ہیں، بعض راوی انفرادی طور سے ضعیف ہیں، لیکن ان کی اکثر روایات متابعات وشواہد کی بنیاد پر صحیح ہوگئی ہیں، تاہم کچھ روایتوں میں ان کا ضعف ختم نہیں ہوا ہے اور بعض روایتوں پر تو سند صحیح کے باوجود کلام کیا گیا ہے۔

تخریج: خواجہ امیر حسن نے حدیث کے جو الفاظ سلطان مشائخ کے سامنے پیش کیے، اس میں **السخی** کی جگہ **الکریم** سے درویشوں کے یہاں مشہور ہے۔ یعنی: **اَلْكَرِيمُ حَبِيبُ اللّٰهِ وَلَوْ كَانَ فَاسِقًا**

یہ روایت درایتاً وروایتاً باطل و بے اصل ہے۔ فاسق محبوب نہیں ہوسکتا، اگر چہ وہ سخاوت کا دریا بہا دے۔ اسی لیے سلطان المشائخ نے اشارتاً اس کی طرف یہ کہہ کر رہنمائی فرمائی کہ صرف صحیحین کی روایت پر ہی آنکھ بند کر کے اعتماد کیا جاتا ہے اور یہ روایت ان میں نہیں ہے۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ حدیث کی نفی کرنے میں سلطان المشائخ احتیاط کرتے تھے، جس کی وجہ سے آپ نے کوئی واضح حکم نہیں لگایا، صرف اشارہ فرمایا۔

تاہم یہ بات یقینی طور سے صحیح و درست ہے کہ سخاوت وفیاضی یا رحم وکرم محبوب عمل ہے، اگر چہ فاسق وفاجر بلکہ کافر سے ہی کیوں نہ صادر ہو۔

سنن ترمذی میں سخاوت سے متعلق جو روایت ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

السَّخِيُّ قَرِيبٌ مِنَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِنَ الجَنَّةِ قَرِيبٌ مِنَ النَّاسِ بَعِيدٌ مِنَ النَّارِ، وَالبَخِيلُ بَعِيدٌ مِنَ اللّٰهِ بَعِيدٌ مِنَ الجَنَّةِ بَعِيدٌ مِنَ النَّاسِ قَرِيبٌ مِنَ النَّارِ، وَالْجَاهِلُ السَّخِيُّ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ عَابِدٍ بَخِيلٍ. (ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب ماجاء فی السخاء، ح:۱۹۶۱)

سخی اللہ سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے، لوگوں سے قریب ہے اور جہنم سے دور ہے۔ بخیل اللہ سے دور ہے، جنت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے، اور جہنم سے قریب ہے۔ جاہل سخی اللہ کی بارگاہ میں عابد بخیل سے زیادہ مقبول ہے۔

اس روایت پر بھی کلام ہے۔ اکثر لوگوں نے ضعیف کہا ہے اور یہی صحیح حکم ہے جیسا کہ علامہ ابن حجر نے فرمایا ہے۔ بعض لوگوں نے تو موضوع بھی کہا ہے، لیکن یہ درست نہیں ہے۔

اس سلسلے میں تفصیلی بحث علامہ عبد الرحمن سخاوی (۹۰۲ھ) کی کتاب ''**المقاصد الحسنة في بيان كثير من الأحاديث المشتهرة على الألسنة**'' (رقم: ۵۵۷) میں ملاحظہ فرمائیں۔

مشکل حدیثوں کے درمیان تطبیق

صائم الدہر کی دو متضاد حدیثوں کے بارے میں سلطان المشائخ نے فرمایا:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: **مَنْ صَامَ الدَّهْرَ لَا صَامَ وَ لَا أَفْطَرَ** (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے نہ روزہ رکھا نہ افطار کیا۔)

اور دوسری حدیث میں آیا ہے: **مَنْ صَامَ الدَّهْرَ ضُيِّقَتْ عَلَيْهِ جَهَنَّمُ هَكَذَا وَ عَقَدَ تِسْعِينَ**۔ (جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس پر دوزخ تنگ ہوگئی اور انہوں نے نوے کی گرہ لگائی۔) اب ان دونوں حدیثوں کے درمیان کس طرح مطابقت کی جائے گا؟ (پہلی حدیث) جس میں یہ کہا گیا ہے کہ جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے نہ روزہ رکھا، نہ افطار کیا۔ اس کے معنی اس طرح ہوں گے کہ جس نے پیوستہ روزہ رکھے تو ان میں وہ پانچ روزہ دو عیدوں کے اور چار ایام تشریق کے روزے بھی ہوئے۔ بس یہ ایسا ہوگا کہ اس نے نہ روزہ رکھا، نہ افطار کیا۔ اور جس نے متواتر روزے رکھے مگر ان پانچ روز افطار کیا، اس پر جہنم تنگ ہوگئی جس طرح نوے کی گرہ، یعنی اس شخص کے لیے جہنم میں کوئی گنجائش نہیں ہے جیسے کہ نوے کی گرہ میں کسی چیز کی گنجائش نہیں ہوتی۔ (ج: اول، اٹھارہویں مجلس، ص: ۳۳)

تجزیہ وتبصرہ

صیام الدہر کے سلسلے میں دو متضاد حدیثوں میں آپ نے جو تطبیق دی ہے، عام محدثین نے سب سے زیادہ اسی تطبیق کو نقل کیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسرے اقوال بھی ہیں جیسے؛ حدیث ممانعت پر ہے ہی نہیں بلکہ خبر ہے کہ جو ہمیشہ روزہ رکھے گا اسے مشقت وتکلف کا کوئی احساس ہی نہیں رہے گا، بلکہ روزہ اس کے لیے روز کی طرح ہوجائے گا، صیام وافطار اس کے لیے برابر ہوجائے گا۔ اسی لیے بعض لوگوں نے صیام الدہر کے بالمقابل صوم داؤدی کو ترجیح دی۔ اسی طرح یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ ممانعت اس شخص کے لیے ہے جو دوسرے حقوق وواجبات کی ادائیگی میں کوتاہی کرے اور اگر تمام حقوق کی پاسداری کے ساتھ روزہ رکھے تو ضرور ہمیشہ کے لیے جہنم سے آزاد ہوجائے گا،

امام ابو یوسف اور بعض حنفیہ سے صیام الدہر کی مطلق ممانعت مروی ہے، اس کی وجہ یہی بتائی گئی ہے کہ صیام الدہر کی وجہ سے جسم لاغر و کمزور ہو جائے گا اور حقوق و واجبات میں کوتاہی ہوگی، یا مستقل روزہ رکھنے کی وجہ سے عبادت عادت کی شکل اختیار کر لے گی، جس کی وجہ سے عبادت کا مقصد فوت ہو جائے گا۔(۱) لیکن اس کے برخلاف اہل علم نے لکھا ہے کہ صحابہ و تابعین میں سے بہت سے لوگ صائم الدہر تھے۔ امام نووی شافعی لکھتے ہیں:

ان سلف صالحین اور ان کے متبعین کے اسمائے گرامی جنھوں نے ایام منہیہ؛ عیدین اور چار دن تشریق کے علاوہ ہمیشہ روزہ رکھا: حضرت عمر بن الخطاب، ان کے لڑکے عبداللہ، ابوطلحہ انصاری، ابوامامہ، ان کی اہلیہ، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم، ان تمام کا ذکر سند کے ساتھ بیہقی نے کیا ہے۔ ابوطلحہ انصاری کی روایت تو بخاری میں ہے۔ ان ہی میں سعید ابن مسیب، ابوعمرو بن حماس، سعید بن ابراہیم بن عبدالرحمن ابن عوف تابعی- انھوں نے تو چالیس سال لگاتار روزے رکھے- عبداللہ ابن مسعود کے تلمیذ اسود بن یزید وغیرہ۔ (المجموع شرح المہذب، مسائل تتعلق بکتاب الصیام: ۶/ ۳۹۰)

تخریج: مَنْ صَامَ الدَّهْرَ فَلَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ۔

مسند احمد (۱۶۳۲۳) میں یہ حدیث صحابی رسول ابومطرف عبداللہ ازدی سے مروی ہے۔ صحابی کے علاوہ اس کے تمام رجال صحیح مسلم کے ہیں۔

مَنْ صَامَ الدَّهْرَ ضُيِّقَتْ عَلَيْهِ جَهَنَّمُ هَكَذَا وَعَقَدَ تِسْعِينَ۔

مسند احمد (۱۹۷۱۳) میں یہ حدیث صحابی رسول ابوموسی اشعری سے مروی ہے۔

طیالسی، ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے موقوفاً روایت کیا۔ عبد ابن حمید، بزار، ابن حبان، ابن خزیمہ وغیرہ نے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ اس حدیث کے وقف و رفع میں اختلاف ہے۔ یہ روایت سنداً حضرت ابوموسی اشعری کے قول کے طور پر صحیح ہے لیکن معنی کے اعتبار سے مرفوع ہے۔

تصحیح مفاہیم حدیث

سلطان المشائخ کی ایک مجلس میں اس حدیث کا ذکر آیا کہ **الصَّوْمُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ**. (روزہ میرے لیے ہوتا ہے اور میں ہی اس کی جزا دیتا ہوں) حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا: یہ حدیث اس طرح بھی سنی گئی ہے کہ **اَلصَّائِمُ لِيْ** (روزہ دار میرے لیے ہے۔) خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے تبسم فرمایا اور کہا پھر تو **أَنَا أَجْزِي لَهُ** (میں ہی اس کا بدلہ ہوں) کہنا چاہیے۔ اس کے بعد ان صاحب کی بات کی تصحیح فرمائی کہ **أَجْزِي بِهِ** کی 'ب' 'ل' کے معنی میں آئی ہے۔ (ج: چہارم، ساٹھویں مجلس، ص: ۳۵۲)

---

(۱) الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار)، کتاب الصوم (۲/ ۳۷۶) حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الايضاح، کتاب الصوم، فصل في صفة الصوم وتقسيمه (ص: ۶۴۱)

صحیحین میں یہ حدیث مروی ہے، کسی بھی روایت میں اَلصَّائِمُ لِیْ کا لفظ نہیں ملا، سلطان المشائخ نے صوفیانہ اخلاق کے مطابق ان صاحب کا رد نہیں کیا، لیکن اس کی نفی کی طرف اشارہ فرمایا کہ تب تو أَنا أَجْزِي لَهُ ہونا چاہیے لیکن صوفیہ نے اس حدیث کے معنی میں جو یہ اشارہ نکالا ہے کہ روزہ داروں کا بدلہ ذات باری تعالیٰ خود ہی ہے، اس کی رضا و خوشنودی ہی ہے۔ اسی معنی کو حاصل کرنے کے لیے سلطان المشائخ نے 'ب' کو 'ل' کے معنی میں لیا ہے یعنی روزہ داروں کے لیے میں ہی بدلہ ہوں۔ اسی معنی کو حاصل کرنے کے لیے بعض لوگوں نے فعل: أَجْزِي معروف کو أُجْزٰی مجہول پڑھا ہے۔

حرف آخر

اس بحث سے اندازہ ہوا کہ سلطان المشائخ اپنے عہد کے اعتبار سے سرزمین ہند کے جہاں ایک ممتاز فقیہ تھے وہیں آپ کا ذوق حدیث بھی بہت بلند تھا۔ آپ کی وجہ سے آپ کے تلامذہ و خلفا میں یہ ذوق عام ہوا کہ وہ لوگ جہاں ایک طرف روحانیت کے شہ سوار ہوئے تو دوسری طرف علمی و فقہی میدان میں بھی اپنے وجود کا احساس دلایا۔

الٰہی تابود خورشید و ماہی
چراغ چشتیاں را روشنائی

سلطان المشائخ اور فقہ

بدایوں ساتویں صدی ہجری میں ایک علمی اور اسلامی ثقافت کا بلند پایہ شہر تھا۔ یہاں بڑے بڑے علما اور اولیا براجمان تھے۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا سید محمد بن احمد بن علی بخاری قدس اللہ سرہ نے اسی شہر میں آنکھیں کھولیں، کم سنی میں ہی والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا لیکن والدہ محترمہ سیدہ بی بی زلیخا نے آپ کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

تقریباً ۱۲/سال کی عمر میں مدرسہ میں داخل ہوئے اور بدایوں کے علما سے ضروری علوم عربیہ اور اسلامیہ حاصل کیا۔ آپ نے دیار ہند میں رائج حنفی مذہب کا معتبر متن قدوری کی تعلیم شیخ علاء الدین اصولی علیہ الرحمہ سے حاصل کی۔ ختم قدوری پر آپ کے مشفق استاذ نے سرکردہ علمائے بدایوں کی موجودگی میں آپ کے سر پر دستار فضیلت و کرامت سجائی، سارے علما نے آپ کی پیشانی میں درخشاں تجلیات کا مشاہدہ کیا، سب نے آپ کو بہت دعاؤں سے نوازا۔

آپ ۱۶/سال کی عمر میں بدایوں سے دہلی تشریف لائے۔ یہاں بھی آپ نے مختلف علما و مشائخ سے متعدد علوم و فنون حاصل کیے۔ پھر اخیر میں علمی و روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے شیخ الاسلام والمسلمین بابا فریدالدین گنج شکر قدس اللہ اسرارہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، یہاں پر بھی آپ نے اپنے ظاہر و باطن کو علم و ادب سے آراستہ کیا اور عرفان کے اعلیٰ منازل طے کیے، اور ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی کے بے تاج روحانی بادشاہ نامزد ہوئے۔

دہلی میں آپ کی شخصیت علم وادب اور اخلاق و روحانیت کا مرکز ہوگئی، طالبان صادق کو آپ نے ہر طرح سے مزین فرمایا، باطن کے تو آپ یکتاے روزگار تھے ہی ظاہر میں بھی علوم عربیہ و اسلامیہ کے شہ سوار تھے۔ دوسرے علوم وفنون کے ساتھ آپ نے ہندوستان میں رائج مذہب حنفی کی کتابوں کی طرف بھی اپنے متوسلین کی رہنمائی فرمائی۔ آپ خود مذہب حنفی کے بڑے عالم وفقیہ تھے اور آپ کے خلفا بھی آپ کی تربیت سے مذہب حنفی کے ماہر واقع ہوئے تھے۔ کیوں کہ آپ علامہ برہان الدین مرغینانی (۵۹۳ھ) کی ممتاز کتاب ''ہدایہ'' کا درس لیے بغیر خلافت نہیں دیتے تھے۔

آپ کے مقام ومرتبہ کا اندازہ شیخ محمد بن نصیر الدین جعفر مکی حسینی خلیفہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس اللہ اسرارہما کے مشاہدۂ غیبی سے لگایا جاسکتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے:

> روزی این فقیر در کشتی دریای نیل مصر با خضر علیہ السلام مصاحب بود وسخن در بیان شاہدان لایزالی می رفت، خضر علیہ السلام نیز فرمود، کہ عبد القادر گیلانی ونظام الدین بدایونی در مقام معشوقی بودند بعدہ فرمود واللہ ہمچون نظام الدین بدایونی وعبد القادر گیلانی در زیر کبود آسمان نیامدہ است و نہ خواہد آمد۔ (بحر المعانی، مکتوب: ۱۴، ص: ۲۱۳، ۲۱۴)
>
> یہ فقیر ایک روز مصر کے دریائے نیل میں کشتی پر خضر علیہ السلام کے ہمراہ تھا اور شاہدان لایزالی کے بارے میں گفتگو چل رہی تھی، خضر علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ عبد القادر جیلانی اور شیخ نظام الدین بدایونی مقام معشوقیت میں تھے، پھر فرمایا: خدا کی قسم! نظام الدین بدایونی اور عبد القادر گیلانی جیسا اس نیلے آسمان کے نیچے نہ آیا ہے اور نہ آئے گا۔

اس واقعہ سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ آپ ولایت محمدی کے کس مقام پر فائز تھے، جہاں عین شریعت کبری سے بلا واسطہ فیض حاصل کیا جاتا ہے، جیسا کہ مقدمہ میں مذکور ہے کہ ایسے لوگ حقیقتاً کسی بھی علم وفن میں تقلید سے آزاد ہوتے ہیں، ان کی کسی فقہی مذہب کی موافقت علی وجہ البصیرۃ ہوتی ہے لیکن عام طور سے یہ لوگ رائج مذہب کی مخالفت نہیں کرتے، جس کی وجہ سے لوگ انھیں خاص مذہب فقہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن یہ حضرات کبھی کبھی بعض مسائل میں احتیاط کی وجہ سے رائج مذہب کے برخلاف دوسرے مذہب پر عمل کرتے ہیں بلکہ اپنے متبعین کو اس کا حکم بھی دیتے ہیں۔

اسی لیے سلطان المشائخ کی علمی وفقہی سیرت کا مطالعہ کرنے والا یہ ضرور ملاحظہ کرے گا کہ آپ نے مسائل فقہیہ اور احکام شرعیہ بیان کرتے وقت اختلاف مذاہب کے ساتھ ساتھ جمع وترجیح کی گفتگو ضرور فرمائی ہے اور جس مسئلہ میں احتیاط کا عنصر غالب رہا ہے اسی کو آپ نے اختیار کیا ہے، اسی لیے آپ نے بعض مسائل میں فقہاے احناف کے مفتی بہ قول کے برخلاف عمل کیا ہے۔ اس کی چند مثالیں آنے والے سطور میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

شریعت ظاہرہ کی پاسداری

شرع کی پاسداری ضروری ہے، خاندان چشت نے ہمیشہ شرع کو مقدم رکھا ہے، مغلوب خواہ وہ شیخ ومرشد ہو یا مرید ومتبع، وہ ہماری بحث سے خارج ہے۔ بسا اوقات مرید آداب شیخ کی بجا آوری میں حکم شرع کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ہم یہاں اسی کی طرف تنبیہ کرنے کے لیے مشائخ چشت کی تعلیمات اور معمولات ذکر کرنا چاہتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

شیخ الاسلام بابا فرید الدین گنج شکر قدس سرہ نے عمر کے آخری رمضان میں مرض کی شدت کی وجہ سے روزہ رکھنا ترک کر دیا تھا، ان دنوں آپ کے خلیفہ خاص خواجہ نظام الدین قدس سرہ آپ کی خدمت میں ہی موجود تھے۔ اسی اثنا میں ایک دن شیخ الاسلام کی بارگاہ میں کوئی خربوزہ لایا گیا اس کی قاشیں کر کے آپ کے سامنے رکھی گئیں، شیخ انھیں ایک ایک کر کے تناول فرما رہے تھے۔ ایک قاش خواجہ نظام الدین قدس سرہ کو عطا فرمائی، سلطان جی فرماتے ہیں:

> ”میں نے چاہا کہ اسے کھالوں، دل میں یہ خیال تھا کہ دو مہینے تک متواتر روزے رکھ کر اس روزے کا کفارہ ادا کروں گا۔ یہ دولت کہ خود اپنے ہاتھ سے کوئی چیز عنایت فرمائیں، پھر کہاں ملے گی؟ چناں چہ قریب تھا کہ میں اسے کھالیتا، شیخ الاسلام نے کہا کہ نہیں مت کھاؤ! مجھے تو شریعت کی طرف سے اجازت ہے، تمھیں نہیں کھانا چاہیے۔ (ج: دوم، اٹھارہویں مجلس، ص: ۸۹)

اسی طرح ایک بار خواجہ امیر حسن علا علیہ الرحمہ نے سلطان المشائخ سے یہ دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص نفل نماز پڑھ رہا ہے، اسی درمیان کوئی بزرگ ہستی کی تشریف آوری ہوتی ہے تو کیا یہ شخص نماز چھوڑ کر اس بزرگ ہستی کی صحبت اختیار کرے، سلطان المشائخ نے جواب دیا کہ نہیں، بلکہ اپنی نماز پوری کرے۔ خواجہ امیر حسن علا علیہ الرحمہ نے دوبارہ عرض کیا کہ جو نفل نماز ادا کرتا ہے وہ بھی ثواب اور سعادت حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے، اس دوران اگر اس کا شیخ ومربی آجائے اس کے لیے تو پیر کی قدم بوسی میں بڑی سعادتیں ہیں۔ اصحاب طریقت کا اعتقاد ہے کہ نفل نماز کے ثواب سے پیر کی قدم بوسی کرنے میں صدہا سعادت زیادہ ہے۔ سلطان المشائخ نے ارشاد فرمایا:

> ”حکم شرع اسی طرح ہے کہ وہ اپنی نماز پوری کرے۔ ایک دفعہ شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کسی پانی کے کنارہ پہنچے، مریدوں کو دیکھا کہ وضو کر رہے ہیں، ان کی نظر جیسے ہی شیخ پر پڑی، آدھے وضو ہی میں کھڑے ہو گئے اور شیخ کی تعظیم بجالائے، مگر ایک درویش نے مکمل وضو کیا پھر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تعظیم کی۔ شیخ بہاء الدین زکریا علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ ان میں درویش یہی ہے کہ اس نے وضو پورا کیا پھر میری تعظیم کی۔ (ج: پنجم، اٹھویں مجلس، ص: ۳۹۱)

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے جو اسی مجلس میں آگے مذکور ہے کہ اگر شیخ آواز دے تو نماز ترک کر دینا چاہیے۔ شیخ الاسلام بابا فرید نے خواجہ بدرالدین اسحاق کو آواز دی وہ نماز میں تھے، انھوں نے لبیک کہا اور شیخ کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی کو آواز دی وہ نماز سے فارغ ہو کر خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خدا اور رسول اگر حکم دیں تو فوراً حاضر ہو جانا چاہیے۔ اس کے بعد سلطان المشائخ نے پھر فرمایا: ''فرمان شیخ ہم چوں فرمان رسول است۔'' شیخ کا حکم بھی رسول اللہ کے حکم کی طرح ہے۔

پہلی حکایت میں شرع کو مقدم کرنے کی بات کہی گئی ہے جب کہ یہاں شیخ کے حکم پر بلا قید عمل کرنے کی بات کہی گئی ہے، ان دونوں مسئلوں میں تطبیق وجمع کے لیے درج ذیل نکات ملحوظ رکھنا چاہیے:

(۱) مسائل اصولیہ - فرائض وواجبات اعتقادیہ وعملیہ - میں شرع کو مقدم رکھیں گے، استحباب ونوافل میں شیخ کے حکم کو فوقیت دیں گے۔

(۲) ان مسائل میں شیخ کے قول کو مقدم کریں گے جن میں شرع کا کوئی واضح حکم نہ ہو، بلکہ کسی مجتہد کے اجتہاد پر عمل کر رہا ہو تو ایسی صورت میں شیخ کے اجتہاد پر عمل کرنا مناسب ہے، ہاں! اگر وہ خود صاحب اجتہاد ہے تو اس کو اپنے اجتہاد پر عمل کی اجازت ہے، لیکن از راہ تواضع اس نے شیخ کے حکم پر عمل کیا تو بھی بہتر کیا۔

(۳) شیخ امیر ہے لیکن اس کی امارت مقید ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقتدائے مطلق ہیں۔ کبھی بھی شرع کی مخالفت کی نیت سے شیخ کے قول پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اگر یہ ارادہ ہو تو کبھی شیخ یا مجتہد کے حکم پر عمل جائز ہے کہ حکم شرع کا محل کوئی اور ہے، شیخ یا مجتہد نے جو حکم دیا ہے اس کا محل یہی ہے۔ جیسا کہ مجتہدین مسائل کا محل اور اسباب وعلل بیان کرتے ہیں۔

آج کے دور انحطاط میں جہاں دار الافتاء پر نا اہلوں کا قبضہ ہے اور خانقاہوں میں بہروپیے اور جہال براجمان ہیں، ایسے دور میں بلا ضرورت اصول شرع کے خلاف تو دور کی بات ہے، استحبابی مسائل میں بھی خلاف عادت اور خلاف معمول حکم دینا امت کو فتنہ میں ڈالنا ہے، جو کسی بھی صاحب بصیرت کے لیے جائز نہیں۔ ہوا پرست ہماری اس بحث سے خارج ہیں، جو توہین علما یا خلاف قول شیخ کی بات اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو امت کے علما ومشائخ کی تعظیم کا حکم دیا اور ان کو انبیا کا مصاحب ومعاون قرار دیا تا کہ امت کے اندر اتحاد اور یکجہتی باقی رہے اور ان علما ومشائخ کی عزت افزائی ہو سکے، لیکن اس امت کی حرماں نصیبی ہے کہ ان اقوال کے سہارے لوگوں نے اپنے آپ کو بلا ادعا نبوت کے منصب پر فائز کر لیا۔ العیاذ باللہ، چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔

مسئلہ سماع اور حضرت محبوب الٰہی

شاعر مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں:

عقل و دل و نگاہ کا مُرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دِیں بُت کدۂ تصوّرات

عرفان ذات اور عشق الٰہی کے بغیر دین کا تصور رسم پرستی کے سوا کچھ نہیں۔ جس نے حقیقت ازلی کی محبت میں خود کو فنا کر دیا، وہی حقیقت میں کامیاب و بامراد رہا۔ عشق ہی انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اسی عشق کے حصول کے لیے فقہاے باطن مشائخ صوفیہ نے ہر طرح کے اجتہادات کیے۔ ان ہی اجتہادات کا ایک دل آویز نمونہ اور تاریخ تشریع اسلامی کی ایک لازوال مثال سنگیت اور سربھی ہے۔ صوفیہ نے موسیقی کے ذریعے فکر و نظر میں انقلاب برپا کیا۔ سماع مزامیر کے ذریعے عشق کی واردات کو انسان کے ظاہر و باطن میں داخل کیا جس نے حیات دنیوی و اخروی کی حقیقت کھول دی، عشق کی تیز آنچ کو اس طرح بھڑکایا کہ باطل کے خانہ خراب کو خاکستر کر دیا اور اس میں عشق و عرفان کی ایسی شمع روشن کی جس نے اس کے وجود کو ماورائی بنا دیا۔

موسیقی انسانی طبیعت میں سرایت کیا ہوا ایک راز پنہاں ہے۔ صوفیہ کرام نے سماع کے ذریعہ قلوب کو مسخر کیا، شعر و نغمہ کے پردے میں وجود کی زمین میں توحید و عرفان کی کھیتی لگائی۔ موسیقی کی مثال اس چنگاری سے دی جاسکتی ہے جس کو حاصل کرنے سیدنا موسی علیہ السلام وادی ایمن میں گئے تو کلیم اللہ بن کر لوٹے، لیکن جو اس کی لذت سے آشنا نہیں وہ تو فضول ہی سمجھے گا اور نصوص احادیث کو سیاق سے جدا کر کے اپنی پسند کا معنی نکالے گا اور حلت کی روایات میں بے جا تاویل کرے گا۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ سماع مزامیر کے تعلق سے صوفیہ کا ہر دور میں اختلاف رہا ہے۔ ایک طبقہ اسے شرائط کے ساتھ جائز قرار دیتا ہے تو دوسرا طبقہ اس کے عدم جواز کا قائل ہے اور اسے لہو و لعب میں شمار کرتا ہے۔ علما و فقہا کا بڑا طبقہ اسے درست نہیں مانتا اور سماع سے پرہیز کرتا ہے۔ ہندوستان میں صوفیہ خاص طور سے چشتی صوفیہ نے اس کو دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بنایا، ہندؤں کی خمیر میں رچی ہوئی بھجن و موسیقی کو مسلمان کر لیا اور اس کے ذریعہ ان کے دلوں میں جذبہ عشق کو پروان چڑھایا، شعر کی شکل میں نغمہ توحید سنایا، جس کے نتیجہ میں ان کے رگ و پے میں توحید حقیقی، عشق رسالت، ذکر آخرت اور محبت و آداب مرشد سما گیا، پھر انھیں یہ کہنا نہ پڑا کہ مسلمان ہو جاؤ بلکہ ان کا سراپا مسلمان ہو گیا۔

سلطان المشائخ مشائخ چشت کی روش پر سماع سنتے تھے، آپ کے خلفا نے بھی سماع سنا ہے، آپ کے محبوب مرید حضرت امیر خسرو موسیقی کے ماہرین میں سے تھے اور سازوں اور راگوں کے موجد تھے، اساتذہ فن میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے باوجود آپ کے حوالے سے بعض نصوص و عبارات ایسی پیش کی جاتی ہیں جن سے یہ باور ہوتا ہے کہ آپ سماع کے تو دل دادہ تھے لیکن مزامیر کو حرام سمجھتے تھے۔

رفیق محترم مولانا ذیشان احمد مصباحی زاداللہ علمہ وعرفانہ نے سماع سے متعلق ایک طویل سلسلہ وار مضمون لکھا ہے جس کی اب تک تین قسطیں اسی مجلہ ''الاحسان'' میں شائع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اللہ ہم سب کو ہدایت دے، فروعی مسئلے میں ہر ایک کو اپنے موقف پر عمل کی توفیق دے، افتراق وانتشار سے دور رکھے۔ آپ نے ان مضامین میں سماع پر اب تک لکھی جانے والی اہم کتابوں کا تعارف، صوفیہ کے سماع مجرد وسماع مزامیر کا تاریخی جائزہ، بعض لوگوں کی غلط تاریخ گوئی کا جائزہ، مسئلہ سماع کا فقہی وحدیثی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔

تاریخی مجلہ الاحسان کے شمارہ ۸ کی قسط کا ایک حصہ سلطان المشائخ اور سماع مزامیر سے متعلق ہے جو تقریبا ۲۰ صفحہ پر مشتمل ہے۔ موصوف نے مکمل وافی وشافی گفتگو فرمائی ہے، اس کا خلاصہ اختصار کے ساتھ قارئین کی نذر کیا جاتا ہے، تفصیل کے لیے اصل مضمون مطالعہ کریں۔

یہاں بنیادی اعتبار سے دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) خواجہ نظام الدین اولیا مزامیر کو جائز سمجھتے تھے یا ناجائز، ان کا موقف مطلق تھا یا مقید؟ اس کے ارتکاب کو کیا سمجھتے تھے؟ خلاف اولیٰ، گناہ صغیرہ، یا گناہ کبیرہ؟

(۲) خواجہ نظام الدین اولیا کا سماع بالمزامیر تھا یا بغیر المزامیر؟ ان سے قبل قاضی حمید الدین ناگوری (۶۴۳ھ/ ۱۲۴۶ء) کا، ان کے عہد میں اور ان کے بعد، ان کے اصحاب، خلفا اور مسترشدین کا موقف اور معمول کیا تھا؟

سماع مزامیر کے حوالے سے سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کے موقف ومعمول جاننے کے سب سے مستند مآخذ تین ہیں:

(۱) کشف القناع عن اصول السماع، از علامہ فخر الدین زرادی (۲) فوائد الفواد، از خواجہ حسن علی سجزی (۳) سیر الاولیاء، از سید محمد بن مبارک خورد کرمانی

یہ یاد رہے کہ پہلی کتاب ایک فقہی واصولی اور دلائل وبراہین کے ساتھ خاص اس موضوع پر لکھی گئی ہے۔ دوسری کتاب ایک ادیب وشاعر کے قلم سے مرتب کردہ مجموعۂ ملفوظ ہے اور تیسری ایک تذکرہ نگار کی کتاب سوانح ہے، موخر الذکر دونوں کتابیں استنادی اعتبار سے لاکھ مستند سہی، لیکن کسی بھی فقہی مسئلے کو سمجھنے کے لیے اس پر کسی عظیم فقیہ کے قلم سے لکھی گئی باضابطہ موضوعی تصنیف کا ہم پلہ نہیں ہو سکتیں۔

(الف) کشف القناع عن اصول السماع علامہ فخر الدین زرادی کا رسالہ ہے۔ آپ سلطان المشائخ کے اولوالعزم اور ممتاز خلفا میں شامل تھے۔ انہیں علم لدنی کا حامل اور مرتبۂ اجتہاد پر فائز بتایا گیا ہے۔ یہ کتاب حضرت نظام الدین اولیا کے حکم سے لکھی گئی ہے۔ علامہ زرادی نے سلطان المشائخ کے حکم سے یہ کتاب حلت مزامیر پر لکھی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا جواز مزامیر کے نہ صرف قائل تھے بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر بعض صوفیہ مزامیر سنتے ہیں تو ان پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور مزامیر کے حوالے سے

تفصیلی علمی موقف عام ہونا چاہیے۔ کشف القناع ایک مقدمہ اور دس اصول/فصول پر مشتمل ہے۔ کشف القناع کی تیسری فصل مزامیر کے بارے میں ہے۔ اس فصل پر غور کیجیے تو چند باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) مزامیر، علامہ زرادی کے نزدیک ہر اس آلہ کو کہتے ہیں، جس سے موزون آواز نکلے۔

(۲) مزامیر فی نفسہ مباح ہیں۔

(۳) مزامیر کی حرمت مقید ہے اور حرمت کی قید شراب نوشی کی یاد کا آنا ہے۔

(۴) مزامیر کی حرمت، جو احادیث میں وارد ہے، وہ حرمت شراب کی تبعیت میں ہے، کیوں کہ شراب پینے والوں کی مجالس میں شراب نوشی کے وقت مزامیر بھی بجائے جاتے تھے، اس لیے شراب کے ساتھ مزامیر کو حرام کر دیا گیا تاکہ شراب کی یاد بھی ذہنوں سے محو ہو جائے۔

(۵) جہاں بھی یہ علت -شراب کی یاد- معدوم ہوگی، مزامیر کی حرمت بھی ختم ہو جائے گی اور اس کی حلت ثابت ہو جائے گی، جو اصل ہے۔

(۶) جنگ میں طبل اور دیگر اچھے مواقع پر دف اور دیگر باجوں کا بجایا جانا اس لیے مباح ہے، کیوں کہ اس وقت شراب نوشی کی یاد نہیں آتی اور اسی طرح تمام مزامیر اصلا مباح ہیں، واقعہ نہیں کہ طبل وغیرہ کی حلت استثنائی ہے، بلکہ معاملہ یہ ہے کہ تمام مزامیر کی حلت بالذات ہے، اس لیے طبل وغیرہ بھی جائز ہیں۔

(۷) نفس اگر لہو سے پاک ہو اور مشتاق خیر ہو، تو ایسی صورت میں مزامیر نہ صرف جائز ہوتے ہیں بلکہ روح کی صفائی اور بلندی کا باعث ہوتے ہیں۔

(۸) دف کا بجانا اور سننا حدیث رسول سے ثابت ہے۔ لہٰذا اسی پر قیاس کرتے ہوئے دیگر مزامیر کی حلت بھی ثابت ہوگی۔ کیوں کہ دف بھی ایک مزمار ہے، جب ایک مزمار کا سننا اور بجانا حدیث سے مباح ہوا تو دیگر مزامیر کا سننا اور بجانا بھی اسی پر قیاس کرتے ہوئے مباح ہوگا۔

(۹) امام غزالی نے بھی سماع مزامیر کو مباح لکھا ہے اور سماع مزامیر کو خوش نوا مترنم پرندوں کی آوازوں کے سماع کی حلت پر قیاس کیا ہے۔

(۱۰) اہل شوق صوفیہ نے بھی سماع مزامیر کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ یہ مزامیر اصلا مباح ہیں ان کی حرمت مشروط ہے مے نوشی اور یاد مے نوشی کے ساتھ، جس کا تصور ان ارباب حق کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے نہیں سنا ہے کہ وہ مجذوب یا مجنون تھے اور انھوں نے غیر شعوری طور پر ایک حرام کام کا ارتکاب کر لیا، جیسا کہ بعض حضرات ایسی عبارتوں سے ایسے معانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱۱) علامہ زرادی کے مشائخ نے سرے سے مزامیر سنے ہی نہیں۔ انھوں نے صرف کمالات الٰہی کی خبر دینے والے اشعار سنے ہیں۔

نمبر ایک سے دس تک نکات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ علامہ فخر الدین زرادی کے نزدیک مزامیر مطلق حلال ومباح ہیں، اور اس کی حرمت مقید ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اہل شوق صوفیہ مزامیر کے ساتھ سماع سنتے تھے، جن کو جواز فراہم کرنے کے لیے کتاب لکھی گئی ہے۔

آخری نکتہ اور آخری سطور (۱) سے اور بطور خاص ان میں مذکور لفظ **مجرد صوت القوال** (صرف قوال کی آواز) سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ علامہ فخر الدین زرادی کے مشائخ (غالباً خواجہ نظام الدین اولیا اور ان کے اوپر کے شیوخ چشت) کا سماع مزامیر سے خالی تھا۔

لیکن یہاں ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مزامیر علامہ زرادی کے نزدیک اصلاً مباح ہیں، جس کو اس پوری فصل میں ثابت کیا ہے، تو پھر آخر میں اس کو تہمت کیوں کہا؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تہمت صرف مختلف فیہ مسائل میں احتیاط پر عمل کرنے کے مقابل میں کہا گیا ہے نہ کہ حلت کے مقابل میں۔ اس وضاحت سے ان لوگوں کا رد ہو جاتا ہے جو علامہ زرادی کی پوری کتاب سے اس ایک جملے کو لیتے ہیں اور پھر اس میں مذکور لفظ ''تہمت'' سے ''حرمت'' کا معنی کشید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

علامہ زرادی نے یہ رسالہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے حکم سے لکھا ہے۔ ایسے میں اس کتاب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کے نزدیک مزامیر اصلاً مباح ہیں، ان کی حرمت یا دشراب (وسیع مفہوم میں لہو) کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اسی طرح اس کتاب کی روشنی میں غالب گمان یہ بھی نکلتا ہے کہ سلطان المشائخ نے کبھی مزامیر نہیں سنے۔ کشف القناع کی پانچویں فصل اباحت سماع سے متعلق ہے۔ اس میں علامہ زرادی نے لکھا ہے کہ تالی بجانا بھی بعض علما کے نزدیک مستحسن ہے۔ نیز انھوں نے اس قول کی تردید نہیں کی ہے بلکہ مزید اس پر اس کی دلیل پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے سبب سامعین کے قلوب میں فرحت ومستی پیدا ہوتی ہے اور تواجد ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ بھی گویا دف بجانے پر محمول کیا جائے گا جس میں طرب وکیف پیدا کرنے کی صفت ہے، بلکہ بعض روایات سے ثابت ہے کہ ایک اعرابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور شعر پڑھتے ہوئے تالی بجائی تھی، جس کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب بھی وجد میں آگئے تھے۔ کشف القناع کی چھٹی فصل اباحت سماع کی شرائط سے متعلق ہے، اس فصل کا حاصل نکات ذیل میں محصور کیا جا سکتا ہے۔

(۱) فقہا اور محدثین کا اجماع ہے کہ سماع فی نفسہ حلال ہے۔

(۲) فقہا اور محدثین کا اجماع ہے کہ سماع اسی وقت حرام ہے جب اس کے اندر لہو پایا جائے۔

---

(۱) أما سماع مشایخنا رضی اللہ تعالیٰ عنھم فبری عن ھذہ التھمة فھو مجرد صوت القوال مع الاشعار المشعرة من کمال صنعة اللہ تعالیٰ

(۳) اختلاف کی بنیاد صرف ایک چیز ہے، لہو کا تحقق، لہٰذا ایسا ہوسکتا ہے کہ بعض صورتوں میں کسی کو لہو نظر آئے تو وہ سماع کو حرام کہے اور انہی صورتوں میں دوسرے کو لہو نظر نہ آئے تو وہ اسے مباح سمجھے۔

(۴) سماع کی حرمت کی بنیاد مزامیر نہیں ہیں۔ کیوں کہ اس سے پہلے علامہ زرادی بیان کر گئے ہیں کہ مزامیر کے لیے لہو لازمی وصف نہیں ہے۔اسی لیے جب لہو یعنی شراب کی یاد نہ ہو تو ان کے نزدیک مزامیر مباح ہیں، بلکہ صفائی قلب سے سنا جائے تو ترقی روح کا ذریعہ ہیں۔

(۵) خواجہ نظام الدین اولیا نے سماع کی چار شرطیں بیان کی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ آلۂ سماع میں مزامیر نہ ہوں۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سماع کے لیے وہ جن چار چیزوں کو ضروری سمجھتے ہیں، ان میں سے ایک آلۂ سماع بھی ہے۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ یہ آلہ، مزامیر کے قبیل سے نہ ہو۔ گویا حضرت سلطان المشائخ کے نزدیک سماع کے لیے آلۂ سماع بھی ضروری ہے اور سماع کا مزامیر سے پاک ہونا بھی ضروری ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے نزدیک ہر آلۂ سماع مزامیر نہیں ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ کون سا آلۂ سماع ہے جو از قبیلِ مزامیر ہے؟ تو اس کا جواب فاضل بریلوی کی اس مشہور عبارت (۱) سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے آلاتِ لہو بروجہِ لہو پر مزامیر کا اطلاق کیا ہے اور ان کو حرام بتایا ہے۔ ظاہر ہے اس معنی کے اعتبار سے مزامیر بالاتفاق حرام ہیں، جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

بالفرض یہاں مزامیر سے مطلق آلۂ سماع مراد ہو تو قابل غور ہے کہ سلطان المشائخ نے مذکورہ بالا شرائط متفق علیہ سماع کی بیان کی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مذکورہ تین شرطوں کے ساتھ اگر آلات سماع بھی نہ ہوں تو سماع اتفاقی طور پر سب کے نزدیک مباح ہے۔ مذکورہ شرائط سے یہ معنی نکالنا کہ اگر سماع میں مزامیر ہوں تو یہ سماع خواجہ نظام الدین اولیا کے نزدیک حرام ہو جائے گا، سیاق وسباق کو قتل کرنے کے مترادف ہے۔

(ب) فوائد الفواد مزامیر کے حوالے سے خواجہ نظام الدین اولیا کے موقف و معمول کو سمجھنے کے لیے دوسرا سب سے بڑا ماخذ ہے، جسے آپ کے ایک ممتاز مرید اور اس عہد کے عظیم ادیب و شاعر حسن علی سجزی نے مرتب کیا ہے۔ اب ہم اسے دیکھتے ہیں:

فوائد الفواد کی تیسری جلد کی پانچویں مجلس مؤرخہ ۲۲؍صفر المظفر ۷۱۳ھ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیا کے اصحاب مزامیر کے ساتھ سماع سنتے تھے، جس سے حضرت نے منع فرمایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے پاس اس کی شکایت پہنچی کہ فلاں مقام پر آپ کے اصحاب کی مجلس جمی تھی اور وہاں مزامیر بھی تھے۔ اس کے جواب میں حضرت نے فرمایا: ’’میں نے منع کیا ہے کہ مزامیر اور محرمات درمیان میں نہیں ہونا چاہیے، انہوں

(۱) مزامیر یعنی آلات لہو ولعب بروجہ لہو ولعب بلاشبہہ حرام ہیں۔ (فتاویٰ رضویہ، ج: ۲۴، مسئلہ: ۲)

نے جو کچھ کیا ہے اچھا نہیں کیا ہے''۔اس مجلس میں مزامیر کے خلاف حضرت نے بہت سی باتیں کیں، یہاں تک کہ کہا نماز میں امام کو جب لقمہ دینا ہو تو عورت کو چاہیے کہ تالی نہ بجائے بلکہ ہاتھ پر ہاتھ مارے، کیوں کہ یہ لہو ہے۔ اس لیے جب ایسی باتوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو سماع میں مزامیر سے منع بطریق اولیٰ ہوگا۔

مزید اس کے بعد فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی مقام سے گرے تو شرع میں آپڑے اور اگر شرع سے بھی گر جائے تو اب کیا کرے؟ خواجہ کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ آپ مزامیر کو ناجائز و نامشروع اور خلاف شرع سمجھتے تھے، لیکن نامشروع اور حرام میں جو فرق ہے، وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

یہاں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ مزامیر کے خلاف آپ کا موقف مجمل ہو، جس کی تفصیل آپ کے حکم سے علامہ زرادی نے کشف القناع میں کی ہو۔

یہاں ایک احتمال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ جیسا کہ کشف القناع سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان المشائخ نے وہ سماع جو بالاتفاق مباح ہے، اس کی شرطوں میں عدم مزامیر کی شرط بھی لگائی ہے، اس لیے آپ علی الاقل مجلس سماع میں مزامیر کی موجودگی کو خلاف اولیٰ اور باعث اختلاف ونزاع سمجھتے رہے ہوں اور اس اختلاف اور نزاع سے بچنے کے لیے آپ نے سماع مزامیر سے اپنے احباب کو منع کر دیا تھا۔اس منع برائے حکمت کی تائید بھی اسی مجلس پنجم سے ہوتی ہے جس کی ابتدائی سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں خواجہ نظام الدین اولیا کی مخالفت شہر دہلی میں بہت بڑھ گئی تھی، یہاں تک کہ برسرمنبر آپ پر تبرابازی شروع ہوگئی تھی۔ان تمام حالات کے پیش نظر حضرت خواجہ کا سماع مزامیر سے اپنے احباب کو منع کرنا قرین حکمت ومصلحت معلوم ہوتا ہے۔ایسے میں اگر وہ سماع سے منع کرتے ہیں یا نامشروع کہتے ہیں تو یہ حکم اصلی نہیں، عارضی اور وقتی ہوگا۔مزید یہ کہ دفع فتنہ اور قصداحتیاط کے پیش نظر کبھی کبھی خلاف اولیٰ اور مختلف فیہ چیزوں کا ترک کرنا بھی واجب ہوجاتا ہے۔لیکن اس سے اصل حکم نہیں بدل جاتا۔

یہ تو صرف ایک مجلس کی عبارت کی شرح وفہم تھی اس طرح مولانا ذیشان مصباحی نے کئی دوسرے مجالس کا ذکر کیا ہے جس میں سماع پر کلام کیا گیا ہے، اور اس کے مالہ وماعلیہ کو شرح وبسط سے بیان کیا ہے۔ان تمام بحثوں کا حاصل یہ ہے کہ فوائد الفواد سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت سلطان المشائخ مزامیر کو مطلقا حرام سمجھتے تھے، ہاں! یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے احباب کو اس سے منع کرتے تھے اور اسے سخت ناپسند کرتے تھے۔خاص طور پر سماع مزامیر کے حوالے سے یہ جملہ کہ آدمی شریعت سے نکل جائے تو پھر کہاں جائے؟ یہی باور کراتا ہے کہ مزامیر آپ کے نزدیک ناپسند وناروا تھے، لیکن مطلقاً حرام ہونے کی بات کہیں ثابت نہیں ہوتی، خصوصاً حرام قطعی ہونے کی بات، بلکہ فوائد الفواد کے دوسرے حوالے اس کی نفی کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر مذکور ہوئے۔ بلکہ فوائد الفواد اور کشف القناع کو ملا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت کے نزدیک سماع مزامیر اصلاً مباح، مفاسد لہو کی صورت میں حرام اور معاصر فتنوں سے بچنے کے لیے ممنوع وناروا ہے۔

(ج) سیر الاولیاء یعنی خواجہ نظام الدین اولیا کے احوال و مواقف کے حوالے سے تیسرے ماخذ کی بات کریں تو فوائد الفواد کے مذکورہ بالا حوالہ جات مختلف مقامات پر اس میں بھی موجود ہیں۔ مزید برآں ص: ۵۰۴ پر ضرب قوال پر رقص کا ذکر ہے۔ ص: ۵۱۱ پر خواجہ نظام الدین اولیا کو بادشاہ عشق اور واضع علم موسیقی کہا گیا ہے اور آپ کے سبب سرود و موسیقی کے عروج کی بات کہی گئی ہے۔ مختلف مقامات پر آپ کے مختلف اصحاب اور قوالوں کو ماہر فن موسیقی کہا گیا ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں بھی ایسی نہیں ہیں جن سے مزامیر کی حلت یا حرمت کے حوالے سے خواجہ کا موقف صراحت و وضاحت کے ساتھ متعین ہو سکے۔ ہاں! اس کتاب میں ایسے واقعات ضرور ہیں جن سے اس خیال کو تقویت فراہم ہوتی ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیا سماع بالمزامیر کو مطلقاً حرام و ممنوع نہیں سمجھتے تھے، کیوں کہ سماع بالمزامیر کرنے والے کے ساتھ ان کے اچھے مراسم تھے اور ان کے ساتھ سماع اور غالباً سماع مزامیر بھی کرتے تھے، (مضمون میں جس کا تفصیلی ذکر تاریخی حوالوں کے ساتھ مولانا ذیشان نے کیا ہے۔) البتہ چوں کہ مزامیر علما کے ایک طبقے کے نزدیک حرام ہے اور علما نے شیخ کے سماع کے خلاف دہلی میں مہم تیز کر دی تھی، ایسے حالات میں آپ نے اپنے احباب و متوسلین کو مزامیر ترک کرنے کا حکم دے دیا، تا کہ فتنہ فرو ہو جائے، اور ایک طبقہ علما جو اسے حرام کہتا ہے، عمل میں اس کی بھی موافقت ہو جائے اور رفع اختلاف پر عمل کر کے استحباب کا ثواب حاصل کیا جا سکے۔

سیر الاولیاء (۵۳۲-۵۲۵) میں اس محضر کا بھی اجمالی ذکر ہے جو غیاث الدین تغلق (عہد حکومت: ۱۲۷-۵۲۵) کے دربار میں قائم ہوا تھا، جس میں علمائے شہر نے مسئلہ سماع پر خواجہ نظام الدین اولیا سے طویل مناظرہ کیا تھا۔ سیر الاولیاء کے مطابق سلطان المشائخ اور علمائے دہلی کے بیچ یہ بحث گرم تھی کہ اسی دوران نبیرۂ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی مولانا علم الدین سہروردی تشریف لے آئے۔ بادشاہ نے ان کا استقبال کیا اور اس بابت ان سے دریافت کیا کہ آپ نے بغداد و شام اور روم کی سیاحت کی ہے۔ ان ممالک میں مشائخ سماع سنتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر سنتے ہیں تو اس کام سے انہیں کوئی روکتا ہے یا نہیں؟ مولانا علم الدین نے جواب دیا:

> ''**تمام ممالک میں مشائخ وا کابر سماع سنتے ہیں اور بعض دف اور شبانہ [شبابہ/ بانسری] کے ساتھ سنتے ہیں** اور کوئی شخص انہیں سماع سے نہیں روکتا۔ سماع، مشائخ کے یہاں جنید و شبلی سے متوارث ہے۔ بادشاہ شیخ علم الدین کی یہ بات سن کر خاموش ہو گیا اور کچھ نہیں بولا۔ (ص: ۵۳۰)

مزید یہ کہ سیر الاولیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علم الدین کے جواب میں جب بادشاہ خاموش ہو گیا تو اس وقت مولانا جلال الدین کھڑے ہوئے اور انہوں نے باشاہ سے گزارش کی **بادشاہ سلامت اس سلسلے میں مذہب امام اعظم کا خیال رکھیں اور سماع کی حرمت پر فیصلہ صادر کریں۔** اس پر حضرت سلطان المشائخ نے بادشاہ سے کہا کہ ہماری گزارش ہے کہ اس مسئلے میں آپ اپنی طرف سے کوئی فیصلہ صادر نہ کریں اور بادشاہ نے سلطان المشائخ کی گزارش قبول کرتے ہوئے کوئی حکم صادر نہیں فرمایا۔

یہاں امیر خورد نے ایک دوسری ضعیف روایت یہ نقل کی ہے کہ بادشاہ نے حضرت سلطان المشائخ کو سماع کی اجازت دے دی اور قلندریوں، حیدریوں اور خواہشات کے لیے سماع سننے والوں کے حق میں منع کر دیا۔

امیر خورد نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ سلطان المشائخ نے اس محضر میں فرمایا تھا کہ **"دف اور شبانہ کے ساتھ امام شافعی کے نزدیک سماع مباح ہے، برخلاف ہمارے علمائے احناف کے، لیکن اب ہوگا وہی جو بادشاہ کا فیصلہ ہوگا۔"** (۱) اس کے بعد مکمل عزت وتکریم کے ساتھ بادشاہ نے سلطان المشائخ کو رخصت کر دیا۔

سلطان المشائخ کی یہ بات واضح طور پر یہ بتاتی ہے کہ آپ سماع بالمزامیر کے حق میں دلیلیں دے رہے تھے اور بادشاہ کو سماع بالمزامیر کے خلاف کوئی بھی امتناعی حکم صادر کرنے سے روکنا چاہتے تھے۔

امیر خورد کرمانی نے اس مقام پر ضیاء الدین برنی کے حیرت نامہ سے نقل کیا ہے کہ جب سلطان المشائخ محضر سے واپس آئے تو بار بار علما کے حسد اور خصوصاً حدیث رسول ﷺ کے تعلق سے ان کے رویے کا شکوہ کرتے رہے۔ آپ نے امیر خسرو اور مولانا محی الدین کاشانی سے کہا:

میں جو بھی حدیث پیش کرتا تو وہ کہتے کہ یہ امام شافعی کا مستدل ہے، اس شہر میں مذہب امام اعظم پر عمل ہے، آپ قول امام پیش کریں۔ خدا جانے یہ کیسا زمانہ آ گیا۔ جس شہر میں اس قسم کے مکابرے کیے جاتے ہوں، وہ کیسے آباد رہ سکتا ہے؟ عجب نہیں کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔ (سیر الاولیاء، باب نہم، دیکھیں دربار دہلی میں محضر کی تفصیلات)

اب ایک بار تمام نمایاں جملوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر پڑھیں تو صاف ہو جاتا ہے کہ یہ محضر سماع بالمزامیر کے تعلق سے تھا، جو ان تفصیلات کی روشنی میں شوافع کے نزدیک جائز اور احناف کے نزدیک ناجائز ہے۔ علمائے دہلی چاہتے تھے کہ اس مسئلے میں بھی فقہ حنفی کے مطابق فیصلہ ہو، جب کہ سلطان المشائخ احادیث کی روشنی میں اس کی حلت کے قائل تھے اور اس مسئلے میں مذہب حنفی کے اتباع کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

---

(۱) فوائد الفواد، جلد پنجم، مجلس ۵، ۲۸ بتاریخ شوال ۷۱۹ھ میں بھی بادشاہ کے دربار میں مناظرہ کے سیاق کے بغیر یہ لکھا ہے: "حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ شاید کہ اب حکم ہو گیا ہے کہ مخدوم جب چاہیں سماع سنیں، ان کے لیے حلال ہے، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا کہ جو چیز حرام ہے، کسی کے حکم سے حلال نہیں ہو سکتی، اور اگر ایسے مسئلے پر آئیں جس کے بارے میں اختلاف ہو، جیسے کہ یہی سماع کا فتوی ہے تو امام شافعی ہمارے علما کے برخلاف دف و چغانہ کے ساتھ مباح رکھتے ہیں، اب اس مسئلے میں حاکم جس رائے کے مطابق حکم دے گا وہی ہوگا۔" اس مجلس میں غیاث الدین کے محضر کا ذکر نہیں ہے لیکن ممکن ہے کہ حاکم سے بادشاہ کی طرف اشارہ ہو یا صوفیہ کے نزدیک شیخ اپنے مریدین کے لیے حاکم ہوا کرتا ہے اس کی طرف اشارہ ہو۔ سلطان جی نے فتنہ یا حاکم کی وجہ سے اپنے مریدین کو سماع مزامیر سے منع کر دیا ہے کیوں کہ اسی مجلس میں ہے: "بندے نے دوبارہ عرض کیا کہ اگر علما اس باب میں بحث کریں اور سماع کی ممانعت میں کچھ کہیں تو ٹھیک لگے لیکن جو شخص فقیری لباس میں ہو وہ کس طرح منع کرتا ہے اور اگر اس کے نزدیک بھی حرام ہے تو بس اتنا کریں کہ خود نہ سنے لیکن دوسروں سے تو نہ لڑے اور نہ یہ کہے کہ نہ سنو! کیوں کہ جھگڑنا درویشوں کی صفت نہیں۔" اور اخیر مجلس میں ہے: "بندہ نے پھر عرض کیا کہ بندہ اس گروہ کو جو سماع کا منکر ہے خوب جانتا ہے اور ان کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو سماع نہیں سنتے اور کہتے ہیں کہ ہم اس وجہ سے نہیں سنتے ہیں کہ حرام ہیں بندہ قسم تو نہیں کھاتا لیکن سچ عرض کرتا ہے کہ سماع ان کے نزدیک حلال ہوتا تو بھی یہ لوگ نہ سنتے۔ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر مسکرائے اور فرمایا: ہاں! جب ان میں ذوق ہی نہیں تو کیسے سنتے اور کس برتے پر سنتے، واللہ اعلم۔" ان عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ ممانعت فتنہ کی وجہ سے تھی۔

یہی وہ پس منظر ہے کہ جب اس محضر کے بعد علامہ زرادی نے کشف القناع لکھی تو اس کے مقدمے میں لکھا کہ صوفیہ پر فقہا کا قول حجت نہیں اور فصل ششم میں لکھا کہ ہمارے شیخ حضرت نظام الدین اولیا مقام اجتہاد پر فائز ہیں۔

اس کے علاوہ مولانا ذیشان نے اس محضر کی مکمل تفصیل دوسرے ماخذ سے پیش کرکے ان کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ مناظرہ مزامیر ہی کے تعلق سے تھا، نہ کہ مطلق سماع کے تعلق سے۔ کیوں کہ مطلق سماع کو شاید ہی کوئی حرام کہتا ہو۔

المختصر! حضرت سلطان المشائخ کے اقوال واعمال اور افکار واحوال کے تعلق سے جملہ مواد کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

۱۔ راجح یہ ہے کہ مزامیر کے تعلق سے حضرت کا موقف اصلاً جواز کا ہے، اگر چہ بعض روایات عدم جواز کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔

۲۔ راجح یہ ہے کہ دف کے سوا دیگر مزامیر کے تعلق سے حضرت کا عمل عدم سماع کا ہے، اگر چہ بعض روایات سماع مزامیر کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔

سلطان المشائخ کے یہاں سجدہ تعظیمی

اکثر محققین موضوعیت کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اپنے ذاتی احساسات وخیالات اور افکار ونظریات کو قارئین پر تھوپنے کی مکمل کوشش کرتے ہیں، وہ واقعیت ومعروضیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اکثر جگہ مل جائیں گے، بلکہ ہر جگہ ایسے لوگوں کا ہی قبضہ ہے۔ تحقیق وافتا کے میدان میں خاص طور سے انصاف اور اعتدال بہت ضروری ہے۔ صرف حق دیکھنے کے لیے ہی نہیں بلکہ حق کی نشر واشاعت اور دعوت وتبلیغ میں بھی اسی منہج کو اپنانا لازم ہے۔

شاخ پر بیٹھ کے جڑ کاٹنے کی فکر میں ہے
کہیں نیچا نہ دکھائے تجھے شجرا تیرا

خیال رہے کہ برصغیر ہندو پاک کے متاخرین علما کا شجرۂ طریقت شاید ہی مشائخ چشتیہ سے خالی ہوگا، کیوں کہ آٹھویں اور نویں صدی ہجری کے بعد شاید ہی کوئی خانقاہ یا شیخ ہو جس کے پاس صرف قادریہ یا صرف سہروردیہ شجرہ آیا ہو۔ عموماً مشائخ کے یہاں اصالۃً کئی کئی سلسلوں کی اجازت وخلافت ہوتی ہے اور وہ ہر سلسلے کے کچھ نہ کچھ اوراد ووظائف اور رسومات پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ بعض حضرات تو کثرت سلاسل کی اجازت وخلافت پر مباہات و فخر بھی کرتے ہیں۔ ہاں! یہ اور بات ہے کہ شیخ پر یا اس کی خانقاہ پر کسی ایک ہی سلسلے کا رنگ غالب ہوتا ہے، خانقاہ کے متعلقین اور مریدین پر اپنے شیخ کی تحکیم لازم ہوتی ہے لیکن تمام مشائخ کی تعظیم ضروری ہے۔ یہاں بھی منسوخ ناسخ ہو جاتا ہے، مفتی بہ غیر مفتی بہ ہو جاتا ہے۔ (یعنی کسی خانقاہ یا کسی شیخ پر کبھی کوئی رنگ غالب رہتا ہے، پھر کبھی دوسرا رنگ چڑھ جاتا ہے۔) ایسے میں سماع مزامیر اور سجدۂ تعظیمی کے سلسلے میں بعض علمائے متاخرین کا اسلوب

بیان، طرز تخاطب اور مد مقابل کے خلاف ہنگامہ آرائی اور فتوی بازی قطعی روا نہیں، کیوں کہ مجتہدین مشائخ صوفیہ کی ایک جماعت نے سماع مزامیر اور سجدۂ تعظیمی کے جواز کا قول ہی نہیں کیا بلکہ وہ اور ان کے متبعین کا ان پر عمل بھی رہا ہے، ایسے میں کفر وضلالت تو دور کی بات ہے فسق بھی ثابت نہیں ہوتا۔

فاضل بریلوی کے خلف اصغر مفتی اعظم مولانا مصطفی رضا خاں نے اپنے فتاوی میں لکھا ہے:

''قوالی مع مزامیر ہمارے نزدیک ضرور حرام وناجائز وگناہ ہے، سجدہ تعظیمی بھی ایسا ہی۔ ان دونوں مسئلوں میں بعض صاحبوں نے اختلاف کیا ہے اگرچہ وہ لائق التفات نہیں، مگر اس نے ان مبتلاؤں کو حکم فسق سے بچا دیا ہے، جو ان مخالفین کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے جائز سمجھ کر مرتکب ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان پر اب شرعاً دہرا الزام ہے ایک ارتکاب گناہ کا، دوسرا اسے جائز سمجھنے خلاف قول صحیح جمہور چلنے کا، واللہ تعالیٰ اعلم۔'' (ص: ۴۵۶)

مفتی اعظم ہند کے اس اقتباس سے واضح ہو گیا ہے کہ نہ سماع مزامیر سننے والے فاسق ہیں اور نہ سجدۂ تعظیمی کے قائلین؛ کیوں کہ یہ لوگ بعض مجتہد صوفیہ کے مسلک پر قائم ہیں، اگرچہ یہ مسلک نادر اور خلاف جمہور ہے۔

واضح رہے کہ مفتی اعظم کے اس اقتباس پر بعض تنقیحات بھی ہیں اور بعض طالب علمانہ معروضات بھی لیکن فی الحال ہم اسے ترک کرتے ہیں، بعد میں آنے والی بحث خود بخود اسے واضح کر دے گی۔

آمدم برسر مطلب! سلطان المشائخ کے یہاں لوگ آتے تھے، اور چوکھٹ پر ہی اپنا سر رکھ دیتے تھے آپ نے انھیں منع نہیں کیا، بلکہ اعتراض کرنے پر آپ نے اس کا جواز دلیلوں کی روشنی میں ثابت کیا، تفصیل کے ساتھ جامع تعلیمات وملفوظات خواجہ امیر حسن علا سجزی کی روایت سے سلطان جی کا بیان کردہ قصہ ملاحظہ فرمائیں:

''فرماتے ہیں: مخلوق میری بارگاہ میں آتی ہے اور سر زمین پر رکھتی ہے۔ شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز اور شیخ قطب الدین قدس اللہ سرہ العزیز منع نہیں کرتے تھے، اسی لیے میں بھی منع نہیں کرتا۔ اس درمیان بندے نے عرض کی: جو شخص آپ کی بارگاہ میں آتا ہے اور سر زمین پر رکھتا ہے، اسے کچھ حاصل ہوتا ہے اور نفس شکنی ہوتی ہے۔ مخدوم تو خدائے بزرگ وبرتر کی جانب سے بنائے گئے ہیں۔ ان کی بزرگی مرید کی وجہ سے نہیں ہے۔.....

.....اس کے بعد خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے اس باب میں ایک حکایت بیان فرمائی کہ گزشتہ دنوں سیاحت کیے ہوئے اور شام وروم کی سیر کیے ہوئے ایک بزرگ آئے۔ وہ آ کر بیٹھے ہی تھے کہ اسی درمیان وحید الدین قریشی بھی آ گئے۔ خدمت گاروں کی مانند خدمت بجا لائے اور سر زمین پر رکھا۔ اس بیٹھے ہوئے آدمی نے زور سے کہا: سجدے کی اجازت کہیں نہیں آئی ہے۔ وہ اس باب میں جھگڑنے لگے۔ میں جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ جب گفتگو زیادہ ہو گئی اور اس باب میں انھوں نے غلو

کیا، تو میں نے ان سے بس اتنا ہی کہا کہ سنو! زیادتی نہ کرو۔ فرض شدہ امر کی جب فرضیت ختم ہو جاتی ہے تو استحباب باقی رہتا ہے، جیسا کہ ایامِ بیض و عاشورہ کے روزے پہلی امتوں پر فرض تھے۔ عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں جب ماہِ رمضان کے روزے فرض ہوئے تو ایامِ بیض و عاشورہ کی فرضیت ختم ہو گئی، لیکن استحباب ابھی بھی باقی ہے۔ اب سجدے کے مسئلے پر آتا ہوں۔ سجدہ امم ماضیہ میں مستحب تھا، چناں چہ رعایا بادشاہ کو، شاگرد استاذ کو اور امت پیغمبر کو سجدہ کرتی تھی۔ جب آمدِ مصطفیٰ ہوئی تو یہ سجدہ ختم ہو گیا۔ اب اگر استحباب ختم ہو گیا تو اباحت تو باقی ہے۔ مستحب نہیں تو مباح ہی سہی۔ مباح ہونے پر نفی و منع کہاں آئی ہے؟ مجھے کوئی ایک ہی حوالہ بتا دو۔ محض انکار کیا ہوتا ہے؟ جب میں نے ان سے اتنا کہا تو وہ خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔'' (فوائد الفواد، ص: ۶۷۴، ۶۷۵، چوتھی جلد، ۳۰ویں مجلس)

سلطان جی کی روایت سے واضح ہوتا ہے کہ ولایت چشت غیر منقسم ہندوستان میں سجدۂ تعظیمی کا سلسلہ شروع ہی سے رائج تھا۔ قدوۃ الکبری مخدوم جہاں سلطان اشرف جہاں گیر قدس اللہ سرہ کے ملفوظ میں بڑی تفصیل سے گفتگو موجود ہے، آپ فرماتے ہیں:

''اکابر کے مزارات پر پیشانی رکھنے کے بارے میں علما نے بحث کی ہے اور اس کو باتفاق جائز قرار نہیں دیا ہے لیکن حضرات مشائخ کے نزدیک اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ اس فقیر (سلطان اشرف جہاں گیر) کے خیال میں جیسا کہ میں نے سفر و سیاحت کے دوران بہت سے اکابر کو دیکھا کہ وہ لوگ ظاہری زندگی میں جس کے ساتھ جس ادب و تعظیم کے ساتھ پیش آتے مرنے کے بعد بھی اسی ادب اور تعظیم کو اس کے قبر و مزار کے لیے روا رکھتے جیسے والد، استاذ، مرشد اور اس شخص کے ساتھ جس کی تعظیم کو واجب رکھتے۔ لیکن مشائخ کے سامنے زمین پر پیشانی رکھنے کو بعض مشائخ نے روا رکھا ہے اور جب کبھی ان کے کسی مرید نے فرط محبت و شفقت سے ان کے سامنے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیا تو انھوں نے مرید کو اس عمل سے منع کبھی نہیں کیا لیکن اکثر مشائخ نے اس سے اجتناب کیا ہے اور اپنے مریدوں کو اس سے منع فرمایا ہے کیوں کہ سابقہ امت کے لیے تحیۃ السجدۃ جائز تھا لیکن اس امت کے لیے منسوخ ہے۔

لیکن میرے مخدوم (مخدوم علاء الحق قدس سرہ) جب نمازِ جمعہ اور عیدین سے لوٹتے تو لوگوں کا ایک جمِ غفیر آپ کے قدمِ مبارک پر اپنا سر رکھتا، جو لوگ اپنا سر آپ کے پائے مبارک پر رکھنے سے محروم رہ جاتے، وہ زمین پر ہی سر رکھ دیتے اور سجدہ کرتے۔ ایک مولوی صاحب نے اس بارے میں استفسار کیا کہ زمین پر سر رکھنا تو شریعت کے خلاف ہے۔ فرماتے ہیں: میں نے اس سے بارہا منع کیا ہے، لیکن یہ لوگ باز ہی نہیں آتے۔ مختصر یہ کہ اس طرح آپ نے بہت سی انکساری کی باتیں کیں۔

طالبان صادق اور دوستان واثق جب شیخ کے آئینہ میں اس جمال حقیقی کا مشاہدہ کرتے اور شیخ کی صورت میں حقیقت کا معائنہ کرتے ہیں تو بے اختیار ہوکر سر زمین پر رکھ دیتے ہیں۔''

(لطائفِ اشرفی: لطیفہ ۱۷، حصہ دوم، ص:۲۹ فارسی)

قدوۃ الکبری کے کلام سے واضح ہوتا کہ جمہور علما اور اکثر صوفیہ سجدۂ تحیت کو ناجائز وحرام سمجھتے ہیں، عالم اسلام اور ہند و پاک کے بعض مشائخ اس کو جائز سمجھتے ہیں لیکن تواضع وانکساری کے سبب مریدین و متبعین کو ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں، بعض وہ بھی ہیں جو منع نہیں کرتے۔

قرآن میں سجدۃ التحیۃ کے دو قصے مذکور ہیں:

(۱) فرشتوں کو اللہ رب العزت نے آدم علیہ السلام کے لیے سجدۂ تحیۃ کا حکم دیا، آدم کے سامنے ابلیس کے علاوہ سب فرشتے سربسجود ہو گئے، اس نے تکبر میں انکار کیا اور ہمیشہ کے لیے مردود بارگاہ ہو گیا۔ اس قصے کو پانچ مقامات پر قرآن نے ذکر کیا ہے: البقرۃ: ۳۴۔ الاعراف: ۱۱۔ الاسراء: ۶۱۔ الکہف: ۵۱۔ طہ: ۱۱۶۔

(۲) یوسف علیہ السلام کو ان کے والد، والدہ اور گیارہ بھائیوں نے سجدہ کیا۔

وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا۔ (یوسف:۱۰۰)

والدین اور تمام بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، آپ نے فرمایا: ابا جان! یہ میرے خواب کی تعبیر ہے، میرے رب نے اسے سچ کر دکھایا۔

ان دونوں قصوں سے واضح ہو گیا کہ پہلے کی امت میں سجدۂ تحیت جائز و معمول تھا۔ قرآن میں اس حکم جواز کو اس امت محمدیہ کے حق میں غیر مشروع وحرام قرار نہیں دیا گیا ہے، لیکن حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے، چند روایت ملاحظہ فرمائیں:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي أَوْفَى، قَالَ: لَمَّا قَدِمَ مُعَاذٌ مِنَ الشَّامِ سَجَدَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: (مَا هَذَا يَا مُعَاذُ؟) قَالَ: أَتَيْتُ الشَّامَ فَوَافَقْتُهُمْ يَسْجُدُونَ لِأَسَاقِفَتِهِمْ وَبَطَارِقَتِهِمْ، فَوَدِدْتُ فِي نَفْسِي أَنْ نَفْعَلَ ذَلِكَ بِكَ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: (فَلَا تَفْعَلُوا، فَإِنِّي لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِغَيْرِ اللهِ، لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا، وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَا تُؤَدِّي الْمَرْأَةُ حَقَّ رَبِّهَا حَتَّى تُؤَدِّيَ حَقَّ زَوْجِهَا، وَلَوْ سَأَلَهَا نَفْسَهَا وَهِيَ عَلَى قَتَبٍ لَمْ تَمْنَعْهُ۔

عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ شام سے واپس آئے تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''معاذ! یہ کیا؟'' انھوں نے کہا: میں شام گیا تو میں نے وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پادریوں اور رہنماؤں کو سجدہ کر رہے تھے۔ مجھے یہ بات اچھی لگی کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ بھی یہ طریقہ اختیار کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم ایسا مت

کرنا، اگر میں کسی کو غیر اللہ کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد -صلی اللہ علیہ وسلم- کی جان ہے! عورت اپنے رب کا حق ادا نہیں کر سکتی جب تک کہ اپنے خاوند کا حق ادا نہیں کرتی۔ اگر وہ اونٹ کے کجاوے پر بیٹھی ہوئی ہو اور خاوند اس سے خواہش کا اظہار کرے تو وہ انکار نہیں کر سکتی۔ (١)

عَنْ قَيْسِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُ، قَالَ: "أَتَيْتُ الْحِيرَةَ فَرَأَيْتُهُمْ يَسْجُدُونَ لِمَرْزُبَانٍ لَهُمْ (وهو الفارس الشجاع المقدم على القوم عندهم) فَقُلْتُ: رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَقُّ أَنْ يُسْجَدَ لَهُ، فَأَتَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ: إِنِّي أَتَيْتُ الْحِيرَةَ فَرَأَيْتُهُمْ يَسْجُدُونَ لِمَرْزُبَانٍ لَهُمْ، فَأَنْتَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَقُّ أَنْ يُسْجَدَ لَكَ، فقَالَ: (لَا تَفْعَلُوا، لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ، لَأَمَرْتُ النِّسَاءَ أَنْ يَسْجُدْنَ لِأَزْوَاجِهِنَّ، لِمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَهُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ حَقٍّ)

قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں حیرہ [کوفہ کے قریب ایک جگہ کا نام] آیا، تو دیکھا کہ لوگ اپنے عسکری کمانڈر کو سجدہ کر رہے ہیں تو میں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ انھیں سجدہ کیا جائے، میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو میں نے آپ سے عرض کیا: ''میں حیرہ شہر گیا تو میں نے وہاں لوگوں کو اپنے عسکری کمانڈر کے لیے سجدہ ریز دیکھا؛ تو اے اللہ کے رسول! آپ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم ایسا نہ کرو، اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں، اس وجہ سے کہ شوہروں کا حق اللہ تعالی نے بہت بڑا مقرر کیا ہے۔ (٢)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: "أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسلم دخل حَائِطًا مِنْ حَوَائِطِ الْأَنْصَارِ، فَإِذَا فِيهِ جَمَلَانِ يَضْرِبَانِ وَيَرْعَدَانِ فَاقْتَرَبَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم مِنْهُمَا، فَوَضَعَا جِرَانَهُمَا بِالْأَرْضِ، فَقَالَ مَنْ مَعَهُ: سَجَدَ لَهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: (مَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ، وَلَوْ كَانَ أَحَدٌ يَنْبَغِي أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا لِمَا عَظَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهَا مِنْ حَقِّهِ)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی انصاری کے کسی باغ میں داخل ہوئے تو وہاں دو اونٹ لڑ رہے تھے اور کانپ رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قریب ہوئے تو ان دونوں نے

---

(١) سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حق الزوج علی المرأۃ (١٨٥٣)۔ سنن کبری بیہقی، کتاب القسم والنشور، باب ما جاء فی بیان حقہ علیہا (١٤٧١١) یہ روایت صحیح ہے۔

(٢) سنن ابوداود، کتاب النکاح، باب فی حق الزوج علی المرأۃ (٢١٤٠) مستدرک حاکم، کتاب النکاح (٢٧٦٣) اس روایت کو حاکم اور ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے۔

اپنی گردنیں زمین پر ٹکا دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود لوگ کہنے لگے: اونٹ آپ کو سجدہ کر رہے ہیں۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنا اچھی بات نہیں ہے، اگر میں کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں اس وجہ سے کہ شوہروں کا حق اللہ تعالی نے بہت بڑا مقرر کیا ہے۔'' (صحیح ابن حبان، باب معاشرۃ الزوجین (۴۱۶۲) حدیث صحیح ہے۔)

اس کے علاوہ بھی اس سلسلے میں متعدد روایتیں ہیں جو تواتر کی حد تک تو نہیں پہنچی ہیں لیکن شہرت وصحت کے اعلی مرتبے پر فائز ہیں۔ ان روایتوں کی بنیاد پر فقہائے صحابہ، ائمہ تابعین اور مجتہدین امت نے باتفاق ناجائز و حرام کہا ہے، میری اپنی معلومات کی حد تک اسلاف میں سے کسی نے اسے جائز نہیں کہا ہے۔

تبصرہ وتجزیہ

اب تک کی بحث کو مندرجہ ذیل نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

(۱) سجدۂ تحیت کا ثبوت قرآن میں ہے، قصے اگر چہ منسوخ نہیں ہوتے لیکن یہ اخبار ہیں تشریع نہیں، ان قصوں سے امت محمدیہ کے لیے کوئی حکم صریح ثابت نہیں ہوتا، ہاں یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ امت سابقہ میں سجدۂ تحیت جائز تھا، اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سجدۂ تحیت کبھی بھی شرک نہیں ہوگا، کیوں کہ شرک کے احکام کبھی متغیر نہیں ہوتے اور جب اللہ جل شانہ نے امت سابقہ میں سجدۂ تعظیمی کو جائز ہی نہیں بلکہ واجب بھی قرار دیا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ کبھی بھی شرک نہیں ہوسکتا، البتہ غیر اللہ کے لیے سجدۂ عبادت ہمیشہ سے شرک رہا ہے۔

(۲) سجدۂ تعظیمی کی حرمت احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے، کئی صحابہ نے الگ الگ مواقع پر آپ کے سامنے سجدہ کیا یا سجدہ کرنے کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہتے ہوئے منع فرما دیا کہ اگر میں اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورتوں کو ضرور حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کو تو سجدۂ عبادت کیا جاتا ہے پھر اس سجدہ کا حکم تو کسی اور کے لیے دیا ہی نہیں جا سکتا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مخلوق میں سے کسی کے لیے استثنا کیوں کیا؟ جب سجدۂ عبادت مخلوق میں سے کسی کے لیے کیا ہی نہیں جا سکتا تو استثنا کا کیا فائدہ؟

اس کا ایک جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ یہاں سجدہ سے مطلق سجدہ مراد ہے خواہ سجدۂ عبادت ہو یا سجدۂ تحیت، اللہ کے لیے جو سجدہ کیا جاتا ہے اس میں بندے کی طرف سے اعلی درجے کی تواضع وانکساری ہوتی ہے اور اللہ کے لیے اجلال وتعظیم کا اعلی پہلو بھی رہتا ہے کیوں کہ عبادت کا تصور اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا، ان احادیث میں مخلوق کے لیے تعظیم کی اس صورت کو حرام کر دیا گیا۔

دوسرا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ دونوں سجدوں کے درمیان شکل وصورت میں یکسانیت ہوتی ہے، یہاں شکل کے اعتبار سے استثنا کیا گیا ہے۔

(۳) علما میں سے کسی نے بھی سجدہ تحیت کے جواز کا قول نہیں کیا ہے، صرف بعض مشائخ صوفیہ کے یہاں اس کا عملی مشاہدہ کیا گیا ہے، آخر ان کی کیا دلیل ہے؟ کن بنیادوں پر انھوں نے جمہور کے مذہب سے اعراض کیا ہے؟

سلطان المشائخ نے جس دلیل کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ سجدہ تحیت کا استحباب اس امت میں ختم ہو گیا، لیکن جواز باقی ہے، اگر کوئی شخص جواز واباحت کا بھی منکر ہے تو اس کو دلیل دینا چاہیے۔

سلطان جی کے ان کلمات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے فقہا کے یہاں سجدۂ تحیت کا عدم جواز پایا اور اپنے مشائخ کے یہاں اس کے برخلاف معمول کا مشاہدہ کیا تو قرآن سے جواز پر تو دلیل پالی لیکن عدم جواز پر فقہا کی عبارت کے علاوہ کچھ نہ پایا تو کہہ دیا: ''مباح ہونے پر نفی ومنع کہاں آئی ہے؟ مجھے کوئی ایک ہی حوالہ بتا دو۔'' دلیل کے مطالبہ کا مطلب صاف ہے کہ ان کے پاس عدم جواز کی روایتیں نہ پہنچی ہوں گی، کیوں کہ اگر ان کے پاس روایات ہوتیں تو انکار نہ کرتے یا ان روایات کی تاویل ضرور کرتے۔

ممکن ہے کہ ان تک یہ روایتیں نہیں پہنچی ہوں، اس کا سبب یہ ہے کہ سماع کے باب میں آپ نے احادیث رسول کے برخلاف قول امام کو ترجیح دینے والوں پر اس طرح ناراضگی جتائی: ''خدا جانے یہ کیسا زمانہ آ گیا۔ جس شہر میں اس قسم کے مکابرے کیے جاتے ہوں، وہ کیسے آباد رہ سکتا ہے؟ عجب نہیں کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔'' اگر آپ کے پاس روایتیں ہوتیں تو مشائخ کے عمل پر احادیث کو ضرور ترجیح دیتے ورنہ ان کا یہ قول ان کے خلاف خود حجت ہو جاتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ آپ کے سامنے ان روایتوں کا کوئی دوسرا محمل رہا ہو لیکن دلیل کا مطالبہ یہی بتاتا ہے کہ یہ روایتیں نہیں پہنچی۔

یہاں اس بات کے امکان سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ آپ کے پاس ممانعت کی احادیث رہی ہو اور اس کی تاویل بھی آپ کے پاس ہو لیکن آپ نے یہاں پر بطور الزام سوال کیا ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ جس مسئلہ میں احادیث وروایات کا ذخیرہ موجود ہے اس میں مشائخ نے کن دلائل و اسباب کی بنیاد پر احادیث رسول پر عمل کو ترک کر دیا۔

اس کا جواب شاید فاضل بریلوی کے اس شعر میں تلاش کیا جا سکتا ہے:

نہ ہو آقا کو سجدہ آدم و یوسف کو سجدہ ہو
مگر سدِ ذرائع داب ہے اپنی شریعت کا

ممکن ہے کہ مشائخ نے ممانعت کی احادیث کو ابتدائے عہد پر محمول کیا ہو کیوں کہ لوگ ابھی ابھی شرک کی ظلمت سے باہر آئے تھے اس لیے ایسے تمام امور سے اجتناب کا حکم دیا گیا جو شرک کی علامت بنی ہوئی تھی جیسے زیارت قبور سے منع کیا گیا تھا، تمثال وتصاویر بنانے کو حرام کہا گیا، اس کے علاوہ بھی بہت سارے احکام جو

ابتداے عہد میں ناجائز وحرام تھے، ان میں بعض تو عہد رسالت ہی میں جائز ہو گئے اور بعض بعد کے زمانے میں فقہا وعلما نے جائز قرار دیا۔

خیال رہے شریعت اسلامیہ میں ایسے احکام بھی ہیں جو عہد رسالت میں جائز تھے لیکن بعد کے عہد میں سد ذرائع یا کسی اور مصلحت سے ناجائز ہو گئے؛ کیوں کہ جن مسائل کی اصل جواز واباحت ہو اسباب کی بنیاد پر اگر غیر مشروع ہو گئے ہوں، اسباب کے زائل ہوتے ہی مشروع ہو جائیں گے، اس کے برعکس بھی حکم بدل جاتا ہے، یعنی جو کسی سبب سے عہد رسالت میں ناجائز رہا ہو حالاں کہ اس کی اصل جائز تھی، سبب مضر کے زائل ہوتے ہی جائز وحلال ہو جائے گا۔ یہ ذہن نشیں رہے کہ سبب کے زوال یا عدم زوال کے تعلق سے فقہا کے اجتہاد میں ایک دوسرے سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔

حاصل بحث

(۱) سجود تحیت کی اصل مباح ہے، اس کی اباحت واستحباب پر قرآن میں مذکور قصے شاہد ہیں اور اس کی حرمت سد ذرائع کی وجہ سے ہے، ناجائز وحرام ہونے کی دلیل احادیث مشہورہ وصحیحہ سے ثابت ہے۔

(۲) بعض مشائخ صوفیہ جو فقہ باطن میں اجتہاد کے اعلی درجہ پر فائز تھے، انھوں نے اصل کے مدنظر اس کو جائز رکھا اور متعلقین ومحبین کو اس عمل سے نہیں روکا، شاید ان کے نزدیک سد ذرائع سے زیادہ اس بات کی اہمیت تھی کہ وہ انکساری وعاجزی جو ان کے باطن میں چھپی ہوئی ہے، ان کا مشائخ کی بارگاہ میں سرنگوں ہونا اس کی دلیل بن جائے یا اس ظاہری انکساری کی وجہ سے ان کا باطن صاف وشفاف ہو جائے، کبر ونخوت کی پراگندگی سے آزاد ہو جائے اور طہارت باطنی کی وجہ سے ان کے قلوب عرش اللہ اور تجلیات الٰہی کے نزول کے لائق، عرفان خداوندی کا مخزن ہو جائے۔

یہاں ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ عاشق صادق کا یہ سجدہ عام سجدۂ تعظیمی کی طرح ہے ہی نہیں یعنی یہ سجدہ مشائخ کی تعظیم وتکریم کے لیے ہے ہی نہیں بلکہ یہ اس نور حقیقی کے لیے سجدہ ہے جو ان میں متجلی ہے، مشائخ تو صرف قبلہ ہیں، مقصود ومطلوب تو وہی ہے۔

شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

رابطہ، تصور شیخ کے حوالے سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے جو بات لکھی ہے اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

بلکہ حضرت شیخ جلال الدین مولانا قاضی خاں یوسف ناصحی قدس سرہ یوں فرماتے ہیں کہ مرشد کی صورت کا ظاہری مشاہدہ آب وگل کے پردہ میں اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ ہے اور مرشد کی خلوت میں نمودار ہونے والی صورت یہ

اللہ تعالیٰ کا آب وگل کے پردہ کے بغیر مشاہدہ ہے ان اللہ تعالیٰ خلق آدم علی صورۃ الرحمن، اللہ تعالیٰ نے آدم کی صورت رحمن کی صفت پر پیدا کی من رانی فقد رای الحق جس نے مجھے دیکھا تو بیشک اس نے حق تعالی کو دیکھا، اس پر درست ثابت ہوگا۔ (انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ بیان طریقہ چشتیہ، از شاہ ولی اللہ، ص: ۹۲، ۹۳)

(۳) دوسری طرف جمہور مشائخ متقدمین اور ائمہ مجتہدین نے سجدۂ تحیت کو ناجائز وحرام کہا ہے، انھوں نے ظاہر حدیث پر عمل کرنے کو ترجیح دی، اتباع کے باب میں بلا چون و چرا، بلا قیل وقال قول رسول کے سامنے اپنے تفقہ کو چھوڑ دینا ہی کمال محبت اور کمال ادب سمجھا ہے، جہاں إذا صح الحدیث فهو مذهبی کا نعرہ ہو وہاں ممکن ہی نہیں ہے کہ مشہور اور صحیح روایات کے ہوتے ہوئے جواز کی راہیں ڈھونڈھتے پھریں، بلاضرورت شرعی تاویل کی راہیں تلاش کرنا کم ہمتی بلکہ منافقت وگمرہی کی علامت ہے۔ افقہ تو وہی ہے جو یار کے حکم پر سر تسلیم خم کر دے۔

پیشِ نظر وہ نو بہار سجدے کو دل ہے بے قرار
روکیے سر کو روکیے ہاں یہی امتحان ہے

(۴) فاضل بریلوی اعلی حضرت مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ نے مزارات اولیا کے چومنے سے متعلق ایک اچھی بات لکھی ہے، جس سے سجدۂ تحیت جیسے مسائل مختلفہ میں ترجیح وتطبیق کی راہ آسان ہوجاتی ہے، عبارت ملاحظہ کریں:

فی الواقع بوسہ قبر میں علما مختلف ہیں، اور تحقیق یہ ہے کہ وہ ایک امر ہے کہ دو چیزوں داعی ومانع کے درمیان دائر، داعی محبت ہے اور مانع ادب، تو جسے غلبہ محبت ہو اس پر مواخذہ نہیں کہ اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت ہے۔ اور عوام کے لیے منع ہی احوط ہے۔ (فتاوی رضویہ (مترجم) ج:۹، ص:۵۲۹، مسئلہ: ۱۶۳)

قراءت خلف الامام کا مسئلہ

سورۂ فاتحہ کی قراءت کے تعلق سے سب کا اتفاق ہے کہ اس کے بغیر نماز مکمل نہیں ہوتی، فرض نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں اور سنن ونوافل کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔ اختلاف صرف امام کے ساتھ نماز ادا کرنے والے مقتدی مدرک کے سلسلے میں ہے، اس کا سورۂ فاتحہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں، اگر پڑھے گا تو اس کا پڑھنا واجب ہے یا مستحب؟ اس سلسلے میں درج ذیل تین اہم مذاہب ہیں:

(۱) مکروہ تحریمی: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سری وجہری کسی بھی نماز میں قرأت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

(۲) وجوب: امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر علمائے کرام کی ایک جماعت کے نزدیک سورۂ فاتحہ کا ہر رکعت میں پڑھنا واجب ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں اکثر رکعتوں میں پڑھنا واجب ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ اور اکثر بصرہ کے فقہا کہتے ہیں کہ پوری نماز میں کسی ایک رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھ لینا واجب ہے، اس لیے کہ حدیث میں نماز کا ذکر مطلق ہے۔

(۳) استحباب: امام مالک کے نزدیک سری نمازوں میں مقتدی کے لیے قراءت مستحب ہے، جہری میں مکروہ ہے، ہاں اگر کوئی اختلاف سے بچنے کے لیے پڑھے تو جائز ہے۔ امام احمد ابن حنبل کے نزدیک بھی سری نمازوں میں مقتدی کے لیے قراءت مستحب ہے، جہری نماروں میں سکتات امام کے دوران یعنی جب امام فاتحہ کے بعد سکوت کرے تو بھی مستحب ہے لیکن دوران قراءت مکروہ ہے۔ فقہاے احناف میں امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ بھی احتیاطاً استحباب کے قائل ہیں جیسا کہ ہدایہ میں مذکور ہے:

ويستحسن على سبيل الاحتياط، فيما يروى عن محمد رحمه الله تعالىٰ۔ (هدایہ، باب صفة الصلاة، فصل في القراءة (۱/۵۶))

احتیاطاً مستحسن ہے کہ مقتدی بھی سورہ فاتحہ پڑھے، جیسا کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔

علامہ بدرالدین عینی اپنی شرح ہدایہ مسمیٰ بہ ''بنایہ'' میں فرماتے ہیں:

أي يستحسن قراءة المقتدي الفاتحة احتياطا و رفعا للخلاف فيما رَوَى بعضُ المشائخ عن محمد، وأطلق المصنِّفُ كلامَه ومراده في حالة المخافتة دون الجهر۔ اھ ملخصاً۔ (البناية في شرح الهداية، فصل في القراءة (۲/۳۱۹))

مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کی قرأت مستحسن ہے احتیاط اور تطبیق کے پیش نظر، جیسا کہ بعض مشائخ حنفیہ نے امام محمد سے روایت کیا ہے۔ صاحب ہدایہ نے مطلقاً قرأت کی بات کی ہے لیکن ان کی مراد سری نمازوں میں قرأت کرنا ہے، نہ کہ جہری میں۔

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ نے بھی امام محمد کے مذہب کو ہی اپنے لیے مفتی بہ قرار دیا ہے۔ آپ کے مرید صادق حضرت امیر خورد کرمانی نے اپنے معروف ومقبول اور مستند تذکرہ ''سیر الاولیاء'' میں اس حوالے سے آپ کے ارشاد کو نقل کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

''مقتدی را می باید کہ در ہر رکعتے فاتحہ بخواند وتسمیہ گوید، من نیز می خوانم۔ بریں حرف عرض داشت کردند کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمودہ است: **من قرأ خلف الامام ففي فيه الكِثكِث**؟ فرمود: اگر نظر دریں حدیث می کنیم، وعید لاحق می شود، و اگر نظر دریں می کنیم کہ پیغامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمودہ است: **لا صلاة لمن لم يقرء الفاتحة** عدم جواز صلوٰۃ می یابم۔ پس وعید را تحمل می باید کرد، فاتحہ می باید خواند، تا باجماع جواز صلوٰۃ باشد۔ **والأخذ بالأحوط والخروج من الخلاف أولىٰ۔**'' (سیر الاولیاء، باب ہفتم، ص: ۶۰۲، ۶۰۳)

مقتدی کو چاہیے کہ ہر رکعت میں بسم اللہ اور فاتحہ پڑھے۔ میں خود بھی پڑھتا ہوں۔ اس پر آپ سے عرض کیا گیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو امام کے پیچھے تلاوت کرے اس کے منہ میں خاک ہو۔ حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا: اگر اس حدیث کو دیکھتے ہیں تو وعید لاحق ہوتی ہے اور اگر ایک دوسری

حدیث میں غور کرتے ہیں جس میں ہے کہ ''جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز ہی نہ ہوئی۔'' تو اس سے قرأت خلف الامام کے بغیر نماز کی عدم صحت ثابت ہوتی ہے۔اس لیے وعید کو برداشت کرنا چاہیے اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرنی چاہیے، تاکہ اجماعاً نماز درست ہو۔ کیونکہ احتیاط پر عمل کرنا اور اختلاف سے بچنا مستحب ہے۔

سلطان المشائخ نے تو امام محمد کے مسلک کو ہدایہ کے ظاہر الفاظ کے مطابق ترجیح دی ہے یعنی سری و جہری دونوں نمازوں میں مقتدی پر فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔

اس کی تائید جہانیاں جہاں گشت مخدوم جلال الدین حسین (۷۸۵ھ) کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ مقتدی سری و جہری دونوں نمازوں میں قراءت کرے:

فرمود: برقول امام شافعی فاتحہ فریضہ است بر مقتدا و مقتدی، و برقول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فاتحہ با ضم سورۃ واجب است و تمسک بدیں حدیث میکند: لا صلاۃ لمن لم یقرء الفاتحۃ و ضم سورۃ معھا۔

دعا گو از جہت ایں امام را دعائے کہ مروی است در عوارف میان فاتحہ و سورۃ در جہریہ فرمودہ است و فاتحہ برقول امام شافعی فریضہ است مقتدی را نیز دعاء گو نیکو میخواند تا آنکہ امام دعاء خواند و ہم بریں جملہ روایت است از رسول اللہ علیہ السلام استماع و انصات ہم می شد۔ (جامع العلوم، ص: ۱۸۳)

مخدوم جہاں نے فرمایا کہ قراءت فاتحہ امام شافعی کے نزدیک مقتدی اور امام دونوں پر فرض ہے اور امام مالک کے نزدیک فاتحہ کے ساتھ سورت ملانا بھی فرض ہے۔ وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فاتحہ اور سورت کے ملائے بغیر نماز درست نہیں ہوتی۔

دعا گو (مخدوم جہاں) نے اپنے امام کو کہہ رکھا ہے کہ وہ جہری قراءت میں فاتحہ اور سورت کے درمیان وہ دعا پڑھا کرے جو عوارف میں مروی ہے، چوں کہ امام شافعی کے نزدیک فاتحہ مقتدی پر فرض ہے اس لیے یہ دعا گو بھی فاتحہ پڑھتا ہے، تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق استماع و انصات دونوں پر عمل ہو جائے۔

صاحب جامع المضمرات فی شرح مختصر الامام القدوری علامہ یوسف بن عمر بن یوسف کے شاگرد محمد فضل اللہ بن ایوب ماجوی صوفی نے اپنی مشہور تصنیف ''الفتاوی الصوفیہ'' میں لکھا ہے:

قال الجامع غفر الله له ولهذا يعلم أن الرواية عن محمد فى الصلاة كلها اعتباراً بخلاف الشافعي فى جميع الصلاة وهكذا أطلق فى التجنيس والمزيد أن قراءة المؤتم خلف الإمام لا يكره عند محمد وهكذا اطلق فى النظم الزندويسى حيث قال: وقال بعضهم: القراءة أفضل للمقتدى خلف الإمام على سبيل الاحتياط.

وأطلق في الهداية أيضا أنه يستحسن على سبيل الاحتياط في ما يروى عن محمد رحمه الله. (الفتاوی الصوفیۃ فی طریق البھائیۃ، الباب السابع، لوح: ۵۴(ب)

مولف کتاب- اللہ اس کی مغفرت فرمائے- نے کہا: امام محمد سے قراءت کے سلسلے میں جو روایت منقول ہے وہ تمام نمازوں میں ہے[خواہ سری ہو یا جہری ہو]؛ کیوں امام شافعی کا اختلاف دونوں نمازوں میں ہے اسی طرح التجنیس والمزید میں بھی مطلق ہے کہ امام محمد کے نزدیک مقتدی کا امام کے پیچھے قراءت مکروہ نہیں ہے، اسی طرح النظم الزندوسی میں بھی ہے کہ مقتدی کے لیے امام کے پیچھے قراءت احتیاطاً افضل ہے۔ ہدایہ میں بھی مطلق ہے کہ احتیاطاً مستحسن ہے کہ مقتدی بھی سورہ فاتحہ پڑھے، جیسا کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔

مخدوم شیخ سعد خیر آبادی (۹۲۲ھ) نے بھی مقتدی کے لیے قراءت خلف امام کو سری و جہری کی قید کے بغیر مطلقاً جائز لکھا ہے:

”اندر جواز صلوٰۃ بے قرأت فاتحہ، علما اختلاف دارند، صوفیہ فاتحہ ترک نہ دہند از بہر احتیاط۔“ (مجمع السلوک: ۱/ ۲۳۵) سورۂ فاتحہ کی قراءت کے بغیر نماز جائز ہونے کے سلسلے میں علما کا اختلاف ہے، اس مسئلے میں صوفیہ احتیاطاً سورۂ فاتحہ ترک نہیں کرتے۔

ان مشائخ کے علاوہ برصغیر کے دیگر کئی فقہاے احناف ہیں جنھوں نے احتیاطاً صرف سری نمازوں میں قراءت خلف امام کو مستحب مانا ہے، چند قابل ذکر اسمایہ ہیں:

بحر العلوم علامہ عبد العلی فرنگی محلی (۱۲۲۵ھ) رسائل الارکان میں فرماتے ہیں:

قال الإمام مالک: یُقرأ سورة الفاتحة في السرية، وإليه ذهب بعض مشايخنا أيضًا۔ (رسائل الارکان، ص: ۱۰۲)

امام مالک نے فرمایا ہے کہ سورہ فاتحہ سری نمازوں میں پڑھی جائے گی۔ اسی طرف ہمارے بعض مشائخ (احناف) بھی گئے ہیں۔

ایسے ہی معروف حنفی عالم علامہ احمد ابن ابو سعید امیٹھوی معروف بہ ملا جیون (۱۱۳۰ھ) اپنی مشہور و معروف تصنیف تفسیرات احمدیہ میں فرماتے ہیں:

فإن رأيت الطائفة الصوفية والمشايخين الحنفية، تراهم يستحسنون قراءة الفاتحة للمؤتم، كما استحسنه محمد۔ رحمه الله تعالىٰ۔ أيضًا احتياطا۔ (التفسیرات الاحمدیۃ، ص: ۴۰۱)

اگر تم صوفیہ کے گروہ اور بعض مشائخ حنفیہ کو دیکھو گے تو وہ مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کی قرأت احتیاطا مستحسن سمجھتے ہیں، جیسا کہ امام محمد نے اسے مستحسن سمجھا۔

مرشد گرامی حضور داعی اسلام جو رفع اختلاف کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں، آپ اس مسئلہ میں فرمایا کرتے ہیں کہ جہری نمازوں میں خاموش تلاوت قرآن سننا چاہیے اور سری نمازوں میں دل ہی دل میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرنا چاہیے جس کی وجہ سے صوفیہ کے مسلک احتیاط پر عمل بھی ہو جاتا ہے اور فقہ حنفی کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوتی ہے۔

کبھی فرمایا کرتے ہیں کہ یہ بھی تصور صفات ہے جب کہ مقصود عرفان ذات ہے۔

اس مقام پر میرے دل میں ایک بات یہ آتی ہے کہ رفع اختلاف کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ اختلاف بھی دیگر اختلافات کی طرح اشخاص واحوال کی بنیاد پر ہے۔ وہ مبتدی جو تلاوت کے وقت بھی قرآن کے سننے سے غافل رہتا ہے ایسے کو شافعی مسلک پر عمل کرنا چاہیے تا کہ کم سے کم اس کا دل قراءت فاتحہ میں لگا رہے اور جس کا دل سماع قرآن کے وقت حاضر رہتا ہے، اس کے لیے جہری نمازوں میں قراءت فاتحہ جائز نہیں، اسی طرح جس کا دل سری نمازوں میں خیال غیر میں لگ جاتا ہو اس کے لیے بھی لازم ہے کہ دل جمعی کی خاطر قرآن کا تصور کرے اور اگر اس سے بھی حاضر نہ ہو تو تلاوت کرے اور اگر کسی پر **کانک تراہ** کی کیفیت طاری ہو جائے اور تلاوت حجاب بنے تو محو دید رہے۔ مقصود سے نیچے نہ آئے لیکن کوشش کرے کہ عرفان ومشاہدہ کے ساتھ تلاوت بھی کرے۔ یہی افضل ہے اور یہی سنت ہے، ایسا ہی شخص مجذوب وسالک ہے۔

جا کسی درویش کامل کے حضور | خاک پہ رکھ دے جبینِ پُر غرور
پوچھ پھر اُس مردِ دانا سے یہ راز | کس طرح ہوتی ہے مستوں کی نماز
جس میں غیر اللہ کا خطرہ نہیں | جس میں اپنی ہستی کا پردہ نہیں
جس میں فاعل ہے تجلیِ خدا | بندہ کی صورت میں بے چون و چرا
جس میں بندہ آپ فانی ہوتا ہے | خود خداے پاک باقی ہوتا ہے

میت کی غائبانہ نماز جنازہ کے درست ہونے کا مسئلہ

جنازہ کی نماز فرض کفایہ ہے اور حق مسلم سے ہے۔ کسی مسلمان کو بلا جنازہ دفن کر دیا گیا تو جن جن لوگوں کو اس کی موت کی اطلاع تھی وہ سب گنہ گار ہوں گے۔

عہد ماضی میں دور دراز علاقوں میں کسی کی موت واقع ہو جائے تو اس کی فوری اطلاع کی کوئی صورت نہ تھی کہ فلاں مسلمان کا انتقال ہو گیا اور وہاں اس کی جنازہ نہیں ہوئی ہے، یہ صرف وحی کے ذریعہ ممکن تھا۔ اصحمہ نجاشی کی وفات دیار کفر میں ہوئی، جہاں ان کے جنازہ کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی وفات کی خبر دی اور صحابہ کے ساتھ ان کی جنازہ ادا کی۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جس دن حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی وفات ہوئی نبی صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَاتَ الیَوْمَ رَجُلٌ صَالِحٌ، فَقُومُوا فَصَلُّوا عَلَی أَخِیکُمْ أَصْحَمَةَ۔ (۱) آج ایک مرد صالح کی وفات ہوگئی ہے، آؤ، اپنے بھائی اصحمہ نجاشی کی جنازہ پڑھیں۔

یہ حدیث غائبانہ نماز جنازہ کی مشروعیت کے قائلین کی دلیل ہے، لیکن فقہاے احناف و مالکیہ غائبانہ نماز جنازہ سے منع کرتے ہیں (۲)، اور اس حدیث کا وہ یہ جواب دیتے ہیں:

یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں شامل ہے کہ انھیں دور دراز علاقے میں وفات پانے والے شخص کی خبر ہو اور یہ بھی اطلاع ہو کہ اس کی نماز جنازہ نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نجاشی کی نماز جنازہ ادا کی، کیوں کہ آپ نے اس کے علاوہ بھی کئی لوگوں کی موت یا شہادت کی خبر دی لیکن ان کی جنازہ مدینہ میں نہیں پڑھائی۔ اس کی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ ان کے ساتھ دوسرے مسلمان ہیں جو اس فرضیت کو ادا کریں گے۔ لیکن شوافع اور حنابلہ جو مشروعیت کے قائل ہیں (۳) اس دلیل کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خصوصیت نص سے ثابت ہوتی ہے، لیکن اس مسئلہ میں خصوصیت پر کوئی دلیل نہیں، اور اصل میں امت مسلمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا اور پیروی کرنے پر مامور ہے۔ غائبانہ نماز جنازہ کے قائلین حضرات میں یہ اختلاف ہے کہ: آیا ہر شخص کی غائبانہ نماز جنازہ ہوسکتی ہے یا نہیں؟ (۱)

شافعی اور حنبلی حضرات کہتے ہیں کہ: دور دراز علاقہ کے ہر شخص کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کرنا جائز ہے، چاہے جہاں اس کی موت ہوئی ہو، وہاں اگرچہ اس کی نماز جنازہ ادا کر لی گئی ہو۔ (۴)

حنفیہ میں بعض صوفیہ بھی اس طرف گئے ہیں انھیں میں حضرت بہاء الدین زکریا اور حضرت نظام الدین اولیا قدس اللہ سرہما ہیں، انھوں نے امام شافعی و امام احمد بن حنبل کے قول کو ترجیح دی۔ فوائد الفواد میں ہے:

> اس بات کا ذکر آیا کہ بعض لوگ غیر موجود جنازے کی نماز پڑھتے ہیں، یہ کیسا ہے؟ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا کہ یہ جائز ہے۔ مصطفی علیہ السلام نے نجاشی کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ہے، کیوں کہ ان کا انتقال کہیں اور ہوا تھا۔ امام شافعی اس بات کو جائز رکھتے ہیں اگر میت کے جسم کا کوئی حصہ لایا جائے جیسے ہاتھ، پاؤں یا انگلی جو بھی ہو اس پر بھی نماز جائز ہے۔ (ص: ۶۲۷، چوتھی جلد، ۲ویں مجلس)

شیخ الاسلام والمسلمین بابا فرید الدین گنج شکر قدس اللہ اسرارہ کے ملفوظ ''راحت القلوب'' میں جامع ملفوظ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا نے لکھا ہے کہ ذکر و مراقبہ کی حالت میں شیخ الاسلام پر غشی طاری ہوئی، جب

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب مناقب الانصار، باب النجاشی (۳۸۷۷)۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب فی التکبیر علی الجنازۃ (ح: ۹۵۲)۔

(۲) بدائع الصنائع، کاسائی حنفی، فصل بیان کیفیۃ الصلاۃ علی الجنازۃ (۱/ ۳۱۲)۔ شرح مختصر خلیل خرشی مالکی، فصل صلاۃ الجنازۃ (۲/ ۱۴۳)۔

(۳) المجموع شرح المھذب، نووی، کتاب الجنائز، باب الصلاۃ علی المیت (۵/ ۲۵۳) المغنی، ابن قدامۃ، کتاب الجنائز، فصل الصلاۃ علی الغائب (۲/ ۳۸۲)

(۴) المجموع شرح المھذب، نووی، باب الصلاۃ علی المیت (۵/ ۲۶۸) المغنی، ابن قدامۃ، فصل الصلاۃ علی الغائب (۲/ ۳۸۲)

افاقہ ہواتو عبداللہ بلخی کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا اس بیابان فنا سے شہرستان بقا کی طرف کوچ کر گئے، خواجہ عبداللہ بلخی نے تصدیق کی اور کہا کہ آیئے نماز جنازہ پڑھیں آپ نے دیگر حاضرین کے ساتھ ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ (راحت القلوب، غرہ محرم ۶۵۶ھ، مجلس: ۲۰)

اسی طرح جہانیان جہاں گشت مخدوم سید جلال الدین حسین بخاری (۷۸۵ھ) قدس اللہ اسرارہ ماہ رمضان کے اعتکاف کے لیے مسجد میں تھے کہ شیخ مدینہ عبداللہ مطری رحمۃ اللہ علیہ حاضر ہوئے اور یہ خبر دی کہ شیخ الہند خواجہ نصیر الدین اس دار فانی میں نہ رہے، دروازہ بند کرواور یہیں جنازہ پڑھ لو۔ مخدوم جہانیاں نے حاضرین کے ساتھ مل کر نماز جنازہ ادا کی۔ (جامع العلوم، ص: ۸۹)

(۲) غائبانہ نماز جنازہ اس شخص کی جائز ہے جس سے مسلمانوں کو کوئی منفعت اور نفع حاصل ہو، مثلاً کسی عالم دین، مجاہد، یا غنی شخص جس کے مال وغیرہ سے لوگ نفع حاصل کرتے رہے ہوں۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کا ایک قول ہے۔ (الاختیارات الفقھیۃ لابن تیمیہ، کتاب الجنائز: ۳/ ۱۴۴)

(۳) غائبانہ نماز جنازہ اس شرط پر جائز ہے کہ جہاں وہ شخص فوت ہوا ہو، وہاں اس کی نماز جنازہ ادا نہ ہوئی ہو، اور اگر اس کی نماز جنازہ ادا کی گئی ہے تو پھر غائبانہ نماز جنازہ جائز نہیں ہے۔ یہ قول امام احمد رحمہ اللہ کی دوسری روایت ہے۔ علامہ ابن حجر نے بھی اسی قول کو ترجیح دیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

وَقَدِ اعْتَذَرَ مَنْ لَمْ يَقُلْ بِالصَّلَاةِ عَلَى الْغَائِبِ عَنْ قِصَّةِ النَّجَاشِيِّ بِأُمُورٍ مِنْهَا أَنَّهُ كَانَ بِأَرْضٍ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِ بِهَا أَحَدٌ فَتَعَيَّنَتِ الصَّلَاةُ عَلَيْهِ لِذَلِكَ وَمِنْ ثَمَّ وقَالَ الْخَطَّابِيّ: "لا يُصَلَّى عَلَى الْغَائِبِ إلا إذَا وَقَعَ مَوْتُهُ بِأَرْضٍ لَيسَ فِيهَا مَنْ يُصَلِّي عَلَيْهِ"، وَاسْتَحْسَنَهُ الرُّويَانِيُّ من الشافعية، وَتَرْجَمَ بِذَلِكَ أَبُو دَاوُد فِي "السُّنَنِ" فَقَالَ: بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الْمُسْلِمِ يَلِيهِ أَهْلُ الشِّرْكِ فِي بَلَدٍ آخَرَ. قَالَ الْحَافِظُ: وَهَذَا مُحْتَمَلٌ إِلَّا أَنَّنِي لَمْ أَقِفْ فِي شَيْءٍ مِنَ الْأَخْبَارِ عَلَى أَنَّهُ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْهِ فِي بَلَدِهِ أَحَدٌ"(۱)

وہ لوگ جو غائبانہ نماز جنازہ کے قائل نہیں ہیں وہ لوگ نجاشی کے جنازے کے بارے میں یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ان کی وفات ایسی زمین پر ہوئی تھی جہاں ان کی نماز ادا نہیں کی گئی تھی، اسی لیے ان کی نماز ضروری تھی۔ خطابی رحمہ اللہ کہتے ہیں: غائبانہ نماز جنازہ اس وقت ادا کی جائے گی جب کسی شخص کی موت ایسی جگہ ہو جہاں اس کی نماز جنازہ ادا کرنے والا کوئی نہ ہو، اور شافعیہ میں سے الرویانی نے اسے مستحسن قرار دیا ہے، اور ابوداود رحمہ اللہ نے سنن ابوداود میں اس پر باب باندھتے ہوئے کہا ہے: "کسی دوسرے علاقے میں مشرکوں کے ساتھ رہنے والے مسلمان شخص

---

(۱) فتح الباری، کتاب الجنائز، باب من صف صفین اوثلاثۃ علی الجنازۃ خلف الامام (۳/ ۱۸۸)

کی نماز جنازہ کے متعلق باب۔'' حافظ ابن حجر آگے کہتے ہیں کہ اس بات کا احتمال حدیث میں موجود ہے۔اگر چہ اس سلسلے میں کوئی روایت منقول نہیں ہے۔

مذکورہ مذاہب میں مندرجہ ذیل اسباب کی وجہ سے سب سے درست مذہب یہی معلوم ہوتا ہے:

(۱) حدیث نجاشی نبی کریم کے ساتھ خاص ہے، اگر چہ اس خصوصیت پر کوئی نص نہیں ہے لیکن آپ نے وحی کے ذریعہ ان کی موت کی خبر دی، وحی کے ذریعے خبر دینا آپ ہی کا خاصہ ہے۔

(۲) یہ واقعہ خاص ہے جس کے ذریعہ عام پر دلیل قائم نہیں ہوتی، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجاشی کے علاوہ کسی کی غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

(۳) نجاشی کی وفات ایسی سرزمین پر واقع ہوئی ہے جہاں غالب گمان یہ ہے کہ آپ کی نماز جنازہ پڑھانے والا کوئی نہیں تھا۔

(۴) اس مسئلے کو دعائے مغفرت اور ایصال ثواب پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ان میں غیر محدود تکرار ہوتی ہے اور ان میں میت کی تخصیص نہیں، زندہ کے لیے بھی ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ کوئی محقق و عارف اپنے شیخ یا کسی معتبر عالم دین کی غائبانہ نماز ادا کرے تو کسی کو واویلا نہیں مچانا چاہیے، اختلاف امت رحمت ہے۔بعض لوگ تو عالم و مجتہد، عارف و محقق اور پیشوا و مقتدا کو بھی مقتدی و مرید کی صف میں کھڑا کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں۔ یہ بات ان کے علمی اور فکری انحطاط کی بین دلیل ہے۔

حرف آخر

سلطان المشائخ کی فقہی بصیرت، استحضار ادلہ، مسائل میں وجہ اختلاف و ترجیح کی یہ چند مثالیں ہیں۔اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ مشائخ عموماً اور سلطان المشائخ خصوصاً کئی مسائل میں اپنی رائے رکھتے ہیں۔ یہ بھی واضح ہوا کہ سلطان المشائخ کے یہاں اختلاف مذاہب میں آرا کے درمیان ترجیح کی بنیاد قوت دلیل سے زیادہ احتیاط رہی ہے جیسا کہ عمل میں احتیاط صوفیہ کی روش ہے۔ یہ اختلاف رائج مذہب میں تحکم یا ان کی دلیلوں کو کمزور ثابت کرنے کے لیے نہیں ہے۔

کلمات اختتامیہ

اس مختصر سے مقالے میں سلطان المشائخ کے تعمق علمی، ذوق حدیثی اور اجتہاد فقہی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے ساتھ ہر مسئلے سے متعلق علما کی مختلف آرا، ان کے درمیان جمع و تطبیق اور معتدل و متوسط راہ نکالنے پر زور صرف کیا گیا ہے۔ حدیث کے باب میں اس کی فنی حیثیت اور عصری تناظر میں قارئین کے لیے پند و نصائح بھی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سلطان المشائخ علما و عوام سب کے محبوب و داور ہیں، آپ کی زندگی کا ہر پہلو طالبان صادق کے لیے دلیل و حجت ہے، آپ کی تعلیمات و ملفوظات ہر مبتدی و منتہی کے لیے پیشوا و رہنما ہیں، اس مقالے کے ذریعے ان کی بارگاہ میں ایک ادنی خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام افراد امت محمد یہ کو سلف صالحین، علماے مجتہدین اور مشائخ صوفیہ کے ساتھ حسن ظن کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے علمی وروحانی فیوض و برکات سے مالا مال فرمائے۔

امت محمدیہ کے ہر فرد کو چاہیے کہ وہ انسانی قدروں کا احترام بجالائے، آپس میں کلمہ کے نام پر اتحاد قائم کرے اور اصول وعقائد ضروریہ کے ماننے والوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ رکھے۔

اس پورے مقالے میں جو اچھی بات آ گئی ہے، یہ سب کچھ پیر ومرشد کا فیض لامتناہی ہے، ان کی علمی توجیہات اور روحانی توجہات کا نتیجہ ہے، اللہ ان کے فیضان کو عام وتام کرے اور جو غلط ہے یا خواہش نفسانی کے اتباع میں لکھی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اسے محو کر دے اور امت کو اس کے مضر اثرات سے محفوظ رکھے۔ آمین

کتابیات

۱-احیاء علوم الدین، محمد غزالی (۵۰۵ھ)، دار المعرفۃ- بیروت

۲-اصول السرخسی، شمس الائمہ سرخسی (۴۸۳ھ) دار المعرفۃ، بیروت

۳-الاختیارات الفقہیۃ لشیخ الاسلام ابن تیمیہ، سامي بن محمد بن جاد اللہ، مجمع الفقہ الاسلامی- جدۃ

۴-البنایۃ فی شرح الھدایہ، بدر الدین عینی (۸۵۵ھ)، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۲۰ھ

۵-الدر المختار شرح تنویر الابصار، علاء الدین حصکفی حنفی (۱۰۸۸ھ) دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۳ھ

۶-الرسالۃ القشیریۃ، ابو القاسم قشیری (۴۶۵ھ)، دار المعارف، قاہرہ

۷-الطبقات الکبری: ابو المواہب عبد الوہاب شعرانی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۴۱۸ھ

۸-الفتاوی الصوفیۃ فی طریق البھائیۃ، محمد بن ابوب فضل اللہ صوفی، مخطوطہ: معہد البیرونی نمبر: ۲۹۸۱

۹-الفتوحات المکیۃ، ابن عربی دار الکتب العلمیۃ، بیروت

۱۰-المجموع شرح المھذب، یحیی بن شرف نووی (۶۷۶ھ) دار الفکر

۱۱-المستدرک علی مجموع فتاوی ابن تیمیہ، ناشر: محمد بن عبد الرحمن بن قاسم، ۱۴۱۸ھ

۱۲-المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ، ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) دار العاصمۃ، -سعودی، ۱۴۱۹ھ

۱۳-انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ بیان طریقہ چشتیہ، شاہ ولی اللہ، عباسی کتب خانہ

۱۴-بحر المعانی (مترجم)، محمد بن نصیر الدین جعفر مکی حسینی، مترجم وناشر: تقی انور علوی، ۱۴۳۱ھ

۱۵-بدائع الصنائع، علاء الدین کاسانی حنفی، (۵۸۷ھ) دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۱۸ھ

۱۶-تأیید الحقیقۃ العلیۃ، جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ)، دار الکتب العلمیہ، ۱۹۷۱

۱۷-تفسیرات احمدیہ، احمد ابن ابو سعید امیٹھوی معروف بہ ملا جیون (۱۱۳۰ھ)، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور

۱۸-جامع العلوم = ملفوظات سید جلال الدین حسین بخاری، جامع: علاء الدین قریشی، تدوین: قاضی سجاد حسین، ناشر: انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ

۱۹-حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح، احمد طحطاوی (۱۲۳۱ھ)، دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۱۸ھ

۲۰--ذخائرالاعلاق، ابن عربی، داربیبلون، پیرس

۲۱-راحت القلوب=ملفوظات بابافریدالدین، جامع: خواجہ نظام الدین اولیا، ناشر: ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۴۰۶ھ

۲۲-ردالمحتار علی الدر المختار، ابن عابدین شامی (۱۲۵۲ھ) دارالفکر- بیروت، ۱۴۱۲ھ

۲۳-رسائل الارکان، عبدالعلی فرنگی محلی (۱۲۲۵ھ)، المطبع الیوسفی، ۱۹۱۱ء

۲۴-سنن ابن ماجہ، محمد بن یزید قزوینی (۲۷۳ھ) مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۳۰ھ

۲۵-سنن ابوداود، ابوداودسلیمان بن الاشعث (۲۷۵ھ) مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۳۰ھ

۲۶-سنن کبری بیہقی، ابوبکر بیہقی (۴۵۸ھ) دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۲۴ھ

۲۷-سیرالاولیاء، امیرخورد کرمانی، ناشر: خواجہ حسن ثانی نظامی، درگاہ حضرت خواجہ۔۔، نئ دہلی، نومبر ۲۰۱۰ء۔

۲۸-صحیح ابن حبان، ابوحاتم محمد بن حبان (۳۵۴ھ) مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۰۸ھ

۲۹-صحیح البخاری، محمد بن اسماعیل بخاری (۲۵۶ھ)، دارطوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ

۳۰-صحیح مسلم، مسلم بن الحجاج نیساپوری (۲۶۱ھ) داراحیاء التراث العربی- بیروت

۳۱-عقدالجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، شاہ ولی اللہ دہلوی، طبع: مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۴۴ھ

۳۲-عوارف المعارف، شہاب الدین سہروردی، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، قاہرۃ

۳۳-فتاوی رضویہ (مترجم) احمد رضاخان، ناشر: مرکز اہل سنت برکات رضا، پوربندر، گجرات

۳۴-فتاوی مصطفویہ، مصطفی رضاخان، مفتی اعظم اکیڈمی، چھتیس گڑھ، ۲۰۰۰ء

۳۵-فتح الباری شرح صحیح البخاری، ابن حجر عسقلانی، ناشر: دارالمعرفۃ- بیروت، ۱۳۷۹ھ

۳۶-فوائدالفواد=تعلیمات وملفوظات خواجہ نظام الدین اولیا، جامع: حسن علاسجزی، ترجمہ وناشر: حسن ثانی نظامی، ۲۰۰۷ء

۳۷-قواعدالتصوف، احمد زروق (۸۹۹ھ) دارالبیروتی، دمشق

۳۸-کشف القناع، فخر الدین زرادی (۷۲۸ھ یا ۷۴۸ھ)، درمطبع مسلم پریس واقع جھجر طبع شد

۳۹-لطائف المنن والاخلاق، ابوالمواہب عبدالوہاب شعرانی (۹۷۳ھ) دارالتقوی، ۲۰۰۴

۴۰-مجمع السلوک (مخطوطہ) مخزونہ، خانقاہ عارفیہ، سیدسراواں، کوشامبی، یوپی

۴۱-مجمع السلوک، (مترجم) سعدالدین خیر آبادی، شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عارفیہ، سیدسراواں

۴۲-مستدرک، حاکم نیساپوری (۴۰۵ھ) دارالکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۱۱ھ

۴۳-میزان الشریعۃ الکبری، ابوالمواہب عبدالوہاب شعرانی (۹۷۳ھ)

۴۴-ہدایہ، ابوالحسن برہان الدین مرغینانی (۵۹۳ھ) داراحیاء التراث العربی- بیروت

۴۵-ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، ابوالحسنات ندوی، رروز بازار، امرتسر

○○○

ضیاء الرحمن علیمی

سلطان المشائخ اور عربی زبان وادب

مقدمہ

عموماً جب لسانی ذوق کی بات ہوتی ہے تو تبادر ذہنی نثری وشعری ذوق کی طرف ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادبی ذوق میں تو ہم خصوصیت کے ساتھ نثری وشعری اصناف اور ان کے اندر پائے جانے والی بلاغی خوبیوں کی جہت سے کسی بھی شخصیت کے ذوق کو پرکھتے ہیں، البتہ جب لسانی ذوق کی بات ہوتی ہے تو اس میں عموم وشمول پیدا ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے کسی کے لسانی ذوق کا مختلف جہتوں سے تجزیہ کیا جاتا ہے۔

جب کسی شخصیت کے ذوق عربی زبان پر گفتگو کی جائے تو درج ذیل پہلوؤں سے استدلال کیا جا سکتا ہے:

ا۔متعلقہ شخصیت کی انشا کردہ نثر مثلاً مستقل نثری تصانیف، خطبات، علمی اجازت نامے، طبع زاد اقوال، جملے، محاورات وامثال، دوسروں کی نثری تحریروں کو اہتمام کے ساتھ اپنی تحریروں یا مجلسوں میں بیان کرنا اور قرآنی آیات احادیث وآثار سے استدلال۔

۲۔خود کے کہے ہوئے اشعار ومصرعے، دوسروں کے اشعار ومصرعے جن سے اس نے اپنی تحریروں یا مجلسوں کو مزین کیا ہو۔

۳۔کوئی نحوی یا صرفی گفتگو یا لغوی نکتہ

۴۔علوم بلاغیہ (معانی بیان وبدیع) پر کوئی گفتگو

۵۔عربی زبان وادب اور علوم عربیہ پر مشتمل کتابوں کا درس اور اس کی تدریس، حفظ ومطالعہ اور ترغیب

۶۔عربی زبان وادب اور علوم عربیہ کے ماہرین کا اس کی طرف رجوع۔

یہ چند استقرائی پہلو ہیں جن کے مطالعہ وتجزیہ سے کسی شخصیت کے ذوق عربی زبان کا بڑی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عہد غلاماں (۱۲۰۶ء-۱۵۲۶ء) میں عربی زبان کے ظاہرے

ان تمام عناصر کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ہم اس عہد اور اس عہد کے ماسبق و مابعد کے قریبی عہد کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں اگرچہ سرکاری، عام علمی، ادبی و عوامی زبان فارسی تھی اور عربی زبان خاص اہل علم کی زبان تھی اور عربی زبان کا ادبی ذوق صرف خواص اہل علم کا حصہ تھا مگر اس کے باوجود عربی زبان وادب سے عام لوگوں کا تعلق بھی بالکلیہ منقطع نہیں تھا۔

عوام کا تعلق عربی زبان سے زیادہ تر دینی تھا یا ان محاورات و امثال، اقوال و اشعار اور مفرد و مرکب الفاظ کی سطح تک تھا جو لوگوں کی زبان پر جاری تھے۔ عام اہل علم تو علوم اسلامیہ اور کتب علوم اسلامیہ کے درس وتدریس کی وجہ سے عربی زبان سے جڑے ہوئے تھے، یوں ہی قرآنی زبان کے لطائف ومحاسن، دقائق وحقائق کی تحصیل کے واسطے سے عربی زبان کی ادبی کتابوں مثلاً معلقات سبعہ، مقامات حریری و ہمدانی اور کتب بلاغیہ مثلاً سکاکی کی مفتاح العلوم وغیرہ سے گہرا تعلق رکھتے تھے، ایسے ہی فارسی زبان کی لسانی بلاغتوں کی فہم اور اس کا ذوق چوں کہ ایک حد تک علوم عربیہ کے ذوق وفہم پر منحصر ہے اس لیے لوگوں کا تعلق عربی زبان وادب سے استوار تھا۔

خواص اہل علم کا تعلق عربی زبان وادب سے اس سطح کا تھا کہ وہ ایک طرف عربی زبان کے درس وتدریس میں لگے تھے تو دوسری طرف وہ اس زبان میں گفتگو کرتے، جمعہ کے خطبات دیتے، تصنیف وتالیف کرتے اور نثری وشعری شہ پارے اور محاورات وامثال تخلیق کرتے، ان کی مجالس علمی یا روحانی عربی زبان میں ہوتی اور عربی زبان میں علمی وروحانی اجازات سے اپنے تلامذہ وخلفا کو نوازتے۔

یہ خواص اہل علم کا عمومی ظاہرہ تھا، یہ الگ بات ہے کہ عجم اور عجمیت کی یلغار اور اس عہد کے سماجی اور سیاسی احوال نے اس عہد کے عربی ذوق کو خالص نہیں رہنے دیا اور عربی تحریروں میں فارسی اسالیب وتراکیب نے جگہ بنالی، لیکن یہ معاملہ صرف ہندوستانی عربی زبان وادب کے ساتھ نہیں پیش آیا بلکہ اس سے پورا عالم اسلام بشمول عالم عرب محفوظ نہیں رہ سکا۔(۱)

مشائخ چشت کی عربی زبان سے محبت

عربی زبان کی محبت اور اس کی پرورش کے حوالے سے اگر عربی زبان کا مؤرخ اس عہد کے مشائخ چشت کی سیرت وسوانح کا مطالعہ کرے تو اسے عربی زبان کی محبت کے عمومی طور پر درج ذیل عناصر ملیں گے:

۱۔قرآنی آیات سے استدلال ۲۔احادیث وآثار سے استدلال ۳۔عربی شعرگوئی ۴۔عربی اقوال و اشعار سے استشہاد ۵۔عربی کتابوں کا درس، ۶۔علمی مذاکرے ۷۔عربی اجازت نامے۔

---

(۱) اس عہد کی ہندوستانی عربی زبان کے معائب ومحاسن سے واقفیت کے لیے دیکھیں: غلام علی آزاد بلگرامی کی سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، عبدالحی رائے بریلوی کی الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، عمر فروخ کی تاریخ الادب العربی اور دیگر متعلقہ کتابیں۔

جہاں تک قرآنی آیات واحادیث سے استدلال کی بات ہے تو یہ ایک فطری بات ہے کیوں کہ مشائخ چشت (مثلاً خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار چشتی اوشی، خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء، آپ کے خلفاء مثلاً خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی، خواجہ فخر الدین زرادی، شمس الدین یحیی اودھی وغیرہ اور پھر خلفاء کے خلفاء) ہر عہد میں عموماً باضابطہ علوم دینیہ کے متبحر عالم تھے اور عربی زبان کا ذوق رکھنے والے تھے، اس لیے فطری طور پر ان کی مجالس ومحافل میں قرآنی آیات واحادیث سے استدلال بکثرت ہوا کرتا تھا۔

ذیل میں یہاں بطور مثال چند مشائخ چشت کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو عربی زبان سے محبت اور اس کے ادبی ذوق کے حوالے سے معروف ہیں:

۱۔خواجہ فرید الدین گنج شکر (۶۵۹ھ)

آپ کا اسم گرامی مسعود بن سلیمان ہے، آپ عظیم شیخ طریقت ہونے کے ساتھ اپنے عہد کے زبردست عالم دین بھی تھے، آپ کی روحانی عظمت وبزرگی کے لیے تو اتنی بات ہی کافی ہے کہ آپ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا اور خواجہ علاء الدین صابر کلیری کے شیخ ومربی ہیں۔ آپ کی علمی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صاحب سیر الاولیاء امیر خورد کرمانی نے آپ کے تذکرے میں (جو آٹھ نکتوں پر مشتمل ہے) چوتھا نکتہ آپ کے تبحر علمی سے متعلق تحریر کیا ہے اور اس میں ایسی باتیں ذکر کی ہیں جن سے آپ کے ذوق عربی زبان کا پتا چلتا ہے:

صاحب سیر الاولیاء امیر خورد کرمانی خواجہ نظام الدین اولیا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> میں نے شیخ شیوخ العالم کی خدمت میں عرض کی کہ میں آپ سے قرآن پڑھنا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا پڑھ لو، چنانچہ جمعہ کے دن یا جس روز فرصت ہوتی میں آپ سے قرآن پڑھا کرتا، اس طرح میں نے آپ سے چھ پارے قرآن مجید کے پڑھے، جب میں نے قرآن پڑھنا شروع کیا تو مجھ سے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو کہا، جب میں نے پڑھنا شروع کیا اور **و لا الضالین** تک پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ جس طرح میں ضاد ادا کر رہا ہوں اس طرح ادا کرو، میں نے اس طرح پڑھنے کی بہت کوشش کی لیکن نہیں ہو سکا، کیسی فصاحت وبلاغت تھی کہ جس طرح آپ ضاد ادا فرماتے دوسرے اس طرح نہیں ادا کر پاتے تھے۔ (سیر الاولیاء، ذکر خواجہ فرید الدین گنج شکر، نکتہ چہارم، ص: ۷۰، ۷۱)

اس واقعے سے جہاں سلطان المشائخ کے ذوق علم وتعلم اور محبت عربی زبان کا پتا چلتا ہے وہیں پہلے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ بابا فرید قدس سرہ کو عربی زبان اور علم تجوید پر ایسی مہارت تھی کہ آپ لفظ ضاد جس کی ادائیگی سب سے مشکل ہے اس کے حسن ادا کے لیے معروف تھے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک پریشان حال شخص نے آپ سے عرض کی کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سفارشی رقعہ لکھ دیں تو آپ نے جو رقعہ لکھا اس میں یہ جملے بھی تھے:

رفعت قصته إلى الله ثم إليک، فإن أعطيته فالمعطي هو الله و أنت المشكور، و إن لم تعطه شيئا فالمانع هو الله و أنت المعذور" (ایضا:۷۲)

ترجمہ: میں نے اس شخص کا معاملہ اللہ کے حوالے کیا پھر تمہارے سپرد کیا، اگر تم اس کو اس کی مراد عطا کر دو تو معطی اللہ ہی ہے اور تم کو اس کا بدلہ ملے گا۔ اور اگر تم عطا نہ کر سکو تو مانع اللہ ہی ہے اور تم معذور ہو۔

آپ کے رقعے کا یہ حصہ آپ کے عربی پیرایۂ بیان کا بہترین اظہار یہ ہے جس میں نہ تو کسی قسم کا تکلف ہے نہ بھاری بھر کم الفاظ کا بوجھ اور نہ ہی غریب کلمات کی وحشت بلکہ مافی الضمیر کی ادائیگی میں الفاظ و معانی شانہ بشانہ چل رہے ہیں۔

صاحب سیر الاولیاء نے خواجہ نظام الدین اولیاء کی دستی تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے آپ کا یہ ملفوظ بھی نقل کیا ہے کہ سات سو مشائخ طبقات سے چار چیزوں کے بارے میں سوال ہوا تو سب نے ایک ہی جواب دیا:

من أعقل الناس؟ تارک الدنیا. من أکیس الناس؟ الذي لا یتغیر بشئ. من أغنی الناس؟ القانع. و من أفقر الناس؟ تارك القناعة۔ (ایضا:۷۴)

ترجمہ: سب سے زیادہ عقل مند کون؟ تارک دنیا۔ سب سے زیادہ باشعور کون؟ جو کسی بھی چیز سے متاثر نہ ہو۔ سب سے زیادہ غنی کون؟ قناعت کرنے والا۔ سب سے زیادہ فقیر کون؟ قناعت نہ کرنے والا۔

اس ملفوظ کے ناقل سلطان جی ہیں، اب اگر آپ نے اپنے شیخ کے قول کی روایت بعینہ فرمائی ہے تو یہ جہاں بابا صاحب کی عربی زبان پر قدرت کی شاہد ہے وہیں خود سلطان جی کے عربی ذوق کی غماز بھی اور اگر یہ روایت بالمعنی ہے پھر بھی دونوں مشائخ چشت کے عربی مذاق کا بہترین نمونہ ہے کیوں کہ یہاں پیرایۂ بیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ قوت اظہار میں بلاغت ایجاز بہت نمایاں ہے۔

خواجہ بدرالدین اسحاق (۶۹۰ھ)

آپ خواجہ فریدالدین گنج شکر کے داماد و خلیفہ ہیں۔ آپ عربی زبان کے صاحب قدرت ادیب تھے، آپ نے علم صرف میں ایک منظوم رسالہ بھی تحریر فرمایا تھا جس کے آخر میں آپ کے یہ اشعار بھی درج تھے:

إني بسطت يدي إليك إلهي
ويسيل سيل الدمع من ماقي
فارحم بكائي واعف عما قد حوى
من غفلة في هذه الأوراق
واسدد بفضلك ثلمة في نظمه
واجعله بعد الموت مني الباقي

واصبب عليه من قبولك جرعة

تهوي إليه أفئد العشاق

وانظر شواغل خاطري وشدائدي

يا من سترت معائب الآفاق

فقد ابتليت بلية لم أرجها

فرجا من الطيس، ولا من راق

الدين فيها راحل أو نادر

وأرى النفاق مواضع الأخلاق

والخل فيها كاشح متنابس

وعليه قس حال العدو والعاق

والعيش فيه لمن تزندق عامدا

واليوم يوم الفسق والفساق

العادلين الآكلين لحومهم

يتمازعون تمازع الأزقاق

وأرى الزمان عزيز الأفطان من

أدهى البلى والروع والإحراق

وارحم لمن يتلو ويدعو عبدك

الإسحاق ابن علي الإسحاق(۱)

ترجمہ: (۱) الٰہی میں تیری بارگاہ میں ہاتھ پھیلائے ہوں اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں ہے۔

(۲) میری آہ وبکا پر رحم فرما اوران اوراق میں جوکوتاہی رہ گئی ہو اسے معاف فرما۔

(۳) اس کتاب کونظم کرنے میں جوکمی رہ گئی ہو اس کی درستگی اور تلافی فرما اور میری وفات کے بعد اسے باقی رکھ۔

(۴) اس کتاب پر اپنی قبولیت کا جام انڈیل دے کہ عاشقوں کے دل اس کی طرف مائل ہوجائے۔

---

(۱) ایضا، باب دوم درفضائل خلفائے شیخ الاسلام، تذکرہ مولانا بدرالدین اسحاق، نکتہ اول در بیان پیوستن مولانا بدرالدین اسحاق، ص: ۱۷۳

(۵) اے ساری کائنات کے عیوب کی پردہ پوشی فرمانے والے! میری پریشان خاطری اور میری تکلیفوں کی جانب نظر کرم فرما۔

(۶) میں غیر متوقع بلا میں گرفتار ہو گیا ہوں، شدید مصیبت سے مجھ کو نجات عطا فرما، میرا کوئی چارہ ساز نہیں ہے۔

(۷) اس زمانے میں دین داری رخصت ہو گئی ہے یا پھر نادر ہو گئی ہے اور آج اخلاق کی جگہ نفاق نے لے لی ہے۔

(۸) اس زمانے میں دوست بھی چھپے اور کھلے دشمن ہیں اسی سے دشمن اور نافرمان کا حال بھی جان لیں۔

(۹) آج زندگی اس کی ہے جو قصداً زندیق ہو جائے آج کا زمانہ فسق وفساق کا زمانہ ہے۔

(۱۰) آج عدل پسند عاملین بھی لوگوں کی بوٹیاں ایسے نوچ کھانے والے ہیں جیسے پرندے گوشت نوچ نوچ کر کھاتے ہیں۔

(۱۱) سخت بلاؤں اور قلب و روح میں آگ بھڑکا دینے والے خوف کی وجہ سے مجھے اس زمانے میں زیرک لوگ کم ہی نظر آ رہے ہیں۔

(۱۲) الٰہی! اس بندے پر رحم فرما جو اس کتاب کو پڑھے اور تیرے بندے اسحاق بن علی ابن اسحاق کے لیے دعا کرے۔

یہ آپ کے کلام کا شعری نمونہ رہا اب ایک نثری ٹکڑا بھی ملاحظہ فرمائیں۔

دراصل اس نثر پارے کے معرض وجود میں آنے کا سبب یہ ہوا کہ آپ نے علم صرف میں جو رسالہ تحریر فرمایا تھا اسے جب سلطان جی نے آپ سے پڑھا اور پھر سند کی درخواست کی تو آپ نے درج ذیل الفاظ میں سند عطا کی:

سمع مني وقرأ هذا النظم العزيز الإمام المجاهد العالم نظام الملة والدين محمد بن أحمد ذو الخصائل الرضية والشمائل السنية شملت شمائله وآثاره وعمت فضائله وأنواره، وإني وإن كنت قليل البضاعة في هذه الصناعة لكن اتفاق هذا النظم كان لأمر من هو واجب الايتمار كسعي النملة بين يدي سليمان، وهو -دام فضله- التمس مني هذه الأسطر مع كثرة قدره فكتبت ذلک امتثالا لأمره وأنا أضعف الفقراء إلى الله الغني إسحاق بن علي الدهلوي بخطي، رجاء أن يذكرني بصالح دعواته حامدا ومصليا۔ (ایضا،ص: ۱۷۴)

ترجمہ: مجھ سے اس منظوم کتاب کی سماعت وقراءت امام مجاہد و عالم نظام الملۃ والدین محمد بن احمد جو پسندیدہ اخلاق وشمائل رکھنے والے ہیں (ان کے اخلاق، فیوض وبرکات اور فضائل وانوار عام وتام ہوں) نے کی۔ میں اگرچہ اس فن میں کوتاہ دست تھا لیکن اس منظوم کتاب کی تالیف ایسی ذات کے

حکم سے ہوئی جن کے حکم کو قبول کرنا واجب ہے اور میری یہ کوشش ان کے خدمت میں ایسے ہی ہے جیسے سلیمان علیہ السلام کے سامنے چیونٹی کی محنت۔ مولانا نظام الدین کو اللہ تعالی دائمی فضیلت و بزرگی سے نوازے، انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کے لیے یہ سطریں لکھ دوں، حالاں کہ خود ان کا مقام بہت بلند ہے۔ چنانچہ میں اضعف الفقرا الی اللہ اسحاق ابن علی دہلوی نے اپنی دستی تحریر میں ان کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے یہ سطریں لکھ دیں، مجھے امید ہے کہ وہ مجھ کو اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ اللہ کے لیے حمد اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلاۃ وسلام نازل ہو۔

امیر خسرو دہلوی (۷۲۵ھ)

حضرت امیر خسرو یوں تو فارسی اور ہندوی زبان وادب میں اپنی مہارت کے لیے معروف ہیں اور عربی زبان وادب سے ان کی شناسائی عام حلقے میں غیر معروف ہے لیکن خواص اہل علم کے طبقے میں عربی زبان پر بھی ان کی قدرت مسلم ہے۔ ان کے مختلف دواوین میں بکھرے ہوئے بعض عربی قصیدے، خزائن الفتوح میں ان کے مفرد عربی ابیات اور رسائل الاعجاز میں ان کے تقریبا ایک ہزار مفرد و مرکب عربی ابیات اور علوم بلاغت پر ان کے افادات اس پر شاہد عدل ہیں۔ آپ کے بعض عربی اشعار درج ذیل ہیں:

يا عاذل العشاق دعني باكيا

إن السكون على المحب محرم

من بات مثلي فهو يدري حالتي

طول الليالي كيف بات متيم (۱)

ترجمہ: (۱) اے عاشقوں کو ملامت کرنے والے! مجھے رونے دو، محبت کرنے والے پر چین وسکون حرام ہوتا ہے۔

(۲) جو میری طرح رات گزارتا ہے وہی میرا حال جانتا ہے کہ عاشق نے پوری رات کیسے گزاری۔

خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی:

آپ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، آپ نے ہدایہ شیخ فخر الدین ہانسوی سے اور اصول بزدوی قاضی محی الدین کاشانی سے پڑھی۔ (نزھۃ الخواطر، ج:۲، طبقہ:۸، حرف میم، ص:۲۰۹)

صاحب سبحۃ المرجان غلام علی آزاد بلگرامی نے آپ کے اساتذہ میں حضرت شمس الدین یحیٰی اودھی کا بھی ذکر کیا ہے۔ (فصل ثانی، تذکرہ مولانا شمس الدین یحیٰی، ص:۶۷)

---

(۱) دیوان غرۃ الکمال، ص:۹۶۔ حضرت امیر خسرو کی عربی زبان وادب پر مہارت کے لیے دیکھیں مقالہ نگار کا ایم فل کا مقالہ: شعر أمير خسرو العربي دراسة تحليلية۔

آپ کی عربی زبان پر قدرت کے حوالے سے یہ ایک شعر جو آپ نے اپنے استاذ کی شان میں کہا ہے بہت مشہور ہے:

سألت العلم من أحياك حقا

فقال العلم شمس الدين يحيى (۱)

ترجمہ: میں نے علم سے پوچھا کہ تم کو حقیقت میں کس نے زندہ کیا تو اس نے کہا شمس الدین یحییٰ نے۔

آپ کے مشہور خلفا و تلامذہ میں صاحب تصانیف کثیرہ خواجہ محمد بن یوسف حسینی قدس سرہ اور قاضی عبد المقتدر کندی وغیرہ ہیں۔ ان میں اول الذکر کی متعدد عربی تصانیف ہیں جن میں معارف العوارف شرح عوارف المعارف قابل ذکر ہے جو حال ہی میں طبع ہو چکی ہے۔(۲) جب کہ ثانی الذکر اپنی تمام تر علمی و روحانی عظمتوں کے ساتھ عربی زبان کے نمایاں ہندوستانی شاعر ہیں، طغرائی کی لامیۃ العجم کی طرز پر آپ کا ایک عربی قصیدہ زبان و ادب کا شاہکار ہے جس کا مطلع یہ ہے:

یاسائق الظعن في الأسحار والأُصُلِ

سلم على دار سلمى وابْكِ ثم سَلِ (۳)

ترجمہ: اے صبح و شام مسافروں کو لے جانے والے! محبوب کے قیام گاہ کو سلام کرو وہاں رک کر گریہ و زاری کرو پھر پوچھو۔

خود سلطان جی کے سبھی خلفا عربی زبان میں با کمال تھے، ان میں سے بعض کی تو عربی تصانیف بھی موجود ہیں مثلاً علامہ فخر الدین زرادی کی کشف القناع عن اصول السماع وغیرہ۔

ان کے علاوہ سلسلۂ چشتیہ کی جتنی شاخیں نکلیں سب میں عربی زبان و ادب اور علوم عربیہ کے ماہرین موجود رہے، مثلاً حضرت سید جلال الدین بخاری، خزانۂ جلالی میں آپ کے عربی نثری نمونے دیکھے جا سکتے ہیں، ان کے ہم عہد اور خلیفہ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی چشتی کی بھی کئی عربی تصانیف ہیں، اسی طرح حضرت مخدوم شیخ سعد چشتی خیرآبادی علوم عربیہ نحو وصرف اور علم اصول فقہ میں اپنے عہد کے بڑے محققین میں شمار کیے جاتے ہیں۔(۴)

خواجہ نظام الدین اولیا (۷۲۵ھ)

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا قدس اللہ سرہ یوں تو پوری دنیا میں اپنے زہد و ورع، تقویٰ و انابت

---

(۱) اخبار الاخیار فارسی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی، طبقہ سوم، تذکرہ مولانا شمس الدین یحییٰ، ص:۱۸۹

(۲) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، عبد الحی رائے بریلوی، باب:۲، علم التصوف والسلوک، ص:۱۵۹۔

(۳) سبحۃ المرجان غلام علی آزاد بلگرامی، فصل:۲، تذکرہ قاضی عبد المقتدر کندی، ص:۷۸

(۴) تفصیل کے لیے دیکھیں: الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے مختلف مقامات، اور نزھۃ الخواطر اور بحر زخار میں ان مشائخ کے تذکرے۔

الی اللہ اور محبوبیت خاصہ کے لیے معروف ہیں لیکن آپ کے عہد کے آثار اور آپ کی سیرت وسوانح خصوصاً فوائد الفواد اور سیر الاولیا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عربی زبان وادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ تفصیلی طور پر کبھی بھی مقالہ نگار کی معلومات کے مطابق اس پہلو سے آپ کی شخصیت کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ اسی کی تفصیلات سے نقاب کشائی کے لیے آئندہ صفحات میں لسانی پہلو سے سلطان المشائخ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے گا اور حاصل شدہ نتائج کو قارئین کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

تعلیم وتربیت میں عربی عناصر

سلطان المشائخ کے تعلیمی وتربیتی احوال کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے عہد میں جو تعلیمی نصاب تھا اس میں مختلف علوم وفنون کے عربی متون شامل تھے، ان کتب سے بھی آپ کے ذوق عربی زبان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، چنانچہ پہلے تو بدایوں میں رہ کر شیخ جلال الدین تبریزی کے مرید مولانا علاء الدین اصولی سے عربی زبان کا مشہور فقہی متن قدوری پڑھا۔ (خیر المجالس، مجلس: ۵۶، ص: ۱۹۱)

اس کے بعد دہلی پہنچے اور تین چار سال تک مسلسل دہلی کے نامور اساتذۂ فن سے استفادہ کیا جن میں استاذ الاساتذہ شمس الملک مولانا شمس الدین خوارزمی بھی شامل تھے، فقہ واصول فقہ میں کامل علمی استحضار حاصل کیا، مولانا شمس الدین سے لغت پڑھی اور مقامات حریری سے چالیس مقامے یاد کیے، علوم عربیہ میں مکمل استعداد کی تحصیل کے بعد علم حدیث کے حصول کی طرف متوجہ ہوئے اور حفظ مقامات کے کفارے میں خلاصۂ صحیحین مشارق الانوار حفظ کیا اور اپنے زمانے کے مشہور محدث مولانا کمال الدین زاہد کی خدمت میں علم حدیث کی تکمیل فرمائی اور اس علم کے غوامض، تصحیح سند وقصۂ وروایات پر پوری محنت فرمائی۔

(سیر الاولیا، تذکرہ سلطان المشائخ، نکتۂ سیوم، ص: ۱۰۰-۱۰۱)

علم نحو کا ذوق

صاحب سبع سنابل میر عبد الواحد بلگرامی نے ایک واقعہ ذکر کیا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کو عربی زبان اور علوم عربیہ سے کیسا گہرا تعلق تھا، وہ لکھتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ ایک مرتبہ نحو کی ایک کتاب ضوء (۱) کا مطالعہ فرما رہے تھے، حاضرین میں سے کسی نے عرض کی: حضور! آپ کو نحو کی کتاب کے مطالعے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر کوئی آ جائے اور نحو کا مسئلہ پوچھ لے تو ہم اسے کیا جواب دیں گے؟ کچھ عرصے بعد ایک شخص آیا اور اس نے نحو کی اسی کتاب سے اسی مقام کو سمجھنا چاہا جس کا آپ مطالعہ فرما رہے تھے۔ (سبع سنابل، خطی، دوسرا سنبلہ، تذکرہ سلطان المشائخ، ص: ۶۷)

---

(۱) یقین سے نہیں معلوم کہ یہ کون سی نحوی کتاب ہے البتہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ یہ تاج الدین محمد بن اسفرائینی کی ضوء المصباح ہے۔ اسفرائینی اپنے عہد کے مشہور عالم نحو ولغت ہیں۔ ۶۸۴ھ میں وفات ہوئی۔

یہاں غور کریں کہ سلطان جی اس وقت مسند ارشاد پر متمکن تھے اور یقینا آپ کو کتب نحو اور مسائل نحویہ کے مراجعے کی حاجت نہیں تھی اس کے باوجود عربی زبان اور علوم عربیہ سے آپ کا یہ شغف ہی تھا کہ آپ اس زمانے میں بھی نحو کی کتابوں کا مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت بابا فرید کے ساتھ آپ کا ایک واقعہ ہے اس سے بھی آپ کے ذوق عربی زبان اور علم نحو وعلوم عربیہ سے آپ کے تعلق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ سلطان جی اس واقعے کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ایک دفعہ شیخ الاسلام فرید الدین گنج شکر قدس سرہ ایک دعا ہاتھ میں لیے ہوئے تھے اور فرما رہے تھے کہ ہے کوئی جو اس دعا کو یاد کرلے، میں سمجھ گیا کہ ان کا مقصود یہ ہے کہ اسے میں یاد کرلوں، چنانچہ میں آداب بجالایا اور عرض کی اگر حکم ہو تو بندہ یاد کرلے، آپ نے وہ دعا مجھے عطا فرمادی، میں نے عرض کی ایک دفعہ حضور کے سامنے پڑھ لوں پھر یاد کروں، فرمایا: پڑھو، جب میں نے پڑھا تو ایک اعرابی اصلاح فرمائی کہ اس طرح پڑھو، جس طرح شیخ نے فرمایا میں نے اسی طرح پڑھا، اگرچہ جس طرح میں نے پڑھا تھا اس طرح بھی صحیح تھا۔ (فوائد الفواد، جلد یکم، مجلس پنج وبستم، ص: ۴۲)

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ سلطان جی نے اگرچہ بابا صاحب کی اصلاح کے مطابق اعراب پڑھا اس کے باوجود آپ کو یہ بات یقین سے معلوم تھی کہ انہوں خود بھی جو اعراب پڑھا ہے وہ درست ہے، اس سے پتا چلا کہ آپ کی عربی زبان کے مختلف وجوہ اعراب پر گہری نظر تھی۔

عربی کتب بینی کا شوق

سلطان جی کے علمی ولسانی ذوق کا اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا رکن الدین چغمر جو آپ کے اصحاب میں تھے اور بڑے خوش خط تھے اس زمانے کی اکثر معتبر کتابیں جیسے کشاف اور مفصل وغیرہ سلطان جی کے لیے اپنے خط سے تیار کرا کر آپ کی خدمت میں بھجواتے۔ (۱) ایسے ہی فوائد الفواد اور افضل الفوائد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر زاہدی تنبیہ فقیہ ابو اللیث، تمہید ابو شکور سالمی اور اس طرح کی دوسری عربی کتابیں آپ کے زیر مطالعہ رہا کرتی تھیں۔

تجوید قرآن کا ذوق

سلطان جی کے بابا فرید سے تجوید قرآن کا درس لینے کا جو واقعہ پہلے گزرا ہے اس سے بھی آپ کے ذوق عربی زبان کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء خود عالم تھے، آپ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے بحاث اور صف شکن کہے جاتے تھے، اس کے باوجود آپ نے اپنے شیخ کی خدمت میں قرآن سیکھنے کی

---

(۱) باب پنجم در بیان مناقب وفضائل، کرامات بعضی یاران اعلی کہ بشرف ارادت وقربت سلطان المشائخ نظام الحق والشرع والدین مشرف و مخصوص گشتند، تذکرہ مولانا رکن الدین، ص: ۳۱۷

عرضی لگائی جسے شیخ مکرم نے قبول فرمایا، یقینا آپ کی عربی زبان اور تجوید وترتیل میں کوئی امتیازی خصوصیت رہی ہوگی جس کی وجہ سے آپ نے اس عمر میں اپنے شیخ سے قرآن سیکھنے کا فیصلہ کیا، بعد میں آپ نے اس امتیازی وصف کی صراحت بھی فرمائی کہ آپ کی زبان میں ایسی فصاحت و بلاغت تھی کہ دوسرے لوگ اس طرح ضاد نہیں ادا کر پاتے تھے۔

علمی ولغوی افادات

حضرت سلطان المشائخ سے جو بہت علمی دقائق منقول ہیں ان میں بہت سے نکات ایسے ہیں جو عربی زبان کے حوالے سے آپ کے علمی ولغوی ذوق کی شہادت دیتے ہیں، ایسے بہت سے نکات کو صاحب سیر الاولیا نے نقل کیا ہے۔ ان سے استفادہ کرتے ہوئے یہاں چند نکات درج کیے جاتے ہیں۔ حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں:

میں نے مولانا وجیہ الدین پائلی سے پوچھا: حدیث میں ہے: اصنعوا کل شیئ إلا النکاح، اس سے تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ نکاح حرام ہے، پھر اس حدیث کی کیا توجیہ ہوگی؟ انہوں نے کہا کہ آپ ہی بیان فرمائیں، میں نے کہا کہ صحابہ نے بارگاہ رسالت میں عرض کی کہ لوگ حالت حیض میں عورتوں سے بستر الگ کر لیتے ہیں، آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: اس حالت میں کمر کے اوپر عورتوں میں تصرف کرو۔ (سیر الاولیاء، تذکرہ خواجہ نظام الدین اولیاء، نکتۂ چہارم، ص: ۱۰۱)

یہ حدیث صحیح مسلم میں کتاب الحیض، باب جواز غسل الحائض کے عنوان کے تحت منقول ہے اور یہاں سلطان جی نے حدیث کی جو توضیح فرمائی ہے وہ کلمۂ نکاح کے لغوی معنی کے لحاظ سے فرمائی ہے اور آپ کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں نکاح کا شرعی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے وطی اور جماع مراد ہے اور لغت میں نکاح کا معنی وطی اور جماع ہوتا ہے اور مفہوم حدیث یہ ہے کہ وطی اور جماع کے علاوہ اس حالت میں سارے ازدواجی تعلقات کی اجازت ہے۔

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف جہاں آپ کی حدیث اور شرح حدیث پر نظر تھی وہیں آپ کی عربی لغت پر بھی نگاہ تھی۔

ایک مرتبہ سلطان جی نے فرمایا:

حدیث میں آیا ہے:

صوموا الشهر وسره (پورے ماہ کا روزہ رکھو)، اس حدیث کے بارے میں قاضی محی الدین کاشانی نے فرمایا کہ یہ حدیث غرائب میں سے معلوم ہو رہی ہے، اور اس کا معنی غامض ودقیق ہے، پھر سلطان جی نے اس کی ان الفاظ میں تشریح فرمائی:

الشهر في أصل الوضع اسم اليوم الأول الذي هو الغرة، سمي به لشهرته ثم اشتهر الشهر كله بحكم غلبة الاستعمال وقد أريد ههنا اليوم الأول بدلالة عطف السر عليه وهو اسم اليوم الآخر من الشهر، ومنه يقال سرار الشهر أو اخره۔ (ایضا،ص:۱۰۱،۱۰۲)

ترجمہ: اصل وضع کے لحاظ سے شہر کا لفظ مہینے کے پہلے دن کے لیے بولا جاتا ہے، مہینے کو شہر کہے جانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مشہور ہوتا ہے، پھر غلبہ استعمال کی وجہ سے پورے ماہ کے لیے شہر کا لفظ مشہور ہو گیا۔ یہاں حدیث میں شہر سے مراد مہینے کا پہلا دن ہے کیوں کہ لفظ سِرّ کا عطف شہر پر ہے اور سِرّ مہینے کے آخری دن کو کہتے ہیں، اسی وجہ سے سرار الشہر کا معنی مہینے کا آخر ہوتا ہے۔

یہ حدیث سنن ابوداؤد کی ہے جو کتاب الصوم کے تحت مذکور ہے، حدیث کی اس تشریح سے سلطان جی کی جہاں حدیث اور شروح حدیث پر نظر معلوم ہوتی ہے وہیں دو باتیں اور معلوم ہوتی ہیں جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔

پہلی بات یہ کہ آپ کی عربی لغت پر نگاہ تھی اور دوسری بات یہ کہ آپ کو عربی زبان پر تقریرا وتحریرا دونوں طرح سے قدرت حاصل تھی، کیوں کہ آپ نے اپنی مجلس میں حدیث کے الفاظ شہر اور سر کی شرح عربی میں فرمائی، اور جو اپنی مجلس میں عربی گفتگو کرسکتا ہو وہ عربی لکھنے پر بھی قادر ہوا کرتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک مجلس جس میں قاضی محی الدین کاشانی اور دیگر احباب موجود تھے سلطان جی نے یہ حدیث پڑھی: **إذا أكل أحدكم طعاما فلا يمسح يده حتى يَلْعَقَهَا** (یا کے فتحے کے ساتھ باب سمع یسمع سے) **أو يُلْعِقَهَا** (یا کے ضمے کے ساتھ باب افعال سے)۔

اس پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ بعض شارحین نے **يلعقها** (یا کے ضمے کے ساتھ باب افعال سے) کی شرح میں لکھا ہے: **يُلْعِقَهَا** غیرہ (دوسرے سے اپنا ہاتھ صاف کروائے)، یہ خطا ہے، روایت چوں کہ دو تھی، دوسری روایت باب افعال سے تھی اور باب افعال کی خاصیت تعدیہ ہے اس لیے انھوں نے یہ تشریح کی حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ باب افعال ہمیشہ متعدی ہی آتا ہو بلکہ باب افعال لازم بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **أولئك هم المفلحون** اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وأشرقت الأرض بنور ربها** ان آیات میں **مفلحون** اور **أشرقت** دونوں باب افعال سے ہیں اور لازم مستعمل ہیں، درحقیقت اس حدیث کی دونوں روایتوں کے معنی ایک ہی ہیں اور دو افعال کا ذکر راوی کے شک کی وجہ سے ہے۔ (ایضا،ص:۱۰۲)

سلطان جی کی اس گفتگو سے بھی چند باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ آپ کی احادیث اور ان کی عربی شروحات پر نظر تھی، دوسری یہ کہ آپ کی لغت پر دسترس تھی، تیسری یہ کہ آپ کی علم صرف پر اور خاصیات ابواب پر ایسی نظر تھی کہ اس پر قرآن کریم سے استدلال بھی کرتے تھے۔

تفسیر کشاف سے ایک افادہ

فوائد الفواد کی ایک اور مجلس سے بھی عربی زبان کے ساتھ آپ کے گہرے تعلق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، حسن علا سجزی کہتے ہیں:

تفسیر کشاف کا ذکر نکلا، فرمایا کہ الحمد للہ کی تفسیر کرتے ہوئے اس میں لکھا ہے کہ الحمد للہ دال کے زیر کے ساتھ حسن بصری کی قرات ہے اور زیر پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ دال لام کے ساتھ متصل ومجاور ہے اور لام کی حرکت مبنی بر کسر ہے، حسن بصری کے برخلاف حضرت ابرہیم کی قراءت الحمد للہ دال اور لام دونوں پر ضمے کے ساتھ ہے، اب یہ ابرہیم نخعی کی قراءت ہے یا کسی اور کی اللہ بہتر جانتا ہے، صاحب کشاف کا کہنا ہے کہ ابراہیم کی قراءت حسن بصری کی قراءت سے بہتر ہے کیوں کہ حسن بصری نے الحمد جو معرب ہے اس کے دال کے کسرے کو لام جر جو مبنی بر کسر ہے اس کے تابع قرار دیا ہے ان کے برعکس ابراہیم نے لام جر کو کلمۂ مفرد الحمد کے دال کی حرکت اعرابی کے تابع قرار دیا ہے اور جو حرکت کسی عامل کی وجہ سے پیدا ہو وہ مبنی کی حرکت سے قوی ہوتا ہے (گویا حضرت حسن بصری نے اقوی کو قوی کے تابع کیا جب کہ ابراہیم نے قوی کو اقوی کے، اس لیے حضرت ابراہیم کی قراءت بہتر ہوئی)۔ (فوائد الفواد، جلد سوئم، مجلس یازدہم، ص:۱۸۶)

یہ ابراہیم بن ابی عبلہ تابعی (مابعد ۶۰ھ-۱۵۲ھ) ہیں، کشاف میں ان کا پورا نام مذکور ہے۔ (دیکھیں: کشاف، تفسیر سورہ فاتحہ)

اس مجلس سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہے۔ پہلی بات یہ کہ کشاف جیسی تفسیر جو بلاغی نکات سے پر ہے اور خود اپنے آپ میں عربی زبان کا مرقع ہے، وہ آپ کے مطالعے میں تھی۔ دوسری یہ کہ آپ اعلی نحوی ذوق رکھتے تھے ورنہ خاص صوفیانہ مجالس میں اعرابی باتیں نہ فرماتے۔ تیسری یہ کہ آپ کو علم قراءت سے بھی دل چسپی تھی۔

ایک اور لغوی نکتہ

حسن علاء سجزی لکھتے ہیں کہ سماع اور اس میں پیدا ہونے والے وجد پر گفتگو شروع ہوئی، آپ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں الواجد اور الماجد بھی ہے۔ واجد کا معنی غنی ہے اس صورت میں واجد، وُجُدُ (واو کے ضمے کے ساتھ) جو وسعت وطاقت کے معنی میں ہے، اس سے مشتق ہوگا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ واجد کا معنی وجد (زبر سے) سے بھی آیا ہے، اور واجد کے معنی ہوں گے: وجد عطا فرمانے والا جیسے شکور اللہ تعالیٰ کا نام ہے، اور لغت میں شکور شکر کرنے والے کو کہتے ہیں لیکن یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی بندوں کا شکر قبول کرنے والا ہے۔ ایسے ہی واجد ظاہری معنی کے لحاظ سے صاحب وجد کو کہتے ہیں لیکن یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ وجد عطا فرمانے والا ہے۔ (ایضا، جلد اول، مجلس سی ویکم، ص:۵۶)

یہاں حضرت سلطان جی نے دوسرا معنی جو بیان فرمایا ہے اس کی اساس یہ ہے کہ علم صرف میں مجرد کی ایک خصوصیت اعطاے ماخذ بھی ہے۔اس لحاظ سے واجد کا معنی معطی وجد یعنی وجد عطا کرنے والا ہوگا۔

ایک لغوی افادہ

حسن علاء سجزی نقل کرتے ہیں کہ چوں کہ ایام تشریق تھے اس لیے لوگوں کی آمد ورفت زیادہ تھی اور اسی وجہ سے بار بار کھانا حاضر کیا جارہا تھا، اسی دوران آپ نے تفریح طبع کے طور پر فرمایا: ایک درویش سے پوچھا گیا کہ آپ کو قرآن کریم کی کون سی آیت محبوب ہے تو انہوں نے فرمایا: **أكلها دائم** (الرعد)

پھر آپ نے یہ علمی افادہ فرمایا:

اکل ہے (الف کے زبر کے ساتھ) اکل ہے (الف کے ضمے کے ساتھ) ایسے ہی اکلۃ ہے (الف کے فتحے کے ساتھ) اکلۃ ہے (الف کے ضمے کے ساتھ) پھر آپ نے ان چاروں کلمات کی شرح فرمائی کہ اکل (کھانا) مصدر ہے، اکل جو چیز کھائی جائے، اکلۃ ایک بار اور یک بارگی کھانا اور اکلۃ ایک نوالا۔ (فوائد الفواد، جلد چہارم مجلس سی وہفتم ،ص: ۲۹۴)

یہاں دیکھیں کہ آپ نے مختلف مشابہ الفاظ کے درمیان کس خوبی سے فرق کو واضح کیا ہے، یقیناً یہ آپ کے استحضار لغوی کی اعلیٰ دلیل ہے۔

ایک اور علمی ولغوی افادہ

حسن علاء سجزی نقل کرتے ہیں کہ قراءت قرآن پر گفتگو نکلی تو آپ نے فرمایا کہ ایک کتاب میں ایسے دو نکتے میں نے دیکھے ہیں جو دوسری کتابوں میں کم ہی دیکھے ہیں، ایک یہ کہ آیت کریمہ (وَ اِذَا رَاَیۡتَ ثَمَّ رَاَیۡتَ نَعِیۡمًا وَّ مُلۡکًا کَبِیۡرًا) میں مُلۡکًا (ضمے سے) کو امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ ملکا (میم کے زبر اور لام کے زیر سے) پڑھتے تھے، دوسرا یہ کہ آیت کریمہ: **لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ** کو آپ **اَنۡفَسِکُمۡ** پڑھتے تھے اور یہ نفیس کا اسم تفضیل ہے۔ (جلد پنجم مجلس چہارم ،ص:۳۷۹)

ایک لغوی نکتہ

حسن علاء سجزی نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ اس بات پر گفتگو شروع ہوئی کہ **العین حق و السحر حق** اس پر آپ نے فرمایا کہ یہ حق باطل کی ضد نہیں ہے (یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ نظر اور جادو حق ہے اور اس کا غیر باطل ہے) بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''اثرہ کائن'' (نظر اور جادو کا اثر ہوتا ہے) معتزلہ اسی کا انکار کرتے ہیں، چوں کہ جادو اور نظر کا اثر فوراً ظاہر نہیں ہوتا ہے اسی لیے اسے وہ خیالی اور وہمی چیز سمجھتے ہیں۔ (ج:۲،مجلس:۲۳،ص:۱۱۶)

یہاں غور کریں کہ سلطان جی نے کس خوبصورتی سے ایک چھوٹے سے عربی جملے میں حدیث کی ایسی شرح فرمائی کہ معتزلہ سے اہل سنت کا اختلاف بھی واضح ہو گیا اور لفظ حق کے جو دو مختلف معانی تھے ان کا فرق بھی سامنے آگیا۔

ایک اور لغوی نکتہ

جامع فوائد الفواد نقل کرتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "کنیفة العلم" یعنی خریطۂ علم (علم کا تھیلا) فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوتاہ قد مائل بہ درازی تھے۔ اس کے بعد فرمایا کہ چھوٹا تھیلا جسے فقرا سلتے ہیں اور اس کو "کِنفُ" کہتے ہیں وہ غلط ہے، وہ کنف نہیں کُنَیفُ ہے۔ (ج:۳، مجلس:۱۰، ص:۱۸۴)

یہاں پہ غور کریں کہ سلطان جی نے لفظ کنیفۃ العلم سے ابن مسعود کے کوتاہ قد مائل بہ درازی ہونے پر جو استدلال کیا ہے اور پھر چھوٹے تھیلے کو کنیف نہ کہہ کر کنف کہنے کی جو تغلیط فرمائی وہ یقینا لغوی نزاکتوں سے آپ کی آشنائی پر دلیل ہے۔ کیوں کہ کنیف تصغیر کا صیغہ ہے جو چھوٹے ہونے پر دلالت کرتا ہے لہٰذا حضرت ابن مسعود کو کنیف کہے جانے میں یقینا آپ کے پستہ قد ہونے پر دلیل ہے ایسے ہی چھوٹے تھیلے کو کنیف کا ہی نام دیا جانا چاہیے۔

ایک اور لغوی افادہ

حسن علا سجزی نقل کرتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ سے کسی نے عرس کا معنی پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

> عرس کا معنی شادی کرنا اور اس کے علاوہ عرس (باب تفعیل کا فعل ماضی) کا معنی قافلے کا رات میں پڑاؤ کرنا بھی ہوتا ہے (ج:۴، مجلس:۵، ص:۲۰۹)

یہاں بھی غور کریں کہ سلطان جی نے کس طرح عرس کے مادے سے مستخرج دو مختلف معانی کا ذکر فرمایا، پہلے تو آپ نے مجرد میں اس کا جو معنی تھا اس کا تذکرہ فرمایا اور پھر باب تفعیل جو مزید کے ابواب میں ہے وہاں اس لفظ کے پہنچنے کے بعد جو معنی پیدا ہو رہا تھا اسے بیان فرمایا۔ احادیث کے ذخیرے میں جو حدیث لیلۃ التعریس ہے وہاں تعریس کا یہی معنی ہے۔

ایک اور لغوی افادہ

حسن علاء سجزی نقل کرتے ہیں کہ حدیث رسول: **زر غبا تزدد حبا** کی تحقیق میں نے سلطان المشائخ سے چاہی تو آپ نے فرمایا کہ ہاں یہ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ جو بخار ایک روز ناغہ کرکے آتا ہے اسے غب (غین کے کسرے اور با کی تشدید) کہتے ہیں، اور حدیث کی مراد یہ ہے کہ ایک روز ناغہ کرکے ملاقات کیا کرو (ایضا، مجلس:۵۰، ص:۳۳۳)

یہاں غور کریں کہ سلطان المشائخ نے جس طرح سے حدیث کے لفظ غب کی لغوی شرح فرمائی اور پھر اس کا انطباق حدیث کے مفہوم پر کیا وہ جہاں اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی کتب شروح احادیث پر نظر تھی وہیں آپ کی لغوی وسیع نگاہی پر کھلی شہادت ہے۔

ایک اور لغوی افادہ

حسن علاء سجزی نقل کرتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے فرمایا: صبر کی تین قسمیں ہیں: الصبر عنھن، الصبر علیھن اور الصبر علی النار۔

پھر آپ نے اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

عورتوں سے صبر ہو یعنی ان سے دور رہے اور ان کی جانب میلان ہی نہ ہو۔ یہ سب سے بہتر ہے یہ الصبر عنھن ہے۔ اگر یہ نہ ہو سکے اور نکاح کرے اور غلام خریدے تو پھر ان کی تکلیفوں پر صبر کرے۔ یہ الصبر علیھن ہے اور اگر خدانخواستہ گناہوں میں گرفتار ہو جائے تو پھر الصبر علی النار ہوگا۔ (ایضا)

یہاں بھی دیکھیں کہ سلطان المشائخ نے جس طریقے سے صبر کا صلہ عن اور علی سے اس کے معانی کی تبدیلی کو واضح کیا ہے یہ جہاں لغت میں آپ کی دستگاہی پر دلیل ہے وہیں علم لغت کی ایک شاخ علم الصلات سے آپ کی واقفیت کی دلیل ہے۔

ایک اور لغوی افادہ

حسن علاء سجزی نقل کرتے ہیں کہ حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا کہ لفظ صبر کا معنی حبس اور قید بھی ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے: اصبروا الصابر واقتلوا القاتل، پھر آپ نے حدیث کا شان نزول بیان کیا اور پھر حکم بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جس نے قاتل سے بھاگنے والے شخص کو روکا ہے اس کو قید کر دو اور جس نے قتل کیا ہے اس کو بدلے میں قتل کر دو (ایضا مجلس: ۶۰، ص: ۳۵۳)

یہاں بھی ملاحظہ کریں کہ سلطان جی نے پہلے صبر کا لغوی معنی بیان کیا پھر آپ نے حدیث کا شان نزول بیان کیا اور پھر آپ نے اس کی روشنی میں مراد رسول کو واضح کیا، یقیناً اس سے جہاں علم حدیث میں آپ کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں آپ کی لغت پر دسترس کا بھی پتا چلتا ہے اور آپ کے ذوق عربی زبان کی بھی شہادت ملتی ہے۔

ایک اور لغوی افادہ

حسن علاء سجزی نقل کرتے ہیں:

ولایت اور ولایت پر گفتگو شروع ہوئی، آپ نے فرمایا کہ شیخ کو ولایت اور ولایت دونوں حاصل ہوتی ہے۔ ولایت (واؤ کے زبر کے ساتھ) یہ ہے کہ جب تائب ہو جائے اور اعمال صالحہ انجام دے تو اس سے بہت ذوق اٹھائے، (۱) ممکن ہے کہ دوسروں کو اللہ تک پہنچائے اور آداب طریقت

---

(۱) یہاں سے آگے ولایت بالکسر کا بیان ہے، اس لیے سیر الاولیاء میں ''ممکن آنست'' کے بجائے ''ولایت آنست'' لکھا ہے، یہ عبارت زیادہ صحیح اور مقصود کو زیادہ واضح کرنے والی معلوم ہوتی ہے

کی تعلیم دے۔ جو کچھ اس کے اور مخلوق کے درمیان ہے اسے ولایت (واؤ کے زیر کے ساتھ) کہتے ہیں اور جو کچھ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے اسے ولایت (واؤ کے زبر کے ساتھ) کہتے ہیں اور وہ خاص محبت ہے۔ جب شیخ کا دنیا سے انتقال ہو جاتا ہے تو اپنی ولایت (زبر کے ساتھ) اپنے ساتھ لے جاتا ہے، البتہ اپنی ولایت (زیر کے ساتھ) جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے اور اگر وہ خود نہ دے تو ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ دوسرے کو اس کی ولایت (زیر کے ساتھ) عطا کر دے لیکن جو ولایت (زبر کے ساتھ) اس کے پاس تھی اسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ (ایضا، ج:۱، مجلس:۱۴)

یہاں غور فرمائیں کہ سلطان جی نے کس لطافت کے ساتھ ولایت بالفتح اور بالکسر کے فرق کو واضح فرمایا ہے۔ کتب لغت اور تفاسیر میں متعلقہ قرآنی کلمات کے ذیل میں اس کی صراحت اور اس کی جانب اشارہ موجود ہے۔

ولایت اور ولایت کے فرق کی تحقیق

ایک بات یہاں قابل توجہ یہ ہے کہ فوائد الفواد کا جو محقق نسخہ ہمارے پیش نظر ہے اس میں حسن علاء سجزی کی جانب سے ولایت اور ولایت کے درمیان فرق کرتے ہوئے لفظی طور پر ایسی کوئی وضاحت نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ سلطان جی نے کس کو ولایت بالفتح فرمایا اور کس کو بالکسر، البتہ مطبوعہ نسخے میں لفظ ولایت پر زبر زیر ڈال کر اس کی وضاحت کی گئی ہے، اعراب لگانے کی وجہ سے جو فرق سمجھ میں آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلطان جی تعلق مع الخلق کو ولایت بالفتح اور تعلق مع اللہ کو ولایت بالکسر فرما رہے ہیں۔

دوسری طرف جہاں سلطان جی نے فرمایا کہ ''شیخ را ہم ولایت باشد و ہم ولایت'' اس عبارت کے ترجمے میں اولا تو فوائد الفواد کے مترجم نے یہ ترجمہ کیا: ''شیخ کے لیے ولایت بفتح واؤ بھی ہوتی ہے اور ولایت (بکسر واؤ) بھی''۔ (فوائد الفواد، مترجم، ص:۱۸۱)

یہاں مترجم نے بفتح واؤ کا اضافہ اصل ترجمے میں اپنی جانب سے کیا ہے، فوائد کا جو محقق نسخہ ہمارے پیش نظر ہے اور جس کا عکس ترجمے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، اس میں ''شیخ را ہم ولایت باشد'' والے جملے میں لفظ ولایت کے بعد بفتح واؤ کا لفظ موجود نہیں ہے، ظاہر ہے کہ یہ مترجم کا اپنا اجتہاد ہے جو در حقیقت متن میں فارسی نسخے کے محقق کی جانب سے لفظ ولایت پر زبر اور زیر لگانے کی وجہ سے سامنے آیا ہے، لیکن اس میں علمی خطا یہ ہے کہ ''بفتح واؤ'' والا کلمہ قوسین کے درمیان ہونا چاہیے تھا جیسا کہ انہوں نے ''بکسر واؤ'' والے کلمے میں کیا ہے۔

ثانیاً فارسی متن کے محقق کی طرح مترجم نے بھی بعد میں لفظ ولایت پر زبر زیر لگایا ہے اور اس کے نتیجے میں یہی بات سامنے آتی ہے کہ سلطان جی کے نزدیک ولایت اور ولایت میں فرق یہ ہے کہ اگر لفظ ولایت بالفتح ہو تو تعلق مع الخلق کہلائے گا اور اگر بالکسر ہو تو تعلق مع اللہ کہلائے گا۔

سیر الاولیاء میں بھی یہ ملفوظ کچھ اختصار کے ساتھ لیکن زیادہ واضح لفظوں میں موجود ہے، ہمارے پیش نظر سیر الاولیاء کے دو نسخے ہیں: ایک مخطوطے کا عکسی ایڈیشن، جسے خواجہ حسن ثانی نظامی نے نومبر ۲۰۱۰ء میں دہلی سے شائع کیا تھا اور دوسرا مطبع محب ہند کا چرنجی لال ایڈیشن۔

پہلے نسخے میں صفحہ ۵۴۵، ۵۴۶ پر یہ ملفوظ فوائد الفواد کی بہ نسبت اختصار کے ساتھ مفہوماً منقول ہے اور اس میں کہیں بھی نہ تو لفظ ولایت کے بعد بالفتح یا بالکسر کا اضافہ موجود ہے اور نہ ہی زبر زیر لگایا گیا ہے، اس لیے از روئے لفظ کوئی نتیجہ نکالنا مشکل ہے کہ سلطان جی نے کسے تعلق مع الخلق کہا اور کسے تعلق مع اللہ۔

چرنجی لال ایڈیشن میں بھی لفظی طور پر ایسی کوئی دلیل نہیں جس سے یہ متعین کیا جا سکے کہ سلطان جی نے کسے ولایت بالفتح کہا اور کسے بالکسر، البتہ اس نسخے میں لفظ ولایت پر ہر جگہ زبر زیر لگا کر فرق کر دیا گیا ہے۔ زبر زیر لگانے کی بنا پر سیر الاولیاء سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سلطان جی نے تعلق مع الخلق کو ولایت کسرے کے ساتھ اور تعلق مع اللہ کو ولایت فتحے کے ساتھ بتایا۔ (باب ششم، نکتہ در بیان ولی وِلایت ووَلایت، ص: ۳۵۱)

اتنی تفصیلات کے بعد مقالہ نگار عرض کرتا ہے کہ سیر الاولیاء کے چرنجی لال ایڈیشن کے مطابق ولایت بالفتح و بالکسر کے درمیان جو فرق سامنے آ رہا ہے وہی عام اہل لغت اور مفسرین کے اقوال کی روشنی میں صحیح ہے۔ کیوں کہ تمام اہل لغت کا اتفاق ہے کہ و ل ی کے مادے میں ولایت بالفتح اور بالکسر دونوں درست ہے، ولایت بالفتح اور بالکسر دونوں ایک دوسرے کی جگہ پر مستعمل ہیں کیوں کہ دونوں کا مادہ و ل ی ہے اور اس میں مصدر فعالۃ کسرے کے ساتھ اور فعالۃ فتحے کے ساتھ دونوں طرح وارد ہے البتہ دونوں میں فرق کرتے وقت علمائے لغت وتفسیر نے جو فرق بیان کیا اس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

علامہ راغب اصفہانی (۵۰۲ھ) لکھتے ہیں:

الوَلَاءُ والتَّوَلِي: أن يَحْصُلَ شيئان فصاعدا حصولا ليس بينهما ما ليس منهما، ويستعار ذلك للقرب من حيث المكان، ومن حيث النّسبة، ومن حيث الدّين، ومن حيث الصّداقة والنّصرة والاعتقاد، والوِلَايَةُ النُّصْرةُ، والوَلَايَةُ: تَوَلِّي الأمرِ، وقيل: الوِلَايَةُ والوَلَايَةُ نحو: الدِّلَالة والدَّلَالة۔

ترجمہ: ولاء (واؤ کے زبر سے) اور تولی یہ ہے کہ دو یا اس سے زیادہ چیزیں اس طرح ہو جائیں کہ ان کے مابین غیر نہ رہ جائے، اس لفظ سے بطور استعارہ قرب کا معنی مراد لیا جاتا ہے خواہ وہ قرب مکان کے لحاظ سے ہو یا نسب کے لحاظ سے، دین کی جہت سے ہو یا دوستی اور یاری کی جہت سے یا عقیدے کی۔ ولایت (کسرے کے ساتھ) امداد اور یاری کو کہتے ہیں اور ولایت (فتحے کے ساتھ) تولی امر یعنی کسی چیز کی ذمے داری اٹھانے کو کہتے ہیں، ایک قول ہے کہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں جیسے لفظ

دلالت (دال کے زبر سے) اور دلالت (دال کے زیر سے) دونوں طرح مستعمل ہے۔ (المفردات في غریب القرآن، کتاب الواو، مادہ: ول ی)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَٰهَدُوا بِأَموَا لِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِينَ ءَاوَوا وَّنَصَرُوا أُولَئِكَ بَعضُهُم أَولِيَاءُ بَعض وَالَّذِينَ ءَامَنُوا وَلَم يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَيَتِهِم مِّنْ شَيءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُم فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَٰق وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِير. (الأنفال: ٧٢)

ترجمہ: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی، یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت نہ کی تمھارے لیے ان کی دوستی اور میراث میں سے کچھ بھی نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد مانگیں تو تم پر مدد کرنا لازم ہے، مگر اس قوم کے خلاف کہ تمھارے درمیان اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہو اور اللہ اسے جو تم کر رہے ہو، خوب دیکھنے والا ہے۔

طبری اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

(من ولايتهم)، يعني: من نصرتهم وميراثهم (تفسیر طبری، الأنفال: ٧٢)

ابن منظور (٦٣٠ھ-٧١١ھ) لکھتے ہیں:

وقال الزجاج: يقرأ ولايتهم وولايتهم بفتح الواو وكسرها، فمن فتح جعلها من النصرة والنسب، قال: والولاية التي بمنزلة الإمارة مكسورة ليفصل بين المعنيين، وقد يجوز كسر الولاية؛ لأن في تولي بعض القوم بعضا جنسا من الصناعة والعمل، وكل ما كان من جنس الصناعة نحو القصارة والخياطة فهي مكسورة۔ (لسان العرب، فصل الواو، مادہ: ول ی)

ترجمہ: زجاج نے کہا: ولایت اور ولایت فتحے اور کسرے کے ساتھ، دونوں طرح قراءت ہے، جن لوگوں نے فتحہ پڑھا ہے انھوں نے اسے نصرت و یاری (محبت و دوستی کا لازمی معنی) اور نسبی تعلق کے معنی میں لیا۔ زجاج نے کہا کہ وہ ولایت جو امارت کے معنی میں ہے وہ کسرے سے ہے تا کہ دونوں معنی میں فرق ہو سکے، اور نصرت و یاری کے معنی میں بھی کسرہ پڑھا جا سکتا ہے کیوں کہ ایک جماعت کی دوسری جماعت سے دوستی اور یاری ایک طرح کا عمل ہے اور جہاں بھی کسی لفظ سے کسی پیشے یا کاریگری کا اظہار ہو وہ کسرے کے ساتھ ہی استعمال ہوتا ہے جیسے قصارت (کپڑے دھونے کا پیشہ) خیاطت (کپڑے سلنے کا پیشہ)

علامہ مرتضی زبیدی بلگرامی (۱۱۴۵ھ-۱۲۰۵ھ) لکھتے ہیں:

فالولاية، بالفتح، في النسب والنصرة والعتق؛ والولاية بالكسر: في الإمارة (تاج العروس، مادہ: ولي)

ترجمہ: ولایت فتحے کے ساتھ نسبی قربت، نصرت و یاری اور آزادی کے تعلق کو کہتے ہیں۔

ابوعبید ہروی (۴۰۱ھ) لکھتے ہیں:

وقوله: {مالكم من ولايتهم من شيء} قال الأزهري: الولاية القرب في النسب والنصرة، وأما الولاية فهي كل الإمارة، يشبه بالصناعة۔ (۱)

ترجمہ: ازہری نے کہا: ولایت (فتحے کے ساتھ) نسبی تعلق، نصرت و یاری اور آزادی میں ہوتی ہے۔ اور جہاں تک ولایت (کسرے کے ساتھ) کی بات ہے تو یہ مکمل طور سے امارت کے معنی میں ہے اور پیشے والے الفاظ کے مشابہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هُنَالِكَ الْوَلَـٰيَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَخَيْرٌ عُقْبًا (الانفال: ۴۴)

اس آیت کی تفسیر میں طبری لکھتے ہیں:

واختلفت القرّاء في قراءة قوله الولاية، فقرأ بعض أهل المدينة والبصرة والكوفة (هُنَالِكَ الْوَلايَةُ) بفتح الواو من الولاية، يعنون بذلك هنالك المُوالاة لله، كقول الله: اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا وكقوله: ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا يذهبون بها إلى الوَلاية في الدين. وقرأ ذلك عامَّة قراء الكوفة (هُنالِكَ الوِلايَةُ) بكسر الواو: من الملك والسلطان۔ (تفسیر طبری: کہف: ۴۴) ارشاد باری: ''الولایۃ'' کی قراءت میں قراء کا اختلاف ہے، بعض اہل مدینہ، بصرہ اور کوفہ کی قراءت ولایت واؤ کے فتحے کے ساتھ ہے، ان لوگوں نے یہاں موالات ربانی یعنی ربانی دوستی مراد لیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ مومنوں کا ولی ہے، اور جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ مومنوں کا مولی ہے۔ یہ قراء یہاں ولایت دینی مراد لیتے ہیں، عام قراء کوفہ نے ولایت واؤ کے کسرے سے پڑھا ہے جو ملک وسلطنت کے معنی میں ہے۔

صاحب کشاف زمخشری (۵۰۳ھ) لکھتے ہیں:

الْوَلايَةُ بالفتح النصرة والتولي، وبالكسر السلطان والملك۔ (کشاف، کہف: ۴۴)

ترجمہ: ولایت فتحے کے ساتھ نصرت و یاری اور دوستی کے معنی میں ہے، اور کسرے کے ساتھ سلطنت اور حکومت کے معنی میں ہے۔

---

(۱) حذف وتغیر کے ساتھ، الغریبین فی القرآن والحدیث، مادہ: ول ی

علامہ قرطبی (۶۷۱ھ) لکھتے ہیں:

وقیل: الولایة بالفتح من الموالاة; کقوله الله ولي الذین آمنوا. ذلك بأن الله مولی الذین آمنوا. وبالکسر یعني السلطان والقدرة والإمارة;. وقال أبو عبید: إنها بفتح الواو للخالق، وبکسرها للمخلوق۔ (الجامع لأحکام القرآن، کہف: ۴۴)

ترجمہ: ایک قول ہے کہ ولایت فتحے کے ساتھ موالات کے معنی میں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ مومنوں کا ولی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ مومنوں کا مولی ہے، ولایت کسرے کے ساتھ سلطنت، قدرت اور امارت کے معنی میں ہے، ابوعبید کا قول ہے: ولایت واؤ کے فتحے کے ساتھ جب کہ اس کا تعلق خالق سے ہو اور کسرے کے ساتھ جب اس کا تعلق مخلوق سے ہو۔

ان تمام اہل لغت وتفسیر کے اقوال سے واضح ہو گیا کہ ولایت فتحے کے ساتھ تعلق مع اللہ دوستی اور قرب کے معنی میں ہے جب کہ ولایت کسرے کے ساتھ تعلق مع الخلق جس میں امارت وتربیت شامل ہے، کے معنی میں ہے۔

اس بات کی تائید عمرو بن الجموح کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لَا یَحِقُّ الْعَبْدُ حَقَّ صَرِیحِ الْإِیمَانِ حَتَّی یُحِبَّ لِلَّهِ، وَیُبْغِضَ لِلَّهِ، فَإِذَا أَحَبَّ لِلَّهِ، وَأَبْغَضَ لِلَّهِ، فَقَدِ اسْتَحَقَّ الْوَلَاءَ مِنَ اللهِ۔** (مسند احمد، مسند المکیین، حدیث عمرو بن الجموح)

ترجمہ: جب تک بندہ اللہ ہی کے لیے محبت اور اسی کے لیے دشمنی نہ رکھے اس وقت تک وہ صریح ایمان تک نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ جب وہ اللہ کے لیے محبت کرتا ہے، اسی کے لیے دشمنی رکھتا ہے تو وہ اللہ کی خاص محبت اور خاص دوستی کا مستحق ہو جاتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

لَا یَحِقُّ الْعَبْدُ صَرِیحَ الإِیمَانِ حَتَّی یُحِبَّ لله، وَیُبْغِضَ لله، فَإِذَا أَحَبَّ لله -تَبَارَكَ وَتَعَالَی- وَأَبْغَضَ لله، فَقَدْ اسْتَحَقَّ الْوَلَایَةَ مِنَ الله۔ (مجمع الزوائد، ہیثمی، کتاب الایمان، باب من الایمان الحب للہ والبغض للہ)

ان دونوں روایتوں میں لفظ ولاء اور ولایت فتحے کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

اس لیے مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق سلطان جی کے ملفوظ میں جہاں تعلق مع الخلق کی بات کی گئی ہے وہاں ولایت بالکسر پڑھا جانا چاہیے اور جہاں تعلق مع اللہ کی بات کی گئی ہے وہاں ولایت بالفتح پڑھا جانا چاہیے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مندرجہ بالا تمام افادات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی لغت، نحو، حدیث، شروح حدیث، عقائد وکلام اور اختلاف قراءات پر وسیع نظر تھی اور آپ کی علمی مجلسوں میں اس طرح کی علمی ولغوی ونحوی باتیں بھی زیر بحث آیا کرتی تھیں۔

عربی نثر پارے

آپ کے عربی نثر پاروں کے حوالے سے ہمارے پاس دو مستند ماخذ ہیں پہلا فوائد الفواد اور دوسرا سیر الاولیاء۔ اور ایک تیسرا ماخذ افضل الفوائد ہے جس کے جامع حضرت امیر خسرو ہیں۔ فوائد الفواد اور افضل الفوائد میں جو نثر پارے آپ کی زبان مبارک پر جاری ہوئے ان میں قرآنی آیات، احادیث، اقوال مشائخ اور بعض طبع زاد عربی اقوال ہیں، ایسے ہی سیر الاولیاء کے مطالعے سے آپ کے عربی نثر پارے جو سامنے آتے ہیں وہ تین طرح کے ہیں:

۱۔ مختصر عربی شہ پارے۔

۲۔ طبع زاد عربی اقوال۔

ان دونوں کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم مجالس میں ذکر کردہ مختصر نثری شہ پاروں اور طبع زاد اقوال پر مشتمل ہے جب کہ دوسری قسم ان مختصر نثری شہ پاروں اور طبع زاد اقوال کی ہے جن کو سلطان المشائخ نے اپنی ذاتی بیاض میں محفوظ کر رکھا تھا اور وہیں سے امیر خورد کرمانی نے سیر الاولیاء میں ''بخط سلطان المشائخ نبشتہ دیدم'' کہہ کر نقل کیا ہے۔

۳۔ وہ اقوال جن کا تعلق دوسرے مشائخ سے ہے اور اسے سلطان المشائخ نے اپنی مجالس میں نقل کیا یا پھر ذاتی بیاض میں اسے نقل کیا اور وہاں سے امیر خورد نے سیر الاولیاء میں مذکورہ بالا الفاظ کے ساتھ نقل کیا۔

آپ کے ملفوظات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ آپ اپنی مجالس میں بسا اوقات عربی زبان میں مختصر گفتگو فرماتے تھے، آپ کی یہ گفتگو کبھی تو قرآنی آیات و احادیث پر مشتمل ہوتی اور کبھی دیگر بزرگوں کے اقوال پر اور کبھی آپ کے طبع زاد جامع اقوال پر۔ آپ کے منہج کلام کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عموماً اگر آپ کسی دوسرے کا قول اپنی مجالس میں نقل فرماتے ہیں تو قائل کا نام ذکر فرما دیتے۔

آپ کی مختصر عربی تحریریں مختلف علمی و روحانی موضوعات سے متعلق ہیں جو رشد و ہدایت کا خزانہ ہونے کے ساتھ عربی زبان و ادب کا سادہ و رنگین شاہ کار ہیں۔ جہاں تک آپ کے طبع زاد اقوال کی بات ہے تو وہ عموماً مختصر اقوال کی شکل میں ہیں جو آپ کی زبان مبارک پر مختلف مواقع پر جاری ہوئے ہیں۔ اور اپنے اندر کمال کی جامعیت لیے ہوئے ہیں۔

ان میں اگرچہ قرآنی آیات اور احادیث طیبہ کے نصوص کا آپ کی مجالس میں پڑھا جانا یا تحریروں میں ذکر کیا جانا بھی عربی سے آپ کے تعلق پر ایک واضح دلیل ہے لیکن یہاں ان آیات و احادیث کے ذکر کا کوئی خاص فائدہ نہیں کیوں کہ مشائخ کی مجالس و تحریرات کی تو عمومی خصوصیت ہی یہی ہے کہ وہ قرآنی و حدیثی نصوص سے پر ہوتی ہیں۔ البتہ ذیل میں فوائد الفواد، سیر الاولیا اور افضل الفوائد سے آپ کے عربی نثر پاروں کے نمونے کے طور پر آپ کی مختصر عربی تحریروں، دوسرے مشائخ کے نقل کردہ اقوال اور آپ کے طبع زاد عربی اقوال کو پیش کیا جا رہا ہے۔

۱-مختصر عربی تحریریں

امیر خورد کرمانی سیر الاولیاء میں حضرت ابوبکر کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ میں نے سلطان المشائخ کے قلم سے یہ لکھا ہوا دیکھا ہے:

لقب أبو بکر بالعتیق، قیل لجماله، و قیل لقوله علیه السلام: أنت عتیق الله من النار، قالت عائشة: کان لأبي قحافة ثلاثة ولد: عتیق و معتق و معتق۔ (دیباچہ،ص:۴)

ترجمہ: حضرت ابوبکر کا لقب عتیق ہے، ایک قول ہے کہ آپ کے حسن و جمال کی وجہ سے آپ کو یہ لقب دیا گیا، ایک قول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی وجہ سے کہ تم اللہ کی طرف سے جہنم سے آزاد ہو، یہ لقب عطا کیا گیا۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ ابوقحافہ کے تین بیٹے تھے، عتیق، معتق اور معتق۔

امیر خورد حضرت ابوبکر کے تذکرے میں ہی لکھتے ہیں کہ میں نے حضرت سلطان المشائخ کے قلم سے یہ تحریر لکھی ہوئی دیکھی:

لما مات أبو بکر رضي الله عنه قام علي رضي الله عنه علی الباب الذي مسجی فیه فقال: کنت والله یعسوبا للدین أولا حین یفر الناس عنه وآخرا حین فشلوا، کنت کالجبل لا تحرکه العواصف ولا تزیله القواصف، الیعسوب فحل النحل لأنه سابق فیما اختلفت آرائهم في قتال مانعي الزکاة، العاصف الریح الکاسرة۔ (دیباچہ سیر الاولیاء،ص: ۴،۵)

ترجمہ: جب حضرت ابوبکر کا انتقال ہو گیا تو جس گھر میں ان کی نعش مبارک کفن میں رکھی تھی اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر حضرت علی نے فرمایا: آپ دین کے لیے ابتدا میں بھی اس وقت یعسوب تھے جب کہ لوگ دین سے فرار اختیار کر رہے تھے اور آخر میں بھی یعسوب تھے جب کہ لوگ کمزور پڑ گئے تھے۔ آپ پہاڑ کی طرح تھے جس کو سخت آندھی بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ یعسوب شہد کی مکھی کے نر کو کہتے ہیں جیسے وہ مکھیوں کا قائد اور ہر معاملے میں پیش پیش رہنے والا ہوتا ہے ایسے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی مانعین زکات سے جنگ جس کے سلسلے میں صحابہ کرام کی آرا مختلف ہو گئی تھی، اس میں سبقت کرنے والے اور قیادت فرمانے والے تھے۔ عاصف تیز ہوا کو کہتے ہیں۔

اولا سلطان المشائخ کی یہ تحریر ان کی قدرت تحریر پر شاہد ہے، کیوں کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اس بات کو مختلف مؤرخین نے ذکر کیا ہے اور آپ نے اسی واقعے کو فصاحت و بلاغت کے ساتھ اسلوب ایجاز کی رعایت کرتے ہوئے اپنے لفظوں میں ذکر کیا ہے۔ ثانیا آپ نے لفظ یعسوب کی جس ایجاز کے ساتھ شرح فرمائی ہے اور پھر سیدنا ابوبکر کو یعسوب کہے جانے کی جو وجہ بیان فرمائی وہ آپ کے قدرت تعبیر پر ایک دوسری دلیل ہے۔

امیر خورد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے تذکرے میں نقل کرتے ہیں کہ میں نے سلطان المشائخ کے قلم سے یہ تحریر لکھی دیکھی: قال علي يوم الخيبر:

أنا الذي سمتني أمي حيدرة

كليث غابات كريه المنظرة

أوفيهم بالصاع كيل السندرة

سمته أمه أسدا باسم أبيها - وهي فاطمة بنت أسد - وأبو طالب غائب، فلما قدم كرهه وسماه عليا، الحيدر من أسماء الأسد، والسندرة مكيال كبير، (يعني) أقتلهم قتالا واسعا، قالت عائشة رضي الله عنها يوم الجمل حين أدنى من هودجها، ثم كلمها بكلام: ملكت فأسجح، فبعث معها أربعين إمرأة حتى قدمت المدينة، شعر:

فردي فؤادي أو أثيبي ثوابه

فقد يملك المرء الكريم فيسجح(۱)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خیبر کے روز فرمایا:

میں وہ ہوں جس کا نام میری ماں نے حیدر رکھا ہے، میں جنگل کے شیر کی طرح دشمنوں کے لیے خوفناک ہوں، میں ان سے پورا پورا انتقام لوں گا۔

حضرت علی کا نام ان کی والدہ فاطمہ بنت اسد نے اپنے والد کے نام پر اسد رکھا تھا، اس وقت جناب ابوطالب موجود نہیں تھے جب وہ آئے تو ان کو یہ نام پسند نہیں آیا اور ان کا نام علی رکھ دیا۔ حیدر شیر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور ''سندرہ'' ناپنے کا ایک بڑا پیمانہ ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ میں ان سے خوب لڑوں گا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ھودج کے قریب پہنچے اور ان سے گفتگو کی تو ام المؤمنین نے فرمایا: تم گفتگو میں مجھ پر غالب آ گئے ہو، تو عفو و درگزر سے کام لو، چناں چہ حضرت علی نے ان کی مشایعت کے لیے مدینہ تک چالیس عورتوں کو بھیجا۔ شعر

یا تو میرا دل مجھے لوٹا دو یا اس کا حسن جزا دو، اس لیے کہ کریم جب غالب آتا ہے تو احسان سے کام لیتا ہے۔

سلطان جی کی یہ تحریر آپ کی عربی زبان پر قدرت کے حوالے سے کئی حقائق بیان کرتی ہے:

اولا یہ کہ آپ فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کے بیان پر قادر تھے اور عموما آپ اسلوب ایجاز کو پسند فرماتے تھے۔

---

(۱) دیباچہ، ص:۹

ثانیاً یہ کہ عربی زبان کے شعری دواوین آپ کی نظر میں تھے جیسا کہ عربی کے دو اشعار کے نقل سے معلوم ہوتا ہے۔

سیر الاولیاء میں صرف تین مصرعے ہیں، ممکن ہے کہ اصل میں ایسا ہی لکھا رہا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ امیر خورد سے نقل میں رہ گیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ نسخہ نویسوں سے لکھنے میں چھوٹ گیا ہو۔

ثالثاً یہ کہ آپ نے پہلے یہ بتایا کہ شیر کے ناموں میں ایک نام حیدر بھی ہے پھر سندرہ کا لغوی معنی بتایا اور پھر اس کا مرادی معنی بھی ذکر فرمایا، یہ لغت سے آپ کی آگاہی کی دلیل ہے۔

رابعاً یہ کہ آپ کی فن غریب الحدیث سے واقفیت تھی اور اس فن پر مہارت کے لیے لغت اور قدمائے عرب کے کلام پر گہری نظر کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لغت اور کلام عرب پر آپ کی عمیق نظر تھی، کیوں کہ آپ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول (**ملکت فأسجح**) کی توضیح میں شاہد کے طور پر مخضرم شاعر ابن مقبل (۶۵۷ء) کے شعر کو نقل کیا ہے۔

امیر خورد نقل کرتے ہیں کہ میں نے سلطان المشائخ کے قلم سے یہ جملہ لکھا ہوا دیکھا:

إني بلغت هذه الليلة أربعين سنة فاستحيت من سني، ذكرني ذبابا۔ (تذکرہ سلطان المشائخ، نکتہ نہم، ص: ۱۲۶)

ترجمہ: میں آج کی شب چالیس سال کا ہو گیا مجھے اپنی عمر سے حیا آئی، رب تعالیٰ نے مکھی کے برابر میرا ذکر فرمایا۔

امیر خورد آگے لکھتے ہیں: راقم الحروف کا خیال ہے کہ سلطان جی نے عربی عبارت میں جس شب کا ذکر کیا ہے یہ وہی شب ہے جس میں بارگاہ الٰہی سے آپ کو یہ اعزاز عطا ہوا کہ اے نظام الدین! جس مومن نے تمہارا دیدار کر لیا میں نے اسے بخش دیا۔ (ایضا)

ایک سے زائد مشائخ سے استفادے کے مسئلے پر حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں:

فإن قال قائل: إنا رأينا المشايخ استفادوا عن غير شيخ واحد كأبي عثمان فإنه كان متمسكا بمتابعة يحيى الرازي وبعده رغب في صحبة شاه الكرماني ثم اتبع أباحفص الحداد وبلغ مبلغ الرجال وأنت قد تحجرت واسعا؟ (قلت) : اعلم أن تعلق الإرادة تعلق لا يشترك فيه غيره وتعلق التربية يشترك فيه غيره فإنه يمكن أن يربي الصبي غير الوالدين فيه صفة الظئر، إلا أن يموت الشيخ كما كان حال الشيخ أبي النجيب السهروردي لما مات شيخه أحمد الغزالي استفاد بإشارته عن الشيخ حماد دباس. (باب ششم، نکتہ در بیان آن کہ بر مشائخ و پیرے بیعت کند، ص: ۳۲۷)

ترجمہ: اگر کوئی کہنے والا کہے: ہم نے مشائخ کو دیکھا ہے کہ انہوں نے ایک سے زیادہ شیوخ سے بھی استفادہ کیا ہے جیسا کہ حضرت ابوعثمان نے کیا، اس لیے کہ وہ پہلے تو یحییٰ رازی کی پیروی میں مضبوطی کے ساتھ لگے رہے اس کے بعد شاہ کرمانی کی صحبت کی طرف راغب ہوئے پھر ابوحفص حداد کی پیروی کی اور مردان خدا کے مقام تک پہنچے اور آپ نے تو یہ کہہ کر کہ ایک شیخ سے زیادہ سے استفادہ صحیح نہیں ہے ایک وسیع اور کشادہ چیز کو تنگ بنا دیا ہے۔ (میں جواب میں کہوں گا) یہ بات ذہن نشین کرلو کہ ارادت کا تعلق ایسا ہے جس میں غیر شریک نہیں ہوتا ہے اور تربیت کا تعلق ایسا ہے جس میں غیر بھی شریک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ممکن ہے کہ والدین کے علاوہ بچے کی تربیت کوئی ایسی ذات کرے جس کے اندر پالنے اور تربیت کی صلاحیت ہو۔ الا یہ کہ شیخ کی وفات ہوجائے جیسا کہ شیخ ابونجیب سہروردی کا حال رہا کہ جب ان کے شیخ احمد غزالی کا وصال ہوگیا تو ان کے اشارہ روحانی سے انہوں نے حضرت شیخ حماد دباس سے استفادہ کیا۔

شیخ کے اوصاف پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

أدنى حال الشيخ أن يكون موصوفا بأوصاف: أولها أن يكون مرادا حتى يمكنه تربية المريد، والثاني أن يكون سالما حتى يقدر على الدلالة، والثالث أن يكون مؤدبا حتى يؤدب، والرابع أن يكون جوادا غير ملتفت إلى الكون، والخامس أن لا يكون طامعا في مال المريد، والسادس إذا أمكنه العظة بالإشارة لا يعظه بالعبارة، والسابع إذا أمكنه التأديب بالرفق لا يؤدب بالعنف، الثامن ما أمر بفعله أمر المريد بفعله، والتاسع ما نهي عنه نهى المريد عنه وينزجر عنه، والعاشر إذا قبل المريد لله تعالى فلا يرده لأحد، فإن كان الشيخ بهذه الصفة لا يكون المريد إلا صادقا۔ (ایضا، نکتہ در بیان حال شیخ، ص: ۳۴۹)

ترجمہ: شیخ کا کم سے کم حال یہ ہے کہ وہ درج ذیل چند صفتوں سے متصف ہو پہلی صفت یہ کہ وہ مراد محبوب ہوتا کہ مرید کی تربیت کر سکے، دوسری یہ کہ وہ صحیح وسالم ہوتا کہ رہنمائی کر سکے، تیسری یہ کہ خود ادب یافتہ ہوتا کہ وہ ادب آموزی کر سکے، چوتھی یہ کہ سخی دل ہو، کائنات کی طرف التفات کرنے والا نہ ہو۔ پانچویں یہ کہ مرید کے مال میں اس کی طمع نہ ہو۔ چھٹی یہ کہ جب تک اشارے سے نصیحت ممکن ہو صریح لفظوں میں وعظ ونصیحت نہ کرے، ساتویں یہ کہ جب تک نرمی سے تادیب ممکن ہو، سختی سے اس کام کو انجام نہ دے۔ آٹھویں یہ کہ جس کام کے کرنے کا اسے حکم دیا گیا ہو اسی کو انجام دینے کا حکم مرید کو بھی دے۔ نویں یہ کہ جس چیز سے اسے روکا گیا ہے اسی چیز سے مرید کو بھی منع کرے اور اس سے خود بھی رکے، دسویں یہ کہ جب اللہ کے لیے مرید کو قبول کرلے تو اس کو کسی کی وجہ سے رد نہ کرے۔ اگر شیخ ان صفات سے متصف ہوگا تو مرید بھی صادق ہوگا۔

قرب ربانی کے حصول کے لیے شیخ کی حاجت کو سنت الٰہیہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقد جرت السنة الإلهية ألاتخرج شيئا من عالم الغيب إلي الشهادة إلا بواسطة كقول ابن مسعود بعد ما سأل النبي عليه السلام وأبو بكر رضي الله عنه اللبن: أنا مؤتمن لست بساقيكما ،فدعا شاة لم ينز عليه فحل وشرب، ما استخرج اللبن إلا بالضرع مع أن الله قادر على إبلاغه من غير ضرع، وأن أباهريرة أسلم زمن خيبر فلازم النبي عليه السلام ثلث سنين وقد زادت روايته على رواية من لازم مدة عمره، وبسط كسائه مشهور فكيف ينكر على من أودع أسراره في كساء أبي هريرة أودع أسرارا في خرقة ألبسها عليا كرم الله وجهه، قالت عائشة رضي الله عنها: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم غداة وعليه مرط من شعر أسود، فجاء الحسن فأدخل معه، ثم الحسين فأدخله معه، ثم قال: إنما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت ويطهركم تطهيرا.أنظر السنة الإلهية بإذهاب الرجس بإدخال النبي عليه السلام تحت مرط۔ (ایضاً،نکتہ در بیان کرامت،ص:۳۵۲)

ترجمہ: سنت الٰہیہ یہ جاری ہے کہ وہ عالم غیب سے عالم شہادت میں ہر شئ کو واسطے سے ہی ظاہر فرماتا ہے ۔جیسے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دودھ مانگا تو انہوں نے فرمایا: یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں۔ میں آپ دونوں کو ان کا دودھ نہیں پلا سکتا۔ چناں چہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بکری منگوائی جو اب تک حاملہ نہیں ہوئی تھی اور آپ نے اس کا دودھ پیا۔ یہاں پر غور کریں کہ دودھ تھن سے ہی نکلا باوجود یکہ اللہ تبارک وتعالیٰ بغیر تھن کے بھی دودھ پہنچانے پر قادر ہے۔ایسے ہی حضرت ابو ہریرہ خیبر کے زمانے میں اسلام لائے ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں لگا تار تین سال رہے اوران کی روایت حدیث ان لوگوں کی روایت سے زیادہ رہی جنہوں نے پوری زندگی حضور کی صحبت اختیار کی ، دامن پھیلانے کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ کا واقعہ مشہور ومعروف ہے۔جنہوں نے حضرت ابو ہریرہ کے دامن میں اپنے اسرار ڈال دیے، کیسے اس ذات گرامی کے حوالے سے اس بات کا انکار کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اس خرقہ میں اسرار ودیعت فرمادیے جو آپ نے حضرت علی کو پہنایا تھا۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت اس حال میں نکلے کہ آپ کے جسم مبارک پر کالے اون کی چادر تھی ، امام حسن آئے ان کو آپ نے اپنی چادر میں داخل فرمالیا۔ پھر امام حسین آئے ان کو بھی داخل کرلیا، پھر فرمایا: بے شک اے اہل بیت !اللہ تعالیٰ تم سے ہر قسم کے رجس کو دور کرنا چاہتا ہے۔سنت الٰہیہ میں غور کیجیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجس سے پاک کرنے کے لیے حضرات اہل بیت کو اپنی چادر میں داخل فرمایا۔

نماز کے سلسلے میں نکتہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

المصلي ببدنه دون قلبه فهو داخل تحت قوله: فويل للمصلين، والمصلي ببدنه و قلبه فهو داخل تحت قوله: قد أفلح المؤمنون، وان السلف يجربون الرجل في صلاته، فإن أتمها آخاه و أمنه الوعظ۔ (باب ہفتم، نکتہ در بیان صلاۃ، ص: ۳۹۳)

ترجمہ: جو صرف اپنے قالب سے نماز ادا کرتا ہے اپنے قلب سے نہیں وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان فویل للمصلین کے تحت داخل ہے اور جو اپنے قلب و قالب دونوں سے نماز ادا کرتا ہے وہ فرمان ربانی قد افلح المؤمنون کے تحت داخل ہے۔ اور اسلاف کسی بھی شخص کی پرکھ نماز سے ہی کیا کرتے تھے۔ اگر وہ نماز کو مکمل رکھتا تو اس سے رشتۂ اخوت قائم کرتے اور وعظ و نصیحت کے سلسلے میں اس کو مامون سمجھتے۔

روزہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الصوم للمسيئ جنة و للمحسن جنة، عن ذو النون: إذا أردت أن تذهب قساوة قلبك فأدم الصيام و أطل القيام و إن بقيت فالطف الأيتام۔ (ایضا، نکتہ در بیان صوم، ص: ۴۰۲)

ترجمہ: روزہ گنہگاروں کے لیے ڈھال ہے اور اچھے اعمال کرنے والوں کے لیے بھی ڈھال ہے۔ حضرت ذوالنون مصری سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے دل کی قساوت دور ہو جائے تو ہمیشہ روزہ رکھو اور راتوں کو طویل قیام کرو پھر بھی قساوت باقی رہ جائے تو یتیموں کے ساتھ لطف و مہربانی کے ساتھ پیش آؤ۔

صوفیہ کے لباس میں مختلف رنگوں کے اسرار پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الثوب الأبيض أولى لقوله عليه السلام خير ثيابكم البيض، وقال عليه السلام: البسوا الثياب الأبيض فإنها أطيب و أطهر و كفنوا فيها موتاكم، إن المشايخ اختاروا الأزرق للمريد لثلاثة معان، الأول: لكونه متحملا للوسخ ولايشوش الوقت لغسله، والثاني لأنه اختص بأهل المصائب وهم أهلها لتضييع الأوقات التي مضت في طلب غير الحق سبحانه تعالى۔ والثالث لأن من عاداتهم لبس الألوان المتلونة بلون الأنوار المشاهدة لهم۔ (ایضا، نکتہ در بیان کسوت اہل تصوف، ص: ۴۲۰)

ترجمہ: سفید کپڑا زیادہ بہتر ہے؛ کیوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تمہارا سب سے بہتر لباس سفید ہے اور آپ کا ارشاد ہے: سفید کپڑے پہنو اس لیے کہ وہ زیادہ پاکیزہ اور طہارت والا ہے اور اس میں اپنے مردوں کو کفن دو۔ مشائخ نے مریدوں کے لیے تین باتوں کی وجہ سے نیلے کپڑے کو پسند کیا ہے۔ پہلی یہ کہ نیلا کپڑا جلدی گندا نہیں ہوتا اور اس کی وجہ سے اس کے

دھلنے کی فکر میں وقت برباد نہیں ہوتا۔ دوسری یہ کہ نیلا رنگ مصیبت زدہ لوگوں کا خاص رنگ ہے اور مریدین مصیبت زدہ ہی ہوتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے غیر اللہ کی طلب میں اپنے اوقات گزار کر ضائع کر دیے۔ اور تیسری یہ کہ ان کی عادت ہے کہ وہ ایسے رنگوں کا لباس پہنتے ہیں جن رنگوں کے انوار کا ان کو مشاہدہ ہوتا ہے۔

دو خلوتوں کے درمیان فصل ہونا چاہیے یا نہیں اس سلسلے میں صوفیہ کی آرا قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بعض المشايخ اختاروا الخلوة على الدوام كأبي يعقوب يوسف الهمداني، والبعض اختاروا الفصل بين الخلوتين كأبي نجيب السهروردي، و روى الأول قوله عليه السلام: أحب الأعمال أدومها و إن قل، وقوله: يا فلان! لا تكن مثل فلان، كان يقوم الليل، ثم ترك قيام الليل، والثاني: كان عليه السلام يخلو بغار حراء أسبوعا أو أسبوعين، وقوله: إن لنفسك عليك حقا الحديث۔ (ایضا، نکتہ در بیان مشغولی ظاہر و باطن، ص: ۴۴۵)

ترجمہ: بعض مشائخ نے دائمی خلوت کو پسند کیا ہے۔ جیسے ابو یعقوب یوسف ہمدانی اور بعض نے دو خلوتوں کے درمیان فصل کو پسند کیا ہے، جیسے کہ ابو نجیب سہروردی۔ پہلے گروہ کے لوگوں نے حضور کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب وہ عمل ہے جس پر دوام برتا جائے اگر چہ وہ عمل تھوڑا ہو اور حضور کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اے فلاں! فلاں کی طرح نہ ہو جانا، وہ راتوں کو قیام کرتا تھا، پھر اس نے ترک کر دیا۔ دوسرے گروہ نے یہ روایت نقل کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں ایک ہفتہ یا دو ہفتہ خلوت گزین رہتے اور حضور کا یہ ارشاد بھی نقل کیا کہ تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے۔

اعمال صالحہ کو بارگاہ الٰہی میں قبولیت کی نیت سے انجام دینے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يا أيها الناس احتسبوا أعمالكم، فإن احتسب عمله كتب له أجر عمله حسبه، الاحتساب من الحسب كالاعتداد من العد، قيل: احتساب العمل أن تنوى به حسبة لله، والحسبة من الاحتساب كالعدة من الاعتداد۔

(ایضا، ص: ۴۵۰)

ترجمہ: اے لوگو! اپنے اعمال سے اس کے مقبول ہونے کی نیت رکھو، اگر کسی کا عمل اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہو گیا تو اسی کے اعتبار سے اس کے عمل کا اجر لکھا جائے گا۔ احتساب، حسب سے مشتق ہے۔ جیسے اعتداد، عد سے مشتق ہے۔ کہا گیا ہے کہ عمل کا احتساب یہ ہے کہ تم اسے اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہونے کے لیے انجام دو اور حِسبۃ، احتساب سے مشتق ہے جیسے عِدۃ، اعتداد سے مشتق ہے۔

محبت اوراس کے غوامض پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لما ماتت ليلى دخل المجنون مقبرتها وجعل يشم تراب قبر ليلى فقال: شعر

أرادا قعر قبرها عن محبته

فطيب تراب القبر دل على القبر

فأخذ من ذلك التراب بكفه وشم وصاح صيحة ومات فدفن عند قبرها۔

(باب ہشتم، نکتہ در بیان محبت وغوامض آن، ص: ۴۶۴)

ترجمہ: جب لیلی کی وفات ہوگئی تو مجنوں اس کے قبرستان میں گیا اور لیلی کے قبر کی مٹی سونگھنے لگا اور اس نے یہ شعر کہا۔

دونوں نے لیلی کی محبت کی وجہ سے اس کی قبر تک پہنچنا چاہا تو لیلی کے قبر کی مٹی کی خوشبو نے ان کو قبر تک پہنچا دیا۔

وہاں پہنچ کر اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کی مٹی اٹھائی، سونگھا اور ایسی چیخ ماری کہ مر گیا اور پھر اس کو لیلی کی قبر کے پاس ہی دفن کر دیا گیا۔

مذکورہ بالا شعر کو میں نے ادبی کتابوں میں تلاش کرنے کی کوشش تو یہ شعر اس طرح ملا:

أرادوا ليخفوا قبره عن عدوه

فطيب تراب القبر دل على القبر(۱)

ترجمہ: لوگوں نے اس کی قبر کو دشمنوں سے چھپانا چاہا تو قبر کی مٹی کی خوشبو نے اس کی قبر کا پتا بتا دیا۔

ممکن ہے کہ دونوں الگ الگ شاعر کا ہو اور مصرع ثانی میں توارد ہوا ہو یا ان میں سے کسی ایک شاعر نے حسب حال تبدیلی کر دی ہو۔

مومن کو حاصل ہونے والے انوار پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وللمؤمن عشرة أنوار: نور الروح ونور العقل ونور المعرفة، ونور العلم ونور اليقين، ونور التوفيق ونور البصر ونور الحيا ونور المحبة ونور الشوق. شعر:

شوقي إلى وجنات وجهك سيدي

شوق المريض إلى باب العافية(۲)

ترجمہ: مومن کو دس نور حاصل ہوتا ہے۔ نورِ روح، نورِ عقل، نورِ معرفت، نورِ علم، نورِ یقین، نورِ توفیق،

---

(۱) نهاية الأرب في فنون الأدب، ج:۲، ص:۸۸

(۲) سیر الاولیاء، باب ہشتم، نکتہ در بیان اشتیاق وشوق، ص:۴۶۶

نورِ بصیرت، نورِ حیا، نورِ محبت اور نورِ شوق۔ شعر

میرے محبوب! میرا شوق واشتیاق آپ کے رخ کی تابشوں کے لیے ایسے ہی ہے جیسے مریض کا اشتیاق مقام عافیت کے لیے ہوتا ہے۔

صوفیہ کے اشاری معانی اور ذوقی مفاہیم ومواجید پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ربما يسمع السالك صوتا من البراغيث ويفهم كلاما مفهوما من ذوق الباب، وكذا من الذباب وأصوات الطير، وسمع علي رضي الله عنه صوت ناقوس، قال: أتدرون ما يقول: قالوا: لا، قال: يقول: سبحان الله حقا حقا، إن المولى قد يبقى۔ (ایضا، باب نہم، نکتہ در بیان تحمیل الفاظے کہ میان شعراء مصطلح شدہ، ص:۴۹۶)

ترجمہ: کبھی کبھی سالک پسو کی آواز سنتا ہے اور ایسا معنی سمجھتا ہے جس کا تعلق ذوق تصوف سے ہے۔ ایسا ہی مکھیوں اور پرندوں کی آواز سے بھی ہوتا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ناقوس کی آواز سنی تو آپ نے لوگوں سے فرمایا: تم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ ناقوس کیا کہہ رہا ہے؟ لوگوں نے عرض کی نہیں، تو آپ نے فرمایا: یہ کہہ رہا ہے:

سبحان الله حقا حقا

إن المولىٰ قد يبقى

(یقینا اللہ پاک ہے اور بے شک مولیٰ باقی رہنے والا ہے۔)

علم پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

العلم بالاكتساب والعقل بالغريزة، ولهذا يقال: عالم ومعلم ومتعلم في العلم، ولا يقال: عاقل ومعقل ومتعقل في العقل، كتب عمر بن عبد العزيز إلى مكحول الشامي: تعلّمتَ فصرت عزيزا عند الناس فاستعمله لتصير عزيزا عند الله تعالى۔ (باب دہم، نکتہ در بیان علم وعلما، ص:۵۳۴)

ترجمہ: علم کسب سے حاصل ہوتا ہے اور عقل فطری ہے۔ اسی لیے علم کے حوالے سے کہا جاتا ہے: عالم، معلم اور متعلم۔ لیکن عقل کے سلسلے میں عاقل، معقل اور متعقل نہیں کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے مکحول شامی کو لکھا: تم نے علم حاصل کیا تو لوگوں کے نزدیک معزز بن گئے اب تم اس پر عمل کرو تاکہ اللہ کی بارگاہ میں معزز ہو جاؤ۔

عقل پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

العقل نور فطري يزيد بالسمع والكسب وقال رسول الله عليه السلام: العقل في القلب

والرحمة في الكبد والرأفة في الطحال، ويدرك الغلام لأربع عشرة سنة وينتهي بلوغه لأربع وعشرين، وعقله لثمان وعشرين۔ (ایضا،نکتہ در بیان عقل، ۵۴۲)

ترجمہ: عقل فطری نور ہے جو سننے سے اور کوشش سے بڑھتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: عقل، دل کے اندر ہے اور رحمت جگر کے اندر اور رأفت تلی کے اندر۔ لڑکا چودہ سال کی عمر میں بالغ ہوجاتا ہے اور اس کا بلوغ چوبیس سال کے عمر میں مکمل ہوجاتا ہے اور اس کی عقل اٹھائیس سال کی عمر میں مکمل ہوتی ہے۔

فقر وغنا کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قيل: الفقر الأنس بالمعدوم والوحشة بالمعلوم، الفقر في الدنيا مفتاح باب الغنى في الآخرة، وفي الحديث: من مات ولم يترك درهما ولا دينارا لم يدخل في الجنة أغنى منه، قال ابن عباس رضي الله عنه: وقف رسول الله صلى الله عليه وسلم على أصحاب الصفة فرأى فقرهم وجهدهم وطيب قلوبهم فقال: أبشركم يا أصحاب الصفة! فمن بقي منكم على التعب الذي أنتم عليه راضيا بما هو، فإنه من رفقائي يوم القيامة۔ (ایضا،نکتہ در بیان فقر وغنا ص:۵۴۶)

ترجمہ: فقر معدوم سے انسیت اور معلوم سے وحشت کا نام ہے۔ دنیا کا فقر آخرت میں باب غنا کی کنجی ہے، حدیث شریف میں آیا ہے: جو انسان مرجائے اور وہ درہم ودینار نہ چھوڑے تو جنت میں اس سے زیادہ غنی کوئی داخل نہیں ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اصحاب صفہ کے پاس کھڑے ہوئے اور ان کے فقر، ان کے مجاہدے اور دلوں کی پاکیزگی کو دیکھا تو فرمایا: اے اصحاب صفہ! میں تمہیں بشارت سناتا ہوں: تم میں سے جو شخص اپنی اس مشقت پر رضا کے ساتھ باقی رہے گا وہ قیامت کے دن میرے رفقا میں ہوگا۔

لوگوں کے طبقات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الناس أربع طبقات: طبقة قارة بحظوظ الدنيا والآخرة، والطبقات مختلفة، الأولى هم السعداء على الإطلاق، والثانية هم الأشقياء على الإطلاق، والأخريان إضافيتان، ونبينا عليه السلام لقوله تعالى: لولاك لما خلقت الأفلاك سيد الأنبياء، والأنبياء من خلقه أفضل ممن سواه۔ (ایضا، ص:۵۴۶، ۵۴۷)

ترجمہ: لوگوں کے چار طبقات ہیں: اول وہ طبقہ جو دنیا اور آخرت دونوں کی نعمتوں سے سرفراز ہے، باقی دوسرے طبقے وہ ہیں جو باہم ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اول طبقے کے لوگ مطلقا خوش بخت ہیں اور دوئم طبقے کے لوگ مطلقا بد بخت ہیں۔ باقی دوسرے دو طبقے کے لوگ کسی جہت سے

خوش بخت اور کسی جہت سے بد بخت ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث قدسی کی وجہ سے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا، سید الانبیا ہیں اور اللہ کی مخلوق میں انبیا سارے لوگوں سے افضل ہیں۔

امت محمدیہ کے پانچ طبقات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امت من پنج طبقہ باشند، ہر طبقہ مدت چہل سال، الطبقة الأولی طبقة العلم والمشاهدة، الطبقة الثانية طبقة البر والتقوی، الطبقة الثالثة طبقة التواصل والتراحم، الطبقة الرابعة طبقة التقاطع والتدابر، الطبقة الخامسة طبقة المرج والهرج۔

(ایضا،نکتہ در بیان طبقات،ص:۵۴۷)

ترجمہ: میری امت میں پانچ طبقے ہوں گے اور ہر طبقے میں چالیس سال کی مدت ہوگی۔ پہلا طبقہ علم ومشاہدہ کا، دوسرا طبقہ بروتقویٰ کا، تیسرا طبقہ باہم صلہ رحمی کا، چوتھا طبقہ قطع رحمی اور قطع تعلق کا، پانچواں طبقہ قتل وغارت گری کا۔

خشیت الٰہی اور اس کے ثمرات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

إذا اقشعر جلد العبد من خشية الله انحطت ذنوبه كما انحط عن الشجرة اليابسة ورقها، قال الله عز وجل: يا موسى! أتخاف من غيري؟ قال نعم أخاف من لا يخاف منك، قال رجل: يا رسول الله! أهو مؤمن وقت الذنب؟ قال: أهو يخاف إذا أذنب؟ قال: نعم، قال: خوفه يدل على إيمانه. (ایضا،نکتہ در بیان خوف ورجا،۵۵۰)

ترجمہ: اللہ کی خشیت کی وجہ سے جب بندے کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تو اس کے گناہ ایسے ہی جھڑ جاتے ہیں جیسے سوکھے درخت سے پتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! کیا تم میرے علاوہ کسی اور سے ڈرتے ہو؟ انہوں نے فرمایا: ہاں! میں اس سے ڈرتا ہوں جو تجھ سے نہیں ڈرتا۔ ایک شخص نے عرض کی: یارسول اللہ! گناہ کرتے وقت کیا بندہ مومن ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب وہ گناہ کرتا ہے تو اس وقت اس کے دل میں خوف ہوتا ہے؟ اس شخص نے جواب دیا: ہاں! آپ نے فرمایا: اس کا خوف اس کے ایمان پر دلالت کرتا ہے۔

ریا پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

الريا لا يقبله الحق ولا يمدحه الخلق، قال الفضيل: كانو قبلنا يراؤون الناس بما عملوا فصاروا اليوم يراؤون بما لم يعملوا، قال الجنيد: من خالط الناس دارهم، ومن دارهم راياهم. (ایضا،نکتہ در بیان ریا،ص:۵۵۰)

ترجمہ: ریا کو نہ تو حق تعالیٰ قبول کرتا ہے اور نہ اس کی بنا پر خلق خدا تعریف کرتی ہے۔ حضرت فضیل نے فرمایا: پہلے لوگ اپنے عمل کا دکھاوا کرتے تھے، لیکن آج لوگ ایسی چیزوں کا دکھاوا کرنے لگے جسے وہ کرتے ہی نہیں۔ حضرت جنید نے فرمایا: جو عام لوگوں کے ساتھ رہتا ہے وہ ان کی دل جوئی کرتا ہے اور جو لوگوں کی دل جوئی میں لگا رہتا ہے وہ دکھاوا کرتا ہے۔

خطرات کی مختلف قسموں کے مابین فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الخطرة الإلهامية تقبلها النفس والشيطان طوعا وكرها، والقلبية والروحية والملكية لا يتغير بعضها عن بعض في الابتداء، والخطرة النفسانية تصر على شيئ معين، ولا يسكن إلا بعد استيفاء المشتهى، والشيطان لا يسكن بلا مراده وهو الشغل عن الله تعالى، فاذا يئس العدو عاد الى الوسوسة۔ (ایضا، نکتہ در بیان الہام ووسوسہ، ص:۵۶۷)

ترجمہ: خطرہ الہامی کو نفس وشیطان خواہی نہ خواہی قبول کرتے ہیں اور روحانی، قلبی اور ملکوتی خطرات شروع میں متغیر نہیں ہوتے۔ اور نفسانی خطرات میں کسی متعین چیز پر اصرار ہوتا ہے اور شیطان اپنی مراد یعنی ذکر الٰہی سے غفلت کے بغیر چین نہیں پاتا پھر جب دشمن مایوس ہوجاتا ہے تو وسوسہ کی طرف لوٹ آتا ہے۔

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ: سلطان المشائخ نے کلاہ چہار ترکی کے اسرار پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

ترک اول آنست کہ **ترک الدنيا وصحبة الأغنياء** یعنی ترک اول یہ ہے کہ ترک دنیا کرے اور دنیا داروں کی صحبت سے پرہیز رکھے، ترک دوم یہ ہے کہ **ترک اللسان عن غيره والتزامه بذكر الله** یعنی دوسروں کا ذکر ترک کردے اور ذکر الٰہی کی پابندی کرے۔ ترک سوم یہ ہے کہ **ترک بصره من غيره لكرامته**، یعنی دوسروں کی جانب نظر کرنے سے دور رہے تاکہ وہ مکرم ومعظم رہے۔ چوتھا ترک یہ ہے کہ **طهارة القلب من حب الدنيا**، یعنی دل کو دنیا کی محبت سے پاک کرلے۔ (افضل الفوائد، ج:۱، مجلس بتاریخ یک شنبہ ذی الحجہ ۷۱۳ھ، ص:۵)

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا سے مولانا وجیہ الدین پائلی اور مولانا برہان الدین غریب نے عرض کی حضور! محبت کا پہلا مقام کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا محبت میں پہلا مقام تحیر ہے اور پھر آگے فرمایا:

العبد إن رجع إلى الله وتعلق بالله وسكر بقرب الله تفنى نفسه ما سوى الله فلو قلت له: أين أنت وأين تريد؟ لم يقل له جواب غير الله (ایضا، مجلس: ۲ ربیع الآخر، ص:۴۰)

ترجمہ: بندہ اگر اللہ تعالیٰ کی جانب راجع ہو اور اپنا تعلق اللہ سے قائم کرلے اور پھر قرب الٰہی کے نشے میں مست ہوجائے تو اس کا نفس ماسوی کو مٹا دیتا ہے۔ چناں چہ اگر تم اس سے اس وقت کہو کہ تم کہاں ہو اور کہاں جانا چاہتے ہو تو وہ اللہ کے سوا کوئی جواب نہیں دے گا۔

یہ آپ کی مختصر عربی تحریروں کے نمونے ہیں۔آپ کی ان تحریروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کسی قسم کا تکلف وتصنع اور محسنات لفظیہ کی کوئی گراں باری نہیں ہے، بلکہ بڑی سادگی لیکن بلاغت کے ساتھ معانی کی ترسیل کی گئی ہے ،ان تحریروں میں عموما اسلوب مساوات کا استعمال کیا گیا ہے اور کہیں کہیں اسلوب ایجاز بھی نمایاں ہے۔بہت سے ادبا کے یہاں دیکھا گیا ہے کہ ان کی تحریروں میں دقیق غیر معروف الفاظ کا اس قدر استعمال ہوتا ہے اور تراکیب اتنی مشکل ہوتی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ادیب معانی کی ادائیگی کے لیے زبان کی چٹان سے الفاظ کے چھوٹے چھوٹے پتھر تراش کر لا رہا ہو،لیکن سلطان المشائخ کی تحریروں میں ایسی بات بالکل نہیں پائی جاتی۔

فریدی دعاؤں کی روایت

سلطان المشائخ نے بہت سی مختصر وطویل دعائیں اپنے شیخ سے روایت کی ہیں،وہ دعائیں جہاں اصلاح وتربیت کا خزانہ ہیں وہیں لازمی طور پر عربی زبان سے آپ کے گہرے تعلق کو ظاہر کرنے والی بھی ہیں، ذیل میں ان میں سے بعض کو مکمل اور بعض کو مختصر انقل کیا جا رہا ہے۔

ایک مقام پر لکھتے ہیں:

سمعت من شيخ شيوخ الإسلام قدس سره: قال عليه السلام: اغتنموا الدعاء عند الرقة فإنه مقرونة بالإجابة، روي أن إبراهيم ابن أدهم رحمة الله عليه رآى حضرة العزة جل جلاله في المنام وتعلم هذا الدعاء بتعليم الحق، وقال عز وجل: كم تسأل حاجات اللغو وما لا يعنيك، فقال: يا رب! كيف أسألك الحاجة وأطلبها عندك؟ قال عز وجل: قل: إلهي! رضني بقضائك وصبرني على بلائك وأوزعني شكر نعمائك، وأسألك تمام نعمتك ودوام عافيتك، اللهم حببني في قلوب المؤمنين. (سیر الاولیاء، باب ہفتم ،نکتہ در بیان ادعیہ ماثورہ کہ از شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس سرہ العزیز منقول است،ص: ۴۲۲)

ترجمہ: میں نے شیخ شیوخ الاسلام قدس سرہ سے سنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: رقت کے وقت دعا کو غنیمت جانو کیوں کہ ایسی دعا مستجاب ہوتی ہے،مروی ہے کہ ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ رب العزت کو خواب میں دیکھا اور حق تعالیٰ نے ان کو یہ دعا سکھائی۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:تم کب تک لغو اور لایعنی چیزوں کو طلب کرتے رہوگے،انہوں نے عرض کی: اے میرے رب! میں تجھ سے کیسے اپنی حاجت طلب کروں؟ اللہ نے فرمایا: اس طرح دعا کرو: اے اللہ! مجھے تو اپنی قضا سے راضی کردے، اپنی بلا پر صبر عطا فرما، اور اپنی نعمتوں کے شکر کی توفیق عطا فرما۔میں تجھ سے تیری کامل نعمت اور دائمی عافیت کا طلب گار رہوں۔اے اللہ! مومنوں کے دلوں میں تو میری محبت ڈال دے۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

أوصاني شيخ شيوخ العالم فريد الحق والدين هذا الدعاء:

بسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لله على الإسلام، الحمد لله على أهل السنة والجماعة، الحمد لله الذي علمنا علما نافعا، ولم يتركنا عميان القلوب، الحمد لله على الصحة والسلامة، الحمد لله الذي أذهب عنا الغضب والحسد والحزن، ولم يجعلنا من المغضوبين عليهم (ایضا)

ترجمہ: مجھے شیخ شیوخ العالم نے اس دعا کی وصیت فرمائی: بسم اللہ الرحمن الرحیم، نعمت اسلام پر اللہ کی حمد ہے، اہل سنت و جماعت کی نعمت پر اللہ کی حمد ہے، تمام حمد ہے اللہ کی جس نے ہم کو علم نافع عطا فرمایا، ہمیں دل سے نابینا نہیں کیا، صحت وسلامتی پر اللہ کی حمد ہے، تمام حمد ہے اللہ کی جس نے ہم سے غضب وحسد اور رنج وغم کو دور کر دیا اور ہم کو مغضوبین میں نہیں بنایا۔

مزید ایک مقام پر لکھتے ہیں:

علمني شيخ شيوخ العالم: اللهم إن دخل الشك في إيماني بك ولم أعلم به تبت عنه، وأقول: لا إله إلا الله محمد رسول الله، اللهم إن دخل الكفر في إسلامى ولم أعلم به تبت عنه أقول: لا إله إلا الله محمد رسول الله، اللهم إن دخل الشرك في توحيدي بك ولم أعلم به تبت عنه وأقول: لا إله إلا الله محمد رسول الله، أللهم إن دخل الشبهة في معرفتي إياك ولم أعلم به تبت عنه وأقول لا إله إلا الله محمد رسول الله، اللهم إن دخل النفاق في قلبي ولم أعلم به تبت عنه وأقول لا إله إلا الله محمد رسول الله، لا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم وصلى الله على خير خلقه محمد وآله أجمعين۔ (ایضا، ص: ۴۲۴)

ترجمہ: مجھے شیخ شیوخ العالم نے اس دعا کی تعلیم دی: اے اللہ! نادانستہ اگر میرے ایمان میں شک داخل ہو گیا ہو تو میں اس سے توبہ کرتا ہوں اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتا ہوں، اے اللہ! اگر نادانستہ میرے اسلام میں کفر داخل ہو گیا ہو تو میں اس سے توبہ کرتا ہوں، اور کلمہ پڑھتا ہوں، اے اللہ! اگر میری توحید میں نادانستہ شرک داخل ہو گیا ہو تو میں اس سے توبہ کرتا ہوں اور کلمہ پڑھتا ہوں، اے اللہ! اگر تیرے معرفت کے حوالے سے نادانستہ کوئی شبہہ لاحق ہو گیا ہو تو میں اس سے توبہ کرتا ہوں، اے اللہ! اگر نادانستہ میرے ایمان میں نفاق آ گیا ہو تو میں اس سے توبہ کرتا ہوں اور کلمہ پڑھتا ہوں۔ اللہ علی وعظیم کے علاوہ کوئی طاقت وقوت نہیں، اللہ تعالیٰ خیر خلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل سب پر صلاۃ نازل فرمائے۔

دوسرے مشائخ کے اقوال

تصنیفات میں دوسرے مشائخ کے عربی اقوال نقل کرنا بھی عربی زبان سے ناقل کے تعلق کو بیان کرتا ہے اور مجالس میں دوسرے مشائخ کے عربی اقوال سے استدلال تو بدرجۂ اولی اس تعلق کو واضح کرتا ہے، اس لیے کہ مجالس میں عربی اقوال کو نقل کرنا دو حال سے خالی نہیں ہوگا، یا تو وہ اسے بعینہ نقل کرے گا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سارے اقوال اس کی نوک زبان پر ہیں اور یہ یقینی طور پر لسانی مہارت کی دلیل ہے، یا ان اقوال کو وہ بالمعنی بیان کرے گا اور یہ تعبیر معانی پر ناقل کی قدرت کی نمایاں دلیل ہے۔ اس لیے ذیل میں چند اقوال مشائخ جن کو سلطان المشائخ نے نقل کیا ہے ان کو بھی یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ حسن علا سجزی بیان کرتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے حضرت جنید بغدادی کا یہ قول نقل فرمایا: **یا علماء السوء أدوا زکاۃ العلم۔** (فوائد الفؤاد، جلد سوم، مجلس نہم) ترجمہ: اے علمائے سو! علم کی زکات ادا کرو۔

امیر خورد کرمانی نقل کرتے ہیں:

قیل للمحب لو أدخلك الله النار ماذا تفعل؟ قال: أطوف في طباق النار وأقول هذا جزاء من أحبه۔ (سیر الاولیا، باب ہشتم، نکتہ در بیان محبت وغوامض آں، ص: ۴۶۳)

ترجمہ: عاشق سے کہا گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ تم کو جہنم میں ڈال دے تو کیا کروگے؟ اس نے جواب دیا کہ میں جہنم کے مختلف طبقات میں گھوم گھوم کر کہوں گا کہ محبت کرنے والے کی یہی جزا ہے۔

ایک اور جگہ نقل کرتے ہیں:

قیل لیحیی معاذ الرازي: متی یصل العبد إلی حلاوۃ الحب قال: إذ کان له الجفاء سکرا والفقر عسلا والحزن رطبا۔ (ایضا، ص: ۴۶۱)

یحییٰ معاذ رازی سے کہا گیا کہ بندہ محبت کی حلاوت کے مقام تک کب پہنچتا ہے؟ انہوں نے فرمایا جب محبوب کی جفا شکر میں فقر شہد میں اور غم تر و تازہ کھجور میں بدل جائے۔

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے اہل سلوک کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

کن بلا وصف تدرک ما لا وصف له۔ (افضل الفوائد، مجلس: شنبہ ۲۳ محرم، ۷۱۵ھ، ص: ۸۷)

ترجمہ: تم اس طرح بن جاؤ کہ تمہارا اپنا کوئی وصف ہی نہ رہ جائے تب تم کو اس ذات کی معرفت حاصل ہوگی جو وصف سے بالاتر ہے۔

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے خواجہ جنید کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

النوم موهبة الله علی المحسنین، یعنی تنام عینی ولا ینام قلبی۔ (ایضا، ص: ۸۹)

ترجمہ: نیند محسنین پر اللہ کا انعام ہے یعنی میری آنکھ سوتی ہے لیکن میرا دل نہیں سوتا۔

طبع زاد عربی اقوال

یہاں پر طبع زاد عربی اقوال میں ان جملوں کو نقل کیا گیا ہے جو بہت مختصر اور اپنے اندر جامعیت لیے ہوئے ہیں، اس طرح کے اقوال بظاہر چھوٹے اور متفرق ہوتے ہیں لیکن ان کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے، کیوں کہ یہی مختصر اقوال کثرت استعمال سے کبھی کبھی ضرب الامثال بن جاتے ہیں۔ ذیل میں سلطان المشائخ کے ایسے ہی بعض کلمات کو نقل کیا جارہا ہے۔

حسن علاء سجزی نقل کرتے ہیں:

کھانا کھلانا کے بارے میں گفتگو نکلی، آپ نے فرمایا: درویشی یہ ہے کہ سلام کے بعد ہر آنے والے کی خدمت میں کھانا پیش کیا جائے، اور پھر حکایات اور باتوں میں مشغول ہو، اس کے بعد آپ نے فرمایا:

ابدؤ ابالسلام ثم بالطعام ثم بالكلام۔ (فوائد الفواد، ج:۲، مجلس بست وہشتم، ص:۱۳۰)

ترجمہ: پہلے سلام پھر طعام اور اس کے بعد کلام۔

ایک اور مجلس کے حوالے سے حسن علاء سجزی نقل کرتے ہیں:

اس جماعت کا تذکرہ نکلا جو کرامت کا دعویٰ کرتی ہے اور خود کو کشف سے مشہور کرتی ہے تو آپ نے فرمایا: یہ کوئی چیز نہیں، پھر آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا:

فرض الله تعالى على أوليائه كتمان الكرامة كما فرض على أنبيائه إظهار المعجزة۔

(ج:۴، مجلس سوم، ص:۲۰۲)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیا پر کرامت پوشی کو فرض قرار دیا ہے جس طرح اس نے اپنے انبیا پر اظہار معجزہ کو فرض قرار دیا ہے۔

ایک اور مجلس کے حوالے سے حسن علاء سجزی نقل کرتے ہیں:

ترک دنیا کا ذکر آیا، اس بارے میں آپ نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک دفعہ حضرت عیسی علیہ السلام ایک سوتے آدمی کے سرہانے پہنچے، انہوں نے اس سوتے آدمی کو پکارا اور بولے اٹھو اللہ کی عبادت کرو، اس نے کہا: میں نے اللہ کی ایسی عبادت کی ہے جو سب سے اچھی ہے، انہوں نے پوچھا تم نے کون سی عبادت کی ہے؟ وہ بولا: **تركت الدنيا لأهلها**، (دنیا کو میں نے دنیا والوں کے لیے چھوڑ دیا۔) اس پر سلطان المشائخ نے فرمایا:

من رضى الله بقليل من الرزق رضي الله تعالى عنه بقليل من العمل.

ترجمہ: جو تھوڑی سی روزی پر اللہ سے راضی ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے سے عمل پر اس سے راضی ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

جو دنیا سے اس حال میں جائے کہ کچھ بھی نہ چھوڑے **لا درهما ولا دينارا فليس في الجنة أغنى منه**

(فوائد الفواد، جلد:۵، مجلس سوم، ص:۳۷۹)

ترجمہ: دنیا میں درہم ودینار کچھ بھی نہ چھوڑے تو جنت میں اس سے زیادہ کوئی غنی نہیں۔

امیر خورد کہتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے فرمایا:

ذكر الشيخ في الكلام كالملح في الطعام أو كالروح في الأجسام۔ (سیر الاولیا، دیباچہ، ص:۱۵)

ترجمہ: گفتگو میں شیخ کا ذکر ایسے ہی ہے جیسے کھانے میں نمک یا جسم میں روح۔

مولانا حسام الدین ملتانی جو سلطان جی کے خلفا میں ہیں انہوں نے ایک بار سلطان جی سے عرض کی: حضور! لوگ کرامت طلب کرتے ہیں، اس بات پر آپ نے ارشاد فرمایا:

الكرامة هي الاستقامة على باب الغيب۔ (تذکرہ مولانا حسام الدین، نکتۂ سیوم، ص:۲۶۲)

ترجمہ: ذات غیب کے در پر استقامت ہی کرامت ہے۔

مولانا فخر الدین مروزی نے ایک مرتبہ سلطان جی کی خدمت میں عرض کی کہ مجھ پر ایک مرتبہ پیاس کی شدت تھی اور میں تنہا تھا کوئی ایسا نہیں تھا جس سے میں پانی مانگ سکوں، اچانک غیب سے پانی کا ایک پیالہ ظاہر ہوا، لیکن میں نے اس پیالے کو توڑ دیا اور میں نے دل ہی دل میں کہا کہ میں کرامت والا پانی پیوں گا؟ یہ سن کر سلطان جی نے فرمایا: پی لینا چاہیے تھا کیوں کہ:

الكرامة لا يرد۔ (ایضا، باب پنجم، تذکرہ مولانا فخر الدین مروزی، ص:۲۹۸-۲۹۹)

ترجمہ: کرامت کو رد نہیں کیا جاتا۔

امیر خورد نے نقل کیا ہے کہ ایک روز دو احباب سلطان المشائخ کی خدمت میں آئے ان میں سے ایک نے احتیاط کے ساتھ وضو نہیں کیا تھا، جب یہ لوگ حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے سب سے پہلے ان سے یہی کہا کہ وضو میں احتیاط کرنا چاہیے کیوں کہ: **الوضوء سر من أسرار الله۔** (ایضا، باب اول، نکتہ سیزدہم، ص:۱۴۲) ترجمہ: وضو اللہ کے اسرار میں سے ایک سر ہے۔

مولانا حسام الدین ملتانی قدس سرہ کو جب سلطان جی سے خلافت ملی تو انہوں نے عرض کی اگر حکم ہو تو میں شہر میں نہ رہوں بلکہ دریا کے کنارے چلا جاؤں اور وہیں سکونت اختیار کروں، اس پر آپ نے فرمایا شہر میں رہو اور عام لوگوں کی طرح رہو:

كن أحدا من الناس۔ (ایضا، تذکرہ مولانا حسام الدین ملتانی، نکتۂ سوم، ص:۲۶۱)

ترجمہ: عام لوگوں کی طرح رہو۔

صاحبِ سیر الاولیاء ''نکتہ در بیان محبت وغوامض آں'' کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں کہ میں نے سلطان المشائخ کے دست مبارک سے محبت کے باب میں گیارہ جملے اور دو حدیثیں لکھی دیکھی ہیں، ان میں سے بعض جملوں کو یہاں درج کیا جا رہا ہے:

(۱) المحبة إيثار ما تحب لمن تحب۔ (باب ہشتم، نکتہ در بیان محبت وغوامض آں، ص:۴۵۶)

ترجمہ: محبت محبوب کے لیے اپنی محبوب چیزوں کو قربان کرنے کا نام ہے۔

(۲) المحبة المحبة التي تظهر الصادق من الكاذب۔ (ایضا)

ترجمہ: درحقیقت محبت وہی ہے جو سچے کو جھوٹے سے الگ کر دے۔

(۳) المحبة عدم النوم و العزلة من القوم۔ (ایضا، ص:۴۵۷)

ترجمہ: محبت نیند کے اچٹ جانے اور لوگوں سے الگ ہو جانے کا نام ہے۔

(۴) المحبة طائر لا يلتقط إلا حبة القلوب۔ (ایضا، ص:۴۵۸)

ترجمہ: محبت ایسا پرندہ ہے جو دانۂ دل ہی چگتا ہے۔

(۵) الحب حرفان، الحاء من الروح و الباء من البدن أي خرج منهما۔ (ایضا، ص:۴۵۹)

ترجمہ: حب میں دو حرف ہیں۔ حا، روح سے آئی ہے، اور با، بدن سے۔ یعنی محبت جسم و روح سے ظاہر ہوتی ہے۔

(۷) الحب حرم نومي و استحل دمي، كذلك في الحب تحريم و تحليل فباتته ليلي كأن العين صومعة و إنسانها راهب و الدمع قنديل۔ (ایضا، ص:۴۶۳)

ترجمہ: محبت نے میری نیند حرام کر دی اور میرا خون حلال کر دیا، یوں ہی محبت میں تحریم و تحلیل دونوں ہوتی ہے، چناں چہ اس حالت میں محبوب کے ساتھ میری رات اس طرح گزری کہ میری آنکھ گویا صومعہ تھی، آنکھوں کی پتلی اس صومعہ کی راہبہ اور میرے آنسو اس کی قندیل۔

(۸) إذا أحب الله عبدا لم يضره ذنبه۔ (ایضا، ص:۴۶۴)

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتا ہے تو اس کے گناہ اس کو نقصان نہیں پہنچاتے۔

(۹) اللهم إني أسألك حبك وحب من يحبك و العمل الذي تأدى إلى حبك، اللهم اجعل حبك أحب إلي من نفسي و أهلي و مالي و من الماء البارد للعطشان۔ (ایضا، ص:۴۶۵)

ترجمہ: اے اللہ! میں تجھ سے تیری محبت کا اور ان کی محبت کا سوال کرتا ہوں جو تجھ سے محبت کرتے ہیں اور اس عمل کا سوال کرتا ہوں جو تیری محبت تک لے جائے۔ اے اللہ! تو اپنی محبت کو میری جان، اہل و مال اور پیاسے کے لیے ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب بنا دے۔

(۱۰) **من اشتاق إلى الله اشتاق إليه كل شيئ۔** (ایضا،نکتہ در بیان اشتیاق وشوق ص:۴۶۶)

ترجمہ: جو اللہ کا مشتاق ہوتا ہے ہر شئی اس کی مشتاق ہوتی ہے۔

(۱۱) **العشق آخر درجات المحبة والمحبة أول درجات العشق۔** (ایضا،نکتہ در بیان عشق،ص: ۴۶۶)

ترجمہ: عشق محبت کا آخری درجہ ہے اور محبت عشق کا پہلا درجہ۔

(۱۲) **حسن الخلق أن لا يتأثر القلب بجفاء الخلق بمطالعة فعل الحق۔** (باب دہم،نکتہ در بیان محاسن اخلاق،ص:۵۵۹)

ترجمہ: حسن خلق یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے فعل کی طرف نظر رکھے اور قلب مخلوق کی جفا سے متاثر نہ ہو۔

عربی اشعار

یہ تو ثابت نہیں ہے کہ آپ نے کبھی کوئی عربی شعر کہا ہو لیکن آپ کی مجالس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی مجلس میں موقع محل کی مناسبت سے عربی مصرعے یا اشعار پڑھا کرتے تھے اور بلاشبہہ یہ آپ کے ذوق ادبی کی اعلی دلیل ہے۔ آپ کی مجالس اور تحریروں میں پائے جانے والے وہ اشعار اور مصرعے درج ذیل ہیں۔

جامع فوائد الفواد لکھتے ہیں:

پھر آپ نے شیخ الاسلام فرید الدین گنج شکر قدس سرہ کی حکایت بیان فرمائی کہ میں کم وبیش بارہ سال کا تھا، لغت پڑھ رہا تھا، ایک شخص جس کو ابوبکر خراط کہا جاتا تھا اور ابوبکر قوال سے بھی معروف تھا، وہ میرے استاد کی خدمت میں آیا، شاید وہ ملتان کی طرف سے آیا تھا، اس نے قصہ سنایا کہ میں نے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کو بھی قوالی سنائی ہے، ایک دفعہ میں ان کو یہ شعر سنا رہا تھا:

بكل صبح وبكل إشراقي

تبكيك عيني بدمع مشتاقي

قد لسعت حية الهوى كبدي

فلا طبيب لها ولا راقي

ترجمہ: (۱) ہر صبح کو شوق واشتیاق رکھنے والے شخص کے آنسو کے ساتھ میری آنکھ تم پر روتی ہے۔

(۲) میرے دل میں محبت کے سانپ نے ڈس لیا ہے اور اس کا کوئی معالج اور جھاڑ پھونک کرنے والا بھی نہیں۔

دو مصرعے اور یاد نہیں رہ گئے تھے تو سلطان جی نے وہ مصرعے یاد دلائے اور یہ پڑھا:

إلا الحبيب الذي شغفت به

فعنده رقيتي وترياقي([1])

ترجمہ: سوائے اس محبوب کے جس کا میں عاشق ہوں اسی کے پاس میرا علاج اور میرے زہر عشق کا تریاق ہے۔

ایک بات یہاں قابل غور یہ ہے کہ آپ بارہ سال کی عمر میں لغت پڑھ رہے تھے اور دوسری بات یہ کہ قوال کو ایک شعر یاد نہیں رہ گیا تو آپ نے اسے وہ شعر یاد دلایا، یہ دونوں باتیں صغرسنی میں آپ کے ذوق عربی زبان کی دلیل ہیں۔

ایک اور مقام پر حسن علاء سجزی لکھتے ہیں:

ایک عزیز حاضر تھے انہوں نے پوچھا کہ معراج کی نوعیت کیا تھی؟ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا کہ مکے سے بیت المقدس تک کا سفر اسرا تھا اور بیت المقدس سے پہلے آسمان تک معراج اور پہلے آسمان سے قاب قوسین کے مقام تک اعراج۔ ان عزیز نے دوبارہ اپنے سوال میں اضافہ کرکے پوچھا: کہتے ہیں کہ جسم کو بھی معراج ہوئی اور روح کو بھی، ہر ایک کو الگ الگ کیسے ہوسکتی ہے؟ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر یہ مصرع زبان مبارک پر لائے: فظن خيرا و لا تسئل عن الخبر

یعنی اچھا گمان رکھو اور تحقیق و تفتیش میں مت لگو، پھر فرمایا کہ یہاں بھی ایمان رکھنا چاہیے اور زیادہ تحقیق و تفتیش میں نہیں پڑنا چاہیے، پھر آپ نے یہ دو اشعار مکمل پڑھے:

جاءني في قميص الليل مستترا

يقارب الخطو من خوف و من حذر

فكان ماكان مما لست أذكره

فظن خيرا ولا تسئل عن الخبر

ترجمہ: (۱) میرا محبوب لباس شب میں لپٹ کر میرے پاس اس طرح چپکے سے آیا کہ وہ خوف و احتیاط کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے قدم بڑھا رہا تھا۔

(۲) پھر جو بھی ہوا میں اسے بتا نہیں سکتا، تو تم اچھا گمان رکھو اور تحقیق و تفتیش میں نہ پڑو۔

سلطان جی نے فرمایا: کسی کا محبوب رات میں آ گیا تھا اسی حال کو شاعر [ابن المعتز] نے نظم کیا ہے۔ (ایضا، جلد چہارم، مجلس پنجاہ و ہشتم، ص: ۳۵۰)

ایک اور مقام پر جامع فوائد الفواد لکھتے ہیں:

---

(۱) فوائد الفواد، جلد چہارم، مجلس بست و دوم، ص: ۲۵۳

سلطان المشائخ نے حکایت بیان فرمائی کہ ایک مرتبہ کسی شاعر [شاعر کا نام سحیم عبد بنی الحسحاس ہے] نے نظم میں امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کی مدح کی تھی، اس نظم میں وعظ ونصیحت کے طور پر بھی ایک شعر کہا تھا جس کا ایک مصرع یہ تھا:

کفی الشیب والإسلام للمرء ناهیا

ترجمہ: بڑھاپا اور اسلام دونوں انسان کو برائیوں سے روکنے کے لیے کافی ہے۔

جب اس شاعر نے یہ شعر امیر المؤمنین کو سنایا تو آپ نے اس کو کوئی انعام دینے کا حکم نہیں فرمایا، اس نے کہا کہ میں نے آپ کی مدح کی ہے آپ کوئی انعام کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے فرمایا تو نے اسلام پر بڑھاپے کو مقدم کر دیا ہے، اگر اسلام کو مقدم کرتا تو ضرور تجھ کو کچھ دیتا۔ (ایضا، جلد پنجم مجلس بست وسوئم، ص: ۴۲۳)

پچھلی دونوں مجالس سے اولا یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو نہ صرف عربی اشعار یاد تھے اور عربی دواوین پر آپ کی نگاہ تھی بلکہ شعر گوئی کا جو پس منظر ہوتا تھا اس پر بھی آپ کی نظر تھی، دراصل یہ عربی زبان وادب سے آپ کے شغف کی دلیل ہے۔

ثانیاً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان سے آپ کا جو تعلق تھا اس کا اظہار اس طرح بھی ہوتا تھا کہ آپ اپنی مجالس میں وقتاً فوقتاً عربی اشعار موقع محل کی مناسبت سے اثنائے کلام پیش فرماتے تھے۔

آگے حسن علا سجزی نقل کرتے ہیں:

سابقہ گفتگو کے بعد ہی شعر کے بارے میں گفتگو نکلی، میں نے کچھ اپنی معروضات رکھی اور پھر بعد میں سلطان المشائخ نے فرمایا کہ صحابہ کرام نے شعر کہے ہیں، مثلا امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ اور دوسروں نے بھی شعر کہے ہیں، اس وقت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کے دو شعر زبان مبارک پر آئے، مفہوم یہ تھا کہ جب عورتیں گھوڑوں پر سوار ہوں گی تو خروج دجال کا خوف ہوگا۔ ان میں سے ایک کا قافیہ سروج تھا دوسرے کا خروج اور تیسرے کا عروج اور پہلا مصرع یہ تھا:

إذا رکبت الفروج علی السروج (ایضا، ص: ۴۲۴)

اس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی مجالس میں بہت سے عربی اشعار دوران گفتگو پیش فرمائے لیکن فوائد الفواد کے جامع ان میں سے کچھ کو تو محفوظ کر سکے اور بہت سے اشعار محفوظ نہیں کر سکے۔

صاحب سیر الاولیاء کہتے ہیں کہ میں نے سلطان المشائخ کی قلمی تحریر دیکھی اس میں یہ اشعار بھی تھے:

إِلٰهِيْ تُبْتُ عَمَّا كَانَ مِنِّيْ

فَكَفِّرْ سَيِّئَاتِيْ وَارْضِ عَنِّيْ

وَعَامِلْنِيْ بِلُطْفِکَ یَا إِلٰهِيْ
وَلاَ تَقْطَعْ لِأَجْلِ الذَّنْبِ مِنِّيْ
فَکُنْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ لِيْ مُعِیْنًا
وَأَحْسِنْ بِيْ کَمَا أَحْسَنْتَ ظَنِّيْ(۱)

ترجمہ:(۱)الٰہی مجھ سے جو گناہ سرزد ہوئے ہوں ان سے توبہ کرتا ہوں تو میری خطاؤں کو معاف کردے۔
(۲)الٰہی تو مجھ سے اپنے لطف کا معاملہ فرما اور گناہوں کی وجہ سے مجھ سے رشتہ منقطع نہ فرما۔
(۳)تو بروز قیامت میری معاونت فرما اور اے مولیٰ! جس طرح میں تجھ سے حسن ظن رکھتا ہوں اسی طرح تو میرے ساتھ حسن کا معاملہ فرما۔

سلطان المشائخ کی دستی تحریر میں ان اشعار کا موجود ہونا بھی آپ کے شعری وادبی ذوق کا اعلامیہ ہے۔

ایک مرتبہ سلطان جی کے تمام احباب شہر کی ایک دعوت میں تشریف لے گئے، جب وہ لوٹے تو باغ کے درمیان تھوڑی دیر ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے، اس دوران ان کو ایک خاص قسم کا ذوق حاصل ہوا جس کی وجہ سے وہ سماع ورقص میں مشغول ہو گئے اور ان کو ایک خاص طرح کی راحت وفرحت ملی بعد میں سلطان جی کی خدمت میں حاضر ہو کر جب سارا قصہ سنایا تو آپ نے فرمایا: کبھی کوئی صاحب دل ضرور اس کے سائے میں بیٹھا ہوگا اور یہ تاثیر اسی کی وجہ سے تھی پھر اس کی مناسبت سے آپ نے درج ذیل شعر اپنی زبان در بار سے پڑھا:

وَتَجْنِيْ کُلُّ أَرْضٍ سِرَّ کَوْنِهَا
کَأَنَّهُمْ فِيْ بِقَاعِ الْأَرْضِ أَمْطَارُ(۲)

ترجمہ: ہر زمین اپنے اندر کی پوشیدہ چیز کا ہی پھل دیتی ہے گویا کہ وہ لوگ خطہائے زمین میں بارش کی طرح ہیں۔

اس شعر کو میں نے کتب ادب اور شعری دواوین میں تلاش کرنے کی کوشش کی تو یہ شیخ الشیوخ أبو مدین تلمسانی (۵۹۷ھ) کی طرف منسوب اس طرح ملا:

تحیا بکم کل أرض تنزلونها
کأنکم في بقاع الأرض أمطار(۳)

---

(۱) سیر الاولیاء، باب ششم، نکتہ در بیان توبہ واستقامت آں، ص:۳۳۲
(۲) باب دھم، ص:۵۶۸
(۳) (دیکھیں:http://www.poetsgate.com/ViewPoem.aspx?id=103588
(دواوین شعراء الأندلس)

ترجمہ:(۱) آپ لوگ جس سرزمین پر فروکش ہو جاتے ہیں وہ سرزمین حیات پا جاتی ہے، گویا کہ آپ لوگ زمین کے خطوں میں نفع بخش بارش ہو۔

(۲) نگاہیں آپ لوگوں کے اندر حسین و جمیل مناظر سے لطف اندوز ہوتی ہیں، گویا آپ لوگوں کی آنکھوں میں پھول ہو۔

(۳) ظلمت شب میں چلنے والے آپ کے نور کو دیکھ کر راہ پاتے ہیں، گویا آپ لوگ شب تار میں ماہتاب ہو۔

(۴) اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی زیارت سے کسی بھی خطۂ زمین کو محروم نہ کرے، اے وہ لوگ! جن کی یاد دل میں اور دل کی گہرائیوں میں بسی ہوئی ہے۔

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ عشق پر گفتگو شروع ہوئی تو آپ نے یہ شعر پڑھا۔

فلولاکم ما عرفنا الھویٰ

ولولا الھویٰ ما عرفناکم(۱)

ترجمہ: اگر تم نہ ہوتے تو ہم محبت کو نہ جانتے اور اگر محبت نہ ہوتی تو ہم تم کو نہ جانتے۔

یہ شعر شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول کی طرف منسوب ہے۔

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے دیدار الٰہی پر گفتگو کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

فینسون النعیم اذا رأوه

فلیست نعمة ما سواہ (۲)

ترجمہ: جب لوگ رب تعالیٰ کو دیکھیں گے تو ساری نعمتوں کو بھول جائیں گے اس لیے کہ اس کے دیدار کے علاوہ در حقیقت کوئی نعمت ہی نہیں۔

حضرت امیر خسرو فرماتے ہیں کہ سلطان المشائخ نے فرمایا:

حضرت جنید بغدادی اس شعر کا ورد کیا کرتے تھے:

من لم یکن للوصال أھلا

فکل إحسان له ذنوب(۳)

ترجمہ: جو لائق وصال الٰہی نہ ہو اس کی ساری نیکیاں گناہ ہیں۔

---

(۱) افضل الفوائد، مجلس دوشنبہ، ۲۳ صفر، ۷۱۴ھ، ص: ۲۵

(۲) افضل الفواد، مجلس: ۲۳ محرم شنبہ، ۷۱۵ھ، ص: ۸۳

(۳) ایضاً، ص: ۸۹

کبار علما کی کہکشاں

سلطان المشائخ کے ذوق عربی زبان وادب پر جہاں دوسری شہادتیں موجود ہیں وہیں ایک شہادت عربی زبان کے کبار علما وادبا کی وہ کہکشاں بھی ہے جو آپ کے گرد قائم ہوگئی تھی، وہ اس طرح کہ اگرچہ یہ بات مسلم ہے کہ حضرت کی روحانی کشش نے ہی ان علما وادبا کو آپ کے گرد جمع کیا تھا لیکن مثل ہے کہ **الجنس الی الجنس یمیل**، ہر جنس اپنے ہم جنس کی طرف ہی مائل ہوتا ہے اس لیے آپ کی روحانی کشش کے ساتھ ضرور حضرت کا تبحر علمی اور عربی ذوق بھی ان حضرات کے سلطان المشائخ کی جانب میلان میں ایک اہم محرک رہا ہوگا۔

ذیل میں ہم بہت اختصار کے ساتھ آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل بعض علما وادبا اور ان کی علمی وادبی مقام کا تذکرہ کرتے ہیں تا کہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ یقینا سلطان المشائخ کے علمی امتیاز اور ذوق ادبی نے بھی ان حضرات کو آپ کے حلقے میں شامل ہونے پر مہمیز کیا ہوگا۔

ا۔مولانا شمس الدین یحییٰ

آپ سلطان المشائخ کے کبار خلفا میں ہیں، سلطان جی سے شرف بیعت حاصل کرنے کا واقعہ یہ ہے کہ مولانا شمس الدین اور ان کے خالہ زاد بھائی مولانا صدرالدین نائلی دونوں شہر میں پڑھتے تھے، تعطیل کے دوران کپڑے دھونے کے لیے غیاث پور کے علاقے میں دریائے جمنا کے پاس آیا کرتے تھے، ان کو خبر مل چکی تھی کہ یہاں ایک بزرگ ہیں اور علما وعمائدین شہران کے یہاں آکر زمین بوسی کرتے ہیں، لیکن چوں کہ پہلے صوفیہ سے ان کو اتنی عقیدت نہیں تھی اس لیے ملاقات کے لیے کبھی نہیں آئے، ایک روز دونوں بھائی غیاث پور آئے ہوئے تھے تو مولانا شمس الدین نے کہا کہ شاہ نظام الدین یہیں رہتے ہیں، شہر کے لوگ ان کے معتقد ہیں، پتا نہیں کیسے ہیں؟ کیا معاملہ ہے؟ آؤ چل کر دیکھتے ہیں، البتہ ہم لوگ زمین بوسی نہیں کریں گے۔

الغرض حاضر خدمت ہوئے جیسے ہی آپ کے جمال جہاں آرا پر نظر پڑی رعب وہیبت سے اضطراری طور پر دونوں بھائی زمین بوس ہوگئے، سلطان جی نے فرمایا بیٹھیے، دونوں بیٹھ گئے، پھر تھوڑی دیر بعد پوچھا: شہر میں رہتے ہیں؟ بولے: جی، پھر پوچھا: کچھ پڑھتے ہیں؟ بولے: جی مولانا ظہیر الدین بھکری کی خدمت میں بزدوی پڑھتے ہیں۔ سلطان جی نے بزدوی میں جس مقام پر سبق تھا اسی سبق سے ایک اشکال کی توضیح کرنے کے لیے ان سے کہا، یہ لوگ حیرانی کے عالم میں زمین بوس ہوگئے اور عرض کی: حضور یہی مقام حل نہیں ہوسکا ہے اور استاذ گرامی ظہیر الدین بھکری سے بھی یہ مقام حل نہیں ہوسکا ہے، انہوں نے فرمایا ہے کہ میں تحقیق کر کے بتاؤں گا، سلطان جی مسکرائے اور جیسا کہ ان دونوں کی آرزو تھی آپ نے اس اشکال کی توضیح فرمادی، مجلس سے اٹھ کر جب یہ حضرات باہر گئے تو بولے کہ اب تک تو صرف بزرگی کا چرچا سنتے تھے لیکن آج وفور علم کا بھی مشاہدہ کرلیا، بعد میں استاذ کی خدمت میں بھی اس کا تذکرہ کیا اور پھر استاذ گرامی کے سامنے وہی تقریر دل پذیر دہرائی جو سلطان جی نے اشکال

کی توضیح میں کی تھی، اس گفتگو کو سن کر مولانا ظہیر الدین بھکری کو بھی سلطان جی سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہو گیا اور پھر بعد میں وہ بھی اس سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ دوسری مجلس میں مولانا شمس الدین حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ (سیر الاولیا، باب چہارم در بیان مناقب وفضائل وکرامات سلطان المشائخ، نکتۂ اول، ص: ۲۲۳, ۲۲۴)

صاحب سیر الاولیاء نے آپ کو دُرِّ دریائے علم کے لقب سے یاد کیا ہے، اور آپ کے تبحر علمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابتدائی تعلیمی زمانے میں ہی مولانا شمس الدین اور ان کے بھائی علمائے شہر کے درمیان مختلف علوم پر بحث ومباحثہ، اور ان کے مسائل پر اعتراضات ومقدمات قائم کرنے میں مشہور تھے، اور علم اصول، فقہ، معانی بیان میں مقام تحقیق پر فائز تھے۔ اسی لیے شہر کے اساتذۂ فن نے آپ سے تلمذ کیا اور شہر کے بیشتر علما آپ کے شاگرد کہلائے۔ (ایضا، نکتۂ سوم در بیان علم وتبحر مولانا شمس الدین، ص: ۲۲۶)

۲۔ مولانا فخر الدین زرادی

آپ سلطان جی کے خلفا میں علم وفضل اور تحقیق وتدقیق میں نہایت اعلی مقام رکھتے ہیں، صاحب سیر الاولیاء نے آپ کو مقام اجتہاد پر فائز قرار دیا ہے۔ (ایضا، نکتۂ سوم در بیان تبحر علمی مولانا فخر الدین، ص: ۲۶۹)

سلطان جی کی خدمت میں آنے اور بیعت سے مشرف ہونے کا واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں خواجہ نصیر الدین دہلی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور مولانا فخر الدین ہانسوی کی مجلس میں حاضر ہوا کرتے تھے، اسی زمانے میں مولانا فخر الدین اور ان کے ایک دوسرے ساتھی امیران بورکش بھی علامہ ہانسوی کے یہاں ہدایہ پڑھ رہے تھے، ان کی مجلس میں ان دو طالب علموں سے زیادہ کوئی ذہین اور بحاث نہیں تھا، اس مجلس میں جب سلطان جی کا ذکر آتا تو یہ لوگ متعصّبانہ انداز میں ان کا ذکر کرتے، یہ بات خواجہ نصیر پر بہت گراں معلوم ہوتی اور آپ یہ کہتے کہ تم لوگ اس طرح کی باتیں سلطان جی کے بارے میں اسی وقت تک کر سکتے ہو جب تک کہ ان کو دیکھ نہ لو۔

ایک روز وہ لوگ سلطان جی کی خدمت میں ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے، جب حاضر خدمت ہوئے، تو سلطان جی نے پوچھا: آپ لوگ کہاں رہتے ہیں؟ ان لوگوں نے جواب دیا کہ شہر میں ہی رہتے ہیں، آپ نے پھر پوچھا: کہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں؟ ان لوگوں نے بتایا کہ مولانا فخر الدین ہانسوی کے پاس تعلیم حاصل کر رہے ہیں، پھر پوچھا: کیا پڑھ رہے ہیں؟ ان لوگوں نے عرض کی ہدایہ، پوچھا: سبق کہاں تک پہنچا ہے؟ خواجہ نصیر فرماتے ہیں کہ مولانا فخر الدین زرادی جو میرے بغل میں تھے آگے کی طرف بڑھ کر پورے سبق کی تقریر پیش کی اور اس سبق پر ان کو ایک اشکال تھا اسے بھی پیش کیا اور سلطان جی سے اس کی توضیح چاہی، آپ نے اپنے تبحر علمی کی وجہ سے علماء کے طرز پر اشکال کی ایسی توضیح کی کہ اس کی لطافت کی وجہ سے مولانا زرادی حیران رہ گئے، پھر پیچھے آ کر میرے کان میں کہا: میری خواہش ہے کہ سلطان جی سے میں اسی وقت بیعت ہو جاؤں، سلطان جی نے مجھ سے پوچھا: مولانا کیا کہہ رہے ہیں، میں نے عرض کی: اسی وقت مرید ہونا چاہتے ہیں۔ آپ نے مسکرا کر

فرمایا کہ کسی اور مجلس میں بیعت کرلوں گا، مولانا زرادی نے پھر مجھ سے کہا کہ اگر اسی مجلس میں مجھ کو بیعت نہیں کریں گے تو میں خود کو ہلاک کرلوں گا، یہ بات جب آپ کے کانوں تک پہنچی تو آپ نے فرمایا: اسی وقت بہتر ہوگا، چنانچہ اسی مجلس میں دونوں حضرات شرف بیعت سے مشرف ہوئے اور مولانا زرادی محلوق ہو گئے۔اس طرح وہ علما کی جماعت سے نکل کر درویشوں کے حلقے میں اس نیت سے داخل ہو گئے کہ وہی حال جوان کے پاس ہے ان کو بھی حاصل ہوجائے اور پھر اپنی ساری کتابیں اور کاغذ سب دوستوں کو نذر کر دیا۔(ایضا،نکتۂ اول در بیان ارادت آوردن مولانا فخر الدین زرادی بحضرت سلطان المشائخ،ص:۲۶۲۔۲۶۴)

امیر خورد نے لکھا ہے کہ ان کے والد نے سلطان جی کے گھر کے قریب میں کرائے پر ایک کمرہ لے رکھا تھا، وہاں درسگاہ قائم کر دی تھی اور وہاں باصلاحیت طلبہ کو جمع کر لیا تھا، وہیں نماز چاشت کی ادائیگی کے بعد مولانا زرادی مولانا رکن الدین اندرپتی کو ہدایہ پڑھاتے تھے۔ایک مرتبہ مولانا کمال الدین سامانی جو شہر کے مشہور عالم تھے، سلطان جی سے ملنے کے لیے آئے چوں کہ مولانا زرادی سے دوستی تھی اس لیے رخصت ہوتے وقت مولانا زرادی جہاں درس دیا کرتے تھے وہاں بھی گئے، مولانا زرادی ہدایہ کا درس دے رہے تھے مولانا سامانی کو دیکھ کر آپ نے ہدایہ کی احادیث چھوڑ کر صحیحین کی احادیث سے استدلال شروع کر دیا، مولانا سامانی نے کہا کہ آپ ہدایہ کی احادیث چھوڑ کر صحیحین کی احادیث سے استدلال کرتے ہیں؟ مولانا زرادی نے کہاں، ہاں، اگر آپ کو بھی اشکال ہو تو بتائیں۔مولانا سامانی نے جب آپ کا وہ درس سنا اور آپ کے استدلالات کو ملاحظہ کیا تو بڑی داد و تحسین کی۔(ایضا،نکتۂ سیوم،ص:۲۶۸)

۳۔مولانا علاء الدین نیلی

آپ بھی سلطان جی کے نمایاں خلفا میں تھے، علما کے درمیان اپنی دل کش گفتگو کے لیے معروف تھے اور اسی لیے بڑے بڑے علما آپ کے عاشق تھے، تفسیر کشاف اور مفتاح العلوم کے غوامض ومشکلات کے حل میں آپ کی مثال نہیں تھی، اودھ کے شیخ الاسلام مولانا فریدالدین شافعی کی مجلس میں آپ کشاف کی قراءت کرتے اور اس مجلس میں مولانا شمس الدین یحییٰ اور دیگر علمائے اودھ سامع ہوا کرتے تھے۔

(باب چہارم،تذکرہ مولانا علاء الدین نیلی،ص:۲۷۵)

۴۔قاضی محی الدین کاشانی

آپ بھی سلطان جی کے خلفا میں ہیں، سلطان جی کے اعلی درجے کے احباب کے درمیان وفور علم میں مشہور تھے اور دہلی شہر کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، سلطان جی نے آپ کو خود اپنے دست مبارک سے رقعہ لکھ کر خلافت دیا تھا۔(۱)اس خلافت نامے کا عربی حصہ سلطان جی کے عربی اجازت ناموں کے ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

---

(۱)ایضا،تذکرہ مولانا محی الدین کاشانی،ص:۲۹۴

۵۔مولانا وجیہ الدین پائلی

آپ بھی سلطان جی کے خلفا میں تھے، آپ اپنے ساتھ کوئی کتاب نہیں رکھتے تھے لیکن درس کے وقت کبار علما آپ کی مجلس میں باادب بیٹھتے، ہاتھ میں کتاب لیے بغیر ایک سبق پر گفتگو فرماتے پھر اسی سبق پر پہلی تقریر سے ہٹ کر دوسری تقریر فرماتے، آپ کے علو علم کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ بابا فرید قدس سرہ کے قبر کی زیارت کے لیے اجودھن گئے، جب روضے کے قریب پہنچ کر زمین بوس ہوئے اور بیٹھے تو روضے سے آواز آئی: ابوحنیفہ پائلی خوش آمدید۔

(ایضا، باب پنجم در بیان مناقب وفضائل وکرامات بعضی یاران اعلی، تذکرہ مولانا وجیہ الدین پائلی ،ص:۲۹۶)

۶۔مولانا فصیح الدین

آپ سلطان جی کے بلند رتبہ احباب میں تھے اور علم سے وافر حصہ رکھتے تھے۔ سلطان جی کی مجلس میں اکثر آپ علمی استفسارات کرتے، اور شافی جوابات سے نوازے جاتے۔ زمانۂ طالب علمی میں مولانا فصیح الدین اور قاضی محی الدین کاشانی دونوں اکثر ساتھ رہتے، مولانا شمس الدین قوشچہ کی مجلس میں طبقۂ اولی میں علم اصول فقہ کی تحقیق وتکمیل کی اور علما کے مابین ذکاوت طبع کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ (ایضا، تذکرہ مولانا فصیح الدین، ص:۲۹۹)

۷۔مولانا حجۃ اللہ ملتانی

آپ بھی سلطان جی کے مقرب اصحاب میں سے تھے، بہت سے علوم سے آراستہ تھے، طبقۂ مشائخ خواجگان چشت کے شجرے کو فصاحت وبلاغت کے ساتھ عربی میں نظم کیا تھا۔

(ایضا، تذکرہ مولانا حجۃ اللہ ملتانی، ص:۳۱۷)

۸۔مولانا جمال الدین اودھی

آپ بھی سلطان جی کے مقرب اصحاب اور مخلص مریدین میں سے تھے، اپنے وقت کے زبردست عالم تھے، سلطان جی نے آپ کو بیعت کے بعد جوان صالح کا خطاب دیا تھا۔

خراسان کا ایک عالم جس کو مولانا بحاث کہتے تھے، ایک مرتبہ اس نے شہر کے ایک عالم کو چیلنج کیا تھا لیکن کسی نے اس سے بحث نہیں کی۔ ایک مجلس میں وہ بھی موجود تھا، اسی مجلس میں مولانا وجیہ الدین اور سلطان جی کے دیگر صاحبان علم اصحاب موجود تھے، بزدوی کے بارے میں گفتگو چل رہی تھی، مولانا جمال الدین اودھی نے بحث شروع کی اور الزام قائم کر کے اس کو خاموش کر دیا۔

مولانا پائلی اور دیگر احباب نے داد وتحسین کی اور کہا کہ اللہ آپ پر اور آپ کے علم پر رحمت فرمائے کہ آپ نے اس کے سر سے غرور علم کو ختم کر دیا، خواجہ اقبال بھی وہاں موجود تھے جا کر سلطان جی کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! وہ جوان صالح تو عالم ہے، سلطان جی نے پوچھا کہ تم کو کیسے معلوم؟ انہوں نے عرض کی کہ اس جوان نے

مولانا بحاث کو بحث میں الزام وارد کر کے خاموش کر دیا اور مولانا پائلی اور دیگر اصحاب نے بھی ان کی تعریف کی، سلطان جی نے فرمایا کہ اس جوان کو احباب کے ساتھ حاضر کیا جائے، مولانا جمال الدین اودھی جب دیگر احباب کے ساتھ حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے ان سے فرمایا: تمہاری آمد پر اللہ کی رحمت ہو کہ تم نے اپنے علم کو نہیں بیچا، اس کے بعد سلطان جی نے قوالوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور پھر آپ سماع سننے میں مشغول ہو گئے، حکم ہوا کہ اے عاشق جوان! سماع سنو، پھر جس قدر سماع ہوتا رہا ان کی رقت بھی مستزاد رہی۔

(ایضا، تذکرہ مولانا جمال الدین اودھی، ص:۳۱۹، ۳۲۰)

مذکورہ شخصیات کے علاوہ اور بھی میدان علم وادب کی بڑی شخصیات آپ کے اصحاب میں تھی جن کا تذکرہ سیر الاولیاء میں دیکھا جا سکتا ہے ان میں سے خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی اور حضرت امیر خسرو کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے اور ان کی علمی وادبی مہارت پر بھی گفتگو ہو چکی ہے۔

مؤرخین کی شہادتیں

ہندوستانی عربی ادب کے مؤرخین عموما جب عہد سلطنت میں عربی زبان وادب کے فروغ وارتقا پر اور اس عہد میں موجود اہل زبان وادب پر جب گفتگو کرتے ہیں تو عموما اس حوالے سے حضرات صوفیہ چشت کے کردار کو فراموش کر جاتے ہیں، حالاں کہ یہ تقاضائے انصاف ہے کہ جس طرح ان کی دعوتی خدمات کا اعتراف کیا جائے اسی طرح ان کی لسانی خدمات کا بھی تذکرہ کیا جائے، البتہ بہت سے ہندوستانی مؤرخین نے ان کے لسانی رول کا بھی ذکر کیا اور اس ذیل میں حضرت سلطان المشائخ کا عربی زبان وادب سے جو تعلق تھا اس کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا۔ ذیل میں انہی میں سے بعض مؤرخین کی تصریحات کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

آپ نے فقہ واصول اور عربی علاء الدین اصولی سے پڑھی، پھر دہلی تشریف لے گئے اور درسی کتابیں اساتذۂ فن سے پڑھی، جن میں سے ایک شمس الدین خوارزمی ہیں، ان کے پاس مقامات حریری کے چالیس مقامات حفظ کیے، پھر صغانی کی مشارق الانوار کمال الدین محمد زاہد ماریکلی سے پڑھی اور مقامات کے کفارے میں مشارق حفظ کیا۔ (نزہۃ الخواطر، عبدالحی رای بریلوی، ج:۲، طبقۃ:۸، حرف میم، ص:۱۹۳)

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> حضرت خواجہ باطنی کمالات کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے، اپنے زمانے کے تمام علوم کو بلند ہمتی، محنت اور اہتمام سے پڑھا تھا، ان کے اساتذہ میں اس عہد کے نامور ترین فضلا اور شیوخ ہیں، ادب اور علوم دینیات کی تعلیم انہوں نے مستوفی الممالک شمس الملک مولانا شمس الدین خوارزمی سے پائی تھی، حدیث کا درس مولانا کمال الدین زاہد محمد بن احمد ماریکلی سے لیا جو صاحب

مشارق الانوار حسن بن محمد صغانی کے شاگرد (۱) اور بیک واسطہ صاحب ہدایہ کے شاگرد تھے۔

سیر الاولیاء میں ہے کہ مولانا رکن الدین چغمر نے کشاف اور مفصل اور ان کے علاوہ بعض کتابیں حضرت سلطان المشائخ کی خاطر نقل کر کے خدمت میں پہنچائیں، یہ دونوں کتابیں مشہور معتزلی فاضل علامہ محمود جار اللہ زمخشری متوفی (۵۳۸ھ) کی ہیں، پہلی کتاب تفسیر میں ہے اور دوسری نحو میں، اس سے بھی آپ کے علمی ذوق اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

(تاریخ دعوت وعزیمت، ج: ۳، باب پنجم، ص: ۱۲۶، ۱۲۷)

ہندوستانی عربی تراث کے مشہور مصری محقق ڈاکٹر عبدالمقصود محمد شلقامی مصری آپ کے عربی خطبہ: **الحمد لله الذي قصرت عن رؤيته أبصار الناظرين الخ** پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومن أصحاب الخطب المشهورة في الهند الشيخ نظام الدين أولياء ۷۲۵/۱۳۲۴ ومن قوله: ۔ (یہاں خطبے کا ذکر ہے)

ومن الواضح أن سمو الأفكار وأناقة الأسلوب في هذه الخطبة يرسمان صورة مشرقة لهذا الشيخ وتمكنه من اللغة ومهارته في البيان۔ (عربی سے ترجمہ، مقالہ: النثر الفني في شبه القارة الهندية، ماہنامہ الفیصل عربی، شمارہ: ۸۷ ص: ۸۷)

ترجمہ: ہندوستان میں جن کے عربی خطبے مشہور ہیں ان میں شیخ نظام الدین اولیا متوفی (۷۲۵ / ۱۳۲۴) ہیں ان کا یہ خطبہ ہے۔ (خطبہ آگے خطبات کے نمونوں میں پیش کیا گیا ہے۔)

یہ بات واضح ہے کہ اس خطبے میں افکار کی بلندی اور اسلوب کی عمدگی اس شیخ کی اور عربی زبان میں ان کے درک اور ان کی قوت تعبیر کی روشن تصویر پیش کرتے ہیں۔

---

(۱) یہ بات محل نظر ہے کیوں کہ تمام تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے کہ کمال الدین زاہد ماریکلی مصنف مشارق کے براہ راست شاگرد نہیں ہیں بلکہ ایک واسطے سے شاگرد ہیں، سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کو ان کی عطا کردہ سند حدیث جسے سلطان جی کے نسخۂ مشارق سے لے کر صاحب سیر الاولیاء نے نقل کیا ہے اس میں اس کی صراحت موجود ہے۔ وہ سند آگے سلطان جی کی اسانید کے ضمن میں آ رہی ہے۔ دوسری طرف خود ان کے والد نے نزہۃ الخواطر میں محمد بن احمد ماریکلی کے عنوان کے تحت ان کی سوانح میں اس کی صراحت کر دی ہے کہ ان کے دو شیخ ہیں ایک برہان الدین محمود بلخی اور دوسرے شارح آثار النیرین اور وہ دونوں مصنف مشارق کے شاگرد ہیں (ج: ۱، طبقہ: ۷، حرف میم، ص: ۱۱۷)

مزید یہ کی صاحب مشارق کے تذکرے میں انہوں نے برہان بلخی کے تلمذ کا تو تذکرہ کیا ہے لیکن کمال زاہد کے تلمذ کا تذکرہ نہیں کیا ہے (دیکھیں: ج: ۱، طبقہ: ۷، حرف حاء، ص: ۹۲)

مجھے گمان غالب ہے کہ یہاں کاتب کی غلطی سے ایک جملہ رہ گیا ہے اور پوری عبارت اس طرح تھی: ’’آپ نے حدیث اپنے زمانے کے مشہور محدث شیخ محمد الماریکلی مشہور کمال الدین زاہد سے پڑھی جو علامہ برہان الدین بلخی کے شاگرد تھے اور وہ مصنف مشارق الانوار علامہ حسن بن محمد صغانی کے براہ راست شاگرد تھے‘‘۔

ڈاکٹر زبید احمد سابق استاذ شعبہ عربی وفارسی الہ آباد یونی ورسٹی انہوں نے سلطان المشائخ کے عربی خطبے کے نص کا ابتدائی حصہ ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

The well-known Sufi of India named Shaykh Nizam al Din styled Sultan al- Awliya (725/ 1324 was an eminent scholar also. One khuta- bah of his has been much appreciated throug- hout India on account of the elegance of the style, coupled with heart- burning expression of a lover's zeal and enthusiasm for the divine love contained therein. It is still recited on the palpits at many Indian mosques. It's style is elegant and at the same time sublime-(The contribution of India to the Arabic literature, Chapter X1,P:184,185.)

ترجمہ: ہندوستان کے مشہور صوفی موسوم بہ شیخ نظام الدین ملقب بہ سلطان الاولیا متوفی (۷۲۵/ ۱۳۲۴) ایک نمایاں عالم بھی تھے۔ ان کا ایک خطبہ اسلوب کی عمدگی کے ساتھ اس کے اندر عشق الٰہی میں عاشق کے شوق و اشتیاق کی جو پرسوز تعبیر پیش کی گئی ہے اس کے لیے اس خطبے کی بہت تحسین کی گئی ہے۔ آج بھی بہت سی مساجد کے منبروں پر اسے پڑھا جاتا ہے، اس خطبے کا اسلوب عمدہ اور بہت خوبصورت ہے۔

ڈاکٹر علیم اشرف جائسی صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی لکھتے ہیں:

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ صوفیہ اسلام کی خدمت اور اس کی نشر واشاعت میں پیش پیش رہے لیکن اس کے باوجود عموما یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے عربی زبان پر توجہ نہیں دی اور اس میدان میں ان کی خدمات قابل ذکر نہیں ہیں، لیکن اس زمانے میں ہمیں بہت سے ایسے صوفیہ نظر آتے ہیں جو عربی زبان کی اعلی ثقافت رکھنے والے اور علوم عربیہ میں درک رکھنے والے تھے مثال کے طور پر انہیں میں سے شیخ فرید الدین چشتی ہیں- انہی صوفیہ میں شیخ نظام الدین دہلوی بھی ہیں- شیخ عربی زبان کے بڑے خطیب تھے، آپ کے خطبات میں روحانی تاثیر کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی فصاحت وحلاوت نمایاں ہے۔ (عربی سے ترجمہ، فصول في التعريف بالهند، الفصل السادس، المبحث الثالث: عصر المماليك والأتراك)

خواجہ نظام الدین اولیا کی علمی اسانید

سیر وسوانح کی کتابوں اور بالخصوص سیر الاولیاء کے مطالعے سے آپ کی تین عربی اسانید واجازات کا پتا چلتا ہے، پہلی وہ سند ہے جو آپ کے مرشد طریقت نے آپ کو خلافت اور دعوت وارشاد کی عطا فرمائی ہے اور چند کتابیں جو آپ نے اپنے مرشد سے پڑھی تھیں ان کی بھی اجازت اسی خلافت نامے میں مذکور ہے۔ وہ سند اجازت یہ ہے:

الحمد لله الذی قدم إحسانه علی منته و أخر شکره علی نعمته، هو الأول هو الآخر و الظاهر و الباطن، لا مؤخر لما قدم و لا مقدم لما أخر و لا معلن لما أبطن و لا مخفی لما أظهر، و لا یکاد نطق الأوائل و الأواخر علی دیمومته اعتبارا و تقابلا، و الصلاة علی رسوله المصطفی محمد و آله و أهل الودد و الارتضاء، و بعد،

فإن الشروع فی الأصول یوسع دعاء الشهود و یبصر لمن یکرع منها محارق الورود، علی أن الطریق مخوف و العقبة کؤود، و نعم الکتاب فی هذا الفن تمهید المهتدی لأبی شکور برد الله مضجعه، و قد قرأ عندی الولد الرشید الإمام النقی العالم الرضی نظام الملة و الدین محمد بن أحمد زین الأیمة و العلماء، مفخر الأجلة و الأتقیاء، أعانه الله علی ابتغاء مرضاته و أناله منتهی رحمته و أعلی درجاته سبقا بعد سبق من أوله إلی آخره قراءة تدبر و إیقان و تیقظ و إتقان مستجمع رعایة سمع و درایة جنان، و لما حصل الوقوف علی حسن استعداده کذلک و فور تهیؤه أجزته أن یدرس فیه للمتعلمین بشرط المجانبة عن التصحیف و الغلط و التحریف و بذل الجد و الاجتهاد فی التصحیح و التنقیح عن الزلل و علته المعول و الله العالم۔ و کان ذلک یوم الأربعاء من الشهر المبارک رمضان عظمه الله برکته بالإشارة العالیة أدام الله علاها و عن الخلل حماها۔

تحررت هذه الأسطر بعون الله علی ید أضعف الفقیر إلی الله الغنی إسحاق بن علی بن إسحاق الدهلوی بمشافهته حامدا و مصلیا فأجزت له أیضا بأن یروی عنی جمیع ما استفاده و حوی و سمع ذلک منی و دعا، و السلام علی من اتبع الهدی۔

و أجزت له أیضا أن یلازم الخلوة فی مسجد أقیمت فیه الجماعة و لا یخل بشرائطها التی بها حصول الزیادة و برفضها تکون الأقدام عاتلة ناصبة، و ذلک تجرید المقاصد عن مفاسدها و تفرید الهمة عما تغفلها، و بیان ذلک ما قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم: کن فی الدنیا کأنک غریب أو کعابری سبیل و عد نفسک من أصحاب القبور الحدیث، فعند ذلک صح قصده و اجتمع همته و صارت الهمم المختلفة همة واحدة فلیدخل الخلوة مفترا نفسه معدما للخلق عالما بعجزهم تارکا للدنیا و شهواتها واقفا علی مضارها و أمنیتها، و لتکن خلوته معمورة بأنواع العبادات، إذا سئمت نفسه عن احتمال الأعلی ینزله إلی الأدنی و إن حجت فلینزلها إما بعمل یسیر أو بالنوم فان فیه احتراز عن هواجس النفس، و لیحترز البطالة فإنها تقسي القلوب، و الله تعالی علی ذلک أعانه و یحفظه عما شانه، و رحمه و هو أرحم الراحمین، صلی الله علی محمد و آله۔

و أیضا إذا استوفر حظه من الخلوة و انفتحت بها عین الحکمة و اجتمعت خلواته بعباداته و

صل إليه من لم يقدر الوصول إلينا يستوفی إليه إياه يده العزيزة نائبة عن يدنا، وهو من جمة خلفائنا، والتزام حكمه فی أمر الدين والدنيا من جملة تعظيمنا، فرحم الله من أكرمه وعظم من أكرمناه وأهان من لم يحفظ حق من حفظناه۔ صح ذلک كله من الفقير المسعود، تم بعون الله وحسن توفيقه والله أعلم۔ (سیر الاولیاء، باب اول، نکتۂ ہشتم در بیان یافتن سلطان المشائخ خلافت ونعمتہای دینی، ص:۱۱۷)

ترجمہ: اس اللہ کے واسطے تعریف ہے جس نے اپنے فضل واحسان کو اپنی منت شماری پر مقدم کیا اور اپنی نعمت سے اپنے شکر کو مؤخر کیا، وہی اول وآخر اور ظاہر وباطن ہے، جس کو اس نے مقدم کیا اس کو کوئی مؤخر کرنے والا نہیں، اور جس کو اس نے مؤخر کیا اس کو کوئی مقدم کرنے والا نہیں، اور جس کو اس نے پوشیدہ کیا اسے کوئی ظاہر کرنے والا نہیں، اور جس کو اس نے ظاہر کیا اسے کوئی پوشیدہ کرنے والا نہیں۔ اولین وآخرین کی حمد وثنا اس کی شان بقا ودوام تک نہیں پہنچ سکتی، نہ از روئے اعتبار اور نہ از روئے مقابلہ۔ درود نازل ہو اس کے برگزیدہ رسول حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل پر اور ان کے محبین اور برگزیدہ لوگوں پر۔

حمد وصلاۃ کے بعد میں کہتا ہوں کہ علم اصول وعقائد میں مشغولیت حاضرین کی دعوت کی راہ کشادہ کرتی ہے اور اس شخص کو بصیرت عطا کرتی ہے جو اس علم سے لوگوں کے لیے آتش زدہ مقامات پر آب پاشی کرتا ہے کیوں کہ یہ راستہ نہایت خطرناک اور یہ گھاٹی سخت دشوار گزار ہے اور اس علم اصول میں بہترین کتاب ابوشکور سالمی کی تصنیف **تمهيد المهتدی** ہے۔ اس کتاب کو مجھ سے فرزند رشید امام پاک، عالم وبرگزیدہ نظام الدین محمد بن احمد زیب ائمہ، زینت علما، لائق فخر بزرگاں ومتقیاں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رضا کی تلاش وجستجو میں ان کی مدد فرمائے، اپنی انتہائی رحمت ان کو نصیب کرے اور ان کو اعلیٰ ترین مرتبہ عنایت فرمائے۔ انہوں نے سبقا سبقا اول سے آخر تک نہایت غور وخوض، فہم وفراست اور ایقان واتقان سے یہ کتاب مجھ سے پڑھی اور ہوش وگوش دل سے خوب محفوظ رکھا۔ چناں چہ مجھے جب ان کے حسن استعداد اور قابلیت ولیاقت سے خوب واقفیت ہوگئی تو میں نے ان کو اجازت دے دی کہ شاگردوں کو تعلیم دیں اور خطا وتصحیف سے بچتے رہیں اور لغزشوں کی اصلاح اور تحقیق وتنقیح میں پوری محنت کریں۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس سندنامے کی کتابت چہارشنبہ کے دن ماہ رمضان المبارک میں بندہ ضعیف، فقیر الی اللہ اسحاق بن علی بن اسحاق دہلوی کے ہاتھوں شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید المبارک (اللہ تعالیٰ ان کی قدر ومنزلت کو قائم ودائم فرمائے اور ان کو ہر ایک خلل سے محفوظ رکھے۔) کے سامنے ان کے اشارہ عالیہ کے مطابق انجام پذیر ہوئی۔ اللہ کے لیے حمد ہو اور اس کے رسول پر صلاۃ نازل ہو۔

نیز میں نے ان کو یہ بھی اجازت دے دی کہ انہوں نے جو کچھ مجھ سے استفادہ کیا ہے، سنا اور یاد رکھا ہے وہ سب مجھ سے روایت کریں۔ سلام ہو اس پر جو سیدھے راستے کی پیروی کرے۔

نیز میں ان کو یہ اجازت دیتا ہوں کہ ایسی مسجد میں خلوت نشین ہوں جس میں جماعت ہوتی ہو، اور خلوت نشینی کی ان تمام شرائط کو نگاہ میں رکھیں جن کی پابندی سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے اور جس کے ترک سے قدم شرکی طرف بڑھتے ہیں اور تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ خلوت کا اصل اصول مقاصد کو مفاسد سے جدا کرنا اور ہمت کو غفلت سے بچانا ہے۔ جس کی تفصیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمائی ہے کہ دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو جیسے کہ تم مسافر ہو یا راستے سے گزرنے والے، اور اپنے آپ کو اہل قبور میں شمار کرو۔ اس وقت خلوت نشین کا ارادہ درست، ہمت مجتمع اور ساری ہمتیں جمع ہو کر ایک بن جائیں گی تب وہ اپنے نفس کو کمزور کر کے، خلق کو معدوم سمجھ کر، ان کی عاجزی اور محتاجی سے واقف ہونے کے ساتھ دنیا کی خواہشات کو ترک کر کے اور اس کے نقصانات اور متوقع فائدوں سے واقف ہو کر خلوت میں داخل ہو۔ اس کی خلوت طرح طرح کی عبادات سے معمور ہونی چاہیے اور جب اس کا نفس بڑے بڑے مجاہدات سے تھک جائے تب اس کے آرام کی خاطر چھوٹے چھوٹے مجاہدے اختیار کرے اور اگر نفس دلیل و حجت کے ساتھ غالب آنے کی کوشش کرے تب تھوڑے عمل یا نیند سے اس کو راضی اور خوش کر دے۔ کیوں کہ نفس کو اتنا خوش رکھنے کا مقصد اس کی شورس سے بچنا ہے۔ خلوت نشین کو باطل کاموں سے پرہیز کرنا چاہیے کیوں کہ باطل اعمال دل کو سخت کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کاموں میں مولانا نظام الدین کی اعانت فرمائے اور ہر ایک بری بات سے ان کو محفوظ رکھے اور ان پر رحم فرمائے۔ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل پر نازل فرمائے۔

نیز جب وہ خلوت سے اپنا وافر حصہ لے لیں اور خلوت کے سبب چشمہ حکمت جاری ہو جائے، عبادات نافلہ سے ان کی خلوت پر ہو جائے اور ان کے پاس وہ شخص پہنچے جو ہم تک نہ پہنچ سکتا ہو، تو یہ اس کو نعمت سے سرفراز کریں۔ ان کا عزیز ہاتھ ہمارے ہاتھ کا قائم مقام ہے اور یہ ہمارے خلفا میں سے ہیں اور دینی و دنیاوی امور میں ان کا حکم بجالانا عین ہماری تعظیم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو ان کی بزرگی کا خیال رکھے اور اس شخص کی تعظیم بجالائے جس کو ہم نے بزرگی دی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس شخص کو ذلیل و خوار کرے جو اس شخص کے حقوق کی حفاظت نہ کرے جس کی ہم حفاظت کرتے ہیں۔

یہ مکمل سند اجازت و خلافت فقیر مسعود کی طرف سے صحیح و درست ہے۔ مولی تعالیٰ کی مدد اور حسن توفیق سے یہ سند مکمل ہوئی۔

دوسری وہ اجازت ہے جو خواجہ بدرالدین اسحاق نے آپ کو علم صرف پر مشتمل ایک منظوم رسالے کی عطا فرمائی ہے۔ وہ اجازت نامہ خواجہ بدرالدین اسحاق کے تذکرے میں پہلے گزر چکا ہے۔

تیسری وہ اجازت ہے جو علامہ کمال الدین زاہد نے آپ کو حدیث اور دیگر کتب کی عطا فرمائی ہے۔ اس سند کے الفاظ یہ ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد لمن له الاهتداء و الإعطاء و الصباح و الرواح، و المدح لمن له الآلاء و النعماء و الصباح و المداح، و الصلواة الفصاح علی ذی الفضائل السماء و الكلمة و الكلام المفتاح و المناقب العليا و الأحاديث الصحاح صلوة تدوم دوام الصباح و الرواح۔

و بعد فإن اللہ تعالی وفق الشيخ الإمام العالم الناسک السالک نظام الدين محمد بن أحمد بن علی مع وفور فضله فی العلم و بلوغ قدرة ذروة الحلم، مقبول المشائخ الكبار منظور العلماء الأخيار و الأبرار، بأن قرأ هذا الأصل المستخرج من الصحيحين علی ساطر هذه السطور فی زمن الزمن الحار و درور الأمطار من أوله إلی آخره قرأة بحث و إتقان و تنقيح معانيه و تنقيد مبانيه۔ و كاتب السطور يرويه قرأة و سماعا عن الشيخين الأمامين العاملين الكاملين۔ أحد الشيخين مؤلف شرح آثار النيرين فی أخبار الصحيحين، و الآخر صاحب الدرسين المنيرين الإمام الأجل الكامل مالک رقاب النظم و النثر، برهان الملة و الدين محمود بن أبی الحسن أسعد البلخی رحمة اللہ عليهما رحمة واسعة، كتابة و شفاهة وهما يرويانه عن مؤلفه۔ و أجزت له أن يروی عنی كما هو المشروط فی هذا الباب و اللہ اعلم بالصواب، و أوصيه أن لا ينسانی و أولادی فی دعواته فی خلوته، و صح له القراءة و السماع فی المسجد المنسوب إلی نجم الدين أبی بكر التواسی رحمه اللہ فی بلدة دهلی صانها اللہ عن الآفات و العاهات۔

و هذا خط أضعف عباد اللہ و أحقر خلقه محمد بن أحمد بن محمد الماريكلی الملقب بكمال الزاهد، و الفراغ من القراءة و السماع و كتابة هذه السطور فی الثانی و العشرين من ربيع الأول سنة تسع و سبعين و ست مأة حامدا اللہ تعالی و مصليا علی رسوله۔ (ایضا، باب اول، نکتۂ سوم در بیان علم وتبحر سلطان المشائخ، ص: ۱۰۴، ۱۰۵)

ترجمہ: بسم اللہ الرحمن الرحیم، تمام حمد ہے اس اللہ کے لیے جس کی طرف سے ہدایت ملتی ہے، جس کی صفت عطا و نوازش ہے اور جس کے لیے صبح و شام ہے۔ تمام تعریفیں ہیں اس کے لیے جس کی جانب تمام نعمتیں لوٹتی ہیں اور جس کے لیے صبح ہے اور جس کے لیے ثنا ہے، واضح و روشن صلاۃ نازل ہو بلند و بالا فضیلتوں والی ذات گرامی پر جن کی ہر چھوٹی بڑی گفتگو سے بند دروازے کھلتے ہیں جو اعلیٰ مناقب والے ہیں اور صحیح حدیثوں والے ہیں، ان پر ایسا درود نازل ہو کہ جب تک صبح و شام باقی ہے اس وقت تک ان پر درود کا نزول ہوتا رہے۔

بعدہٗ عرض ہے شیخ و امام عالم و زاہد و سالک نظام الدین محمد بن احمد علی کو وافر علم و فضل، اور اعلی عقل رکھنے کے باوجود، مشائخ کبار کا مقبول نگاہ اور علماے اخیار و ابرار کا منظور نظر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بات کی توفیق دی کہ انہوں نے صحیحین سے مستخرج اس اصل کو راقم الحروف کے پاس شدید گرمی اور بارش کے

زمانے میں ازاول تا آخر بحث واتقان، معانی کی تنقیح اورالفاظ کی تحقیق کے ساتھ پڑھا۔ راقم الحروف اس اصل کو قراءت وسماعت ،تحریری وشفوی دونوں لحاظ سے دوشیخ وامام، عالم کامل سے روایت کرتا ہے جن میں سے ایک تو شرح آثار النیرین فی اخبار الصحیحین کے مؤلف ہیں اور دوسرے مشہور مدرس، امام اجل وامام کامل، نظم و نثر کا ملکہ رکھنے والے برہان الملۃ والدین محمود بن ابوالحسن اسعد بلخی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں پر اپنی رحمت واسعہ نازل فرمائے۔ وہ دونوں اس کتاب کے مؤلف سے اس کی روایت کرتے ہیں۔ میں نے ان کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ مجھ سے اس باب میں متحقق شرطوں کے مطابق اس کتاب کی روایت کریں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میں ان کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو اور میری اولاد کو اپنی دعاؤں اور اپنی خلوتوں میں فراموش نہ کریں، ان کی طرف سے اس کتاب کی قراءت وسماعت نجم الدین ابوبکر تواسی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب مسجد میں بمقام دہلی ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ دہلی کو آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے۔

یہ اضعف العباد واحقر الخلق محمد بن احمد بن محمد ماریکلی ملقب بکمال زاہد کی تحریر ہے۔ اس کتاب کی قراءت وسماعت اور اس اجازت نامے کی تحریر سے فراغت ۲۲/ربیع الاول ۶۷۹ھ میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے لیے حمد ہے اور اس کے رسول پر درود وسلام نازل ہو۔

ان تینوں اجازت ناموں سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ عربی زبان سے چوں کہ آپ کو خاص ذوق تھا اسی لیے آپ کو اجازت نامے عربی میں عطا کیے گئے ورنہ اس عہد میں فارسی اجازت ناموں کا بھی چلن عام تھا۔

سلطان المشائخ کے عطا کردہ اجازت نامے

آپ نے جو خلافت نامے عطا فرمائے ان کے صرف دو عربی نمونے تاریخ نے محفوظ کیے ہیں، ذیل میں ان دونمونوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ ان میں پہلا وہ خلافت نامہ ہے جو آپ نے مولانا شمس الدین یحییٰ کو عنایت فرمایا تھا۔ وہ خلافت نامہ یہ ہے:

بسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لله الذى سمت همم أوليائه عن الركون (۱) إلى الأكوان عارا، واعتلقت هومهم بالواحد الحنان بارا، فدارت عليهم بكرة وعشيا كأس المحبة من كوثر محبوبهم دارا، كلما جن عليهم الليل تشتعل قلوبهم من الشوق نارا، و تفيض أعينهم من الدمع مدرارا، ويتمتعون بمناجاة الحبيب أسرارا ويطوفون بسرادقات العز أفكارا، لايزال منهم فى زمان من هم على مكنونة نضارة العرفان فيظهر فى الأقطار آثاره، ويزهر فى الآفاق أنواره، لسانه ناطق بالحق و هو داعى الله فى الخلق ليخرجهم من الظلمات إلى النور ويقربهم إلى الرب الغفور ثم الصلاة على صاحب الشريعة الغراء والطريقة الزهراء رسول الرحمة المخصوص بخلافة ربه فى مقام البيعة،

---

(۱) سیر الاولیا کے مطبوعہ نسخے میں ''رکوان'' ہے، تصحیح سیر الاولیا کے خطی نسخے سے کی گئی ہے۔ دیکھیں: سیر الاولیا خطی، ص: ۳۵۲

وعلى خلفاءه الراشدين الذين فازوا بكل مقام علی، وعلى الذين يدعون ربهم بالغداة والعشی۔

أما بعد فإن الدعوة إلى الواحد العلام من أرفع دعائم الاسلام وأوثق عروة فی الإيمان على ماورد فی الخبر عنه عليه السلام: والذی نفس محمد بيده لئن شئتم لأقسمن لكم، إن أحب عباد الله إلى الله الذين يحببون الله إلى عباد الله ويحببون عباد الله إلى الله ويمشون على الأرض بالنصيحة والأمر، وما مدح الله عباده الذين يقولون ربنا هب لنا من أزواجنا وذرياتنا قرة أعين واجعلنا للمتقين اماما، وقد أوجبها الله تعالى على وفقه لاتباع سيد المرسلين وقائد الغر المحجلين بقوله عز وجل: قل هذه سبيلی أدعو إلى الله على بصيرة أنا ومن اتبعنی، واتباعه انما يكون برعاية أقواله والاقتداء به فی أعماله وتنزيه السر عن كل ماسوى الله فی الوجود، والانقطاع الى المعبود۔

ثم إن الولد الأعز التقی والعالم المرضی المتوجه إلى رب العالمين شمس الملة والدين محمد بن يحيی۔ أفاض الله الواحد أنواره على أهل اليقين والتقوی۔ لما صح قصده إلينا ولبس خرقة الإرادة منا واستوفی الحظ من صحبتنا أجزت له إذا استقام على اتباع سيد الكائنات واستغرق الأوقات بالطاعات وراقب القلب عن هواجس النفس والخطرات وأعرض عن الدنيا وأسبابها ولم يركن إلى أبناءها وأربابها وانقطع إلى الله بالكية وأشرقت فی قلبه الأنوار القدسية والأسرار المكنونة وانفتح باب فهم التعريفات الإلهية۔ أن يلبس الخرقة للمريدين ويرشدهم إلى مقامات الموقنين كما أجازنی بعد ما لاحظنی بنظره الخاص وألبسنی خرقة الاختصاص شيخنا الفايح فی الأقطار فوائح نفحاته، الرايح فی الآفاق لوامع كراماته، السائح فی عالم القدس أفكاره، البائح بمحبة الرحمن أثاره، قطب الورى علامة الدنيا فريد الحق والشرع والدين طيب الله ثراه وجعل حظيرية القدس مثواه، وهو لبس الخرقة من ملک المشايخ سلطان الطريقة قتيل محبة الجبار قطب الملة والدين بختيار أوشی وهو من بدر العارفين معين الملة والدين الحسن السنجری، وهو من حجة الحق على الخلق عثمان الهارونی، وهو من سديد النطق الحاجی الشريف الزندنی، وهو من ظل الله فی الخلق مودود الجشتی، وهو من ملک مشايخ أهل التمكين ناصر الملة والدين يوسف الجشتی، وهو من ملجا العباد محمد الجشتی، وهو من عمدة الأبرار وقدوة الأخيار أبی احمد الجشتی، وهو من سراج الأتقياء أبی إسحاق الجشتی، وهو من شمس الفقراء علو الدينوری، وهو من أكرم أهل الإيمان هبيرة البصری، وهو من تاج الصالحين برهان العاشقين حذيفة المرعشی وهو من سلطان السالكين برهان الواصلين تارک المملكة والسطلنة إبراهيم بن أدهم، وهو من قطب الولاية أبی الفضل والفضائل والدراية الفضيل بن عياض وهو من قطب العالم والشيخ المعظم

عبدالواحد ابن زید، وهو من رئیس التابعین إمام العارفین الحسن البصری وهو من أمیر المؤ منین فی أعالی المقامات المنتهی إلیه خرقة کل طالب علی بن ابی طالب کرم اللہ وجهه، قدس اللہ اسرارهم وأبقی إلی یوم القیامة أنوارهم، وهو من سید المرسلین خاتم النبیین المنوط باتباعه محبة رب العالمین محمد المصطفیٰ صلی اللہ علیه وآله وسلم وعلی کل من به انتمی و اقتدی۔

فمن لم یصل إلینا و وصل الیه فقد استخلفناه عنا فیده العزیز ة نائبة عن یدنا و التزام حکمه فی امر الدین و الدنیا من تعظیمنا ، ورحم اللہ من عظمناه، وأهان من لم یحفظ حق من حفظناه و اللہ الموفق الهادی و المستعان وعلیه التکلان۔ (ایضا، باب چہارم، نکتۂ چہارم، ص: ۲۲۹، ۲۳۱)

ترجمہ: تمام حمد اس اللہ کے لیے جس نے اپنے دوستوں کی ہمتوں کو کائنات کی جانب متوجہ ہونے سے بلند رکھا، کیوں کہ یہ چیز ان کے لیے باعث عار ہے اور ان کی لو صدق و طاعت کے ساتھ الٰہ واحد سے لگی ہے جو بہت زیادہ اپنے بندوں سے محبت فرمانے والا ہے، چناں چہ ان کے محبوب کے کوثر سے صبح و شام ان پر جام محبت کا دور چلا، جب جب رات ہوتی ہے تو ان کے قلوب آتش شوق سے بھڑک اٹھتے ہیں اور ان کی آنکھیں آنسوؤں کی برکھا برساتی ہیں اور محبوب سے مناجات اور سرگوشی کا لطف اٹھاتے ہیں اور رب العزت کے گھر کا عالم فکر و خیال میں طواف کرتے ہیں۔ ہر زمانے میں ایسے بندگان مولی رہتے ہیں جو معرفت کے تر و تازہ اسرار اپنے سینے میں چھپائے ہوتے ہیں، کائنات میں ان کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، آفاق میں ان کے انوار روشن ہوتے ہیں، ان کی زبان حق کی ناطق اور وہ خلق کی جانب اللہ کے داعی ہیں تا کہ ان کو تاریکی سے نور کی طرف لے جائیں اور ان کو رب غفور کا قرب عطا کریں۔

پھر صلاۃ و سلام نازل ہو روشن شریعت والے، پر نور طریقت والے رسول رحمت پر جو مقام بیعت میں اپنے رب کی خلافت کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان کے خلفاے راشدین پر جو ہر بلند مقام سے سرفراز ہوئے اور ان لوگوں پر جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

بعدہ عرض یہ ہے کہ الٰہ واحد و علام کی طرف دعوت دینا اسلام کا بلند ترین ستون اور ایمان کی مضبوط رسی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان! اگر تم لوگ چاہو تو میں ضرور قسم کھا کر یہ بات کہہ دوں کہ بے شک اللہ کی بارگاہ میں اللہ کے سب سے محبوب بندے وہ لوگ ہیں جو اللہ کی ذات کو اللہ کے بندوں کے نزدیک محبوب بنا کر پیش کرتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو رب تعالیٰ کی بارگاہ میں مقام محبوبیت کے لائق بناتے ہیں اور روئے زمین پر نصیحت و خیر خواہی اور امر ربانی کے ساتھ چلتے ہیں اور وہ بندے اللہ کے سب سے محبوب بندے ہیں جو لوگ یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ازواج و اولاد میں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی وجہ سے سید المرسلین، قائد الغر المحجلین کی اتباع میں دعوت دین کو واجب قرار دیا اور فرمایا: اے رسول آپ فرما دیجیے یہ میری راہ ہے جس کی طرف بصیرت کے ساتھ میں دعوت دیتا ہوں اور میرے متبعین اس کی دعوت دیتے ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اقوال میں ان کی رعایت، اعمال میں ان کی اقتدا اور ما سوی اللہ سے قلب و سر کو پاک کر کے معبود کی طرف کلی توجہ سے ہوتا ہے۔

پھر یہ کہ فرزند اعز، متقی و عالم مقبول و متوجہ بہ جناب رب العالمین شمس الملۃ والدین محمد بن یحییٰ (الٰہ واحد اہل یقین وتقویٰ پر اپنے انوار کا فیضان نازل فرمائے) جب ان کا ہماری طرف قصد وارادہ درست ہو گیا اور انہوں نے ہم سے خرقہ ارادت پہن لیا، ہماری صحبت سے پورا حظ اٹھالیا تو میں نے ان کو جازت دے دی کہ وہ مریدین کو خرقہ پہنائیں اور ان کو صاحبان ایقان کے مقامات کی رہنمائی کریں، بشرطیکہ وہ خود سید کائنات کی پیروی میں استقامت کے ساتھ لگے رہیں، اپنے اوقات کو طاعتوں میں لگائیں، نفسانی خطرات وحوادث سے قلب کی نگرانی رکھیں، دنیا اور اسباب دنیا سے اعراض کریں، دنیا داروں اور دنیا والوں کی طرف مائل نہ ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف بالکلیہ متوجہ رہیں، پھر نتیجتاً ان کے قلب میں قدسی انوار اور ملکوتی اسرار چمک اٹھیں، اور معرفت الٰہی کے فہم کا باب کھل جائے، جس طرح اپنی نگاہ خاص فرمانے کے بعد اور خرقہ اختصاص پہنانے کے بعد میرے شیخ نے مجھ کو اجازت دی۔ وہ شیخ کہ عالم میں جن کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے اور جن کی کرامتوں کے انوار سے آفاق منور ہیں، جن کے افکار عالم قدس میں سیر کرنے والے ہیں اور جن کے آثار سے محبت الٰہی کی خوشبو پھوٹتی ہے، یعنی قطب الورع، علامۃ الدنیا، فرید الحق والشرع والدین- اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو معطر فرمائے اور حظیرۃ القدس کو ان کا آشیانہ بنائے-

انہوں نے یہ خرقہ ملک المشائخ، سلطان طریقت، قتیل محبت الٰہی، قطب الملۃ والدین بختیار اوشی سے پہنا، انہوں نے بدر العارفین معین الملۃ والدین حسن سنجری سے، انہوں نے خلق خدا پر اللہ کی حجت عثمان ہارونی سے، انہوں نے سدید النطق حاجی شریف زندنی سے، انہوں نے ظل رحمانی مودود چشتی سے، انہوں نے ملک المشائخ، صاحب تمکین ناصر الملۃ والدین یوسف چشتی سے، انہوں نے ملجا العباد محمد چشتی سے، انہوں نے عمدۃ الابرار قدوۃ الاخیار ابو احمد چشتی سے، انہوں نے سراج الاتقیا ابو اسحاق چشتی سے، انہوں نے شمس الفقرا علو دینوری سے، انہوں نے اکرم اہل ایمان ہبیرہ بصری سے، انہوں نے تاج الصالحین برہان العاشقین حذیفہ مرعشی سے، انہوں نے سلطان السالکین برہان الواصلین تارک مملکت وسلطنت ابراہیم بن ادہم سے، انہوں نے قطب ولایت ابو الفضل، صاحب فضیلت ودرایت فضیل ابن عیاض سے، انہوں نے قطب عالم شیخ معظم عبد الواحد ابن زید سے، انہوں نے رئیس التابعین، امام العارفین، حسن بصری سے، انہوں نے امیر المؤمنین فی اعالی المقامات، جن تک ہر طالب کا خرقہ پہنچتا ہے یعنی علی ابن طالب کرم اللہ وجہہ سے۔ اللہ تعالیٰ تمام مشائخ کے اسرار وارواح کو قدسی بنائے اور ان کے انوار کو قیامت تک باقی رکھے۔ انہوں نے سید المرسلین خاتم النبیین جن کے اتباع پر رب العالمین کی محبت کا

دارومدار ہے یعنی محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر صلاۃ وسلام نازل فرمائے اور آپ کی آل پر اور ان تمام لوگوں پر جو ان سے نسبت رکھتے ہیں جو ان کی اقتدا کرتے ہیں۔

چناں چہ جو ہم تک نہ پہنچ سکے اور ان تک طالب بن کر پہنچے تو ہم نے ان کو اپنی جانب سے خلیفہ و نائب بنایا، چنانچہ ان کا دست عزیز ہمارے دست کا نائب ہے اور دین و دنیا کے معاملے میں ان کے حکم کی پیروی دراصل ہماری تعظیم ہے، اللہ اس پر رحم فرمائے جس کی ہم نے تعظیم کی، اور اسے ذلیل و رسوا کرے جو اس کے حقوق کی حفاظت نہ کرے جس کے حقوق کی ہم نے حفاظت کی۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا، ہدایت عطا فرمانے والا اور مستعان ہے اور اسی پر توکل ہے۔

مقالہ نگار کہتا ہے: سلطان المشائخ کے عطا کردہ اس خلافت نامہ پر آپ کی دستخط ہے، البتہ اس کا متن سلطان المشائخ کے حکم سے مولانا فخر الدین زرادی کا مسودہ کردہ ہے اور اس کا مبیضہ سید حسین بن محمد علوی کرمانی نے تیار کیا ہے اور تاریخ خلافت ۲۰/ذی الحجہ ۷۲۴ھ ہے۔ یہاں قابل توجہ یہ ہے کہ یہ خلافت نامہ سلطان المشائخ کے اشارے سے اگر چہ لکھا گیا ہے لیکن اگر آپ نے اس کے مضمون کو مختصرا مولانا زرادی سے بیان کر دیا تھا جیسا کہ عموما طریقہ ہے تو یہ بھی عربی زبان پر قدرت کی دلیل ہے۔ اور اگر مستقلا یہ متن مولانا زرادی کا تیار کردہ ہے تب بھی اس میں سلطان جی کی عربی زبان پر قدرت کا اشارہ موجود ہے وہ اس طرح کہ عموما کسی بڑی شخصیت کی طرف سے اپنے کسی سینیر شاگرد کو اسی وقت اس طرح کے کام کرنے کا حکم ملتا ہے جب کہ وہ اس کے ذوق زبان و منہج بیان سے واقف ہو گویا کہ مولانا زرادی کا تیار کردہ یہ متن دراصل سلطان المشائخ کے ذوق عربی زبان کا عکاس ہے۔

دوسرا خلافت نامہ وہ ہے جو آپ نے مولانا محی الدین کاشانی کو عطا فرمایا تھا۔ اس کا پورا متن تو فارسی میں ہے لیکن اس کا آخری حصہ عربی میں ہے۔ خلافت نامے کا وہ عربی حصہ یہ ہے:

فإن فعلت ما أمرتك فظني بك أن تفعل كذلك فأنت خليفتي، وإن لم تفعل فالله خليفتي على المسلمين۔ (سیر الاولیاء، باب پنجم، تذکرہ مولانا محی الدین کاشانی، ص: ۲۹۵)

ترجمہ: جو میں نے تم کو حکم دیا ہے اگر اس پر عمل کرو گے اور مجھے امید ہے کہ تم اس پر عمل کرو گے، تو تم میرے خلیفہ ہو اور اگر اس پر عمل نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ میرے بعد مسلمانوں کا ولی اور مرشد و ہادی ہے۔

خطبۂ جمعہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی قَصُرَتْ عَنْ رُؤْيَتِهِ أَبْصَارُ النَّاظِرِيْنَ وَعَجَزَتْ عَنْ نَعْتِهِ أَوْهَامُ الْوَاصِلِيْنَ وَابْتَدَعَ بِقُدْرَتِهِ ابْتِدَاعًا وَاخْتَرَعَ عَلٰى مَشِيَّتِهِ اخْتِرَاعًا وَأَنْطَقَ لِسَانَ الذَّاكِرِيْنَ بِذِكْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَوْدَعَ مَفَاتِيْحَ الْأَنْوَارِ فِی صُدُوْرِ الْعَالَمِيْنَ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا اللّٰهُ وَرَوَّحَ أَرْوَاحَ الْمُشْتَاقِيْنَ بِرَوْحِ الْإِشْتِيَاقِ

فِي مُشَاهَدَةِ جَمالِ اللهِ وَأَهْرَقَ دَمَ المُحِبِّينَ بِسَيْفِ الجَلالِ فِي بَيْدَاءِ وِصالِ اللهِ وأَحْرَقَ قُلُوبَ العَاشِقِينَ بِنَارِ العِشْقِ فِي ابْتِغَاءِ لِقاءِ اللهِ وَخَلَقَ الجَنَّةَ وَالنَّارَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَالْكُفَّارِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ أَسَاءُوْا بِما عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنٰى، فَلَوْ كَانَتِ الْجَنَّةُ نَصِيبَ الْعَارِفِينَ بِدُوْنِ جَمالِهٖ وَوِصَالِهٖ فَوَاوَيْلَاهُ، وَلَوْ كَانَتِ النَّارُ نَصِيبَ العَاشِقِيْنَ مَعَ جَمَالِهٖ وَوِصَالِهٖ فَوَاشَوْقَاهُ۔ (حوالے گزر چکے)

ترجمہ: تمام حمد ہے اس اللہ کے لیے جس کے دیدار سے دیکھنے والوں کی آنکھیں کوتاہ ہیں۔ اور جس کے اوصاف کے بیان سے واصلین کے عقول عاجز ہیں۔ جس نے اپنی قدرت سے نئی نئی بے مثال چیزیں بنائیں، اور اپنی مشیت سے نوع بنوع اشیا کو وجود بخشا، جس نے ذاکرین کی زبانوں پر لا الہ الا اللہ کا ذکر جاری کیا، جس نے صاحبان علم کے سینوں میں ایسے کلید انوار کو ودیعت کیا جن کو اللہ ہی جانتا ہے۔ جس نے اہل شوق واشتیاق کی روحوں کو مشاہدہ جمال الٰہی کے شوق سے چین وسکون بخشا، اور اپنے سیف جلال سے وصال ربانی کے صحرا میں اہل محبت کا خون بہایا اور عاشقوں کے دلوں کو لقاے مولیٰ کی تلاش میں آتش عشق میں جلایا۔ اس نے جنت وجہنم کو مومنوں اور کافروں کے لیے پیدا کیا تاکہ وہ بدعملی کرنے والوں کو ان کی بدعملی کا بدلہ دے، اور صاحبان احسان کو ان کے حسن عمل کی جزا عطا فرمائے۔ اگر عارفین کے حصے میں اس کے جمال ووصال کے بغیر جنت آئے تو ہائے مصیبت اور اگر عاشقوں کے نصیبے میں اس کی جمال ووصال کے ساتھ جہنم آئے تو واہ رے شوق۔

پہلے سلطان المشائخ کے جس خطبے کا ابتدائی حصہ ڈاکٹر زبید احمد اور ڈاکٹر عبدالمقصود محمد شلقامی کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے وہی خطبہ مکمل طور سے مشائخ صوفیہ کی بیاضوں میں موجود رہا ہے۔ چنانچہ یہ خطبہ مکمل طور پر داعی اسلام حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی (سجادہ نشین خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں) کے پیر ومرشد حضرت شاہ ریاض احمد ملقب بہ شاہ احمد صفی محمدی صفوی قدس سرہٗ (م: ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۷۹ء) کی بیاض میں موجود تھا۔ حضرت داعی اسلام نے یہ خطبہ مولانا اشتیاق عالم مصباحی (استاذ جامعہ عارفیہ) کو جمعہ کے خطبے میں پڑھنے کے لیے اسی بیاض سے نقل کر کے عطا فرمایا تھا۔ خطبے کا ابتدائی حصہ تو مذکورہ بالا محققین کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے اور اب یہاں اُس کا باقی ماندہ حصہ نقل کیا جا رہا ہے:

اَلْحَمْدُ لله الَّذِی مَنَّ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنْفُسِهِم عَرَبًا وَعَجَمًا وَأَشَدِّهِمْ بِهٖ رَأْفَةً وَّرَحْمَةً، وَأَعْطَاهُ حِكْمَةً وَّحُكْمًا، وَفَتَحَ بِهٖ أَعْيُنًا عُمْيًا وَقُلُوْبًا غُلْفًا وَآذانًا صُمًّا، فَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖ أَعْمٰى فَهُوَ فِي الآخِرَةِ أَعْمٰى، وَنَشْهَدُ أَن لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

اِعْلَمُوْا أَنَّ الدُّنْيَا دَارُ الْمِحَنِ وَمَوْضِعُ الْفِتَنِ، وَأَنَّهَا دَارُ أَوْجَاعٍ وَّأَحْزَانٍ، وَبَيْتُ عِبْرَةٍ وَامْتِحَانٍ، كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالإِكْرَامِ، إِنَّكُمْ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ بَعْدَ ذٰلِكَ تُبْعَثُوْنَ، وَفِي

الْعَرَصَاتِ تُحْضَرُوْنَ، عَنِ الْمَعَاصِي تُسْئَلُوْنَ، فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ نَاعِمُوْنَ وَفَرِيقٌ فِي النَّارِ مَحْرُوْمُوْنَ۔
بَارَکَ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ۔

تمام حمد اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے مومنوں پر احسان فرمایا ہے جب کہ اس نے انہیں میں سے ایک عظیم رسول کو مبعوث فرمایا جو عرب وعجم سب میں سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ رحیم ومہربان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت اور حکمت عطا فرمائی، ان کے ذریعہ اندھی آنکھوں کو بینائی سے نوازا، بند دلوں کے تالے کھولے اور بہرے کانوں کو سماعت کی قوت عطا فرمائی۔ چناں چہ جو اس دنیا میں نابینا ہے وہ آخرت میں بھی نابینا ہوگا اور ہم شہادت دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

یہ بات ذہن نشین کرلو کہ دنیا مشقتوں اور فتنوں کا گھر ہے یہ دنیا تکلیف ومصیبت، غم واندوہ کا ٹھکانہ ہے اور عبرت وامتحان کی جا ہے۔ جو بھی دنیا میں ہے وہ ایک دن فنا ہو جائے گا اور تمہارے رب ذوالجلال والاکرام کی ذات باقی رہ جائے گی۔ بے شک تم سب موت کے گھاٹ اتر جاؤ گے پھر اس کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے، میدان قیامت میں حاضر کیے جاؤ گے، گناہوں کے بارے میں سوال ہوگا، چناں چہ ایک جماعت جنت میں راحت وآرام میں ہوگی تو دوسری جماعت جہنم میں محروم پڑی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمہارے لیے قرآن کریم میں برکتیں نازل فرمائے۔

تجزیہ

درج بالا سطور میں چند طریقوں سے حضرت سلطان المشائخ کے ذوق عربی زبان وادب پر استدلال کیا گیا ہے، آپ کی تعلیم وتربیت میں موجود عربی عناصر کا تذکرہ کیا گیا ہے، آپ کے بیان کردہ علمی ولغوی نکات کو درج کیا گیا ہے، آپ کے عربی نثر پاروں کے نمونے نقل کیے گئے ہیں جن میں آپ کی مختصر عربی تحریریں، طبع زاد عربی اقوال اور دیگر مشائخ کے وہ اقوال بھی شامل ہیں جن کو آپ نے اپنی مجالس میں بیان فرمایا یا اپنی تحریروں میں جگہ دی، مزید یہ کہ اس میں بعض وہ عربی اشعار بھی درج کیے گئے ہیں جن کو آپ نے اپنی مجالس میں پڑھا یا اپنی تحریروں میں نقل فرمایا، کیوں کہ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ ساری چیزیں بلاواسطہ یا بالواسطہ آپ کے ذوق عربی زبان وادب پر دلیل ہیں۔

مقالے میں ذکر کردہ آپ کے عربی نثر پاروں میں انہی کو نقل کیا گیا ہے جن کو امیر خورد کرمانی نے یہ کہہ کر نقل کیا ہے کہ میں نے سلطان المشائخ کے دست مبارک سے یہ تحریر لکھی ہوئی دیکھی، مزید یہ کہ ان دستی تحریروں میں بھی انہی تحریروں کو نقل کیا گیا جن کے حوالے سے مقالہ نگار کو داخلی وخارجی شہادتوں کی بنا پر کم ازکم ظن غالب ہو گیا ہے کہ یہ آپ کی طبع زاد تحریر ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض تحریریں تو بالکل طبع زاد ہیں اور بعض آپ کے مطالعے سے گزری ہوئی کتابوں کے مضامین کا خلاصہ ہیں اور خلاصہ نگار جانتے ہیں کہ خلاصہ نگاری میں اصل تحریر کے الفاظ اور اس کا آہنگ آ ہی جاتا ہے، اس لیے ان تحریروں میں بھی وہی رنگ وآہنگ نظر آتا ہے۔ ادبی لحاظ سے اگر ان نمونوں کا تجزیہ کیا جائے تو

معلوم ہوگا کہ یہ تحریریں اسلوب مساوات کی نمائندہ ہیں جن میں زبان کی فصاحت اوراسلوب کی بلاغت نمایاں ہے۔

ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ سلطان المشائخ کا جوعہد ہے اس زمانے میں پوری دنیامیں عموما اور ہندوستان میں خصوصا عربی ادب اپنی اصالت اور رونق کھو چکا تھا اوراس پر معنی اور روح سے زیادہ ظاہر داری مثلا مسجع ومقفی تراکیب اور جناس کا استعمال غالب آچکا تھا بلکہ مشہور مصری ادیب حسن زیات کے مطابق عربی زبان کی حالت اس دلہن کی ہوگئی تھی جو اندر سے ٹی بی کی مریضہ ہولیکن اس کواوپر سے انتہائی خوبصورت قیمتی لباس اور زیورات سے آراستہ کردیا گیا ہو، اس کے باوجود جب سلطان المشائخ کی عربی تحریروں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظاہرداری کے تکلفات سے خالی اور پرتکلف سجع بندی اوردیگر محسنات لفظیہ کی بیڑیوں سے آزاد ہیں۔

جہاں تک طبع زاد اقوال کی بات ہے تو ان میں آپ کا ذاتی ذوق نمایاں ہے اور وہ آپ کے طبع زاد ہی معلوم ہوتے ہیں اگر متقدمین کے یہاں اس طرح کا قول کہیں اور بھی نظر آئے تو اسے توارد کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

اگر لسانی جہت سے ان طبع زاد اقوال کا تجزیہ کیا جائے تو عموما یہ اقوال صنف ایجاز کی عمدہ مثال ہیں جن میں زبان کی فصاحت تو موجود ہے ہی کیوں کہ ان میں غریب کلمات کا استعمال کر کے ان کو چیستاں نہیں بنایا گیا ہے بلکہ سادہ وفصیح کلمات کو ترجیح دی گئی ہے، ان میں ایسی تراکیب نہیں ہیں کہ اس کی وجہ سے تنافر حروف کا عیب پیدا ہوا ہو، بلکہ ان مثالوں میں بلاغتِ کلام بھی پورے آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق لایا گیا ہے اورعلم المعانی کے اسرار ورموز کی بھی رعایت موجود ہے۔ ان میں بعض اقوال اسلوب مساوات پر بھی ہیں کہ ان میں الفاظ ومعانی باہم بغل گیر ہیں۔

جہاں تک آپ کی مجالس ومحافل میں بیان کردہ عربی منثور اقوال اورعربی اشعار کی بات ہے تو یہ یقینا عربی زبان سے آپ کے گہرے تعلق اوراعلی ذوق کو بتاتا ہے کیوں کہ گہرے تعلق اوراعلی ذوق کے بغیر دوسروں کے نظم ونثر کو صحیح مناسبت سے نقل کرنا ممکن نہیں، اور یہی معاملہ تحریر کا بھی ہے، عربی زبان کے اعلی ذوق کے بغیر یہ چیزیں کبھی بھی وجود میں نہیں آتیں۔

جہاں تک آپ کے عربی خطبات کی بات ہے تو اس حوالے سے جو خطبہ نقل کیا گیا ہے اس کی نسبت ہندوستان میں آپ کی جانب مشہور ومعروف ہے، البتہ اس بات کی جستجو تھی کہ کسی قدیم مؤرخ کی جانب سے اس طور پر اس کی تصدیق ہوجائے کہ انہوں نے اس خطبے کو سلطان المشائخ کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہو، تحقیق وجستجو کے بعد معلوم ہوا کہ ڈاکٹر زبید احمد نے اس خطبے کو اپنی کتاب The contribution of India میں نقل کیا ہے، یہ کتاب ۱۹۵۱ میں شائع ہوئی ہے اور اس کتاب پر پروفیسر گب کا مقدمہ بھی ہے، مزید تحقیق وتفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ سلطان المشائخ کے اس خطبے کو ڈاکٹر عبد المقصود شلقامی مصری نے بھی مجلہ الفیصل میں شائع شدہ اپنے مقالے: النثر الفني في شبه القارة الهندية میں نقل کیا ہے اور اس کے محاسن پر گفتگو بھی کی ہے۔

نتائج

سلطان المشائخ کے ذوق عربی زبان وادب کے حوالے سے جو دلائل دیے گئے اور ان کا جو تجزیہ پیش کیا گیا، ان سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔سلطان المشائخ نے جو تعلیم حاصل کی تھی وہ عربی میڈیم کی ٹکسٹ بک پر مشتمل تھی۔

۲۔آپ کے تعلیمی نصاب میں لغت اور عربی ادب کی کتابیں مثلاً مقامات حریری وغیرہ شامل تھیں اور آپ نے اپنے عربی زبان کے ذوق کی بنا پر ہی چالیس مقامات بھی حفظ کیا تھا۔

۳۔آپ کو جو علمی اسانید جاری کی گئیں وہ عربی میں تھی، یہ خود بھی آپ کے عربی ذوق کی شاہد ہیں۔

۴۔آپ کی مجالس بہت سے علمی ولغوی افادات پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔

۵۔آپ کی مجالس میں بسا اوقات عربی گفتگو ہوتی تھی اور سلطان المشائخ بھی کبھی بہت مختصر اور کبھی نسبتاً کچھ طویل گفتگو بھی فرمایا کرتے تھے، ان میں سے کچھ گفتگو تو آپ کی طبع زاد ہوتی تھی اور کچھ دوسروں کے اقوال پر مشتمل ہوا کرتی تھیں، ایسے ہی سلطان جی کی ذاتی بیاض میں بعض ایسی تحریریں ملتی ہیں جن کو آپ کی طبیعت نے انشا کیا ہے اور بعض تحریریں ایسی ہیں جو دوسروں کے قیمتی مواد پر مشتمل ہیں جن سے بہر صورت آپ کے لسانی ذوق کا پتا ملتا ہے۔

۶۔آپ اپنی مجالس میں بسا اوقات مختلف باتوں پر عربی اشعار سے استدلال کرتے تھے، ایسے ہی آپ کے ذاتی بیاض میں بھی بعض برمحل عربی اشعار ملتے ہیں جن سے آپ کے ذوق عربی کی یقیناً شہادت ملتی ہے۔

۷۔آپ کے خطبات کے ذیل میں جو نمونہ پیش کیا گیا ہے اس سے بطور ظن غالب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ عربی خطیب بھی تھے اور غالب گمان یہ ہے کہ آپ جمعہ کے خطبے میں عربی زبان میں خطاب فرمایا کرتے تھے، اس نمونے کے ادبی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ عربی ادبیت کا ایک دل کش نمونہ ہے۔

مقالے میں مذکور دلائل، ان کے اجمالی تجزیے اور اوران سے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں خلاصہ کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سلطان المشائخ عربی زبان وادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، اور بلاشبہہ آپ کی عربی تحریروں میں لسانی حلاوت، لغوی فصاحت، بیانی بلاغت اور معنوی نزاکت پائی جاتی ہے، یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ صوفیہ کا بھی عربی زبان سے گہرا لگاؤ رہا ہے اور اس کی ترویج واشاعت میں اہل علم کے دوسرے طبقات کی طرح ان کا بھی کردار رہا ہے، اور ان کے اس کردار کو کسی بھی طرح فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

تجاویز

مقالہ نگار نے سلطان المشائخ کے ذوق عربی زبان و ادب کے حوالے سے اپنی تحقیق کی بنیاد تین کتابوں پر رکھی ہے۔۱-فوائد الفواد، ۲-سیر الاولیا ۳-افضل الفوائد۔ اور انہیں سے استفادہ کر کے اپنی تحقیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے، لیکن ابھی بھی اس موضوع پر درج ذیل کام کیا جاسکتا ہے۔

۱-تحقیق کی بنیادوں میں مزید عموم پیدا کرتے ہوئے آپ کے معاصر تذکرے مثلا برنی کی تاریخ فیروز شاہی اور دیگر کتب تاریخ وتراجم اور آپ کے خلفا کے مجموعہ ہائے ملفوظات جن میں سلطان المشائخ کا ذکر کثرت سے ہے ان کا بھی مطالعہ کیا جائے اور مزید کوئی معلومات فراہم ہو تو اس کا بھی اضافہ کیا جائے۔

۲-سلطان جی کے ایک عربی مجموعۂ ملفوظات کا ذکر صاحب سیر الاولیا نے کیا ہے جسے درر نظامی کے مؤلف نے تیار کیا تھا اگر وہ دستیاب ہو سکے تو اس سے استفادہ کیا جائے۔

۳-مقالہ نگار نے سلطان جی کی جو عربی تحریریں سیر الاولیا سے نقل کی ہیں ان میں بہت سی تحریریں وہ ہیں جو آپ کی طویل تحریروں سے اقتباس ہیں ان کو مکمل نقل کیا جائے۔

۴-آپ کی عربی تحریروں اور طبع زاد اقوال کا تفصیلی، تحلیلی اور بلاغی تجزیہ کیا جائے اور پھر اصول بلاغت کی روشنی میں ان کے محاسن ومعایب پر گفتگو کی جائے۔

مقالہ نگار کو امید ہے کہ اس طرح سلطان المشائخ کے ذوق عربی زبان کے حوالے سے نسبتا اور زیادہ محقق بات سامنے آئے گی اور اہل علم سلطان جی کی شخصیت کے اس پہلو سے اور بہتر انداز میں واقف ہو سکیں گے۔

کتابیات

۱-الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، عبدالحی رائے بریلوی، مؤسسۃ ہنداوی للتعلیم و الثقافۃ، قاہرہ، مصر۔

۲-الجامع لاحکام القرآن، محمد ابن محمد ابوعبداللہ قرطبی، تحقیق: عبداللہ ترکی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت

۳-اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، تصحیح وتوضیح: علیم اشرف خان، انجمن آثار ومفاخر فرہنگی، تہران، ایران، ۱۸۸۳ء

۴-افضل الفوائد، امیر خسرو دہلوی، مطبع رضوی دہلی، ۱۳۰۴ھ

۵-الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، ابوالقاسم جار اللہ زمخشری، تخریج وتعلیق: خلیل مامون شیحا، دارالمعرفۃ، بیروت، لبنان، ۱۴۳۰ھ-۲۰۰۹ء

۶-المفردات فی غریب القرآن، ابوالقاسم حسین بن محمد راغب اصفہانی، تحقیق: صفوان عدنان داؤدی، دارالقلم دمشق، ۱۴۱۲ھ

۷-الغریبین فی القرآن والحدیث، احمد بن محمد ہروی، تحقیق: احمد فرید المزیدی، مکتبہ نزار مصطفی الباز، سعودی عربیہ، ۱۴۱۹ھ

۸-تاریخ الادب العربی، عمر فروخ، دارالعلم للملائین۔ ۱۹۸۱

۹-تاریخ الادب العربی، احمد حسن زیات، دارنھضۃ مصر، للطبع والنشر قاہرہ۔

۱۰-تاریخ دعوت وعزیمت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مجلس نشریات اسلام، کراچی ۱۸

۱۱-تاج العروس من جواہر القاموس، ابوالفیض محمد ابن محمد ملقب بہ مرتضیٰ زبیدی بلگرامی، تحقیق: حسام قدسی، دارالہدایہ۔

۱۲-جامع البیان عن تاویل القرآن (تفسیر طبری) محمد ابن جریر طبری۔

۱۳-خیر المجالس، ملفوظات خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی، مرتب: حمید شاعر قلندر، باتصحیح ومقدمہ وتعلیقات: خلیق احمد نظامی، شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۴- دیوان غرۃ الکمال امیر خسرو دہلوی، تحقیق: سید علی حیدر، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ، ۱۹۸۸۔

۱۵- دواوین شعراء الاندلس www.poetsgate.com/ViewPoem.aspx?id=103588

۱۶- رسالہ ایم فل بعنوان دراسۃ تحلیلیۃ لشعر امیر خسرو العربی، برائے مرکز الدراسات العربیۃ والافریقیۃ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، مقالہ نگار: ضیاء الرحمن علیمی، نگراں: ڈاکٹر رضوان الرحمن، ۲۰۰۸ء، مخزونۃ الاحسان لائبریری، جامعہ عارفیہ، سید سراواں، کوشامبی، یوپی

۱۷- سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، غلام علی آزاد بلگرامی، تقدیم و تحقیق محمد سعید طریحی، دار الرافدین، بیروت، لبنان، ۲۰۱۵ء

۱۸- سبع سنابل قلمی، میر عبد الواحد بلگرامی، کتب خانہ مجلس شورای اسلامی، ایران، شمارہ بازیابی: ۱، ۱۸۱۴۰

۱۹- سیر الاولیاء، مولانا سید محمد مبارک معروف بہ امیر خورد کرمانی، مطبع محب ہند، دہلی ۱۳۰۲ / ۱۸۵۸ء

۲۰- سیر الاولیا، مخطوطہ کا عکسی ایڈیشن، ناشر: خواجہ حسن ثانی نظامی، طبع اول: ۲۰۱۰ء

۲۱- فوائد الفواد، مرتب: امیر حسن علا سجزی، با تصحیح و مقدمہ و حواشی و فہارس، محمد لطیف ملک ایم، اے، لاہور ۱۹۶۶ء

۲۲- فوائد الفواد، اردو ترجمہ، خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی، مکتبہ زاویہ، لاہور ۲۰۰۳ء

۲۳- فوائد الفواد، (مع متن و ترجمہ) ترجمہ: خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی، ناشر: خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی، ۲۰۰۷ء

۲۴- فصول فی التعریف بالہند العربیۃ الاسلامیۃ، ڈاکٹر علیم اشرف جائسی، دار العلوم جائس، رائے بریلی، ہند، ۱۴۲۴ھ

۲۵- لسان العرب، ابو الفضل محمد ابن مکرم جمال الدین ابن منظور افریقی، دار صادر، بیروت ۱۴۱۴ھ

۲۶- مسند احمد، ابو عبد اللہ احمد ابن محمد ابن حنبل، تحقیق: شعیب ارناءوط، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۴۲۱

۲۷- مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، ابو الحسن نور الدین علی بن ابوبکر ہیثمی، مکتبہ القدس، قاہرہ، ۱۴۱۴

۲۸- ماہنامہ الفیصل، سعودی عربیہ، شمارہ: ۸۷، ایڈیٹر علوی طہٰ صافی، ۱۹۸۳

(17) The contribution of india to the Arabic literature. Foreword by H.A.R Gibb of Oxfort.Maktaba-i Dino Danish, Jallundar city, Punjab1946

۲۹- نزہۃ الخواطر، وبہجۃ المسامع والنواظر، عبد الحی حسینی، رائے بریلوی، دار ابن حزم، بیروت، لبنان، ۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹ء

۳۰- نہایۃ الارب فی فنون الادب، شہاب الدین احمد بن عبد الوہاب، نویری۔ http://www.alwarraq.com



ساجد الرحمن شبر مصباحی

برصغیر کی بعض چشتی نظامی خانقاہیں

ارباب فکر ونظر اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ اس چمن کائنات میں ہمیشہ سے اقتدار کے دو نظام چل رہے ہیں۔ ایک ظاہری نظام اور دوسرا باطنی وروحانی نظام۔ جس طرح دنیا کے ظاہری نظام میں نظام حکمرانی کے مختلف عہدے ہوا کرتے ہیں۔ مثلا صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، اسپیکر، وغیرہ اسی طرح باطنی وروحانی نظام میں بھی غوث، قطب، ابدال، اوتاد وغیرہ مختلف عہدے ہیں۔ اس روحانی حکومتی نظام میں چار مشہور سلسلے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ شامل ہیں۔ اور یہ عہدیدار ہر دور میں ہر علاقے میں موجود رہتے ہیں، جب کسی علاقے سے کوئی عہدیدار رحلت کرجاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرے کی ذمہ داری لگ جاتی ہے۔ روحانی دنیا کے ان خلفا کی آمدورفت یکے بعد دیگرے جاری وساری رہتی ہے۔ جیسے حضرت خواجہ معین الدین چشتی جو برصغیر میں چشتیہ سلسلہ کے موسس وبانی سمجھے جاتے ہیں، آپ کو روحانی حکومتی نظام میں خلافت ملی۔ اور اسی زمانے میں محمد غوری اور قطب الدین ایبک دنیوی حکومتی نظام سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کے بعد سلطان شمس الدین التمش دنیوی نظام حکومت پر متمکن ہوئے تو دوسری طرف خواجہ معین الدین چشتی کے مرید وخلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی روحانی نظام حکومت کی تشکیل جدید کررہے تھے اور تصوف وروحانیت کا پیغام ہر طبقے کے کانوں تک پہنچانے میں بڑی تندہی کے ساتھ مصروف تھے۔

خواجہ قطب صاحب کے بعد اس نظام روحانیت کی باگ ڈور بابا فریدالدین مسعود گنج شکر اور شیخ بدرالدین غزنوی نے سنبھالی تو دوسری طرف دہلی حکومتی نظام پر فیروز شاہ کا تسلط ہوگیا۔ بابا صاحب نے اپنی روحانی عظمت، کردار کی بلندی اور دردمندی خلق سے اس روحانی نظام حکومت کو زبردست فروغ دیا۔ بابا صاحب کے سفر آخرت کے بعد آپ کے خلفا میں دو اہم شخصیات (۱) شیخ نظام الدین اولیا اور (۲) شیخ علی احمد صابر کلیری نے اس باطنی نظام حکومت کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے بعد ہی اس چشمہ سیال سے دو نہر صافی ابل پڑے۔ ان میں ایک چشتیہ نظامیہ سے متعارف ہوا اور دوسرا چشتیہ صابریہ سے موسوم۔

حضرت مخدوم علی احمد صابر کلیری نے روحانی نظام حکومت کا کام عظیم الشان طریقے پر انجام دیا مگر مشغولیِ حق کی بنا پر سلطنت چشتیہ کی ترقی کے لیے خاطر خواہ کام نہ کر سکے۔لیکن محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا نے اپنے زمانے میں اس روحانی نظام چشت کو آفتاب نصف النہار تک پہنچا دیا۔متعدد خانقاہیں قائم کروائیں، اصلاح وتربیت کے مراکز کھولے، یہاں تک کہ نصف صدی سے زائد آپ کی خانقاہ دہلی کی سرزمین پر ارشاد وتلقین کا مرکز اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنی رہی۔اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر میں سلسلہ چشتیہ کی روحانی سلطنت کی داغ بیل اگرچہ خواجہ معین الدین اجمیری نے ڈالی لیکن اس روحانی نظام کو محبوب الٰہی نے معراج کمال تک پہنچایا۔

حضرت محبوب الٰہی نے باطنی نظام سلطنت کی توسیع وترقی کے لیے خلفاومریدین کی شکل میں وزرا کی ایک مضبوط ٹیم تیار کی تھی اور انھیں برصغیر کی وسعتوں میں پھیلا دیا تھا۔ان کے ذریعے ملک کے اطراف واکناف میں اس روحانی حکومت کی متعدد شاخیں قائم ہوئیں جو آج چشتی نظامی خانقاہوں سے جانی جاتی ہیں۔ان خلفا میں صرف تین چار ہستیاں ہی ایسی گزری ہیں جن سے چشتیت ونظامیت کے روحانی نظام کی زبردست ترقی واشاعت ہوئی۔اور یہ بات ہر بزرگ کے زمانے میں پائی جاتی ہے کہ سلسلہ کی ترقی بعض افراد ہی کے حصے میں آتی ہے۔حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کو دیکھا جائے تو آپ کے بہت سے خلفا بھی تھے اور فرزند بھی مگر سلسلہ خواجہ قطب الدین بختیار کا کی سے پھیلا۔اور خواجہ قطب صاحب کے بھی بہت سے خلفا تھے لیکن سلسلے کو ترقی دینے والے حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر ثابت ہوئے۔اور حضرت بابا صاحب کے بھی بے شمار خلفا اور اولاد بھی تھی مگر ان کے سلسلے کو پھیلانے والے تین بزرگ ہوئے۔ایک حضرت مخدوم جمال الدین ہانسوی جن سے جمالیہ سلسلہ پھیلا۔دوسرے حضرت نظام الدین اولیا جن سے نظامیہ سلسلہ جاری ہوا۔تیسرے حضرت مخدوم علاء الدین صابر کلیری جن سے صابریہ سلسلہ وجود میں آیا۔لیکن جمالیہ سلسلہ بعد میں سلسلہ نظامیہ ہی میں مدغم ہو گیا۔(بزم صوفیہ،ص ۱۷۲)

اسی طرح سلطان المشائخ کے بھی بہت سے خلفا تھے لیکن سلسلے کو بڑھانے والے دو بزرگ سب سے نمایاں رہے:(۱) حضرت مخدوم نصیر الدین محمود چراغ دہلوی اور (۲) حضرت مخدوم اخی سراج عثمانی۔حضرت چراغ دہلوی سے نظامیہ نصیریہ سلسلہ جاری ہوا۔اور حضرت اخی سراج سے نظامیہ سراجیہ کی ابتدا ہوئی۔سراجیہ سلسلہ زیادہ تر صوبہ بہار وبنگال اور آسام میں پھیلا اور نصیریہ سلسلے کی اشاعت پنجاب (پاکستان)، راجپوتانہ، گجرات، اترپردیش اور دکن کے علاقوں میں خوب ہوئی۔اس طرح سے نصیری اور سراجی شاخوں کے ذریعے برصغیر میں نظامی سلسلہ خوب فروغ پایا۔اور مختلف بلاد وامصار میں چشتی نظامی خانقاہیں اس کثرت سے آباد ہوئیں کہ اگر ہر ایک خانقاہ کا تعارف وتجزیہ اختصاراً بھی حوالۂ قلم کیا جائے تو دفاتر تیار ہو جائیں۔اس لیے ہم یہاں صرف نظامی، نصیری خانقاہوں کا ذکر کریں گے اور ان میں بھی وہ خانقاہیں جو ہمارے مجوزہ اصول میں سے کسی بھی اصل پر منطبق ہوں گے۔وہ اصول درج ذیل ہیں:

(۱) جن خانقاہوں میں راست طور پر محبوب الٰہی کا فیض پہنچا ہو اور ترویج سلسلہ و دعوت وارشاد میں ان کا نمایاں کردار رہا ہو۔

(۲) جس خانقاہ کی حیثیت ایک مرکزی ہو اور اس سے مختلف شاخیں معرض وجود میں آئی ہوں۔

(۳) جس خانقاہ کی علمی، اصلاحی، روحانی اور رفاہی خدمات کے حوالے سے کسی بھی صدی میں عمدہ کارکردگی رہی ہو۔

(۴) عصر حاضر میں جو خانقاہ روحانیات وسماجیات اور علم وتربیت کے لحاظ سے سرگرم عمل ہو۔

(۱) درگاہ حضرت سلطان المشائخ، دہلی

یہ خانقاہ حضرت محبوب الٰہی شیخ نظام الدین اولیا (متوفی ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء) کی مرکزی خانقاہ ہے جو ہند کی دارالحکومت دہلی میں واقع ہے۔ آپ کا سلسلہ طریقت حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر (متوفی: ۶۶۴ھ) اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی: ۶۳۳ھ) سے ہوتا ہوا صرف دو واسطوں سے خواجہ معین الدین اجمیری (۶۲۷ھ) تک پہنچتا ہے۔ فوائد الفواد اور سیر الاولیا میں آپ کے حالات وملفوظات مفصلا مذکور ہیں۔

ساتویں صدی ہجری میں اس خانقاہ کی بنا رکھی گئی اور نصف صدی سے زیادہ تک یہ خانقاہ ارشاد وتلقین کا مرکز اور رشد وہدایت کا سرچشمہ بنی رہی۔ لوگ پروانوں کی طرح یہاں جمع ہوتے اور عشق الٰہی کی تپش اور خدمت خلق کا جذبۂ بے کراں لے کر واپس لوٹتے تھے۔ تقریبا پچاس سال تک یہ خانقاہ مضطرب وپریشان افراد کے لیے امن وسکون کی آماجگاہ، ظاہری وباطنی امراض کے لیے دارالشفا، غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں کے لیے دارالطعام اور تمازت آفتاب سے خستہ جاں مسافرین کے لیے ایک سایہ دار درخت بنی رہی۔

حضرت محبوب الٰہی کے وصال کے بعد شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اس خانقاہ کے منصب مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے اور پھر یہیں سے سلسلہ نظامیہ کی ایک شاخ نصیریہ معرض وجود میں آئی۔ ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> دہلی کی مرکزی خانقاہ کے بعد جس کی مسند ارشاد پر یکے بعد دیگرے دو شیخ اجل حضرت خواجہ نظام الدین اور حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلوی متمکن رہے، ہندوستان کے مختلف مقامات پنڈوہ، لکھنوتی، دولت آباد، گلبرگہ، برہان پور، زین آباد، مانڈو، احمد آباد، صفی پور، مانک پور، سلون میں چشتی نظامی خانقاہیں قائم ہوئیں جنھوں نے صدیوں تک چراغ سے چراغ روشن رکھا۔
>
> (تاریخ دعوت وعزیمت، ج ۳، ص: ۱۵۲)

حضرت چراغ دہلوی ۳۲ سال تک سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی مرکزی ذمہ داری سنبھالے رہے۔ آپ کی عہد سجادگی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ نے اپنے شیخ کی طرح تمام مشائخ چشت کو ایک مرکزی نظام سے مربوط رکھا۔ خلیق نظامی لکھتے ہیں: حضرت خواجہ معین الدین اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید الدین گنج شکر

اور حضرت محبوب الٰہی کے خلفاو مریدین برصغیر کے جس خطے میں کام کرتے ان کی نگاہیں ہمیشہ اجمیر، دہلی یا اجودھن ہی کی طرف لگی رہتی تھیں اور وہ اپنے کو ایک مرکزی نظام کے تحت تصور کرتے تھے۔لیکن حضرت چراغ دہلوی کی وصال کے بعد مرکزی نظام تباہ و برباد ہو گیا۔(تاریخ مشائخ چشت ،ص:۱۸۶)

آپ نے کسی کو اپنا جانشیں نہیں بنایا، یہاں تک وراثت کے تبرکات بھی کسی کو نہیں دیے۔ وصیت کے مطابق سارے تبرکات آپ کے ساتھ قبر میں دفن کر دیے گئے۔آپ کے وصال کے بعد شیخ کمال الدین علامہ کو جانشین بنایا گیا جو آپ کے بھانجے تھے لیکن بعد میں گجرات جا کر مقیم ہو گیے۔آپ کے بعد اس خانقاہ کا نہ کوئی سجادہ نشین رہا اور نہ متولی بلکہ سجادہ نشینی اور تولیت کے فرائض و مراسم مشترکہ طور پر چار خاندانوں میں منقسم ہو گئے۔(۱) نبیر گان ،جس کے مورث اعلی خواجہ سید محمد امام نظامی ہیں جو حضرت محبوب الٰہی کے شیخ بابا فرید گنج شکر کے نواسے اور محبوب الٰہی کے فرزند معنوی تھے (۲) ہارونیان، اس کا تعلق حضرت محبوب الٰہی کے خواہر زادے خواجہ سید رفیع الدین ہارون سے ہے۔آج کل جو خاندان موجود ہیں ان کی اکثریت کو آپ ہی کے توسط سے حضرت محبوب الٰہی کا خواہر زادہ ہونے کا شرف حاصل ہے (۳)۔خاندان ہندوستانیان، اس خاندان کے افراد خواجہ ابوبکر مصلی بردار کی اولاد سے ہیں۔(۴) قاضی زادگان ،جس کے مورث حضرت قاضی سید محی الدین کاشانی ہیں جو حضرت محبوب الٰہی کے جلیل القدر خلیفہ تھے۔ایک زمانے میں ان چاروں خاندانوں میں زیادہ شہرت خاندان نبیر گان کو حاصل ہوئی۔حضرت خواجہ حسن نظامی کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا جنھوں نے تیرہویں صدی ہجری میں اس خانقاہ کی تعمیر و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔آج بھی اس خانقاہ کی تولیت اور انتظامی امور کسی فرد واحد کے اختیار میں نہیں بلکہ مشترکہ کمیٹی اس کا ذمہ دار ہے جس میں چاروں خاندان کے افراد کا اشتراک ہے اور ہر سال اسی کمیٹی کی نگرانی میں حضرت محبوب الٰہی کا عرس ۱۸ / ربیع الثانی کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

(۲) خانقاہ سراجیہ پنڈوہ بنگال

یہ خانقاہ حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ کے ممتاز خلیفہ حضرت مخدوم سراج الدین اخی عثمان (متوفی ۷۵۸ھ) کی قائم کردہ ہے جو ریاست بنگال کا ایک معروف ضلع مالدہ سے تقریبا ۸ کلو میٹر کے فاصلے پر ساگر دیگھی کے قریب واقع ہے۔یہیں آپ کا مرقد انور بھی زیارت گاہ خاص عام ہے۔اس خانقاہ کی مذہبی، علمی، سماجی اور رفاہی خدمات آج بھی تاریخ کے صفحات پر مرقوم ہیں۔آٹھویں صدی ہجری میں صوبہ بہار و بنگال اور آسام کے متعدد علاقوں میں مذہب وملت اور علم و روحانیت کی جو بہاریں آئی ہیں وہ اسی خانقاہ کی رہین منت ہیں۔خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:

> بنگال کے بادشاہ نے ان (شیخ سراج) کی بیعت کی تھی اور ان کے ذریعہ بنگال اور آسام کے لوگ ان کے حلقہ بگوش ہو گئے۔صوبہ بہار و بنگال میں ان کے سلسلے کی بہت سی خانقاہیں ہیں۔

(نظامی بنسری ،ص:۴۱۲)

خانقاہ سراجیہ اپنے ابتدائی دور میں روحانی پیاسوں کے لیے بحر معرفت،مریضوں کے لیے دارالشفا اورغربا ومساکین کے لیے ایک لنگر خانہ تھا۔ یہاں کے لنگر خانے کا ذکر ایک انگریزی تذکرہ نگار جناب غلام رسول صاحب نے اپنی کتاب ''چشتی نظامی صوفی آرڈر آف بنگال'' میں یوں کیا ہے:

The shaikh also started a free kitchen where the beggars and mendicants used to get food at all time. (Chishti Nizami Sufi Order of Bengal, page no 83.)

حضرت شیخ (اخی سراج) نے ایک لنگر خانہ بھی جاری کیا تھا، جہاں فقیروں اور ناتواں لوگوں کو ہر وقت مفت میں کھانا فراہم کیا جاتا تھا''

مفتی عبدالخبیر اشرفی لکھتے ہیں:

آج بھی اس لنگر خانے کا اثر روضہ پاک پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ درگاہ معلیٰ میں روزانہ بالخصوص جمعرات اور یک شنبہ کو اتنی قربانیاں رب کی بارگاہ میں پیش کی جاتی ہیں کہ کوئی بھی اجنبی مسافر وہاں سے بھوکا نہیں لوٹتا''۔(اخی سراج،ص:۲۱۳)

یہ خانقاہ جسمانی وروحانی دونوں طرح کے مریضوں کے لیے ایک شفاخانہ کی حیثیت رکھتی تھی۔قلبی امرض سے متاثر لوگ روحانیت کا جام پی کر لوٹتے تھےاورجسمانی امراض سے پریشان مخلوق سکون وراحت کی دولت بے بہا سے سرشار لوٹتی تھی۔ جناب غلام رسول صاحب لکھتے ہیں:

It also served the purposed of a hospital where the sick and the distressed were attended to.(حوالہ مذکورہ)

علم وتربیت کے میدان میں بھی اس خانقاہ کا نمایاں حصہ رہا ہے۔اگرچہ یہاں باضابطہ کسی مدرسہ یادارالعلوم کے قیام وتاسیس کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا،لیکن محض ''خانقاہ سراجیہ'' کسی دانش کدہ علم وفن سے کم نہیں تھا۔دوردراز مقامات سے شائقین علم یہاں باریاب ہوکر اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا کرتے تھے۔اورعلم ظاہر وباطن سے فیض یاب ہوکر لوٹتے تھے۔ چناں چہ حضرت مخدوم اشرف سمنانی کچھوچھوی کے مرشد طریقت شیخ علاء الحق پنڈوی اسی چمنستان علم وفضل کے گل ولالہ ہیں۔

خانقاہ سراجیہ کی تفصیلی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد ہر شخص پر واضح ہوجاتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں اس خانقاہ نے علمی،روحانی،سماجی،رفاہی اورتحقیقی وتصنیفی ہر میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔اس خانقاہ کی چہار دیواری میں بیٹھ کر تحقیق وتصنیف کا جو ماحول گرم کیا گیا تھا اس کی ایک جھلک آج بھی مدارس اسلامیہ کی نصاب تعلیم میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ چناں چہ میزان الصرف، پنج گنج اور ہدایۃ النحوجیسی کتابوں کا انتساب اسی خانقاہ کے بانی کی

طرف کیا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سلسلے میں مورخین باہم مختلف ہیں لیکن کئی مورخین نے غیر حتمی طور پر ہی سہی مذکورہ کتابوں کو شیخ اخی سراج کی تصانیف میں شمار کیا ہے۔

ظفر المحصلین باحوال المصنفین معروف بہ حالات مصنفین درس نظامی میں ہے:

آپ (اخی سراج) کی تصانیف میزان الصرف، پنج گنج اور ھدایۃ النحو بتائی جاتی ہے''

(ظفر المحصلین، ص: ٦٢٣)

نصف صدی پر محیط اس خانقاہ کی تاریخی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا لیکن افسوس! حوادثات زمانہ نے اس خانقاہ کی خدمات کو صرف قلم کی سیاہی تک محدود کر دیا۔ بعد کے ادوار میں اس کی احیا و تجدید اور تعمیر و ترقی کی راہ بالکلیہ مسدود ہوگئی اور ایک عالیشان خانقاہ صرف مزارات و درگاہ کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ ایک ایسا دور بھی گزرا کہ یہاں لوگوں کی آمد و رفت بھی کم ہوگئی، صرف وہی لوگ حاضر بارگاہ ہوتے تھے جو حضرت ممدوح کے احوال و مراتب سے آشنا ہوتے۔ ۱۹۸۳ء میں شیخ طریقت حضرت علامہ سید شاہ مجتبیٰ اشرف اشرفی قدس سرہ نے بشارت منامی پا کر یہاں ازسر نو خانقاہ کی بناڈالی اور یہاں کے لوگوں کو آئینہ ہند کے فیض و کرم سے شرف یاب ہونے کی ترغیب دلائی۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے جانشین حضرت سید جلال الدین اشرف اشرفی الجیلانی عرف قادری میاں صاحب مدظلہ اس خانقاہ کی تعمیر و ترقی اور احیا و تجدید کے لیے سعی جمیل کر رہے ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں آپ نے یہاں شعبہ حفظ و قرات کا ایک عالیشان ادارہ بنام ''سراج المجتبیٰ دار الحفظ'' قائم فرمایا جس میں سو سے زائد طلبہ زیور علم سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ اس جامعہ سے متصل کئی ایکڑ زمین بھی حاصل کر لی گئی ہے جس میں ''آئینہ ہند انٹرنیشنل اسکول'' کا کام برق رفتاری کے ساتھ چل رہا ہے۔

(ٹیلی فونک رابطہ مولانا سید جلال الدین اشرف)

(۳) خانقاہ برہانیہ اورنگ آباد مہاراشٹر

یہ خانقاہ حضرت محبوب الٰہی کے مشہور خلیفہ سید برہان الدین غریب قدس سرہ (۷۴۱ھ) کی طرف منسوب ہے۔ آپ کا شجرہ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ تک پہنچتا ہے اور شجرہ طریقت اکیس واسطوں سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک متصل ہے۔ آپ کے حالات و ملفوظات احسن الاقوال، نفائس الانفاس اور ھدایت القلوب میں مفصل مذکور ہیں۔ آپ کے برادر کلاں خواجہ منتجب الدین زرزری زربخش (٦٩٥ھ) وہ پہلے چشتی بزرگ تھے جنھوں نے سرزمین دکن کو دعوت وارشاد کا مرکز بنایا، انھوں نے دیوگیر (دولت آباد) کا سفر اس وقت کیا تھا جب کہ یہ پورا خطہ کفر و شرک میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر آپ نے لوگوں کو ہدایت دی جس کے نتیجے میں کثیر خلق خدا آپ کی ہمنوا ہوگئی۔ جنھوں نے ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا، آپ نے ان کے حق میں بدعا کی، ان کی صورتیں مسخ ہوگئیں۔ آج تک دیوگیر کے پہاڑوں میں پتھر کی بنی ہوئی مسخ صورتیں پائی جاتی ہیں۔ (خزینۃ الاصفیا، ص: ١٦١)

گزیٹر آف اورنگ آباد کے مطابق حضرت زرزری زربخش کے وصال کے بعد حضرت برہان الدین غریب بحکم مرشد دولت آباد (دیوگیر) تشریف لائے اوراپنے بڑے بھائی کے منصب ولایت پرجلوہ افروز ہوئے۔

Gazetteer of Aurangabad.H.H THE NIZAM, GOVERMENT. 884/ PAGE NO 395,396)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت برہان الدین غریب نے علی حدہ کوئی خانقاہ قائم نہیں کی بلکہ اپنے برادر اکبر کی ہی قائم کردہ خانقاہ سے دعوت وارشاداور تبلیغ وہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔اس وقت یہ خانقاہ صوبہ مہاراشٹر کے ضلع اورنگ آباد کے ایک معروف شہر خلدآباد میں واقع ہے۔جو اپنے ابتدائی عہد میں ارشادوتلقین کا مرکز اور رشدوہدایت کا منبع تھی، یہاں عقیدت مندوں کا ایک ہجوم لگا رہتا تھا، ہرروز فرزندان توحید کی ایک بڑی تعداد کسب فیض کے لیے حاضر ہوا کرتی تھی۔حضرت شیخ زین الدین شیرازی جیسی شخصیت اسی خانقاہ کے پروردہ لوگوں میں سے تھے جن کے ذریعے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی خوب اشاعت ہوئی۔خلیق نظامی لکھتے ہیں:

دکن میں آپ کی خانقاہ مرجع خاص وعام بن گئی اور عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔حضرت شیخ زین الدین آپ کے مشہور خلیفہ تھے جن کے ذریعے چشتیہ سلسلہ کی کافی اشاعت ہوئی۔

(تاریخ مشائخ چشت،ص:۲۰۵،۲۲۰)

مذہبی اور علمی ہر لحاظ سے اس خانقاہ کی نمایاں خدمات ہیں، خطہ دکن میں آج جو اسلام کی بہاریں نظر آرہی ہیں ان میں وافر حصہ اسی خانقاہ کا ہے۔مؤلف خزینۃ الاصفیا لکھتے ہیں: شیخ برہان الدین غریب نے اتنی محنت کی کہ اس خطے میں کفروبدعت کا نام ونشان نہ رہا۔(خزینۃ الاصفیا،ص:۱۶۱۔۶۲)

خلیق نظامی لکھتے ہیں:

دکن میں چشتیہ سلسلہ کی نشرواشاعت کا کام شیخ برہان الدین غریب اور حضرت سید محمد گیسودراز اوران کے خلفانے انجام دیا۔ان کی خانقاہیں جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی اصلاح وتربیت کا مرکز تھیں۔اور شاہ وگدا سب وہاں جمع ہوتے تھے۔(تاریخ مشائخ چشت،ص:۲۰۸)

افسوس کہ مرورزمانہ کے باعث اس خانقاہ کی سابقہ روایات بحال نہ رہ سکیں اور خانقاہیت درگاہیت میں تبدیل ہوگئی۔اس وقت اس خانقاہ کا نہ کوئی سجادہ نشین ہے اور نہ یہاں خانقاہی رسم ورواج ہے۔بلکہ مشترکہ کمیٹی اس درگاہ کے انتظامی امورکوسنبھالتی ہے اور ۸؍صفر تا ۱۳؍صفرالمظفر عرس کی تقریبات اسی کمیٹی کے زیرانتظام منعقد ہوتی ہیں۔

فی الوقت اس درگاہ کے مجاور جناب عبدالحمید صاحب ہیں۔جن کی کوششوں سے حضرت شیخ کی ملفوظاتی کتاب ''احسن الاقوال''مخطوطات کی ظلمتوں سے نکل کر ترجمہ وطباعت کے اجالے تک پہنچی ہے۔

(۴)خانقاہ بندہ نواز گیسودراز گلبرگہ

یہ خانقاہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے باکمال مرید اور ممتاز خلیفہ حضرت سید محمد بندہ نواز گیسودراز (۸۲۵ھ) سے منسوب ہے۔آپ کا سلسلہ نسب بائیس واسطوں سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ مولف سیر محمدی کے مطابق آپ حضرت چراغ دہلوی کے منصب ولایت پر بھی جلوہ افروز ہوئے۔

(سیر محمدی ۲۴،۲۵)

۸۰۱ھ میں آپ نے گلبرگہ کو اپنا مسکن بنایا۔جو ریاست کرناٹک کا ایک تاریخی شہر ہے اور بنگلور سے تقریبا ۶۲۳ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔اس سرزمین پر آپ نے قال وحال، شریعت وطریقت اور وعظ وتصنیف کا ایک خوبصورت سنگم آباد کیا۔جو آج خانقاہ بندہ نواز گیسودراز سے متعارف ہے۔خطہ دکن کی علمی وروحانی تاریخ اس خانقاہ کے تذکرے کے بغیر ناقص ونامکمل ہے۔نویں صدی ہجری کے آغاز میں تصوف وروحانیت اور علم وعرفان کا آفاقی پیغام تصنیفاتی شکل میں پھیلانے کا عظیم سہرا اسی خانقاہ کے سر جاتا ہے۔قرآنی تفسیرات، حدیثی تشریحات اور تصوف کے رموز واسرار پر مشتمل ایک درجن سے زائد کتابیں اس خانقاہ کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے۔جن میں تصوف کی اعلی کتابیں جیسے عوارف المعارف، فصوص الحکم، رسالہ قشیریہ، تمہیدات عین القضاۃ وغیرہ کی شرحیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔قرآن کریم کی صوفیانہ تفسیر اور فن حدیث میں برصغیر کی اولیں کتاب مشارق الانوار کا فارسی ترجمہ بھی اس خانقاہ کا حصہ ہے۔

بعض تذکرہ نگاروں نے ان کتابوں کے علاوہ تیس سے زائد کتابوں کا انتساب حضرت خواجہ بندہ نواز کی طرف کیا ہے۔اس لیے خلیق نظامی لکھتے ہیں کہ: بعض کے متعلق یقین سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان ہی کی تصنیف ہیں یا غلط طور پر منسوب کردی گئی ہیں۔(حاشیہ تاریخ مشائخ چشت، ص:۲۰۷)

ان تصنیفی خدمات کے علاوہ سماجی اور رفاہی خدمات کی بھی ایک طویل داستان ہے، علاقہ دکن میں کفر وشرک کا قلع قمع کرنے اور اسلام کی عظمت ورفعت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرنے میں اس خانقاہ کا بنیادی کردار رہا ہے۔لیکن افسوس تصوف وروحانیت کا یہ شیش محل بعد کے ادوار میں کچھ خستہ وفرسودہ ہوگیا تھا جس کا اظہار خواجہ حسن نظامی نے بھی کیا ہے۔آپ رقم طراز ہیں: دکن میں حضرت بندہ نواز گیسودراز کی درگاہ میں بھی ایک لاکھ روپے کے قریب جاگیر ہے۔اس لیے وہاں بھی سلسلے کا کام رک گیا ہے۔(۱) لیکن جب اس خانقاہ کی مسند مشیخت پر حضرت سید محمد الحسینی متمکن ہوئے تو پھر اس خانقاہ کی عظمت رفتہ بحال ہوئی اور ان کے ذریعے سلسلے کا خوب فروغ ہوا۔فی الوقت اس خانقاہ کے مسند نشیں حضرت سید محمد خسرو پاشا صاحب ہیں جن کی قیادت وسرپرستی میں یہ خانقاہ تعلیم، تربیت اور خدمت خلق کے میدان میں مثالی کردار ادا کررہا ہے۔اس وقت خانقاہ

---

(۱) نظامی بنسری، ص: ۵۰۳، ۵۰۴

کے تحت طلبہ اور طالبات کے ادارے چل رہے ہیں جس میں چار سو سے زائد تشنگان علوم اپنی پیاس بجھار ہے ہیں۔اس کے علاوہ اس خانقاہ کی باضابطہ ایک یونیورسٹی ہے جس کے احاطے میں میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے عصریات ہیں جن سے ہرسال پانچ سو سے زائد طلبہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل کرتے ہوئے سند فراغت حاصل کرتے ہیں۔ موجودہ صاحب سجادہ سے اگر چہ ہماری ملاقات نہیں لیکن مخدوم گرامی حضرت افضال محمد فاروقی صاحب سے ان کے خصائص وکمالات سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ خانقاہ آپ کی نگرانی میں عصریات کے ساتھ ساتھ عرفانیات وروحانیات پر بھی خاص توجہ مبذول کررہی ہوگی۔ ہرسال ۱۶/ ذی قعدہ کو آپ ہی کی قیادت میں حضرت بندہ نواز کا عرس بڑے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے جس کے نظام العمل میں قرآن خوانی، محفل سماع اور علمی مذاکرے وغیرہ خصوصی طور سے شامل ہیں۔

(۵) خانقاہ جلالیہ، اوچ شریف پاکستان

اس خانقاہ کے بانی حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی (متوفی ۶۶۱ھ/ ۱۲۶۱ء) کے خلیفہ اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے دادا سید جلال الدین سرخ بخاری ہیں۔ یہ خانقاہ مغربی پنجاب کا ایک قدیمی قصبہ ''اوچ'' میں واقع ہے، جو ریاست بہاول پور میں ملتان سے ستر میل کے فاصلے پر جنوب مغرب میں ہے۔ پہلے یہ قصبہ دو بڑے حصے پر مشتمل تھا ایک حصہ گیلانیہ کہلاتا تھا جہاں قادریہ سلسلہ کے بزرگ رہتے تھے اور دوسرا محلہ بخاریاں تھا جہاں سہروردی سلسلے کے بزرگ رہتے تھے۔ محلہ بخاریاں کی بنا سید جلال الدین سرخ بخاری نے ۶۹۰ھ/ ۱۲۹۴ء میں ڈالی تھی۔ جب کہ اس زمانے میں اوچ کو دیوگڑھ کہا جاتا تھا اور یہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ لیکن خانقاہ جلالیہ کے قیام کے بعد یہاں اسلام کو رونق ملی اور یہ شہر اشاعت اسلام کا ایک بڑا مرکز بن گیا، مصنف آب کوثر کے بقول ہندوستان کے بخاری سیدوں کا سلسلہ سید جلال الدین بخاری پر ختم ہوتا ہے۔(۱) ان کے علاوہ کئی سہروردی بزرگوں نے خطہ اوچ کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ لیکن اوچ کے جس بزرگ نے سب سے زیادہ شہرت پائی وہ حضرت مخدوم جہانیاں تھے جن کا نام سید جلال الدین بخاری اور لقب مخدوم جہانیاں جہاں گشت ہے۔ متعدد تذکرہ نویسوں کے بقول آپ کوئی علوم میں مہارت کاملہ حاصل تھی۔ (بزم صوفیہ، ص: ۴۱۲)

آپ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے شیخ ابوالفتح رکن الدین سے بیعت تھے اور متعدد مشائخ سلسلہ سے اجازت وخلافت حاصل تھی جن میں ایک بڑا نام جانشین محبوب الٰہی شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کا ہے۔ ایوب قادری لکھتے ہیں: شیخ مکہ حضرت عبداللہ یافعی کے ارشاد پر آپ دہلی تشریف لائے اور حضرت چراغ دہلوی سے سلسلہ چشت کی اجازت وخلافت حاصل کی۔ (حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ص: ۱۰۵)

آپ اپنے والد سید محمد کبیر بن جلال الدین بخاری کی وفات کے بعد خانقاہ جلالیہ کے مسند ارشاد پر متمکن

---

(۱) آب کوثر، ص: ۲۷۷

ہوئے اور پوری زندگی رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔آپ کے ذریعے برصغیر کی وسعتوں میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی زبردست اشاعت ہوئی چناں چہ ہندوستان کی متعدد خانقاہیں مثلا خانقاہ مینائیہ، خانقاہ صفویہ، خانقاہ عارفیہ، خانقاہ برکاتیہ وغیرہ کا سررشتہ اسی خانقاہ سے جاملتا ہے۔

اودھ میں اس خانقاہ کا فیضان شیخ قوام الدین عباسی (۸۰۷ھ) کے مرید اور حضرت مخدوم صدرالدین راجو قتال کے خلیفہ مخدوم شیخ سارنگ (۸۵۵ھ) کے ذریعہ خوب عام ہوا، مخدوم شیخ قوام الدین حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے خلیفہ تھے۔ شیخ سارنگ کے بعد اودھ میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کو ان کے خلیفہ مخدوم شاہ مینا (۸۸۴ھ) اور ان کے خلیفہ مخدوم شیخ سعدالدین خیرآبادی (۹۲۲ھ) اور ان کے خلیفہ شیخ عبدالصمد معروف بہ مخدوم شاہ صفی (۹۴۵ھ) کے ذریعہ بڑا فروغ ہوا۔ حضرت مخدوم شاہ صفی کے نامور خلفا میں بندگی شیخ مبارک، مخدوم سید الہدیہ خیرآبادی اور شیخ محمد حسین سکندرآبادی کے اسما بہت اہم ہیں۔ اول الذکر کے آٹھویں پشت میں ایک نامور بزرگ مخدوم شیخ خادم صفی محمدی صفی پوری (۱۲۸۷ھ) ہوئے جن کے متوسلین و مستفیدین کی تعداد بے شمار ہے۔

مخدوم شیخ محمد حسین کے مشہور و نامور خلیفہ میر عبدالواحد بلگرامی (۱۰۱۷ھ) ہوئے جن کی کتاب سبع سنابل مشہور و معروف ہے۔ غرض اس خانقاہ کے فیوض و برکات سے ہندو پاک کی سرزمین خوب سرشار ہوئیں اس میں جہاں حضرت کے خلفا کا نمایاں کردار ہے وہیں آپ کی اولاد کا بھی ایک بڑا حصہ ہے۔ ایوب قادری لکھتے ہیں کہ ہند پاکستان کا شاید ہی کوئی مرکزی شہر ایسا ہو جہاں حضرت مخدوم جہانیاں کی اولاد نہ ہو اور ان اولاد نے برصغیر میں علوم وفنون اور تبلیغ و اشاعت کے جو لازوال نقوش چھوڑے ہیں ان کے بیان کے لیے ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ (حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ص:۲٦٦)

خانقاہ جلالیہ کی تبلیغی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے بعد ایوب قادری لکھتے ہیں: اوچ کی خانقاہ میں مریدین و طالبین کا کثیر مجمع رہتا تھا۔ دور دراز مقامات سے لوگ آکر حضرت مخدوم سے فیض یاب ہوتے تھے۔ عوام و خواص، امرا، وزرا اور سلاطین سبھی حاضر ہوتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ہر مذہب فکر کے لوگ حضرت مخدوم کی خدمت میں آتے اور فیض حاصل کرتے۔ (حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ص:۱۵۸)

عہد مخدومی میں یہ خانقاہ بلا شبہ اہل علم کی تربیت گاہ، صوفیہ کا راہ سلوک اور عامۃ الناس کے لیے مشعل ہدایت تھی۔ جہاں ایک طرف علما و مفتیان اپنے مسائل کی گتھیاں سلجھاتے تھے وہیں مشائخ صوفیہ معرفت و طریقت کے منازل طے کرتے تھے۔ سخاوت مرزا لکھتے ہیں:

علمائے دین و مفتیان شرع نیز مشائخ کرام حضرت مخدوم کی خدمت میں پہنچتے اور مختلف مسائل شریعت و تصوف کا حل حضرت مخدوم سے فرماتے تھے۔ ان میں بعض بڑے بڑے عالم تھے۔ (تذکرہ مخدوم جہانیاں، ص:۱۵۸)

اس خانقاہ میں باضابطہ کسی مدرسہ یا دارالعلوم کے قیام وتاسیس کا ذکر اگر چہ تاریخی کتابوں میں نہیں ملتا لیکن یہاں درس قرآن، فہم حدیث اور فقہ وتصوف کے اسباق روزانہ پڑھائے جاتے تھے۔ مؤلف تذکرہ مخدوم جہانیاں لکھتے ہیں: حضرت مخدوم کی مجلس رشد وہدایت تہجد کے بعد خاص طور سے منعقد ہوتی تھی اس مجلس میں عام طور سے مریدین حاضر خدمت ہوتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف کے مسائل کا درس وبیان ہوتا تھا۔ پھر صبح میں اشراق کے بعد لوگ حاضر خدمت ہوتے اور فیض حاصل کرتے۔ (تذکرہ مخدوم جہانیاں، ص:۱۶۱)

آپ اپنی مجالس معرفت وروحانیت میں رسالہ مکیہ کا خصوصی درس دیا کرتے تھے، اور اکثر رسالہ کے مباحث واقوال نقل کر کے محبت وشوق کے ساتھ اس کی تشریح وتوضیح فرمایا کرتے تھے، جس کا ذکر جامع العلوم میں جا بجا ملتا ہے جو آپ کے ملفوظات کا فارسی مجموعہ ہے جسے آپ کے شاگرد وخلیفہ حضرت علاء الدین علی بن سعد حسنی نے جمع کیا ہے۔

یہ کتاب ۱۹۹۶ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی الدر المنظوم کے نام سے دو جلدوں میں طبع شدہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے مجموعۂ ملفوظات میں خزانۂ جلالی، سراج الہدایہ، جواہر جلالی اور مقرر نامہ بھی ہے، لیکن ان سب میں خزانۂ جلالی زیادہ مشہور ومعروف ہے جس کو حضرت مخدوم کے مرید شیخ احمد بہاء بن حسن بن محمود تلبنی نے مرتب کیا ہے۔ یہ علوم ومعارف کا ایک نادر ذخیرہ ہے جو فارسی زبان میں محفوظ ہے، اب اس کی تدوین وتخریج وتحشیہ اور اسے اردو قالب میں ڈھالنے کی سعی واہتمام شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں کر رہی ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی یہ عظیم سرمایہ قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔

اس خانقاہ سے کسب فیض کرنے والوں میں مشہور سیاح ابن بطوطہ کا بھی نام آتا ہے جو سیر وسیاحت کرتا ہوا اس خانقاہ میں حاضر ہوا اور حضرت مخدوم نے اسے اپنا خرقہ عنایت فرمایا ابن بطوطہ نے حضرت مخدوم کو صالحین میں شمار کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں۔ (سفرنامہ ابن بطوطہ، ج:۳ ص:۹۸)

۱۰/ذی الحجہ ۷۸۵ھ میں حضرت مخدوم کے وصال کے بعد آپ کے بھائی مخدوم سید صدرالدین راجو قتال اس خانقاہ کی مسند سجادگی پر جلوہ افروز ہوئے۔ آپ نے قبل وفات اپنے بھتیجے فضل الدین بن ناصرالدین محمود کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور آج بھی سجادگی کا یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔

(۶) خانقاہ مینائیہ لکھنو

یہ خانقاہ حضرت شیخ محمد بن قطب الدین عرف مخدوم شاہ مینا (۸۸۴ھ) سے منسوب ہے۔ آپ مادرزاد ولی تھے۔ نسباً صدیقی اور مشرباً چشتی نظامی تھے۔ آپ کے والد شیخ قطب الدین جو دہلی اور جون پور ہوتے ہوئے شاہ قوام الدین لکھنوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند ہی دنوں میں مقام قرب سے نوازے گئے۔ ایک دن شیخ نے فرمایا کہ تم نکاح کرو اس لیے کہ تمہاری صلب سے ایک لڑکا پیدا ہوگا جس سے ہمارا نام زندہ رہے گا اور خانوادہ

چشتیہ روشن ہوگا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا جب حضرت مخدوم کے پیدائش کی خبر شیخ قوام الدین تک پہنچی تو فرمایا: ''آوا مورا مینا'' اس وجہ سے آپ شیخ مینا مشہور ہوئے۔ (عین الولایت، ص: ۵۷)

آپ دس سال تک حضرت شاہ قوام الدین لکھنوی قدس سرہ کے ہی سایہ تربیت اور ظل عاطفت میں رہے۔ اور انتہائی قلیل مدت میں علوم عقلیہ ونقلیہ کے درجہ علیا پر فائز ہو گئے۔ بڑے بڑے علمائے زمانہ مسائل کی تحقیق وتدقیق کے لیے آپ کی بارگاہ میں رجوع کرتے۔ جب آپ کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو مقام قطبیت سے سرفراز کئے گیے اور پندرہ سال کی عمر میں حضرت مخدوم شیخ سارنگ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ وہبی ولایت کے باوجود آپ نے ایسی ایسی پر مشقت ریاضتیں کیں جو انسان کے بس سے باہر ہیں۔

(ملخصا، مقدمہ فوائد سعدیہ، از: ارتضا گوپاموی)

آپ نے تبلیغ دین، اشاعت علم اور دعوت وارشاد کے لیے اپنی مجالس کا آغاز کیا یہ مجلسیں کیا تھیں قرآنی تفسیرات، حدیثی تشریحات اور مشائخ کے اقوال وفرمودات کے ساتھ ساتھ ہر طرح کی علمی، فقہی، کلامی اور روحانی ارشادات سے ہم آہنگ تھیں۔ ان مجالس ودعوت ارشاد میں آپ کی زبان مبارک سے صادر شدہ ملفوظات کو آپ کے خلیفہ خاص حضرت مخدوم شیخ سعد الدین خیر آبادی نے اپنی تصنیف مجمع السلوک والفوائد میں جا بجا ذکر کیا ہے۔ ان ملفوظات کے استیعابی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ خانقاہ مینائیہ اپنے ابتدائی عہد میں اشاعت دین، فروغ تصوف، تزکیہ باطن اور تصفیہ قلب کا نمایاں سینٹر تھا، جہاں قرآن وحدیث کی تفسیر وتوضیح اور تصوف کے رموز واسرار سکھائے جاتے تھے۔ انبیا ورسل اور صحابہ وصحابیات کے حیرتناک واقعات سنا کر مجاہدین کی ایک ٹیم تیار کی جاتی تھی جو مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے اعلاء کلمۃ الحق کا فریضہ انجام دے سکیں۔ بلا شبہ ان ملفوظات کے مطالعے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نویں صدی میں اگر مولانا احمد تھانیسری (۸۵۰ھ) قاضی شہاب الدین دولت آبادی (۸۴۹ھ) اور قاضی نظام الدین جون پوری جیسی شخصیات اپنے علم وفضل کی خیرات بانٹ رہی تھیں تو وہیں قطب اودھ حضرت مخدوم شاہ مینا اپنے گوہر سخن اور علمی برکات سے ایک خطے کو سیراب کر رہے تھے۔ آپ کی خانقاہ نہ صرف علم وعمل اور شریعت وطریقت کا مجمع البحرین تھی بلکہ بیماروں اور مصیبت زدہ لوگوں کے لیے اکسیر روحانی بھی تھی۔

۲۳ صفر ۸۸۴ھ میں آپ کی وفات کے بعد آپ کے متبنی اور برادر زادے شیخ قطب الدین عہدۂ جانشینی پر فائز ہوئے لیکن خانقاہ اور آستانے کی تعمیر وتزئین آپ کے خلیفہ اعظم مخدوم شیخ سعد قدس سرہ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں یہ عمارت منہدم ہوگئی تھی، بعد میں اس کی تعمیر جدید ہوئی۔ اس وقت موجودہ متولی جناب راشد مینائی صاحب ہیں جن کی قیادت میں ہر سال ۲۳ صفر المظفر کو عرس مینائی انتہائی شان وشوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

(۷) خانقاہ سعدیہ (آستانہ بڑے مخدوم صاحب) خیرآباد شریف، سیتاپور

یہ خانقاہ قطب عالم شیخ سعد الدین خیرآبادی قدس سرہ (۹۲۲ھ) سے منسوب ہے۔ آپ نسبا قدوائی اور مشربا چشتی، قادری اور سہروردی تھے۔ آپ کے مورث اعلی قاضی قدوہ روم سے ہندوستان آئے تھے۔

آپ حضرت مخدوم شاہ مینا کے مرید خاص اور علوم ظاہر و باطن کے رمز شناس تھے۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے آپ کو عارف کامل کے ساتھ فقیہ، نحوی اور اصولی سے بھی یاد کیا ہے۔ مجمع السلوک والفوائد آپ کی علمی جلالت وشان پر بیّن دلیل ہے۔ آپ نے اپنی پچاس سالہ زندگی علمی جستجو میں بسر کی پھر بیس سال تک مخدوم شاہ مینا کی بارگاہ میں جاروب کشی کی جب عمر کی سترویں سال میں قدم رکھا تب آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا جو ۳۸ سالہ مدت کو محیط ہوئی ۶ سال تک لکھنو میں اور باقی ۳۲ سال خیرآباد میں آپ کی کامل ومکمل زندگی بسر ہوئی۔ (۱) اور اس طرح ۱۰۸ سال کی عمر میں دار بقا کی طرف کوچ کر گیے۔ قیام لکھنو کے دوران حضرت مخدوم شاہ قوام الدین لکھنوی کی خانقاہ کے انتظامی امور آپ ہی سنبھالتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ نے حضرت مخدوم شاہ مینا کی خانقاہ اور آستانے کی تعمیر کرنے کے ساتھ ایک دوسری خانقاہ بھی قائم کی تھی اور اسی سے متصل ایک سرائے بھی بنوائی تھی۔ اگرچہ یہ خانقاہ اب باقی نہ رہی لیکن سرائے کی تھوڑی آبادی اب بھی باقی ہے۔ (تحفۃ السعداء، ص:۴۷)

مرشد کی وفات کے چھ سال بعد آپ نے لکھنو کو ترک فرما کر خیرآباد میں اقامت اختیار کی۔ یہیں آپ نے تعلیم وتربیت، مبادی اسلام اور معارف صوفیہ کی نشر واشاعت کے لیے ایک عظیم خانقاہ اور مدرسہ کی بنا رکھی جو آپ کی آخری آرام گاہ بنی۔ یہ خانقاہ کیا تھی، طالبین وسالکین کے ساتھ بھوکوں، پیاسوں، بیماروں اور پریشان حالوں کی امید گاہ تھی۔ لنگر عام فیض عام تھا۔ خواجہ کمال لکھتے ہیں: حضرت سعد کے مطبخ میں روزانہ چودہ پندرہ من میدہ خرچ ہوتا تھا، جو صوفیوں، قوالوں، طلبہ اور مجاورین ومسافرین پہ خرچ ہوتا تھا۔ تقریبا چار پانچ ہزار تنکہ جو بمنزلہ روپیہ کے تھا محتاجوں کی بخشش میں صرف ہوتا تھا۔ (تحفۃ السعداء ص:۱۵۷-۱۵۸)

اس خانقاہ کی علمی، دعوتی، عرفانی وروحانی حیثیت مسلم ہے۔ تقریبا تمام تذکرہ نگاروں نے یہاں کے اسلوب دعوت وارشاد اور علمی جاہ وجلال کا مکمل اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر ذیشان مصباحی لکھتے ہیں: اس خانقاہ ومدرسہ کا دستور یہ تھا کہ طلبہ پہلے مدرسے میں داخل ہوتے تھے اور علوم ظاہری کی تکمیل کرتے تھے۔ اس کے بعد مراقبوں اور مجاہدوں سے گزرتے تھے۔ مدرسے میں کئی اساتذہ تھے، مطبخ تھا طلبہ کے قیام وطعام کا اہتمام تھا۔ بعض طلبہ ابتدا ہی سے شیخ سعد کی نظر انتخاب میں آجاتے اور وہ شیخ کی صحبت خاص میں چلے جاتے۔ (۲) مخدوم شاہ صفی جیسا قیمتی جوہر اسی کان علم ومعرفت کی بازیافت ہے۔

---

(۱) تحفۃ السعداء، ص:۱۴۱

(۲) پی، ایچ، ڈی مقالہ بعنوان شیخ سعد الدین خیرآبادی، ص:۲۴۷

آپ کی یہ خانقاہ امیر وغریب مسافر ومقیم، مسلم وغیر مسلم اور عابد وزاہد سب کے لیے یکساں کھلی رہتی تھی یہاں تک کہ جوگی و پنڈت کی بھی آمد ورفت رہا کرتی تھی۔ آنے جانے والوں کے لیے لنگر خانہ خاص میں کثرت سے کھانا پکتا تھا۔ ایک دن میں جتنے فتوحات آتے سب اسی دن صرف کر دیے جاتے تھے کل کے لیے کچھ باقی نہ رکھا جاتا چناں چہ جس دن آپ کی وفات ہوئی گھر میں کفن تک نہ نکلا۔(۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ اس خانقاہ کی برکت سے عرفا اور صالحین کی ایک جماعت وجود پذیر ہوئی جس سے ہندوستان میں بالعموم اور خطہ اودھ میں بالخصوص دعوت وعرفان کے کئی ایک علمی وروحانی مراکز قائم ہوگیے جس کے نتیجے میں اس بادۂ چشتی، نظامی ومینائی پر صفویت کا بھی ایک اضافی اور امتیازی لیبل لگ گیا۔ آپ کی حیات مبارکہ نویں اور دسویں دونوں صدی پر محیط رہی ہے اور ان دونوں صدیوں میں آپ مرجع علما ومشائخ رہے ہیں اس لیے ڈاکٹر ذیشان مصباحی آپ کی جلالت علمی اور دینی، علمی، تصنیفی تعلیمی، روحانی، اخلاقی اور اصلاحی وتجدیدی ہر میدان میں آپ کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوتے لکھتے ہیں: ’’آپ کو بجا طور پر اس عہد کے مجددین میں شمار کیا جانا چاہیے‘‘۔(ص:۳۰۹)

۹۲۲ھ میں آپ کے وصال کے بعد آپ کے برادر زادے سراج الاسلام شیخ محمود (۹۳۷ھ) جانشین ہوئے۔(۲) پھر ان کے صاحبزادے شیخ کمال الدین عرف شیخ ملک (۲۳ شعبان ۹۸۸ھ) مسند سجادگی پر متمکن ہوئے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں حاجی حسین صاحب اس خانقاہ کی مسند سجادگی اور تولیت پر جلوہ افروز ہوئے اور خانقاہ کی جائیداد، عرس کے اخراجات اور درگاہ کی مرمت کے اختیارات پانچ رکنی ٹرسٹ کے حصے میں آئی۔ حاجی حسین صاحب کے بعد آپ کے پوتے شاہ سجاد حسین تھے جو اپنے بزرگوں کی روحانی وراثت کے امین ہوئے۔ حضرت شاہ سجاد حسین علیہ الرحمہ نے اپنے نواسے حضرت نجم الحسن عثمانی عرف شعیب میاں کو سجادہ نشین مقرر کیا۔ ہر سال آپ ہی کی سرپرستی میں ۱۶/ ربیع الاول کو عرس کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

(۸) خانقاہ صفویہ صفی پور شریف، اناؤ

خانقاہ صفویہ کے روح رواں حضرت مخدوم شیخ عبد الصمد عرف مخدوم شاہ صفی قدس سرہ (۹۴۵ھ) ہیں۔ آپ مادرزاد ولی تھے۔ نسلاً عثمانی اور مشرباً چشتی قادری، سہروردی تھے۔ آپ حضرت مخدوم شاہ مینا قدس سرہ کے مرید وخلیفہ حضرت مخدوم شیخ سعد الدین خیر آبادی کے ممتاز خلیفہ اور ارشد تلامذہ سے تھے۔(۳) شیخ نے جب علوم ظاہری کے بعد ریاضت ومجاہدہ اور چلہ کشی کا حکم دیا تو تیسرے ہی دن سب علویات وسفلیات آپ پر کھل گیے۔ اور جب خلافت سے سرفراز ہوئے تو سب خلفا پر مقدم ہوگیے یہاں تک کہ اپنے شیخ کی خانقاہ میں بیٹھ کر مرید کیا کرتے تھے، لوگوں

---

(۱) پی، ایچ، ڈی مقالہ بعنوان شیخ سعد الدین خیر آبادی، ص:۲۵۰)

(۲) تحفۃ السعداء ص:۱۷۵

(۳) نزہۃ الخواطر، ج،۱ ص:۳۶۵

کے اعتراض پر آپ کے شیخ نے فرمایا:''تم صفی کے مراتب کو نہیں جانتے ہووہ میری منزل سے گزر کر میرے پیر کے مقام پر پہنچے ہیں''۔(۱) آپ کا شجرہ طریقت سات واسطوں سے حضرت محبوب الٰہی سے جاملتا ہے۔

آپ کی خانقاہ ضلع اناؤ کے قدیم ترین قصبہ صفی پور میں واقع ہے جو اناؤ شہر سے ۲۷ رکلومیٹر جانب غرب اور ریاست اتر پردیش کے دارالحکومت لکھنو سے تقریبا ۶۴ رکلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ قصبہ اولاً سائی پور کے نام سے جانا جاتا تھا بعد میں آپ ہی کے نام نامی سے موسوم ہو کر صفی پور کہلایا۔

یہ خانقاہ شمال ہند میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کا سب سے بڑا دعوتی وروحانی مرکز رہا ہے۔شمال کی شاید کوئی خانقاہ ہو جہاں براہ راست یا بالواسطہ خانقاہ صفویہ کے توسط سے چشتی نظامی فیضان نہ پہنچا ہو۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: خانقاہ صفویہ-تعارف وخدمات،از ڈاکٹر مجیب الرحمن علیمی)

خانقاہ صفویہ کی علمی ودعوتی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مجیب الرحمن علیمی رقم طراز ہیں:

ہر دور میں کفر وشرک میں ڈوبے ہوئے ہزاروں بندگان اس عظیم آستانے سے وابستہ ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ لاکھوں کی تعداد میں اولاد آدم نے اپنی گناہوں سے آلودہ زندگی سے توبہ کر کے راہ ہدایت اختیار کیا اور یہاں کے مشائخ نے ہزاروں نفوس کو عالم انسانیت کی رہبری ورہنمائی کے لائق بنا دیا۔(۲) چناں چہ میر عبدالواحد بلگرامی ۱۰۱۷ھ/ ۱۶۰۸ء، شیخ محمد حسین سکندر آبادی، سید محمد نظام الدین عرف مخدوم الہدیہ خیر آبادی، مخدوم شاہ خادم صفی ۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء) صاحب سرقل ہواللہ شاہ عبدالغفور محمدی ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء) شاہ عزیز اللہ صفی پوری ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) اور قاضی ارتضا علی خان گوپاموی ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء) وغیرہ جیسی شخصیات اسی کان علم ومعرفت کی بازیافت ہیں۔

ان حضرات نے سلسلہ صفویہ کی نشر واشاعت کے ساتھ اشاعت دین، فروغ روحانیت اور خدمت خلق کے حوالے سے جو لازوال نقوش چھوڑے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے یہ حصہ خانقاہ صفویہ ہی کے لیے مقدر کر رکھا تھا۔لیکن افسوس ہے کہ اس خانقاہ کی علمی، دعوتی،روحانی اور انقلابی خدمات کو مکمل طور پر نسل نو کے سامنے پیش نہ کیا جاسکا جس کا نتیجہ ہے کہ آج کی نسل نہ صرف خانقاہ صفویہ کی ہمہ گیریت اور وسیع دائرۂ خدمات سے ناواقف ہے بلکہ بہت سے ایسے بھی ہیں جنھیں اس کی شاخوں کا بھی صحیح علم نہیں۔اور اگر شاخوں کا علم ہے تو یہ نہیں جانتے کہ ان شاخوں کی کارکردگی خانقاہ صفویہ ہی کے مکتب کی کرامت اور اسی کے فیضان کرم کا ثمرہ ہے۔لیکن ہزاروں برکتیں ہو اس بطل عظیم ،جنید زماں شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی (متولد ۵ /محرم الحرام ۱۳۷۷ /۱۹۵۷ء) کی ذات مبارکہ پر جنھوں نے نقوش رفتہ کی بازیابی اور مشائخ کے توارث کی

---

(۱) عین الولایت،ص:۵۷

(۲) خانقاہ صفویہ-تعارف وخدمات،ص:۶۴ از ڈاکٹر مجیب الرحمن علیمی

تجدید واحیا کی طرف خصوصی توجہ کی اور علما کی ایک مضبوط ٹیم تیار کر کے اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ انھیں میں ایک بڑا نام ڈاکٹر مجیب الرحمن علیمی صاحب کا ہے جنھوں نے مشائخ صفویہ کے احوال وکوائف اور خانقاہ صفویہ کی خدمات اجاگر کرنے کی ایک خوبصورت پہل کی اور ''خانقاہ صفویہ- تاریخ وخدمات کا اجمالی جائزہ'' کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ مرتب کیا جو کتابی شکل میں خانقاہ عارفیہ سید سراواں سے شائع ہو کر وابستگان سلسلہ صفویہ کی نگاہوں کو ٹھنڈک پہنچا رہا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے مگر جامعیت سے لبریز ہے۔ اس کے مطالعے سے سلسلہ صفویہ کی ہمہ گیریت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

خانقاہ صفویہ آج بھی اپنے اسلاف کی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے اشاعت دین وفروغ روحانیت کے لیے مصروف عمل ہے۔ فی الوقت اس خانقاہ کے سجادہ نشین حضرت شاہ نوازش محمد صفوی فاروقی عرف صمدی میاں ہیں جو شب وروز خانقاہی نظام کو بحال کرنے اور اپنے بزرگوں کے طریقۂ مرضیہ کو فروغ دینے میں تگ ودو کر رہے ہیں۔ آپ نے خانقاہ سے متصل ایک دینی ادارے کی نشاۃ ثانیہ بھی کی ہے جہاں تشنگان علوم سیرابی حاصل کر رہے ہیں۔ آپ ہی کی قیادت میں ہر سال ۱۹ محرم الحرام کو عرس صفوی بڑے شان وشوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

(۹) خانقاہ برکاتیہ مارہرہ، ایٹہ

سلسلہ برکاتیہ کے امام صاحب البرکات سید شاہ برکت اللہ مارہروی ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب ۳۵ر واسطوں سے حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ سید محمد المعروف صاحب الدعوۃ الصغری (۶۴۵ھ) تھے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزندوں نے اس خطے کو آباد رکھا پھر اسی خاندان کی ایک شاخ مارہرہ میں سکونت اختیار کی۔ صاحبِ سبع سنابل حضرت میر عبدالواحد بلگرامی (م: ۱۰۱۷ھ/ ۱۶۰۸ء) کے بڑے بیٹے میر عبدالجلیل چشتی بلگرامی (م: ۱۰۵۷ھ/ ۱۶۴۷ء) وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مارہرہ کو اپنا مستقر بنایا۔ پھر آپ کے پوتے سید شاہ برکت اللہ مارہروی نے مارہرہ میں مستقل سکونت اختیار کی اور یہیں رشد وہدایت کے لیے ایک خانقاہ کی بنا ڈالی جو آج خانقاہ برکاتیہ سے معروف ہے۔

سید شاہ برکت اللہ مارہروی قدس سرہ اپنے والد محترم سید شاہ اویس بلگرامی سے شرف بیعت رکھتے تھے اور انھیں سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ حضرت صاحب البرکات نے اپنے والد سے سلسلہ چشتیہ نظامیہ ہی میں بیعت کی تھی۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے شیخ اسید الحق قادری لکھتے ہیں:

> یہ اس لیے کہ خاندان بلگرام میں گو کہ تمام سلاسل موجود تھے لیکن مشائخ پر نسبت چشتیت غالب تھی اور ان حضرات نے سلسلہ چشتیہ ہی کا اجرا کیا اور عموماً اسی میں بیعت لیا کرتے تھے۔ حضرت میر عبد الواحد بلگرامی مشہور چشتی بزرگ عارف باللہ حضرت مخدوم صفی سائی پوری (صفی پوری) سے شرف بیعت رکھتے تھے جو ظاہر ہے سلسلہ چشتیہ ہی میں تھے۔ حضرت میر صاحب کو خلافت اپنے پیر بھائی

مخدوم شاہ حسین سکندر آبادی سے تھی ۔لہٰذا بلگرام سے اسی سلسلہ مخدوم صفی کا اجرا کیا گیا اور حضور صاحب البرکات کو اپنے والد گرامی سے اسی سلسلہ چشتیہ کا فیض پہنچا۔(۱)

بعد میں حضرت شاہ برکت اللہ حضرت شاہ فضل اللہ قادری کالپوی سے وابستہ ہوئے۔حضرت سید شاہ فضل اللہ قادری کالپوی کی اجازت وخلافت کے بعد حضرت صاحب البرکات نے سلسلہ قادریہ کا اجرا فرمایا۔خانوادۂ برکات اور اس کی فیض یافتہ خانقاہوں سے عام طور پر اسی سلسلۂ قادریہ کالپویہ میں بیعت لی جاتی ہے۔اس لیے صاحب البرکات کو اپنے والد سیدنا شاہ اویس بلگرامی سے جس آبائی سلسلہ کی اجازت وخلافت حاصل تھی اس کو سلسلہ قدیمہ کہا جاتا ہے اور کالپی شریف سے جن سلاسل کی اجازت عطا فرمائی گئی ان کو سلاسل جدیدہ کہا جاتا ہے۔البتہ خانوادۂ برکات کا سلسلہ قدیمہ ہو یا جدیدہ دونوں میں خواجہ خواجگاں سلطان الہند غریب نواز کے واسطے سے فیضان چشت موجود ہے۔

حضرت ابوالفضل آل احمد اچھے میاں مارہروی کے چہیتے مرید وخلیفہ حضرت شاہ عین الحق عبدالمجید قادری بدایونی قدس سرہ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء تھے جنھوں نے شیخ کے وصال کے بعد بدایوں کی سرزمین پر خانقاہ قادریہ اور سلسلہ قادریہ کی بناڈالی۔اس طرح سے یہ خانقاہ بھی چشتیت ونظامیت اور صفویت کے اشتراک کے ساتھ مستفیض ومستنیر ہے۔۱۲۳۵ھ میں اس خانقاہ کے قیام سے اب تک دوصدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ان پچھلی دو صدیوں میں جن مشائخ عثمانیہ قادریہ نے خانقاہ قادریہ کی مسند سجادگی کو زینت بخشی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا شاہ عین الحق عبدالمجید قادری (۱۲۵۳ھ/ ۱۸۴۷ء

(۲) سیف اللہ المسلول حضرت مولانا شاہ فضل رسول بدایونی ۱۲۸۹ھ

(۳) تاج الفحول حضرت مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی ۱۳۱۹ھ

(۴) حضرت مولانا شاہ عبدالمقتدر قادری بدایونی ۱۳۳۴ھ

(۵) حضرت مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی ۱۳۸۹ھ

(۶) حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری، موجودہ سجادہ نشیں ۱۹۶۰ء تا حال

انھیں کے عظیم سپوت حضرت مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری تھے، جو سفر بغداد میں جام شہادت نوش کر گئے۔

خانقاہ برکاتیہ کا ایک نمایاں وصف یہ رہا ہے کہ اس خانوادے میں ہر دور میں شریعت وطریقت کی جامع شخصیات نمودار ہوئی ہیں۔چناں چہ تیرہویں صدی ہجری کے آغاز میں سید شاہ آل رسول مارہروی کی شخصیت فخر اسلاف بن کر ظاہر ہوئی جن کے دست حق پرست پر وقت کے نامور عالم دین مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی بیعت ہوئے۔گویا خانوادہ رضویہ اسی خانقاہ کا فیض یافتہ ہے۔

---

(۱) تحقیق وتفہیم، ص:۲۳۸

سید شاہ آل رسول مارہروی کے خلیفہ سیدنا شاہ ابوالحسین احمد نوری مارہروی بھی تھے جن کے ذریعے سے فیضان برکاتیت دور دور تک پہنچا۔ اس وقت خانقاہ برکاتیہ میں چشتی و قادری دونوں فیضان جاری وساری ہے۔ حضرت پروفیسر سید شاہ امین میاں برکاتی، حضرت سید نجیب حیدر برکاتی اور حضرت مولانا سید سبطین حیدر برکاتی (سجادہ نشینان خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف) کی قیادت وسرپرستی میں یہاں اعراس کی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔

موجودہ دور میں خانقاہ برکاتیہ نے مسلمانوں کے درمیان تعلیمی بیداری لانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ خانقاہ ایک علمی وقار اور فکری وعملی انقلاب سے ہم آہنگ دینی و تعلیمی شناخت رکھتی ہے۔ چنانچہ جامعۃ البرکات جیسا عظیم الشان تعلیمی ادارہ اسی خانقاہ کی دین ہے۔ جامعہ آل رسول اور جامعہ احسن البرکات اس خانوادہ کے مذہبی تعلیمی ادارے ہیں جہاں طلبہ حفظ وقراءت اور عالمیت کا درس پا رہے ہیں۔

(۱۰) خانقاہ کلیمیہ چشتیہ نظامیہ، دہلی

اس خانقاہ کے بانی حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی متوفی (۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ) ہیں جنہیں تاریخ سلسلہ چشت میں ایک خاص مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ اس لیے کہ آپ ہی کے عہد سے چشتیہ سلسلہ کے احیا وتجدید کا دور شروع ہوتا ہے۔ آپ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے بھانجے شیخ کمال الدین علامہ کے خاندان کے فرد فرید شیخ یحییٰ مدنی کے مرید وخلیفہ تھے جن کے متعلق خلیق نظامی لکھتے ہیں کہ چشتیہ نظامیہ سلسلہ کی سب سے اہم اور مرکزی کڑی وہی ہے جو کمال الدین علامہ کے ذریعہ شیخ یحییٰ مدنی تک پہنچتی ہے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص:۲۱۱)

آپ کا خاندان دیگر علوم وفنون کے ساتھ فن تعمیر میں اپنی مثال آپ تھا۔ چنانچہ جامع مسجد دہلی، تاج محل آگرہ، لال قلعہ دہلی اور محل نواب آصف خان لاہور ان جیسی عمارتوں کے تزئین وتحسین اور نقش ونگار کا سہرا آپ ہی کے خاندان کے سر جاتا ہے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص:۲۷۳-۲۷۳)

آپ کی روحانی تربیت حجاز مقدس میں شیخ یحییٰ مدنی کے پاس ہوئی اور یہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد حضرت شیخ نے آپ کو خرقہ خلافت اور ظاہری وباطنی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد آپ دہلی تشریف لائے اور لال قلعہ کے سامنے چاندنی چوک سے متصل خانقاہ کلیمیہ چشتیہ نظامیہ کی بنا ڈالی اس وقت یہ جگہ بازار خانم کے نام سے جانی جاتی تھی جو دلی کا سب سے بارونق بازار تھا۔ ایک طرف لال قلعہ کی دلکش عمارت تھی تو دوسری طرف جامع مسجد کی فلک بوس مینار یں، ان دونوں کے درمیان میں شاہ صاحب کی خانقاہ تھی۔ خلیق نظامی لکھتے ہیں: یہ خانقاہ کیا تھی علم ومعرفت، رموز وحکمت احسان وسلوک کا سرچشمہ تھی ہزاروں تشنگان معرفت اپنی پیاس بجھانے کے لیے یہاں آتے تھے، شائقین علم وفضل ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہونا فخر ومباہات تصور کرتے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص:۳۸۶)

اسی خانقاہ سے متصل ایک مدرسہ تھا جس کی شہرت پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی، دور دراز سے طلبہ تحصیل علم کے لیے یہاں حاضر آتے اور علم وفن کے گوہر آبدار سے اپنا دامن بھر کر لوٹتے تھے۔ یہاں طلبہ کو صرف زیور علم

سے آراستہ ہی نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ان کی جملہ ضروریات کی تکمیل بھی ہوا کرتی تھی، کھانے پینے کے علاوہ کپڑے بھی تقسیم کیے جاتے تھے جس کا ذکر مولف شجرۃ الانوار نے بھی کیا ہے: بسیار طلبہ ایں جا آمدہ سکونت می نمودند سبق کتبہا می خواندند و نان و پارچہ نیز از سرکار می یافتند، بہت سے طلبہ ان کی خدمت میں آکر رہتے اور علم حاصل کرتے تھے، ان کو کھانا اور کپڑا بھی سرکار سے ملتا تھا۔ (بحوالہ تاریخ مشائخ چشت، ص:۳۸۶)

اس خانقاہ کا نمایاں کارنامہ یہ تھا کہ اس نے سلسلہ چشتیہ کے بے ترتیب نظام میں از سرنو باقاعدگی کی ایک روح پھونک دی تھی اور ایسے زمانے میں رشد و ہدایت کی شمع روشن کی تھی جب مسلمانان ہند نہایت نازک دور سے گزر رہے تھے۔ سلطنت مغلیہ زوال پذیر ہونے لگا تھا۔ مذہب کی روح تقریبا ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے مؤلف تاریخ مشائخ چشت لکھتے ہیں کہ: شاہ صاحب نے تنزل و انحطاط کے اس دور میں احیا ملت اور اعلاء کلمۃ الحق کے لیے جو کوششیں کی وہ اسلامی ہند کی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

(تاریخ مشائخ چشت، ص:۳۶۷)

اس خانقاہ میں تعلیم و تربیت اور اصلاح و تبلیغ کے ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی گراں قدر خدمات ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کی نہایت اعلیٰ تفسیر قرآن القرآن اور عشرہ کاملہ، سواء السبیل، کشکول کلیمی، مرقع تسنیم اور الہامات کلیمی وغیرہ جیسی نایاب کتابیں اسی خانقاہ کی رہین منت ہیں، تاریخ مشائخ چشت میں ہے: شاہ کلیم اللہ صاحب نے تصانیف کا ایک بے بہا ذخیرہ چھوڑا ہے جس سے ان کی تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مناقب فریدی میں ان کی تصانیف کی تعداد ۳۲ بتائی گئی ہے ان تصانیف کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنے مکتوبات بھی چھوڑے ہیں جن کا مجموعہ مکتوبات کلیمی کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کی دیگر تصانیف اگر ان کی علمی کی شاہد ہیں تو یہ مکتوبات ان کی عملی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص:۳۹۵)

حضرت نظام الدین اورنگ آبادی اسی خانقاہ کے سپوت تھے جنہوں نے دکن میں اشاعت اسلام اور اصلاح عوام کا زبردست کارنامہ انجام دیا۔ ۱۱۴۲ھ مطابق ۱۷۲۹ء میں حضرت شاہ صاحب کے انتقال کے بعد بھی یہ خانقاہ آباد رہی اور دین وملت کے خدمات انجام دیتی رہی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر میں نہ صرف منہدم کر دی گئی بلکہ خانقاہ کے گرد و نواح کی پوری آبادی تباہ و برباد کر دی گئی۔ مناقب المحبوبین میں ہے" در سال غدر چوں نصاریٰ بر اہل اسلام دہلی فتح یافتند مکانہائے کہ قریب لعل قلعہ بودند ہمہ را منہدم کردند۔(۱) غدر میں جب نصاریٰ نے مسلمانوں پر فتح پائی تو لال قلعہ کے قریب کے مکانات منہدم کر دیے گئے۔ اسی ہنگامہ میں شاہ صاحب کی خانقاہ بھی منہدم کر دی گئی۔ لیکن بعد میں پھر آپ کی تربت پر ایک عالیشان گنبد تعمیر کیا گیا اور خانقاہ کی جدید عمارتیں بنائی گئیں، اس وقت یہ خانقاہ لال قلعہ کے صدر دروازے کے سامنے لب روڈ واقع ہے۔

---

(۱) (بحوالہ، تاریخ مشائخ چشت، ص:۴۲۱)

(۱۱) خانقاہ نظامیہ کلیمیہ اورنگ آباد دکن

حضرت مولانا نظام الدین اورنگ آبادی متوفی ۱۱۴۲ھ متاخرین مشائخ چشت میں ایک جلیل القدر بزرگ گزرے ہیں۔ آپ علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور سنت رسول کے سخت پابند تھے۔ تحریر وتصنیف کا بھی بہت شوق تھا۔ آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں نظام القلوب بہت مشہور ہے۔ آپ حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کے عزیز مرید اور ممتاز خلیفہ تھے۔ شیخ ہی کے اشارے پر دکن تشریف لائے اور اورنگ آباد کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ یہیں آپ نے خانقاہ نظامیہ کلیمیہ کی بنا ڈالی جو بہت جلد مرجع عوام وخواص ہوگئی۔ مولف نافع السالکین نے اس خانقاہ کے خصائص کا کچھ یوں ذکر کیا ہے:

> حضرت اورنگ آبادی کی خانقاہ کے دس دروازے تھے، ہر دروازے پہ ایک کاتب بیٹھا رہتا تھا جو حاجت مندوں کی حاجت لکھ کر اس پر حضرت اورنگ آبادی کی مہر لگا دیتا، سائل وہ رقعہ لے کر جس امیر کے پاس جاتا وہ اس کی حاجت پوری کرنے میں بے حد خوشی محسوس کرتا اور ثواب دارین تصور کرتا۔ اس خانقاہ کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوتے تھے۔ (نافع السالکین، ص: ۱۰۷، بحوالہ تاریخ مشائخ چشت، ص ۴۳۷)

اس خانقاہ کی سخاوت وفیاضی بھی عجیب تھی، غربا و مساکین کے لیے روپے، پیسے اور اشرفیاں کاغذی ٹکڑوں میں محفوظ رکھی جاتی تھیں، جب بھی کوئی حاجت مند آتا تو اشرفیوں سے بھرے وہ کاغذی تھیلے اس کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ فخر الطالبین میں ہے کہ حضرت اورنگ آبادی کے پاس اشرفی روپے، پیسے علاحدہ علاحدہ کاغذ میں بندر کھے ہوتے تھے جو محتاج آتا اس میں سے دے دیتے، فقیر کو ایک پیسہ سے زیادہ نہ دیتے، اور لوگوں کو اشرفیاں تک دے دیتے تھے۔ فرمایا کرتے کہ شریفوں کے لیے بڑی مشکل ہے کہ: وہ شرم کے مارے بھیک بھی نہیں مانگ سکتے اور فاقہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے کیا ہے یہ تو در در پھر کر خوب جمع کر لیتے ہیں۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص: ۴۴۷)

آپ ہی کے صاحبزادے حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں تھے جن کی روحانی تربیت اسی خانقاہ سے ہوئی تھی جو بعد میں چل کر شبستان چشت کے انمول جوہر اور اس سلسلے کے میر کارواں اور مجدد تسلیم کیے گئے۔ والد کے انتقال کے بعد آپ اولیں جانشین کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ حضرت شیخ نظام الدین کا مزار مبارک اورنگ آباد میں ایک عالیشان گنبد کے نیچے واقع ہے۔ یہاں اب صرف آپ کا آستانہ ہے پہلے کی طرح خانقاہی نظام نہیں ہے۔ آپ کے بعد بھی آپ کے صاحبزادے کے ذریعے اس سلسلے کی خوب ترقی ہوئی، لیکن آپ کی قائم کردہ خانقاہ ترقی پذیر نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت فخر الدین فخر جہاں الہامی ارشادات کی بنا پر اورنگ آباد کو خیر باد کہہ کر دہلی تشریف لے آئے اور یہیں خانقاہ کلیمیہ نظامیہ کی ایک شاخ خانقاہ فخریہ وجود میں آئی جس نے سلسلہ نظامیہ کو دور دراز مقامات تک پہنچا یا دیا۔ اس خانقاہ کے متعلق خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں کہ: آپ کی خانقاہ کی

روحانیت ایسی عجیب وغریب تھی کہ یہاں کے تربیت یافتہ حضرات جہاں بھی گئے نظامیہ سلسلہ کو چار چاند لگا دیا۔ چنانچہ پنجاب میں آپ کے خلیفہ نور محمد مہاروی گئے تو وہاں تونسہ شریف، چاچڑاں شریف، سیال شریف، گولڑہ شریف اور جلال پور وغیرہ کی متعدد چشتی نظامی خانقاہیں شاخ در شاخ پیدا ہوئیں۔ (نظامی بنسری، ص:۵۰۱)

اس خانقاہ کے خصائص کا ذکر کرتے ہوئے خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں: اس خانقاہ میں جو بھی آتا متاثر ہوئے بغیر نہیں لوٹتا، جرائم پیشہ لوگ پناہ تلاش کرتے ہوئے خانقاہ میں آتے اور ولی بن کر لوٹتے، گردن کشاں تکلیف پہنچانے کی نیت سے آتے اور حلقہ بگوش ہو جاتے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص:۴۹۰)

آپ ہی کے زمانے میں سلسلہ چشت پر ایک زبردست اعتراض کیا گیا یہ کہتے ہوئے کہ چشتیہ سلسلہ کی سند متصل نہیں ہے، کیوں کہ خواجہ حسن بصری، حضرت علی کے زمانے میں کم عمر تھے اور کم سنی میں انہیں روحانی خلافت کیسے مل سکتی ہے؟ اس اعتراض کا تشفی بخش جواب اسی خانقاہ فخریہ سے دیا گیا۔ جس کا جوابی بیاض فخر الحسن کے نام سے معروف ہے۔ خود صاحب خانقاہ حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں نے یہ خدمت انجام دی، اس لیے سوانح نگاروں نے آپ کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے آپ کو نظامیہ سلسلہ کا مجدد قرار دیا ہے چناں چہ خلیق نظامی لکھتے ہیں: شاہ فخر الدین کو بجا طور پر نظامیہ سلسلہ کا مجدد کہا جاتا ہے، انہوں نے اس سلسلہ کو نئی زندگی بخشی، اور اپنے خلفا کو ملک کے دور دراز حصوں میں بھیج کر نظامیہ سلسلہ کی خانقاہیں قائم کرائیں۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص:۵۱۴-۵۲۰)

آپ کے وصال کے بعد آپ کے صاحبزادے خواجہ غلام قطب الدین سجادہ نشین ہوئے جن کے دست حق پرست پر محمد اکبر شاہ اور بہادر شاہ ظفر جیسے لوگ شرف بیعت رکھتے تھے۔ بعد میں یہ سجادگی حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں کے پوتے نصیر الدین عرف کالے صاحب کے نواسوں میں چلی گئی۔ حتیٰ کہ بعد کے ادوار میں سجادگی کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔ اس وقت اس خانقاہ کا نہ کوئی سجادہ ہے نہ جانشین اور نہ ہی باضابطہ خانقاہی رسم و رواج ہے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار مبارک سے متصل حضرت شاہ فخر صاحب کا مزار ہے جہاں ہر سال ۲۷ر جمادی الآخر کو عرس کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں جس میں لنگر چادر پوشی اور محفل سماع جیسے معمولات شامل ہوا کرتے ہیں۔ جس کے ذمہ دار دہلی وقف بورڈ کی طرف سے منتخب کردہ کمیٹی کے افراد ہوا کرتے ہیں۔

(۱۲) خانقاہ حضرت خواجہ نور محمد مہاروی پنجاب

حضرت شیخ نور محمد مہاروی (متوفی: ۱۲۰۵ھ) شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کے سلسلے کے ایک گوہر نایاب کا نام ہے جو مولانا فخر الدین فخر جہاں کے مرید وخلیفہ تھے۔ موضع چوٹالہ بہاول پور میں پیدا ہوئے اور بحکم مرشد مہار کو اپنے مشن کا مرکز بنایا۔ آپ کا سلسلہ نسب نوشیرواں عادل سے جا ملتا ہے۔ ''خلاصۃ الفوائد'' آپ کے ملفوظات کا شاندار مجموعہ ہے جسے مولانا محمد عمر شہید پوری نے ترتیب دیا ہے۔

آپ کی خانقاہ پاکستان کی قدیم ریاست بہاول پور کا ایک معروف قصبہ مہار شریف میں واقع ہے جو پاک

پٹن سے تقریباً چالیس کوس کے فاصلے پر ہے۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے بعد سرزمین پنجاب میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی ترویج و اشاعت کا سب سے بڑا پلیٹ فارم یہی خانقاہ ہے، یہاں تک کہ موجودہ سلاسل چشت پنجاب اسی خانقاہ سے وابستگی کا دامن تھامے ہوئے ہیں۔ تونسہ شریف، سیال شریف، چاچڑاں، جلال پور، کوٹ مٹھن اور گولڑہ وغیرہ متعدد مقامات کی خانقاہوں کے چراغ اسی خانقاہ سے روشن و منور ہوئے ہیں۔ اس لیے خلیق نظامی لکھتے ہیں: حضرت بابا فرید گنج شکر کے بعد پنجاب میں چشتیہ سلسلہ کے کسی بزرگ نے ترویج سلسلہ میں اس قدر کوشش نہیں کی جتنی اٹھارویں صدی میں حضرت نور محمد مہاروی نے کی تھی۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص: ۵۳۰)

آپ کی خانقاہ کے قیام سے قبل پنجاب اور سندھ کے بیشتر علاقوں میں سلسلہ قادریہ اور سہروردیہ زوروں پر تھا لیکن شاہ نور محمد قدس سرہ کی خانقاہ قائم ہونے کے بعد دوسرے سلسلے کی رونق سلسلہ نظامیہ کے سامنے اس طرح گم ہو گئی جیسے آفتاب کے سامنے ستاروں اور چراغوں کا نور گم ہو جاتا ہے۔ شیخ جمال ملتانی اسی خانقاہ کے خوشہ چیں تھے جن کے ذریعے ملتان میں چشتیہ نظامیہ کی شجرکاری ہوئی اور انھیں کے مرید و خلیفہ شیخ عبدالعزیز پرہاروی تھے جنھوں نے عقائد کی معروف کتاب عقائد نسفی کی شرح ''النبراس'' لکھی جو عرب و عجم میں یکساں مقبول ہوئی۔ موجودہ اسلامی اسکالر پیر ثاقب شامی انھیں کے سلسلے سے وابستہ ہیں۔

اس خانقاہ میں ہزاروں عقیدت مند حاضر ہوا کرتے، آنے والوں میں امیر و غریب سبھی ہوتے، امرا و صاحبان ثروت کا جم غفیر لگا رہتا تھا اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جو یہاں پہنچ جاتا متاثر ہوئے بغیر نہیں لوٹتا۔ آپ کے خلیفہ شاہ سلیمان تونسوی فرمایا کرتے تھے کہ: عجیب تاثیر بود ہر کہ دست ایشاں گرفتے او را تاثیر شدے۔ آپ میں عجیب تاثیر تھی جو بھی ان کے دست حق پرست پر بیعت ہو جاتا وہ بھی صاحب تاثیر ہو جاتا۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص: ۵۴۳)

آپ کے وصال کے بعد آپ کے خلف اکبر شیخ نور الصمد مسند سجادگی پر بیٹھے پھر یکے بعد دیگرے شیخ نور احمد میاں، خواجہ محمود اور شیخ نور بخش مسند نشین ہوئے۔ آج کل خواجہ غلام معین الدین منصب سجادگی سنبھالے ہوئے ہیں اور ہر سال انھیں کی قیادت و سرپرستی میں ۱ تا ۳ / ذی الحجہ عرس کی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔

(۱۳) خانقاہ خواجہ محمد عاقل چشتی، کوٹ مٹھن

یہ خانقاہ حضرت خواجہ محمد عاقل چشتی کی ذات بابرکات سے وجود میں آئی۔ آپ ایک معزز فاروقی خاندان کے فرد فرید تھے۔ مولانا فخر الدین دہلوی اور خواجہ نور محمد مہاروی کے صف کے تلامذہ میں شامل تھے۔ شاہ فخر صاحب سے آپ نے شرح عبدالحق اور سواء السبیل کا درس پایا اور خواجہ مہاروی سے علوم ظاہری و باطنی دونوں کی تکمیل کی پھر انہیں کے حلقہ ارادت میں شامل بھی ہوئے۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص: ۵۸۰)

اصلاح باطن اور تزکیہ نفس کے بعد بحکم مرشد اشاعت سلسلہ کی طرف متوجہ ہوئے اور چاچڑاں، احمد پور، کوٹ مٹھن وغیرہ مختلف مقامات کی خانقاہیں آپ ہی کی مساعی سے وجود میں آئیں۔ حاجی نجم الدین صاحب لکھتے

ہیں: ہزار ہا مخلوق از دروازہ ایشاں فیض یاب شدند وصد ہا صاحب خانقاہا از ایشاں مبعوث شدند' ہزاروں خلق خدا ان کے دروازے سے فیض یاب ہوئی اور سیکڑوں اصحاب خانقاہ ان سے مبعوث ہوئے۔

(مناقب المحبوبین، ص: ۱۲۳، بحوالہ تاریخ مشائخ چشت، :۵۷۵)

پنجاب میں سلسلہ نظامیہ کی نشر واشاعت میں اس خانقاہ نے نمایاں حصہ لیا تھا، یہاں علوم باطن کے ساتھ علوم ظاہر کا بھی بڑا اہتمام تھا، علما وطلبا کی ایک بڑی تعداد یہاں تعلیم وتربیت سے لیس ہوتی تھی۔خواجہ سلیمان تونسوی عرف پیر پٹھان جیسے درنایاب اسی چمنستان علم وفضل کے چہکتے بلبل تھے۔(فیضان پیر پٹھان ص: ۴، دعوت اسلامی)۔خلیق نظامی لکھتے ہیں: خواجہ محمد عاقل نے کوٹ مٹھن میں نہایت اعلی پیمانہ پر ایک مدرسہ قائم کیا تھا، بڑے بڑے عالم اس مدرسہ میں ملازم تھے۔درس وتدریس کا کام بہت با قاعدہ ہوتا تھا، خود خواجہ محمد عاقل صاحب سو سے زائد طلبہ کو درس دیتے تھے۔مدرسہ کے ساتھ ہی ایک بڑا لنگر خانہ بھی تھا۔اس لنگر خانے کے متعلق خلیق نظامی لکھتے ہیں : قاضی صاحب کا لنگر ابتدائی زمانہ سے ہی جاری تھا۔طلبا اور فقرا کو اس لنگر سے خانہ ملتا تھا۔لیکن ایک زمانہ شاہ صاحب پر ایسا بھی گزرا تھا کہ مسلسل فاقہ رہتا تھا اور لنگر کے سب متعلقین، فقرا اور طلبا کو یہ مصائب برداشت کرنے پڑتے تھے۔جب فتوح نہ آتی تھی تو کچھ نہ پکتا تھا جب کچھ آجاتا تو پک جاتا۔لیکن خواجہ صاحب کا یہ عالم تھا کہ جب تک تمام متعلقین، درویش اور طالب علم کھانا نہ کھا لیتے اس وقت تک آپ کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے۔جب باب فتوح کھل گیا تو لنگر سے کھانے والوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا، اس وقت نہ آنے والوں کا شمار تھا نہ کھانے کا اندازہ۔بس ایک شاہی دربار تھا جو چلتا رہتا تھا۔

(تاریخ مشائخ چشت، ص:۵۸۶-۸۷)

اس خانقاہ میں امیر وغریب بوڑھے اور نوجوان سبھی حاضر آتے تھے اور سب کو یکساں شفقتیں ملا کرتی تھیں، آنے والوں کی تربیت کی خاطر آدھی آدھی رات تک مجلسیں سجی رہتی تھیں۔ بالآخر ایک دن خواجہ صاحب فرمانے لگے:

''امروز در تمام ہرج سفر کشیدیم خوب شد کہ بہ منزل رسیدیم''

یہ الفاظ سن کر حاضرین رونے لگے اور ۸ رجب ۱۲۲۹ھ کو آپ محبوب حقیقی سے جا ملے۔آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے میاں احمد علی (متوفی ۱۲۳۱ھ) سجادہ مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے جو بڑے پایہ کے عالم تھے۔آپ کے وصال کے بعد آپ کے فرزند اکبر میاں خدا بخش مسند نشیں ہوئے جو کچھ دنوں کوٹ مٹھن میں رہے پھر چاچڑان کو اپنا مستقر بنالیا۔

اس طرح سے چاچڑان میں بھی سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی خانقاہ قائم ہوئی اور یہیں ۲۵ / ذوقعدہ ۱۲۶۱ھ کو میاں خدا بخش کے گھر غلام فرید نامی ایک فرزند پیدا ہوا جس نے چاچڑان کو دانش کدہ علم وحکمت بنا دیا۔اس شہر

کے محل وقوع کے تعلق سے ویکیپیڈیا میں ہے: چاچڑاں شریف (انگریزی:Chachran Shrif) پاکستان کا ایک آباد مقام جو تحصیل خانپور ضلع رحیم یار خان میں واقع ہے۔ یہ تحصیل خانپور کی ایک یونین کونسل بھی ہے۔ یہ شہر دریائے سندھ کے مشرقی کنارے پر آباد ہے۔ چاچڑاں شریف کی وجہ شہرت عظیم صوفی بزرگ اور سرائیکی زبان کے عظیم شاعر خواجہ غلام فرید کی جائے پیدائش ہونا ہے۔ حضرت خواجہ غلام فرید اپنے بڑے بھائی خواجہ فخر جہاں سے بیعت تھے۔ بھائی کے انتقال کے بعد آپ سجادہ نشین ہوئے۔ آپ بڑے سخی و فیاض تھے۔ آپ کے لنگر کا روزانہ کا خرچہ 12 من چاول اور 8 من گندم تھا۔ تقریباً 100 سے 500 آدمی ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ آپ کے پاس جو کچھ آتا سب شام تک غرباء و مساکین میں بانٹ دیتے تھے۔

آپ نے شاعری بھی کی، آپ کا زیادہ تر کلام سرائیکی زبان میں ہے۔ جس کا نام ''دیوان فرید'' ہے اس کے علاوہ اردو، عربی، فارسی، پوربی، سندھی اور ہندی میں شاعری بھی کی ہے۔ آپ کا اردو دیوان بھی موجود ہے۔ آپ کا کلام ہر رنگ و نسل، عوام و خواص، عالم وان پڑھ، خواندہ و ناخواندہ اور عجم و عرب میں مشہور ہے۔ آپ الفاظ کے ساحر ہیں اور حافظ جیسا سوزِ عشق آپ کے کلام کا خاصہ ہے۔ لطیف احساسات، جذبات اور اس میں وجدانی کیفیات کو اس طرح ملا دینا کہ شیر و شکر ہو جائیں، یہ آپ کی شاعری کا ادنیٰ کمال ہے۔

آپ کا وصال چاچڑاں شریف میں ۲۴ رجولائی ۱۹۰۱ء بروز بدھ ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۵۶ برس تھی۔ آپ کا ایک بیٹا، حضرت خواجہ محمد بخش عرف نازک کریم اور ایک بیٹی تھیں۔ آپ کا مزار کوٹ مٹھن (ضلع راجن پور) میں ہے۔

(۱۴) خانقاہ نیازیہ بریلی شریف

شاہ نیاز احمد بریلوی (متوفی: ۱۲۵۰ھ) سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے ایک نامور صوفی، اردو اور فارسی کے باکمال شاعر اور رنگ شاعری کے فرد فرید، مصحفی کے استاد تھے۔ خلق سے بے نیازی کے سبب آپ شاہ نیاز بے نیاز کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کا دیوان ''دیوان نیاز احمد بریلوی'' اپنی جامعیت وافادیت کے لحاظ سے خوب تر ہے جسے صوفیہ اپنی مجالس میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ اس دیوان میں منطق وفلسفہ وغیرہ کی اصطلاحات متعدد مقامات پر استعمال کئے گئے جس سے آپ کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ حضرت مولانا فخر الدین فخر جہاں کے مرید وخلیفہ تھے اور انھیں کے ایما پر سرہند کو ترک کر کے بریلی میں اقامت گزیں ہوئے تھے یہاں آپ نے ایک خانقاہ قائم فرمائی جو بہت جلد معدن فیوض ربانی اور مطلع انوار سبحانی بن گئی۔ اس وقت یہی خانقاہ ''خانقاہ نیازیہ'' سے معروف ہے جو کم وبیش ۱۵/ بیگھے پر پھیلی ہوئی ایک وسیع وعریض خانقاہ ہے۔ ماضی قریب کے مشہور شاعر بہزاد لکھنوی اسی خانقاہ کے فیض یافتگان میں سے تھے۔ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے فروغ واشاعت میں اس خانقاہ کا نمایاں کردار رہا ہے۔

خلیق نظامی لکھتے ہیں: اٹھارویں صدی میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کو ہندوستان میں جو کچھ فروغ ملا وہ مولانا شاہ فخر الدین کے دو مریدوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ شاہ نور محمد صاحب نے پنجاب میں اور شاہ نیاز احمد صاحب نے اتر پردیش میں سلسلے کو خوب پروان چڑھایا۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص: ۵۶۳)

اس خانقاہ کی خدمات کا دائرہ صرف ریاست اتر پردیش ہی تک نہیں بلکہ برصغیر سمیت دیگر ممالک میں بھی خوب وسیع تھا۔ ایران، عرب، افغانستان، سمرقند اور بدخشاں کے دور دراز مقامات پر اس خانقاہ کے متعلقین، عقیدت مند اور ارادت کیش پائے جاتے تھے اور ان مقامات سے بھی تشنگان معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے خانقاہ نیازیہ بریلی شریف حاضر ہوا کرتے تھے۔ مؤلف خزینۃ الاصفیا لکھتے ہیں:

''خلق بے شمار بہ حلقہ ارادت وے در آمدہ و مردماں از اقالیم دور و دراز یعنی از قابل وقندھار و شیراز وبدخشاں بہ خدمت بابرکت وے حاضر آمدہ مستفیض و مستفید شدند''۔ (خزینۃ الاصفیا، فارسی ص: ۵۱۳)

بے شمار خلق ان کے حلقہ ارادت میں شامل تھی اور دور دراز ملکوں یعنی کابل، قندھار، شیراز اور بدخشاں سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض یاب ہوتے۔ حضرت شاہ نیاز بے نیاز کے خلفا کی تعداد کثیر تھی اس لیے ہند اور بیرون ہند ان کے سلسلہ کی خانقاہیں بکثرت قائم ہوئیں چناں چہ خانقاہ ظریفیہ نیازیہ گوالیار، دائرہ شاہ محمدی الہ آباد، خانقاہ نیازیہ علی گنج ایٹہ وغیرہ متعدد خانقاہیں اسی خانقاہ کی شاخیں ہیں۔ حضرت شاہ نیاز قدس سرہ کے وصال کے بعد آپ کے خلف اکبر شاہ نظام الدین خانقاہ نیازیہ کے مسند ارشاد پر متمکن ہوئے جو بڑے پائے کے بزرگ تھے فرزندان توحید کا ایک بڑا طبقہ ان کی بارگاہ میں نیاز مندی کو اپنی سعادت تصور کرتا تھا۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے شاہ محی الدین سجادہ نشیں ہوئے پھر سجادگی کا سلسلہ نواسوں میں منتقل ہو گیا اور شاہ نظام الدین ابن شاہ نیاز قدس سرہ کے نواسے شاہ عزیز میاں مسند مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ آج کل شبو میاں اور مہدی میاں خانقاہ کے بعض انتظامی امور سنبھالے ہوئے ہیں جب کہ حسنی میاں بحیثیت سجادہ نشیں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھیں حضرات کی قیادت و سرپرستی میں ہر سال ۶/ جمادی الثانی کو حضرت شاہ نیاز بے نیاز کا عرس بڑے شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے جس میں لنگر، چادر پوشی، اور سماع کے علاوہ جشن چراغاں بھی منایا جاتا ہے جس میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی تمام مذاہب کے ماننے والے شرکت کرتے ہیں جو بین المذاہب ہم آہنگی کا خوب صورت نمونہ پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اسلام امن و آشتی کا پیامبر ہے۔

(۱۵) خانقاہ سلیمانیہ تونسہ شریف

یہ خانقاہ حضرت نور محمد مہاروی کے مرید و خلیفہ حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی عرف پیر پٹھان (۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰ء) کا مرکز عرفان ہے جو پنجاب کے جنوبی ضلع ''ڈیرہ غازی خان'' کا معروف شہر تونسہ شریف میں واقع ہے۔ یہ شہر صوبائی دار الحکومت لاہور سے ۶۰۰/ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے

بارے میں سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ نہایت وسیع المشرب، وسیع الخیال اور وسیع النظر بزرگ تھے، خلق خدا آپ کو غوث زماں، پیر پٹھان اور شہباز چشت جیسے القابات سے یاد کرتی ہے۔صوبہ پنجاب میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی تکمیل آپ ہی کی ذات مبارکہ سے ہوتی ہے۔آپ کے ارشاد وتلقین سے پنجاب اور افغانستان کے ہزاروں گم گشتگان راہ صراط مستقیم پر گامزن ہوئے۔آپ کا آبائی وطن بلوچستان ہے لیکن شیخ کی وصیت پر آپ نے تونسہ کو اپنا وطن بنایا اور یہیں ایک خانقاہ کی بناڈالی جو آج خانقاہ سلیمانیہ سے معروف ہے۔ابتدا میں تونسہ تقریبا سو گھروں پر مشتمل ایک گاوں تھا۔مگر قیام خانقاہ کے بعد یہاں اس قدر رونق ہوئی کہ اندرون ملک کے علاوہ بیرون ملک سے بھی فرزندان توحید بکثرت آنے لگے اور تونسہ کا غیر آباد اور غیر معروف علاقہ علم وعرفان کا مرکز بن گیا۔

اس خانقاہ سے ہزاروں عقیدت مند تربیت پاکر دنیا کے اطراف وجوانب میں پھیل گئے۔چناں چہ سیال، گولڑہ، حیدرآباد، شیخاواٹی اور راجپوتانہ وغیرہ کی چشتیہ نظامیہ خانقاہیں سلیمانیہ خانقاہ ہی کی رہین منت ہیں۔ خلیق نظامی لکھتے ہیں: اس نقارہ کی آواز پنجاب، ممالک متحدہ اور راجپوتانہ سے گزرکر جزیرہ عرب، سراندیپ اور عدن تک پہنچی، افغانستان، ترکستان اور بلوچستان سب اس نقارہ کی آواز سے چونک اٹھے اور ہزاروں طالبان حق سیکڑوں مسافت طے کر کے تحصیل فیض کے واسطے سنگھڑ (تونسہ) پہنچے۔(تاریخ مشائخ چشت، ص:٦١١)

بتایا جاتا ہے کہ اس خانقاہ کے چاروں طرف متعدد مدرسے تھے جو شاہ صاحب کے خلفا کے نام سے معروف تھے مثلا مدرسہ مولوی محمد عمر، مولوی احمد صاحب کا بنگلہ، مدرسہ مولوی الٰہی بخش وغیرہ ان مدارس میں چالیس سے زائد اساتذہ تدریسی اور تربیتی خدمات پر مامور تھے۔خلیق نظامی لکھتے ہیں: خواجہ صاحب نے تونسہ کو دارالعلوم بنادیا تھا۔ان کے دولت کدے کے چاروں طرف متعدد مدرسے تھے، پچاس استاد وہاں رہتے تھے۔تعلیم وتربیت کا کام نہایت وسیع پیمانے پر جاری تھا۔علوم دینیہ کی ترقی وترویج میں بے حد کوشش کی جارہی تھی۔مدرسوں کا اجرا شاہ صاحب کے حصول مقصد کا بہترین ذریعہ تھا، ان مدارس میں پچاس مدرسین کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ تونسہ اس علاقہ کا تعلیمی مرکز بن گیا تھا اور دور دور سے شائقین علم وہاں جمع ہونے لگے تھے۔(تاریخ مشائخ چشت، ص:٦٢٢)

اس خانقاہ کے زائرین، علما اور طلبا کے لیے ایک وسیع لنگر خانہ بھی قائم تھا جس کے مصارف بے حساب تھے۔مولانا دین محمد کلیم مناقب سلیمانیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں: اس لنگر میں دونوں اوقات دودو ہزار آدمیوں کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا تقریبا پچاس علما اور ہزاروں کی تعداد میں طالب علم ہوا کرتے تھے۔(١) اس لنگر میں کھانے کے ساتھ ساتھ ہر چیز موجود رہتی تھی حجام، لوہار، دھوبی، آب کش وغیرہ ماہانہ تنخواہ پاتے تھے اور وہاں موجود رہتے تھے۔کوئی بیمار ہوجاتا تو دوائیں مفت ملتی تھیں۔لنگر کا یہ قاعدہ تھا کہ ہر درویش کو چھ مہینے کے بعد کپڑے اور جوتیاں ملتی تھیں اس کے علاوہ ایک سیر تیل اور کچھ گھی ملا کرتا تھا۔(تاریخ مشائخ چشت، ص:٦٢٦)

---

(١) برصغیر کی چشتی نظامی خانقاہیں، ص:١٦٢

۷ /صفر المظفر ۱۲۶۷ھ میں آپ کے وصال کے بعد آپ کے پوتے خواجہ اللہ بخش متوفی ۱۹۰۱ء سجادہ نشیں ہوئے جن کے دور خلافت میں رفاہی اور تعمیراتی کام خوب عمل میں آئے۔ عالیشان مسجد، مہمان خانے، کنواں، مسافر خانہ، لنگر خانے اور شیش محل وغیرہ آپ ہی کے تعمیر کردہ ہیں۔ اس وقت خواجہ عطاء اللہ خاں تونسوی مسند سلیمانی کے سجادہ نشین ہیں اور آپ ہی کی قیادت میں ہر سال صفر کی ۵، ۶، ۷ تاریخ کو خواجہ شاہ سلیمان تونسویؒ کا عرس آستانہ عالیہ تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان میں نہایت عقیدت و احترام سے منایا جاتا ہے۔

(۱۶) خانقاہ شمسیہ، سیال شریف پنجاب پاکستان

اس خانقاہ کی نسبت حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے محبوب ترین خلیفہ خواجہ شمس الدین سیالوی سے ہے۔ آپ کا شجرہ نسب پچاس واسطوں سے حضرت عباس علم دار شہید کربلا سے جا ملتا ہے۔ آپ ۱۲۱۴ھ میں سیال میں پیدا ہوئے جو ریاست پنجاب کا ایک معروف شہر سرگودھا سے جانب جنوب ۳۶/کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے جسے آج سیال شریف کہا جاتا ہے۔ آپ سلسلہ چشتیہ اور دربار سیال شریف کے روحانی پیشوا تھے عوام وخواص میں آپ شمس العارفین اور پیر سیال کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ مرشد کی ہدایت پر آپ نے وطن ہی کو دعوت و تبلیغ کا مرکز بنایا اور یہیں اپنا خانقاہی نظام اعلی پیمانے پر قائم کیا جو آج خانقاہ شمسیہ سیالویہ سے معروف ہے۔

اس خانقاہ کے متعلق خلیق نظامی لکھتے ہیں:

> اس خانقاہ میں لنگر کا خاص ہتمام ہوا کرتا تھا۔ تمام زائرین ومسافرین کے خورد ونوش کا انتظام اسی لنگر خانہ سے ہوتا تھا، شہر کے مسکینوں اور مفلسوں کو بھی دو وقت کا کھانا اسی لنگر سے میسر ہوتا تھا۔ یہاں قیام کا بہت اچھا انتظام تھا، ہر نو وارد شخص کے لیے چار پائی اور بستر مہیا کئے جاتے تھے۔ جو لوگ مستقلا خانقاہ میں رہتے تھے ان کو کپڑا بھی دیا جاتا تھا۔ یہ خانقاہ ہر دکھ درد کا مداوا تھی۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص:۷۰۵)

اس خانقاہ سے متصل ایک مذہبی ادارہ تھا جس میں تفسیر وحدیث اور فقہ وتصوف کا درس ہوتا تھا۔ ابتدا میں حضرت خواجہ سیالوی خود ہی درس بھی دیتے اور اس کے جملہ انتظامی امور بھی سنبھالتے تھے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ جب اس خانقاہ میں طالب علموں کے لیے روحانیت اور عاشقوں کے لیے دیدار عام ہوا تو پھر پیر مہر علی شاہ گولڑہ اور پیر حیدر شاہ جلال پور جیسی نابغہ روزگار ہستیاں اپنی علمی وروحانی پیاس بجھانے کے لیے یہاں میں حاضر ہوئیں اور اس قدر فیض یاب ہوئیں کہ دنیا کے لیے خیر وبرکت اور دین اسلام کے لیے روشنی کا مینارہ بن کر ابھریں۔ اس وقت یہی ادارہ دار العلوم ضیائے شمس الاسلام سے معروف ہے اور آج بھی ایک عالم اس سے فیض یاب ہو رہا ہے۔

۲۱ /صفر ۱۳۰۰ھ میں شیخ سیالوی کے واصل بحق ہوجانے کے بعد آپ کے صاحبزادے خواجہ محمد الدین متوفی ۱۳۲۷ھ نے آپ کی روایت کو جاری رکھا۔ اس وقت اس خانقاہ کی منصب سجادگی پر پیر حمید الدین سیالوی متمکن ہیں۔ آپ خواجہ قمر الدین سیالوی کے فرزند ہیں جو پاکستان کی تحریک ختم نبوت کے بانیوں میں سے تھے۔

آپ کے خاندان کا سیاسی اثر ورسوخ سرگودھا اور اس کے نواحی علاقوں میں کافی زیادہ ہے۔ ہرسال آپ کی صدارت میں ۲۱/صفرالمظفر کوحضرت شمس الدین سیالوی کا عرس بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

(۱۷)خانقاہ عالیہ عارفیہ سید سراواں

خانقاہ عالیہ عارفیہ حضرت سلطان العارفین مخدوم شاہ عارف صفی محمدی قدس سرہ (۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۳ء) کا قائم کردہ ایک علمی وروحانی قلعہ ہے جس کی خشت اول ۱۲۹۸ھ میں رکھی گئی۔ یہ گلستان علم ومعرفت شہرالٰہ آباد سے تقریباً ۲۲ کلومیٹر دور ایک معروف قصبہ ''سید سراواں'' میں واقع ہے جو آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ مخدوم سید محمد حقانی سبزواری سے منسوب ہے۔ اسی زرخیز وادی کو حضرت سلطان العارفین کے مولد ومسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ نسباً عثمانی اور مشرباً چشتی قادری سہروردی ہیں۔ آپ کے آباء واجداد میں شیخ بہاءالدین غزنوی وارد ہندوستان ہوئے تھے جن کی اولاد سید سراواں میں اقامت گزیں ہوئی۔ آپ کی والدہ ماجدہ سادات بخاری سے تھیں۔ (مرآت جلالی، ص:٦٦)

خانقاہ عالیہ عارفیہ کا روحانی تعلق سلسلہ چشتیہ صفویہ سے ہے حضرت سلطان العارفین کو اجازت وخلافت واقف سرقل ہواللہ شاہ عبدالغفور محمدی صفوی بارہ بنکوی سے حاصل تھی جو مجدد سلسلہ صفویہ حضرت مخدوم شاہ خادم صفی محمدی قدس سرہ کے مرید وخلیفہ تھے۔ یہ روحانی سلسلہ حضرت مخدوم شاہ صفی سے ہوتا ہوا ۱۷/ واسطوں سے محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا تک پہنچتا ہے۔

اس خانقاہ نے اپنے ابتدائی دور میں خلق خدا کی رہنمائی اور مذہب اسلام کی صحیح ترجمانی کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مولف تذکرۃ الاصفیا کے مطابق اس خانقاہ نے متعدد غیر مسلموں کو دولت ایمان سے سرفراز کیا، سیکڑوں افراد کو عوام کالانعام کے زمرے سے نکال کر مخلصین وصادقین کی صف میں لاکھڑا کیا اور صالحین کی ایک مضبوط ٹیم تیار کی جنھوں نے مختلف مقامات پر اپنی خانقاہیں قائم کیں اور ہزاروں تشنہ کاموں کو سیراب کیا۔(۱) بانی خانقاہ حضرت سلطان العارفین نے زندگی کی صرف ۴۲/ بہاریں دیکھیں اور اسی قلیل عرصے میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو عموماً مدت دراز میں بھی لوگوں کو نصیب نہیں ہوتے۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادگان میں مخدوم شاہ صفی اللہ قدس سرہ (۱۳۷۴ھ) اور مخدوم شاہ احمد صفی قدس سرہ (۱۴۰۰ھ) یکے بعد دیگرے اس روحانی میکدے کے جانشین ہوئے اور خلق خدا کے لیے سامان ہدایت بنے۔ شاہ احمد صفی قدس سرہ کے بعد داعی اسلام شاہ احسان اللہ محمدی صفوی حفظہ اللہ ورعاہ مسند مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ اس کے بعد ہی خانقاہ عارفیہ ہند کے حدود اربعہ سے نکل کر عالمی سطح پر اپنی انفرادیت کا علم لہرانے لگا اور یہیں سے سلسلہ عارفیہ اور خانقاہ عارفیہ کی تعمیر وترقی اور ترویج واشاعت کا زریں دو شروع ہوا جو روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ اس وقت یہ خانقاہ حضرت داعی اسلام کی

(۱) تذکرۃ الاصفیا، ملخصا۔ ۱۴۱

قیادت وسرپرستی میں عرفان وروحانیت اور علم ومعرفت کے میدان میں اپنے خزانے لٹارہی ہے۔علوم دینیہ کی نشرو اشاعت، اسلامی افکار ونظریات کی بیداری اور نسل نو کی ذہنی وفکری تشکیل جدید کے لیے آپ نے خانقاہ عارفیہ سے متصل جامعہ عارفیہ بھی قائم فرمایا ہے جہاں سیکڑوں طلبہ اور درجنوں اساتذہ کے قیام وطعام کا مکمل انتظام وانصرام ہے۔ یہاں کا نصاب تعلیم اور منہج تعلیم دیگر جامعات سے جداگانہ ہے اس کے مرتب کردہ نصاب میں اخلاقی تزکیہ، نظریاتی تطہیر، نفسانی آلائشوں اور جذباتی آمیزشوں سے طلبہ کے ذہن ودماغ کو پاک وصاف کرنا سرفہرست ہے اور جدید طریقہ تعلیم کے مطابق مفید تر تعلیم وتربیت سے طلبہ کو لیس کرنا اس کا اولین مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو ادارہ ۱۹۹۳ء میں قائم کیا گیا آج ۲۰۱۹ء میں اس کی علمی شعائیں اور عرفانی تب وتابیاں ملک کی سرحدوں سے نکل کر بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی راہیں تلاش کررہی ہیں۔ یہ جامعہ اپنے مختلف شعبہ جات میں سرگرم عمل ہونے کے ساتھ ایک درجن سے زائد شاخوں کی نگرانی بھی کررہا ہے۔ملک وبیرون ملک کی دینی وعصری دانش گاہوں سے اس کے الحاقات بھی ہیں جیسے جامعہ ازہر قاہرہ مصر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی وغیرہ۔ جامعہ ازہر کے دو اساتذہ اس جامعہ کے شعبہ عربی ادب اور شعبۂ قرات کی کمان سنبھالے ہوئے ہیں اور اس سے پہلے بھی دو حضرات اپنی مدت مکمل کر کے مصر واپس جا چکے ہیں۔ یہ سب اس مرد قلندر اور جنید وقت کی نگاہ کیمیا اثر کا فیضان ہے جسے خاص وعام ''میاں حضور'' اور ''ابومیاں'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔آپ کی شخصیت علم وعرفان اور اصلاح وتربیت کے حوالے سے ایک انقلاب تازہ کی آواز ہے۔آپ نے جامعہ عارفیہ اور خانقاہ عارفیہ کے درمیان علم وعمل، شریعت وطریقت، حال وقال اور جدت وقدامت کا ایسا خوبصورت سنگم قائم کردیا ہے کہ دھیرے دھیرے الٰہ آباد کے گنگا وجمنا سنگم سے کہیں زیادہ زائرین اس سنگم کی زیارت کے لیے امنڈتے چلے آرہے ہیں۔اور کیوں نہ ہو کہ یہ سنگم صرف تفریح طبع کا سامان نہیں بلکہ خلق کو خالق سے ملانے کا ایک انمول نگینہ بھی ہے۔ یہاں رنگ ونسل، ذات پات مذہب وملت اور مسلک ومشرب کی وجہ سے تفریق نہیں کی جاتی بلکہ الخلق کلہ عیال اللہ کا عملی نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

اس خانقاہ کا امتیازی پہلو اس کا توسع اور اس کی وسیع المشربی ہے۔ یہاں نقطہ نظر کے اختلاف کو سراہا جاتا ہے مخالف پر طنز نہیں کیا جاتا بلکہ اختلاف کو آزادئی رائے کے زمرے میں رکھا جاتا ہے گروہیت یا حزبیت کے خانے میں نہیں۔ یہاں تبرکا بیعت نہیں کی جاتی بلکہ تربیت کے ساتھ ارادت کا جام بھی پلایا جاتا ہے۔ یہاں کے علما خود کو ملازم نہیں اسلامی سرحدوں کا محافظ تصور کرتے ہیں اور طلبہ صرف قال نہیں حال کی بھی تعلیم پاتے ہیں۔ان مخلص علما وطلبہ کی ایک منظم جماعت ہر جمعہ وعظ وخطاب کے لیے درجنوں مساجد میں جاتی ہے تاکہ لوگ دین آشنا ہوسکیں۔ ان علما کا نمایاں وصف یہ ہے کہ یہ سرکاری ملازمتوں کے لیے در در کی خاک نہیں چھانتے بلکہ در پہ آئی ہوئی ملازمتوں کو بھی مسکراتے ہوئے ٹھکرا دیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں کے علما ودیگر وابستگان میں اطاعت

مرشد کا ایسا جذبہ پنہاں ہوتا ہے کہ حکم مرشد کے سامنے اپنی جملہ خواہشات بھسم کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

اس خانقاہ میں ہر مہینے چاند کی اکیس تاریخ کو مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شہادت کی مناسبت سے پروگرام رکھا جاتا ہے جس میں علما وطلبہ کے علاوہ دور دراز سے طالبین وسالکین، عوام وخواص بھی شریک ہوکر روحانی بیانات سے مستفید ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہر سال ''جشن غزالی'' کا بھی انعقاد ہوتا ہے جس میں منتہی طلبہ کے درمیان مخصوص عنوان پر Debate کرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال عرس عارفی بھی بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ خانقاہ عارفیہ کا جملہ انتظام وانصرام شاہ صفی میموریل ٹرسٹ کے زیر نگرانی ہوتا ہے اسی کا ایک شعبہ شاہ صفی اکیڈمی بھی ہے جو کتب تصوف اور صوفیانہ لٹریچر کی نشر واشاعت میں ایک منفرد شناخت رکھتا ہے۔ اب تک اس اکیڈمی سے ایک درجن سے زائد کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر فرد کی فکری وروحانی تسکین کے لیے ماہانہ ''خضر رارہ'' اردو، ہندی دونوں زبان میں شائع کیا جاتا ہے تا کہ اردو کے ناخواندہ افراد بھی استفادہ کر کے اپنی زندگی کا قبلہ درست کر سکیں۔ اور ہر سال تصوف کے موضوع پر ایک علمی وتحقیقی دستاویز ''الاحسان'' اشاعت پذیر ہوتا ہے جو اردو وعربی دونوں زبانوں میں ہوتا ہے تا کہ عرب وعجم یکساں طور پر مستفید ہو سکیں۔ خانقاہ عارفیہ کے انھیں خدمات کے پیش نظر ہندوستان کے معروف اسلامی اسکالر ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی نے یہ تاثر دیتے ہوئے کہا: ''شاید کاتب تقدیر نے ہندوستان جنت نشان میں تصوف کے عہد نو کے لیے تمہید اور راہ ہمواری کا اعزاز خانقاہ عارفیہ کے لیے مختص کر دیا ہے'' (مجلہ الاحسان، الہ آباد، شمارہ: ۳، ص: ۳۷۸)

بلاشبہ یہاں کی جملہ خدمات وکارکردگی کا سہرا مرشد گرامی، عارف باللہ شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی کے سر جاتا ہے جو اس عہد پر آشوب میں بھی تربیت وتزکیہ، اور دعوت واصلاح کی ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ میں اپنے تجزیے کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مخدوم شاہ خادم صفی قدس سرہ کے بعد سلسلہ صفویہ کی تجدید واحیا کے لیے مشائخ صفویہ نے شاید آپ ہی کا انتخاب فرمایا ہے۔

(۱۸) خانقاہ ربانیہ، باندہ

اس خانقاہ کے امام وروحانی پیشوا حضرت امانت علی شاہ چشتی صفوی ہیں جنھیں سلسلہ صفویہ کے مجدد حضرت شاہ خادم صفی محمدی قدس سرہ کے مرید وخلیفہ واقف سر قل ہو اللہ شاہ عبد الغفور صفوی بارہ بنکوی (۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء) سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔

آپ کے مورث اعلی حضرت شیخ معروف ملتانی قدس سرہ تھے جو مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد میں بخارا سے عازم ہند ہوئے اور الہ آباد کے قریب فتح پور میں فروکش ہوئے۔ اور یہیں آپ کی نسل سے خاندان وجود میں آیا۔ اسی خاندان کے چشم وچراغ حضرت شاہ دائم علی قدس سرہ تھے جنھوں نے نواب باندہ ذوالفقار الدولہ کے پیہم

اصرار پر شاہ پور فتح پور کو خیر باد کہ کر ضلع باندہ کو اپنے دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت کا مرکز بنایا۔ اس مبارک سفر میں آپ کے فرزند ارجمند حضرت امانت علی شاہ چشتی صفوی بھی شریک تھے، جن کی شخصیت عالمانہ جاہ وجلال اور روحانی تصرفات کے ساتھ مستجاب الدعوات بھی تھی۔ آپ ہی کی ذات سے منسوب ہوکر اس خانقاہ کو ''خانقاہ امانتیہ'' کہا جانے لگا۔ یہاں آپ نے سلسلہ چشتیہ نظامیہ صفویہ کا اجرا فرمایا، پھر بعد میں حضرت شیخ عبدالرحمن محدث پانی پتی سے سلسلہ قادریہ کی بھی اجازت وخلافت حاصل ہوئی۔ آپ کے پانچ صاحبزادے ہوئے جن میں ایک اہم نام مولانا شاہ عبدالرب عامل قادری رحمانی عرف سرکار ربانی (۱۳۰۸ھ) کا ہے۔ جن کی ذات گرامی سے منسوب ہوکر اب یہی خانقاہ ''خانقاہ ربانیہ'' سے متعارف ہے اور آپ کی اولاد ''خانوادہ ربانیہ'' سے پہچانی جاتی ہے۔ اس خانقاہ کے تربیت یافتہ مشائخ ہندو پاک کے مختلف شہروں میں آباد ہیں۔ جبل پور، حیدرآباد اور کراچی وغیرہ میں یہاں کے متعلقین کے آستانے ہیں جہاں سے آج بھی خلق خدا فیض یاب ہو رہی ہے۔ ضلع جبل پور میں اس خانقاہ کے فرد فرید حضرت شاہ عبدالودود قادری عرف سرکار شہید ملت کی خانقاہ ہے جس کے موجودہ سجادہ مولانا فیضان الرب امجد ربانی ہیں جو ایک عالم، نیک، صالح اور کم گو انسان ہیں۔ ان کے علاوہ خانوادہ ربانیہ کے دیگر اکابر کے بھی آستانے اور مزارات یہاں موجودہ ہیں۔

خانقاہ ربانیہ باندہ نے دعوت و تبلیغ، رشد و ہدایت اور فروغِ علوم اسلامیہ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، آج بھی اس خانقاہ کے صحن میں ایک عظیم الشان ادارہ ہے جو دارالعلوم ربانیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس ادارے سے اب تک سیکڑوں طلبہ علم و معرفت کی گراں قدر نعمتیں لے کر فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور آج بھی علما وطلبہ کی ایک ٹیم علوم دینیہ کی تحصیل اور اس کی نشر واشاعت میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس خانقاہ کے موجودہ سجادہ مولانا ارشد ربانی صاحب ہیں جن کی قیادت و سرپرستی میں ہر سال ۱۰ جمادی الثانی کو عرس ربانی نہایت تزک واحتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

(۱۹) خانقاہ مہریہ گولڑہ شریف

یہ خانقاہ تیرہویں صدی کے بزرگ حضرت سید پیر مہر علی شاہ چشتی نظامی کے نام منسوب ہے۔ جو خواجہ سلیمان تونسوی کے مرید وخلیفہ خواجہ شمس الدین سیالوی کے خلفا سے تھے۔ (مہر منیر، ص: ۹۳) آپ نے متوسطات تک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علم منطق وفلسفہ، علم معقول اور اقلیدس وغیرہ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور علوم حدیث کی تحصیل کے لیے مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے زمرہ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ علوم ظاہری کی تحصیل کے بعد خواجہ شمس الدین سیالوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ریاضت ومجاہدہ کے بعد ۱۸۸۲ء میں اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔ آپ نے حکم مرشد کی تعمیل کرتے ہوئے وطن مالوف کو اپنے دعوتی و تبلیغی مشن کا مرکز بنایا جو آج خانقاہ مہریہ سے متعارف ہے۔

یہ خانقاہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے نواح میں مارکلہ کی پہاڑیوں کے قریب ایک گاوں میں واقع تھی جو آج گولڑہ شریف کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں ہر گھڑی ارشاد و تلقین اور دعوت و اصلاح کا ایک سماں بندھا رہتا تھا۔ دور دراز مقامات سے طالبان علم اور طالبان خدا کشاں کشاں چلے آتے اور حضرت شیخ کے روحانی فیوض و برکات سے سرشار ہو کر لوٹتے تھے۔ یہاں ایک مثالی لنگر خانہ تھا جہاں سے ہزاروں کی تعداد میں علما، طلبا، اور عوام الناس کو کھانا میسر ہوتا تھا۔ اس کے اخراجات وسیع ہونے کے باوجود بانی خانقاہ اپنے اکثر مشائخ چشت کی تقلید میں حکومت وقت اور امرا سے ہمیشہ بے نیاز و مستغنی رہے۔ یہاں تک مریدین کو بھی ہدایت تھی کہ حکومت برطانیہ کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھنا اور ان کے شعبہ فوجداری میں ملازمت کرنا ناجائز ہے۔ جس کی تفصیلات حضرت شیخ کا رسالہ ''امر معروف'' میں ملتی ہیں۔ اس خانقاہ نے فتنہ قادیانیت کے ساتھ ہر نو پید فتنے کی بیخ کنی اور اس کے رد و قدح میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جس پر خانقاہ کی مطبوعات شاہد عدل ہیں۔ چناں چہ سیف چشتیائی در رد عقائد مرزا غلام احمد قادیانی، فتوحات صمدیہ رسالہ در جواب غیر مقلدین اور شمس الہدایت فی اثبات حیات المسیح وغیرہ اسی خانقاہ کے پلیٹ فارم سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہیں اور یہ جملہ تصانیف حضرت ممدوح کے نوک قلم سے معرض وجود میں آئی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے فتاوی کا مجموعہ ''فتاوی مہریہ'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے جس کے مرتب مولانا فیض احمد صاحب ہیں۔ آپ کے حالات و خدمات پر مشتمل ایک تفصیلی کتاب ''مہر منیر'' بھی طبع شدہ ہے جس کے مولف بھی مرتب مذکور ہیں۔

۲۹ /صفر ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۷ء کو آپ کا وصال گولڑہ شریف میں ہوا جہاں آپ کا عالی شان مقبرہ زیارت گاہ خلائق ہے۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے پیر غلام محی الدین جانشین ہوئے پھر ۱۹۹۷ء میں برصغیر کے معروف شاعر اور علمی و ادبی شخصیت حضرت پیر نصیر الدین شاہ نصیر مسند ارشاد پر متمکن ہوئے جنھوں نے یہاں کے خانقاہی نظام کو روایتی تصوف کے بجائے ایک فعال علمی اور تربیتی کردار کا حامل کا بنانے کے لیے زبردست جدوجہد کی۔ آپ کے بعد آپ کے بھائی پیر غلام معین الدین اور آپ کے صاحبزدے اس روحانی وراثت کے امین ہیں۔ اور انھیں حضرات کی قیادت میں ہر سال ۲۹ /صفر کو عرس کی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔

خاتمہ

بادۂ چشتی نظامی کے میخواروں کا تفصیلی تذکرہ اور ان کے فضائل و کمالات کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ہر قاری پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس میخانے کا ہر رند ساقی بھی ہے اور شراب بھی، فرد بھی ہے اور انجمن بھی، شخص بھی ہے اور تحریک بھی، تنہا بھی ہے اور جماعت بھی۔ انہیں نفوس قدسیہ کی لازوال کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج برصغیر میں اسلام کی بہاریں، روحانی قدریں اور قوانین شریعت کی رونقیں دیکھنے کو مل رہی ہیں، یقینا ملت اسلامیہ صبح قیامت تک ان محسنین کے بار احسان تلے دبی رہے گی۔

کتابیات

۱-آب کوثر، شیخ محمد اکرم، ادبی دنیا ۱۹۸۷ء

۲-اخی سراج االدین عثمان-احوال وآثار مفتی عبدالخبیر اشرفی، اشرفیہ اسلامک فاؤنڈیشن، حیدرآباد، دکن

۳-برصغیر کی چشتی نظامی خانقاہیں، میاں محمد دین کلیم، مکتبہ نبویہ، لاہور ۱۹۹۰ء

۴-بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۱۱ء

۵- تاریخ دعوت وعزیمت، ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ ۲۰۰۸ء

۶- تاریخ مشائخ چشت، خلیق نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۵۳ء

۷-تذکرہ مخدوم جہانیاں، سخاوت مرزا، انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا حیدرآباد، ۱۹۶۲ء

۸-تذکرۃ الاصفیاء، درویش نجف علیمی، ج:۳، طباعت: اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۹۵ء

۹-تحقیق وتفہیم، شیخ اسید الحق قادری بدایونی، ادارہ فکر اسلامی دہلی

۱۰-تحفۃ السعداء خواجہ کمال، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۱ء

۱۱- حضرت مخدوم جہانیاں، ایوب قادری، ادارہ تحقیق وتصنیف وحیدرآباد کراچی ۱۹۶۳ء

۱۲-خانقاہ صفویہ تعارف وخدمات، ڈاکٹر مجیب الرحمن علیمی، خانقاہ عارفیہ، سید سراواں

۱۳-خزینۃ الاصفیا، فارسی، مفتی غلام سرور لاہوری، مکتبہ نبویہ، لاہور ۱۹۹۰ء

۱۴-سجاد سعد، سید ضیاء علوی خیرآبادی، سن اشاعت ۱۹۹۹ء

۱۵-سفرنامہ ابن بطوطہ، مترجم رئیس احمد جعفری، ادارہ درس اسلام، دیوبند ۱۹۸۰ء

۱۶-سیر الاولیا، از میر خورد، مطبع محب ہند فیض بازار دہلی۔

۱۷-سیر محمدی، فارسی، مولانا محمد علی سامانی، یونانی دواخانہ پریس سبزی منڈی الہ آباد

۱۸-شیخ سعد الدین خیرآبادی (پی ایچ ڈی کا غیر مطبوعہ مقالہ)، از: ڈاکٹر ذیشان احمد مصباحی، جامعہ عارفیہ سید سراواں، کوشامبی

۱۹- ظفر المحصلین باحوال المصنفین، مولانا حنیف گنگوہی دارالاشاعت اردو بازار، کراچی، سن طباعت ۲۰۰۰ء)

۲۰-عین الولایت لراح الہدایت، منشی ولایت علی صفی پوری معروف بہ عزیز اللہ شاہ، نول کشور لکھنو، ۱۸۹۹ء

۲۱-فوائد سعدیہ فارسی، ارتضی علی خان گوپاموی، نول کشور لکھنو، ۱۸۸۵ء

۲۲- فیضان پیر پٹھان، مکتبۃ المدینہ، دعوت اسلامی،

۲۳-لطائف اشرفی، فارسی شیخ نظام یمنی، مکتبہ سمنانی کراچی، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۹ء

۲۴-مجمع السلوک، شیخ سعد الدین خیرآبادی، مترجم: مولانا ضیاء الرحمن علیمی، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں ۲۰۱۶ء

۲۵-مرآۃ جلالی، سید خلیل احمد بخاری حسانی، طبع دوم کراچی ۱۹۹۹ء

۲۶-مہر منیر، فیض احمد فیض، ماہ نور پبلی کیشنز، اکتوبر ۲۰۰۵ء

۲۷-نزھۃ الخواطر، سید عبدالحی الحسنی، دار ابن حزم، بیروت ۱۹۹۹ء

۲۸- نظامی بنسری، خواجہ حسن نظامی، سن اشاعت ۲۰۰۹ء

○○○



شاہ صفی اکیڈمی کی مطبوعات
کتب
مجمع السلوک 1500/-₹
نغمات الاسرار فی مقامات الابرار (مثنوی) 100/-₹
خانقاہ صفویہ (تاریخ اور خدمات کا اجمالی جائزہ) 80/-₹
الرسالة المكية 200/-₹
خیر آباد کا پانچ سو سالہ سفر 40/-₹
مسئلہ اذان واقامت (ایک معتدل نظریہ) 80/-₹
سالانہ الاحسان (عربی)
الاحسان (شمارہ-۱) 200/-₹
الاحسان (شمارہ-۲) 200/-₹
الاحسان (شمارہ-۳) 200/-₹
سالانہ الاحسان (اردو)
الاحسان (شمارہ-۱) 300/-₹
الاحسان (شمارہ-۲) 300/-₹
الاحسان (شمارہ-۳) 300/-₹
الاحسان (شمارہ-۴) 150/-₹
الاحسان (شمارہ-۵) 300/-₹
الاحسان (شمارہ-۶) 300/-₹
الاحسان (شمارہ-۷) 300/-₹
الاحسان (شمارہ-۸) 500/-₹
ماہنامہ خضر راہ (مجلد)
خضر راہ (مجلد-۲۰۱۳) 350/-₹
خضر راہ (مجلد-۲۰۱۴) 350/-₹
خضر راہ (مجلد-۲۰۱۵) 350/-₹
خضر راہ (مجلد-۲۰۱۶) 350/-₹
خضر راہ (مجلد-۲۰۱۷) 350/-₹
شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عارفیہ 9312922953 / 9935791673

ملفوظات

نوشاد عالم چشتی علیگ

سلطان المشائخ کے اقوال

فوائد الفواد کی روشنی میں

فوائد الفواد میں شامل مجالس کے ملفوظات کی ورق گردانی سے ہمیں سلطان جی کے دینی اور سماجی افکار و نظریات کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ملفوظات کے اس مجموعے سے قرآن وحدیث کی تفسیر وتشریح کے علاوہ ارکان دین، اوراد ووظائف ،صوم وصلوۃ، ادب واخلاق، آداب درویشی ،صوفیانہ مراسم، بیعت وارادت، احترام شیخ ،خدمت خلق، رواداری وایثار کے متعلق تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔

فوائد الفواد کا اردو ترجمہ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے کیا ہے اور اس ترجمے پر بہت وقیع اور معلوماتی مقدمہ پروفیسر نثار احمد فاروقی فریدی صاحب نے لکھا ہے۔ میں نے اسی ترجمے سے سلطان جی کے کچھ اقوال وافکار کو منتخب کیا ہے جسے اپنے قارئین کے لیے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔مقصد صرف اتنا ہے کہ سلطان جی کے خوشہ چینوں میں اس حقیر غلام مسکین کا نام بھی شامل ہو جائے۔ اقوال محبوب الٰہی پیش کرنے سے پہلے یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے پیش نظر ترجمہ کا جو نسخہ ہے اسے اردو اکادمی دہلی نے شائع کیا ہے جس کا فارسی متن اور اردو ترجمہ کتابت شدہ ہیں اور اس کا سن اشاعت ۲۰۰۱ء ہے۔مگر اس کی ایک اور اشاعت خواجہ حسن ثانی صاحب نے اپنے زیر اہتمام جنوری ۲۰۰۷ء میں کرائی ہے جس کا فارسی متن کتابت شدہ اور اردو ترجمہ کمپوزنگ ہے جس کی وجہ سے ۲۰۰۱ء کی اشاعت سے اس اشاعت میں کافی صفحات کا فرق ہے۔اس تمہیدی تعارف کے بعد سلطان جی کے ملفوظات سے کچھ اقوال خاکسار کی توضیح وتشریح کے ساتھ ملاحظہ کریں:

مردان خدا: مردان خدا کے متعلق سلطان جی ارشاد فرماتے ہیں:

''مردان خدا خود کو پوشیدہ رکھتے ہیں اور حق تعالیٰ انہیں ظاہر کر دیتا ہے۔''(۱)

---

(۱) ص:۱۸۹، اشاعت ۲۰۰۱، ص:۱۴۱، پہلی جلد، پہلی مجلس، اشاعت ۲۰۰۷ء

مرد کا کمال: سلطان جی نے اپنے یاران طریقت کی محفل میں تزکیہ کے ضمن میں ارشاد فرمایا کہ

''مرد کا کمال چار چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ۱-کم کھانا۔ ۲-کم بولنا۔ ۳-کم سونا۔ ۴-کم ملنا جلنا۔''

(ص: ۱۹۳، اشاعت ۲۰۰۱ء ص: ۱۴۱، پہلی جلد، پہلی مجلس، اشاعت ۲۰۰۷ء)

مرد خاص: مرد خاص کے متعلق سلطان جی کا ارشاد:

اس کے بعد فرمایا کہ ہر (مجمع) عام میں ایک خاص بھی ہوتا ہے۔ (ص: ۱۹۹، اشاعت ۲۰۰۱ء)

جدو جہد ضروری ہے: سلطان جی کے نزدیک حصول فیض خداوندی کے لیے جدو جہد ضروری ہے۔ ملفوظ نگار کے مطابق: ''اور فرمایا کہ جو بھی تھا، حسن عمل سے کسی مقام تک پہنچا، اگرچہ خدا کا فیض تو پہنچتا ہی ہے۔ لیکن ہمیں خود بھی جدو جہد کرنی چاہیے۔'' (ص: ۲۰۵، اشاعت ۲۰۰۱ء ص: ۱۵۷، پہلی جلد، پہلی مجلس، اشاعت ۲۰۰۷ء)

سلطان جی کے اس قول سے انسانی معاشرے کو، اپنے حالات سدھارنے اور خود کو سنوارنے کے لیے اجتماعی، شخصی اور انفرادی جدو جہد کی ترغیب ملتی ہے۔ مخالفین صوفیہ کا یہ الزام کہ صوفیہ لوگوں کو اپنی تعلیمات کے ذریعہ عملی جدو جہد سے کاٹ کر ناکارہ بنا دیتے ہیں سلطان جی کے اس قول سے باطل ثابت ہوتا ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ انعام فیض خداوندی اپنی جگہ مگر بندے کو جدو جہد کرنا حصول فیض خداوندی کے لیے لازم ہے۔ صوفیہ کے یہاں جدو جہد ہے قنوطیت نہیں۔ عالم اسباب میں ترقی کے لیے اسباب کا مہیا کرنا اور اس کے حصول کے لیے جدو جہد کرنا ہر فرد کے لیے ضروری ہے اور یہی انسانی معاشرے کا لازمی خاصہ ہے۔

حب دنیا: جدو جہد کے ساتھ ہی اہل دنیا کو حب دنیا کا ترک کرنا ضروری ہے۔ دنیا والوں کو ترک دنیا کر کے دنیا اختیار کرنا چاہیے۔ اس بابت سلطان جی نے کہا کہ:

''حکایت پوری ہونے کے بعد ارشاد ہوا کہ ایک بزرگ تھے پرہیزگار۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے: نماز وروزہ و تسبیح و اوراد سب دیگ کے مسالے ہیں۔ اصل چیز دیگ میں گوشت ہوتا ہے جب تک گوشت نہ ہو ان مسالوں سے کچھ نہیں بنتا۔ ان بزرگ سے پوچھا گیا کہ آپ یہ تمثیل اکثر بیان فرماتے ہیں۔ (ذرا ان کی) تشریح (بھی) کیجیے۔ ان بزرگ نے کہا کہ گوشت ترک دنیا ہے، اور نماز وروزہ اور اوراد و تسبیح اس کے مسالے ہیں۔ اول آدمی کو چاہیے کہ ترک دنیا اختیار کرے، اور اس کا تعلق کسی چیز سے نہ رہے اگر وہ نماز وروزہ (نفلی) اوراد وغیرہ کرے نہ کرے، مضائقہ نہیں، لیکن جب دنیا کی محبت دل میں ہوگی تو دعا اور اوراد وغیرہ سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے بعد خواجہ ذکرہٗ اللہ بالخیر نے فرمایا کہ اگر گھی اور کالی مرچ لہسن پیاز دیگ میں ڈالے اور پانی بھی چھوڑ دے اور شوربہ تیار کریں تو اسے شوربائے زور (نقلی شوربا) کہیں گے اور شوربائے مزور بھی یعنی جھوٹا شوربا۔ پس اصل شوربا وہ ہوگا کہ جو گوشت سے تیار ہو چاہے اس میں مسالے ہوں یا نہ ہوں۔'' (ص: ۱۶۱، جلد: ۱، مجلس: ۶، ۲۰۰۷ء)

ترک دنیا کی حقیقت: سلطان جی ترک دنیا کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''ترک دنیا یہ نہیں کہ کوئی اپنے آپ کو ننگا کر کے مثلاً لنگوٹی باندھ کر بیٹھ جائے، ترک دنیا یہ ہے کہ لباس پہنے اور کھانا کھائے۔ البتہ جو کچھ آئے اسے خرچ کرتا رہے۔ جمع نہ کرے اور اس سے رغبت نہ رکھے اور دل کو کسی چیز سے اٹکائے نہ رکھے۔'' (ص: ۶۳-۱۶۱، پہلی جلد مجلس ششم، اشاعت ۲۰۰۷ء)

سلطان جی کے اس قول سے ترک دنیا کی حقیقت جو صوفیانہ تعلیمات میں رائج ہے اس کی مکمل تشریح ہو جاتی ہے۔ اور اس قول سے جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنا دل حب دنیا سے مملو نہ کرے، بلکہ اپنا تعلق باللہ مضبوط رکھے۔ اور ماسوائے اللہ کے دل میں کچھ نہ رکھے۔

اولیا کا غلبہ شوق اور مقام سالک: خاصان خدا کا وہ طبقہ جسے اہل علم، عرف عام میں اولیا سے موسوم کرتے ہیں۔ اس طبقے میں قدرت خداوندی کی تخلیقی فطرت کے مطابق مختلف طبائع کے افراد پائے جاتے ہیں، بعض اولیائے کرام خزانہ خداوندی کے کچھ راز غلبہ شوق میں عیاں کر دیتے ہیں مگر ان میں جو کاملین ہیں وہ کسی بھی حالت میں راز کو ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ سلطان المشائخ اس مقام کے متمکن صاحبان کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

''فرمایا کہ جس وقت اولیا شوق کے غلبے میں ہوتے ہیں تو بےخودی کے عالم میں کچھ کہہ دیتے ہیں۔ البتہ جو کامل ہیں وہ اسرار میں سے کوئی چیز بھی ظاہر نہیں کرتے۔ اس کے بعد دو بار یہ مصرعہ زبان مبارک پر آیا: مرداں ہزار دریا خورند و تشنہ رفتند

(ترجمہ) مردوں نے ہزار دریا پیے اور (پھر بھی) پیاسے گئے۔

پھر فرمایا کہ بہت بڑا حوصلہ چاہیے کہ راز کے قابل ہو سکے اور اس کے اہل پوری طرح ہیں تو اصحاب صحو (سالک) ہیں۔ بندے نے پوچھا کہ اصحاب سکر (مجذوب) کا مرتبہ اونچا ہے یا اصحاب صحو کا؟ فرمایا اصحاب صحو کا مرتبہ واللہ اعلم۔'' (ص: ۷۷-۱۷۵، پہلی جلد، گیارہویں مجلس، اشاعت ۲۰۰۷ء)

طاعت لازمی اور طاعت متعدی کا فرق: طاعت ایک کثیر المعنی لفظ ہے۔ سیاق وسباق کے اعتبار سے فرماں برداری، عبادت، بندگی، وفا شعاری کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ سلطان جی نے اپنی محفل میں اس پیش نظر ملفوظ میں 'طاعت' بمعنی عبادت و بندگی کے استعمال کیا ہے۔ اور لفظ 'طاعت' کی وضاحت کرتے ہوئے آپ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ انسان کی ایک عبادت ایسی ہے جس کے ادا کرنے سے اسے خود ذاتی طور پر فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر طاعت یعنی عبادت کی ایک قسم ایسی ہے جسے کرنے سے اس کے علاوہ دیگر مخلوق خدا کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کے لیے فلاحی، ملی وسماجی کاموں کی انجام دہی کے لیے متوجہ کرنے یعنی رفاہ عام کی ترغیب دینے کے لیے سلطان جی ارشاد فرماتے ہیں کہ طاعت متعدی یعنی مخلوق خدا کو فائدہ پہنچانے کی عبادت، خلوص کے ساتھ جیسے بھی کی جائے اس کا ثواب دونوں کو ملتا ہے۔ اس سے متعلق سلطان جی کا ارشاد ملاحظہ کریں:

''۸۰۷ھ ماہ محرم الحرام کی تیسری تاریخ کو قدم بوسی کی دولت میسر آئی۔ طاعت کا ذکر آیا۔ فرمایا کہ ایک طاعت ہے لازمی اور ایک طاعت ہے متعدی۔ طاعت لازمی تو وہ ہے کہ جس کا فائدہ اسی ایک طاعت کرنے والے کی ذات کو پہنچتا ہے۔ اور وہ نماز ہے اور روزہ ہے۔ اور حج ہے اور اوراد و تسبیحات اور اسی طرح کی (اور) چیزیں ہیں۔ لیکن طاعت متعدی وہ ہے کہ جس سے فائدہ و راحت دوسروں کو پہنچے، خرچ کرنے سے اور سبقت برتنے سے اور جہاں تک ہو سکے دوسروں کے حق میں مہربانی کرنے سے، اس کو طاعت متعدیہ کہتے ہیں۔ اور اس کا ثواب بے حد و اندازہ ہے۔ اور طاعت لازمہ میں تو اخلاص ہونا چاہیے تا کہ قبول ہو جائے، لیکن طاعت متعدیہ تو جس طرح کی بھی ہو اور جیسے بھی کی جائے اس کا ثواب ہے، واللہ الموفق۔'' (ص:۱۷۹، پہلی جلد، تیرہویں مجلس، اشاعت ۲۰۰۷ء)

سلطان المشائخ کے اس ملفوظ سے سماجی اور فلاحی کاموں کے متعلق رفاہ عامہ کا صوفیانہ تصور واضح نظر آرہا ہے۔ صوفیہ کے یہاں مخلوق خدا کو مختلف اعتبار سے نفع پہنچانے کا رفاہی اور فلاحی تصور بہت واضح انداز میں پایا جاتا ہے۔ سلطان المشائخ نے اپنے ملفوظ میں اسی کی تشریح کی ہے۔

مسافران سلوک کے اقسام: راہ سلوک طے کرنے والے صوفیۂ کرام اپنے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ۱-سالک، ۲- واقف، ۳- راجع۔ محبوب الٰہی مسافران طریقت کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے جو اپنی محفل میں ارشاد فرمایا اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ملفوظ نگار لکھتے ہیں:

''اسی مہینے کی انیسویں تاریخ پیر کو قدم بوسی کی سعادت میسر آئی۔ سلوک کا ذکر آیا۔ فرمایا کہ چلنے والا کمال کی طرف رخ رکھتا ہے یعنی سالک جب تک سلوک میں ہو کمالیت کا امیدوار ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ (ایک) سالک ہوتا ہے۔ اور (ایک) واقف ہوتا ہے اور (ایک) راجع (ہوتا ہے)۔ چناں چہ سالک تو وہ ہے جو راستہ چلتا ہے۔ اور واقف وہ ہے جس کو وقفہ پڑ جاتا ہے۔ بندے نے عرض کی کہ کیا سالک کو بھی وقفہ پڑتا ہے؟ فرمایا: ہاں! جب بھی سالک کی طاعت میں کوئی فتور پڑتا ہے جیسے کہ طاعت کا ذوق نہ رہے تو اس کے لیے وقفہ ہوتا ہے۔ اگر جلدی ہوشیار ہو جائے اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہو تو پھر سالک ہو سکتا ہے۔ اور اگر خدا کی پناہ اسی (حال) پر جما رہے تو اس کا خطرہ ہے کہ راجع ہو جائے۔'' (ص:۱۸۹، جلد:۱، مجلس:۱۶)

درویشانہ فروخت: محبوب الٰہی درویشانہ فروخت کی دل چسپ وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''اس کے بعد فقرا کی لین دین اور خرید و فروخت کے بارے میں فرمایا کہ شیخ بدرالدین اسحاق علیہ الرحمہ والغفران نے کسی کو، ایک شطرنجی دی، اور کہا کہ اسے بازار میں لے جا کر بیچ ڈالو۔ پھر فرمایا کہ **درویشانہ بیچنا!** ان سے پوچھا گیا کہ **درویشانہ فروخت** کا کیا طریقہ ہے؟ بولے: واپس گھر نہ لانا جو مول بھی لگے بیچ ڈالنا۔'' (ص:۳۱۱، اشاعت ۲۰۰۱ء۔ ص: ۲۶۳، پہلی جلد، تینتیسویں مجلس، اشاعت ۲۰۰۷ء)

انبیا علیہم السلام کو موت کے وقت اختیار: اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمام انبیا کے انتقال کے وقت انہیں مزید دنیا میں زندہ رہنے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس بابت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کا ذکر کرتے ہوئے سلطان جی نے ارشاد فرمایا:

''پھر انبیا علیہم الصلاۃ والسلام کے احوال کا ذکر آیا کہ ہر پیغمبر کو انتقال کے وقت اختیار دیا جاتا ہے۔ فرمان ہوتا ہے کہ تمہیں اختیار ہے اگر تم چاہتے ہو کہ کچھ اور دن دنیا میں رہو تو رہو، اور اگر نہیں چاہتے تو انتقال کرو۔ چناں چہ حضرت مصطفیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کے رحلت کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دل میں خیال کیا کہ کسے خبر کہ رسول علیہ الصلاۃ والسلام اس میں خوش ہیں کہ کچھ عرصے اور صحابہ کے درمیان (رونق افروز) رہیں، یا اس میں (خوش ہیں) کہ عالم بقا کو سدھاریں۔ یہ بات دل میں سوچی اور رسول علیہ السلام والتحیۃ کی طرف (ٹکٹکی باندھ کر) دیکھنے لگیں۔ رسول علیہ السلام والتحیۃ نے زبان مبارک سے وصال کے وقت ارشاد فرمایا: رسولوں کے اور صدیقوں اور شہدا اور صالحین کے ساتھ! تیری رحمت سے اے سب سے بڑے مہربان۔''

(ص: ۳۷-۱۷۲، جلد: ا، مجلس: ۳۴، ۲۰۰۷ء)

سماع مردوں کے لیے زبردست کسوٹی ہے: سلطان جی کی محفل مبارک میں سماع اور اہل سماع کا ذکر نکلا تو سلطان جی کے زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ:

سماع مَردوں کے لیے زبردست کسوٹی ہے۔'' (ص: ۲۸۷، دوسری جلد مجلس چہارم، اشاعت ۲۰۰۷ء)

خوف کا ایمان یا نزع کے وقت کا ایمان: نزع کے وقت عذاب الٰہی دیکھ کر خوف سے ایمان لانا شریعت میں معتبر نہیں۔ ایمان بالغیب جو نزع سے پہلے کا ہے وہی معتبر ہے۔ اس بارے میں سلطان جی کے فرمودات بیان کرتے ہوئے مرتب لکھتے ہیں:

''پھر یہ تذکرہ آیا کہ خوف کا ایمان کیسا ہوتا ہے؟ ارشاد ہوا کہ کافر لوگ مرتے وقت عذاب کو دیکھ لیتے ہیں، (اور وہ) اس وقت ایمان لائیں گے۔ یہ ایمان کسی حساب میں نہیں کیوں کہ یہ ایمان بالغیب نہیں (ہے)، اگر مومن مرتے وقت توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، لیکن کافر لوگوں کا مرتے وقت ایمان قبول نہیں ہوتا۔'' (ص: ۳۲۵، اشاعت ۲۰۰۱ء۔ ص: ۲۸۷، دوسری جلد مجلس چہارم، اشاعت ۲۰۰۷ء)

دعا کے وقت نظر، رحمت الٰہی پہ ہو: دعا عبادت ہے اور بندے کو دعا سے دلی تسکین ملتی ہے۔ بندہ جب مصائب و مشکلات اور آزمائش سے دوچار ہوتا ہے تو ان پریشانیوں سے نجات کے لیے دعا اور مناجات کا سہارا لیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ملتا ہے کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ سلطان جی نے آداب دعا کے متعلق جو کچھ اپنی محفل میں ارشاد فرمایا اس کے بارے میں مرتب لکھتے ہیں:

’’پھر دعا کا ذکر نکلا۔ ارشاد ہوا کہ: دعا کے وقت بندے کو چاہیے کہ نہ تو، جو گناہ کر چکا ہو، ان کا خیال دل میں لائے اور (نہ) کسی طاعت (وعبادت) کا۔ کیوں کہ اگر اس کا خیال دل میں لائے گا تو یہ غرور ہوگا اور گھمنڈی کی دعا قبول نہیں ہوا کرتی۔ اور اگر گناہ کا دھیان دل کو ہوگا تو دعا کے یقین میں سستی آئے گی۔ پس دعا کے وقت نظر، خاص رحمت حق (تعالیٰ) پر رکھنی چاہیے اور یہ یقین ہونا چاہیے کہ یہ دعا ضرور قبول ہوگی اگر خدا چاہے۔

مزید فرمایا کہ دعا کے وقت دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور سینے کے سامنے ہوں اور یہ بھی آیا ہے کہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے رکھنے چاہیےاور خاصے بلند رکھنے چاہیے اور ایسی صورت بنانی چاہیے کہ گویا اس وقت کوئی چیز اس کے ہاتھ میں ڈالی جائے گی اس درمیان یہ معنی بھی بیان فرمایا کہ دعا دل کی تسکین کے واسطے ہے (ورنہ) خدائے عزوجل (خوب) جانتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے۔‘‘ (ص:۳۹۵، اشاعت ۲۰۰۱ء۔ ص: ۳۴۷، دوسری جلد، اٹھارہویں مجلس، اشاعت ۲۰۰۷ء)

جادو معجزہ اور کرامت: جادو معجزہ اور کرامت کے متعلق حضرت محبوب الٰہی کی مجلس میں گفتگو چل نکلی تو آپ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ:

’’جادو کے سلسلے میں معجزہ اور کرامت کا ذکر نکلا (تو آپ نے فرمایا) کہ اس کے چار درجے ہیں معجزہ اور کرامت، معونت اور استدراج۔ معجزہ انبیا کی چیز ہے جن کا علم بھی کامل ہوتا ہے اور عمل بھی کامل ہوتا ہے۔ اور وہ صاحب وحی ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ دکھاتے ہیں معجزہ ہوتا ہے۔ لیکن کرامت اولیا سے متعلق ہوتی ہے۔ علم و عمل ان کا بھی مکمل ہوتا ہے، فرق بس یہ ہے کہ وہ مغلوب ہوتے ہیں اور ان سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ کرامت کہلاتا ہے۔ مگر معونت اسے کہتے ہیں کہ بعض دیوانے جو نہ علم رکھتے ہیں نہ عمل، ان سے کبھی کبھی کوئی بات خلاف عادت سرزد ہوتی دکھائی دیتی ہے اسے معونت کہا جاتا ہے۔ اسی طرح استدراج اسے کہتے ہیں کہ ایک گروہ جو قطعاً ایمان نہیں رکھتا جیسے جادوگر وغیرہ ان سے کوئی چیز نظر آتی ہے (تو) یہ استدراج کہلاتی ہے۔‘‘ (ص: ۳۶۹-۱۷، جلد: ۲، مجلس: ۳۰، اشاعت ۲۰۰۷ء)

قرآن کے علوم و معارف: پورے قرآن میں جن اصول و مبادیات کا ذکر ہے وہ تمام سلطان جی کے نزدیک دس (۱۰) ہیں ان دسوں کی تفصیلات بتاتے ہوئے سلطان جی نے سورہ فاتحہ کے ذکر میں ارشاد فرمایا:

’’فاتحہ کے ذکر میں ارشاد ہوا کہ جو کچھ پورے قرآن میں موجود ہیں وہ دس چیزیں ہیں، اور ان دس چیزوں میں آٹھ چیزیں فاتحہ میں موجود ہیں وہ دس چیزیں جو قرآن میں ہے کون سی ہیں؟ ذات و صفات، اور افعال، اور آخرت کا ذکر، اور تزکیہ، اور تخلیہ، اور اولیا کا ذکر، دشمنوں کا ذکر، اور کافروں سے معرکہ آرائی (جہاد) اور احکام شرع۔

پھر فرمایا کہ ان دس چیزوں میں سے آٹھ چیزیں سورہ فاتحہ میں موجود ہیں۔ جیسے الحمدللہ (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں) ذات ہے۔ رب العالمین (جو پالنے والا ہے تمام جہانوں کا) فعل ہے۔ الرحمن الرحیم (جو رحمن ہے اور رحیم) صفات ہے۔ مالك یوم الدین (مالک ہے آخرت کے دن کا) ذکر آخرت۔ ایاك نعبد (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) تزکیہ۔ وایاك نستعین (اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں) تخلیہ۔ اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم (ہمیں صراط مستقیم کی طرف ہدایت فرما ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا) اولیا کا ذکر۔ غیر المغضوب علیهم ولاالضالین (ان کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا، اور نہ گمراہوں کا) دشمنوں کا ذکر۔ پس ان دس چیزوں میں جو سارے قرآن میں ہے آٹھ فاتحہ ہی میں مل جاتی ہیں۔ بس کفار سے جہاد اور احکام شرع (فاتحہ میں) نہیں ہیں۔'' (ص:۲۹-۷۴۳، اشاعت ۲۰۰۱ء۔ص:۹۱-۳۸۹، دوسری جلد، چھبیسویں مجلس، اشاعت ۲۰۰۷ء)

ہنود کی ریاضت وعرفان: صوفیہ نے اپنی خانقاہیں اور اپنے دل کا دروازہ کسی بھی ذات برادری کے لیے بند نہیں کیا۔ ہر ذات برادری اور تمام طبقے وادیان و مذاہب کے لوگ ان سے ملنے، ان سے دعا کرانے، اپنی جسمانی وروحانی پریشانیوں کے حل کے لیے ان خاصان خدا کے پاس آتے تھے۔ کچھ لوگ علمی اور روحانی معاملات پہ تبادلۂ خیال کے لیے بھی صوفیہ کی بارگاہ میں آتے تھے۔ بفضلہٖ تعالیٰ برصغیر چشتیوں کی ولایت ہے، بر صغیر میں چشتیوں کے اکابر، سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز کفاران ہند کے درمیان نبوی مشن یعنی تبلیغ دین کے لیے حکمت، مواعظ حسنہ اور اخلاق محمدی کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ مشائخ چشت اہل بہشت نے دین اسلام کی فروغ واشاعت اور تبلیغ کے لیے اخلاق محمدی کو ہمیشہ اپنا معیار بنائے رکھا۔ ایک بار سلطان جی کے پیرو مرشد شیخ کبیر شیخ الاسلام حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کی بارگاہ اقدس میں ایک ہندو جوگی آیا۔ حسن اتفاق اس وقت سلطان جی بھی اپنے پیرومرشد کی دامن پناہ میں حاضری رکھتے تھے۔ موقع ملنے پر سلطان جی نے اس جوگی سے جو گفتگو فرمائی اس کو آپ کے ملفوظ نگار نے ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے:

''اس کے بعد فرمایا کہ: میں ایک دفعہ شیخ کبیر (حضرت بابا فرید) کی خدمت میں بمقام اجودھن (حال پاک پٹن) حاضر تھا کہ ایک جوگی آیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارا طریقہ کیا ہے؟ اور کام کی بنیاد تمہارے یہاں کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہمارے علم میں اس طرح بتایا گیا ہے کہ آدمی کے نفس میں دو عالم ہوتے ہیں۔ ایک عالم علوی اور دوسرا عالم سفلی۔ پیشانی سے ناف تک عالم علوی ہے اور ناف سے پیروں تک عالم سفلی ہے۔ کام اس طرح بنتا ہے کہ عالم علوی میں تو پوری طرح صدق وصفا اور اچھے اخلاق اور حسن معاملہ ہو۔ اور عالم سفلی میں نگاہ داشت اور پاکی اور پارسائی۔

خواجہ ذکرہٗ اللہ بالخیر نے زبان مبارک سے ارشاد فرمایا کہ مجھے اس کی بات اچھی لگی۔'' (ص:۴۲۵،
دوسری جلد، تینتیسویں مجلس، اشاعت ۲۰۰۷ء)

حسن اخلاق کے دائرے میں بات چیت، گفتگو اور باہمی دوستانہ ماحول میں مکالمے افہام و تفہیم کے لیے راستے ہموار کرتے ہیں۔ محبوب الٰہی کی یہ افہام و تفہیم پہ مبنی گفتگو مکالمے کا ایک روشن باب ہے جسے سلطان جی نے اپنے دور میں جاری رکھا۔ اور اسی انداز فکر کی آج بھی ضرورت ہے۔

حب دنیا اور محبت الٰہی: خالق کائنات، رب قدیر، مالک الملک کی ذات ہی صوفیہ کے یہاں اصل مقصود بالذات ہے۔ ان دنیا داروں سے صوفیۂ کرام کا نقطۂ نظر الگ ہے۔ اللہ کی محبت کے سوا صوفیہ اپنے دل کو ہر اعتبار سے خالی اور پاک وصاف رکھنا چاہتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ محبت الٰہی اور حب دنیا کو دل میں ایک ساتھ نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ اس بابت سلطان جی نے جو ارشاد فرمایا ملفوظ نگار کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

''پھر ترک دنیا کا ذکر نکلا اس باب میں بے حد غلو فرمایا۔ زبان مبارک پر یوں آیا کہ اگر کوئی اپنے (پورے) دن روزہ رکھ کر گزارے اور راتیں نماز پڑھتے بتائے اور حرمین کا زائر (بھی) ہو، اصل بات جب ہوگی کہ دنیا کی محبت اس کے دل میں نہ ہو اس کے بعد فرمایا کہ جو شخص خدا کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور دنیا کی محبت اس کے دل میں ہوتی ہے تو وہ اس دعوی میں جھوٹا ہوتا ہے۔'' (ص:۴۲۵، جلد:۲، مجلس:۳۳)

اہل سماع اہل درد ہیں: عبادت و ریاضت کے ساتھ ذوق سماع بھی اپنی شرائط کے ساتھ مختلف سلاسل کے صوفیہ کا معمول شروع سے رہا ہے۔ بعض زاہدان خشک، صوفیہ کے اس ذوق سماع پر وقتاً فوقتاً چیں بہ چیں ہوتے رہے مگر صوفیہ نے ان خشک مزاج لوگوں کی ایک نہ سنی۔ سلطان جی کے ملفوظات میں بھی سماع بالمزامیر اور سماع بغیر مزامیر کے جواز اور سماحت وفضیلت پر آپ کے احوال واقوال شاہد ہیں۔ اہل سماع کے متعلق سلطان جی کے فرمان کو نقل کرتے ہوئے ملفوظ نگار لکھتے ہیں:

''اس کے بعد فرمایا کہ سماع بڑے (بڑے) مشائخ نے سنا ہے اور جو اس کام کے اہل ہیں اور جو صاحب ذوق ہیں اس میں درد پایا جاتا ہے۔ وہ اگر گویئے سے ایک شعر بھی سنتا ہے تو آبدیدہ ہو جاتا ہے، چاہے مزامیر ہو یا نہ ہو۔ البتہ جس کو عالم ذوق کی خبر نہیں اگر اس کے سامنے (زمانے بھر کے) گویئے ہوں اور ہر قسم کے مزمار (باجے) بھی آجائیں تو کیا فائدہ؟ کیوں کہ وہ اہل درد میں سے نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ کام درد سے تعلق رکھتا ہے، مزامیر وغیرہ سے نہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ لوگوں کو ہر روز حضور کہاں میسر آتا ہے۔ اگر کسی دن کوئی اچھا وقت میسر آجاتا ہے (تو)، اس دن کے سارے متفرق اوقات اس (اچھے) وقت کی پناہ میں ہوتے ہیں، اور اگر کسی مجمع میں کوئی شخص ذوق والا اور نعمت والا ہوتا ہے تو سب لوگ اس شخص کی پناہ میں ہوتے ہیں۔'' (ص:۴۶۷، جلد:۳، مجلس:۵، ۲۰۰۷ء)

یہ ہے سماع کے متعلق سلطان جی کے حقیقی نظریات ۔محبوب الٰہی کے مرید خاص اور آپ کی بارگاہ میں قرب خاص کا مرتبہ رکھنے والی شخصیت امیر خسرو نے جن آلات سماع کا ایجاد کیا وہ سب سلطان جی کی تربیت خاص میں رہ کر کیا، کسی زاہد خشک کی محبت وصحبت میں رہ کر نہیں کیا۔مگر سلطان جی نے کبھی بھی اپنے مرید خاص امیر خسرو کی ان آلات کی ایجادات پہ حوصلہ شکنی نہیں کی۔

اسم اعظم کیا ہے؟: اسم اعظم تصوف کی دنیا میں ایک بہت اہم راز ہے جس پہ متعدد مشائخ طریقت نے اپنے اپنے اعتبار سے اظہار خیال کیا ہے۔مگر سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی نے اسم اعظم کے متعلق حضرت ابراہیم بن ادہم علیہ الرحمۃ کے حوالے سے جو بات کہی ہے وہ بہت ہی قابل غور اور توجہ کے لائق ہے آپ فرماتے ہیں:

''پھر اسم اعظم کا ذکر نکلا ارشاد ہوا کہ ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ کو اسم اعظم یاد ہے؟ بتائیے کون سا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں! معدے کو حرام لقمے سے پاک رکھو اور دل کو دنیا کی محبت سے خالی کرلو اس کے بعد جس نام سے بھی خدا کو پکاروگے وہی اسم اعظم ہے۔''

(ص:۲۱-۵۱۹، اشاعت ۲۰۰۱ء۔ص:۷۳-۱۷۴، تیسری جلد، پانچویں مجلس، اشاعت ۲۰۰۷ء)

رزق کے اقسام: سلطان جی کے ملفوظ نگار لکھتے ہیں کہ مشائخ نے رزق کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔۱-رزق مضمون۔۲-رزق مقسوم۔۳-رزق مملوک، ۴-رزق موعود۔اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رزق مضمون تو وہ ہے جو آدمی کو کھانے اور پینے کی چیزوں کی صورت میں، جو اس کے لیے کافی ہو ملتا ہے، اس کو مضمون کہتے ہیں۔یعنی (ان کا) خدا ضامن ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا (ترجمہ:اور زمین میں کوئی رینگنے والا ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو)۔

رزق مقسوم وہ ہے جو ازل میں مقدر کر دیا گیا اور لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے۔رزق مملوک وہ ہے جس کا ذخیرہ ہوتا ہے روپے (پیسے) کپڑے اور دوسرے سامان کی صورت میں۔رزق موعود، وہ ہے جس کا وعدہ حق تعالیٰ نے عبادت گذاروں اور (اپنے صالح) بندوں سے کر رکھا ہے۔ وَمَنْ يَّتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (ترجمہ:اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے (دینے کے) ذریعہ بناتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں اس کو خیال بھی نہیں ہوتا ہے)۔اس کے بعد فرمایا توکل رزق مضمون میں ہوتا ہے۔ دوسری قسم کے رزق میں نہیں ہوتا۔کیوں کہ جو کچھ مقسوم ہے اس میں توکل کیا کرے گا؟ اور جو مملوک (ملکیت) ہے، اس میں بھی توکل کا دخل نہیں۔اور جو موعود (جس کا وعدہ کیا گیا) ہے اس میں بھی توکل نہیں کیوں کہ جس کا وعدہ کرلیا گیا وہ تو پہنچے ہی گا۔توکل رزق مضمون میں ہے یعنی یہ یقین رکھے جو کچھ میرے لیے کافی ہو پہنچ کر رہے گا (اس پر) توکل کرے۔'' (ص:۷۵۳، ۲۰۰۱ء۔ص:۴۸۹، تیسری جلد، نویں مجلس، ۲۰۰۷ء)

درویش زمان ومکان کی قید سے ماورا ہوتا ہے: سلطان جی نے درویشانہ شان کے متعلق ارشاد فرمایا:

''جس طرح کوئی زمانہ دوسرے زمانے سے ممتاز ہوجاتا ہے، جیسے عید کا دن دوسرے سب دنوں کے مقابلے میں عام خوشی کے لیے مخصوص ہے، اسی طرح سے بعض جگہ بھی ہوتی ہے جہاں ایسی راحت ملتی ہے جو دوسرے مقام پر نہیں ملتی۔ لیکن درویش وہ ہوتا ہے جو زمان و مکان (کی قید) سے باہر نکل جاتا ہے۔ نہ تو کسی خوشی سے شادمان ہوتا ہے، نہ کسی غم سے غم گین، اور ایسا وہی شخص ہوتا ہے جو دنیا اور دنیا داری سے آزاد ہوجائے۔'' (ص:۵۲۷، تیسری جلد، سترہویں مجلس، ۲۰۰۷ء)

حکام کے مزاج: اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کے رویہ کے مطابق ان پہ حکمران مسلط کیے جاتے ہیں۔ سلطان جی ایک حدیث قدسی سے استدلال کرتے ہوئے بادشاہوں کے مزاج کے تغیر وتبدلی کے متعلق ارشاد فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بادشاہوں کا دل میرے ہاتھ میں ہے یعنی جب تک خلق، خدائے تعالیٰ کے ساتھ ٹھیک رہتی ہے، میں ان (بادشاہوں) کے دلوں کو خلق پر مہربان رکھتا ہوں اور جب خلق، اللہ کے ساتھ ٹھیک نہیں رہتی ہے تو میں ان کے دلوں کو خلق پر نا مہربان (سخت) کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ اس چیز پہ نگاہ رکھنی چاہیے اور اسی سب چیزوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔'' (ص:۵۹۷، اشاعت ۲۰۰۱ء، ص:۵۴۹، چوتھی جلد، چوتھی مجلس، ۲۰۰۷ء)

انبیا اور اولیا: بعض خالی اور خام کار قسم کے متصوفین کا گمان یہ ہے کہ اولیا انبیا پر فضیلت رکھتے ہیں خام کار صوفیوں کے اس غلط خیال کی تردید سلطان جی نے بہت دوٹوک انداز میں کی ہے۔ اور اپنے مجلسی احباب سے مخاطب ہوکر اس باطل عقیدے کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اولیا، انبیا پر فضیلت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ انبیا کا اکثر وقت خلقت کے ساتھ مشغولی میں گزرتا ہے۔ یہ عقیدہ غلط ہے کیوں کہ انبیا اگرچہ خلق میں مشغول رہتے ہیں لیکن جس وقت حق (تعالیٰ) کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں وہ ایک وقت اولیا کے سارے اوقات پہ شرف رکھتا ہے۔'' (ص:۶۰۱، اشاعت ۲۰۰۱ء۔ ص:۵۵۳، چوتھی جلد، چوتھی مجلس، اشاعت ۲۰۰۷ء)

سلطان جی کے ملفوظات سے کچھ گوہر آبدار چن کر میں نے قارئین مجلہ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ ان پیش کردہ اقتباسات سے، ہم سب اپنی زندگی کو سنوارنے میں مدد لیں گے اور آپ کے نقش قدم پہ چلنے کی کوشش کریں گے۔ پیش نظر مجلہ سلطان جی کی ذات سے منسوب ہے اس لیے خاکسار بھی اپنی سعادت سمجھتا ہے کہ سلطان جی کی بارگاہ میں ٹوٹے پھوٹے کچھ لفظوں کے پیرائے میں اپنا خراج عقیدت پیش کرے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

○○○

سید قمر الاسلام

فوائدالفواد کے چند اہم مباحث-ایک جائزہ

فوائدالفواد حضرت شیخ نظام الدین اولیا (۷۲۵ھ) کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ برصغیر میں سلسلۂ چشتیہ کے عناصر اربعہ میں خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اجمیری (۶۳۲ھ)، شیخ قطب الدین بختیار کاکی (۶۳۵ھ) اور شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر (۶۶۴ھ) کے بعد شیخ نظام الدین اولیا کا اسم گرامی چوتھے نمبر پر آتا ہے۔صوفی حلقوں میں آپ کو 'سلطان جی' 'محبوب الٰہی' اور 'سلطان المشائخ' جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے لفظوں میں ''ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ کی داغ بیل حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے ہاتھوں پڑی، حضرت بابا فرید گنج شکر نے اسے منظم کیا اور حضرت شیخ نظام الدین نے اسے معراج کمال تک پہنچادیا۔'' (تاریخ مشائخ چشت، ج:اول،ص:۲۲۵) حضرت سلطان جی کی کوششوں سے جو ہمہ گیر روحانی اورسماجی انقلاب پیدا ہوا اس کے یہ تین نکات بے حد اہم تھے:

● آپ کے حسن اخلاق اور تبلیغی مساعی نے دہلی کی معاشرتی زندگی پر انتہائی گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ شہر جہاں کبھی قحبہ خانوں اور گناہوں کی کثرت تھی، چند برسوں کی خاموش جدوجہد نے اس کی تصویر بدل دی۔عوام وخواص کا بڑا طبقہ آپ کے دامن فیض سے وابستہ ہوکر اسلامی افکار وکردار کا حامل بن گیا۔آپ نے وہاں صحیح معنوں میں اسلام کو زندہ حقیقت کے طور پر لوگوں کے دلوں میں راسخ کردیا۔

● آپ نے اپنی خانقاہ کے روحانی ماحول میں خلفا وتلامذہ کی مضبوط ٹیم تیار کی اور تعلیم وتربیت کے مراحل سے گزار کر ان کو مختلف علاقوں کی طرف روانہ کردیا،اس کی بدولت برصغیر کے دور دراز علاقوں میں چشتی سلسلے کے مراکز قائم ہوگئے، چراغ سے چراغ جلنے کا یہ سلسلہ اس قدر وسیع ہوا کہ خطے کا شاید ہی کوئی گوشہ چشتی نظامی فیض سے محروم رہ گیا ہو۔

● آپ ہی کے زیر نگرانی فوائدالفواد کی شکل میں مشائخ چشت کے صوفیانہ نظریات مدوّن ہوگئے۔ بعد کے زمانوں میں یہ مبارک مجموعہ سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ،ان کے احوال وکردار خاص طور سے ان کے صوفیانہ فکر وفلسفے سے آگاہی کا سب سے مستند ماخذ قرار پایا۔اس بابرکت مجموعہ کی ترتیب وتدوین کی سعادت خواجہ میر حسن سجزی کے حصے میں آئی۔

امیر حسن علاء سجزی دہلوی

آپ کا نام حسن اور لقب نجم الدین ہے، لیکن علمی اور روحانی حلقوں میں امیر حسن علاء سجزی کے نام سے شہرت پائی۔ والد کا نام علاء الدین حسن تھا۔(۱)۔ ۵۳-۶۵۲ھ/ ۱۲۵۵ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی میں ہوئی، آپ امیر خسرو سے ایک سال چھوٹے تھے، جب ۲۷ برس کے ہوئے تو سلطان بلبن کے بڑے بیٹے سلطان محمد نے امیر خسرو کو مصحف دار اور امیر حسن کو دوات دار مقرر کرلیا۔ پانچ سال وہیں ملازم رہے، محمد خان کی شہادت کے بعد امیر خسرو نے ایک پر درد مرثیہ نظم میں اور امیر حسن نے ایک مرثیہ نثر میں لکھا۔ امیر حسن انتہائی ذہین اور لطیف الطبع انسان تھے، عربی اور فارسی پر مکمل عبور حاصل تھا، تیرہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے۔

محبوب الٰہی سے واقف تو بہت پہلے سے تھے لیکن باضابطہ رشتۂ عقیدت کافی بعد میں استوار ہوا۔ سیر العارفین میں آپ کے توبہ کی روایت اس طرح ہے کہ ایک دن معمول کے مطابق حضرت سلطان المشائخ قطب صاحب کی قبر سے فاتحہ پڑھ کر واپس آرہے تھے۔ امیر حسن حوض شمسی کے قریب اپنے چند احباب کے ہمراہ مے نوشی کررہے تھے۔ محبوب الٰہی کو آتا دیکھ کر نشے ہی کے عالم میں یہ رباعی پڑھی:

سالہا باشد کہ ما ہم صحبتیم
گر ز صحبتہا اثر باشد، کجا ست؟
زہد تان فسق از دل ما کم نکرد
فسق مایان، بہتر از زہد شما ست

آپ نے امیر حسن کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور فرمایا:

''در صحبت اثرہا است، ان شاء اللہ روزی باد''

آپ کے ان سادہ الفاظ نے امیر حسن کی کایا پلٹ دی، برہنہ سر بے تابانہ سلطان جی کے قدموں سے لپٹ گئے۔ سیر العارفین کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس واقعے کے وقت امیر حسن کا سن ۳۷ کا تھا،(۲) یہ صریحاً غلط ہے۔ امیر حسن کی پیدائش ۵۳-۶۵۲ھ میں ہوئی۔ اگر ۳۷ سال والی اس روایت کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر اس لحاظ سے ان کے توبہ کا واقعہ ۶۸۵ھ میں پیش آنا چاہیے جو حضرت سلطان جی کی رحلت کا سال ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ واقعہ ۷۰۷ھ سے تھوڑے عرصے قبل وقوع پذیر ہوا ہوگا۔ اسی سال شعبان کی تیسری تاریخ سے فوائد الفواد کی ترتیب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے توبہ کے وقت آپ کی عمر ۵۴-۵۵ کی عمر رہی ہوگی۔

(مقدمہ فوائد الفواد، نثار احمد فاروقی، ص:۱۱۷)

---

(۱) پروفیسر حبیب نے والد کا نام نجم الدین لکھا ہے۔

(۲) سیر العارفین، ص:۸۷

جب سلطان محمد تغلق نے دیوگیر میں اپنا دوسرا پایۂ تخت بنایا تو امیر حسن وہاں منتقل ہو گئے اور وہیں ۷۳۷ھ یا ۷۳۸ھ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا مزار خلد آباد ضلع اورنگ آباد میں مرجع خلائق ہے۔

(حضرت نظام الدین اولیا،ص:۷)

عشق کے موضوع پر رسالہ مخ المعانی، ایک فارسی دیوان اور فوائد الفواد آپ کی قلمی یادگاریں ہیں۔ لیکن آپ کی جاودانی شہرت فوائد الفواد کی مرہون منت ہے۔

منہج ترتیب

حضرت امیر حسن علا سجزی نے فوائد الفواد کو پانچ اجزا اور ۱۸۸ مجالس میں تقسیم کیا ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے:

جزو اوّل: یہ ۳۴ مجالس پر مشتمل ہے، اس کی ترتیب کا آغاز ۳ شعبان المعظم ۷۰۷ھ بروز یک شنبہ ہوا اور ۲۹ ذوالحجہ ۷۰۸ دوشنبہ کو اس کی تکمیل ہوئی۔ اس کی مدت ترتیب ڈیڑھ برس ہے۔

جزو دوم: اس جزو میں مجالس کی تعداد ۳۸ ہے۔ اور یہ تین سال کی مدت یعنی ۲۹ شوال ۷۰۹ھ، چہارشنبہ سے ۱۳ شوال ۷۱۲ھ شنبہ کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس لحاظ سے جزو اول کے اختتام اور جزو دوم کی ابتدا کے درمیان دس ماہ کا وقفہ ہے۔

جزو سوم: اس میں کل ۱۷ مجلسیں ہیں۔ اس کا آغاز ۷ ذی قعدہ ۷۱۲ اور اختتام یکم ذی الحجہ ۷۱۳ھ کو ہوتا ہے۔

جزو چہارم: یہ جزو ۶۷ مجالس پر مشتمل ہے۔ اور اس کی تکمیل میں ساڑھے پانچ برس سے کچھ زائد عرصہ صرف ہوا ہے۔ ۲۴ محرم الحرام ۷۱۴ بروز چہارشنبہ کو شروع ہو کر ۲۳ رجب المرجب ۷۱۹ بروز دوشنبہ کو ختم ہوا ہے۔

جزو پنجم: یہ ۳۲ مجلسوں پر مشتمل ہے۔ جو ۲۱ شعبان المعظم ۷۱۹ سے ۲۰ شعبان المعظم ۷۲۲ کی تین سالہ مدت میں ترتیب دی گئی ہیں۔

خصوصیات

فوائد الفواد کے اندر حسب ذیل امتیازی خصوصیات ہیں:

● یہ پہلا مجموعہ ہے جس کی تدوین میں ماہ و سال، دن اور تاریخ کے اندراج کا اہتمام کیا گیا۔

● حضرت امیر حسن نے شعوری طور پر محبوب الٰہی کی زبان مبارک سے الفاظ کو بعینہ نقل کا اہتمام کیا، چناں چہ جہاں کہیں آپ کے الفاظ ذہن سے محو ہو جاتے، آپ وہاں بیاض چھوڑ دیتے، بعد میں استفسار کے بعد اس جگہ کو پر کرتے۔

●اس مجموعے کو یہ شرف حاصل ہوا کہ تدوین کے بعد صاحب ملفوظات نے اس پر نظر ثانی فرمائی اور امیر حسن کے انداز نگارش کی تحسین وتائید بھی فرمائی۔

●یہ مجموعۂ ملفوظات اپنے موضوعات ومباحث کے اعتبار سے عوام اور خواص دونوں کے لیے مفید ہے۔

●اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت اس کے جامع ومرتب خواجہ امیر حسن سجزی دہلوی کی شخصیت بھی ہے جو ایک طرف زبان وادب کے زبردست فاضل ہونے کی وجہ سے 'سعدی ہند' کہلاتے تھے تو دوسری طرف ان کا دل پیرومرشد کی محبت سے معمور تھا۔

●فوائد الفواد کا نمایاں وصف اس کے مضامین کی رنگارنگی اور تنوع ہے جو دراصل صاحب ملفوظات حضرت سلطان جی کی جامع کمالات شخصیت کا عکس جمیل ہے۔آپ 'درکفے جام شریعت درکف سندان عشق' کا عملی مصداق تھے۔مؤلف سیر العارفین کے بقول اسرار باطنی میں وقت کے بایزید اور علوم ظاہری میں زمانے کے ابوحنیفہ تھے۔(۱) آپ ان مجتہدین صوفیہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے یہاں فقہ ظاہری اور فقہ باطنی کا امتزاج پایا جاتا ہے، جو بیک وقت شریعت کے مصادر اور مقاصد دونوں سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔آپ کے گرمیٔ انفاس سے وجود پذیر خانقاہی نظام کا ہر گوشہ اسی مقصد ومنہاج کا آئینہ دار ہے۔

آپ اسلامیات کے نامور فاضل تھے۔کم سنی کے زمانے میں ہی 'بحاث ومحفل شکن' جیسے القاب سے مشہور ہو گئے تھے۔بدایوں میں طالب علمی کے دوران مقامات حریری کے چالیس مقامات حفظ کر ڈالے تھے۔دہلی منتقل ہونے کے بعد قرآن مجید حفظ کیا اور اسی دوران مشارق الانوار جیسے مستند مجموعۂ احادیث کے حفظ کی بھی سعادت حاصل کی۔(۲) طلب علم کا یہ مرحلہ گزار کر جب بابا فرید کی خدمت میں پہنچے تو وہاں **التمهيد في بيان التوحيد**، **عوارف المعارف** اور لوائح جیسی کتابوں کا باقاعدہ درس لیا۔

(مقدمہ فوائد الفواد، نثار احمد فاروقی، ص:۳۶)

خواجہ امیر حسن نے فوائد الفواد کے اندر سلطان جی کی اسی جامعیت کو سمیٹ لیا ہے۔اس کے سبب فوائد الفواد کا قاری اپنی آنکھوں کے سامنے شریعت وطریقت کے دو دریاؤں کو ملتے ہوئے دیکھتا ہے۔یوں تو اس کا بنیادی موضوع تصوف ہے اور پوری کتاب اسی مرکزی موضوع کے اردگرد گردش کرتی ہے لیکن اس کے پہلو بہ پہلو اس نے اپنے دامن میں علوم قرآن، علوم حدیث، علم الکلام، فقہ واصول، تذکرہ وتاریخ، علم لغت اور شعر وادب کے بیش قیمت جواہر اکٹھا کر لیے ہیں جن سے ہر طبقے اور ہر ذوق کا قاری فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔آئندہ سطور میں اسی کتاب مستطاب کے چند اہم مباحث کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

---

(۱)''دراسرار باطنی بایزید وقت بود ودر اطوار ظاہر ابوحنیفہ زمان'' سیر العارفین، ص:۵۹

(۲) سیر الاولیا، ص:۱۷۵، ملخصا

قرآنی مباحث

حضرت محبوب الٰہی کو کلام الٰہی سے خصوصی ربط تھا۔فوائد الفواد کی ایک مجلس میں آپ نے بدایوں کے قاری شادی مقری کا بڑے والہانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ان کی ایک کرامت یہ تھی کہ جو بھی ان سے قرآن کا ایک ورق پڑھ لیتا تو پورے قرآن کا حافظ ہوجاتا تھا۔آپ نے بھی قاری شادی سے ایک سیپارہ پڑھا تھا،اسی کی برکت سے دہلی آنے کے بعد پورا قرآن آپ کو حفظ ہوگیا(۱)۔ پھر جب بابا صاحب سے وابستگی ہوئی تو چھ پارے تجوید کے ساتھ ان سے پڑھے۔آپ اپنی مجالس میں بابا صاحب کے صحت مخارج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے کہ ان جیسا 'ضاد'ادا کرنے والا دوسرا نہیں دیکھا، ہرچند میں نے چاہا کہ اسی طرح پڑھوں لیکن نہیں ہوسکا۔(مرجع سابق، جزو:۴،مجلس:۳۲،ص:۶۸۷)

قرآن سے اسی غیر معمولی شغف نے آپ کو عملی زندگی میں بھی 'قرآن کا مطلوب انسان' بنادیا تھا۔آپ کے حالات زندگی پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے عقیدہ وعمل اور اخلاق وآداب میں حددرجہ قرآنی منہج کی اتباع کرنے والے شخص تھے۔قاری جب آپ کے منہج گفتگو کا کلام الٰہی کے منہج سے تقابل کرتا ہے تو قرآنی طرز فکر،اسلوب تفہیم،عبرت انگیز قصص وحکایات اور دل کو چھو لینے والی مثالوں کی جلوہ گری سے اس کا ذہن روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں ہم فوائد الفواد کے قرآنی مباحث کے چند نمونوں کا تذکرہ کررہے ہیں۔

آداب تلاوت

قرآن رب العالمین کا کلام لاریب ہے۔متکلم کی نسبت سے اس کی عظمت وجلالت مسلم ہے تو اپنے لازوال پیغام کی بدولت وہ عالمین پر ابدی حجت بھی ہے۔اسی عظمت کے پیش نظر متقدمین ومتأخرین نے 'آداب القرآن' کے موضوع پر گراں قدر تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔فوائد الفواد کی مختلف مجالس میں الگ الگ اسلوب میں محبوب الٰہی اپنے حاضر باشوں پر کلام ربانی کی عظمت واضح کرتے ہیں نیز اس کے حفظ وتلاوت کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ایک روز یہی تذکرہ چل رہا تھا۔امیر حسن سوال کرتے ہیں کہ اگر قرآن یاد کرنے کا موقع نہ ملے تو ناظرہ پڑھنا کیسا ہے؟ فرمایا:''اچھا ہے،اس میں آنکھ کے لیے بھی ایک حظ ہے۔اسی مناسبت سے بابا صاحب کی اس نصیحت کا بھی ذکر کیا کہ حضرت جب کسی کو قرآن یاد کرنے کے لیے کہتے ،فرماتے پہلے سورۂ یوسف یاد کرلو کہ جو اس کو یاد کرلیتا ہے اس کی برکت سے حق تعالی پورے قرآن کے حفظ کی توفیق عطا فرماتا ہے۔''

(مرجع سابق، جزو:۲،مجلس:۲۱،ص:۳۵۷)

ایک مجلس میں تلاوت قرآن کے آداب کا ذکر ہورہا تھا،اسی مناسبت سے آپ نے درج ذیل آداب بیان فرمائے:

---

(۱) فوائد الفواد، جزو:۴،مجلس:۲۷،ص:۶۱-۶۵۹

’’قرآن پڑھتے وقت پڑھنے والا اللہ سے لولگائے۔ یہ میسر نہ ہوتو جو کچھ پڑھ رہا ہے اس کے معانی دل پر گزارے۔ اگر یہ بھی میسر نہ ہوتو اللہ کی عظمت وجلال کو اپنے دل پر طاری رکھے۔ تلاوت کے وقت شرم غالب ہونی چاہیے کہ میں اس دولت کے لائق کہاں، میرے لیے اس سعادت کا موقع کیسے؟ پنجم: اگر یہ بھی نہ میسر ہوتو اتنا سمجھے کہ تلاوت قرآن کا اجر دینے والا اللہ ہے، وہ ضرور مجھے اجر عطا فرمائے گا۔ (مرجع سابق، جزو:۲،مجلس: ۲۳،ص: ۹۷۔۷۷۳)

ایمان افروز واقعہ

آداب قرآن ہی کے ضمن میں آپ نے سلطان محمود کی یہ حکایت بیان فرمائی:

سلطان محمود کو اس کے انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا، دریافت کیا خدا نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کہنے لگا کہ ایک رات کو میں کسی گھر میں جہاں طاق میں قرآن رکھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہاں تو قرآن ہے میں کیسے سوؤں؟ پھر خود سے بولا کہ قرآن کو اس جگہ سے باہر بھیج دوں؟ مگر یہ خیال بھی آیا کہ اپنے آرام کی خاطر قرآن کو یہاں سے کیسے باہر بھیجوں؟ الغرض پوری رات بیٹھا جاگتا رہا۔ جب میرے انتقال کا وقت آیا تو مجھے قرآن کے اس ادب کی وجہ سے بخش دیا گیا۔ (مرجع سابق، جزو:۴،مجلس: ۳۵،ص: ۶۹۹)

ترتیل اور تردید

ایک مرتبہ فرمایا کہ قرآن کو ترتیل اور تردید کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا کہ تردید کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: جس آیت سے پڑھنے والے کو ذوق اور رقت حاصل ہو، اس کی تکرار کرنی چاہیے۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ پڑھنا چاہتے تھے۔ جب بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا تو صرف بسم اللہ ہی سے آپ کے مبارک دل پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور بیس دفعہ اس کی تکرار فرمائی۔ (مرجع سابق، جزو:۲،مجلس: ۲۳،ص: ۷۷۳)

مفردات القرآن

’مفردات القرآن‘ علوم قرآن کی اہم شاخ ہے۔ جس میں قرآن مجید میں استعمال ہونے والے کلمات کی تحقیق مقصود ہوتی ہے۔ اس سے یہ علم ہوتا ہے کہ قرآن میں کون سے الفاظ کن معانی میں مستعمل ہوئے ہیں؟ اس کی معرفت کے بغیر کلام الٰہی کے درست فہم تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ اس فن پر سیکڑوں کی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ سردست فوائد الفواد سے اس کا ایک نمونہ پیش ہے:

’’کسی درویش سے سوال کیا گیا کہ تمہیں کلام اللہ کی کون سی آیت سب سے زیادہ پسند ہے۔ انھوں نے کہا: ’أُكُلُهَا دَائِمٌ‘ [الرعد:۳۵] اس پر آپ نے فرمایا: ’اِکَل‘ ہے، اور ’أُكُل‘ ہے۔ ’أُكْلَة‘ ہے اور ’أَكَلَة‘ ہے۔ اس کے بعد ان چاروں کلموں کی تشریح فرمائی کہ ’أَكل‘ (کھانا) مصدر ہے، اور ’’أُكُل‘‘ جو کچھ کھاتے ہیں، ’’أَكَلَة‘‘ ایک بار ایک ہی دفعہ میں کھانا، اور ’’أُكْلَة‘‘ ایک نوالہ۔‘‘ (فوائد الفواد، جزو:۴،مجلس: ۳۷)

اختلاف قراءت

ایک مفسر کے لیے جن علوم سے آگاہی ضروری ہے، ان میں سے ایک 'علم اختلاف القرأت' بھی ہے۔ اہل عرب قرآن کی زبان سے آشنا تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ان کے مابین کسی لفظ کی قرات کے سلسلے میں اختلاف واقع ہو جاتا تھا، اس اختلاف کی نوعیت تضاد یا تخالف کی ہرگز نہیں تھی بلکہ ایسا عربی زبان کی وسعت اور گہرائی کی وجہ سے ہو جاتا تھا کہ ایک ہی لفظ دو مختلف طریقے سے پڑھا جا سکے۔ معنی و مفہوم کے لحاظ سے دونوں قرأتیں درست معلوم پڑتی تھیں۔ اس کی کما حقہ معرفت کے بغیر تفسیر قرآن کے سلسلے میں ٹھوکر کھا جانا یقینی ہے۔ فوائد الفواد سے اس کی دو مثالیں پیش ہیں جن سے اس فن پر حضرت محبوب الٰہی کی مہارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک روز مجلس میں تلاوت قرآن کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ فرمایا کہ میں نے یہ دو فائدے کسی کتاب میں دیکھے جو اور کہیں کم دیکھے ہیں۔ ایک اس آیت کے بارے میں 'وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا'' [الانسان:۲۰] امیر المومنین اسے 'مَلِكًا كَبِيرًا' (میم مفتوح اور لام مکسور) پڑھتے تھے۔ دوسرے اس آیت کے بارے میں ''لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ' [التوبۃ:۱۲۸] اس کو 'مِّنْ أَنفَسِكُمْ' پڑھا ہے۔

صوفیانہ نکتہ آفرینی

ایک مجلس میں تفسیر کشاف کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس کے حوالے سے فرمایا:

'الْحَمْدُ لِلّٰهِ' میں حسن بصری کی قرات 'الْحَمْدِ لِلّٰهِ' (دال کے زیر کے ساتھ) ہے۔ دال کو زیر انھوں نے لام مکسور سے متصل ہونے کی بنیاد پر دیا ہے اور لام کی حرکت مبنی ہے۔ ابراہیم کی قرات 'الْحَمْدُ لُلّٰهِ' (دال اور لام دونوں پر پیش کے ساتھ) ہے۔ انھوں نے لام سے اتصال کی بنیاد پر دال کو پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔ حسن بصری کی قرأت سے ابراہیم کی قرات بہتر ہے۔ کیوں کہ حسن بصری 'للہ' کے لام کی وجہ سے 'الحمد' کی دال پر زیر رکھتے ہیں اور للہ کے لام کی زیر مبنی ہے۔ جب کہ ابراہیم 'الحمد' کی دال پر پیش ہونے اور 'للہ' کی لام کے اس سے متصل ہونے کی وجہ سے لام پر بھی پیش لگاتے ہیں، کیوں کہ الحمد کی دال کی حرکت ایک عامل کی وجہ سے ہے اور وہ اعراب جسے کوئی عامل بدل دے، وہ مبنی کے اعراب سے قوی ہوتا ہے۔'' (۱)

---

(۱) فوائد الفواد کے زیر نظر نسخے میں قاری کا نام صرف 'ابراہیم' ہے اور آگے چل کر سلطان جی نے شک کے ساتھ یہ ذکر کیا ہے کہ یہ ابراہیم نخعی کی قراءت ہے یا کسی اور کی، واللہ اعلم۔ جب کہ کشاف میں ابراہیم بن ابی عبلہ صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ واللہ اعلم۔ کشاف کی اصل عبارت یہ ہے: ''وقرأ الحسن البصري: (الحمدِ لله) بكسر الدال لإتباعها اللام. وقرأ إبراهيم بن أبي عبلة: (الحمدُ لُله) بضم اللام لإتباعها الدال، والذي جسرهما على ذلك- والإتباع إنما يكون في كلمة واحدة كقولهم منحدر الجبل ومغيرة- تنزل الكلمتين منزلة كلمة لكثرة استعمالهما مقترنتين، وأشف القراءتين قراءة إبراهيم حيث جعل الحركة البنائية تابعة للإعرابية التي هي أقوى، بخلاف قراءة الحسن.'' (الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل، ج: ۱، ص: ۱۰)

مندرجہ بالا اختلاف قرأت بیان فرمانے کے بعد محبوب الٰہی نے ایک صوفیانہ نکتے کی طرف بڑے ہی خوبصورت پیرایے میں اشارہ فرمایا۔ کہتے ہیں:

''میں نے اس سے ایک نتیجہ نکالا ہے، وہ یہ ہے کہ 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہ' کی دال اس شخص کی مانند ہے جس کا کوئی پیر ہو اور وہ اس سے کہے اس طرح رہو، اس طرح رہو۔ اور للہ کا لام اس شخص کی مانند ہے جس کا کوئی پیر نہ ہو اور وہ جیسا ہے ویسا ہی رہے۔ (مرجع سابق، جزو: ۳، مجلس: ۱۱، ص: ۱۱-۵۰۹)

مباحث حدیث

حضرت محبوب الٰہی اپنی روحانی اور علمی عظمتوں کے باوصف احادیث رسول پر گہری نظر رکھنے والے محدث بھی تھے۔ آپ کی پیدائش بدایوں کی تھی جو علامہ رضی الدین صغانی مصنف مشارق الانوار جیسے نابغۂ روزگار کا مسکن تھا۔ آپ نے صغر سنی میں ان کے علم وفضل کے چرچے سنے تھے۔ دہلی منتقل ہونے کے بعد آپ نے مولانا کمال الدین زاہد جیسے نامور اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ آخر الذکر نے آپ کو باقاعدہ روایت حدیث کی سند بھی مرحمت کی جس کا متن سیر الاولیا میں درج ہے۔ (۱) ان اساتذہ کے فیض صحبت اور ازلی سعادت مندی کا ہی نتیجہ تھا کہ مشارق الانوار جیسا مجموعہ حدیث آپ کو ازبر تھا۔

تصنیف وتالیف کے عدم اہتمام کی وجہ سے آپ کی محدثانہ عظمت کما حقہ واضح نہیں ہوسکی۔ فوائد الفواد کے مرتب پر خدا رحمت کی بارش برسائے جن کی درویشانہ کاوش سے جہاں محبوب الٰہی کی بلند پایہ شخصیت کے دیگر علمی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، وہیں جابجا ایسے ملفوظات بھی شامل کتاب ہوگئے ہیں جن سے فن حدیث میں آپ کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فوائد الفواد میں اس حوالے سے جو نمونے درج ہیں ان کو درج ذیل خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

شرح الحدیث

شرح حدیث بڑا مہتم بالشان فن ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم افصح العرب تھے، جوامع الکلم سے آپ کی نصرت کی گئی تھی۔ بسا اوقات چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایسی قیمتی باتیں فرمادیتے جن کی تہ تک بآسانی نہیں پہنچا جاسکتا تھا، شرح حدیث ان ہی اسرار ومعانی کی نقاب کشائی کا نام ہے۔ اس کے لیے عربی زبان وادب پر مکمل عبور کے ساتھ مزاج نبوت سے آشنائی اور اصول کی گہری معرفت ضروری ہے۔ فوائد الفواد میں شرح الحدیث کی مثالیں جابجا بکھری ہوئی ہیں، جن کو دیکھ کر اس باب میں محبوب الٰہی کی مہارت بالخصوص احادیث کی صوفیانہ تشریح وتعبیر کے سلسلے میں آپ کے خصوصی منہج کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

- ایک روز مجلس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کا ذکر آیا:

''للصائم فرحتان، فرحة عند الافطار وفرحة عند لقاء الملك الجبار''

---

(۱) متن کی عربی عبارت کے لیے دیکھیے: سیر الاولیا، ص: ۱۷۹

(روزہ رکھنے والے کے لیے دوفرحتیں ہیں؛ایک فرحت افطار کے وقت کی اور دوسری فرحت اللہ سے ملاقات کے وقت کی)اس کے بعداس حدیث کی شرح فرمائی:

''افطار کے وقت روزے دار کی یہ فرحت کھانے پینے کی فرحت نہیں ہے، بلکہ روزہ پورا ہونے کی فرحت ہے۔یعنی جب روزہ پورا ہوجاتا ہے تو اس کو فرحت ہوتی ہے کہ الحمدللہ مجھ سے یہ چیز پوری ہوئی اورمیں دیدار خداوندی کی نعمت کا امیدوار بنا،اس کے بعد فرمایا کہ ہر طاعت کی ایک جزا مقرر ہے، چوں کہ روزے کی جزا دیدار الٰہی کی نعمت ہے اس لیے روزہ پورا ہونے پر روزہ دار اس نعمت کی امید سے خوش ہوتا ہے۔''(فوائدالفواد، جزو:۴،مجلس:۶۰،ص:۱۴۱۸)

● ایک مجلس میں اس موضوع پر گفتگو ہورہی تھی کہ ختم قرآن کے بعد سورۂ الحمد اور سورۂ بقرہ کی چند آیتیں پڑھتے ہیں،آپ نے حاضرین سے اس کے متعلق استفسار فرمایا، پھر خود ہی اس کا مفصل جواب عنایت فرمایا:

''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ سب سے اچھا آدمی کون ہے؟ فرمایا: **الحال مرتحل**۔(۱) حال اسے کہتے ہیں جو کسی پڑاؤ پر آکر اترے اور مرتحل اسے کہتے ہیں جو روانہ ہوجائے،اور یہ اشارہ اس طرف ہے کہ جب کوئی قرآن پڑھتا ہے اور ختم کرتا ہے تو گویا ایک منزل آکر اترتا ہے اور جب دوبارہ شروع کرتا ہے تو گویا دوبارہ روانہ ہوجاتا ہے۔پس انسانوں میں سے بہترین وہ شخص ہوتا ہے جو قرآن ختم کرتے ہی فوراً شروع بھی کردیتا ہے۔ایسے شخص کو رسول علیہ السلام نے '**الحال مرتحل**' کی صفت سے یاد فرمایا۔(مرجع سابق، جزو:۴،مجلس:۲۰،ص:۶۲۵)

● ایک روز دوران گفتگو یہ حدیث زیر بحث آئی: ایک قوم ہوگی جس کو زنجیر سے باندھ کر بہشت میں لے جائیں گے۔(۲) آپ نے فرمایا:اس حدیث کے بارے میں تین قول ہیں:

پہلا قول: وہ قوم یہی بچے ہیں کہ جنھیں زبردستی استاد کے پاس لے جاتے ہیں،اگرچہ کہ انھیں بہت ہی مشکل لگتا ہے لیکن پکڑ کر مسجد میں ہی لے جاتے ہیں پھر بتدریج حروف سے معنی تک پہنچتے ہیں اور معنی سے معنی کی گہرائی تک اور پھر اس سے بھی آگے۔

دوسرا قول: وہ لونڈی اور غلاموں کا گروہ ہے جسے زنجیر سے باندھ کر دارالحرب سے دارالاسلام لاتے ہیں۔

تیسرا قول: کل قیامت کے دن اللہ تعالی سے محبت کرنے والوں میں سے ایک گروہ کو بہشت میں جانے کا

---

(۱) عبارت حدیث: قال رجل: یا رسول اللہ أي العمل أحب إلی اللہ؟ قال: الحال المرتحل۔ قال: وما الحال المرتحل؟ قال: الذی یضرب من أول القرآن إلی آخرہ کلما حل ارتحل۔(ترمذی:۲۹۴۸)

(۲) متن حدیث یہ ہے:''عَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ: اسْتَضْحَكَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا فَقِيلَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللهِ، مَا أَضْحَكَكَ؟ قَالَ: قَوْمٌ يُسَاقُونَ إِلَى الْجَنَّةِ مُقَرَّنِينَ فِي السَّلَاسِلِ۔ مسند الامام احمد بن حنبل ۳۶/۵۳۹

حکم ہوگا۔ وہ کہیں گے ہم نے تیری پرستش جنت ودوزخ کے لیے نہیں کی، ہم نے تو تیری محبت کی وجہ سے یہ پرستش کی ہے۔ حکم ہوگا ٹھیک ہے، مگر دیدار اور وصال کا وعدہ بہشت ہی میں ہے، وہاں جاؤ تا کہ یہ وعدہ پورا ہو، وہ لوگ پھر بھی نہیں جائیں گے۔ اس کے بعد مقرب فرشتوں کو حکم ہوگا کہ نوری زنجیریں ان کے گلوں میں ڈالیں اور کھینچ کر جنت میں لے جائیں۔ (مرجع سابق، جزو: ۴، مجلس: ۲۴، ۵۳-۶۵۱)

● میر حسن نے دریافت کیا: کیا 'زر غبا تزدد حبا' رسول ﷺ کی حدیث ہے؟

فرمایا ہاں یہ حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمائی تھی۔ وہ ہمیشہ حاضر خدمت رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ناغہ کر کے آیا کرو۔ پھر لفظ ''غب'' کا لسانی پس منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا: بخار جو ایک روز آتا ہے اور ایک روز نہیں آتا اس کو غب کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا 'زر غبا' یعنی ایک روز آؤ اور ایک روز نہ آؤ۔ (فوائد الفواد، جزو: ۴، مجلس: ۵۰، ص: ۸۰۳۔ مسند ابوداؤد طیالسی ۴/ ۲۶۸)

● فرمایا کہ اس حدیث کی روایت دو طرح کی گئی ہے۔ ایک اس طرح کہ اس (دنیا) کے حلال کا حساب ہے اور حرام پر عذاب۔ یعنی جو کچھ حلال کمائی سے جمع کیا ہے اس کا حساب دینا پڑے گا۔ اور جو حرام سے کمایا ہے اس پر عذاب ہوگا۔ دوسری روایت اس طرح ہے کہ اس کے حلال پر عذاب ہوگا اور حرام پر بھی عذاب ہوگا۔ حرام پر عذاب تو کھلی ہوئی بات ہے لیکن اس کے حلال پر عذاب کیسے ہوگا؟ ارشاد ہوا کہ ایک شخص کو قیامت کی دھوپ میں کھڑا کیا جائے گا اور حساب مانگا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا، یہ عذاب ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ قول امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کا ہے کہ (دنیا کی دولت) حلال پر حساب ہے اور حرام پر عذاب ہے اور اس کی مشتبہ چیزوں پر عتاب۔ (مرجع سابق، جزو: ۱، مجلس: ۳۴، ص: ۲۶۹)

علم مختلف الحدیث

علوم احادیث میں علم مختلف الحدیث کی بڑی اہمیت ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کی دو حدیثیں بلحاظ مفہوم باہم متعارض ہو جاتی ہیں، ان کو دیکھ کر ذہن کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی تعارض نہیں ہوتا، ان میں تطبیق ممکن ہوتی ہے۔ محدثین کے یہاں تطبیق اور رفع تعارض کے اس عمل کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس فن سے منسلک محقق کے لیے روشن فہم، وسیع علم و تجربہ اور مہارت درکار ہے۔

● اب یہاں محبوب الٰہی کی ایک مجلس کا ذکر سنیے۔ آپ نے یہ دو حدیثیں بیان فرمائیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے ہمیشہ روزہ رکھا، اس نے نہ روزہ رکھا نہ افطار کیا۔ (۱)

اور دوسری حدیث میں آیا ہے جس نے ہمیشہ روزہ رکھا، اس پر دوزخ تنگ ہوگئی اور انھوں نے نوّے کی

---

(۱) حدیث کا متن اس طرح ہے: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ صَامَ الْأَبَدَ فَلَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ'' (سنن النسائی، باب ذکر الاختلاف علی العطاء فی الخبر ۴/ ۲۰۵)

گرہ لگائی۔(۱)

بظاہر دونوں حدیثوں کا مفہوم ایک دوسرے سے ٹکراتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ آپ نے معا بعد ہی اس کی خوب صورت تطبیق پیش فرمائی:

''جہاں یہ کہا گیا ہے کہ جس نے ہمیشہ روزہ رکھا، اس نے نہ روزہ رکھا نہ افطار کیا۔اس کے معنی اس طرح ہوں گے کہ جس نے پیوستہ روزے رکھے تو ان میں وہ پانچ روز دونوں عیدوں اور ایام تشریق کے بھی ہوئے۔ بس یہ ایسا ہوگا کہ اس نے نہ روزہ رکھا اور نہ افطار کیا۔اور جس نے متواتر روزے رکھے مگر ان پانچ روز افطار کیا (کھایا پیا) اس پر تنگ ہوگئی دوزخ، جس طرح نوّے کی گرہ، یعنی اس شخص کی گنجائش نہیں دوزخ میں جیسے کہ نوّے کی گرہ میں کسی چیز کی گنجائش نہیں ہوتی۔'' (مرجع سابق، جزو:۱، مجلس:۱۸، ص:۲۰۳)

علم اسباب ورود الحدیث

علوم حدیث کی اہم شاخوں میں سے ایک 'علم اسباب ورود الحدیث' بھی ہے۔ کسی بھی حدیث کے درست مصداق تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ اس کا پس منظر یا محرک طالب علم کے پیش نظر رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس موقع پر، کن حالات میں کس مقام پر کس تعلق سے کیا بات ارشاد فرمائی تھی۔ ان تمام پہلوؤں کو نظر انداز کرنے کی صورت میں بسا اوقات فہم حدیث میں نہ صرف دشواریاں پیش آتی ہیں بلکہ بعض دفعہ گمرہی کے دلدل میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

فوائد الفواد میں اس نوعیت کی متعدد مثالیں موجود ہیں جہاں محبوب الٰہی نے پہلے حاضرین کے سامنے حدیث بیان فرمائی، پھر اس کا پس منظر واضح کیا تاکہ مصاحبین حدیث کے اصل مفہوم سے آشنا ہو جائیں۔ اس کی دو مثالیں پیش ہیں۔

● ایک روز آپ کی مجلس میں صبر کا ذکر ہو رہا تھا، آپ نے فرمایا کہ صبر کے معنیٰ 'قید' کے بھی آتے ہیں۔ پھر اس معنی پر بطور استدلال نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث پیش فرمائی:

اصبروا الصابر واقتلوا القاتل (روکنے والے کو قید کرو اور قاتل کو قتل کرو)

اس کے بعد اس حدیث کا پس منظر بیان فرمایا: 'رسول علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانے میں کوئی شخص تلوار کھینچے کسی شخص کا پیچھا کر رہا تھا اور وہ شخص تلوار کشیدہ آدمی کے سامنے سے بھاگ رہا تھا۔ ایک شخص بڑھا اور اس نے بھاگنے والے کو پکڑ کر کھڑا کر لیا اور تلوار والے آدمی نے آکر بھاگنے والے کو قتل کر دیا۔ یہ خبر رسول علیہ الصلوۃ

---

(۱) حدیث کا متن اس طرح ہے: ''عَنْ أَبِي مُوسَى، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: »مَنْ صَامَ الدَّهْرَ ضُيِّقَتْ عَلَيْهِ جَهَنَّمُ هَكَذَا وَعَقَدَ تِسْعِينَ''مسند ابوداؤد الطیالسی، باب ابوالمجاز وغیرہ عن ابی موسی، ۱۴/ ۱/۴

والسلام کو پہنچائی گئی۔ حکم ہوا کہ جس شخص نے بھاگنے والے کو پکڑ کر روکا تھا، اس کو قید کر دو اور قاتل کو قتل کر دو۔ اس حکم کو اس عبارت میں ادا فرمایا کہ 'اصبروا الصابر و اقتلوا القاتل' روکنے والے کو قید کر دو اور قاتل کو قتل کرو۔''

(مرجع سابق، جزو ۴، مجلس: ۶۰، ص: ۸۴۳)

● محبوب الٰہی اپنے احباب کے ساتھ مجلس طعام میں حاضر تھے، کھانا سامنے لایا گیا، چاول بھی تھا، اسی موقع پر امیر حسن نے پوچھا کہ 'الأرز منی' (چاول میری طرف سے) حدیث ہے؟

فرمایا: ہاں حدیث ہے، ہوا یہ تھا کہ ایک دفعہ صحابہ نے کھانا تیار کیا، ہر شخص نے کوئی چیز اپنے ذمے لی، ایک نے کہا گوشت میری طرف سے، دوسرے نے کہا مصالحہ میری جانب سے، ہر شخص نے اسی طرح کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ 'الأرز منی' چاول میری طرف سے۔ (مرجع سابق، جزو: ۴، مجلس ۵۶، ص: ۸۳۱)

علمی دیانت

علم دریائے ناپیدا کنار ہے۔ اس کی وسعت اور گہرائی کا احاطہ انسانی وسعت سے باہر ہے۔ اس بساط عشق کے نو وارد اور منتہی ہر دو کو 'لا ادری' کہہ کر کمال عجز کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبان علم و عرفان نے بارہا سوالات کے جواب میں سکوت فرمایا تو کہیں صاف طور پر لاعلمی ظاہر کر دی، اس سے ان کے احتیاط و امانت داری کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت محبوب الٰہی ان ہی علمائے ربانیین میں سے ایک تھے، ہر قدم پر علمی دیانت اور دینی احتیاط جن کے پیش نظر ہوتی ہے۔

ایک روز آپ نے ایک حدیث ذکر فرمائی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیدتنا عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ 'سورج کے سامنے مت بیٹھو اس سے چہرے کی طراوت (تازگی) جاتی رہتی ہے۔'

دوسرے روز حضرت امیر حسن نے اس حدیث کی بابت دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا: یہ حدیث کسی کتاب میں نہیں دیکھی، البتہ مولانا علاؤالدین اصولی سے سنی ہے جو بدایوں میں میرے استاد تھے اور بڑے بزرگ اور کامل حال ہوئے ہیں۔ (مرجع سابق، جزو: ۴، ۳۴، ص: ۶۹۳)

آپ دیکھیں کس قدر سادگی کے ساتھ فرمایا کہ میں نے کسی کتاب میں یہ حدیث نہیں دیکھی بلکہ اپنے استاذ سے سنی ہے، ساتھ ہی اپنے استاذ کی ثقاہت اور علمی رتبے کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ ہر طالب علم کے سامنے احتیاط و امانت داری کا یہ نمونہ ہمہ وقت رہنا چاہیے۔

فوائد الفواد میں مذکور علما و مشائخ

سادات صوفیہ بالخصوص چشتی مشائخ کے ساتھ ایک بڑی زیادتی یہ ہوئی کہ ان کے تذکروں کو تحقیقی اصولوں کے ساتھ مدون کرنے کا ویسا اہتمام نہیں کیا گیا جیسا کیا جانا چاہیے تھا۔ فوائد الفواد بنیادی طور پر محبوب الٰہی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، لیکن اس میں متفرق طور پر صوفیہ کے تذکروں پر خاصا مواد آ گیا ہے۔ ان تذکروں کے ضمن

میں فطری طور پر سب سے زیادہ سلطان جی کے مرشد و مربی بابا فرید الدین گنج شکر کا ذکر ہے۔اسی طرح بدایوں کے علما،اساتذہ اور مشائخ ومجاذیب کا تذکرہ بھی تکریمی انداز میں کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ بڑی تعداد ایسے علما و مشائخ کی ہے جن کے حالات سے آگاہی کے لیے ہمارے پاس فوائد الفواد کے علاوہ کوئی قابل ذکر ماخذ دستیاب نہیں ہے۔جن مشائخ وعلما کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے چند کے اسما یہ ہیں: خواجہ قطب الدین بختیار کا کی،حمید الدین ناگوری، شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی، شیخ نجیب الدین متوکل،جلال الدین تبریزی،شیخ نظام الدین ابو المؤید، شیخ منہاج الدین سراج،امیر عالم ولوالجی،شیخ احمد معشوق،شیخ ابوسعید ابو الخیر،جمال الدین خطیب،مولانا علاء الدین اصولی،حمید الدین ناگوری،حافظ سراج الدین بدایونی،سیف الدین باخرزی،شیخ عثمان حرب آبادی علیھم الرحمہ۔

فوائد الفواد میں مذکور کتابیں

حضرت سلطان المشائخ کی مجلس سدا بہار تھی، یہاں ہر ذوق اور ہر میدان کے لوگ شریک ہوکر مستفیض ہو سکتے تھے۔آپ حاضرین کے ذوق طبع کے لحاظ سے سب کی ضیافت فرماتے۔جیسا کہ ماسبق میں مذکور ہوا کہ آپ نے اپنے پیر و مرشد سے بعض کتابوں کو سبقا سبقا پڑھا، آپ نے اپنی خانقاہ میں اسی علمی منہج کو اختیار کیا۔ چناں چہ فوائد الفواد میں کئی ایسے مسترشدین کا ذکر ہے جو باقاعدہ آپ سے دینی کتب کا درس لیتے۔بسا اوقات آپ خود بھی لوگوں میں علمی شوق ولگن جگانے کی خاطر مخصوص کتابوں کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔آپ کی ذکر کردہ کتابوں میں سے چند کے اسما یہ ہیں: قوت القلوب، احیاء العلوم،مکتوبات عین القضاۃ،عوارف المعارف، کشف المحجوب، مخ المعانی، روح الارواح،تفسیر بیضاوی وغیرہ۔

یہاں اس حقیقت کی نشاندہی لازم ہے کہ علم کے سلسلے میں سادات صوفیہ کا موقف یہ ہے کہ ہر اس علم کا سیکھنا یا کتاب کا پڑھنا افضل ہے جو اللہ سے قریب کرنے والا ہو جب کہ وہ تمام چیزیں جو دل کو یاد مولی سے غافل کردیں وہ ممنوع ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مشائخ اپنے معتقدین کو ان علما کی کتابوں کے درس و مطالعہ کی نصیحت کرتے جو عملی زندگی میں اسلامی افکار و کردار کے حامل ہوں۔سلطان جی فرماتے ہیں:

> جو بات کسی بزرگ اور صاحب نعمت سے سنی جائے اس کی لذت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔اگر وہی بات کسی اور سے سنی جائے تو کچھ مزا نہیں دیتی، گویا اس بات کا سرچشمہ معرفت کے نور سے روشن ہوتا ہے۔جس آدمی کے معاملات اچھے نہ ہوں،اس کی بات ذوق نہیں دیتی۔

(مرجع سابق، جزو:۲،مجلس:۲۶،ص:۳۹۳)

عرفانی اصطلاحات

تصوف علم الاقوال کے بجائے احوال،مواجید اور ذوقیات کا علم ہے۔اس کے فہم وادراک میں 'گفتن وشنیدن' سے کہیں زیادہ 'چشیدن' کی اہمیت ہے۔دوسرے تمام علوم وفنون کی طرح تصوف کی بھی اپنی اصطلاحات

اور تعبیرات ہیں۔ بسا اوقات ایک لفظ دوسرے فنون میں ایک خاص معنی میں استعمال ہوتا ہے جب کہ کتب تصوف میں اس کا محمل بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ان اصطلاحات کی معرفت کے بغیر عرفانی متون کی تفہیم وتشریح نہ صرف یہ کہ مشکل ہوتی ہے بلکہ بسا اوقات گمراہی کی طرف لے جانے والی ہوتی ہے۔ فوائد الفواد میں سلطان جی کی زبان مبارک سے بکثرت ایسے اصطلاحی کلمات کی تشریح وتعبیر منقول ہوئی ہے۔ جن سے چراغ راہ کا کام لیا جاسکتا ہے۔ یہاں ان میں سے چند مثالیں پیش ہیں۔

ولایت کی دو قسمیں

ولایت کی دو قسمیں ہیں؛ ایک ولایت ایمان اور دوسری ولایت احسان۔ ولایت ایمان: جو بھی مومن ہے وہ ولی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے: اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ [البقرة:۲۵۷]۔ ولایت احسان یہ ہے کہ کسی کو کوئی کشف وکرامت اور عالی مرتبہ حاصل ہوجائے۔

(مرجع سابق، جزو:۵، مجلس:۲۵، ص:۶۹۷)

بخیل، سخی اور جواد

’’دوسو درہم میں سے جو پانچ درہم دے تو بس یہ ہوتا ہے کہ اسے بخیل نہیں کہتے لیکن سخی بھی نہیں کہتے۔ سخی اسے کہتے ہیں جو مقرّرہ زکوۃ سے کچھ زیادہ دے۔ اس کے بعد سخی اور جواد کے درمیان فرق کو بیان فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ سخی وہ ہے جو زکوۃ سے کچھ زیادہ دیتا ہے لیکن جواد وہ ہے جو بہت دے۔ مثلا دوسو درم میں سے پانچ درہم پاس رکھے اور باقی دے ڈالے۔‘‘ (مرجع سابق، جزو:۳، مجلس:۹، ص:۴۹۱)

زکوۃ کی تین قسمیں

شیخ الاسلام بابا فریدالدین قدس سرہ العزیز نے فرمایا کہ زکوۃ تین طرح کی ہے، زکوۃ شریعت ہے، اور زکوۃ طریقت ہے اور زکوۃ حقیقت۔

زکوۃ شریعت: دوسو درم میں سے پانچ درہم دے دیں۔ زکوۃ طریقت: دوسو درم میں سے پانچ رکھیں باقی دے دیں۔ زکوۃ حقیقت: سب دے ڈالیں اور کچھ پاس نہ رکھیں۔ (مرجع سابق، جزو:۳، مجلس:۹، ص:۴۹۳)

ترک دنیا کی صوفیانہ تعبیر

ترک دنیا خانقاہی نظام تربیت کا پہلا سبق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرفانی متون میں جابجا اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ خاص طور سے چشتی مشائخ کے یہاں اسے قرب مولی کی کنجی اور محبت الٰہی کی اولین شرط قرار دیا گیا ہے۔

ترک دنیا درحقیقت کلمۂ طیبہ کے ’لا‘ کی عملی مشق ہے۔ مال ودولت اور رشتۂ وپیوند کے ان بتان وہم وگماں کی مکمل نفی کے بغیر ’الہ واحد‘ کی معرفت وقرب کا کوئی امکان نہیں۔ یہ تصور جوہری طور پر کتاب وسنت کے ان نصوص سے مستفاد ہے جن میں دنیوی زندگی کو لہو ولعب، زینت وتفاخر اور اموال واولاد کی کثرت کی ہوس سے تعبیر

کیا گیا ہے۔(۱) ظاہر ہے کہ جب کعبۂ دل دنیا کی محبت میں ڈوبا ہوا ہو تو عبادات کے ظاہری اہتمام اور نماز و روزہ کی کثرت سے صفائے باطن اور تنویر قلب ونگاہ کی امید کیوں کر رکھی جاسکتی ہے۔

فوائد الفواد میں حضرت محبوب الٰہی سے کسی بزرگ کا یہ قول منقول ہے کہ ''وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ نماز وروزہ اور تسبیح واوراد سب دیگ کے مسالے ہیں۔ اصل چیز دیگ میں گوشت ہوتا ہے، جب تک گوشت نہ ہو ان مسالوں سے کچھ نہیں بنتا۔ ان بزرگ سے پوچھا گیا کہ آپ یہ تمثیل اکثر بیان فرماتے ہیں، اس کی تشریح کردیجیے۔ انھوں نے فرمایا کہ گوشت ترک دنیا ہے اور نماز وروزہ اوراد وتسبیح اس کے مسالے ہیں، اول آدمی کو چاہیے کہ ترک دنیا اختیار کرے، اور اس کا تعلق کسی چیز سے نہ رہے۔ اگر وہ نفل نماز وروزہ کرے نہ کرے، کوئی مضائقہ نہیں، لیکن جب دنیا کی محبت دل میں ہوگی تو دعاؤں اور اوراد وغیرہ سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔''

سلطان جی مزید فرماتے ہیں:

''اگر کوئی اپنے دن روزے رکھ کر گذارے اور راتیں نماز پڑھتے بتائے اور حرمین کا زائر ہو، اصل بات جب ہوگی کہ دنیا کی محبت اس کے دل میں نہ ہو۔ اس کے بعد فرمایا جو شخص خدا کی محبت کا دعوی کرتا ہے اور دنیا کی محبت اس کے دل میں ہوتی ہے تو وہ اس دعوی میں جھوٹا ہے۔''

(مرجع سابق، جزو:۲، مجلس:۳۳، ص:۴۲۵)

تعبیرات کے ابہام یا بعض مغلوب الحال صوفیہ کے اقوال وافعال یا منکرین تصوف کی کرم فرمائیوں کے سبب ترک دنیا کا یہ خالص قرآنی تصور بھی سوء فہم کا شکار ہوا۔ جس سے شبہ در آیا کہ یہ کوئی سلبی رویہ ہے جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے، ترک دنیا زندگی کے معرکوں سے فرار کا نام نہیں ہے بلکہ مشاغل حیات میں انہماک رکھنے کے ساتھ باطن کو اس کی لذتوں میں مستغرق ہونے سے بچانے سے عبارت ہے۔ ترک دنیا یہ نہیں ہے کہ انسان ازدواجی تعلقات، کسب وتجارت، حرفت ودستکاری سے کنارہ کش ہوجائے۔ حضرت سلطان جی فرماتے ہیں:

''ترک دنیا یہ نہیں ہے کہ کوئی اپنے آپ کو ننگا کرلے مثلا لنگوٹی باندھ کر بیٹھ جائے، ترک دنیا یہ ہے کہ لباس پہنے اور کھانا کھائے، البتہ جو کچھ آئے اسے خرچ کرتا رہے، جمع نہ کرے، اور اس سے رغبت نہ رکھے اور دل کو کسی چیز سے اٹکائے نہ رکھے۔'' (مرجع سابق، ج:۱، مجلس:۶، ص:۶۳-۱۶۱)

یہاں دنیا سے حضرات صوفیہ کی مراد کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ یہی وہ نقطہ ہے جہاں معمولی ابہام بھی غلط فہمیوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ حضرت محبوب الٰہی نے فوائد الفواد میں اس سوال کا بے حد دل نشیں اور معقول جواب عنایت فرمایا:

''ایک ظاہر اور باطن دونوں میں دنیا ہے، ایک ظاہر اور باطن دونوں لحاظ سے دنیا نہیں ہے، ایک ظاہر میں

---

(۱) آیت یہ ہے: ''اِعْلَمُوْا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ'' [الحدید:۲۰]

دنیانہیں ہےلیکن باطن میں دنیا ہے،اورایک ظاہر میں دنیا ہےلیکن باطن میں دنیانہیں ہے۔اس کے بعد اس کی تفصیل بیان فرمائی کہ جوصورت اور معنی میں دنیا ہے،وہ کیا ہے؟ ہر وہ چیز جوضرورت سے زیادہ ہو، دنیاہےاور جوصورت اور معنی میں دنیانہیں ہے وہ خلوص کے ساتھ طاعت ہے۔اور جوصورت میں دنیا نہیں ہےاور معنی کےاعتبار سے دنیا ہے۔ وہ ایسی طاعت ہے جوریا کاری سے ہو(کوئی) فائدہ اٹھانے کے لیےاور جوصورت میں دنیا ہے مگر معنی میں دنیانہیں ہے وہ اپنی بیوی کا حق زوجیت ادا کرنا ہے یعنی اپنی بیوی سے اس نیت سے صحبت کرنا کہ اس کا حق ادا کرنا ہو، یہ فعل اگر چہ صورت کے اعتبار سے دنیا ہےلیکن معنی کےاعتبار سے دنیانہیں ہے۔‘‘(فوائد،ج،۴،مجلس:۱۲،ص:۵۸۳۔۸۵)

ایک واقعہ

اسی ضمن میں فوائدالفواد میں ایک دل چسپ حکایت بھی منقول ہے۔’’ایک دفعہ حضرت عیسی علیہ السلام کسی سوتے (آدمی) کے سرہانے پہنچے۔انھوں نے اس سونے والے کو پکارااور کہااٹھوخدا کی عبادت کرو!اس شخص نے جواب دیا کہ میں نے خدا کی ایسی عبادت کی ہے جوسب سے اچھی عبادت ہے۔حضرت عیسی علیہ السلام نے پوچھاکون سی عبادت کی ہے؟ بولا: **ترکت الدنیا لأهلها** میں نے دنیا کو دنیا داروں کے لیے چھوڑ دیا ہے۔اس وقت فرمایا: **من رضي الله تعالی بقلیل من الرزق رضي الله عنه بقلیل من العمل**۔ جوشخص اللہ تعالی سے کم رزق پر راضی ہوجا تا ہے، اللہ تعالی اس سے کم عمل پر راضی ہوجا تا ہے۔‘‘ (مرجع سابق، جزو:۵،مجلس:۴،ص:۸۹۵)

تمثیلات

حضرت سلطان المشائخ مکمل طور سے قرآنی اور حدیثی منہج پر کاربند تھے۔آپ کا انداز گفتگوشیریں، اسلوب سادہ، لہجہ دل پذیراورالفاظ شستہ وسہل ہوتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ فوائدالفواد کے مطالعہ کے دوران قاری اکتاہٹ کا شکارنہیں ہوتا۔ایسامحسوس ہوتا ہے جیسے دریا کا صاف وشفاف پانی اپنی طبعی روانی کے ساتھ نشیب کی طرف بہ رہاہو یا جیسے دل کی گہرائی سے کوئی بات نکلی ہواور سامنے موجود ہر شخص کے دل میں براہ راست داخل ہوگئی ہو۔

اسی قرآنی وحدیثی منہج کے تتبع کا نتیجہ تھا کہ بسااوقات آپ کوئی بات سمجھانے کے لیے دلنشیں مثالوں اور حکایتوں سے مدد لیتے تاکہ سامعین پر آپ کا مافی الضمیر خوب خوب واضح اوراس کا مفہوم ان کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجائے۔ یہاں فوائدالفواد سے دومثالیں پیش کی جاتی ہیں جس سے آپ کے اعلی ذوق جمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

راہ سلوک کی لغزشوں کی مثال

ایک مجلس میں آپ نے راہ سلوک کی لغزشوں کی سات قسمیں بیان کیں، اعراض، حجاب، تفاضل، سلب مزید، سلب قدیم، تسلی، عداوت۔ پھران قسموں کودرج ذیل مثال سے واضح کیا:

’جیسے دو دوست ہوں، عاشق اور معشوق ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہوں، اس درمیان اگر عاشق سے کوئی حرکت یا کام یا بات یا فعل ایسا ہوجائے جو اس کے دوست کی پسند کا نہ ہو تو وہ دوست اس سے اعراض کرتا ہے، یعنی منہ موڑ لیتا ہے۔ پس عاشق پر واجب ہے کہ اسی وقت استغفار میں مشغول ہوجائے اور معذرت چاہے اور یقیناً اس کا دوست اس سے راضی ہوجائے گا۔ تھوڑی سی بے توجہی جو ہوئی تھی جاتی رہے گی۔ اور اگر وہ محبت کرنے والا اس خطا پر اصرار کرے گا اور عذر پیش نہیں کرے گا۔ تو وہ اعراض حجاب تک پہنچ جائے گا۔ معشوق ایک حجاب درمیان میں لے آئے گا۔ جیسے ہی خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر اس بات پر پہنچے ہاتھ اونچا کیا اور آستین چہرۂ مبارک کے سامنے کرلیا اور فرمایا کہ مثلاً اس طرح کا حجاب محب اور محبوب کے درمیان ہوجائے گا۔ پس محب پر واجب ہوگا کہ معذرت کی کوشش میں رہے اور توبہ کرے، اور اگر اس معاملے میں سستی کرے گا تو وہ حجاب تفاصل میں بدل جائے گا۔ کیا ہوگا؟ یہ کہ وہ دوست اس سے جدائی اختیار کرلے گا۔ پس شروع میں اعراض سے زیادہ نہیں تھا، چوں کہ معافی نہیں چاہی، حجاب ہوگیا اور جب اس ناپسندیدگی پر اڑا رہا تو تفاصل ہوگیا۔ اگر اس کے بعد بھی وہ دوست معافی نہ مانگے تو سلب مزید واقع ہوگا یعنی اس کے اوراد اور طاعت وعبادت کے ذوق میں جو بڑھت تھی وہ واپس لے لی جائے گی۔ پس اگر اس پر بھی عذر نہ کرے اور اس ہٹ دھرمی پر جما رہے تو سلب قدیم ہوگا کہ وہ طاعت اور وہ راحت جو ’’مزید‘‘ سے پہلے میسر تھی، وہ بھی چھن جائے گی، پس اگر یہاں بھی توبہ میں کسر رہ جائے تو اس کے بعد تسلی ہوگی۔ تسلی کسے کہتے ہیں؟ یعنی اس کے دوست کا دل اس کی جدائی پر مطمئن ہوجاتا ہے۔ پس اگر پھر بھی توبہ میں سستی ہو تو عداوت پیدا ہوجاتی ہے، اور محبت جو تھی وہ عداوت میں بدل جاتی ہے۔‘‘ (مرجع سابق، جزو:۱، مجلس:۱۶، ص:۹۱-۱۸۹)

درجات توکل کی مثال

پہلا درجہ: جیسے کوئی شخص اپنے دعوے کے لیے کسی کو اپنا وکیل کرے اور وہ وکیل عالم بھی ہو اور مؤکل کا دوست بھی۔ پس اس مؤکل کو اطمینان رہے گا کہ میرا وکیل اپنے کام اور مقدمہ میں ہوشیار بھی ہے اور میرا دوست بھی ہے، اس صورت میں توکل بھی ہے اور سوال بھی۔ کیوں کہ کبھی کبھی وہ اپنے وکیل سے یہ بھی کہے گا کہ اس دعوے میں اس طرح جواب دینا اور اس کام کو اس طرح پورا کرنا۔

دوسرا درجہ: جیسے کوئی دودھ پیتا بچہ ہو کہ اس کی ماں اس کو دودھ پلاتی ہے۔ اس کو محض توکل ہوتا ہے، سوال نہیں ہوتا۔ بچہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے فلاں وقت دودھ دینا، بس رونے لگتا ہے اور تقاضا نہیں کرتا اور یہ نہیں کہتا کہ مجھے دودھ دو، اپنی ماں کی شفقت پر اسے بھروسہ ہوتا ہے۔

تیسرا درجہ: اس کی مثال غسل میت دینے والے کے سامنے مردے کی سی ہے۔ مردہ نہلانے والے سے کوئی سوال نہیں کرتا اور اس سے کوئی حرکت سرزد نہیں ہوتی۔ نہلانے والا جس طرح بھی اسے ضرورت ہوتی ہے اسے پھیرتا اور نہلاتا ہے۔ توکل کا تیسرا مرتبہ یہی ہے اور یہ مرتبہ اعلی اور بلند ہے۔ (مرجع سابق، جزو: ۲ مجلس: ۹ ص: ۱۹۔۳۱۷)

سوال و جواب کے خوب صورت نمونے

بہترین مجلس وہ ہے جہاں ترسیل فکر کے عمل میں متکلم کے ساتھ سامعین بھی برابر کے شریک ہوں، متکلم کے بے دریغ اور مسلسل بولتے رہنے سے سامعین کے اندر اکتاہٹ آ جاتی ہے جس کا سب سے منفی اثر اس فکر کی ترسیل و تفہیم پر پڑتا ہے جسے وہ دوسروں تک منتقل کرنا چاہتا ہے۔ فوائد الفواد کے مطالعہ کے دوران قاری کو اس کا یہ پہلو بطور خاص متاثر کرتا ہے۔ سلطان المشائخ کی مجلسِ وعظ کی ان عام مجالس کی طرح نہیں ہوتی تھیں جہاں ایک شخص کسی موضوع پر مسلسل بولتا چلا جائے بلکہ وہ دل نواز محفل مکالمہ ہوتی تھیں جہاں حاضر باشوں کو کھلی اجازت تھی کہ وہ کسی دینی یا روحانی مسئلے کی بابت شیخ سے رہنمائی طلب کر سکیں یا زیر بحث کسی مسئلے کے تشنہ پہلوؤں کے بارے میں بے جھجک استفسار کر سکیں۔ اس پوری مجلس میں سلطان المشائخ کی حیثیت اس شفیق و مہربان معلم کی ہوتی جو طلبہ کی ذہنی سطح اور نفسیاتی کیفیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے لیے مسائل کے فہم کو ممکن بناتا ہے۔ آپ سائل کے حسب حال کبھی چند لفظوں میں تو کبھی مفصل جواب عنایت فرماتے البتہ اگر سوال نامناسب ہوتا تو حکمت وشفقت کے ساتھ تنبیہ فرما دیتے۔ فوائد الفؤاد میں اس نوعیت کی مثالیں بکثرت بکھری پڑی ہیں۔ ان میں سے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

کیا اہل ایمان قیامت میں دیدار الٰہی سے مشرف ہوں گے؟

میر حسن نے دریافت کیا کہ کیا کل قیامت کے دن مومنوں کو دیدار الٰہی کی نعمت ملے گی؟ فرمایا: ہاں۔ پھر پوچھا کہ اس کے بعد دوسری نعمتوں کی طرف نہیں دیکھیں گے؟

ارشاد فرمایا: جب اس نعمت کا مشاہدہ کرلیں گے تو کئی ہزار سال تک حیرت میں رہیں گے۔ اس موقع پر زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ بڑی کم نظری ہوگی کہ اس کے بعد کسی اور چیز کو دیکھیں۔ (مرجع سابق، جزو: ۵ مجلس: ۲۲ ص: ۹۷۹)

من لیس لہ شیخ فشیخہ الشیطان حدیث ہے؟

مولانا سراج الدین نامی کسی شخص نے سوال کیا: **من لیس لہ شیخ فشیخہ ابلیس** (جس کا کوئی پیر نہیں ہوتا، اس کا پیر شیطان ہوتا ہے۔) حدیث ہے؟ فرمایا: یہ مشائخ کا قول ہے۔

من لم یر مفلحا حدیث ہے؟

مولانا سراج الدین نے پھر پوچھا: کیا 'من لم یر مفلحا لا یفلح ابدا' حدیث ہے؟ فرمایا، یہ بھی مشائخ کا قول ہے۔

قبروں پر قرآن کی آیت لکھنا کیسا ہے؟

میر حسن نے قبروں پر قرآن اور دعائیں لکھنے کی بابت پوچھا، فرمایا: نہیں لکھنا چاہیے اور کفن کے کپڑے پر بھی نہیں لکھنا چاہیے۔ (مرجع سابق، جزو:۱۵، ص:۷۹۴)

معراج کی کیفیت کیا تھی؟

حاضرین میں سے کسی نے پوچھا معراج کی نوعیت کیا تھی؟

فرمایا: مکہ سے بیت المقدس اسرا تھا اور بیت المقدس سے پہلے آسمان تک معراج تھی اور پہلے آسمان سے قاب قوسین کے مقام تک اعراج!

انھوں نے عرض کیا کہ کہتے ہیں کہ جسم کو بھی معراج ہوئی اور روح کو بھی، ہر ایک کو کس طرح ہو سکتی ہے؟ ان کے اس دوبارہ سوال پر آپ نے یہ مصرع ارشا فرمایا:

فظن خیرا و لا تسأل عن الخبر

یعنی اچھا گمان رکھو اور تحقیق حال میں مت لگو۔

اس پر بھی ایمان رکھنا چاہیے اور زیادہ تحقیق و تفتیش میں نہیں پڑنا چاہیے۔ (مرجع سابق، جزو:۴، مجلس:۵۸، ص:۷۸۳)

قبر کا تعویذ دوبارہ بنانا کیسا ہے؟

میر حسن نے دریافت کیا کہ قبر کا جو تعویذ بناتے ہیں، اگر وہ خستہ ہو جائے تو دوبارہ بنانا کیسا ہے؟ ارشاد فرمایا: نہیں، جو قبر خراب ہو جائے اس کی پھر تعمیر نہیں کرنی چاہیے، جس قدر فرسودگی زیادہ ہوگی، رحمت کی امید بھی زیادہ ہوگی۔ (مرجع سابق، جزو:۴، مجلس:۶۷، ص:۸۶۹)

جہاں موت آئے وہیں دفن کر دینا بہتر ہے

میر حسن نے سوال کیا: لوگ لشکر میں جاتے ہیں، مجھے خیال آتا ہے کہ اگر مجھے کوئی واقعہ پیش آ جائے تو خدمت گاروں کو وصیت کر جاؤں کہ جہاں واقعہ پیش آئے، وہیں دفن کر دیں۔ مردے کو دور دراز سے شہر میں لانا بہت بے ذوقی معلوم ہوتی ہے۔

ارشاد فرمایا: یہی اچھا ہے کہ جہاں کسی کی وفات ہو اسی جگہ دفن کر دیں۔ مگر یہ جو امانت رکھتے ہیں اور پھر قبر میں سے نکالتے ہیں، یہ پسندیدہ نہیں ہے۔ زمین خدائے عزوجل کی ملکیت ہے، امانت کیا ہوتی ہے۔ البتہ ایسی زمین سے جو کسی اور کی ملکیت ہو تو وہاں سے نکال کر لانا جائز ہے، مگر شہر سے جو لشکر جاتے ہیں درمیان میں بہت زمین ہوتی ہے۔ اس سے بہتر بات اور کوئی نہیں کہ جہاں وفات ہو وہیں دفن کر دیں۔ مسافرت میں جسے موت آ جاتی ہے اور وہیں اسے دفن کر دیا جاتا ہے تو جس قدر فاصلہ اس کے اور گھر کے درمیان ہوتا ہے، بہشت میں اس کو اتنی ہی زمین دی جاتی ہے۔ (مرجع سابق، جزو:۴، مجلس:۵۰۳، ص:۷۰۱-۶۹۹)

تراویح کس کی سنت ہے؟

میر حسن نے دریافت کیا: تراویح رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے یا صحابہ کی؟
ارشاد فرمایا: صحابہ کی سنت ہے۔ ایک روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین رات ادا فرمائی اور دوسری روایت کے مطابق ایک رات۔ لیکن اس کی پابندی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں کی۔
(مرجع سابق، جزو: ۴، مجلس: ۳۳، ص: ۶۸۹)

صحابہ کی سنت کو سنت کہا جا سکتا ہے؟

حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ کیا صحابہ کی سنت کو بھی سنت کہتے ہیں؟ فرمایا: ہمارے مذہب میں کہتے ہیں لیکن امام شافعی کے مذہب میں سنت صرف وہی ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا ہے۔ (مرجع سابق، جزو: ۴، مجلس: ۳۳، ص: ۳۸۹)

بندے اور خدا میں کیا نسبت؟

ایک شخص نے سوال کیا کہ حضرتِ عزت کی عظمت اور پاکی بے انتہا اور فرزند آدم ایک ادنی مقام پر؛ ایسے میں محبت اور قربت کی کیا نسبت؟
ارشاد فرمایا: یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے اور یہ مسئلہ بحث کا بھی نہیں ہے۔ (مرجع سابق، جزو: ۴، مجلس: ۴۳، ص: ۶۱۷)

حالت خوف کا ایمان معتبر نہیں

ایک روز مجلس میں خوف کے ایمان کا تذکرہ ہوا۔ ارشاد فرمایا: کافر لوگ مرتے وقت عذاب کو دیکھ لیں گے اس وقت ایمان لائیں گے۔ یہ ایمان کسی حساب میں نہیں، کیوں کہ یہ ایمان بالغیب نہیں۔ اگر مومن مرتے وقت توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، لیکن کافر لوگوں کا مرتے وقت کا ایمان قبول نہیں ہوتا۔ (مرجع سابق، جزو: ۲، مجلس: ۴، ص: ۲۸۷)

بعض اولیا کو دنیا ہی میں مشاہدے کی نعمت مل جاتی ہے؟

کسی نے سوال کیا کہ کیا بعض اولیا ایسے ہوتے ہیں جن کو یہیں مشاہدے کی نعمت مل جاتی ہے؟ فرمایا: ہاں! لیکن یہ نعمت وہ اس وقت دیکھتے ہیں، جب وہ کمال کو پہنچتے ہیں تو پھر بالکل اس سونے والے کی مانند ہوتے ہیں کہ جو نیند سے بیدار ہو تو اپنے معشوق کو اپنے بستر پر پائے۔ اس حدیث کے موافق کہ **الناس نیام فاذا ماتوا انتبھوا** یعنی ساری خلقت نیند میں ہے جب موت آئے گی تو بیدار ہو گی، یعنی یہاں جو جس طلب میں مستغرق ہے، مرنے کے بعد اس کا مطلوب اس کو ملے گا۔ (مرجع سابق، جزو: ۲، مجلس: ۵: ص: ۲۹۵)

رازوں کو چھپانے کی حکمت

میر حسن نے عرض کیا کہ بزرگوں میں سے اکثر اپنے احوال کو پوشیدہ رکھتے ہیں، اس میں کیا حکمت ہے؟
ارشاد ہوا کہ اگر راز کو فاش کر دیں تو دوسرے راز کے محرم بننے کے قابل نہ رہیں۔ اگر ایک آدمی دوسرے سے راز کہتا ہے اور راز سننے والا اس کو ظاہر کر دیتا ہے تو وہ راز بتانے والا پھر دوسرا راز نہیں بتائے گا۔

اس پر میر حسن عرض گذار ہوئے کہ خواجہ ابوسعید ابوالخیر بہت دفعہ غیب کی باتیں زبان پر لاتے تھے؟ فرمایا کہ جس وقت اولیا شوق کے غلبے میں ہوتے ہیں تو بے خودی کے عالم میں کچھ کہہ دیتے ہیں، البتہ جو کامل ہیں وہ اسرار میں سے کوئی چیز ظاہر نہیں کرتے۔ ع۔ مرداں ہزار دریا خوردند وتشنہ رفتند

پھر فرمایا کہ بہت بڑا حوصلہ چاہیے کہ راز کے قابل ہو سکے اور اس کے لیے اصحاب صحو ہیں۔

(مرجع سابق، جزو:۱، مجلس:۱۱، ص:۱۷۵)

اسراف کی حد کیا ہے؟

میر حسن نے پوچھا: اسراف کیا ہے اور اسراف کی حد کیا ہے؟ فرمایا: جو چیز بغیر نیت کے دی جائے اور اللہ کے واسطے نہ دی جائے وہ اسراف ہے۔ اگر ایک دانگ بھی دیں گے تو اسراف ہوگا اور جو کچھ رضائے حق کے لیے دیا جائے، چاہے ساری دنیا دے ڈالی جائے وہ اسراف نہ ہوگا۔

اسی مناسبت سے شیخ ابوسعید کے بارے میں فرمایا کہ ان کا خرچ بہت زیادہ تھا، ایک شخص نے ان کے سامنے یہ حدیث پڑھ کر سنائی کہ ''لا خير في الإسراف''۔ شیخ ابوسعید نے جواب دیا کہ 'لا إسراف في الخير' (خیر میں کوئی اسراف نہیں۔) (مرجع سابق، جزو:۴، مجلس:۵۲، ص:۸۱۱-۸۱۳)

حرف ختام

فوائد الفواد کے سرسری مطالعے سے یہ علمی مباحث سامنے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی مزید تحقیق و تفصیل کی ضرورت ہے۔ اس جہت سے فوائد الفواد کا تفصیلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور استیعاب و احاطے کے ساتھ ایک تفصیلی و تحقیقی مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ واللہ هو الموفق وعليه التكلان۔

کتابیات

عربی

القرآن الكريم۔ كلام الله

سنن النسائی، أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي (المتوفى: ۳۰۳ھ) الناشر: مؤسسة الرسالة - بيروت، طبع اول: ۱۴۲۱ھ - ۲۰۰۱

مسند الامام احمد بن حنبل، أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني (المتوفى: ۲۴۱ھ) الناشر: مؤسسة الرسالة، طبع اول، ۱۴۲۱ھ - ۲۰۰۱م

مسند ابی داؤد الطیالسی۔ أبو داود سليمان بن داود بن الجارود الطيالسي البصرى (المتوفى: ۲۰۴ھ) الناشر: دار هجر - مصر طبع اول: ۱۴۱۹ھ - ۱۹۹۹م

الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل، أبو القاسم محمود بن عمرو بن أحمد، الزمخشرى جار الله (المتوفى: ۵۳۸ھ) الناشر: دار الكتاب العربی - بيروت، طبع ثالث - ۱۴۰۷

فارسی

اخبارالاخیار(فارسی)شیخ عبدالحق محدث دہلوی،مطبع مجتبائی دہلی،۱۳۳۲ھ

سیر العارفین(فارسی)مولانا جمالی،مطبع رضوی دہلی باہتمام سید میر حسن،سن اشاعت ندارد

اردو

تاریخ مشائخ چشت،خلیق احمد نظامی،ادارہ ادبیات دلی،۱۹۸۰

حضرت نظام الدین اولیا:حیات اور تعلیمات،پروفیسر محمد حبیب،ناشر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی،دہلی ۱۹۷۲

سیر الاولیا،سید محمد بن مبارک کرمانی،ترجمہ:غلام احمد حریری،مشتاق بک کارنر،اردو بازار لاہور،سن اشاعت ندارد

شیخ نظام الدین اولیا،خلیق احمد نظامی،نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا،۱۹۹۴،دوسرا ایڈیشن

فوائد الفواد،جامع:خواجہ امیر حسن سجزی دہلوی،اردو ترجمہ:خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی،ناشر و تقسیم کار:خواجہ حسن ثانی نظامی،خواجہ ہال،بستی حضرت نظام الدین اولیاء،نئی دہلی،سن اشاعت:جنوری ۲۰۰۷

فوائد الفواد کا علمی مقام،مولانا سید اخلاق حسین قاسمی،مکتبہ اسعدیہ کراچی،۲۰۰۶

ملفوظاتی ادب کی تاریخی اہمیت،پروفیسر محمد اسلم،ادارہ تحقیقات پاکستان،دانش گاہ پنجاب،لاہور

(نوٹ:اس کتاب کے متعلقہ صفحات کا اسکین محترم راشد اشرف صاحب[کراچی]کے توسط سے دستیاب ہوا۔راقم اس علم دوستی پر ان کا شکر گزار ہے۔)

منثورات فارسی عہد خلجیہ۔مطالعۂ انتقادی،(پایان نامہ برای دریافت درجۂ دکتریٰ)سید محمد اسد علی خورشید بخشش فارسی،دانشگاہ اسلامی،علی گڑھ،۲۰۰۱

رسائل

'سلسلۂ چشتیہ کی مشہور کتاب فوائد الفواد:ایک تجزیاتی مطالعہ'مضمون نگار:مولانا احتشام الحق قاسمی،ص:۴۹ تا ۶۰ سہ ماہی تحقیقات اسلامی،علی گڑھ،شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۹۹

'تصویر امیر حسن علاء سجزی در تذکرہا و کتب تاریخی'،دکتر راجندر کمار،فصلنامۂ مطالعات شبہ قارہ،منبع:مطالعات شبہ قارہ،دانشگاہ سیستان و بلوچستان،سال دوم بہار ۱۳۸۹،شمارہ:۲

○○○

ڈاکٹر شبیب انور علوی

افضل الفوائد - ایک تعارف

حضرات صوفیہ ومشائخ کے ارشادات کو قلم بند کرنے کا سلسلہ تصوف وعرفان کی روایت سے بہت مضبوط رہا ہے۔ بزرگان دین اور اہل عرفان کے یہ ملفوظات نہ صرف ان کی تعلیمات کے ضمن میں ایک بے بہا دولت ہیں بلکہ ان سے ان کے ادوار کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی حالات اور رویوں کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے۔ عام طور پر ان ملفوظات کی اہمیت وسند بھی مسلم ہوتی ہے کیوں کہ مخلص اور بے ریا مریدین اور ان ملفوظات کو ضبط تحریر میں لانے والے مرتبین اور جامعین اپنے مرشدین ومشائخ سے جن باتوں کی سماعت کرتے ان کو بے کم وکاست قلم بند کرنے کو اپنے لیے دارین کی کامیابی اور صلاح وفلاح کا ضامن سمجھتے تھے اسی لیے کسی غلط بات کو نقل کرنے سے نہ صرف احتراز کرتے بلکہ اس کذب بیانی کو اپنے واسطے دونوں جہاں میں سب سے بڑا خسارہ جانتے تھے۔

بعض ملفوظات میں جو کہیں کہیں کچھ غلط بیانات اور نامناسب الفاظ آ گئے ہیں ان کی سب سے بڑی وجہ بعد کے نسخوں میں تحریفات وغیرہ ہیں ورنہ مرتب اور جامع ملفوظات کے اصل نسخے اس قسم کے غلط بیانات سے عام طور پر پاک ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں سلسلہ عالیہ چشتیہ کے بزرگوں کے ملفوظات میں سب سے اہم اور مروج ومقبول ملفوظ سلطان المشائخ حضرت سید محمد بدایونی معروف بہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی دہلوی کا، فوائد الفواد ہے جس کو ان کے مرید خاص حضرت سید امیر حسن علا سجزی (۷۳۸ھ) نے مرتب کیا تھا۔ اس امر کے اظہار میں خاکسار کو کوئی باک نہیں کہ برصغیر ہندو پاک میں جو مقبولیت اور عوام وخواص میں محبوبیت اور دلچسپی فوائد الفواد کو حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے بزرگ کے ملفوظ کو اس پیرایہ میں نہ ہو سکی۔ اس کی شاید دو وجوہات ہیں ایک تو حضرت محبوب الٰہی جیسی جاذب نظر وقلوب شخصیت تمام مشائخ چشتیہ میں منفرد رہی۔ دوسرے حضرت امیر خسرو جیسی عبقری اور مشہور زمانہ ہستی کا یہ ارشاد کہ کاش امیر حسن میری تمام تصانیف لے کر صرف یہ ایک اپنی تصنیف فوائد الفواد مجھے دیدیتے۔ اس ایک جملہ سے جہاں حضرت امیر خسرو کی اپنے شیخ قدس سرہ کے ارشادات مبارکہ سے غیر معمولی عشق اور والہانہ

شیفتگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہیں ان جیسی عظیم اور مشہور زمانہ شخصیت کا اس طرح خراج عقیدت، فوائد الفواد کی شہرت و مقبولیت اور ہر دل عزیزی و پذیری کا ضامن بھی ہو گیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں اس حقیقت کا بجا طور پر اظہار فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

''ایں سخن ناشی از غایت محبتی است کہ امیر خسرو را نسبت بہ پیر خود بود''۔

(اخبار الاخیار (فارسی) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مطبع مجتبائی۔ دہلی ۱۳۳۲ھ۔ ص۱۰۱)

حضرت امیر خسرو کو جو فنائیت، شیفتگی، اتحاد و یگانگت اپنے مرشد برحق کی ذات میں حاصل تھی وہ حضرت محبوب الٰہی کے کسی مرید، خلیفہ یا مسترشد کو ارزانی نہ ہوئی تھی۔ ان کا جیسا محرم راز، مرشد کامل کی خلوت وجلوت کا راز دار، ان کا مزاج داں بلکہ شخصیت کا سب سے بڑا شناسا بھی کوئی نہ تھا اور ان سب پر مستزاد کہ ان کے شیخ کے قلب ونظر میں جیسی ان کی وقعت و اہمیت اور مقام و مرتبہ تھا اس میں ان کا کوئی بھی برادر طریقت شریک و سہیم نہ تھا۔

خسرو اقلیم سخن کے نہ صرف اپنے عہد میں سب سے بڑے تاجدار تھے بلکہ آج تک علم و ادب سخن شناسی و سخن فہمی کے وسیع و عریض منظر نامہ پر ان جیسی جامع کمالات شخصیت کہیں نظر نہیں آتی ہیں۔ یہاں تک کہ خود حضرت محبوب الٰہی نے ان کے اس کمال کے بارے میں یہ فرمایا:

خسروؔ کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیت ملک سخن این خسرو راست
ایں خسرو ماست ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست

تقریباً آٹھ برس کی عمر سے حضرت محبوب الٰہی کے دامن فیض وارادت سے وابستہ ہونے والی شخصیت کن کمالات کی مالک بنی کہ حضرت محبوب الٰہی کی زبان مبارک سے بارہا اس حقیقت کا اظہار ہوا کہ اے ترک من از خود تنگ آیم اما از تو تنگ نہ آیم''۔ میرے ترک! میں کبھی کبھی (انقباضی حالت میں) اپنی ذات سے تنگ آجاتا ہوں مگر تجھ سے کبھی نہیں تنگ آتا۔ (ایضا ص۱۰۰)

مرشد کامل سے یہ والہانہ محبت و شیفتگی آخر کو اس منتہائے کمال پر پہونچ گئی جس کا ایک عالم گواہ ہے اور امیر خسرو کو بھی چارونا چار اس کا اظہار کرنا پڑا۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

افضل الفوائد کے قلمی نسخے بھی مختلف کتاب خانوں میں ملتے ہیں۔ اس کا شاید قدیم ترین نسخہ ۱۳۰۴ھ میں مطبع رضوی، دہلی سے شائع ہوا تھا۔ ۱۹۶ صفحات پر مشتمل اس قدیم مطبوعہ نسخہ کی حیثیت بھی اب مخطوطہ کی ہو گئی ہے۔

۱۳۱۳ھ میں ہی اس کا اردو ترجمہ مولوی مولا بخش چشتی نظامی نے احسن الشواہد کے نام سے کیا تھا جو اس کے دوسرے حصہ کا اردو ترجمہ مطبع مجتبائی دہلی سے ۱۳۳۴ھ میں منظر عام پر آیا تھا۔

اسی سال مطبع رضوی میں طبع ہوا تھا۔علاوہ ازیں ۱۳۵۷ھ میں لاہور کے اللہ والے کی قوم دکان سے بھی ایک ترجمہ کی اشاعت ہوئی تھی۔ جہاں تک اس خاکسار کا محدود علم گواہی دیتا ہے اس کا آخری بار اردو ترجمہ لطیف ملک صاحب نے ۱۹۶۱/ ۱۳۸۰ھ میں لاہور سے کر کے شائع کیا تھا۔موصوف کی صراحت کے مطابق انہوں نے سابقہ اردو تراجم کو سامنے رکھ کر اسے ترتیب دیا تھا۔

راقم کے شعبۂ فارسی کے اولین فاضل اساتذہ کرام میں ڈاکٹر وحید مرزا صاحب تھے جنہوں نے حضرت امیر خسرو دہلوی پر انگریزی میں پہلا محققانہ و فاضلانہ کام کیا تھا۔انہوں نے اسی قدیم ۱۳۰۴ھ کے مطبوعہ نسخہ سے استفادہ کیا تھا جس کے شواہد ان کی تصنیف میں موجود ہیں، آئندہ صفحات میں اس اہم ملفوظ کا ایک تعارف درج کیا جا رہا ہے۔

افضل الفوائد دو جلدوں میں منقسم ہے۔بعض تذکرہ نگاروں نے دوسرے حصہ کو ایک الگ تصنیف کا نام دے دیا جو درست نہیں ہے حالاں کہ اس کے آغاز ہی میں اس کے نام اور جلد کی صراحت موجود ہے۔راقم سطور ابتدائی و آخری سطور کے اندراج کے بعد (تا کہ جامع ملفوظ کے زبان و بیان اور طرز نگارش کا اجمالی خاکہ قارئین کے ذہن میں مرتسم ہو سکے) اس کے مضامین مع فہرست پیش کر رہا ہے۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ایں گوہر گنج علوم غیبی و ایں درآثار زواہر لاریبی از خزانۂ دل خواجۂ راستان ملک المشائخ و الارضین قطب الوقت مجمع الاسناد و الارشاد حجۃ اللہ علی العباد مبین الفرع والاصول الجامع بین المعقول والمنقول علم البلاغۃ نظم الحق والشرع والدین شیخ الاسلام والمسلمین وارث الانبیاءَ والمرسلین متع اللہ المسلمین بطول بقائہ وادام علینا نعمۃ لقائہ۔خص اللہ تعالیٰ اسلافہ بالفر والاکرام والرضوان القام بحرمت محمد علیہ افضل الصلوٰت والسلام۔آمین رب العالمین جمع کردہ آمد۔انچہ از زبان شمع جمع ملوک از لفظ ایشاں ومعانی آں کہ بسمع رسید بقدر فہم خود درین مجموعہ کہ نام اوراست افضل الفواید نبشتہ آمد مشتمل بر تواریخ مختلف بہر محلی کہ بخدمت پیوستہ شدہ است ۔۔۔۔۔۔۔۔و چہارم روز یکشنبہ ماہ ذی حجہ سنۃ ثلث عشر و سبعمأۃ بندہ ضعیف نحیف کہ یکی از بندگان درگاہ ملک المشائخ فی الارضین است خسرو لاچین کہ جامع ایں معانی ست، دولت پائے بوس آں قطب عالم حاصل کرد ہماں زماں کلاہ چہارترکی بر سر بندہ نہاند و بشرف بیعت مشرف گردایندند۔الحمد للہ علی ذالک (۱) ۔۔۔۔۔۔۔بعد ازاں خواجہ ذکر اللہ بالخیر روئے سوئے حاضراں کرد کہ چناں چہ امروز یکجا ایم وفردا یکجا خواہیم خاست آں گاہ چوں خواجہ ایں سخن بر لفظ مبارک راند بندہ وعزیزان دیگر روی بر زمین آوردند عرض نمودند کہ مولانائی شہاب الدین میرٹھی

(۱) افضل الفواید (فارسی)، امیر خسرو دہلوی، مطبع رضوی، دہلی ۱۳۰۴ھ، ص: ۲

انصاری کہ یکی از بندگان مخدوم است بیتے نوشتہ است اگر فرماں شود بگویم فرمود بگو۔

من از تو ہیچ مرادی دگر نمی خواہم
ہمیں قدر بکنی کز خودم جدانہ کنی(۱)

دوسری جلد کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم-این انوار و اسرار الٰہی و ایں آثار و اخبار نامتناہی از انفاس متبرکہ خواجہ راستان الکلام فی الارضین ختم المشائخ والاولیاء وارث اہل السلوک والانبیاء تاج المحققین برھان العاشقین نظام الحق والشرع والدین ادام اللہ تقواہ۔ چنانچہ بخدمت پیوستہ شدہ است بتاریخ مختلف دریں فواید دیگر بنشتہ آمد فہرست بتاریخ روز دوشنبہ بستم ماہ رجب قدر سنتہ تسع وعشر وسبعمائہ سخن در ذکر آفرینش مہتر آدم وفواید دیگر افتادہ بود۔ بندہ گنہگار امیدوار رحمت پروردگار خسرو لاچین کہ یکی از بندگان سلطان المشائخ و اولیاست۔ بتاریخ مذکور دوست پابوس حاصل کرد۔ عزیزان اہل صفہ بخدمت حاضر بودند سخن در انبیاء گذشتہ می رفت بر لفظ مبارک راند تا چہ ایام باراحت بود کہ قطب حضرت ایشاں بودند چوں خواجہ ذکر اللہ بالخیر دریں حرف رسید بندہ برخاست روی برزمین آورد ایستادہ عرضداشت کرد خواجہ بندہ نواز مرحمت فرمود و برلفظ مبارک راند کہ بنشین ہر چہ گفتار است بگو۔ برحکم فرمان باردوم بندہ روئے برزمین آورد فرمان شد کہ بگو التماس کردم کہ پیش ازیں بندہ از زبان مخدوم بندہ نواز ہر چہ شنیدہ است آنرا در قلم آوردہ است و جلدی مرتب کردہ نام افضل الفواید کردہ بشرف نظر منظور گشتہ پس دریں وقت نیز اگر بمرحمت فرمان شود ہر چہ از زبان مخدوم شنیدہ آمد در سلک تحریر کشیدہ آید تا دو جلد مرتب گردد (ایضا، جلد دوم، ص: ۱۳۰)۔

جلد دوم کا اختتام اس غزل اور اس کے بعد ذیل کی عبارت پر ہوتا ہے۔

آں مطرب از کجاست کہ برگفت نام دوست
تا جان و جامہ پارہ کنم من بنام دوست
دل زندہ می شود بہ امید وفای یار
جاں رقص می کند بسماع کلام دوست
تا نفخ صور باز نیاید بخویشتن
ہر کو فتادہ مست ز شربت بجام دوست

بعد ازاں فرمود کہ ہمیشہ دوستی انبیاء در دل مومن بہتر از عبادت ہزار سال است پس مردم می باید کہ در ذکر ایشاں بسیار حرف کنند آنگاہ فرمود کہ چوں قارون در زمین فروشد ہمیں کہ چہارم زمیں رسیدہ خلق آں زمین پر

(۱) ۴۔ایضا، جلد اول۔ص ۱۲۹

سیدندکہ تو کیستی وقوم کدام کسی؟ قارون گفت از قوم مہتر موسی علیہ السلام۔فرمان آمدکہ ھمانجابدار یدکہ نام دوست می گیر د مااورا از یں فر و د تر نہ برم۔آنگاہ خواجہ چشم پر آب کر دکہ ایں سکس امید وار سختی است دشمنی کہ باخدا ے برابری کند تام گرفتن مہتر موسی خلاصی می یابد۔مومن کہ محبت ایشان تاانقراض عالم در دل دار د مبادا کہ ہر گز او را در آتش دوزخ سوختہ کنند(ایضا،جلد دوم،ص:۱۹۶)۔

مذکورہ بالا کتاب جیسا کہ عرض کیا گیا ہے دوحصوں (جلدوں) پر مشتمل ہے پہلے حصہ میں چونتیس مجالس اور دوسرے حصہ میں سترہ مجالس کا بیان ہے۔

زیر نظر اقتباسات اور تفصیلات جناب محمد لطیف ملک صاحب ایم اے لاہور کے مذکورہ بالا ترجمہ سے پیش ہیں:

کتاب کا دیباچہ

''یہ گو ہر گنج علوم غیبی اور یہ جواہر زواہر لاریبی خواجۂ راستاں ملک المشائخ والارضین قطب الوقت مجمع الاسناد والارشاد حجۃ اللہ علی العباد مبین الفرع والاصول، الجامع بین المعقول والمنقول علم البلاغۃ نظام الحق والشرع والدین شیخ الاسلام والمسلمین وارث الانبیاء والمرسلین کے خزانہ دل سے جمع کیے گئے ہیں۔اللہ تعالیٰ محمد علیہ وافضل الصلوٰت والسلام کی حرمت سے آپ کو دیر تک زندہ رکھ کر مسلمانوں کو آپ سے مستفیض کرے اور ہمیں آپ کے لقاء کی نعمت عطا کرے اور آپ کے اسلاف کو عزت واکرام اور رضوان کامل سے مخصوص کرے۔آمین یارب العالمین۔حضور کی زبان گوہر فشاں سے جو کچھ سنا گیا بقدر فہم خود اس کے الفاظ اور معانی اس مجموعے میں کہ نام اس کا افضل الفوائد ہے تحریر کیے ہیں جو ان مختلف تواریخ پر مشتمل ہے جب بندہ کو حضور کی خدمت میں شرفیاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔(افضل الفواید،اردو ترجمہ،محمد لطیف ملک،لاہور،۱۹۶۰ء،ص:۲۰)

۱۔مجلس ا-چہارتر کی کلاہ کا ذکر،خواجہ حسن بصری کی روایت وغیرہ۔(۲۴رذی الحجہ ۷۱۳ھ)

۲۔مجلس ۲-یوم عاشورہ اور علم کی فضیلت۔

۳۔مجلس ۳-ماہ شوال اور ایام بیض کے روزے۔عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی راتوں میں نماز کی فضیلت۔

۴۔مجلس،شعبان میں نماز کی فضیلت،شب برأت کی فضیلت،نماز باجماعت کی فضیلت نیز اصحاب سلوک کا ذکر وغیرہ۔

۵۔مجلس ۲- صلاۃ التسبیح اور ہفتہ بھر کی نمازوں نیز مشائخ سے محبت کا بیان۔

۶۔مجلس ۲-غلاموں اور اپنے سے کمتر لوگوں سے رعایت،بڑوں کا اعزاز و تعظیم اور پڑوسی کے حقوق۔

۷۔مجلس ,قاضی اور قضا کا ذکر، امام احمد بن حنبل اور قاضی ابو یوسف کے صدق وتقوی کا بیان۔رشتہ داروں کے حقوق،بیماروں کی عیادت اور عشق کا بیان۔

۸۔مجلس-۷- پچھلی امتوں کا ذکر۔

۹۔مجلس ۸ -لواطت، بہتان اور بیہودہ گوئی کی برائی، حضرت ابراہیم بن ادہم کا قصہ اورتوبہ کا بیان، خوش بخت اور بد بخت (سعید وشقی) کا ذکر۔جھوٹ کی برائی۔

۱۰۔مجلس ۸ -حضرت بایزید بسطائی کی عظمت اور بزرگی کا بیان۔سلوک ومحبت، حضرت جنید بغدادیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی وفات کا ذکر۔

۱۱۔مجلس ۸ - شریف وسفیہ، تواضع، مردم آزادی کی مذمت، مومن ومنافق، اچھی بری صحبت، محبت کے مقامات، حسین بن منصور حلاج کی بزرگی اور محبت کے سلسلہ میں بیان۔

۱۲۔مجلس ۸ -سلوک، عارف، گریہ، اصل محبت اور شیخ جلال الدین تبریزی وشیخ علی کھوکھری کے قصوں کا بیان۔

۱۳۔مجلس ۸ -امت محمدی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآلہ وسلم، نماز اور روزہ وغیرہ کی فضیلت کا بیان۔

۱۴۔مجلس ۸ -رجب کے مہینہ کی فضیلت، معجزات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیان، پیغمبری کی علامت، ایک اونٹ، ایک بھیڑیئے کی حکایت، خواجہ ابراہیم ادہم، ابوسفیان، ایک بدو اور سوسمار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کے صفات وغیرہ کا بیان۔

۱۵۔مجلس ۸ -بھلائی برائی، نفس کی خواہشات اور اذان کی فضیلت کا بیان۔

۱۶۔مجلس ۸ -اصحاب تحیر، کرامات، صفت بہشت، حکایت یعقوب علیہ السلام، خواجہ بایزید بسطامی کی حکایت نیز خواجہ داؤد طائی کے مجاہدہ وریاضت کا ذکر۔

۱۷۔مجلس ۱۷ -رویت باری، امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعی کی بزرگی کا بیان جو غضب وخشم الٰہی، قاضی ابو یوسف کی حکایت، امام محمد بن حسن کے مناقب، علم کی فضیلت، مجتہدین اور مستدعیون کا بیان۔

۱۸۔مجلس ۱۷ -کلام مجید حفظ کرنے کا بیان۔

۱۹۔مجلس ۱۷ - مظلوم کی بددعا کا بیان اور حضرت ذوالنون مصری اور حضرت بایزید بسطامی کے قصے۔

۲۰۔مجلس ۱۷ - حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی وفات کا بیان۔

۲۱۔مجلس ۱۷ -توحید، معراج شریف، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والہ وسلم کی فضیلت، انبیاء کی عصمت، حضرت لقمان، سکندر ذوالقرنین، فاروق، ذوالنورین، اسداللہ جیسے القاب کی وجہ، معرفت وکمال کا بیان، سماع، مراقبہ وحیا، صوفی کی صفت، عارف کا مقام، مرد کامل کی صفت، محب ومحبت کا بیان، حضرت جنید بغدادی کی بزرگی، خرقہ کا ذکر۔

۲۲۔مجلس ۱۷ - آسمانوں وزمین کی پیدائش کا بیان۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی مرتضیٰ کی ولادت باسعادت کا بیان، حضرت جنید بغدادی کی عبادت اور رابعہ بصریہ کی حکایت کا ذکر۔

۲۳۔مجلس ۱۷ -سورۂ مزمل کے فضائل۔

۲۴۔مجلس ۱۷ - آخری زمانہ کی علامات، قیامت کی نشانیاں۔دجال ملعون اور آخری دور کا ذکر۔

۲۵۔مجلس ۲۵- اولیاء اللہ کی بزرگی اور فضیلت، عقلمند کی تعریف، حضرت اویس قرنی کا تذکرہ، نماز میں دل جمعی اور خشوع، کشف حجاب، کمالیت اور خلوت کے بیانات۔

۲۶۔مجلس ۲۵- افضل الفوائد کو آپؒ کے حضور میں پیش کرنا، خواجہ معین الدین چشتیؒ کی عظمت اور بزرگی، حضرت حسن بصری کا برکت حاصل کرنا، سماع کے آداب، حسن بصری، حجاج بن یوسف، حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے قصے، بارش نہ ہونے کا تذکرہ، خوف اور قہقہہ کا بیان۔

۲۷۔مجلس ۲۵- مالک بن دینار کا ذکر، بزرگوں اور مشائخ کی دست بوسی۔

۲۸۔مجلس ۲۵- حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، بابا فرید الدین گنج شکرؒ اور حضرت عثمان ہرونی کی بزرگی اور عظمت کا بیان۔

۲۹۔مجلس ۲۵- حضرت یونس علیہ السلام کی فضیلت۔

۳۰۔مجلس ۲۵- حضرت جرجیس علیہ السلام کا قصہ۔

۳۱۔مجلس ۲۵- والدین کے حقوق کا بیان، حضرت رابعہ بصریہ کا تذکرہ۔

۳۲۔مجلس ۲۵- سماع اور اہل سماع، اسم اعظم کا بیان۔

۳۳۔مجلس ۲۵- صلوۃ السعادت کا بیان، اولیاء اللہ کی بزرگی کا ذکر۔

۳۴۔مجلس ۲۵- دس ذی قعد یک شنبہ، مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا برہان الدین غریب شیخ یوسف چندیری، مولانا فخر الدین زرادی، مولانا شہاب الدین میرٹھی، شیخ عثمان سیاح، شیخ ضیاء الدین پانی پتی، مولانا وجیہہ الدین پائلی وغیرہ کی موجودگی میں مولانا شرف الدین، مولانا نجم الدین سنامی اور جامع ملفوظ (امیر خسرو) کو کلاہ چہارتر کی عطا ہونا۔

دوسرا حصہ جیسا کہ مذکور ہوا ہے سترہ مجالس پر مشتمل ہے۔

ابتدا میں فرماتے ہیں:

''یہ انوار واسرار الٰہی اور یہ آثار واخبار نامتناہی خواجۂ راستاں صاحب الکلام فی الارضین ختم المشائخ والاولیاء وارث اہل السلوک والانبیاء تاج المحققین برہان العاشقین نظام الحق والشرع والدین ادام اللہ تقواہ کے انفاس متبرکہ سے ہیں کہ مختلف تاریخوں میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوکر سنے گئے اور ان اوراق میں لکھے گئے۔'' (ایضا،ص:۲۰۹)

۱۔مجلس ۱: (۲۰/رجب المرجب ۷۱۹ھ دوشنبہ) بلا کے خزانہ کا بیان، حضرت آدم کی پیدائش، قلندر درویشوں کا ذکر، انسانوں کی صورتوں میں ایک دوسرے سے اختلاف کی وجہ، درویشی کے کمال کا بیان، حضرت شبلی کی حکایت، مومن سے ہمدردی، چغل خوری کی برائی، حجر اسود، شیطان کے راندۂ درگاہ ہونے کی وجہ، حضرت

ایوب، حضرت زکریاؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی مناجاتیں، نمک خواری کا حق یاد رکھنا، پردہ پوشی، چاند وسورج گرہن کی وجہ، درود شریف کی فضیلت، نور محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقت کا بیان۔

۲۔مجلس ۲: حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر، حضرت ابوطالب کا حال، قیامت کا بیان، نماز کی فضیلت، حضرت اویس قرنی کی نماز، شب معراج کی نماز، واصلان حق کی حکایت۔

۳۔مجلس ۳: حضرت ابراہیمؑ کا حال، مہر نبوت کا بیان۔

۴۔مجلس ۴: حضرت ادریس اور حضرت اسحاق علیہما السلام کے احوال، انبیا اور اولیا اللہ کے ذکر کی فضیلت۔

۵۔رمضان المبارک کی فضیلت، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کا تذکرہ۔

۶۔: حضرت اسماعیل کا تذکرہ، درود شریف کی فضیلت و برکت، مرد اور نیم مرد کی تعریف۔

۷۔: حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر۔

۸۔: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ۔

۹۔: حضرت عیسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا بیان۔

۱۰۔: حضرت لوط علیہ السلام کا تذکرہ۔

۱۱۔: صفر کے مہینہ کا تذکرہ، کشف و کرامات کا بیان، حضرت جبرئیلؑ کی حکایت درود شریف کی فضیلت، شراب پینے والے کی مذمت۔

۱۲۔مجلس ۱۲: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت مبارکہ کا بیان۔صحابہ کرام کا ذکر درود شریف کی فضیلت۔خلفائے راشدین کی الگ الگ فضیلت، والدین کی خدمت کا بیان، نماز ترک کرنے والوں کی مذمت اور برائی۔

۱۳۔مجلس ۱۳: سلوک کے مدارج کا بیان، درویشی، اسلام اور سماع سے متعلق ارشادات۔

۱۴۔مجلس ۱۴: عشق کے اسرار و رموز، طاقیہ کا بیان۔

۱۵۔مجلس ۱۵: شعبان کے مہینہ کی فضیلت، عارفین کا بیان، شوہر و بیوی کے حقوق، انصاف کا ذکر۔

۱۶۔مجلس ۱۶: ماہ رمضان المبارک کی فضیلت، شیخ الاسلام حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کی حکایت انبیاء اولیاء اللہ سے دوستی کی فضیلت اور بزرگی۔

۱۷۔مجلس ۱۷: حضرت بابا صاحب قدس سرہ کی وفات کا بیان، حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی ولادت مبارکہ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ذکر۔

قارئین باتمکین نے مندرجہ بالا عناوین سے اس ملفوظ کی اہمیت وافادیت ملاحظہ کی ہوگی۔ یہ ملفوظ حضرت سلطان المشائخ کی تعلیمات اور افکار کو سمجھنے میں بھی بہت معاون ہے۔جلد اول کی مجلس ۲۶ میں اس ملفوظ کو حضرت

موصوف الصدر قدس سرہ کی خدمت عالیہ میں پیش کرنے اور آں جناب قدس سرہ سے اس کی قبولیت و پسندیدگی نیز اس کے فاضل و کامل جامع کے سلسلہ میں آپؒ کا ارشاد اس کی اہمیت و سند کے سلسلہ میں مسلم ہے۔ ملاحظہ ہو:

"۷ ؍ ۲ ؍ جمادی الثانی میں حضرت محبوب الٰہی کی قدم بوسی کی سعادت و دولت حاصل ہوئی اس روز بندہ نے چند جزو کاغذ کے جن میں خواجہ راستاں کے الفاظ دربار گوہر نثار قلم بند کئے ہوئے تھے مخدوم عالمیاں کی نظر مبارک کے سامنے پیش کر کے ملاحظہ سے گزارے اور عرض کیا کہ اب تک یہ بیچارہ جو کچھ مخدوم کی زبان فیض بیان سے سنتا رہا ہے جہاں تک فہم و ادراک ساتھ دیتے اس کو لکھ لیتا ہے اور اس کا نام افضل الفوائد رکھا ہے۔ بندہ (خسرو) نے جب یہ عرض کیا تو حضرت مخدوم نے ان کو دست مبارک میں لے کر شرف ملاحظہ سے مشرف فرمایا اور فرمایا کہ خوب لکھا ہے اور اچھا نام رکھا ہے نیز جہاں کہیں بھی بندہ سے کوئی بات چھوٹ گئی تھی اس کو اپنے دست مبارک سے درست فرمایا۔

اس کے بعد حاضرین سے ارشاد فرمایا کہ خسرو سے یہی بہت ہے کہ اس قدر فوائد قلم بند کر لیے کیوں کہ یہ ہر وقت سر سے پیر تک بحر معانی میں غرق رہتا ہے لیکن خداوند تعالیٰ نے اس کے تمام اعضا عقل اور فضل سے گوندھے ہیں وہ تمام دن معانی کے سمندر میں شناوری کرتا ہے اور لاکھوں موتی نکال کر زیب قرطاس کرتا ہے۔ (ایضاً ص: ۶ ۱۷)

پہلی مجلس میں حضرت سلطان المشائخ نے کلاہ چہار ترکی، کی بابت فرمایا کہ اس کو ولایت مآب حضرت علی شیر خدا کرم اللہ وجہہ نے اپنے سر پر رکھا۔ اس سے مراد دولت و سعادت ہے نیز یہ کہ پہلا ترک "**ترک الدنیا و صحبة الاغنیاء**"۔ (دنیا اور اہل دنیا (مالداروں) کی ہم نشینی سے پرہیز کرے۔ دوسرا ترک، "**ترک اللسان عن غیرہ و التزامه بذکر الله**" (اپنی زبان کو ذکر الٰہی کے سوا کہیں نہ لگائے یعنی اللہ کے ذکر کے سوا کوئی بات نہ کرے) تیسرا ترک **ترک بصرہ من غیرہ لکرامة** (غیر کی طرف نظر کرنے سے دور رہے تاکہ نابینا نہ ہو جائے۔ جب آپ نے یہ بیان فرمایا تو آنکھیں بھر آئیں اور خوب روئے یہاں تک کہ حاضرین بھی متاثر ہوئے پھر یہ شعر پڑھا:

اگر بغیر رخت دیدہ ام بکس بیند
کشم بہ خنجر انگشت چوں سزاش اینست

پھر فرمایا کہ چوتھا ترک طہارۃ القلب من حب الدنیا (دل کا دنیا اور اس کے ساز و سامان کی محبت سے پاک کرنا ہے) جب آئینہ دل سے دنیا کی محبت کے رنگ کو پاک کر دے گا تو خداوند تعالیٰ سے موانست ہو جائے گی اور غیریت درمیان سے اٹھ جائے گی اور خدا تعالیٰ سے یگانہ اور خلق سے بیگانہ ہو جائے گا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ درمیان سے سارے پردے اٹھا لے اور یہ سر ظاہر ہو جائے اور غیریت دور ہو جائے اور یہ ندا ہو کہ **بی یبصر و بی یسمع و بی ینطق**۔ وہ مجھ سے ہی دیکھتا، سنتا اور بولتا ہے۔ سالک جب اس مقام پر پہنچتا ہے تو مشاہدہ و مکاشفہ کی لذت پاتا ہے۔ یہ چہار ترکی کلاہ سر پر رکھنا (پہننا) ایسے ہی لوگوں کا حق ہے۔ (ایضاً ص: ۶، ۷)

دوسری مجلس بھی حضرت برہان الدین غریب کے اس عرض کرنے پر کہ علم کی نعمت ایک بڑی نعمت ہے

ارشاد فرمایا کہ ہاں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی حدیث شریف ہے کہ علم میں دو شناخت ہیں اگر اہل علم فرومایہ ہوتو شریف ہوجاتا ہے، اگر بخیل ہوتو جواں مرد ہوجاتا ہے، اگر فقیر ہوتو تونگر ہوجاتا ہے اگر خوار ہوتو عزیز ہوجاتا ہے اگر دور ہوتو خدائے عزوجل کے قریب ہوجاتا ہے، اگر سخت دل ہوتو نرم دل ہوجاتا ہے اگر بدگو ہوتو شیریں دہن ہوجاتا ہے، اگر ضعیف ہوتو قوی، بےشرم و بےحیا ہوتو باحیا، مجہول ہوتو معروف اور ریاکار ہوتو بےریا ہوجاتا ہے۔ مزید یہ ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز بندگان خدا علم تلاش کریں گے اور اہل علم کے چہرے اس دن چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے۔ علماء کے پاس بیٹھنا اور ان کی خوبیاں اپنے میں پیدا کرنا ہدایات الٰہی پر کاربند ہونا ہے۔ سب کچھ چھوڑ کر پہلے علم حاصل کرنا چاہیے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے جبرئیلؑ سے انہوں نے اسرافیلؑ سے اور انہوں نے حضرت حق تعالیٰ سے سنا ہے کہ جو کوئی علم کی تلاش میں دو قدم جاتا ہے اور اہل علم کے پاس دو گھڑی بیٹھتا ہے اس سے دو باتیں سنتا ہے اللہ تعالیٰ اسے **وجنا الجنتین دان** عطا فرمائے گا۔ (ایضاً ص: ۹، ۱۰، ۱۱)

چھٹی مجلس میں بوڑھوں اور عمر رسیدہ لوگوں کی تعظیم و تکریم کے ضمن میں ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کی تعظیم نہیں کرتا اور ان پر اپنا مرتبہ جتاتا ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی بوڑھے کو خواہ وہ مسلمان ہوتا یا یہودی راستہ میں دیکھ لیتے تو اس کے سفید بالوں کی حرمت کی بنا پر اس سے آگے ہرگز نہ چلتے اور فرماتے کہ جس میں نور خدا کا نشان ہو اس سے آگے نہیں چلنا چاہیے۔ **الشیب نوری** (بڑھاپا میرا نور ہے) پھر ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس بوڑھے کو عزیز رکھتا ہے جس نے اسلام کی حالت میں بال سفید کیے ہوں۔ تم بھی اس کو بزرگ و عزیز جانو کیوں کہ توریت میں حکم ہوا ہے کہ موسیٰؑ! بوڑھوں کی عزت کیا کرو، جب وہ آئیں تو ان کے آنے پر کھڑے ہوجاؤ جب تم یہ دیکھو کہ جوان لوگ بوڑھوں سے پہلے پانی پیتے ہیں یا ان کے آگے آگے چلتے ہیں اور وہ پیچھے پیچھے تو سمجھ لو کہ اللہ نے مخلوق سے برکت اور راحت چھین لی۔ اسی ضمن میں آپ نے یہ فرمایا کہ سلطان معزالدین محمد بن سام کی یہ عادت تھی کہ جب کوئی بوڑھا ان کے پاس آتا تو فوراً تخت پر سے کھڑے ہوجاتے اور اس کی ضرورت پوری کرتے تھے۔ ان کے وزیروں نے عرض کیا کہ بادشاہ سلامت کو اس طرح کرنا زیب نہیں دیتا انہوں نے جواب دیا کہ میں اس وجہ سے اٹھتا ہوں اور ان کی تعظیم کرتا ہوں کہ شاید کل قیامت کے دن مجھ بیچارہ کا حشر ان بوڑھوں کے ساتھ ہو اور جہنم کی آگ سے بچ جاؤں اور انوار کی برکت سے کہ خداوند تعالیٰ نے سفید بالوں کو اپنے نور سے نسبت دی ہے مجھے نجات دے دیں۔ (ایضاً ص: ۲۹، ۳۰)

اسی مجلس میں پڑوسی کے حقوق کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جبرئیلؑ نے مجھ سے پڑوسی کے حقوق کی اس قدر تاکید کی کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید ہمسایہ کو ہمسایہ کے مال میں سے میراث دیں گے۔ پھر فرمایا کہ حضرت بایزید بسطامی کا ایک یہودی ہمسایہ تھا وہ کہیں سفر پر گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی کے ہاں

ولادت ہوئی۔اس کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ چراغ تک جلائے۔بچہ اندھیرے کی وجہ سے روتا تھا آپ کو خبر ہوئی تو آپ روزانہ بازار سے تیل لاکر اس یہودی عورت کو دیدیا کرتے کچھ دنوں کے بعد جب وہ یہودی واپس آیا تو اس کی بی بی نے اسے تمام حالات بتائے۔وہ بہت شرمندہ ہوا اور حضرت کے پاس آیا اور عرض کیا کہ آپ نے اتنی مہربانی کیوں کی۔آپ نے جواب دیا پڑوسی کے حق کی بنا پر۔کیوں کہ پڑوسی کا بہت بڑا حق ہے۔وہ یہودی اسی وقت مسلمان ہوگیا۔

اسی ضمن میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ خواجہ بایزید بسطامیؒ کا ایک یہودی پڑوسی تھا۔لوگ اکثر اس سے مسلمان ہوجانے کو کہتے تو وہ جواب میں کہتا کہ اگر اسلام یہی ہے جس پر بایزید عامل ہیں تو یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا اور اگر اسلام وہ ہے جس پر تم عمل پیرا ہو تو ایسے اسلام سے مجھے شرم آتی ہے۔مزید آپ قدس سرہ نے یہ بھی فرمایا کہ جان لو پڑوسی کا یہ بھی حق ہے اگر وہ تم سے قرض مانگے تو دیدو، اس کی کوئی ضرورت ہو اسے پوری کرو، بیمار ہو جائے تو عیادت اور تیمارداری کرو، اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو اس کی مدد کرو، جب کچھ پکاؤ تو اسے بھی کھلاؤ اگر وہ فوت ہوجائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھو اور قبرستان تک لے جاؤ، پھر آپ نے یہ حدیث شریف نقل فرمائی کہ جو شخص خداوند تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لایا اسے پڑوسی کو کبھی تکلیف نہ دینا چاہیے کیوں کہ اس کا اتنا حق ہے جتنا ماں باپ کا۔

بارھویں مجلس میں سلوک کی بابت گفتگو فرمائی تو ارشاد ہوا کہ خواجہ سمنون محب قدس اللہ سرہ العزیز مکہ کی مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے۔محبت کا ذکر ہو رہا تھا۔جب انہوں نے لوگوں کو اپنی طرف پوری طرح متوجہ نہ پایا تو مسجد کی قندیلوں کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ قندیلو! آخر تم ہی محبت کی یہ باتیں سنو، ان کا اتنا کہنا تھا کہ قندیلیں آپس میں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوگئیں اس بیان کے بعد حضرت سلطان المشائخ نے فرمایا یہ گزشتہ زمانہ کی حالت تھی جب لوگ صاحب درد تھے اور آج ایسے لوگ ہیں کہ اگر ان کو احادیث وآثار پر مشتمل سو وعظ بھی سنائیں تو ان میں ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔(ایضاص:٦٨)

بائیسویں مجلس میں حضرت رابعہ بصری رضی اللہ عنہا کے محامد ومناقب کے باب میں فرمایا کہ روز قیامت جب آواز دی جائے گی کہ اے مردان خدا! تو سب سے پہلے جو اس صف میں قدم رکھیں گی وہ رابعہ ہوں گی۔محبت کے معاملہ میں ان کے زمانہ میں ان جیسا کوئی نہ تھا۔حضرت حسن بصری فرماتے تھے کہ ایک بار میں ایک رات ایک دن رابعہ کی خدمت میں رہا۔محبت کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔نہ تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ میں مرد ہوں اور نہ ان کے دل میں آیا کہ وہ عورت ہیں۔آخر کار میں اس حال میں اٹھا کہ خود کو مفلس اور ان کو مخلص پایا۔حضرت رابعہ بصری ایک روز مناجات کر رہی تھیں۔خداوند تعالیٰ! اگر تو نے مجھے دوزخ میں بھیجا تو وہ راز جو تیری محبت کا میرے دل میں ہے دوزخ سے کہہ دوں گی جس کی وجہ سے وہ ہزار سالہ راہ کے برابر مجھ سے دور بھاگ جائے گی اگر میں دوزخ کے ڈر سے تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھ کو دوزخ میں جلانا اور اگر بہشت کی امید پر عبادت کرتی ہوں تو بہشت میرے اوپر حرام کردے اور اگر تیرے لیے کرتی ہوں تو اپنا جمال باقی مجھے عطا فرما۔(ایضاص:١٤٨،١٤٩)

حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ نے ۵ ربیع الثانی چہار شنبہ کے روز چوبیسویں مجلس میں قرب قیامت اور آخری زمانے کی نشانیوں اور آثار کی بابت ارشاد فرمایا (اس وقت مجلس مبارکہ میں علاوہ جامع ملفوظ حضرت امیر خسرو کے مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا نصیر الدین گیاہی اور مولانا برہان الدین غریب حاضر تھے) کہ یہ تمام علامتیں اور نشانیاں جو ہر پل اس دنیا میں ظاہر ہو رہی ہیں سب آخری زمانہ کی ہیں۔لوگ ان سے غافل ہیں۔پھر حدیث مبارکہ نقل فرمائی کہ اس زمانہ میں فرزندان آدم کم پیدا ہوں گے،عورتیں مردوں کے ساتھ شراب پئیں گی ان کے برابر سوار ہو کر کوچہ بہ کوچہ پھریں گی۔دف بجانے والے (گانے) بکثرت ہوں گے۔بے عمل علماء بہت ہوں گے اور حکمران وسلاطین کھلے عام ظلم کریں گے۔

بعد ازاں آپ نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا یہ ارشاد بیان فرمایا کہ جب تم دیکھو کہ عورتیں گھوڑوں پر سواریاں کرتی اور بازاروں میں جاتی ہیں تو یہ بھی قیامت کی نشانیاں ہیں۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد امت کی زندگی ناخوش ہوگی۔وہی شخص خوش وخرم ہوگا جو دنیا سے کنارہ کشی کرے گا۔

حضرت مولائے کائنات کا ارشاد ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے اس عالم سے تشریف لے جانے کے چھ سو سال بعد فتنے برپا ہوں گے اور ہندستان وترکستان میں ایک دوسرے سے فساد کریں گے لوگ ایک دوسرے کا گوشت و پوست اکھاڑیں گے۔

آپ نے پھر اس حدیث شریف کو بیان فرمایا کہ آخری زمانہ میں عالم بہت ہوں گے مگر دینداری تھوڑی ہوگی۔درویش مردوں کو بیت المال سے کچھ نہ ملے گا۔عورتیں گھروں میں سوداگری کریں گی۔اعلانیہ شراب پئیں گی۔گانے بجانے والوں اور مسخروں کو مال و دولت دیا جائے گا۔عورتیں چرب زبانی کریں گی۔بادشاہ اور حکمراں حکومتوں پر قبضہ کریں گے اور بہت فساد برپا کریں گے۔پارساؤں کو تکلیف دیں گے۔عابدوں وزاہدوں کو قتل کریں گے مخلوق ان کے ہاتھوں مفلس ونادار ہو جائے گی۔شادی بیاہ کے کاموں میں شراب نوشی ہوگی۔بیگانہ عوتوں کو لائیں گے اور اپنے لوگوں سے فساد کریں گے۔آپ قدس سرہ نے پھر مزید یہ ارشاد فرمایا کہ آخری زمانہ میں مسلمانوں پر وہ وقت بھی آئے گا کہ گانے بجانے والے،مسخرے اور فسادی دنیا والوں کی نظروں میں عزیز ہوں گے علما اور قرآن پڑھنے والوں کی قدر و منزلت نہیں ہوگی۔مرد رنگ برنگے لباس پہنیں گے۔عورتوں کی طرح لڑکیوں اور مردوں کا بناؤ سنگار کریں گے،مرد عورت ایک ساتھ بیٹھ کر شراب پئیں گے۔لواطت اور ہم جنسی کا پیشہ اختیار کریں گے۔حاکم حکم بیچیں گے۔خلقت کے درمیان بد دیانتی پھیلے گی۔دنیاوی مال اور اغراض کی خاطر حق کو ناحق ثابت کریں گے۔عدل وانصاف درمیان سے اٹھ جائے گا اور سوداگر خرید وفروخت اور لین دین میں جھوٹ بولیں گے۔پانچ درم کے لیے جھوٹی گواہی دیں گے زمین سے کھیتی باڑی کی برکت اٹھالی جائے گی۔بارش کم ہو جائے گی اور اگر برسے گی بھی تو بے وقت۔جب دنیا میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو سمجھ لینا کہ قیامت قریب ہے۔

پھر یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ایسا زمانہ آئے گا کہ سال کی درازی ایک مہینہ کے برابر اور ایک ماہ کی ہفتہ کے برابر اور ہفتہ کی ایک دن کے برابر ہوگی۔ جو کوئی کسی کے پاس کچھ مال و دولت دیکھے گا تو اس فکر میں ہوگا کہ کسی طرح اس سے لے لے اور اسے مار ڈالے۔ مسلمان مفلس ہوں گے اور کمینوں کے سوا کوئی مالدار نہ ہوگا۔ ظلم کا دور دورہ ہوگا۔ رات دن جھوٹ، غیبت، حسد، فحش گوئی، لہو و لعب، قمار بازی، ناچ گانے اور بڑے کاموں میں مشغولیت ہوگی۔ عورتیں بے شرم ہو جائیں گی۔ اس قسم کی بہت سی نشانیوں کے بیان کے بعد آپ پر شدید گریہ طاری ہو گیا اور فرمایا کہ خدا جانے اس کے بعد اور کیا ہو اور کب قیامت آئے۔ (ایضا،ص:۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲)

پچیسویں مجلس میں اولیائے کرام کی بزرگی و فضیلت کے بعد حضرت اویس قرنی کے حال و مقام کے ذکر کے بعد حضرت عمر اور حضرت علی کی ان سے تفصیلی گفتگو کا بیان فرمایا کہ جب حضرت عمر نے ان سے دریافت کیا کہ تم حضور ﷺ کی زیارت کو کیوں نہیں آئے؟ انہوں نے کہا: کیا تم نے ان کی زیارت کی؟ کہا ہاں! اس پر انہوں نے پوچھا: کیا تم نے آپ ﷺ کی پیشانی مبارک دیکھی دونوں ابرو ملے ہوئے تھے یا الگ الگ تھے؟ حضرت عمرؓ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر دریافت کیا کہ تم حضور ﷺ کے دوست ہو؟ کہا ہاں! انہوں نے پوچھا کہ اگر تم سچے دوست تھے تو احد میں جب آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے تم نے اپنے دانت کیوں نہ توڑ ڈالے؟ دوستی اور یگانگت کی یہی شرط ہے پھر اپنا منھ کھول کر دکھایا تو تمام دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔

اس کے بعد حضرت عمر نے کہا: اویس! میرے لیے دعا کرو! انہوں نے کہا: میں نماز میں دعا کرتا ہوں اگر تم قبر میں اپنا ایمان سلامت لے گئے تو میری دعا سے تم کو فائدہ ہوگا ورنہ بیکار۔ پھر حضرت عمرؓ نے ان سے نصیحت چاہی، انہوں نے کہا کہ خدا کو پہچانتے ہو؟ کہا: ہاں! فرمایا اگر اس کے عزیز ہو تو بہتر یہی ہے کہ کسی اور کو نہ پہچانو۔ اس کے بعد حضرت عمر نے کچھ نذر پیش کی جسے انہوں نے قبول نہ کیا اور کہا اس سے رنجیدہ مت ہو اب واپس جاؤ کیوں کہ قیامت نزدیک ہے۔ قیامت میں ملیں گے پھر جدائی نہ ہوگی اب تو میں قیامت کی تیاری میں مشغول ہوتا ہوں۔ پھر آپ دونوں صاحبان واپس آ گئے۔ (ایضا،ص:۱۶۷)

اٹھائیسویں مجلس میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت شیخ الاسلام بابا فرید اور حضرت عثمان ہارونی قدس اللہ اسرارہم کے فضائل و مناقب کے بیان میں ارشاد فرمایا کہ ایک بار ایک گناہ گار کو خواجہ کاکی کے پائیں دفن کیا گیا۔ اسی شب کچھ لوگوں نے اسے جنت میں دیکھا۔ تعجب سے اس سے سوال کیا گیا اس نے کہا جب تم لوگ مجھے دفن کر کے چلے گئے تو عذاب کے فرشتے میرے پاس آئے۔ خواجہ کاکی موصوف الصدر وہاں موجود تھے۔ وہ پریشان ہوئے تو اسی وقت حکم الٰہی ہوا کہ فرشتو! اس بندہ سے ہاتھ اٹھا لو اس نے ہمارے دوست قطب الدین کے پائیں جگہ پائی ہے اور اس کا دل پریشان ہے۔ ہم نے اس گناہ گار کو بخش دیا۔

حضرت محبوب الٰہی نے اپنے پیر و مرشد کے حال میں یہ بیان فرمایا کہ ایک بار کچھ مسافر آپ کی خدمت

میں حاضر ہوئے۔ حضرت والا سے امتحاناً سوال کرتے۔ آپ کے سامنے لکڑیوں کا ایک گٹھا پڑا ہوا تھا ایک نے پوچھا درویش کا مقام ومرتبہ کیسا اور کس حد تک ہونا چاہیے۔ آپ نے فوراً دونوں ہاتھ اس گٹھے پر مارے کہ اس حد تک ہونا چاہیے کہ اگر وہ یہ کہے یہ سب سونا تو ہو جائے۔ حضرت والا نے ابھی یہ بات زبان مبارک سے ارشاد ہی فرمائی تھی کہ سب سونا ہو گیا۔

اسی ضمن میں حضرت عثمان ہارونیؒ کا واقعہ بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ آپ اپنے احباب کے ساتھ جماعت خانہ میں تشریف فرما تھے چند فقرا اور درویش آئے آداب وسلام بجالائے آپ نے انہیں بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ اس وقت سلوک کا ذکر ہو رہا تھا آپ نے فرمایا کہ سالکین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے کہ جب وہ عالم تحیر اور حیرت میں مستغرق ہوتے ہیں تو اگر لاکھوں تلواریں بھی ان کے سر پر مارے انہیں خبر نہ ہو۔ یہ بیان فرمانے کے بعد حضرت محبوب الٰہی رونے لگے اور فرمایا کہ جس وقت وہ لوگ دوست کی محبت میں عالم تحیر میں غرق ہوتے ہیں اگر اس وقت لاکھوں مقرب فرشتے ان کے ایک کان سے داخل ہو کر دوسرے کان سے نکل جائیں انہیں خبر تک نہ ہو''۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان فقرا نے حضرت شیخ ہارونیؒ سے درخواست کی کہ ہم کو آپ کی بارگاہ سے کچھ عطا ہو جائے تاکہ ہم یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ اتفاق سے اس وقت جماعت خانے میں کچھ موجود نہ تھا۔ آپ نے اپنے آگے سے ایک مٹھی، مٹی اٹھا کر انہیں دی کہ گرہ میں باندھ لیں۔ جہاں ضرورت پڑے خرچ کر لینا۔ وہ لوگ آپ کے حضور سے اٹھ کر باہر آئے۔ جب دیکھا تو وہ تمام مٹی سونا بن گئی تھی۔ اس کے بیان کے بعد آپ نے فرمایا کہ جو کوئی کامل ہوتا ہے وہ مٹی کیا جو چیز بھی ہاتھ میں لے اور چاہے تو سونا بن جائے۔ (ایضاً ص: ۱۸۷، ۱۸۸)

بیس جمادی الاول روز شنبہ کی اکتیسویں مجلس میں رقم طراز ہیں کہ حضرت شیخ نظام الدین اولیا کی قدمبوسی کی سعادت نصیب ہوئی۔ اولیاء اللہ اور مشائخ عظام کی بزرگی اور فضیلت کے سلسلہ میں آپ گفتگو فرما رہے تھے۔ اسی درمیان شیخ برہان الدین غریب، مولانا شمس الدین یحییٰ اور مولانا فخر الدین زرادی حاضر ہوئے۔ ان کا آداب و نیاز قبول فرمانے کے بعد حضرت خواجہ نے انہیں بیٹھ جانے کا حکم فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے والدین کے حقوق کے سلسلہ میں گفتگو فرمائی اور یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک صاحب حج کی نیت سے نکلے بغداد پہونچے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واپسی کا حکم فرمایا کہ تیرے گھر میں حج ہے یعنی تیری ماں گھر میں موجود ہے اس کے حقوق بجالا کہ وہ تیرے لیے حج سے بہتر ہے۔ اور اس کی رضا وخوشنودی طلب کر۔ وہ وہیں سے اپنے گھر واپس آگئے اور والدہ کی خدمت کی سعادت میں لگ گئے پھر آپ نے فرمایا اگر کوئی شخص اپنے ماں باپ کو اپنے کندھے پر سوار کر کے تمام زندگی حج کرائے تو بھی وہ اس ایک رات کا حق ادا نہیں کر سکتا جس میں انہوں نے اس کی وجہ سے اپنی رات کی نیند خراب کی۔

بعد ازاں حضرت رابعہ بصری کے فضائل ومناقب بیان فرمائے کہ وہ حضرت حسن بصری کی مجلس میں بالکل خاموش بیٹھتی تھیں۔ وہ پیدائشی ولیہ تھیں جس رات پیدا ہوئیں تو مفلسی کا یہ عالم تھا کہ ان کے گھر میں کوئی کپڑا

تک نہ تھا اور نہ چراغ کے واسطے تیل۔ان کی والدہ نے ان کو ایک چھوٹے سے کپڑے میں لپیٹا اور شوہر سے کہا کہ فلاں پڑوسی سے تھوڑا تیل لے آؤ وہ گئے اور دروازہ چھوکر چلے آئے اور کہا کہ ہمسایہ سو رہا تھا۔ چنانچہ اسی حالت رنجیدہ وملول میں سو گئے۔خواب میں سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی۔آپ نے فرمایا ملول مت ہو تیرے لیے یہ بیٹی نعمت رشید ہوگی۔اس کی سفارش سے میری امت کے ستر ہزار آدمیوں کو نجات ملے گی۔

پھر فرمایا کہ تو عیسیٰ بن داؤد امیر بصرہ کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ تم ہر رات مجھ پر سو بار درود بھیجتے تھے، جمعہ کی رات تم درود بھیجنا بھول گئے اور چار سو رکعت نماز ادا کرتے تھے جو نہ کر سکے،اس کا کفارہ سو دینار مجھے دو۔

ان کے والد جاگ کر بہت روئے اور یہ خواب لکھ کر امیر بصرہ کے پاس پہونچے۔اس نے دس ہزار درم اس شکرانہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے انہیں صدقہ میں دیے اور کہا آئندہ جو بھی تیری ضرورت ہو وہ میں پوری کروں گا۔ان کے صبر وتوکل، رضا اور تقوی و پرہیز گاری کے باب میں مزید ارشاد فرمایا کہ ایک بار وہ مکہ معظّمہ جا رہی تھیں کہ جنگل میں دیکھا کعبہ ان کے استقبال کو آرہا ہے۔انہوں نے کہا مجھے کعبہ کی استطاعت نہیں اس کے جمال سے مجھے کیا خوشی۔ مجھے تو رب کعبہ چاہیے کعبہ کو لے کر کیا کروں گی۔(ایضا،ص: ۲۰۰،۲۰۱)

بتیسویں مجلس میں سماع اہل سماع کے بارے میں گفتگو فرمائی اور اس کے شرائط وآداب بیان کیے۔مزید برآں حضرت ابراہیم ادہم کے اسم اعظم کے سلسلہ میں جواب کی بابت فرمایا کہ معدہ کو حرام لقمہ سے پاک رکھو اور دل کو دنیا کی محبت سے بالکل صاف اور خالی کر دو۔اس کے بعد جو بھی اسم پڑھو گے وہ اسم اعظم ہوگا۔

حصہ دوم کا آغاز

۲۰؍رجب المرجب ۱۹ ۷ ھ دوشنبہ سے ہوتا ہے۔خسروؒ قمطراز ہیں کہ حضور سلطان المشائخ کی مجلس میں حضرت آدمؑ کی پیدائش اور دوسرے فوائد کے سلسلہ میں گفتگو ہو رہی تھی عزیزان اہل صفہ بھی حاضر تھے کہ آپ (قدس سرہ) نے انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ کے درمیان فرمایا کہ وہ زمانہ کیا ہی راحت وآرام والا تھا جب حضرت خواجہ قطب الدین قدس سرہ باحیات تھے۔میں نے دست بستہ عرض کیا کہ اس دوسرے حصہ میں اگر انبیاء ورسل اور سلوک کے قصے ہوں تو اس غلام کے لیے طمانیت خاطر ہو۔آپ مسکرائے اور ارشاد فرمایا کہ میں نے نماز کے بعد انبیاء کا جو تذکرہ شروع کیا وہ اسی لیے کہ تمہاری دلی تمنا یہی تھی۔(ایضا،ص:۲۱۰،۲۱۱)

حضرت آدم کی پیدائش، ان کی تسبیح وتقدیس،فرشتوں کا تخلیق کے سلسلہ میں جناب باری میں عرض کرنا اور ان کو جواب ملنا کہ:إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے)

بعد ازاں ابلیس کی نافرمانی اور اس پر لعنت کے بیان کے بعد حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ کا آبدیدہ ہو کر یہ فرمانا کہ ابلیس تو ایک ہی لعنت سے مردود ابدی ہوا اور اس زمانہ میں کچھ ایسے مسلمان بھی ہیں کہ ان سے ایسے برے اعمال سرزد ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان پر ایک دن میں ہزار بار لعنت بھیجتا ہے اور ان کو غفلت کی وجہ سے پتہ بھی نہیں چلتا۔

یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے دنیا میں سب سے پہلے عشق کیا اور اس کی بلا کو قبول کیا وہ حضرت آدم صفی اللہ تھے۔ کیوں کہ ان کو بہشت کی خاک سے پیدا کیا اور اگر ان کی خاک میں عشق کی سرشت نہ ہوتی تو سالکین میں عشق مرکب نہ ہوتا کیوں کہ عشق کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا، اسی لیے ان کی اولاد میں بھی اس کا وجود رہا۔ اولیاء اللہ میں شوق اور اشتیاق کا جو ولولہ پایا جاتا ہے یہ بھی ان کی ہی ذات مبارکہ سے ہے۔ آپ اس پر آبدیدہ ہو گئے اور یہ رباعی ارشاد فرمائی:

از بہر رخ تو مبتلا می باشم
وندر غم عشق تو بلا می باشم
در یاد جمال تو چناں مدہوشم
کز خود خبرے نیست کجا می باشم

پھر فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہونے کا وقت آیا تو جناب باری سے حکم ہوا کہ ہر ماہ کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخوں کو روزے رکھو تا کہ تمہاری توبہ قبول کروں۔ تین سو سال کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی تھی۔ ایک زمانے بعد ان سے پوچھا گیا کہ کبھی اپنی مراد کے موافق پایا جواب دیا کہ ان تین سو سالوں میں جب بلا میں گرفتار تھا جو دن بھی مجھ پر گزرتا تھا اپنے آپ کو بامراد پاتا اور جو رنج و غم اس وقت مجھ پر پڑتا تھا ہر ایک سے ولایت کا راز مجھ پر کھلتا۔ (ایضاً ص: ۲۱۴، ۲۱۵)

دوسری اور تیسری مجلس میں حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے تذکرے ہیں اور چوتھی مجلس میں حضرت ادریس و حضرت اسحاق علیہما السلام کے احوال بیان فرمائے کہ جب حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحاق پیدا ہوئے تو ان کی برکت سے اس رات یہودیوں کے گھروں میں جتنے بت تھے سب سرنگوں ہو گئے اور لا الہ الا اللہ اسحاق نبی اللہ کی آوازیں نکلیں۔ حضرت اسحاق جب نبوت سے سرفراز ہوئے تو ہر لمحہ عبادت و طاعت میں مشغول رہتے۔ اللہ کے خوف سے ہر وقت کانپتے۔ رات کو اپنی گردن میں زنجیر ڈال کر باندھ لیا کرتے تھے اور دن میں کفار و مشرکین کو خدا کی جانب بلاتے، ان کا سب سے بڑا معجزہ یہی تھا کہ ان کی پشت سے ستر ہزار پیغمبر اور رسول پیدا ہوئے۔

قارئین نے گذشتہ صفحات میں درج شدہ فہرست مضامین سے بخوبی اندازہ کر لیا ہوگا کہ افضل الفوائد حضرت سلطان المشائخ اور دوسرے مشائخ چشت کی تعلیمات، انداز تلقین اور تربیت، نیز تہذیب نفس کے باب میں کن اہمیتوں کا حامل ہے۔

○○○

حماد رضا مصباحی

راحت القلوب-ایک مطالعہ

حضرت شیخ الاسلام خواجہ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ کی ذات ستودہ صفات ان مقدس اور عظیم ہستیوں میں سے ایک ہے جو عجائب روزگار، فرید عصر اور یکتائے دہر ہیں۔ جن کی تمام تر زندگی ریاضت ومجاہدہ، فقر و فاقہ، زہد وقناعت، صبر وتوکل، تواضع وخاکساری، عشقِ الٰہی اور سراپا تسلیم ورضا سے عبارت ہے۔ جن کے اقوال و ملفوظات طالبانِ مولیٰ کے لیے دستور العمل، سالکینِ راہ طریقت کے لیے اکسیرِ حیات، واصلین کے لیے رہنما اصول، عشاق کے دردِ دل کی دوا اور گم گشتگان راہ کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

آپ کی ولادت باسعادت قصبہ کھتوال ضلع ملتان میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت والدہ ماجدہ کی نگرانی میں ہوئی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ملتان تشریف لے گئے۔ وہیں حضرت قطب العالم خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کا شرف ملا اور صحبت میسر آئی۔ (بزم صوفیہ، ص ۱۴۲)

بعد ازاں اپنے مشائخ کے نقوش قدم کی پیروی کرتے ہوئے متعدد بزرگان دین سے کسب فیض کے لیے آپ نے مختلف مقامات کی سیر وسیاحت کی۔ چناں چہ بغداد میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی، بخارا میں حضرت شیخ سیف الدین باخرزی، بدخشاں میں شیخ عبد الواحد مصری اور سیوستان اور اس کے علاوہ متعدد مقامات میں مختلف مشائخ عظام سے آپ نے کسبِ فیض کیا۔ اس کے بعد آپ دہلی اپنے پیر ومرشد کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، پھر آپ کو خلافت سے نوازا گیا۔

آپ نرمی ومہربانی، حسنِ خلق، استغنا وشانِ بے نیازی، حسنِ معاشرت، دنیا سے کنارہ کشی اور خدمتِ خلق میں یگانۂ روزگار تھے۔ آپ کی حیات وخدمات کے حوالے سے فوائد الفواد کا مندرجہ ذیل اقتباس نہایت جامع اور کافی وشافی ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیا فرماتے ہیں:

> ’’ان کا کام کچھ اور ہی تھا۔ انہوں نے خلق کو چھوڑ کر جنگل بیابان اختیار کیا۔ یعنی اجودھن میں جا کر رہے اور فقیروں کی روٹی اور جو کچھ اس علاقے میں پیدا ہوتا ہے جیسے پیلو وغیرہ اس پر قناعت کی، لیکن اس

کے باوجود مخلوقِ خدا کی آمد ورفت کی کوئی حد نہ تھی، خانقاہ کا دروازہ آدھی رات تک یا کچھ کم زیادہ کھلا رہتا تھا یعنی برابر کھلا ہی رہتا اور روپیہ، کھانا اور اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے جو نعمت بھی موجود ہوتی اس میں سے آنے جانے والوں کو حصہ ملتا۔ کوئی شخص ان کی خدمت میں ایسا نہ آتا جسے کچھ نہ کچھ عطا نہ کیا جاتا ہو۔ عجیب قوت اور عجیب زندگانی تھی۔ بنی آدم میں سے کسی کو میسر نہیں ہوسکتی۔ اگر کبھی کوئی شخص ایسا آتا جو اس سے پہلے کبھی نہ آیا تھا، اسی وقت کسی ایسے کی بھی حاضری ہوتی جو برسوں کا واقفِ کار ہوتا تو دونوں کے ساتھ یکساں بات چیت ہوتی اور توجہ اور مہربانی دونوں پر برابر کی جاتی۔ محبوبِ الٰہی نے ارشاد فرمایا کہ: میں نے بدرالدین اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں محرم راز خادم تھا۔ جو بات بھی ہوتی مجھ سے فرماتے اور جس کام کے لیے بھی مجھے متعین فرماتے، تو سب کے سامنے اور پیچھے ایک ہی بات فرماتے۔ کبھی بھی تخلیے میں مجھ سے ایسی بات نہیں فرمائی اور کوئی کام ایسا نہیں بتایا جسے سب کے سامنے جوں کا توں مجھ سے نہ کہا ہو۔ یعنی ظاہر و باطن میں ان کی ایک روش تھی اور یہ بات عجائبِ روزگار سے ہے۔'' (فوائد الفواد، ج:۲، م:۲۵، ص:۱۲۵۔۲۶)

۵ محرم الحرام ۶۶۴ھ میں آپ اس دنیائے فانی سے کوچ کیے اور اپنے رب سے جا ملے۔

آپ کے حوالے سے آپ کے ملفوظات کے دو مجموعوں کا تذکرہ ملتا ہے:

(۱) راحت القلوب: اس کو حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ نے جمع کیا ہے۔

(۲) اسرار الاولیا: اس کو حضرت خواجہ بدرالدین اسحٰق قدس سرہ نے مرتب کیا ہے۔ (بزمِ صوفیہ، ص: ۱۶۳)

ملفوظات مشائخ کی اہمیت وافادیت

مشائخ کی ان باتوں کے مجموعہ کو ملفوظات کہتے ہیں جو اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ، مقاماتِ عالیہ اور احوالِ سنیہ کی ترغیب وتحریض پر مشتمل ہو۔ مشائخ کے ملفوظات راہِ سلوک میں سالکین کے لیے بے حد معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ یہ لوگوں کو خدا طلبی، خدا ترسی، حبِ الٰہی، دنیا بے زاری، فقر و فاقہ، ریاضت ومجاہدہ، خوف وخشیت، صبر وشکر اور تواضع وانکساری جیسے اوصافِ حمیدہ پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ یہ عشاق کے بھڑکتے دلوں کے لیے سکون و راحت کا سامان، مغموم دلوں کے لیے مداوائے غم، راہِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے لوگوں کے لیے منزل، بیمار دلوں کے لیے شفا اور احوال ومقامات کی ترقی کا باعث ہوا کرتے ہیں۔ ان سے مریدوں کے قلوب کو ریاضت ومجاہدہ میں تقویت ملتی ہے، طالبانِ مولیٰ کو صراطِ مستقیم پر ثبات قدمی میسر ہوتی ہے اور سالکانِ راہِ الٰہی شیطانی وساوس و خطرات سے نجات پاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بجا ہوگا کہ یہ ملفوظات طالبوں کے واسطے مشائخ کی صحبتِ معنوی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حضرات مشائخ قدست اسرارہم کے اقوال وملفوظات اور حکایات وقصص کی اہمیت وافادیت کو اجاگر

کرنے کے لیے قطبِ عالم حضرت مخدوم شیخ سعد الدین خیر آبادی قدس سرہ کے وہ دو اقتباسات قابل ذکر ہیں جو آپ نے ملفوظاتِ مشائخ کے حوالے سے رقم فرمائے ہیں:

''حضرت جنید بغدادی قدس سرہ سے لوگوں نے پوچھا کہ مرید کے لیے مشائخ کے ملفوظات وحکایات کا کیا فائدہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس سے دل کو مجاہدہ وریاضت کے میدان میں تقویت ملتی ہے اور طلب مولیٰ کے عہد و پیمان کی تجدید میں ثبات حاصل ہوتا ہے۔ حاضرین نے پوچھا: قرآن کریم میں اس کی کوئی دلیل موجود ہے؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں! وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ (ھود:۱۲۰) [اور ہم آپ سے رسولوں کے واقعات بیان کرتے ہیں تاکہ ہم آپ کے دل کو تقویت عطا کریں۔]

بزرگوں نے فرمایا ہے: كَلِمَاتُ الْمَشَايِخِ جُنْدٌ مِنْ جُنُوْدِ اللّٰهِ فِي أَرْضِهٖ یعنی مشائخ کی باتیں طالبان مولیٰ کو مدد پہنچانے والے لشکر ہیں۔ وہ بے چارہ جسے شیخ کامل کی صحبت نصیب نہ ہو، طلب مولیٰ کے دوران اور ریاضت ومجاہدہ کے زمانے میں اگر کسی سنت کی آڑ میں یا کسی بدعت کے ذریعے شیطان اس کے طلب کی راہ میں آنا چاہے تو وہ مشائخ کے ملفوظات کو مضبوطی سے پکڑ لے اور اپنے معاملات کو ان مشائخ کے کلمات کے معیار پر پرکھے، تاکہ ہر طرح کے شیطانی خطرات ووساوس سے نجات پائے اور جادۂ مستقیم اور دین قویم پر استقامت کے ساتھ گامزن رہے۔

حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمان بھی اسی سے تعلق رکھتا ہے کہ مرید کو چاہیے کہ ہر روز ایک پارہ کی مقدار مشائخ کی باتوں کو بیان کرے اور سنے۔'' (مجمع السلوک، ج:۱،ص:۷۰)

مشائخ کے ملفوظات کتنا اہم اور کس قدر نفع بخش ہوتے ہیں اس کا اندازہ امیر حسن علاء سنجری رحمۃ اللہ علیہ کے اس اقتباس سے بھی بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''۸ شوال ۷۰۷ھ بروز ہفتہ قدم بوسی کی سعادت ملی، اس دن میں نے اپنے شیخ کے کلمات کو جمع کرنے کے بارے میں دریافت کیا، وقت بہت اچھا تھا، بڑی پرسکون خلوت کا سماں تھا، میں نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا اور عرض گزار ہوا کہ مخدوم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، فرمایا: ضرور کہو! میں نے عرض کیا کہ مخدوم کی غلامی میں داخل ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا، ہر بار جب بھی قدم بوسی کی دولت میسر آئی مخدوم کی زبانِ گوہر بار سے وعظ ونصیحت، طاعت وترغیب، مشائخ کے حکایات اور ان کے احوال کے حوالے سے بہت سارے فوائد اور ہر باب میں روح افزا کلمات سنے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کلمات مجھ خستہ حال کا دستور العمل اور رہنما بن جائیں اس لیے ان کو اپنی فہم کے مطابق میں نے قلم بند کرلیا ہے۔ مخدوم کی زبانِ مبارک سے بارہا یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ مشائخ کی کتابیں اور ان

کے وہ ارشادات جو انہوں نے سلوک کے بارے میں فرمائے ہیں نظر کے سامنے رکھنا چاہیے، چوں کہ کوئی بھی مجموعہ میرے لیے میرے مخدوم کے جاں بخش کلمات سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں نے جو بھی زبانِ مبارک سے سنا جمع کر لیا اور اب تک اس کا اظہار نہیں کیا ہے، حکم کا منتظر ہوں کہ کیا فرمان صادر ہوتا ہے۔ جب خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے یہ عرض داشت سن لی تو فرمایا کہ: جب میں شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں پہنچا تو یہی بات میرے دل میں بھی آئی تھی کہ جو کچھ حضرت کی زبانِ مبارک سے سنا کروں گا، لکھ لیا کروں گا۔۔۔ الغرض اس روز شیخ سے میں نے جو کچھ سنا اپنے مقام پر واپس آنے کے بعد لکھ لیا، اس کے بعد جب بھی کچھ سنتا قلم بند کر لیتا۔''

(فوائد الفواد، ج:۱، ص:۴۹۔۵۰، مجلس:۲۸)

حضرت شیخ الاسلام فرید الدین گنج شکر قدس سرہ بھی ملفوظات کو جمع کرانے کا اس درجہ اہتمام فرمایا کرتے تھے کہ دورانِ گفتگو اگر کوئی اہم بات یا بہترین نکتہ بیان فرماتے تو پہلے مجلس میں پوچھ لیا کرتے تھے کہ حضرت محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا مجلس میں موجود ہیں یا نہیں؟ اگر وہ موجود نہ ہوتے تو بعد میں جب حاضرِ خدمت ہوتے تو پھر ان نکات کو بیان فرماتے اور ان فوائد کو دہراتے جو حضرت سلطان جی کی غیر موجودگی میں بیان فرمائے تھے۔ (ایضا)

حضرت شیخ الاسلام خواجہ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ نے فرمایا:

''اگر کسی را شیخ کامل نہ باشد کتابِ اہلِ سلوک را پیشِ خود دارد و متابعتِ آن نماید۔'' (راحت القلوب، مجلس: ۵، ص:۱۵)

اگر کسی کو شیخِ کامل نہ ملے تو وہ سلوک کی کتابوں کا مطالعہ کرے اور ان پر عمل پیرا ہو۔

پھر ملفوظات کے حوالے سے محبوبِ الٰہی کا مذکورہ بالا قول جو حسن علا سنجری نے ضمناً ذکر کیا ہے کہ: ''کتابِ مشایخ و اشاراتِ ایشان کہ در سلوک راندہ اند در نظر می باید داشت۔'' (فوائد الفواد، ج:۱، ص:۴۹، مجلس:۲۸) [مشائخ کی وہ کتابیں اور ان کے وہ ارشادات جن میں انہوں نے سلوک کے متعلق کلام فرمایا ہے نظر میں رکھنا چاہیے] بھی ملفوظات کی اہمیت کو دوبالا کر دیتا ہے۔

مخدوم گرامی داعیِ اسلام شیخ ابو سعید دام فضلہ کا بھی یہی حال ہے، چناں چہ دورانِ گفتگو آپ کے دل پر بھی کوئی نکتہ آتا ہے تو اسے بیان فرماتے ہیں اور پھر قرآن و حدیث اور اقوال و حکایاتِ مشائخ سے اس کو مؤید فرماتے ہیں۔ اسی طرح خانقاہِ عالیہ عارفیہ میں علما کی ایک ٹیم حضرت شیخ کی نگرانی میں مختلف علوم و فنون میں تصنیف و تالیف اور متفرق کتب کے ترجمہ و شروح لکھنے میں مصروفِ عمل ہیں، خاص طور سے عربی و فارسی زبان میں مشائخ کی قدیم کتبِ تصوف کی تحقیق و تخریج اور ان پر حواشی و تعلیقات کا کام یہاں مسلسل جاری ہے۔ ہمارے شیخ کی عادتِ

کریمہ یہ ہے کہ جو جس فن یا جس کتاب کے کام میں لگا ہوا ہے اگر اس کتاب کے متعلق یا اس کتاب کی کسی حدیث یا اس کتاب کے اندر مذکور کسی بھی بات کے متعلق شیخ کے دل پر کوئی نکتہ آتا ہے تو جو شخص اس کتاب پر کام کرتا ہے اس کو بلا کر آپ وہ نکتہ اس سے بیان فرماتے ہیں اور پھر ساتھ میں اس بات کو قرآن وحدیث اور اقوال مشائخ سے بھی مدلل اور مبرہن فرماتے ہیں۔

راحت القلوب کی استنادی حیثیت

بعض حضرات نے راحت القلوب پر کلام کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ مثلاً مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب تاریخِ دعوت وعزیمت میں حضرت شیخ الاسلام خواجہ فریدالدین قدس سرہ کی سوانح کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"راحت القلوب میں جو آپ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے اس سفر اور دوسری سیاحتوں کی بڑی تفصیل موجود ہے، لیکن چوں کہ اس کتاب کی نسبت صحیح نہیں ہے، اس پر اعتماد نہیں کیا گیا، بعض دوسری کتابوں میں بھی بعض دوسری تفصیلات ہیں۔" (تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ سوم، ص: ۳۷)

ان کے علاوہ دیگر لوگوں نے بھی راحت القلوب کی نسبت پر کلام کیا ہے۔

راحت القلوب پر کلام اور اس کی نسبت کی عدمِ صحت کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

(۱) راحت القلوب میں مذکور تاریخی اندراجات کی غلطیاں

(۲) محبوبِ الٰہی یا آپ کے کسی مرید یا خلیفہ نے حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر قدس سرہ کے ملفوظات کا راحت القلوب کے نام سے کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ راحت القلوب میں جو تاریخی اندراجات ہیں وہ غلط ہوں، لیکن صرف تاریخی اندراجات کی غلطیوں کی وجہ سے کسی کتاب کو غیر معتبر نہیں کہا جاسکتا، صرف ان کی وجہ سے کسی کتاب کو غیر مستند، جعلی یا وضعی کہنا خلافِ تحقیق ہے۔ کیوں کہ تاریخی غلطیاں مورخین سے بکثرت ہوئی ہیں، جبکہ راحت القلوب کے بعض اندراجات کی تائید سیر الاولیا سے ہوجاتی ہے، مثلاً راحت القلوب کی پہلی مجلس کی تاریخ ۶۵۵ھ درج ہے اور یہی تاریخ سیر الاولیا میں خواجہ فریدالدین قدس سرہ سے بیعت ہونے کی تاریخ ہے، امیر خورد لکھتے ہیں:

"پوشیدہ نماند کہ حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ پانژدہم رجب المرجب سنہ خمس وخمسین وست ماۃ بشرف ارادت شیخ شیوخ العالم مشرف شدہ اند و دران وقت بست سالہ بودند پس ولادت حضرت سلطان المشائخ در شش صد وسی وشش باشد وہر گاہ کہ نقل ایشان در ہفت صد و بست وپنج باشد سن شریف ایشان ہشتاد ونہ باشد۔ واللہ اعلم۔" (سیر الاولیا، ص: ۱۵۴)

اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ ۱۵ رجب ۶۵۵ھ کو شیخ شیوخ

العالم کی ارادت سے مشرف ہوئے۔اس وقت آپ کی عمر مبارک بیس سال تھی۔اس اعتبار سے آپ کی ولادت ۶۳۶ھ،آپ کی تاریخِ وفات ۷۲۵ھ اور آپ کی عمر ۸۹ سال قرار پاتی ہے۔

اور فوائد الفؤاد کے مطابق بھی آپ نے اسی دن سے راحت القلوب کی تدوین و ترتیب کا کام شروع کیا ہے جس دن خواجہ فرید الدین قدس سرہ کی بارگاہ میں پہلی بار آپ کی حاضری ہوئی، اور مذکورہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہو چکا کہ آپ خواجہ فرید کی بارگاہ میں ۱۵ رجب ۶۵۵ھ میں حاضر ہوئے، یہی تاریخ راحت القلوب کی پہلی مجلس میں بھی ہے۔چنانچہ حضرت حسن علا سجزی رقم طراز ہیں:

''جب میں شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں پہنچا تو یہی بات میرے دل میں بھی آئی تھی کہ جو کچھ خواجہ کی زبانِ مبارک سے سنا کروں گا، لکھ لیا کروں گا۔اولِ روز دست بوسی کی دولت ملی تو پہلی بات جو شیخ سے سنی وہ یہ تھی۔۔۔۔۔۔۔۔الغرض اس روز شیخ سے میں نے جو کچھ سنا اپنے مقام پر واپس آنے کے بعد لکھ لیا، اس کے بعد جب بھی کچھ سنتا قلم بند کر لیتا۔''

(فوائد الفواد، ج:۱،ص:۴۹۔۵۰،مجلس:۲۸)

مذکورہ باتوں سے یہ ثابت ہو چکا کہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا ۱۵ رجب ۶۵۵ھ کو شیخ شیوخ العالم کی بارگاہ میں پہنچے، اسی دن شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے اور اسی دن سے آپ نے شیخ کے ملفوظات کو قلم بند کرنا شروع فرمایا، اور یہی تاریخ راحت القلوب کی پہلی مجلس کی ہے۔

رہی بات یہ کہ حضرت محبوبِ الٰہی نے یا آپ کے کسی بھی مرید یا خلیفہ نے آپ کے جمع کردہ ملفوظات کو راحت القلوب کے نام سے کہیں ذکر نہیں کیا ہے، تو اس پر عرض ہے کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ راحت القلوب کے مؤلف محبوبِ الٰہی نہیں ہیں، کیوں کہ ممکن ہے کہ حضرت محبوبِ الٰہی نے تواضعاً اس کتاب کا نام نہ لیا ہو اور آپ ہی کی اتباع میں آپ کے مریدین اور خلفا میں سے کسی نے بھی اس نام کا ذکر نہ کیا ہو۔یا یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت محبوبِ الٰہی نے ملفوظات کو جمع تو کیا تھا مگر ان کو کتابی شکل میں آپ نے ترتیب نہیں دی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی نام آپ نے تجویز فرمایا تھا، بعد میں جب وہ ملفوظات کتابی شکل میں مرتب ہوئے اور اس کو بعد کے لوگوں نے طباعت کے مرحلے سے گزارنا چاہا تو ہو سکتا ہے کہ طباعت کے وقت یہ نام تجویز کیا گیا ہو۔واللہ اعلم۔

لیکن اتنی بات تو تحقیق سے ثابت ہے کہ حضرت محبوبِ الٰہی نے اپنے شیخ خواجہ فرید الدین قدس سرہ کے ملفوظات کو جمع کیا ہے اور اس بات کا ذکر آپ نے خود بھی کیا ہے۔چنانچہ فوائد الفواد شریف میں ہے:

''الغرض آن روز ہر چہ از شیخ شنودم، چون بمقامِ خود باز آمدم بر جائی نسخہ کردم، بعد ازان ہر بار آن چہ سماع می افتاد در قلم می آوردم تا این معنی بخدمتِ شیخ باز نمودم، بعد ازان ہر گاہ کہ حکایتی و اشارتی بیان کردی می فرمودی کہ حاضر ہستی؟ تا آن غایت کہ اگر من غایب بودمی، چون باز بخدمت پیوستمی فائدہ کہ در

غیبت فرمودہ بودی آن را اعادہ کردی، بعد ازان خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ کرامتی معائنہ کردم: ہمدرین ایام مردی مرا کاغذہای سپید داد یک جا جلد کردہ، من آن رابستدم وفوائد شیخ الاسلام ہمہ دران جا ثبت کردم، بالا نبشتم کہ **سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم**، بعد ازان کلماتی کہ از شیخ سماع داشتم بنوشتم، وتا این غایت آن مجموع بر من است۔"

(ج:۱، مجلس:۲۸، ص:۵۰۔۵۱)

یعنی جس دن میں پہلی بار شیخ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، اس روز شیخ سے میں نے جو کچھ سنا اپنے مقام پر واپس آنے کے بعد لکھ لیا، اس کے بعد جب بھی کچھ سنتا تھا قلم بند کر لیتا۔ ملفوظات کو لکھنے والی بات میں نے شیخ کو بھی بتائی۔ اس کے بعد دورانِ گفتگو اگر کوئی اہم بات یا بہترین نکتہ بیان فرماتے تو پہلے مجلس میں میرے بارے میں پوچھ لیا کرتے تھے کہ میں مجلس میں موجود ہوں یا نہیں؟ اگر میں موجود نہ ہوتا تو بعد میں جب حاضرِ خدمت ہوتا تو پھر ان نکات وفوائد کو دوبارہ بیان فرماتے جو میری غیر موجودگی میں بیان فرمائے تھے۔ اس کے بعد حضرت محبوبِ الٰہی نے فرمایا کہ: ملفوظات کو جمع کرنے کے ایام کے دوران ہی ایک شخص نے مجھے سفید کاغذ کی ایک جلد دی، میں نے اس سے وہ جلد لے لی اور شیخ الاسلام کے سارے فوائد کو اس پر لکھ لیا، میں نے اوپر یہ دعا لکھی: **سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم**، اس کے بعد شیخ کی زبانِ مبارک سے جو کچھ میں نے سنا تھا اس کے نیچے لکھ لیا۔ ابھی تک ملفوظات کا وہ مجموعہ میرے پاس ہے۔

اسی طرح سیر الاولیا میں بھی اس بات کا ذکر موجود ہے کہ حضرت محبوبِ الٰہی نے اپنے شیخ کے ملفوظات کو جمع کیا ہے، چناں چہ امیر خورد کرمانی قدس سرہ رقم طراز ہیں:

"بعضی ملفوظاتی شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز، سلطان المشائخ قدس اللہ سرہ العزیز بخطِ مبارک خود در قلم آورد۔" (آئینۂ ملفوظات بحوالہ سیر الاولیا، ص:۲۱۹)

حضرت خواجہ فرید قدس سرہ کے بعض ملفوظات کو حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ نے خود قلم بند فرمایا۔

مذکورہ بالا دونوں اقتباس سے یہ بات یقینی طور سے ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرہ نے اپنے شیخ خواجہ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ کے ملفوظات کو جمع فرمایا ہے، خاص طور سے فوائد الفواد کے مذکورہ بالا اقتباس سے اس بات کی بھی تحقیق ہو جاتی ہے کہ وہ ملفوظات حضرت محبوبِ الٰہی کے پاس موجود تھے کیوں کہ آپ نے اسی مجلس میں یہ بھی فرمایا کہ وہ ملفوظات اب تک میرے پاس موجود ہیں اور فوائد الفواد کی وہ مجلس ۸ شوال ۷۰۸ھ بروز ہفتہ کی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ محبوبِ الٰہی یا آپ کے کسی مرید یا خلیفہ نے ان ملفوظات کو راحت القلوب کے نام سے یاد نہیں کیا ہے۔

بعض مستند کتبِ تصوف میں راحت القلوب کا ذکر

بعد کی مستند اور معتبر کتابوں میں اس بات کا بیان موجود ہے کہ راحت القلوب خواجہ فرید کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس کو سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا نے جمع کیا ہے۔ چناں چہ حضرت مخدوم جہاں نیاں جہاں گشت قدس سرہ (۷۸۵ھ) کے مرید وخلیفہ احمد بہاء بن یعقوب بن حسین بن محمود بن سلیمان البتی قدس سرہ نے اپنے شیخ مخدوم جہاں نیاں جہاں گشت کے ملفوظات خزانۂ جلالی میں فرمایا ہے:

”خواجہ شیخ الاسلام نظام الحق والشرع والدین نور اللہ مضجعہ از تقریر خواجہ شیخ الاسلام قطب الانام فرید الحق والدین قدس اللہ روحہ العزیز در راحت القلوب آوردہ است:

زہی سعادت آن مرید کہ ہر چہ از زبان پیر خود بشنود، ہوش وگوش او بدان متعلق شود وآن را بنویسد زیرا چہ در آثار اولیاء آمدہ است چون مرید ہر چہ از پیر خود بشنود وآن را بنویسد بعدد ہر حرف کہ در قلم آرد ثواب طاعت در نامہ اعمال او ثبت فرمایند و بعد مردن جای او در علیین باشد۔“ (خزانۂ جلالی مخطوطہ نسخہ ندوہ، ص:۵)

اسی طرح مجمع السلوک والفوائد میں حضرت مخدوم شیخ سعد الدین خیر آبادی قدس سرہ (۹۲۲ھ) راحت القلوب کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”پیر دست گیر اس فقیر سے بارہا فرماتے تھے کہ حضرت شیخ الاسلام شیخ نظام الدین قدس سرہ نے قطب عالم شیخ فرید الدین قدس اللہ روحہ کے ملفوظات کے حوالے سے راحت القلوب میں بیان کیا ہے کہ وہ مرید بڑا سعادت مند ہے جو اپنے پیر کی باتوں کو بغور سن کر اسے تحریر کا جامہ پہنادے، اس لیے کہ آثار اولیا میں منقول ہے کہ جو مرید اپنے پیر کی باتوں کو بغور سن کر اسے قید تحریر میں لے آتا ہے، ہر حرف کے عوض اس کے نامۂ اعمال میں نیکی لکھی جاتی ہے اور اس کی وفات کے بعد اس کا ٹھکانہ جنت کے اعلیٰ محلات میں ہوتا ہے۔“ (مجمع السلوک، ج:۱، ص:۷۶)

شاہ محمد بلاق دہلوی اپنی تصنیف مطلوب الطالبین (جو حضرت سلطان جی خواجہ نظام الدین اولیا کی سوانحِ حیات پر مشتمل ہے) میں راحت القلوب کی پہلی مجلس کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”سلطان المشائخ نے اپنی تصنیف راحت القلوب جس میں شیخ فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات مجلس وار جمع کیے ہیں، مجلسِ اول میں تحریر فرمایا ہے۔“ (مطلوب الطالبین مترجم، ص:۳۹، مطلب چہارم)

اسی طرح دیگر مستند اور معتمد کتابوں میں بھی اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ راحت القلوب خواجہ فرید قدس سرہ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جس کو خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی قدس سرہ نے جمع فرمایا ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ حضرت سلطان جی قدس سرہ کے زمانۂ اقدس میں وہ ملفوظات اس نام سے معروف نہ تھے۔ علامہ اخلاق حسین دہلوی لکھتے ہیں:

''حضرت محبوبِ الٰہی نے حضرت بابا صاحب کے ملفوظات جمع فرمائے تھے، جو آٹھویں صدی ہجری کے ربعِ اول تک آپ کے پاس محفوظ و موجود تھے، مگر ظنِ غالب یہ ہے کہ اس وقت تک یہ مجموعۂ ملفوظات متداول و معروف نہ تھا، اگر ہوتا تو اعادۂ ذکر کی ضرورت نہ ہوتی، تاہم اس کے مبارک نام کی اطلاع اس سے قریب تر عہد ہی میں شمائل الاتقیا و دلائل الاتقیا سے ملتی ہے، جو حضرت محبوبِ الٰہی کے معزز خلیفہ مولانا برہان الدین غریب المتوفی ۷۳۸ھ کے ایما سے اور ان کی نگرانی میں ان کے لائق ترین مرید و مستند اہلِ قلم مولانا رکن الدین عماد کاشانی دبیر نے تالیف کی تھی، جس کی فہرست مآخذات میں اس کا نام موجود و مرقوم ہے۔'' (آئینۂ ملفوظات، ص: ۲۱۷۔۲۱۸)

راحت القلوب اور فوائد الفواد کا مشمولاتی اشتراک

راحت القلوب میں مذکور بہت ساری روایتوں کی تائید فوائد الفواد سے بھی ہوتی ہے، اسلوبِ بیان اور الفاظ کا اگرچہ کہیں کہیں فرق بھی نظر آتا ہے لیکن بعض جگہوں میں بعینہٖ ایک جیسے جملے اور ایک جیسے الفاظ دونوں کتابوں میں مشترک ہیں۔ ذیل میں اس کی کچھ نظیریں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ محبوبِ الٰہی کا پہلی بار شیخ کی مجلس میں حاضر ہونے کا ذکر اور اپنے شیخ کے ملفوظات کو جمع کرنے کا ارادہ اور دیگر باتیں۔

۲۔ خواجہ فرید الدین قدس سرہ کا فرمان کہ زکوۃ کی تین قسمیں ہیں: (۱) زکوۃِ شریعت (۲) زکوۃِ طریقت (۳) زکوۃِ حقیقت۔ پھر ان تینوں قسموں میں سے ہر ایک کی وضاحت۔

۳۔ شبِ معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خرقہ عطا ہونے کا بیان، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سوال کرنا اور پھر اس بات کا ذکر کہ وہ خرقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مولیٰ علی کو عطا کیا۔

۴۔ اوراد کی پابندی کا ذکر اور اس کا بیان کہ صاحبِ ورد سے کسی ورد کا ترک ہو جانا اس کی موت کے برابر ہے، پھر اس حوالے سے ایک بزرگ کی حکایت۔

۵۔ خواجہ فرید قدس سرہ کا قوالی سننے کا اشتیاق ظاہر کرنا، پھر خواجہ بدر الدین اسحاق کو خط پڑھنے کا حکم دینا اور ان کا کھڑے ہو کر خواجہ فرید قدس سرہ کو خط پڑھ کر سنانے کا بیان۔

۶۔ خواجہ جلال الدین تبریزی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی ملاقات کا ذکر۔

۷۔ روزوں کے فضائل کا بیان۔

۸۔ خواجہ فرید کی بارگاہ میں ایک جوگی کا حاضرِ خدمت ہونا، اس کا اسلام قبول کرنا، محبوبِ الٰہی کا اس جوگی سے کچھ سیکھنا، پھر شیخ الاسلام خواجہ فرید کی بارگاہ میں اس علم کے بارے میں دریافت کرنا اور خواجہ فرید کا محبوبِ الٰہی

سے یہ کہنا کہ: مولانا نظام الدین! خوب ہوا جو تم نے اس کو سیکھ لیا، لیکن یہ تمہارے کس کام کا؟

۹۔ تین اوقات میں رحمت کا نزول ہوتا ہے: ۱۔ سماع کے وقت۔ ۲۔ عبادت کی نیت سے کھائے جانے والے کھانے کے وقت۔ ۳۔ درویشوں کی باہمی رنجش کو مٹانے کے وقت۔ اسی گفتگو کے درمیان خواجہ فرید کی بارگاہ میں چھ سات درویشوں کا حاضر ہونا اور اپنی باہمی مصالحت کے لیے بارگاہ میں درخواست پیش کرنا۔

۱۰۔ رئیس نامی ایک شخص کا خواب اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا درود شریف پڑھنے کی حکایت۔

۱۱۔ خواجہ فرید کی بارگاہ میں شمس دبیر کا اشعار پڑھ کر سنانے کا ذکر۔

۱۲۔ سلطان غیاث الدین کے ہاتھوں سلطان ناصر الدین کا خواجہ فرید قدس سرہ کی بارگاہ میں نذر اور نقود بھیجوانے کا واقعہ۔

۱۳۔ مولانا رضی الدین صنعانی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی کتاب مشارق الانوار کا ذکر۔

۱۴۔ حضرت شیخ سعد الدین حمویہ قدس سرہ کی حکایت اور ان کے فضائل ومناقب۔

راحت القلوب	فوائد الفواد
(۱) مجلس: ۱، ص: ۲	جلد: ۱، مجلس: ۲۸، ص: ۵۰۔۵۱
(۲) م: ۱، ص: ۳	ج: ۳، م: ۹، ص: ۱۷۸
(۳) م: ۱، ص: ۳	ج: ۴، م: ۹۴، ص: ۳۲۹۔۳۰
(۴) م: ۸، ص: ۲۲	ج: ۵، م: ۴، ص: ۳۸۰
(۵) م: ۸، ص: ۲۳۔۲۴	ج: ۴، م: ۲۲، ص: ۲۵۴۔۵۵
(۶) م: ۸، ص: ۲۳۔۲۴	ج: ۴، م: ۲۲، ص: ۲۵۵
(۷) م: ۹، ص: ۲۶	ج: ۴، م: ۶۰، ص: ۳۵۲
(۸) م: ۹، ص: ۲۸	ج: ۵، م: ۱۹، ص: ۴۱۷۔۱۸
(۹) م: ۱۰، ص: ۲۹	ج: ۲، م: ۵۳، ص: ۱۴۶۔۴۷
(۱۰) م: ۱۰، ص: ۳۰۔۳۱	ج: ۳، م: ۱۰، ص: ۱۸۴۔۸۵
(۱۱) م: ۱۰، ص: ۳۱	ج: ۴، م: ۱۰، ص: ۲۱۸۔۱۹
(۱۲) م: ۱۱، ص: ۳۱	ج: ۳، م: ۷، ص: ۱۷۱
(۱۳) م: ۱۱، ص: ۳۲	ج: ۳، م: ۹، ص: ۱۷۸۔۷۹
(۱۴) م: ۱۱، ص: ۳۲	ج: ۴، م: ۱۱، ص: ۲۲۱۔۲۲

اس کے علاوہ دیگر قدیم کتبِ تصوف میں بھی راحت القلوب میں ذکر کردہ واقعات اور روایتیں ملتی ہیں۔

اخلاق حسین دہلوی لکھتے ہیں:

''مخدوم نصیر الدین چراغِ دہلی کے ایک بزرگ و عالم مرید مجیر وجیہ ادیب کی تصنیف کتاب مفتاح الجنان ہے، جو انہوں نے ۷۵۶ھ میں لکھنا شروع کی تھی جس کی تصحیح خواجہ کمال الدین علامہ نے فرمائی، اس میں وہ ملفوظات بکثرت منقول ہیں جو راحت القلوب کے سوا دیگر دستیاب شدہ کسی مجموعۂ ملفوظات میں نہیں ہیں، اور یہ امر بلاشبہہ راحت القلوب کے استناد اور قدامت کی روشن دلیل ہے۔'' (آئینۂ ملفوظات، ص:۲۱۹)

خلاصۂ بحث

یہ بات تو تحقیق سے ثابت ہے کہ حضرت سلطان المشائخ محبوبِ الٰہی قدس سرہ نے اپنے شیخ خواجہ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ کے ملفوظات کو جمع فرمایا ہے اور ۸ شوال ۷۰۸ھ تک وہ ملفوظات حضرت محبوبِ الٰہی کے پاس ہی موجود تھے، البتہ کلام اس میں ہے کہ راحت القلوب محبوبِ الٰہی کے جمع کردہ ملفوظات کا مجموعہ ہے یا نہیں؟ تاہم یہ بھی قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ راحت القلوب ان ملفوظات کا مجموعہ نہیں ہیں جن کو محبوبِ الٰہی نے جمع فرمایا تھا کیوں کہ خزانۂ جلالی، مجمع السلوک والفوائد، شمائل الاتقیا و دلائل الاتقیا، مطلوب الطالبین اور مفتاح الجنان جیسی تصوف و تذکرہ کی کتابیں راحت القلوب کی نسبت حضرت محبوب الٰہی کی جانب ثابت کر رہی ہیں۔ پھر فوائد الفواد اور دیگر مستند کتابوں سے راحت القلوب کے مضامین و حکایات کی تائید بھی ہو رہی ہے، اور پھر تیسری سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تاریخی اندراجات کے علاوہ راحت القلوب کے مضامین و حکایات میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی ہے جن کو محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا یا خواجہ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ کی طرف منسوب کرنا غلط معلوم ہوتی ہو۔ جن لوگوں نے بھی راحت القلوب کی نسبت کو غلط کہا ہے انہوں نے عدمِ صحتِ نسبت کی کوئی بھی علت بیان نہیں کی ہے اور نہ ہی اس کی نسبت کی عدمِ صحت پر کوئی دلیل دی ہے۔ مولانا ابوالحسن ندوی بھی صرف یہ کہہ کر گزر گئے ہیں کہ: ''لیکن چوں کہ اس کتاب کی نسبت صحیح نہیں ہے، اس پر اعتماد نہیں کیا گیا''۔ اپنی اس بات پر انہوں نے کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ راحت القلوب کی نسبت کی عدمِ صحت کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کہ فوائد الفواد یا سیر الاولیا میں راحت القلوب کے نام کا ذکر نہیں ملتا ہے یا راحت القلوب میں مذکور فلاں روایت، فلاں حکایت، یا خواجہ فرید کی فلاں سیاحت کا ذکر فوائد الفواد اور سیر الاولیا میں نہیں ملتا ہے اس لیے اس کتاب کی نسبت صحیح نہیں، بے حد غیر معقول دلیل ہے۔ اس دلیل کا ضعف اہلِ علم و دانش پر مخفی نہیں ہے۔ کیوں کہ کسی ایک کتاب کے نام کا کسی دوسری کتاب میں ذکر نہ ہونا یا کسی ایک کتاب کی کسی روایت، حکایت اور سیاحت کا کسی دوسری کتاب میں تذکرہ نہ ہونا پہلی کتاب کی عدمِ صحت کی دلیل نہیں ہے۔ جناب اخلاق حسین دہلوی لکھتے ہیں:

''یقین ہے کہ بعض مقامات کا ذکر ملفوظات کے ان مجموعات میں بھی ہوگا جو دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے، اور آج نایاب و ناپید ہیں۔ فوائد الفواد میں صرف ایسے سفر کا ذکر ملتا ہے جس کا تعلق اندرونِ ملک سے ہے، بیرونی ممالک کی سیاحت کا ذکر اس میں نہیں ہے، مگر یہ وجہ انکار نہیں ہوسکتی، خواجہ امیر حسن علا سنجری کے اسلوب کا وصف ایجاز ہے، جس کی بدولت کتنی ہی اطلاعات نا تمام رہ گئی ہیں۔ فوائد الفواد میں وہ سب کچھ ہے جو حاضرینِ مجلس کے دکھ درد کی دوا ہے، مگر یہ سمجھنا کہ جو کچھ فوائد الفواد میں نہیں ہے اس کا وجود ہی نہیں ہے، معقولیت سے بعید ہے۔ اس میں روغن فروش کی بیوی کا اور میر شکار کے واقعہ کا ذکر نہیں ہے جو نہایت درجہ حیرت انگیز اور بصیرت افروز ہے۔ اس میں لق و دق صحرائے اجودھن میں بڑے اور گھن دار درخت کے نیچے حضرت بابا صاحب کے قیام فرمانے کا اور حضرت بابا صاحب کے چلۂ معکوس کا ذکر بھی نہیں ہے، تو کیا ان سب ہی سے انکار کیا جاسکتا ہے؟'' (آئینۂ ملفوظات، ص:۲۳۹)

راحت القلوب کا اسلوبِ بیان

راحت القلوب کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ تصوف و سلوک کے مشکل سے مشکل مسائل کو آسان لب و لہجہ میں ایسے اسلوب کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ عام فارسی خواں آدمی بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

اندازِ بیان کا یہ کمال ہے کہ کہیں بھی سلاست نہیں ٹوٹتی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لڑیوں میں موتیوں کو پروتے چلے گئے ہیں۔ ترہیب و ترغیب، انذار و تبشیر، قصص و امثال اور حکایات و ضرب الامثال کو اس قدر موثر ترین اسلوب میں ذکر کیا گیا ہے کہ قاری کے دل پر اس کا غیر معمولی اثر ہوتا ہے۔ پڑھنے والا کچھ لمحات کے لیے ایسا کھو جاتا ہے جیسے وہ خود صاحبِ ملفوظات کی مجلس میں ہو اور بلا واسطہ ان سے سن رہا ہو۔ اس کی جاذبیت و کشش اور تاثیر کا یہ حال ہے کہ پڑھنے والے کا دل بے اختیاری طور پر اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے، دل کرتا ہے کہ جب تک کتاب کو ختم نہ کروں سکون نہیں ملے گا۔

بعض مقامات میں تو کیف و سرور اور مستی و مدہوشی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ طبیعت مچل جاتی ہے اور آنکھیں نمناک ہوئے بغیر نہیں رہ پاتی ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام خواجہ فریدالدین قدس سرہ کا عجیب دل آویز اور پرکشش انداز میں وعظ و نصیحت کرنا، واقعات و حکایات کو ذکر کرنا، بعض جگہوں میں کچھ اشعار کا پڑھنا، ان کی تکرار کرنا، آپ کا چشم پُرآب ہوجانا، وعظ و نصیحت کرتے کرتے بے اختیار وجد میں آجانا، کبھی کبھی نعرہ مار کر بے ہوش ہوجانا، پھر ہوش میں آنے کے بعد اپنے محبوب کا ذکر چھیڑ دینا اور تذکیر کرتے کرتے یادِ الٰہی میں غرق ہوجانا، ان ساری باتوں کا قاری کے دل پر ایسا گہرا اثر پڑتا کہ وہ فرطِ محبت اور غایتِ شوق میں یہ تمنا کرنے لگتا ہے کہ کاش میں بھی اُس زمانہ میں ہوتا اور ان کے دیدار سے اپنے چشم و دل کو بینا کرتا۔

ایسی تاثیر اور اس قدر کشش کیوں کر نہ ہوگی جب کہ صاحبِ ملفوظات خود شیخ شیوخ العالم خواجہ فرید الحق والدین اور جامعِ ملفوظات محبوبِ الٰہی سلطان المشائخ خواجہ نظام الحق والشرع والدین قدس اللہ اسرار ہما ہیں۔

خود حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرہ حضرت شیخ الاسلام خواجہ فرید قدس سرہ کے اسلوبِ بیان کی جاذبیت و تاثیر کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے حسنِ عبارت، لطافتِ تقریر، عذوبتِ بیان اور شیرینیِ گفتار کا یہ عالم تھا کہ مخاطب کے دل پر اثر ہوتا تھا، حلاوت ایسی تھی کہ الفاظ کانوں میں رس گھولتے تھے، اور سننے والا سوچتا تھا کاش غایتِ ذوق و کیفیت میں اس وقت دم نکل جائے تو کتنا اچھا ہو، شاید اسی لیے حضرت شیخ الاسلام کو گنجِ شکر کہا گیا ہے۔'' (مقدمہ فوائد الفواد، ص:۵۹)

راحت القلوب کے خصوصیات و امتیازات

ہر ملفوظ کے اپنے کچھ خصوصیات اور امتیازات ہوا کرتے ہیں جو اس کو دیگر ملفوظات سے ممتاز کرتے ہیں۔ راحت القلوب کے بھی چند ایسے خصائص ہیں جو دیگر ملفوظات میں نہیں ملتے۔ ذیل میں ان میں سے کچھ کو ذکر کیا جاتا ہے:

✪ بیشتر مجالس کی شروعات میں قدم بوسی کے بعد ان حضرات کے نام کے ذکر کا التزام کرنا جو اس مجلس میں حاضرِ خدمت تھے، مثلاً تاریخ اور دن کو رقم کرنے کے بعد دوسری مجلس کی ابتدا اس طرح فرماتے ہیں:

''دولتِ پای بوس میسر شد، خدمت شیخ بدر الدین غزنوی، و شیخ جمال الدین ہانسوی و مولانا شرف الدین نبیہ و قاضی حمید الدین ناگوری نیز حاضر بودند و اصحابِ دیگر ہم۔'' (مجلس:۲، ۴)

ترجمہ: آج قدم بوسی کی سعادت مندی حاصل ہوئی۔ شیخ بدر الدین غزنوی، شیخ جمال الدین ہانسوی، مولانا شرف الدین نبیہ، قاضی حمید الدین ناگوری اور دیگر احباب بھی مجلس میں حاضرِ خدمت تھے۔

✪ تقریباً ہر مجلس کے اختتام میں خاص طور سے اس بات کا ذکر کہ نماز کا وقت ہوگیا، پھر حضرت شیخ الاسلام اور ہم سب نماز کے لیے روانہ ہوگئے اور مجلس برخاست ہوگئی۔ مثلاً پہلی مجلس کے آخر میں فرماتے ہیں:

''شیخ الاسلام درین حرف رسیدہ کہ بانگِ نماز پیش گفتن چون نماز ادا کردہ در مراقبہ مشغول شد۔'' (مجلس:۱، ص:۴)

ترجمہ: حضرت شیخ الاسلام اتنا بیان فرمائے ہی تھے کہ اذان ہوگئی، مخدوم نے نماز ادا کی اور مراقبے میں مشغول ہوگئے۔

اسی طرح دوسری اور تیسری مجلس کے اختتام میں اذان اور نماز کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ ہے:

''چنان چہ وقتِ نماز در آمد، در عالم تحیر مشغول شد، خلق و دعا گو باز گشت۔'' (مجلس:۲، ص:۶)

''وقتِ نماز در آمد، شیخ الاسلام بنماز مشغول شد، خلق و دعا گو باز گشت۔'' (مجلس:۳، ص:۹)

✪ حضرت شیخ الاسلام خواجہ فرید الدین قدس سرہ کے بیان کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ اثنائے تقریر اپنی باتوں کو اپنے مشائخ کے اقوال و افعال اور قصص و حکایات سے مزین فرماتے اور دورانِ تقریر حوالہ بھی کثرت سے بیان فرماتے۔ راحت القلوب میں حوالہ کے طور پر جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے کچھ کتابوں کے نام ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) عوارف المعارف۔ (۲) قوت القلوب (۳) فتاوی ظہیریہ (۴) جامع الحکایات (۵) کشاف (۶) کفایہ (۷) تفسیرِ زاہد (۸) شرحِ مشائخ (۹) اسرارِ تابعین (۱۰) شرحِ اولیا (۱۱) اسرار العارفین (۱۲) آثارِ تابعین (۱۳) راحۃ الارواح (۱۴) سیر العارفین (۱۵) دلیل الشافی (۱۶) شرح الاسرار (۱۷) فتاویٰ کبریٰ (۱۸) اورادِ شیخ عثمان ہارونی (۱۹) اورادِ شیخ معین الدین حسن سنجری (۲۰) اورادِ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی (۲۱) شرحِ خواجہ معین الدین (۲۲) اورادِ شیخ شہاب الدین سہروردی (۲۳) مفصل۔

مطالعہ

یہ کتاب حضرت خواجہ فرید گنج شکر قدس سرہ کی چوبیس مجلسوں پر مشتمل ہے:

پہلی مجلس

اس مجلس میں حضرت محبوبِ الٰہی کا خواجہ فرید کی بارگاہ میں پہلی بار حاضری کا بیان ہے، اسی مجلس میں محبوبِ الٰہی کو شیخ کے ملفوظات کو جمع کرنے کا ارادہ ہوا اور پھر شیخ نے اسی مجلس میں یہ فرمایا کہ: وہ مرید نہایت سعادت مند ہے جو اپنے شیخ کی باتوں کو ہوش و گوش کے ساتھ سنتا ہے اور اسے قلم بند کر لیتا ہے۔ اسی میں ہے کہ درویشی خلقِ خدا کی عیب پوشی کا نام ہے۔ خرقہ پوشی اس شخص کا کام ہے جو لوگوں کے عیبوں کو چھپائے، دنیا کے مال و دولت میں سے جو کچھ اس کے پاس آئے اسے اللہ کی راہ اور جائز مصرف میں خرچ کر ڈالے۔ ان مال و دولت پر خود بالکل نظر نہ لگائے۔ پھر خواجہ فرید قدس سرہ نے فرمایا: مشائخ نے اپنی کتابوں میں ذکر فرمایا ہے کہ زکوۃ کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ زکوۃِ شریعت

۲۔ زکوۃِ طریقت

۳۔ زکوۃِ حقیقت

زکوۃ شریعت یہ ہے کہ اگر بندہ کے پاس چالیس درہم ہو تو ان میں سے پانچ درہم راہِ خدا میں خرچ کردے۔

زکوۃِ طریقت یہ ہے کہ صرف چالیس میں سے پانچ درہم اپنے پاس رکھے اور باقی پورے کے پورے اللہ کی راہ میں صرف کردے۔

زکوۃِ حقیقت یہ ہے کہ ان چالیس دراہم میں سے ایک درہم بھی اپنے پاس نہ رکھے بلکہ کُل کے کُل راہِ

خداوندی میں خرچ کر دے کیوں کہ درویشی خودفروشی ہے۔

پھراس سلسلے میں شیخ نے شیخ شہاب الدین سہروردی سے اپنی ملاقات کا ذکر فرمایا اوران کے بارے میں حکایت بیان فرمائی کہ انہوں نے ایک دن خانقاہ میں آئے ہوئے سارے نذر اورفتوحات کواللہ کی راہ میں دے دیا۔ پھر درویشی کے تعلق سے حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی ذکر فرمایا۔ اسی مجلس میں خرقۂ معراج والی حدیث کو بیان فرمایا گیا۔ پھر درویشی کی فضیلت پر گفتگو فرمانے لگے اور کہنے لگے کہ درویشی پردہ پوشی ہے۔ درویش کو یہ چار باتیں اختیار کرنا چاہیے:

۱۔اپنی آنکھیں اندھی کرلے تا کہ لوگوں کے معائب نہ دیکھ سکے۔

۲۔اپنے کان بہرے کرلے تا کہ فضول اورلغو باتوں کو سننے سے نجات مل جائے۔

۳۔اپنی زبان گونگی کرلے تا کہ ناحق باتیں نہ کر سکے۔

۴۔پیر توڑ کر بیٹھ جائے تا کہ ناجائز جگہوں پر نہ جاسکے۔

اگر یہ چار خصلتیں کسی میں پائی جائیں تو اس کو بلا شک وشبہہ درویش تسلیم کرنا۔ اوراگر یہ خصلتیں اس کے اندر نہیں ہیں اور صرف دعویٰ کر رہا ہے توسمجھ لینا کہ وہ جھوٹا مدعی ہے، درویشی کی کسی بھی چیز سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

دوسری مجلس

امیر وغریب، درویش ومسکین کوئی بھی آئے اسے خالی پیٹ جانے نہ دو۔ کچھ نہ کچھ دے دو تا کہ وہ درویش صفت بن جائے۔ اس ضمن میں انفاق اور خدمت خلق کی ترغیب دیتے ہوئے شیخ الاسلام قدس سرہ نے اپنا طرزِ عمل اوراپنی زندگی کا دستور اور طرزِ طریق بتایا۔ پھر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا کی قدس سرہ کے معمول سے آشنا فرمایا۔ اسی ضمن میں اپنے سفرِ بغداد، وہاں شیخِ اجل سنجری رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات، انفاق اور خدمتِ خلق کے بارے میں ان کی خانقاہ کا دستور بیان فرمایا۔ پھر بغداد ہی میں مختلف مشائخ سے اپنی ملاقات اوران کی صحبت سے مشرف ہونے کا ذکر فرمایا۔

اخیر میں اپنے دہلی جانے، وہاں حضرت قطب الدین بختیار کا کی قدس سرہ کی صحبت میں جانے، ان سے بیعت کے شرف سے مشرف ہونے اور شیخ کے عنایات والطاف کا تذکرہ فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا: مردانِ خدا ایسے ایسے مرحلے طے کر کے اس مقام کو پہنچتے ہیں۔ اللہ رب العزت کا فیض عام ہے، یہ سعادت سب کو حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن مرد ہونا چاہیے، جو منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہے۔ اس راہ میں جب تک صدق سے قدم نہ رکھے اور دل نہ جلے حاشا وکلا کبھی بھی مقامِ قرب تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ یہ صراطِ مستقیم ہے، جس نے اس میں سچائی سے قدم رکھا وہ پار ہو گیا، مگر جو ذرا بھی خلافِ مرضیِ دوست چلا وہ جلا دیا گیا۔

تیسری مجلس

حب الدنیا رأس کل خطیئة (۱) دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔جس نے دنیا کو ترک کر دیا وہ دنیا پر غالب آ گیا اور جس نے اس کو اختیار کیا وہ ہلاک ہو گیا۔انسان جس قدر دنیا میں مشغول رہتا ہے اسی قدر حق سے دور رہتا ہے۔ بندہ جب تک صیقلِ محبت کے ذریعہ اپنے آئینۂ قلب کو زنگارِ دنیا سے پاک وصاف نہیں کرے گا، ذکرِ الٰہی سے دل نہیں لگائے گا اور غیر کو درمیان سے نہیں ہٹائے گا اس وقت تک اللہ کو نہیں پا سکتا۔جس طرح زمین میں جب خس وخاشاک کی زیادتی ہونے لگتی ہے تو وہ مردہ ہو جاتی ہے،اسی طرح انسان جب دنیا کے لذات،شہوات اور خواہشات میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس پر حرص وہوس اور غفلت جیسی آفتیں غالب آنے لگتی ہیں،غیر اللہ کی فکر سے اس کا دل سیاہ ہونے لگتا ہے اور یہی دل کی موت ہے۔تقرب اور طریقت یہ ہے کہ درویش کے دل میں دنیا اور اہلِ دنیا کی دوستی کا ذرہ بھر اثر نہ ہو۔فقیر کے نزدیک ساری مخلوقِ خدا یکساں ہے۔اس ضمن میں شیخ سہل بن عبد اللہ تستری، شیخ ابوبکر شبلی،حضرت جنید بغدادی،خواجہ اجل سنجری،حضرت ذوالنون مصری،حضرت قطب الدین بختیار کاکی اور امام مالک رضی اللہ عنہم کے اقوال وافادات سے دنیا اور اربابِ دنیا کی مذمت اور دنیا سے کنارہ کشی پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

چوتھی مجلس

شبِ معراج کی فضیلت واہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔اس حوالے سے بغداد کے ایک بزرگ کا واقعہ ذکر کیا گیا۔بعدازاں سماع پر بحث ہونے لگی کہ سماع دلوں کے سکون وراحت کا باعث ہے۔اس سے غواصانِ دریائے معرفت کے قلوب میں جنبش وحرکت ہوتی رہتی ہے،جس دن سے وہ ندائے الست بربکم سن کر بے ہوش ہوئے ہیں،سرور وبے ہوشی اور مستی ومدہوشی ان کی خمیر میں ڈال دی گئی،اس لیے آج بھی جب ان کے کان میں کوئی اچھی آواز پہنچتی ہے تو وہ مست ومدہوش ہو جاتے ہیں۔سماع میں جو لوگ بے ہوش ہو جایا کرتے ہیں یہ وہی ہیں جو ازل میں ندائے الست بربکم سن کر بے ہوش ہو گئے تھے۔وہی چیز ان میں اب تک موجود ہے۔جب دوست کا نام سنتے ہیں تو ذوق وحیرت اور بے ہوشی اور بے اختیاری کا ظہور ہونے لگتا ہے۔اہلِ سماع وہ لوگ ہیں جن پر تحیر واستغراق کی حالت میں اگر سو ہزار تلواریں چلائی جائیں تو بھی انہیں کچھ خبر نہ ہو۔جس وقت انسان دوست کی محبت میں محو ہوتا ہے اسے دنیا ومافیہا کی کچھ بھی خبر نہیں رہتی ہے۔کوئی آئے،کوئی جائے،اسے کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا ہے کہ کیا ہوا۔

---

(۱) اس قول کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں ان الفاظ سے روایت کیا ہے عن سفیان بن سعید قال:"کان عیسی علیه السلام یقول: حب الدنیا أصل کل خطیئة, والمال فیه داء کبیر".الخ۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے تھے کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے اور مال میں بہت بیماری ہیں۔(شعب الایمان : باب الزهد وقصر الأمل، جلد:۱۳، ص ۷۴) اور شعب الایمان ہی میں حضرت سیدنا حسن بصری سے مرسلا ان الفاظ میں مروی ہے "حب الدینار رأس کل خطیئة" دینار کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔(ص ۱۰۲)

پانچویں مجلس

کوئی مسلمان کسی شیخ سے مرید ہونا چاہے تو پہلے غسل کرے اور اگر ممکن ہو تو رات بھر جاگے اور رب العزت کی بارگاہ میں اپنی بھلائی کی دعائیں کرے۔ پھر رسمِ مقراض رانی پر گفتگو ہونے لگی۔ مشائخ نے فرمایا ہے کہ تکبیر پڑھتے وقت نفسِ امارہ کی جانب متوجہ ہو جائے اور یہ سمجھے کہ آج اس سے جنگ کرنا ہے، پھر لاحول پڑھے اور کوئی وسوسہ نہ آنے دے، تیسری تکبیر سے فارغ ہو کر ایک بار کلمۂ توحید، بیس مرتبہ درود شریف اور ایک مرتبہ استغفار پڑھے۔ ان ساری چیزوں سے جب فارغ ہو جائے تو پیر مرید کی پیشانی سے ایک بال لے لے اور یہ کہے: اے بادشاہوں کے بادشاہ! تیری بارگاہ سے بھاگا ہوا غلام پھر تیرے حضور آیا ہے، ماسوا سے بیگانہ ہونے اور تیری عبادت کرنے کا قصد کرتا ہے، اس کے بعد پیشانی کے دائیں اور بائیں جانب سے ایک ایک بال کتر لے۔ پھر اس سلسلے میں حبیب عجمی اور حسن بصری کے واقعہ کو ذکر کیا گیا۔ اسی مجلس میں یہ بھی فرمایا گیا کہ مقراض رانی ایک الٰہی رمز ہے جو کسی پر بھی منکشف نہ ہوا۔ البتہ بعض لوگوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ بندہ اور مولیٰ کے درمیان جو حجابات ہوتے ہیں وہ اس قینچی سے کٹ جاتے ہیں۔ خلوت اور ریاضت کے بارے میں بھی گفتگو ہونے لگی کہ ریاضت کا مطلب یہ ہے کہ نفسِ امارہ مغلوب ہو اور خلوت سے مراد یہ ہے کہ سگِ نفس کو محبوس کیا جائے۔ بعد ازاں مرید کو تلقینِ ذکر کے حوالے سے مختلف اقوال بیان کیے گئے۔

چھٹی مجلس

نماز میں استغراق و بے خودی اور درویشوں سے حسنِ عقیدت اور حسنِ ظن کے تعلق سے گفتگو ہوئی۔ اسی مجلس میں شیخ الاسلام خواجہ فرید الدین قدس سرہ نے مختلف مقامات میں اپنی سیاحت کا ذکر فرمایا۔ چناں چہ غزنی، بخارا، سیوستان اور بدخشاں کے سفر، وہاں کے مشائخ سے ملاقات اور ان کے واقعات و حکایات کا تذکرہ فرمایا۔

ساتویں مجلس

کراماتِ اولیا کے تعلق سے شیخ سعد الدین حمویہ، شیخ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی اور شیخ ابو المغیث کے واقعات کو بیان فرمایا گیا۔ پھر اس تعلق سے گفتگو ہونے لگی کہ غلباتِ احوال اور محبوب سے ملاقات کے اشتیاق میں عاشقانِ الٰہی کس کس طرح سے اور کیسی کیسی اداؤں سے اپنی جانیں دے دیتے ہیں اور خود کو اپنے محبوب پر قربان کر دیتے ہیں۔ اس حوالے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، شیخ سعد الدین حمویہ اور شیخ سعد الدین باخرزی کے انتقال کے واقعات کا تذکرہ فرمایا گیا۔ اس مجلس میں ہر واقعہ کو بیان فرمانے کے بعد شیخ پر ایک الگ کیفیت طاری ہوتی ہے، کبھی نعرہ مارتے ہیں، کبھی بے خود اور بے ہوش ہو جاتے ہیں، کبھی غلبۂ حال اور فرطِ محبت کے عالم میں بے ساختہ رونے لگتے ہیں اور بار بار ہر ہر حکایت کو بیان فرمانے کے بعد یہ مثنوی زبانِ مبارک پر لاتے ہیں:

در کوئی تو عاشقان چنان جان بدہند
کانجا ملک الموت نہ گنجد ہرگز

کس قدر وارفتگی اور گم گشتگی ہے کہ پوری مجلس میں سامعین پر بھی عجب رقت اور گریہ طاری رہتا تھا۔ایسے میں اگر کوئی جان بھی دے دے تو کچھ بعید نہیں۔

آٹھویں مجلس

راہِ طریقت محض تسلیم و رضا کا نام ہے۔ اگر کوئی گردن پر تلوار بھی رکھ دے تب بھی راضی رہے اور دم بھی نہ مارے۔جس کی یہ کیفیت ہو اسے درویش جانو۔ اسی مجلس میں ارشاد ہوا کہ اگر کوئی طاعت یا ورد بندے سے فوت ہو جائے تو اسے اپنی موت تصور کرنا چاہیے، صاحبِ ورد سے کسی ورد کا ترک ہوجانا اس کی موت کے برابر ہوتا ہے۔ صاحبانِ اوراد و وظائف جو کچھ پڑھتے ہیں اگر کسی عذر کی وجہ سے دن کو نہ پڑھ سکے ہوں تو رات کو پڑھ لیں لیکن ہرگز ہرگز ترک نہ کریں کیوں کہ اس کا اثر اس سے گزر کر سارے شہر والوں پر پڑتا ہے، جس کی وجہ سے ایک کے ساتھ بہت ساری مخلوق پر اللہ کی شامت آجاتی ہے۔ پھر اس سلسلے میں ایک حکایت بھی بیان کی گئی۔اس کے بعد شیخ نے خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا ان کے دوستوں کے جنازوں میں حاضر ہونے کا طرزِ عمل اور اس ضمن میں خواجۂ پاک کا ایک واقعہ ذکر فرمایا۔اس کے بعد شیخ الاسلام قدس سرہ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی، حاضرین سے مخاطب ہوکر فرمانے لگے: اگر اس وقت قوال ہوتے تو ہم کچھ سنتے۔ پھر خواجہ بدرالدین اسحاق کو حکم ہوا کہ جو خط ان کے پاس ہے وہ پڑھ کر سنائیں، وہ کھڑے ہوکر پڑھ کر سنانے لگے، ابھی خواجہ بدرالدین اسحاق تھوڑا پڑھ کر سنائے ہی تھے کہ شیخ الاسلام وجد میں آ گئے اور پھر ایک دن ایک رات تک شیخ پر وہی کیفیت طاری رہی۔اس کے بعد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ جلال الدین تبریزی کی ملاقات اور پھر دونوں کا ایک دوسرے سے اپنے اپنے سفر کے واقعات بیان کرنے کا تذکرہ فرمایا۔

نویں مجلس

ماہِ رمضان المبارک ، شبِ قدر اور تراویح کے فضائل و مناقب پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ پھر کشف و کرامت کا تذکرہ ہونے لگا۔اس تعلق سے شیخ جمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ سنایا گیا۔ اثنائے مجلس ایک جوگی آ گیا، شیخ الاسلام کچھ دیر اس سے ہم کلام رہے۔ کچھ دیر بعد ایک شخص آیا اور حضرت کے پائے اقدس میں سر رکھ کر عرض گزار ہوا! اے مخدوم میں نے آپ کو بیت المقدس میں جاروب کشی کرتے دیکھا ہے، ارشاد ہوا کہ سچ کہتے ہو لیکن تم سے جو عہد ہوا تھا اس کی بھی خبر ہے یا اسے بھول گئے؟ تمہیں یہ راز فاش نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پھر فرمانے لگے: اے عزیز! مردانِ خدا جس جگہ بیٹھتے ہیں وہیں خانۂ کعبہ ہوتا ہے، وہیں عرش ہوتا ہے، وہی کرسی ہوتی ہے اور اللہ رب العزت کی پیدا کی ہوئی ہر چیز اس کو دِکھائی دیتی ہے۔ پھر شیخ نے اس شخص کو حکم دیا کہ آنکھیں بند کرلو، انہوں نے آنکھیں بند کرلی، پھر فرمایا: کھول دو، انہوں نے کھول دی اور نعرہ مار کر بے ہوش ہوگئے۔ کچھ دیر بعد

جب ان کو ہوش آیا تو کہنے لگے: واقعی حضور نے جو فرمایا تھا، دِکھا بھی دیا۔ شیخ الاسلام نے انہیں کلاہ عطا فرمائی اور سیوستان کی خلافت سے سرفراز فرما کر رخصت کر دیا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ: میں بیس سال عالمِ تفکر میں رہا ہوں اور ان بیس سالوں میں ہمیشہ کھڑا رہا ہوں۔ چناں چہ تمام خون پیروں میں جمع ہو کر نکلنے لگا تھا اور اس زمانے میں میں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ کبھی ٹھنڈا پانی یا کھانے کا کوئی لقمہ بھی اپنے نفس کو نہ دوں گا۔

دسویں مجلس

عالمِ علوی اور عالمِ سفلی پر گفتگو ہونے لگی۔ ارشاد ہوا: عالمِ علوی میں صدق و صفا، خوش اخلاقی اور حسنِ معاملہ کا ہونا ضروری ہے، جب کہ عالمِ سفلی میں پارسائی، پاکی اور زہد کی نگہداشت کی جاتی ہے۔ پھر شیخ الاسلام چشم پر آب ہو کر کہنے لگے کہ جو شخص اللہ رب العزت سے دوستی اور محبت کا دعوی کرے اور دنیا کی محبت بھی اس کے دل میں ہو وہ جھوٹا اور دروغ گو ہے۔ اس مجلس میں یہ بھی فرمایا گیا کہ جب کھانا کھائے تو لازم ہے کہ طاعت بھی بجا لائے تا کہ وہ کھانا بھی عبادت میں شامل ہو جائے، فقیر کو خواہشِ نفس پر ہر گز نہیں کھانا چاہیے۔ پھر ارشاد ہوا کہ تین اوقات میں رحمتِ الٰہی نازل ہوتی ہے:

(۱) سماع کے وقت۔

(۲) اس کھانے کے وقت جو طاعت کے لیے قوت پیدا کرنے کی نیت سے کھایا جائے۔

(۳) درویشوں کے صفائے قلب کے وقت۔

پھر اثنائے گفتگو ہی چھ سات درویشوں کا حاضرِ خدمت ہونا، شیخ کی بارگا میں اپنا قضیہ پیش کرنا، شیخ کے حکم سے خواجہ بدر الدین اسحاق اور محبوبِ الٰہی کا ان درویشوں کے قضیہ کو سننا، ان کے قضیے کو سن کر ان دونوں کا آپس میں رونا اور گریہ طاری ہونا، شیخ الاسلام کا رئیس نامی شخص کا وہ واقعہ بیان فرمانا جو انہوں نے خواجہ قطب الدین کی بارگا میں درود شریف والا خواب ذکر کیا تھا، پھر شمس دبیر کا شیخ کی بارگاہ میں کچھ پڑھنا اور اپنا عریضہ شیخ کے گوش گزار کرنا اور پھر شمس دبیر پر شیخ کے الطاف وعنایات، یہ ساری باتیں اس مجلس کے وہ حصے ہیں جنہیں پڑھ کر آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔

گیارہویں مجلس

درویشی اور جاگیری پر گفتگو ہوئی۔ شیخ الاسلام کا سلطان ناصر الدین کے نذر ونقود کو قبول نہ کرنے والی حکایت کا ذکر فرمایا گیا۔ پھر خواجہ قطب الدین کا سلطان شمس الدین کے نذر ونقود کو قبول نہ فرمانے والے واقعہ کا بھی تذکرہ کیا گیا۔ اس کے بعد مشارق الانوار کی احادیث پر گفتگو ہونے لگی۔ تصحیحِ حدیث کے سلسلے میں مولانا رضی الدین اصفہانی کے فضائل ومناقب بیان کیے گئے۔ پھر کشف وکرامت پر گفتگو ہونے لگی، ارشاد ہوا! یہ کام کم حوصلہ والوں کا ہے، مشائخِ عظام نے اس کو کچھ وقعت نہیں دی ہے۔ جسے کشف ہوا اس پر لازم ہے کہ وہ خود کو کسی

شمارے میں نہ لائے، کرامت کا اظہار فرض کا ترک ہے۔ مردانِ خدا خود کو پوشیدہ رکھتے ہیں اور کرامات کو کسی کے سامنے ظاہر نہیں فرماتے۔ اسی مجلس میں حضرت شیخ سعد الدین حمویہ کی کرامت کا ایک واقعہ بھی درج ہے۔

بارہویں مجلس

اس مجلس میں حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت، ان کے اسلام لانے اور حضرت بلال کو برسرِ عام اذان کہنے پر برانگیختہ کرنے کا بیان ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر کے فضائل و مناقب پر مشتمل ایک طویل واقعہ مذکور ہے۔

تیرہویں مجلس

ترکِ دنیا اور ذکرِ الٰہی میں مستغرق رہنے پر گفتگو ہوئی۔ پھر عقل و علم پر گفتگو ہونے لگی، ارشاد ہوا! اللہ تعالیٰ نے بندوں پر دو عنایتیں کی ہیں: ۱۔ بعثتِ رسل۔ ۲۔ عقل۔ پہلی ظاہری ہے اور دوسری باطنی۔ اگر کوئی شخص عالم ہے مگر عقل نہیں رکھتا ہے تو علم اس کو کچھ بھی نفع نہیں پہنچائے گا۔ علم و عقل ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ نہ علم عقل سے الگ ہے اور نہ ہی عقل علم سے۔ ہر چیز کی ایک انتہا ہے اور عبادت کی انتہا عقل ہے۔ کیوں کہ علم کے بغیر عبادت ناقص اور عقل کے بغیر علم دردِ سر ہے۔ قیامت کے دن یہی حجت ہوگی۔ اگر عقل نہ ہوتی تو اللہ کی معرفت بھی نصیب نہ ہوتی۔ اسی مجلس میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو مصحف میں حکم ہوا کہ عشاق کو چار ساعتوں سے غافل نہیں رہنا چاہیے:

پہلی ساعت میں نماز کے اندر اور نماز کے آخر میں اپنے رب سے مناجات کریں۔

دوسری ساعت میں اپنے اعمال کا محاسبہ کریں۔

تیسری ساعت میں اپنے بھائی بہنوں میں بیٹھیں اور ان کی غلطیوں کو دیکھ کر ان کی اصلاح کی کوشش کریں اور ان کے معائب کی پردہ پوشی بھی کریں۔

چوتھی ساعت میں نہ کھائیں، نہ پئیں اور نہ بری صحبتوں میں جائیں بلکہ نیک کام کریں۔

چودہویں مجلس

علم اللہ کے نزدیک ساری عبادتوں سے افضل اور برتر ہے۔ علم وہ ہے جسے عالم نہیں جانتے اور زہد وہ ہے جسے زاہد نہیں جانتے۔ جب کہ حقیقتِ کار ان دونوں کے باہر ہے۔ مرد کو چاہیے کہ ان دونوں سے دل اٹھالے۔ کاش لوگوں کو علم کا درجہ معلوم ہو جاتا تو سب کاموں کو چھوڑ کر طلبِ علم میں لگ جاتے۔ علم ایک ایسا اَبر ہے جو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں برساتا، جو اس ابر سے حصہ لیتا ہے گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ علما علم سے غافل ہیں، انہوں نے دنیا کو اپنا قبلہ گاہ بنا رکھا ہے اور غرورِ علم سے اپنے نفسوں کو موٹا کر لیا ہے۔ عالم در حقیقت اس کو کہتے ہیں جو علمِ نبوی سے آشنا ہو اور علمِ نبوی کا تعلق آسمان سے ہے۔ آدمی خود کو نہیں پہچانتا، ہوا اور ہوس اسے دوسری باتوں میں مشغول کر دیتی ہے۔ ورنہ جو خود کو پہچان لیتا ہے اسے رب العزت سے ایسی محبت ہو جاتی ہے کہ اس کے

دل میں غیر کی بالکل جگہ نہیں رہتی۔ اگر ہژدہ ہزار عالم اس کے سامنے آجائے تو وہ التفات نہ کرے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے فرمایا:

عقل کے درخت کو فکر کے پانی سے سیراب کروتا کہ اس میں خشکی نہ آئے۔ غفلت کے درخت کو جہالت کے پانی سے تر کروتا کہ اس سے اس کی جڑ بندھی رہے۔ توبہ کا درخت ندامت کے پانی سے بارآور ہوتا ہے جب کہ محبت کا درخت موافقت کے پانی سے پھلتا پھولتا ہے۔

پندرہویں مجلس

جو شخص ان چار امراض میں سے کسی ایک مرض میں بھی مبتلا ہوگا، اس سے حکمت ہمیشہ دور رہے گی:

۱۔ حرصِ دنیا

۲۔ فکرِ فردا

۳۔ مسلمانوں سے بغض وحسد

۴۔ جاہ ومنصب کی حرص ومحبت

زہد ودرویشی کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں۔ یہ تین چیزیں جس کے اندر نہیں ہوگی وہ کبھی بھی زاہد یا درویش نہیں ہوسکتا:

۱۔ دنیا کی معرفت حاصل کر کے اسے پسِ پشت ڈال دینا۔

۲۔ مولیٰ کی اطاعت کرنا اور ادب ملحوظ رکھنا۔

۳۔ آخرت کی آرزو اور اس کی طلب

اہلِ سلوک کبھی خدا کی یاد سے غافل ہوجاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس وقت ہم مردہ ہیں، اگر زندہ ہوتے تو ذکرِ الٰہی ہم سے الگ نہ ہوتا۔ ذکرِ الٰہی سے چھ باتیں حاصل ہوتی ہیں:

۱۔ بندہ ایسی حالت میں پہنچ جاتا ہے کہ حضرت رب العزت کو چشمِ دل سے دیکھنے لگتا ہے۔

۲۔ اللہ رب العزت اسے گناہوں سے محفوظ فرما دیتا ہے۔

۳۔ اللہ کی محبت اور اس کی دوستی اس کے دل میں راسخ ہوجاتی ہے۔

۴۔ اللہ رب العزت اس کو عزیز رکھتا ہے۔

۵۔ جِنات کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔

۶۔ اللہ رب العزت قبر میں اس کا مونس ہوتا ہے۔

جو شخص ان چار باتوں کا خیال نہیں رکھتا ہے اللہ بھی اسے چار چیزوں سے محروم کر دیتا ہے:

(۱) زکوۃ۔ (۲) صدقہ وقربانی۔ (۳) نماز۔ (۴) دعا

ترکِ زکوۃ سے برکت چلی جاتی ہے۔ ترکِ صدقہ سے صحت بگڑنے لگتی ہے۔ ترکِ نماز سے مرتے وقت ایمان سلب ہوجاتا ہے۔ اور ترکِ دعا سے دعا کی قبولیت رک جاتی ہے۔

سولھویں مجلس

ماہِ ذی الحجہ کے اعمال اور فضائل پر بالتفصیل روشنی ڈالی گئی اور اس سلسلے میں مختلف احادیث اور واقعات کو بیان کیا گیا۔

سترہویں مجلس

چاروں مذاہب کا تذکرہ کیا گیا، امامِ اعظم کے مذہب کی برتری کو بیان کیا گیا، امامِ اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد کے فضائل ومناقب کا چرچا کیا گیا۔ پھر امامِ اعظم سے لے کر اللہ رب العزت تک امام اعظم کے مذہب کا شجرہ بیان فرمایا گیا۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل باتوں پر بالتفصیل گفتگو ہوئی:

ادعیۂ ماثور۔ تہجد کی نماز۔ شیطان سے بچنے کا عمل۔ محتاجی دور کرنے کا وظیفہ۔ غم دور کرنے کا وظیفہ۔ خوف دور کرنے کا وظیفہ۔ دشمن کے مکر سے بچنے کا وظیفہ۔ جنت حاصل کرنے کا عمل۔ عذابِ قبر کی آسانی کا وظیفہ اور کشادگیِ رزق کا وظیفہ۔

اٹھارہویں مجلس

شیخ الاسلام قدس سرہ نے اس مجلس میں درود شریف کی فضیلت اور آیت الکرسی کے فضائل بیان فرمائے۔ پھران دونوں چیزوں کی فضیلت کو مختلف آثار واحادیث اور متفرق حکایات وواقعات سے مزین فرمایا۔

انیسویں مجلس

اس مجلس میں مندرجہ ذیل موضوعات پر گفتگو ہوئی:

رنج وغم دور کرنے کی دعا۔ کشایشِ رزق کی دعا۔ ہر مہم میں کامیاب ہونے کی دعا۔ اعمال مقبول ہونے کی دعا۔ دین ودنیا کی بھلائی کی دعا۔ استقامت اور ثابت قدم رہنے کی دعا۔ اطمینانِ قلب کی دعا۔ خاصانِ خدا میں شامل ہونے کی دعا۔ اولاد طلب کرنے کی دعا۔ صالحین کے ساتھ حشر ہونے کی دعا۔ ظالموں سے نجات پانے کی دعا۔ وسعتِ رزق اور نزولِ برکت ورحمت کی دعا۔ ظلم سے بچنے کی دعا۔ قید سے رہائی کی دعا۔ ایمان واسلام پر خاتمہ ہونے کی دعا۔ آسیب سے محفوظ رہنے کی دعا۔ کفار پر فتح پانے کی دعا۔ نورِ ایمان کامل ہونے کی دعا۔ روزانہ پڑھنے کا وظیفہ اور دیگر دعائیں۔ اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے دعا کی تین شرطوں کا ذکر فرمایا:

۱۔ اللہ رب العزت کے نامِ پاک سے دعا کی ابتدا کی جائے۔

۲۔ اپنی عورتوں کو آواز دار زیور مثلاً پازیب وغیرہ نہ پہننے دے۔

۳۔ دعا کے آغاز اور اتمام پر صدقہ دے۔

بیسویں مجلس

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ مراقبہ میں تھے، اسی وقت ذکر کرنے لگے، اس قدر ذکر کیے کہ بے ہوش ہو گئے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا خرقہ آپ کے اوپر ڈالا گیا تو آپ ہوش میں آئے۔ پھر عبداللہ بلخی کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ: تم نے دیکھا! ہمارے بھائی بہاء الدین زکریا ملتانی اس بیابانِ فنا سے شہرستانِ بقا کی طرف کوچ فرما گئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں اسی وقت انتقال ہوا ہے۔ آیئے نمازِ جنازہ پڑھ لیں۔ پھر شیخ الاسلام اور حاضرین نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غائب کی نمازِ جنازہ پڑھنا منقول ہے۔ کیوں کہ جب حضرت حمزہ اور دیگر صحابہ شہید ہوئے تھے تو آپ نے ہر ایک کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی تھی اس لیے ہمیں بھی پڑھنا چاہیے۔ اس کے بعد ماہِ محرم کی فضیلتوں پر گفتگو کا سلسلہ دراز رہا۔

اکیسویں مجلس

اس مجلس میں عاشوہ کے دن کی برکتوں اور اس کے فضائل و مناقب کا بیان ہوا۔ اس سلسلے میں مختلف روایات اور حکایتیں بھی بیان کی گئی۔

بائیسویں مجلس

حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرہ چند روز کے لیے ہانسی تشریف لے گئے تھے پھر جب ہانسی سے اجودھن شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شیخ نے فرمایا کہ: بہت دیر کر دی، محبوبِ الٰہی فرماتے ہیں کہ یہ سنتے ہی میں نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا اور عرض گزار ہوا کہ: تنِ خاکی وہاں تھا مگر دل یہیں تھا۔ ارشاد ہوا: ہاں جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی ہے۔ تم پر ہمارا اشتیاق غالب تھا۔ اور تم کہتے تھے کہ اگر میرے پر ہوتے تو اُڑ کر چلا جاتا اور خواجہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع میسر آتا۔ پھر حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے: شیخ کا مرید اور فرزند ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا کہ مولانا نظام الدین ہیں۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ تم نے ایک خط بھی لکھا جس میں قدم بوسی کا اشتیاق بہت تھا اور تم نے ایک بیت بھی لکھی تھی جس کو میں نے یاد کر لیا ہے۔ جب تم یاد آتے ہو تو میں اس بیت کو پڑھ لیتا ہوں۔ بے نظیر ہے۔ اگر تم پڑھو تو میں سنوں۔ میں نے قدم بوس ہو کر وہ شعر سنائے۔ اشعار سنتے ہی شیخ الاسلام قدس سرہ پر رقت طاری ہو گئی اور رقص فرمانے لگے۔ چاشت سے دو پہر تک اس وجد و کیف کے عالم میں رہے۔ پھر مجھے خرقۂ خاص، عصا، مصلیٰ اور نعلین چوبی مرحمت فرمائے اور مجھ کو اپنے پہلوئے اقدس میں لے کر فرمانے لگے کہ مولانا نظام الدین قریب ہے کہ میں تم کو اب رخصت کروں اور پھر تمہارا دیدار نہ ہو، آج ہی تمہاری رخصتی ہے، اب جاؤ، مگر کچھ دن اور رہ جاؤ کیوں کہ دیدار غنیمت ہے۔ پھر شیخ الاسلام نمناک ہو گئے اور یہ شعر پڑھنے لگے:

دیدار دوستان موافق غنیمت است
چون یافتیم حیف بود گر رہا کنیم

تیئیسویں مجلس

مجاہدۂ نفس پر گفتگو ہونے لگی۔اس سلسلے میں شیخ نے خواجہ بایزید بسطامی، شجاع کرمانی، خواجہ ذوالنون مصری، حضرت سہیل بن عبداللہ تستری، شیخ علی مکی، خواجہ قطب الدین مودود چشتی اور دیگر مشائخ قدست اسرارہم کے مجاہدات اور مجاہدۂ نفس کے حوالے سے ان کے واقعات کا تذکرہ فرمایا۔

چوبیسویں مجلس

قدم بوسی کی دولت میسر آئی، اِس بندے کو خلعتِ خاص سے مشرف فرمایا۔عزیزانِ اہلِ صفہ حاضر تھے۔زبانِ مبارک سے ارشاد فرمائے کہ مولانا نظام الدین میں نے تم کو ہندوستان کی ولایت دی اور صاحبِ سجادہ بنایا۔اس ارشاد پر میں نے دوبارہ قدم بوسی کی۔فرمان ہوا کہ اے جہاں گیرِ عالم! سر اٹھا اور فوراً ہی حضرت شیخ قطب الدین کی دستار جو اپنے سر پر باندھے ہوئے تھے مجھے عطا کی، عصا میرے ہاتھ میں دیا، اپنے دستِ مبارک سے خرقہ پہنایا اور فرمایا کہ: جاؤ دوگانہ ادا کرو! میں جب قبلہ رو ہوا تو میرا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف نظر فرمائے اور فرمایا کہ: میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا۔ پھر فرمایا کہ یہ سب چیزیں تم کو اس سبب سے دیتا ہوں کہ تم آخری وقت میرے پاس نہ ہوگے۔اور یہ بھی فرمایا کہ میں بھی اپنے مرشد کے وصال کے وقت حاضر نہ تھا۔اس وقت میں ہانسی میں تھا۔اس کے بعد مولانا بدرالدین اسحاق کو حکم دیا کہ سند تحریر کریں۔پھر جب سند مجھ کو مل گئی تو میرا سر پہلو میں لے کر فرمایا میں نے تم کو خدا تک پہنچا دیا۔پھر فرمایا کہ جمال الدین سے ہانسی میں مل کر جانا۔پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کا واقعہ ذکر فرمایا۔اور میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ جن کے واسطے تمام عالم پیدا کیے گئے جب انہیں کو عالم میں نہ رکھا تو میں اور آپ کون ہیں کہ زندگی کا دم بھریں۔ہم بھی خود کو رفتگان میں شمار کرتے ہیں۔مگر زادِ راہ کی فکر کرنا بہت ضروری ہے۔

کتابیات

۱-آئینۂ ملفوظات، اخلاق حسین دہلوی، طباعت فوٹو لیتھو ورکس، ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی، مئی ۱۹۸۳ء

۲-بزمِ صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مطبع معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی، ۲۰۱۱ء

۳-تاریخ دعوت وعزیمت، ابوالحسن علی ندوی، طابع کاکوری آفسیٹ پریس لکھنؤ، ناشر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۲۰۰۶ء

۴-خزانۂ جلالی، احمد بہاء بن یعقوب بن حسین بن محمود بن سلیمان البتی، مخطوطہ کتب خانہ ندوۃ العلما لکھنؤ

۵-راحت القلوب فارسی، محبوبِ الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا، مطبوعہ مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۳۰۹ھ

۶-سیر الاولیا فارسی، امیر خورد سید محمد مبارک علوی کرمانی، مطبوعہ مطبع محب ہند، فیض بازار، دہلی، شعبان ۱۳۰۲ھ

۷-فوائد الفواد، حضرت حسن علا سنجری، ایم آر پرنٹرز، نئی دہلی، جنوری ۲۰۰۷ء

۸-مجمع السلوک، شیخ سعدالدین خیر آبادی، مترجم: مولانا ضیاء الرحمن علیمی، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں الہ آباد، یوپی، ۲۰۱۶ء

۹-مطلوب الطالبین مترجم، شیخ محمد بلاق دہلوی، ایم ایس پرنٹرس، لال کنواں، دہلی، ۲۰۰۲ء

○○○

زین العابدین اشرفی

فوائد الفواد اور لطائف اشرفی

ایک تقابلی اور تجزیاتی مطالعہ

مشائخ کے ملفوظات ہوں یا مکتوبات، دونوں سے علم وحکمت، حقیقت ومعرفت اور شریعت وطریقت کے مغلق دروازے وا ہوتے ہیں۔علم وعرفان کے چشمے ابلتے ہیں۔سالک کو منزلِ مقصود کا پتہ چلتا ہے۔سلوک کی راہیں طے ہوتی ہیں۔ظلمت کے حجابات چھٹ جاتے ہیں اور بندے کو مشاہدۂ حق کی دولت نصیب ہوتی ہے۔

ملفوظاتِ مشائخ کو صوفیہ کے یہاں ایک الگ اہمیت ومقام حاصل ہے۔انھیں نفعِ عوام وخواص کے لیے ان کی محفل میں ہمہ وقت رہنے والا،سفر وحضر میں ان سے اکتسابِ فیض کرنے والا اوران کے فیضانِ نظر کے سائے میں عرفانِ حق کی دولت سے بہرہ ور ہونے والا کوئی مریدِ صادق حیطۂ تحریر میں لاتا ہے۔ان سے صاحبِ ملفوظ کی ہمہ جہت شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے۔اس قرن کے اصحابِ طریقت ومعرفت،صاحبانِ صلاح وتقویٰ اور اربابِ علم ودانش کی دریافت ہوتی ہے اوراس زمانے کی تہذیب وثقافت،معیشت ومعاشرت اور سیاست ووسطیت کا منظر نامہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔

مشائخ کی زبانِ مقدس سے نکلے ہوئے پاکیزہ کلمات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی یہ روش بڑی قدیم ہے۔ اسے عربی میں ''امالی'' اورزبانِ فارسی میں ''ملفوظ'' کے لفظ سے قدرے فرق کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔جیسے امام ابو یوسف (۱۸۲ھ)، امام صنعانی (۲۱۱ھ)،امام عامری کوفی (۲۷۰ھ)، ابوبکر انباری (۳۲۸ھ) ،اورابن مندہ (۳۹۵ھ)،ابونعیم اصبہانی (۴۳۰ھ) وغیرہ کی ''امالی'' بڑی مشہور ہیں۔فارسی میں ''سخنانِ ابی سعید ابی الخیر'' ''سخنانِ اوحدالدین کرمانی''، ''دلیل العارفین''، ''راحت القلوب''، ''فوائدالسالکین''، ''انیس الارواح''، ''فوائد الفؤاد'' اور ''لطائف اشرفی'' وغیرہ جیسی کتابیں اربابِ طریقت کے لیے مرجع اور اصحاب شریعت کو قلبی سکون کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

مشائخ کی ان کتابوں کے مطالعے سے مسدود راہیں کھل جاتی ہیں۔ گم گشتگانِ راہ کو نشانِ منزل ملتا ہے اور ''وصول الی اللہ'' کے اسرار و رموز نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ بڑی مشکل اس وقت ہوتی ہے، جب بزرگانِ امت کی دو کتابوں کے درمیان تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ بطورِ خاص جب دونوں شخصیتیں ایک ہی چمنستانِ معرفت کے پھول اور دبستانِ طریقت کے ماہر استاذ ہوں۔ پہلی چیز، ان سے ہمارا عقیدت و محبت کا رشتہ قائم ہے۔ دوسری چیز یہ ہمارے اکابر و مشائخ ہیں۔ تیسری چیز، یہ مقبولانِ بارگاہ قدس ہیں۔ چوتھی چیز، ان کی گفتگو حقیقت کو نگاہوں میں رکھتے ہوئے ہوتی ہے۔ پانچویں چیز، یہ صاحبانِ کشف و کرامات ہوتے ہیں اور بسا اوقات بلاواسطہ رسولِ گرامی وقار صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ واستفاضہ کرتے ہیں۔

ایسی کتابوں کے تقابل سے ہمارا مقصود فقط یہ ہوتا ہے کہ ہمیں جادۂ طریقت میں ان کا مقام معلوم ہو۔ ''سیر الی اللہ'' کے طریقے کا علم ہو۔ بڑوں سے اختلاف کرنے کا ہنر ملے۔ خلقِ خدا کے ساتھ معاملات برتنے کا سلیقہ اور دین مصطفوی کی اشاعت وتبلیغ کے لیے صوفیہ کا منہج، جو درحقیقت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہج ہے، معلوم ہو۔

ان سارے اوصاف کے حامل اشخاص کی کتابوں میں جب تقابل کیا جاتا ہے، تو بہت ساری چیزوں کا پاس ولحاظ رکھا جاتا ہے۔ پہلی چیز، زبان ادب واحترام کے دائرے میں ہو۔ موضعِ اختلاف میں اظہارِ رائے کے لیے ان کے تقدس کا خیال ہو۔ اپنی رائے کو حتمیت کا درجہ نہ دیا جائے۔ ان کے تسامحات کی اچھی تاویل کی جائے اور ان کے بظاہر خلافِ شرع افعال سے صرفِ نظر کیا جائے۔

فوائد الفواد–ایک تعارف

''فوائد الفواد'' یہ کتاب تصوف و معرفت کے سرخیل سلطان المشائخ سیدنا خواجہ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ملفوظات ہیں۔ اس کے جامع ومرتب خواجۂ موصوف کے ایک مخلص مرید وخلیفہ، سعدیِ ہند حضرت خواجہ امیر حسن، نجم الدین علا سجزی ہیں۔ آپ سلطان جی کے بڑے منظورِ نظر اور قریبی خلفا میں تھے۔ آپ کی ولادت ۶۵۲ھ اتر پردیش کے ضلع بدایوں میں ہوئی۔ آپ نسباً ہاشمی وقریشی، مشرباً چشتی نظامی، عقیدۃً اشعری وماتریدی اور مسلکاً حنفی تھے۔ خواجہ امیر حسن نے شادی نہیں کی اور تاعمر مجرد رہے۔ آپ کی وفات ۷۳۸ھ میں ہوئی۔

''فوائد الفواد'' تصوف و معرفت کا ایک گنجِ گرامایہ ہے۔ اس میں تصوف کے اسرار و رموز بڑے لطیف انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن وحدیث اور صالحین امت کے واقعات سے صوفیہ کے مختلف احوال اور تصوف کے مختلف موضوعات کا ذکر ہے۔ سالک کی ابتدا سے لے کر انتہا تک پیش آنے والے احوال کا بیان ہے۔ فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے منازل کا تذکرہ ہے۔ سماع اور وجد ورقص کے ساتھ ساتھ یادِ الٰہی میں اپنی خودی کو نیست ونابود کرنے کا بھی ذکر ہے اور توبہ وتقویٰ، خدمتِ خلق، اعتدال ومیانہ روی، اخلاقِ حمیدہ، عفو ودرگزر، انفاق وایثار، حلم وبردباری، دنیا سے بے رغبتی وتقشّف، علم وعمل اور حسد وغبطہ جیسے اہم اسباق بھی موجود ہیں۔

لطائف اشرفی -ایک تعارف

''لطائفِ اشرفی'' یہ کتاب بانی سلسلۂ اشرفیہ نظامیہ چشتیہ، تارک السلطنت، غوث العالم، محبوبِ یزدانی سلطان سید اشرف جہاں گیر سمنانی سامانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔اس کے جامع حضرت مخدوم کے ایک دائم الخدمت خلیفہ، حضرت نظام الدین غریب یمنی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔آپ تقریباً تیس سال تک مخدوم کی خدمت میں رہے۔آپ کی ولادت یمن میں ہوئی۔ ۷۵۰ھ میں حضرت مخدوم کی رفاقت میسر ہوئی۔انھی کے ساتھ ہند آئے اور مخدومِ سمناں کے وصال کے چند سالوں بعد آپ کی وفات ہوئی۔(نزہۃ الخواطر، ج:۳،ص:۲۸۵)

''لطائفِ اشرفی''علم وعرفان کا گنجینہ ہے۔تصوف کی اصطلاحات، اقسام، آداب اور ادق ادق مباحث کو قرآن، احادیث اور اقوالِ سلف سے مبرہن کیا گیا ہے۔شطحیاتِ صوفیہ کی بڑی دل چسپ تاویلات کی گئی ہیں۔ سلاسل طریقت اور صوفیہ کے خانوادوں کا تذکرہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اہلِ بیتِ اطہار، ازواجِ مطہرات ،خلفائے راشدین، اکابرِ امت، ائمۂ ہدیٰ، فرقِ باطلہ اور شعرائے اہلِ تصوف کے احوال وکوائف کا بھی ذکر ہے۔ کہیں اقسامِ توحید کا بیان ہے۔کہیں سالک کے عروج ونزول کا ذکر ہے۔کہیں قرآن وحدیث کی لاجواب تشریح وتوضیح ہے۔کہیں ذکر وفکر، عشق ومحبت اور یادِ الٰہی میں سرمست رہنے کی تعلیمات ہیں۔ یہ کتاب سالک کے لیے سرمایۂ حیات اور مرشد کے لیے دستورِ زندگی ہے۔تصوف کے وہ مسائل جو دیگر کتابوں میں مجملاً بیان ہوئے ہیں، اس کتاب میں اس کی تفصیل ہے۔

اگر اسے تصوف کا انسائیکلو پیڈیا اور دائرۃ المعارف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔متعدد مقامات پر قرآن وحدیث کے تحت زبردست علمی نکات، سماع اور آدابِ سماع پر تشنگانِ علم کو سیراب کردینے والی گفتگو اور صوفی منہج کی تعلیمات ہیں۔

اشتراکات

یہ دونوں کتابیں چشتی نظامی سلسلے کے بزرگوں کی ملفوظات ہیں، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بزرگوں کی تعلیمات میں کچھ اختلافات در آتے ہیں، تاہم اکثر مسائل میں ان ہستیوں کے درمیان اشتراکی تعلیمات پائی جاتی ہیں۔گفتگو طویل نہ ہوجائے ، اس لیے دو چند اشتراکات ذکر کیے جاتے ہیں، جن سے ان بزرگوں کی علمیت واتفاقیت، عبقریت وانفرادیت اور خاص رنگ وآہنگ کا پتہ چلے گا۔

اشتراکِ اول

سماع کے حوالے سے دونوں تصنیفیں جواز کے نظریے کی حامل ہیں۔سماع کے موضوع پر ''فوائد الفواد'' میں مختلف مقامات پر گفتگو ہوئی ہے، لیکن درج ذیل پیراگراف سے زیادہ واضح بیان کسی اور جگہ نہیں ہے۔اسے در بابِ سماع ''فوائد الفواد'' کی روشنی میں قولِ فیصل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

”یک شنبہ سوم ماہِ محرم سنہ احدی عشر وسبع ماۃ سعادت دست بوس حاصل شد، دراں ایام یکی از مدعیان در خصومت کشادہ بود و در منع سماع کلمات ناگفتنی می گفت وعداوتی سخت پیدا کرد، خواجہ ذکرہ اللہ تعالیٰ بالخیر بر لفظِ مبارک راند کہ خدائے تعالیٰ دشمن دارد الد الخصام را، آں گاہ فرمود آنست کہ سخت خصومت کردہ باشد بعد ازاں در بابِ سماع فائدہ فرمود وگفت چند چیز موجود شود، آں گاہ سماع شنود آں چند چیز چیست مستمع و مسموع و آلۂ سماع آں گاہ ایں تفسیر را فائدہ فرمود وگفت مسمع گوئندہ است آدمی باشد کہ مرد باشد و مرد تمام باشد کودک نباشد وعورت نباشد، مستمع آں کہ می شنود او باید کہ حق بشنود و مملو از یادِ حق باشد، مسموع آں کہ آں چہ می گویند باید کہ ہزل و فحش نباشد، اما آلۂ سماع آں مزامیر است چوں چنگ و رباب و مثل ایں باید کہ درمیان نباشد، ایں چنیں سماع حلال است، آں گاہ فرمود کہ سماع صوتی ست موزوں آں چرا حرام است وآں چہ می گوئندہ کلامیست مفہوم آں چرا حرام باشد، دیگر تحریک قلب ست اگر آں تحریک بیادِ حق باشد مستحب است، واگر میل بفساد باشد حرام“

”ماہِ محرم، ۷۱۱ھ بروز اتوار دست بوسی کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان دنوں ایک مخاصم نے بابِ خصومت کھولا۔ منعِ سماع میں نامناسب الفاظ کہے اور سخت عداوت کا اظہار کیا۔ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا: اللہ رب العزت ”الد الخصام یعنی جھگڑالو“ سے دشمنی رکھتا ہے۔ اس کے بعد بابِ سماع میں فائدوں کا ذکر کیا اور کہا: جب چند چیزیں موجود ہوں، اس وقت سماع سنو۔ وہ چند چیزیں مستمع، مسموع اور آلۂ سماع ہیں۔ اس مقام پر اس کی وضاحت بھی کی اور کہا: مسمع: گانے والا ہوتا ہے، آدمی ہو، مردِ تمام ہو، بچہ اور عورت نہ ہو۔ مستمع: جو بھی سنا جائے، حق کی خاطر ہو اور یادِ حق سے مملو ہو۔ مسموع: جو گایا جائے، وہ ہزل و فحش نہ ہو۔ آلۂ سماع: وہ چنگ و رباب اور ان جیسے مزامیر ہیں، جب یہ درمیانِ سماع نہ ہوں تو ایسا سماع حلال ہے۔ اس جگہ فرمایا: سماع ایک آوازِ موزوں ہے، وہ حرام کیسے ہوگی؟ جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ کلام ہے، اس کا مفہوم کیسے حرام ہوگا؟ نیز قلب کو حرکت میں لانا ہے۔ اگر یہ تحریک یادِ حق میں ہو تو مستحب اور فساد کی جانب مائل ہو تو حرام ہے۔“ (فوائد الفواد: ۵،۱۵۱، مجلس: ۲۰)

حضرت قدوۃ الکبریٰ مخدوم سلطان سید اشرف جہاں گیر سمنانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سماع کے جواز پر قرآن، حدیث، کتبِ فقہا اور اکابر اولیا کے افعال و اعمال سے استدلال کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”حضرت قدوۃ الکبریٰ می فرمودند کہ ایں فقیر مدت سی سال در تحت قبہ نیلگوں و زیر گنبد گردون پرکار وار گردیدہ و بملازمتِ اکابر روزگار رسیدہ و از بزمِ نعمت ایشاں جرعہ چشیدہ و خلعت ہمت و نعمت ایں خوب کیشاں در برکشیدہ ہیچ کہ ازیں طائفہ بی سماع نیافتہ و ہمہ ایں اشتغال داشتند اگر چہ بعضے اکابر و برخی اماثر بی سماع ہم بودند ولیکن انکار نداشتند، واز مشائخ ماتقدم حضرت سید الطائفہ، و ابوبکر شبلی، و معروف

کرخی، وسری سقطی، و بایزید، وابوسعید ابی الخیر، وعبد اللہ خفیف، وحاجی شریف، وعزیزانی کہ در تذکرۃ الاولیا مذکور اند و بزرگانی کہ در طبقات الاصفیا مسطور اکثر ازاں ہا صاحبِ سماع بودہ اند، واز مشائخ ما تاخر حضرت شیخ فرید الدین، وقاضی حمید الدین، وخواجہ قطب الدین، وشیخ نظام الدین، وروایاتِ صحیح کہ از ایشاں رسیدہ معلوم شدہ کہ ہمہ تواجد کردہ اند ورقص فرمودہ پس ہر کہ سماع را منکر باشد وحرام بگوید پس گفتہ باشد کہ ایں ہمہ اولیا ارتکابِ حرام کردہ باشد، وایں سخن از عداوت بود ''ومن عادیٰ ولیا فقد بارزنی بالمحاربۃ'' باحق تعالیٰ حرب کردہ باشد''

''حضرت قدوۃ الکبریٰ فرماتے ہیں: یہ فقیر تیس سال تک شامیانۂ آسمان کے نیچے پرکار کی مانند گھوما ہے۔ اکابرِ روزگار کی ملازمت کی ہے۔ ان کی بزمِ نعمت سے خوب خوب فیوض وبرکات حاصل کیے ہیں۔ ان سارے مشائخ کو مشغولِ سماع پایا۔ اگر چہ بعض اکابر نے اس سے پرہیز کیا ہے، لیکن انکار نہیں کیا ہے۔ مشائخِ متقدمین میں حضرت سید الطائفہ، ابوبکر شبلی، معروف کرخی، سری سقطی، بایزید بسطامی، ابوسعید ابوالخیر، عبد اللہ خفیف، حاجی شریف رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور وہ اکابر ومشائخ، جن کا تذکرہ ''تذکرۃ الاولیا'' اور ''طبقات الاصفیا'' میں ہے، ان میں سے اکثر وبیشتر صاحبِ سماع تھے۔ مشائخ متاخرین میں شیخ فرید الدین، قاضی حمید الدین، خواجہ قطب الدین، شیخ نظام الدین کے متعلق صحیح روایات سے معلوم ہے کہ یہ حضرات صاحبِ وجد ورقص تھے۔ لہٰذا جو شخص منکرِ سماع ہے، گویا وہ کہہ رہا ہے کہ یہ سارے اولیائے کاملین فعل حرام کے مرتکب تھے۔ یہ بات تو عداوت ودشمنی پر مبنی ہے۔ جو شخص کسی ولی سے دشمنی رکھتا ہے، وہ اللہ رب العزت کا محارب ہوتا ہے۔'' (لطائفِ اشرفی: حصہ دوم: ۵۷، لطیفہ: ۲۰)

اشتراکِ دوم

مشائخ کے یہاں سجدۂ تعظیمی کا مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے۔ ''فوائد الفواد'' سے پتہ چلتا ہے کہ محبوبِ الٰہی کی بارگاہ میں اس پر عمل ہوتا تھا اور محبوبِ الٰہی اس سے منع نہیں فرماتے تھے اور مخدومِ سمناں کے پیر ومرشد کے دربار میں بھی اس پر عمل درآمد ہوتا، باوجودیکہ حضرت علاء الحق والدین گنج نبات اس سے منع فرماتے، لیکن مرید اس سے باز نہیں آتے تھے۔ درج ذیل عبارات کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ طریقہ مشائخِ چشت کے یہاں معمول بہا رہا ہے۔ ''فوائد الفواد'' میں ہے:

''فرمود کہ بر من خلق می آید وروی بر زمین می آرد چوں پیشِ شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز ، وشیخ قطب الدین قدس اللہ سرہ العزیز منع نبود ومن ہم منع نمی کنم ۔۔۔۔۔ بعد ازاں خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر دریں باب حکایت فرمود کہ ۔۔۔۔ ہر امرے کہ فرض بودہ شد چوں فرضیت برخیزد استحباب باقی می ماند چناں چہ روزہائے ایامِ بیض وایامِ عاشورہ برامِم ماضیہ فرض بود در عہدِ رسول علیہ السلام چوں روزہ

ماہِ مبارک رمضان فرض شد، فرضیتِ ایامِ بیض و ایامِ عاشورہ برخاست، اما استحباب باقی ماند آمدم در سجدہ در میانِ امم ماضیہ مستحب بود، چناں چہ رعیت مر بادشاہ زاد، شاگرد مر استاد در او امت بر پیغمبر را سجدہ می کرد، چوں رسول علیہ السلام شد آں سجدہ برخاست اکنون اگر استحباب رفت، اجابت ماند اگر مستحب نباشد مباح شد، بر مباح نفی و منع کجا آمدہ است، یکے با من بگوہمیں، انکار صرف چہ کار آرد، چوں ایں قدر گفتم او ساکت بماند، ہیچ جواب نتواں است"، ملخصاً

''فرماتے ہیں: مخلوق میری بارگاہ میں آتی ہے اور سر زمین پر رکھتی ہے۔ شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز اور شیخ قطب الدین قدس اللہ سرہ العزیز منع نہیں کرتے تھے، اسی لیے میں بھی منع نہیں کرتا۔ اس درمیان بندے نے عرض کی: جو شخص آپ کی بارگاہ میں آتا ہے اور سر زمین پر رکھتا ہے، اسے کچھ حاصل ہوتا ہے اور نفس شکنی ہوتی ہے۔ مخدوم تو خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے بنائے گئے ہیں۔ ان کی بزرگی مرید کی وجہ سے نہیں ہے۔ اس کے بعد خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے اس باب میں ایک حکایت بیان فرمائی کہ گزشتہ دنوں سیاحت کیے ہوئے اور شام و روم کی سیر کیے ہوئے ایک بزرگ آئے۔ وہ آکر بیٹھے ہی تھے کہ اسی درمیان وحید الدین قریشی بھی آ گئے۔ خدمت گاروں کی مانند خدمت بجالائے اور سر زمین پر رکھا۔ اس بیٹھے ہوئے آدمی نے زور سے کہا: سجدے کی اجازت کہیں نہیں آئی ہے۔ وہ اس باب میں جھگڑنے لگے۔ میں جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ جب گفتگو زیادہ ہو گئی اور اس باب میں انھوں نے غلو کیا، تو میں نے ان سے بس اتنا ہی کہا کہ سنو! زیادتی نہ کرو۔ فرض شدہ امر کی جب فرضیت ختم ہو جاتی ہے تو استحباب باقی رہتا ہے، جیسا کہ ایامِ بیض و عاشورہ کے روزے پہلی امتوں پر فرض تھے۔ عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں جب ماہِ رمضاں کے روزے فرض ہوئے تو ایامِ بیض و عاشورہ کی فرضیت ختم ہو گئی، لیکن استحباب ابھی بھی باقی ہے۔ اب سجدے کے مسئلے پر آتا ہوں۔ سجدہ امم ماضیہ میں مستحب تھا، چناں چہ رعایا بادشاہ کو، شاگرد استاذ کو اور امت پیغمبر کو سجدہ کرتی تھی۔ جب آمدِ مصطفیٰ ہوئی تو یہ سجدہ ختم ہو گیا۔ اب اگر استحباب ختم ہو گیا تو اباحت تو باقی ہے۔ مستحب نہیں تو مباح ہی سہی۔ مباح ہونے پر نفی و منع کہاں آئی ہے؟ مجھے کوئی ایک ہی حوالہ بتا دو۔ محض انکار کیا ہوتا ہے؟ جب میں نے ان سے اتنا کہا تو وہ خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔'' (فوائد الفواد: ۱۰۲، جلد ۴)

حضرت قدوۃ الکبریٰ نے جبیں سائی کے سلسلے میں مجوزین و مانعین دونوں طبقوں کے دلائل دیے ہیں کہ بعض مشائخ اسے جائز کہتے ہیں اور جمہور عدمِ جواز کے قائل ہیں۔ دلائل و براہین ذکر کرنے کے بعد حضرت مخدوم اپنے پیر و مرشد، مخدوم علاء الحق والدین گنجِ نبات رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''اما مخدومی چوں از نمازِ جمعہ وصلاۃِ اعیاد عود می کردند، خلائق انبوہ سر در قدمِ ایشاں می آوردند و سرہا کہ بپائے مبارک ایشاں سرفراز نمی شدند سر برزمین می نہادند و سجدہ می کردند، شخصے از ملایانِ ازیں معنیٰ استفسار کرد کہ نامشروع می شود کہ مردم سر برزمین می نہند، فرمودند کہ اینہارا بسیار منع کردیم و باز داشتہ ایم باز نمی آیند''

''لیکن میرے مخدوم (مخدوم علاء الحق والدین گنجِ نبات) جب نمازِ جمعہ اور عیدین سے لوٹتے تو لوگوں کا ایک جمِ غفیر آپ کے قدمِ مبارک پر اپنا سر رکھ دیتا، جو سر آپ کے پائے مبارک سے محروم رہ جاتے، وہ زمین پر ہی سر رکھ دیتے اور سجدہ کرتے۔ ایک مولوی نے اس بارے میں استفسار کیا کہ زمین پر سر رکھنا تو شریعت کے خلاف ہے۔ فرماتے ہیں: میں نے اس سے بارہا منع کیا ہے، لیکن یہ لوگ باز ہی نہیں آتے۔'' (لطائفِ اشرفی: ۲۹، حصہ دوم، لطیفہ: ۱۷)

اشتراکِ سوم

حضرت خواجہ ابو طالب کے مسئلۂ کفر میں بھی دونوں بزرگوں کا اتفاق نظر آتا ہے۔ ''فوائد الفواد'' میں ہے:

''حکایت ابو طالب درافتاد فرمود کہ چوں او رنجور شد، مصطفیٰ علیہ السلام نزدیک او رفت و گفت تو یک بار بوحدانیتِ حق اقرار کن خواہ بزبان، خواہ بہ صدقِ دل تا من بخدائے حجت گویم کہ الٰہی او ایمان آوردہ است، ہر چند کہ رسول علیہ السلام ایں معنیٰ گفت، ہیچ اثر نکرد، ہم چناں با کفر مرد، و تا امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ مردن او را با رسول علیہ الصلاۃ والسلام بدیں عبارت گفت کہ ''عمک الضال مات'' یعنی عم گمراہ تو بمرد''

''حضرت ابو طالب کی حکایت آئی، فرمایا: جب وہ بیمار تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قریب تشریف لائے اور کہا: خواہ زبان سے ہو یا صدقِ دل سے، ایک ہی بار اللہ رب العزت کی یکتائی کا اقرار کرلیں، تا کہ میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں بطورِ حجت کہہ سکوں کہ مولا! یہ ایمان لے آئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کئی مرتبہ کہی، لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اسی طرح کفر پر انتقال ہوا۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے ان کے انتقال کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں دی کہ ''عمک الضال مات'' یعنی آپ کے گمراہ چچا کا انتقال ہو گیا۔'' (فوائد الفواد: ۸۸، جلد: ۴، مجلس: ۱۵)

''لطائفِ اشرفی'' میں ہے:

''أَبُو طَالب بن عبد المطلب و اسمه عبد مَنَاف وَهُوَ أَخُو عبد الله أبي النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم لأمه وأبيه وعاتكةَ صَاحِبَة الرُّؤْيَا فِي بدر، أمّهم فَاطِمَة بنت عَمْرو بن عايذ بن مَخْزُوم وَله من الْوَلَد أَبُو طَالب وَمَاتَ كَافِرًا''

”حضرت ابوطالب کا نام عبدِ مناف ہے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والدِ گرامی حضرت عبداللہ اور عاتکہ کے اخیافی بھائی ہیں۔ان کی ماں فاطمہ بنت عمرو ہیں۔ ان کےابو طالب نامی ایک صاحبزادے ہیں، جن کی موت کفر پر ہوئی ہے۔“ (لطائفِ اشرفی: ۳۱۵، حصہ: ۲، لطیفہ: ۵۲)

مذکورہ دونوں عبارتیں کفرِ ابی طالب کی بابت بالکل واضح ہیں۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ ”لطائفِ اشرفی“ کی ذکر کردہ عبارت درحقیقت وہ مخدومِ سمناں کی اپنی عبارت نہیں ہے، بلکہ یہ عبارت امام محب الدین طبری (۶۹۴ھ) کی کتاب ”خلاصۃ سیر سید البشر“ (۱/ ۱۴۵) سے ماخوذ ہے۔اس کے علاوہ بھی ”لطائفِ اشرفی“ میں بہت سارے مقامات پر اس کتاب کی عبارتیں منقول ہیں۔

اشتراک چہارم

صوفیہ صاحبِ ترجیح وتمیز ہوتے ہیں۔ وہ مقلد ضرور ہوتے ہیں، لیکن بسا اوقات درجۂ اجتہاد پر فائز ہوتے ہیں اور جس مذہب پر انھیں انشراحِ صدر ہوتا ہے، عمل درآمد کرتے ہیں۔ ایسی بہت ساری مثالیں اربابِ تصوف کے یہاں ملتی ہیں۔ خود محبوبِ الٰہی حنفی المذہب تھے، لیکن بعض مسائل میں امام شافعی کی رائے کے مطابق رائے رکھتے تھے۔

”سخن دوران افتاد کہ روا باشد بعضے بر جنازۂ غائب نماز می گزارند، چگونہ باشد، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ روا باشد، مصطفیٰ علیہ السلام بر نجاشی ہم چنیں نماز گزاردہ است او در غیبتِ مردہ بود و امام شافعی ایں معنیٰ جائز می دارد، و اگر عضو از میت مثلاً دستے، و یا پائے، و یا انگشتے ہر چہ باشد، بر آں ہم نماز می گزارند۔“

”گفتگو چلی کہ بعض حضرات نمازِ غائب پڑھتے ہیں۔ یہ عمل کیسا ہے؟ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا: جائز ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کی نمازِ جنازہ اسی طرح پڑھی ہے، وہ غائبانے میں مردہ تھے۔ امام شافعی اسے جائز کہتے ہیں۔ اگر میت کا کوئی عضو بھی موجود ہو جیسے ہاتھ، یا پاؤں یا انگلی، چاہے جو بھی ہو، اس پر نماز پڑھنا جائز ہے۔“ (فوائد الفواد: ۹۳، جلد: ۴)

اسی طرح ایامِ بیض کے سلسلے میں محبوبِ الٰہی کبھی کبھی امام شافعی کے نظریے پر عمل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ ”فوائد الفواد“ کی چھپنویں مجلس میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

”بندہ عرض داشت کرد کہ سیزدہم ایں ماہ افطار کردہ می شود بسببِ ایامِ تشریق حال روزہ ایامِ بیض چہ شود، فرمود کہ شانزدہم روز روزہ باید داشت، آں گاہ فرمود کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پیوستہ چہاردہم، پانزدہم وشانزدہم ایامِ بیض می دارد“

”بندے (خواجہ امیر حسن علا سجزی) نے عرض کی: اس مہینے تیرھویں کو ایامِ تشریق کے سبب روزہ چھوڑنا پڑے گا۔ پھر ایامِ بیض کے روزے کا کیا ہوگا؟ فرمایا: سولھویں تاریخ کو روزہ رکھ لینا چاہیے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ لگاتار ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ کو ایامِ بیض قرار دیتے ہیں۔‘‘ (فوائد الفواد: ۱۲۸، جلد: ۴)

حضرت سلطان سید اشرف جہاں گیر سمنانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی لطائفِ اشرفی میں ایک ایسی روایت ملتی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی کسی دوسرے مجتہد کے قول پر عمل درآمد کرنے کے قائل و مؤید تھے۔

’’لیکن قولِ اوتعالیٰ: اذکر ربك۔ ذکرِ قراءت در نماز است خلف امام در نفس خود و آں قولِ قتادہ است‘‘

’’لیکن اللہ رب العزت کا فرمان: ’’اذکر ربک‘‘ حالتِ نماز میں امام کے پیچھے اپنے ہی دل میں قراءت کرنا ہے اور یہ قول حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔‘‘ (لطائفِ اشرفی: ۲۸۷، حصہ: ۱، لطیفہ: ۹)

ان اقوال و آثار کے علاوہ بھی دوسری کتابوں میں ان بزرگوں سے بعض اختلافی باتیں ملتی ہیں، جیسے محبوبِ الٰہی قراءت خلف الامام کے قائل تھے۔ مخدوم سمناں ایمانِ فرعون کے مسئلے میں جمہورِ امت سے اختلاف کرتے ہوئے شیخِ اکبر سیدنا محی الدین ابن عربی کے نظریے کے حامل و مؤید تھے۔ وغیرہ وغیرہ

اختلافات

دونوں بزرگوں کی تعلیمات میں بہت زیادہ اشتراک ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھتی ہیں، مزید برآں کہ محبوبِ الٰہی مخدومِ سمناں کے پردادا مرشد ہیں۔ تاہم بعض مقامات پر اختلاف کا درآنا، ایک انسانی فطرت ہے اور اس سے کسی انسان کو کوئی مفر نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر کچھ باتوں میں دونوں اختلافِ رائے رکھتے ہیں۔ محبوبِ الٰہی کے نزدیک زکات کی تین قسمیں ہیں اور ان کی ادائیگی کی نوعیت بھی الگ ہے۔

اختلافِ اول

’’فوائد الفواد‘‘ میں ہے:

’’بعد ازاں برلفظ مبارک راند کہ شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز می فرمودند زکات سہ نوع است: زکاتِ شریعت، وزکاتِ طریقت، وزکاتِ حقیقت است، زکاتِ شریعت آنست کہ از دویست درم پنج درم بہ دہد، زکاتِ طریقت آنست کہ از دویست درم پنج درم نگہ دارد باقی بہ دہد، زکاتِ حقیقت آنست کہ ہمہ بہ دہد، ہیچ نگہ ندارد‘‘

’’اس کے بعد فرمایا کہ شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں: زکات کی تین قسمیں ہیں۔ زکاتِ شریعت، زکاتِ طریقت اور زکاتِ حقیقت۔ زکاتِ شریعت، دوسو درہم میں سے پانچ درہم دینا ہے۔ زکاتِ طریقت، دوسو درہم میں سے پانچ رکھنا ہے، باقی دے دینا ہے اور زکاتِ حقیقت، سارے درہم دے دینا ہے اور کچھ باقی نہیں رکھنا ہے۔‘‘ (فوائد الفواد: ۶۹، جلد سوم)

مخدومِ سمناں کے نزدیک زکات دو ہی طرح کی ہیں اور ان کی ادائیگی کی نوعیت بھی مختلف ہے:

''حضرت قدوۃ الکبریٰ می فرمودند زکاتِ اہلِ شریعت دیگر است، و زکاتِ اہلِ طریقت دیگر، چناں کہ نقل است از حضرت شبلی کسی پرسید کہ از دویست درم چند درم زکات بباید داد، گفت برآں بہ تو او ہم یا از اں خویش، گفت مسئلہ بہ نسبت ہر یکی واحد است، پس آں من و آں او کدام باشد، فرمودند آں تو آنست کہ از دویست درم پنج درم بباید داد و مرا از دویست بتمام و پنج درم دیگر بدہم، گفت دویست خود دادی بدہے، پنج درم کدام است، گفت دام کردہ بدہم، گفت ایں مذہب کیست گفت مذہبِ ابی بکر صدیق، چناں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم از و پرسید کہ ''ما خلفت لعیالك، گفت: اللہ و رسولہ''

''حضرت قدوۃ الکبریٰ فرماتے ہیں: زکاتِ اہلِ شریعت چیز دیگر ہے اور زکاتِ اہلِ طریقت چیزِ دیگر۔ منقول ہے کہ حضرت ابوبکر شبلی سے کسی نے پوچھا: دوسو درہم میں سے کتنی زکات دینی ہے؟ فرمایا: تیری بابت بتاؤں یا اپنی بابت؟ اس نے کہا: مسئلہ تو ہر شخص کے لیے ایک ہی ہوتا ہے، لہٰذا میرا اور آپ کا مسئلہ کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: تو دوسو درہم میں سے پانچ درہم دے گا اور میں پورے دوسو درہم اور مزید پانچ درہم دوں گا۔ اس نے کہا: دوسو درہم تو آپ اپنی ملکیت سے دے دیں گے، لیکن پانچ درہم کیسے ادا کریں گے؟ فرمایا: پانچ درہم قرض لے کر دیں گے۔ اس نے کہا: یہ کس کا مذہب ہے؟ فرمایا: یہ سیدنا صدیقِ اکبر کا مذہب ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: اپنے اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا؟ عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو۔'' (لطائفِ اشرفی: ۱۵۹، لطیفہ: ۳۱، حصہ دوم)

اختلافِ دوم

سماع کے جواز میں تو دونوں بزرگ بالکل متفق ہیں۔ البتہ ''فوائد الفواد'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیانِ سماع مزامیر کا نہ ہونا محبوبِ الٰہی کے نزدیک بہتر و اولیٰ ہے، جب کہ بعض اربابِ علم و فضل نے محبوبِ الٰہی کی جانب حرمتِ مزامیر کی نسبت بھی کی ہے، جو ثابت نہیں ہے۔

''فوائد الفواد'' میں ہے:

''اما آلۂ سماع آں مزامیر است چوں چنگ و رباب و مثل ایں باید کہ درمیان نباشد، ایں چنیں سماع حلال است''

''آلۂ سماع: وہ چنگ و رباب اور ان جیسے مزامیر ہیں، جب یہ درمیانِ سماع نہ ہوں تو ایسا سماع حلال ہے۔'' (فوائد الفواد: ۵، ۱۵۱، مجلس: ۲۰)

مخدوم سمناں کے نزدیک استماعِ مزامیر کے حلال و مباح ہونے میں کسی قسم کا کوئی تردد نہیں ہے۔ ''لطائفِ اشرفی'' میں ہے:

''استماع مزامیر در مذاہبِ مختلفہ آمدہ است و بعضی جواز او نداشتہ اند اما دف بی جلاجل مشائخ شنیدہ اند،

وبعضے رباب ہم شنیدہ اند، ودف باجلاجل ودر مجلس حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند شاہین و رباب ونائے نی حاضری کردہ اند۔۔۔۔حضرت قدوۃ الکبریٰ می فرمودند جواب آخریں ما در مقابلۂ منکرانِ سماع ومواجہۂ مدعیانِ استماع ایں ست کہ سنتِ پیران ما است وما می شنویم انکار اگر شما است از یں کار در انکار باشید"

"مزامیر کا سننا مختلف مذاہب سے چلا آرہا ہے۔بعض مشائخ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں،لیکن انھوں نے بغیر جھانجھ کے دف سنا ہے۔بعض نے رباب اور جھانجھ کے ساتھ بھی دف سنا ہے۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں شاہین، رباب، نائے اور نی (دونوں ایک قسم کے ساز ہیں) موجود رہتے تھے۔حضرت قدوۃ الکبریٰ بطورِ قولِ فیصل فرماتے ہیں کہ منکرینِ سماع واستماعِ مزامیر کے سلسلے میں ہمارا آخری جواب یہی ہے کہ یہ ہمارے پیروں کی سنت ہے۔ہم سنیں گے۔اگر تم اس کے منکر ہو، تو منکر رہو۔(لطائفِ اشرفی:۸۷،حصہ:دوم،لطیفہ:۲۰)

یہاں دل چسپ بات یہ ہے کہ"فوائد الفواد" کے مترجم خواجہ حسن نظامی نے ایک تو ماہِ محرم کو ماہِ ذی الحجہ سے، اتوار کو پیر سے بدلا اور دوسری طرف "مثل ایں باید کہ درمیان نباشد" کا ترجمہ ہی چھوڑ دیا۔مترجم کا ایسا کرنا میری سمجھ سے باہر ہے۔ہمارا مدعا یہی ہے کہ محبوبِ الٰہی کے اقوال میں کہیں بھی صراحت کے ساتھ مزامیر کی حرمت کا ذکر نہیں ہے۔تاہم بعض ایسے اقوال "فوئد الفواد" ہی میں ہیں، جن سے حرمت کا گمان ہوتا ہے۔بعض ایسے اقوال ہیں، جن سے اباحت کا اشارہ ملتا ہے۔

بعض احباب کے دل ودماغ میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہاں لفظِ "باید" "وجوب" کے معنیٰ میں ہو، کیوں کہ وہ حلت کے مقابلے میں وارد ہوا ہے۔لہٰذا اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہاں "حلال" اپنے اصلی معنیٰ پر محمول نہیں ہے، جیسا کہ "لطائفِ اشرفی" میں "دستور القضات" کے حوالے سے سماع کی چار قسمیں ہیں: حلال، مباح، مکروہ اور حرام۔یہاں حلال ومباح دو الگ الگ قسم ہیں۔پھر حضرت سلطان المشائخ کے حوالے سے اسی لطائف میں انہی چار قسموں کا ذکر ہے۔اس میں بھی حلال ومباح، دو الگ الگ قسم ہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "فوائد الفواد" میں مذکور لفظِ "حلال" کو مندوب ومستحب کے معنیٰ میں لینا ہی اولیٰ واحسن ہوگا۔

دوسری بات مزامیر کے حوالے سے محبوبِ الٰہی کا موقف ونظریہ سمجھنے کے لیے ان کے مختلف ملفوظات کا استقصا بھی ضروری ہے، تاکہ بات مکمل طور سے واضح ہوجائے۔اس سلسلے میں سب سے اہم ماخذ ومصدر "کشف القناع عن اصول السماع" ہے، یہ کتاب حضرت محبوبِ الٰہی کے حکم پر حضرت فخر الدین زرّادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مرتب کی ہے۔اس کتاب کے متعلق اعلیٰ حضرت فاضلِ بریلوی فرماتے ہیں: "یہ کتاب حضرت نظام الاولیا کے حکم احکم سے لکھی گئی ہے۔"

ظاہر ہے کہ جب محبوبِ الٰہی کے حکم سے ترتیب دی گئی ہے تو حضرت محبوبِ الٰہی کے اصلی موقف ونظریے ہی

پر مبنی ہوگی۔ اس کتاب میں علامہ زرادی نے لکھا ہے کہ مزامیر فی نفسہ مباح ہیں۔ (تفصیل کے لیے الاحسان-۸ر ازمولانا ذیشان مصباحی ملاحظہ فرمائیں)

اس گفتگو سے کم سے کم یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مزامیر کے حوالے سے محبوبِ الٰہی کی مختلف آرا ملتی ہیں۔ کسی سے حرمت کا شائبہ ہوتا ہے۔ کسی سے ناجائز وممنوع کا خیال آتا ہے۔ کسی سے اباحت کا اشارہ ملتا ہے۔ ان اقوال میں فقیر کے نزدیک سب سے قوی بات حضرت علامہ زرادی ہی کی معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ رسالہ بقول فاضل بریلوی محبوبِ الٰہی کے حکمِ احکم سے لکھا گیا ہے۔

''لطائفِ اشرفی''میں مخدومِ سمناں نے بھی محبوبِ الٰہی کی جانب سماعِ مزامیر کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ اشتراکِ اول میں ذکر ہوا۔

اختلافِ سوم

''فوائد الفواد''میں حضرت ابو اسحاق گاذرونی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ مذکور ہے، جس میں ان کا نام ''شہریار''اور پیرومرشد کا نام عبداللہ خفیف بتایا گیا ہے۔

''فوائد الفواد''میں ہے:

''حکایت شیخ ابو اسحاق گاذرونی افتاد فرمود کہ اوراشہریار نام بود،۔۔۔۔۔۔۔۔مگر وقتے درایام صغرسن ریسمانی رستہ می کرد شیخ عبداللہ خفیف قدس اللہ سرہ العزیز برو بگزشت ونظر کرد تاچہ دید درسیمین او، ابو اسحاق راگفت بیامرید من شو، ابو اسحاق حیران ماندگفت من چہ دانم کہ مرید چگونہ می شوند شیخ عبداللہ فرمود تو دست بردستِ من نہ بگو کہ من مرید تو شدم، ابو اسحاق ہم چناں دست شیخ بگرفت ومرید شد۔۔۔''ملخصاً

''حضرت ابو اسحاق گاذرونی کی حکایت چلی، فرمایا: ان کا نام شہریار اور کنیت ابو اسحاق تھی۔ اس مقام پر ان کی کیفیت بیان فرمائی کہ وہ ایک نور باف تھے۔ دیہات میں رہتے تھے۔ جس وقت صغرِ سنی میں وہ سوت بنا رہے تھے، ان کے پاس سے شیخ عبداللہ خفیف کا گزر ہوا، شیخ نے انھیں دیکھا، معلوم نہیں کون سی روشنی دیکھی؟ ابو اسحاق سے کہا: میرے مرید ہو جاؤ! ابو اسحاق نے حیران ہو کر کہا: میں نہیں جانتا کہ مرید کیا ہوتا ہے؟ شیخ عبداللہ خفیف نے فرمایا: اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں رکھو اور کہو کہ تم میرے مرید ہو، ابو اسحاق نے اسی طرح شیخ کا ہاتھ تھاما اور مرید ہو گئے۔''

(فوائد الفواد: ۱۵۷، جلد: ۵، مجلس: ۳۰)

''لطائفِ اشرفی''میں بعینہٖ یہی واقعہ مذکور ہے، لیکن اس میں ''شہریار''ان کے والد کا نام اور پیر کا نام ابو علی حسین بن محمد فیروز آبادی بتایا گیا ہے۔

''لطائفِ اشرفی''میں ہے:

''حضرت قدوۃ الکبریٰ تقریباً می فرمودند کہ حضرت شیخ ابو اسحاق بن شہریار گاذرونی ہم از خدمت فقرا بمقصود اصلی بحصول کلی رسیدہ اند،۔۔۔۔۔، چوں نظرِ شیخ ابو علی بر شیخ ابو اسحاق افتاد بنور ولایت خود عواقب ومراتب ایشاں دانستند کہ یکے از قدوۂ اولیائے عصر وزبدۂ اصفیائے دہر خود خواہند بود،۔۔۔۔۔حضرت شیخ ابو علی فرمودند کہ دست خود بموجب فرمودہ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ دست من بدہ وبگو کہ من مرید شما شدم ہم چناں کردند وبحضرت شیخ ارادت آوردند۔۔۔۔'' ملخصاً

''حضرت قدوۃ الکبریٰ فرماتے ہیں: حضرت شیخ ابو اسحاق بن شہریار گاذرونی فقرا کی خدمت ہی سے مقصودِ اصلی اور حصولِ کلی تک پہنچے ہیں۔ شیخ ابو اسحاق گاذرون کے ایک گاؤں میں نسّاجی کے عمل میں مشغول رہتے تھے۔ حضرت شیخ ابو علی حسین بن محمد فیروز آبادی، جو اصحابِ توحید کے مقتدا، اربابِ تفرید کے رہنما، صاحبِ ولایت اور متصرفِ ہدایت تھے، دورانِ سفر اسی گاؤں سے ان کا گزر ہوا۔ حضرت شیخ ابو اسحاق دھاگوں کی درستگی میں مشغول تھے۔ جب حضرت شیخ ابو علی کی نظر ابو اسحاق پر پڑی، تو اپنے نورِ ولایت سے انھیں معلوم ہو گیا کہ یہ بندہ آگے چل کر قدوۂ اولیائے عصر اور زبدۂ اصفیائے دہر ہوگا۔ فرمایا: اسحاق میرے مرید ہو جاؤ! عرض کی: مجھے ارادتِ قوانین کا علم نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ انتہائی سادہ انسان تھے۔ انوارِ ارشاد ومرشد اور آثارِ مرید ومراد سے انھیں واقفیت نہ تھی۔ شیخ ابو علی نے فرمایا: آیتِ: إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ کے مطابق اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھو اور کہو کہ میں تمھارا مرید ہو گیا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور شیخ کی ارادت میں داخل ہو گئے۔'' (لطائفِ اشرفی: ۸۷، حصہ: ۱، لطیفہ: ۴)

ان عبارتوں میں غور فرمائیں۔ محبوبِ الٰہی ان کے پیر کا نام ''شیخ عبد اللہ خفیف''، ان کا نام شہریار اور کنیت ابو اسحاق بتا رہے ہیں۔ قدوۃ الکبریٰ نے پیر کا نام ابو علی حسین بن محمد فیروز آبادی اور ''شہریار'' والد کا نام بتایا ہے۔ پُرلطف بات یہ ہے کہ ابو اسحاق گاذرونی کی شیخ عبد اللہ خفیف سے ملاقات ہونے پر نزہۃ الخواطر میں تو ایک روایت ہے:

''أخذ عن الشيخ دانيال عن الشيخ علي عن الشيخ أبي إسحاق الكاذروني عن الشيخ أبي عبد الله محمد بن خفيف الشيرازي'' (نزهة الخواطر: ۱/ ۱۳۰)

اس عبارت سے کم از کم یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابو اسحاق گاذرونی نے طریقت کا حصول حضرت شیخ ابو عبد اللہ بن خفیف شیرازی سے کیا ہے، لیکن حضرت ابو علی حسین بن محمد فیروز آبادی، جن کا ذکر ''لطائفِ اشرفی'' میں ہے، کون ہیں؟ کس طبقے سے ان کا تعلق ہے؟ ان کی ملاقات ابو اسحاق گاذرونی سے ہوئی ہے یا نہیں؟ تحقیق بسیار کے بعد معلوم نہ ہو سکا۔

امتیازات

دونوں کتابیں اپنی نظیر آپ ہیں۔ چشتی نظامی خانقاہوں کے شہرۂ آفاق مردانِ باوفا سے منسوب ہیں۔ ایک ذات دنیا میں محبوبِ الٰہی، سلطان المشائخ، سلسلۂ نظامیہ کے بانی حضرت سیدنا نظام الدین اولیا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے معروف ہے۔ دوسری شخصیت تارک السلطنت، محبوبِ یزدانی، غوث العالم، میر کبیر اوحد الدین، سید اشرف جہاں گیر سمنانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے معنون ہے۔

''فوائد الفواد'' غالباً پہلا ایسا ملفوظ ہے، جو اتنے اہتمام کے ساتھ اور تاریخی انداز میں مرتب کیا گیا ہے۔ جامعِ ملفوظ نے اپنی ہر نشست ''مجلس'' سے تعبیر کی ہے اور بعینہٖ محبوبِ الٰہی کے الفاظ جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اگر کہیں الفاظ ذہن سے اتر گئے تو وہاں کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے، تا کہ شیخ کی بارگاہ میں دکھا کر اصلاح ہو جائے۔ مرتبِ ملفوظ خود فرماتے ہیں:

''بندہ را گفت کہ آں کاغذ کہ در قلم آوردہ بیاوردہ، بندہ عرض داشت کردکہ آرے آوردہ ام۔۔۔۔ یک دو جائے بیاضی گزاشتہ بودم، فرمود کہ ایں بیاض چرا گزاشتہ، عرض داشت کردم کہ بقیہ آں حرف نیکو معلوم نکردہ بودم شفقت فرمودہ بقیہ ہر کلمہ بیان کردتا آں کلمات تمام شد''

''بندے سے کہا: اپنا تحریر کردہ کاغذ لائے ہو؟ میں نے عرض کی: جی لائے ہیں۔ فرمایا: لے آؤ، بندے نے لکھے ہوئے ۶/ کاغذات حضرت کے دستِ مبارک میں دیے۔ حضرت نے مطالعہ فرمایا اور تعریف کی، فرمایا: اچھا لکھا ہے۔ جوں جوں مطالعہ فرماتے، کہتے اچھا لکھا ہے۔ ایک دو مقام پر خالی جگہ تھی۔ فرمایا: یہاں خالی کیوں ہے؟ عرض کی: بقیہ حروف صحیح سے معلوم نہ تھے۔ حضرت نے شفقت فرمائی اور بقیہ کلمات بیان فرمائے، حتیٰ کہ وہ کلمات مکمل ہو گئے۔'' (فوائد الفواد: ۱۹، ۲۰، جلد: ۱)

مختلف مقامات پر تفسیر وحدیث، فقہ واصولِ فقہ، تاریخ وسِیر، مصطلحاتِ صوفیہ، آدابِ بیعت، اوراد ووظائف، اعمال واشغال، سماع ومزامیر، حکایاتِ مشائخِ امت، تذکیر وموعظت اور عقائد وتزکیۂ نفس کے پُر تنوع موضوعات ہیں۔ اسلوبِ بیان نہایت ہی دل نشیں ہے۔ زبان کی لطافت وصحت میں منفرد وبے مثال ہے۔ یہ پوری کتاب درس وعبرت، پند ونصائح، تعلیمِ امت، خدمتِ خلق، اتحاد واتفاق اور تبلیغِ دین کے نبوی منہج واسلوب پر مبنی ہے۔

''لطائفِ اشرفی'' ''فوائد الفواد'' کے بعد دوسرا ملفوظ ہے، جو اس قدر اہتمام اور عرق ریزی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اتنی ضخامت اور تفصیل پر مشتمل غالباً یہ خانقاہِ چشت کا پہلا ملفوظ ہے۔ جامعِ لطائف نے مرتبِ ''فوائد الفواد'' کے برخلاف ''لطائف'' سے اسے معنون کیا ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھی امتیاز کی حامل ہے کہ اس میں تصوف ومعرفت کے اکثر وبیشتر ادق ادق مسائل کا ذکر ہے۔ حسنِ ترتیب میں اسے ''فوائد الفواد'' پر سبقت حاصل ہے۔ طرزِ بیان سحر انگیز ہے۔ الفاظ ایجاز واطناب سے خالی اور بڑے آسان ہیں۔ ہر مقام پر قرآن، حدیث، اقوالِ ائمۂ اعلام اور سلف

کے عمل سے زبردست استدلال ہے۔ حجیت واستدلال میں بھی یہ دیگر ملفوظاتِ مشائخ پر عبقریت رکھتی ہے۔ فلسفۂ وحدت الوجود بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس زمانے کے حالات، معیشت، معاشرت اور تہذیب وثقافت کا بھی علم ہوتا ہے۔ اس میں حوالے کی بڑی کثرت ہے۔ یہ ملفوظ بھی صوفی منہج کا عکاس ہے۔

منہج

ہر کتاب کا اپنا ایک خاص منہج ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ کتاب دوسرے سے الگ اور ممتاز ہو جاتی ہے۔ ''فوائد الفواد'' اور ''لطائفِ اشرفی'' کا بھی اپنا مخصوص نہج ہے۔ یہ بات تو معلوم ہے کہ ''فوائد الفواد'' محبوبِ الٰہی کا ملفوظ ہے اور اس کے جامع حضرت علا سجزی ہیں، گو کہ محبوبِ الٰہی اپنے وقت کے ایک زبردست فقیہ ومتکلم اور اجتہادی شان کے مالک تھے، لیکن آپ کی ذات پر تصوف ومعرفت کا غلبہ تھا۔ یہی حال حضرت علا سجزی کا بھی ہے۔ اس لیے ''فوائد الفواد'' کا منہج صوفیانہ اور معروضی ہے۔ لوگوں کو اللہ رب العزت تک پہنچانے اور اس کی معرفت وعرفان کے حصول کی خاطر واقعاتِ سلف سے استفادہ کیا گیا ہے۔ سائل کا سوال جس انداز واسلوب میں ہے، اسی کے مطابق جواب بھی دیا گیا ہے۔

''لطائفِ اشرفی'' کا بھی اپنا ایک خاص اسلوب ومنہاج ہے۔ چوں کہ غوث العالم، محبوبِ یزدانی سلطان سید اشرف جہاں گیر سمنانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اپنے وقت کے زبردست محدث، مفسر، متکلم، فقیہ، فلسفی، نحوی، بلاغی اور درجۂ اجتہاد تک پہنچے ہوئے مجتہد تھے، تاہم آپ کی ذات شریعت وطریقت کا سنگ میل سمجھی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ''لطائفِ اشرفی'' کا قاری کبھی تصوف ومعرفت کی حلاوت وچاشنی محسوس کرتا ہے تو کبھی ایک نکتہ سنج فقیہ ومتکلم ، دور بیں محدث اور بابِ تفسیر میں یدِ طولیٰ رکھنے والے مفسر کی نکتہ آفرینی، دور اندیشی اور مہارتِ خداداد کو ملاحظہ کرتا ہے۔ پہلے مسئلے کو قرآن سے بیان کیا جاتا ہے۔ پھر احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حل پیش کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اقوالِ سلف کی روشنی میں مسئلے کی نوعیت پوری طرح واضح کی جاتی ہے۔ مسئلہ مختلف فیہ ہے یا متفق علیہ ہے، اسے بیان کیا جاتا ہے۔ حوالوں کا اس قدر التزام کیا گیا ہے کہ اسے دیگر ملفوظات پر تفوق وبرتری حاصل ہے۔

قبولیتِ عام وخاص

یہ دونوں ملفوظات چشتی نظامی خانقاہوں میں درجۂ اعتبار رکھتے ہیں۔ صاحبانِ سلوک ومعرفت کے یہاں انھیں خصوصی مقام حاصل ہے۔ چشتیوں کے یہاں ان کتابوں سے بیمار دلوں کا علاج ہوتا ہے۔ سالک کے لیے رہنمائے اصول اور مرشد کے لیے گنجینۂ ارشاد ہیں۔ عوام وخواص دونوں میں یکساں مقبول ہیں۔ اگر سالک فقط انھی دونوں کتابوں کا مطالعہ کر لے تو تصوف کی دوسری کتابوں سے بے نیاز ہو جائے گا؛ کیوں کہ یہ دونوں کتابیں اپنے اندر اسرار ومعانی کا ایک سمندر سموئے ہوئی ہیں۔ انھیں صرف چشتی نظامی خانقاہوں ہی میں نہیں، بلکہ مختلف خانقاہوں میں دستور العمل سمجھا جاتا ہے۔

''فوائد الفواد'' کی مقبولیت متقدمین میں بھی رہی ہے اور متاخرین میں بھی۔ سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے عظیم خلیفہ، جامعِ ''لطائفِ اشرفی'' حضرت نظام الدین یمنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ رقم طراز ہیں:

''الحق آں ملفوظ جامع حقائق اسرار وحاویِ دقائقِ انوار نامتناہی است، چوں در ولایت رفتہ جمعی درو یشاں را موجب حصول معانی وسبب وصول منافع شدہ، و دستور شدہ کہ از اکابر ولایت را جامع نوشتن باعث شدہ، چناں کہ خواجہ بہاء الدین نقشبند را باسلوب آں کتاب شخصے جامع مقالات ایشاں شدہ، وفقیر را از کتبِ تصوف کہ در ہند تصنیف شدند دو کتاب در ولایت رسید، یکے فواد الفواد، دوم مکتوباتِ حضرت شیخ شرف الدین کہ بسیار از و بہرہ مندیم''

حقیقت میں یہ ملفوظ اسرار کی حقیقتوں کا جامع اور انوارِ الٰہی کے دقائق وغوامض کو محیط ہے۔ جب ملک میں اس کے نوشتے پھیلے تو فقرائے طریقت کے لیے حصولِ معانی اور عرفانِ الٰہی کے وصول کا سبب بن گئے۔ پھر اسی نہج پر اکابر کے ملفوظات کو لکھنے کی طرح پڑ گئی۔ خواجہ بہاء الدین نقشبند رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مجموعۂ مقالات کو ایک شخص نے اسی طرز پر قلم بند کیا ہے۔ فقیر کو ہندوستان میں فنِ تصوف پر لکھی ہوئی کتابوں میں سے دو ہی کتابیں بیرونِ ہند میں ملیں۔ ایک ''فوائد الفواد'' اور دوسری شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ''مکتوبات''، ان سے مجھے بڑا فائدہ حاصل ہوا ہے۔'' (لطائفِ اشرفی: ۲: ۷۳، حصہ: ۲، لطیفہ ۵۴)

متاخرین میں پروفیسر خلیق احمد نظامی وغیرہ جیسے محققین نے اپنی کتاب میں بیشتر مقامات پر اس سے استفادہ کیا ہے، جس سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت اور قبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

''لطائفِ اشرفی'' بھی قدما کے یہاں درجۂ قبول اور متاخرین کے یہاں ایک ماخذ ومصدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی جیسے محقق نے بھی اپنی کتاب ''تاریخ مشائخِ چشت'' میں ''لطائفِ اشرفی'' سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد جامعات میں اس کتاب پر تحقیقی مقالات لکھے گئے ہیں اور ان مقالات کی ترتیب پر مرتبین کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ جیسے شعبۂ فارسی، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹر محی الدین اظہر صاحب نے ''لطائفِ اشرفی کا تنقیدی جائزہ'' کے موضوع پر اپنا وقیع مقالہ لکھا اور ڈاکٹریٹ آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ (سید اشرف جہاں گیر سمنانی: مختلف عصری جامعات میں علمی تحقیق از ڈاکٹر محمد احمد نعیمی)

اثرات

ان دونوں کتابوں کا قاری اس بات کا شاہد ہے کہ ان کے اثرات سے روح میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ سخت دل نرم پڑ جاتے ہیں۔ نگاہوں سے اشک رواں ہوتے ہیں۔ پڑھنے والا ایمان کی حلاوت وچاشنی سے لذت آشنا ہوتا ہے۔ گناہ گار اپنے گناہوں پر نادم وپشیماں ہوتا ہے۔ خود احتسابی کا ضمیر بیدار ہوتا ہے۔ انسانوں کے عروقِ مردہ

میں رمق حیات پیدا جاتی ہے۔ رنج وکرب میں مبتلا انسان کو دفیعہ ملتا ہے۔قلبی امراض والوں کوتریاق نصیب ہوتا ہے۔شکوک وشبہات کے حجابات چھٹ جاتے ہیں اور بندے کویقین واذعان کی دولتِ لازوال میسر ہوتی ہے۔ اس ہنگامہ خیز دنیا میں ان سے سکونِ قلب ملتا ہے۔اربابِ علم علمی موشگافیوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔تصوف شناسا حضرات کودرسِ تصوف کے دقائق وغوامض کا علم ہوتا ہے۔سالکانِ طریقت کومختلف نکاتِ سلوک کا پتہ چلتا ہے۔علم وتصوف سے عاری حضرات کے ایمان میں ان کے مواعظ ونصائح سے پختگی ملتی ہے۔

راقم نے بوقتِ مطالعہ خود بہت ساری چیزیں محسوس کی ہیں۔متعدد مقامات پر اس گناہ گار کی بھی آنکھیں نم ہوئی ہیں۔ بارہادل نے اپنے گناہوں پر ندامت کا اظہاراوراپنی حرکات وسکنات پر خوب ملامت کی ہے۔دورانِ مطالعہ ایسامحسوس ہوتا ہے، گویا ہم نے اتنی عمرلہوولعب اور بے جااعمال واشغال میں ضائع کردی ہے۔حقیقی ایمان توان اولیائے کاملین کے پاس ہے، جنھوں نے فاقہ کشی کے باوجودشجرِ اسلام کی آبیاری اورنشرواشاعت کے لیے اپنی پوری زندگی تیاگ دی۔بدخواہ حضرات کے ساتھ کیساسلوک کیا جاتا ہے، یہی حضرات جانتے ہیں۔غیروں کواپنا بنانے کا ہنر انہی لوگوں کے جلو میں ملتا ہے۔اسوۂ رسول کی خوبوانہی حضرات کی جھولی میں ہے۔راستے میں کانٹے بچھانے والوں کے تلووں تلے پھول بچھانا، انہی کی تعلیم ہے۔گالی دینے والوں کودعائیں دینا، انہی لوگوں کا وتیرہ ہے۔

ملاحظات والتماس

ان دونوں کتابوں کے مطالعے سے بہت سارے نکات سامنے آتے ہیں۔ان کی ترتیب وتبویب میں مزید حسن درکار ہے۔بعض مقامات پر تاریخی غلطیاں درآئی ہیں، جن کی تصحیح نہایت ہی ضروری ہے۔عبارتیں سہل ہونے کے باوجود عدمِ حسنِ طباعت کی وجہ سے پُر پیچ معلوم ہوتی ہیں۔عرصۂ دراز سے ان کی طباعت کا سلسلہ موقوف ہے، اس لیے بعض مقامات پر الفاظ کی قراءت دشوارکن ہے۔تمام نسخوں سے ان کا مقارنہ ضروری ہے، تاکہ الفاظ کی تقدیم وتاخیر، کمی وزیادتی اورصحیح وضعیف میں تمیز کی جاسکے۔انھیں جدید طرزِ طباعت، ابواب بندی اورحسنِ ترتیب سے آراستہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔''لطائفِ اشرفی''میں بوقتِ نکاح حضرت خدیجہ کی عمر ۲۸ سال بتائی گئی ہے۔''لطائفِ اشرفی''میں ہے:

''فتزوجها وقد بلغ عليه السلام خمسا وعشرين سنة وشهرين وعشرة ايام، وهي يومئذ ابنة ثمان وعشرين سنة'' (لطائفِ اشرفی: ۲۷۵، لطیفہ: ۵۲، حصہ: دوم)

درحقیقت یہ عبارت امام محب الدین طبری (۶۹۴ھ) کی کتاب ''خلاصۃ سیر سید البشر'' سے اخذ کی گئی ہے۔دل چسپ بات ہے کہ تاریخ وسِیَر کی اکثر کتابوں میں بوقتِ نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر ۴۰ سال ہونے کی صراحت ملتی ہے۔ امام ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) نے ''تاریخ الرسل والملوک'' (۲/ ۲۸۰) میں، ابن عساکر (۵۷۱ھ) نے ''تاریخِ دمشق'' (۳/ ۱۹۴) میں، ابن اثیر جزری (۶۳۰ھ) نے

''الکامل فی التاریخ'' (۱/ ۶۳۹) میں اور امام ابن کثیر دمشقی (۷۷۴ھ) نے ''البدایۃ والنہایۃ'' (۵/ ۳۱۴) میں اس بات کی وضاحت ہے کہ حضرت خدیجہ کی عمر بوقتِ نکاح ۴۰ سال تھی، گو کہ امام ابن کثیر دمشقی اور بعض مورخین نے اختلاف ذکر کیا ہے، لیکن جن کتابوں میں اختلاف ذکر ہے، وہ صیغۂ تمریض کے ساتھ منقول ہیں۔

اگر تاریخی حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو حضرت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال ہی ہونی چاہیے؛ کیوں کہ حضرت خدیجہ کی وفات ۶۵ سال کی عمر میں ہجرت سے تین سال قبل ہوئی ہے۔ جیسا کہ ابن جریر طبری نے ذکر کیا ہے۔ اب اگر ان کی عمر ۲۸ سال مان لی جائے تو ان کی عمر ۶۵ سال کے بجائے ۵۳ ہی سال آتی ہے، حالاں کہ ان کی عمر کے ۶۵ سال ہونے میں شاید ہی کسی مورخ کا اختلاف ہو۔

لٰہذا یہ کہنا پڑے گا کہ جن کتابوں میں بوقتِ نکاح حضرت خدیجہ کی عمر ۲۸ سال بتائی گئی، وہ روایت ودرایت دونوں لحاظ سے قابلِ قبول نہیں۔ وغیرہ وغیرہ

ان ملفوظات کے تراجم میں بعض مواضع پر عبارت کا وجود ہی نہیں ہے اور اس کا ترجمہ درآیا ہے۔ جیسے ''لطائفِ اشرفی'' میں ہے:

''فرمودند کہ ولایت مشتق از ''ولی'' کہ قربست وآں قرب بود ولایتِ عامہ، وولایتِ خاصہ، وولایتِ عامہ مشترک است میاں ہمہ مومناں۔ قال اللہ تعالیٰ: اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ۔ وولایتِ خاصہ مخصوص اسے بواصلانِ از اربابِ سلوک'' وھی عبارۃ عن فناء العبد فی الحق وبقائہ قالوا: الولی ھو الفانی فیہ والباقی بہ'' (لطائفِ اشرفی: ۳۸، حصہ: اول، لطیفہ: ۲)

مترجم یہاں ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولایتِ عامہ کو لطفِ الٰہی سے قرب ہے اور اس طرح تمام مومنین حق سبحانہ وتعالیٰ کے لطف سے قریب ہوئے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے استغفار کے ذریعہ کفر سے ان کو نکال لیا ہے اور نورِ ایمان عطا فرما دیا ہے اور وہ اس کے نزدیک ہو گئے۔'' (لطائفِ اشرفی مترجم: ۵۶، لطیفہ: ۲)

اصل پیراگراف میں کوئی ایسی عبارت نہیں، جس کا یوں ترجمہ کیا جائے۔ معلوم نہیں بوقتِ ترجمہ مترجم کے پیشِ نظر کون سی عبارت تھی۔ کچھ جگہوں پر مترجم نے صاحبِ ملفوظ کو اپنی فکر کے موافق پیش کرنے کے لیے ترجمہ ہی چھوڑ دیا ہے۔ جیسا کہ مزامیر کی گفتگو میں ''فوائد الفواد'' کے حوالے سے مذکور ہوا۔

دونوں ملفوظات کا ازسرِ نو ترجمہ، تحقیق، تحشیہ اور مصادر ومراجع کی تحقیق ہونی چاہیے، تاکہ اربابِ عقیدت کے علاوہ صاحبانِ تحقیق ونقد کے لیے بھی مطالعہ کا سامان فراہم ہو۔

مسند نشینانِ خانقاہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ چند اردو وفارسی داں تصوف سے آشنا علما وادبا کو اس کام پر مامور کریں، تاکہ یہ حضرات ان ملفوظات کی ازسرِ نو تحقیق کریں۔ جہاں کہیں بھی ان کے مخطوطے موجود ہوں، انھیں

حاصل کریں اور ہر مخطوطے سے دوسرے کا مقارنہ فرمائیں۔ جدید طرز پر ان کے ترجمے ہوں۔ موضوعات کا انتخاب، ابواب بندی، فصول کا تعین اور ابحاث کی تعیین ہو۔ اگر کہیں مسئلے میں پیچیدگی ہے تو اس کی شرح کی جائے۔ اگر مسئلہ جمہور سے مختلف ہے، تو اس کی وضاحت ہو۔ جہاں اصطلاحات کا ذکر ہو، ان کی توضیح ہو۔ ان کے تفردات کا بیان ہو۔ بعض مسائل میں صوفیہ کی اپنی خاص ترجیحات ہوتی ہیں، جو انھیں دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں، ان کا تذکرہ ہو۔

اللہ رب العزت ہمیں صوفیہ کے نقوشِ راہ پر چلائے۔ ان کے فیضان سے مالا مال فرمائے۔ سماحتِ اسلام کے حوالے سے ان کی ترجیحات پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ ہمیں شخصیت وذات کی مخالفت سے بچائے۔ کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کی جوان کی تعلیم ہے، اسے بروئے کار لانے کا حوصلہ دے۔ اس ہنگامی دنیا میں اشاعتِ اسلام اور خدمتِ دین کے حوالے سے صوفیہ کا منہاج وطریقہ اپنانے کی طاقت وقوت دے۔ ہمارے ارادے میں پہاڑوں جیسی بلندی اور ستاروں کی مانند روشن تخیلات دے۔ سمندر جیسی وسعتِ ظرفی، سورج جیسا ہر فرد پر سخاوت کا جذبہ اور زمین کی مانند منکسر المزاجی عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!!!

کتابیات

۱-البدایۃ والنھایۃ، ابوالفداء ابن کثیر دمشقی، ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء، داراحیاء التراث العربی

۲-الکامل فی التاریخ، عزالدین ابن اثیر جزری، ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء، دارالکتب العربی، بیروت، لبنان

۳-تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق احمد نظامی، مشتاق بک کارنر، لاہور

۴-تاریخ الرسل والملوک، ابن جریر طبری، ۱۳۸۷ھ، دارالتراث، بیروت

۵-تاریخ دمشق، ابوالقاسم علی بن حسن، ابن عساکر ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء، دارالفکر للطباعۃ، والنشر

۶-خلاصۃ سیر سیدالبشر، محب الدین طبری، ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء، مکتبۃ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ

۷-سالنامہ الاحسان-۸، مدیر: مولانا حسن سعید صفوی، ۲۰۱۸ء، شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عارفیہ، الہ آباد

۸-سید اشرف جہاں گیر سمنانی: مختلف عصری جامعات میں علمی تحقیق مولانا محمد احمد نعیمی

۹-فتاویٰ رضویہ، فاضلِ بریلوی، مولانا احمد رضا خان بریلوی، برکات رضا، پوربندر، ۲۰۰۳ء

۱۰-فوائد الفواد، اردو ترجمہ: خواجہ حسن ثانی نظامی، ۲۰۰۳ء، مکتبہ زاویہ

۱۱-فوائد الفواد فارسی، خواجہ امیر حسن علا سجزی

۱۲-کشف القناع عن اصول السماع، مسلم پریس، جھجر ۱۳۱۱ھ

۱۳-لطائف اشرفی فارسی، جامع نظام الدین یمنی، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۹ء، مکتبہ سمنانی، کراچی

۱۴-لطائف اشرفی، ترجمہ: شمس بریلوی، ایس، ایم لطیف اللہ، ۱۹۹۹ء، سہیل پریس، کراچی، پاکستان

۱۵-نزھۃ الخواطر، عبدالحئ حسنی رائے بریلوی، ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء، دار ابن حزم، بیروت، لبنان

○○○

خصوصی تحریر

ذیشان احمد مصباحی

سماع مزامیر کا فقہی و شرعی مطالعہ

دوسری قسط - سماع مزامیر بمعنی سماع آلات نغمہ کی بحث

موسیقی یا موسیقار یونانی لفظ ہے۔شروع میں مطلقاً فن کے لیے استعمال ہوتا تھا، بعد میں فنِ الحان یا فن ترتیب سکوت وصدا کے لیے خاص ہوگیا۔اسے آوازوں کی سائنس بھی کہا جاتا ہے۔آواز اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی۔اس کا فیصلہ آواز کے زیر وبم میں حسن ترتیب یا قبح ترتیب کی بنا پر کیا جاتا ہے۔یہ آواز یا تو انسانی منہ سے نکلتی ہے، یا کسی بھی چیز میں پھونکنے، رگڑنے، ٹکرانے یا پیٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔سُر اور تال کی مدد سے ان آوازوں میں حسن ترتیب قائم کیا جاتا ہے، نیز اس کی پیمائش کا عمل ہوتا ہے۔

ہر وہ چیز (Object) جس سے آواز پیدا ہو، اصل کے لحاظ سے وہ مزامیر (یعنی آلات موسیقی، Musical Instruments) میں شامل ہے، تاہم فن موسیقی میں مطلوب صرف آواز نہیں، حسن آواز ہے، اس لیے آلات موسیقی ان آلات کو کہا جاتا ہے جو تحسین صوت وصدا کے لیے بنائے یا استعمال کیے جاتے ہیں۔ بنیادی اعتبار سے یہ دو طرح کے ہوتے ہیں؛ ہاتھ سے بجائے جانے والے یا منہ سے بجائے جانے والے، تاہم فیضی نے ان کی کل چار قسمیں بیان کی ہیں:

۱-تَت-ان باجوں کو کہتے ہیں جو تار سے بجائے جاتے ہیں۔

۲-بِتَت-کھال لے کر بجائی جاتی ہے

۳-گھن-وہ جو دو ہڈیوں کو زور سے ملانے میں آواز آتی ہے۔

۴-سُکھر-وہ جو سانس سے بجائے جاتے ہیں۔

ان میں سے ہر ایک کے بے شمار قسم کے باجے ہیں۔

(آئین اکبری:۲/۲۲۲)

چند سوالات

احادیث میں مزامیر ومعازف کی مذمت آئی ہے، ساتھ ہی بعض مقامات پر مزامیر کا ذکر مدح کے اسلوب میں بھی آیا ہے۔ دوسری طرف متعدد مواقع پر دف وغیرہ بجانے اور سننے کا ذکر آیا ہے۔ اب ایسی صورت میں جب کہ عہد رسالت میں بعض آلات موسیقی بجائے اور سنے جارہے ہیں اور دوسری طرف معازف ومزامیر کی مذمت ہو رہی ہے، بنیادی سوال یہ ہے کہ:

۱- کیا آلات موسیقی اور مزامیر ومعازف الگ الگ چیزیں ہیں؟ کہ آلات موسیقی تو حلال ہیں مگر معازف ومزامیر حرام ہیں۔ یا دونوں ایک ہی ہیں؟

۲- ایک ہونے کی صورت میں کہیں جواز کہیں عدم جواز کا جو ذکر آیا ہے، اس میں تطبیق کی صورت کیا ہے؟

۳- کیا تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ان میں سے ایک حکم ناسخ ہے اور دوسرا منسوخ؟

۴- یا دونوں کے بیچ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ایک حکم عام ہے اور دوسرا حکم خاص؟

۵- اگر عام اور خاص کا معاملہ ہے تو حکم عام کیا ہے اور حکم خاص کیا ہے؟

۶- کیا حرمت کا حکم خاص ہے اور حلت کا حکم عام ہے؟ اس صورت میں سوال ہوگا کہ وہ کون سی مخصوص صورتیں ہیں جن میں آلات موسیقی کا استعمال حرام ہے؟

۷- اور اگر حرمت کا حکم عام ہے اور حلت کا حکم خاص ہے؟ تو اب سوال یہ ہوگا کہ آلات موسیقی کی حرمت لذاتہ ہے یا لغیرہ ہے؟ اگر لذاتہ ہے تو مزامیر کا بالذات قبح کیا ہے؟ اور جو چیز بالذات حرام ہو اس کے جواز کی استثنائی صورتیں کیا ہوتی ہیں؟ اور اگر آلات موسیقی کی حرمت لغیرہ ہے تو وہ غیر کیا ہے جو بالذات حرام ہے؟ اور کیا وہ بالذات امر حرام آلات موسیقی کے ساتھ ہمیشہ لازم ہوتا ہے؟ اس لیے کہ اگر وہ ہمیشہ آلات موسیقی کو لازم نہ ہو تو پھر آلات موسیقی کی ہمیشہ حرمت والی بات ناقابل فہم ہوگی؟

ان اصولی سوالوں کو حل کرنے کے ساتھ اس مسئلے کو آیات واحادیث، فقہ وروایات اور اسلاف کے افکار واعمال کی روشنی میں سمجھنا ہوگا۔ لیکن بات شروع جب ہوگی کہ پہلے مزامیر ومعازف کے معنی متعین ہو جائیں۔

کتب احادیث میں آلات موسیقی کے حوالے سے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں مزامیر ومعازف سب سے زیادہ زبان زد خاص وعام ہیں، اس لیے یہاں پہلے ان دونوں الفاظ کی وضاحت کی جاتی ہے:

مزامیر کی تحقیق

مزامیر کی تحقیق ماسبق (۱) میں گزر چکی ہے۔ اس کے مطابق مزامیر کا اطلاق دو معانی پر ہوتا ہے: (۱) حسن صوت اور نغمہ (۲) آلات نغمہ- پھر دوسرے معنی کے لحاظ سے مزامیر کبھی

---

(۱) دیکھیے مجلہ الاحسان شمارہ ۹ رمیں اس مقالے کی پہلی قسط۔

الف: بانسری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ب: کبھی مطلقاً منہ سے بجائے جانے والے تمام آلات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ج: اور کبھی مطلقاً تمام آلات نغمہ کے لیے ہوتا ہے۔

اب ہم جب نصوص کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے اندر:

الف: بعض آلات موسیقی کے بجانے کا جواز اور عمل بھی ملتا ہے۔

ب: مزامیر کا مطلقاً ذکر مدح کے لیے بھی ملتا ہے۔

ج: اور مزامیر کا مطلقاً ذکر ذم کے لیے بھی ملتا ہے۔

آلات نغمہ کے مذکورہ بالا تینوں اقسام کو مذکورہ تینوں اقسامِ نصوص کے ساتھ ضرب دینے سے کل ۹ر شکلیں پیدا ہوتی ہیں:

۱- مزامیر یعنی بانسری بجائے جانے کا ثبوت نص میں موجود نہیں ہے، اس لحاظ سے مزامیر یعنی بانسری کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔

۲- مزامیر یعنی بانسری کا ذکر مدح کے ساتھ بعض نصوص میں موجود ہے، اس روشنی میں مزامیر یعنی بانسری بجانا جائز معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ استدلال بھی ناتمام ہے۔(۱)

۳- مزامیر یعنی بانسری کا ذکر ذم کے ساتھ نص میں موجود ہے، لہٰذا مزامیر یعنی بانسری بجانا ناجائز ہے۔ اگرچہ یہ استدلال بھی نامکمل ہے۔(۲)

۴- مزامیر یعنی منہ سے بجائے جانے والے آلات نغمہ کا ثبوت نص میں نہیں ہے، اس لیے مزامیر یعنی منہ سے بجائے جانے والے آلات موسیقی کے بارے میں علی الاقل سکوت اختیار کیا جائے۔

۵- مزامیر یعنی منہ سے بجائے جانے والے آلات موسیقی کا ذکر مدح کے ساتھ موجود ہے، اس لیے مزامیر یعنی منہ سے بجائے جانے والے آلات موسیقی جائز ہیں۔

---

(۱) عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهُ: يَا أَبَا مُوسَى لَقَدْ أُوتِيتَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ. (صحيح البخاري، كتاب فضائل القرآن، بَابُ حُسْنِ الصَّوْتِ بِالقِرَاءَةِ لِلْقُرْآنِ) مزامیر آل داؤد کیا ہے؟ اس سلسلے میں عام رائے یہی ہے کہ یہ ان کا حسن صوت ہے جس کے لیے مزمار یعنی بانسری کا استعارہ کیا گیا ہے۔ بعض شارحین نے مزامیر کو مزمورۃ کی جمع بتایا ہے اور کہا ہے کہ مزمورۃ توریت میں ایسے ہی ہے جیسے سورۃ قرآن میں ہے۔ تاہم تورات کی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام مزامیر یعنی بانسریاں بھی بجاتے تھے، اگرچہ امکان تحریف کے سبب اس بات پر کلی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ آگے اس پر گفتگو آتی ہے۔

(۲) سَمِعَ ابْنُ عُمَرَ، مِزْمَارًا قَالَ: فَوَضَعَ إِصْبَعَيْهِ عَلَى أُذُنَيْهِ، وَنَأَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَقَالَ لِي: يَا نَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا؟ قَالَ: فَقُلْتُ: لَا، قَالَ: فَرَفَعَ إِصْبَعَيْهِ مِنْ أُذُنَيْهِ، وَقَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ مِثْلَ هَذَا فَصَنَعَ مِثْلَ هَذَا، قَالَ أَبُو عَلِيٍّ اللُّؤْلُؤِيُّ: سَمِعْتُ أَبَا دَاوُدَ يَقُولُ: هَذَا حَدِيثٌ مُنْكَرٌ (سنن ابو داؤد، كتاب الادب، باب كراهية الغناء والزمر) اس حدیث سے بانسری کی حرمت پر استدلال محل نظر ہے۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

۶-مزامیر یعنی منہ سے بجائے جانے والے آلات موسیقی کا ذکر ذم کے ساتھ نص میں موجود ہے، اس لیے مزامیر یعنی منہ سے بجائے جانے والے آلات موسیقی ناجائز ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں استدلالات بھی محل نظر ہیں۔

۷-مزامیر یعنی آلات موسیقی کا بجانا جائز ہے، کیوں کہ بعض آلات موسیقی کا ثبوت نص میں موجود ہے۔(۱) اس پر سوال یہ ہے کہ بعض آلات موسیقی کے خلاف بھی نصوص موجود ہیں۔ ایسے میں آلات موسیقی کے جواز کا مطلقاً قول ممکن نہیں۔

۸-مزامیر یعنی آلات موسیقی کا بجانا جائز ہے کیوں کہ مزامیر کا ذکر مدح کے ساتھ نص میں موجود ہے۔ اس پر بھی وہی سابق سوال قائم ہوگا۔

۹-مزامیر یعنی آلات موسیقی کا بجانا ناجائز ہے، کیوں کہ مزامیر کا ذکر ذم کے ساتھ بھی نص میں موجود ہے۔ لیکن اس پر سوال یہ ہے کہ بعض نصوص میں بعض آلات موسیقی کا ثبوت اور اسی طرح مزامیر کا ذکر بصورت مدح بھی موجود ہے۔ ایسے میں آلات موسیقی کے حوالے سے مطلقاً تحریم کی رائے درست نہیں ہے۔

مزامیر کے تینوں مفاہیم-بانسری، منہ سے بجائے جانے والے تمام آلات یا مطلقاً تمام آلات موسیقی- اور ان سے متعلق مذکورہ تینوں احکام-سکوت، تحلیل اور تحریم- کے حاصل ضرب مذکورہ ۹ رصورتوں میں سے صرف آخری صورت کو متعین طور پر درست اور صحیح سمجھنا اور باقی تمام صورتوں کو حرف غلط سمجھنا ایک ایسا دعویٰ ہے، جو بغیر برہان قاطع کے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ان ۹ رصورتوں کے سامنے آنے سے پہلی چیز جو واضح ہوئی وہ یہ کہ آلات موسیقی کی مطلقاً یا کلیۃً حرمت کبھی بھی قطعی نہیں ہوسکتی۔

اگر کسی کے نزدیک آخری صورت دلائل وقرائن سے راجح ہوتی بھی ہے تو یہ قرینہ زیادہ سے زیادہ موجب ظن یعنی کراہت تحریمی کو ثابت کرنے والا ہوگا نہ کہ حرمت کو۔ پھر یہ بات بھی اس وقت قابل قبول ہوگی جب کہ آخری صورت دلائل وبراہین سے متعین ہوجائے۔ پھر اگر شارحین ومحققین اس ترجیح پر متفق نہ ہوئے تو یہ کراہت تحریمی بھی صرف ان کے حق میں ثابت ہوگی جن کے نزدیک مذکورہ ترجیح ثابت ہوگی۔ رہے دیگر محققین تو ان کے نزدیک ۹ رصورتوں میں وہ صورت درست ہوگی جس کی ترجیح ان کے حق میں ثابت ہوگی۔

---

(۱) عن عائشة، دخل علي رسول الله صلى الله عليه وسلم وعندي جاريتان من جوار الأنصار وفي راية: قينتان في أيام منى، تدففان، وتضربان، تغنيان بغناء وفي رواية: بما تقاولت وفي أخرى: تقاذفت الأنصار يوم بعاث وليستا بمغنيتين، فاضطجع على الفراش وحول وجهه ودخل أبو بكر والنبي صلى الله عليه وسلم متغش بثوبه فانتهرني وفي رواية: فانتهرهما وقال: مزمارة وفي رواية: مزمار الشيطان عند وفي رواية: أمزامير الشيطان في بيت رسول الله صلى الله عليه وسلم مرتين؟ فأقبل عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم وفي رواية: فكشف النبي صلى الله عليه وسلم عن وجهه فقال: دعهما يا أبا بكر فإن لكل قوم عيدا وهذا عيدنا فلما غفل غمزتهما فخرجتا۔ (مختصر صحیح البخاری للالبانی، یہاں پر شیخ البانی نے بخاری میں مذکور مختلف مقامات پر وارد احادیث کے مختلف کلمات کو اکٹھا کرلیا ہے۔)

بنظر تحقیق ان صورتوں کا جائزہ لینے والے پر مخفی نہیں ہوگا کہ آلات موسیقی کی کلی تحلیل یا کلی تحریم درست نہیں ہے، بلکہ ان کی مروجہ صورتوں میں تقسیم وتفریق کی ضرورت ہوگی۔بعض صورتیں تحلیل سے مختص ہوں گی جب کہ بعض صورتیں تحریم کے ساتھ متعین ہوں گی۔

معازف کی تحقیق

مزامیر کے ساتھ معازف کا بھی ذکر آتا ہے،اس لیے اس لفظ کی تحقیق بھی ضروری ہے۔

خلیل فراہیدی (۱۷۰ھ) اپنی مشہور زمانہ لغت کتاب العین میں لکھتے ہیں:

"العزف من اللعب بالدف والطنابير ونحوه، والمعازف الملاعب التی یضرب بها، الواحد عزف والجمع معازف، روایة عن العرب ، فاذا أفرد المعزف فهو ضرب من الطنابیر یتخذه أهل الیمن۔"

عزف ؛ دف یا طنبورہ وغیرہ سے لہو ولعب کو کہتے ہیں۔معازف وہ آلات موسیقی ہیں جو ہاتھ سے بجائے جاتے ہیں۔اس کا واحد عزف اور جمع معازف ہے۔عرب سے یہی مروی ہے،البتہ معازف کا واحد اگر معزف ہو تو یہ ایک قسم کا طنبورہ ہے جسے اہل یمن بجاتے ہیں۔

ازہری (۳۷۰ھ) کی تہذیب اللغہ میں اس کے آگے یہ بھی ہے:

"وغیرہ یجعل العود معزفا" اہل یمن کے علاوہ دوسرے عرب عود کو معزف کہتے ہیں۔

ابن منظور افریقی (۷۱۱ھ) کی لسان العرب میں ہے:

المعازف الملاهی، واحدها معزف و معزفة، والملاعب التی یضرب بها۔ فاذا أفرد المعزف فهو ضرب من الطنابیر ویتخذه أهل الیمن وغیرهم یجعل العود معزفا۔

معازف آلات موسیقی کو کہا جاتا ہے،اس کا واحد معزف اور معزفہ ہے۔وہ آلات موسیقی جو ہاتھ سے بجائے جاتے ہیں،اور جب اس کا مفرد معزف ہو تو طنبورہ کے معنی میں ہے جسے اہل یمن بجاتے ہیں اور دیگر خطۂ عرب والے عود کو معزف کہتے ہیں۔

مجمع اللغۃ العربیہ،قاہرہ کی تیار کردہ المعجم الوسیط میں ہے:

"المعزف آلة الطرب کالعود والطنبور (ج) معازف"

معزف جس کی جمع معازف ہے،عود اور طنبورے جیسے آلات موسیقی کو کہتے ہیں۔

فراہیدی نے عود کے بارے میں لکھا: **ذو الأوتار الذی یضرب به**، وہ آلۂ موسیقی جس میں تار لگے ہوتے ہیں۔

لوئس معلوف کی المنجد کے اردو ترجمے میں مولانا عبدالحفیظ بلیاوی نے عود کے معنی سارنگی لکھے ہیں۔ظاہر

ہے فراہیدی کے لفظی عموم میں سارنگی ٹائپ کے دوسرے تار والے آلات موسیقی کو بھی اس ذیل میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

ان تمام حوالوں سے معلوم ہوا کہ:

۱- معازف طنبورہ اور سارنگی جیسے آلات موسیقی کو کہا جاتا ہے، جن میں تار لگے ہوتے ہیں۔

۲- کبھی ہاتھ سے بجائے جانے والے تمام آلات موسیقی کے لیے بھی معازف کا استعمال ہوتا ہے۔

۳- جب کہ ابن منظور کی تشریح کی روشنی میں معازف کے ایک معنی ملاہی، یعنی مطلقاً آلات موسیقی کے بھی ہیں۔ ابن قیم الجوزیہ اور شیخ البانی معازف کے اسی عموم کی بنیاد پر تمام آلات موسیقی کو بلا استثنا حرام کہتے ہیں۔(۱)

اب ان معانی کو مزامیر کے ساتھ جوڑ کر دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

۱- مزامیر کا اطلاق نغمات اور آلات دونوں پر ہوتا ہے، جب کہ معازف کا اطلاق صرف آلات پر ہوتا ہے، نغمات پر نہیں ہوتا۔

۲- ایک معنی کے لحاظ سے دونوں کا مفہوم مطلقاً تمام آلات موسیقی کو شامل ہے۔

۳- ایک دوسرے معنی کے لحاظ سے مزامیر کا اطلاق منہ سے بجائے جانے والے آلات پر ہوتا ہے، جب کہ معازف کا استعمال ہاتھ سے بجائے جانے والے آلات موسیقی، خصوصاً تار والے آلات موسیقی کے لیے ہوتا ہے۔

۴- ایک معنی کے لحاظ سے مزامیر بانسری کے ساتھ مختص ہے، جب کہ معازف سارنگی، عود یا طنبورہ کے ساتھ۔

۵- فراہیدی کے بیان کے مطابق معازف دف کو بھی شامل ہے۔ اسی طرح ایک اطلاق کے لحاظ سے دفوف کو ہی مزامیر کہا جاتا ہے۔ سنن کبریٰ میں امام بیہقی نے ابو مودود کے حوالے سے لکھا ہے:

سَأَلْتُ أَبَا مَوْدُودٍ: مَا الْمَزَامِيرُ؟ قَالَ: الدُّفُوفُ الْمُرَبَّعَةُ (السنن الکبری للبیهقي (۱۰/۳۷۶) میں نے ابو مودود سے پوچھا: مزامیر کیا ہیں؟ فرمایا: چوکور دف۔

اس قدر تشریح کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگر کہیں مزامیر اور معازف دونوں ایک ساتھ آئیں تو یہ نغمات اور آلات موسیقی کے معنی لیے جائیں گے یا پھر منہ سے اور ہاتھ سے بجائے جانے والے آلات موسیقی مراد لیے جائیں گے یا پھر بطور مرادف مطلقاً آلات موسیقی مراد لیے جائیں گے۔ نغمات کی شرعی تحقیق ما سبق میں گزر

---

(۱) ابن قیم کہتے ہیں: ان المعازف هی آلات اللهو كلها، لا خلاف بين أهل اللغة فی ذلك۔ (إغاثة اللهفان من مصايد الشيطان: ۱/۲۶۰) البانی کی عبارت ہے: اعلم أخي المسلم أن الأحاديث المتقدمة صريحة الدلالة على تحريم آلات الطرب بجميع أشكالها وأنواعها نصا على بعضها كالمزمار والطبل والبربط وإلحاقا لغيرها بها وذلك لأمرين: الأول: شمول لفظ المعازف لها في اللغة كما تقدم بيانه۔ (تحریم آلات الطرب، ص: ۹۲)

چکی۔اس وقت ہمارے سامنے آلات موسیقی کی شرعی تحقیق مطلوب ہے۔سوال یہ ہے کہ:

۱-کیا تمام آلات موسیقی مطلقاً حرام ہیں اوران میں سے بعض کا ثبوت محض استثنائی ہے، جو کسی مخصوص تناظر میں ہے؟ ۲- یا تمام آلات موسیقی مطلقاً حلال ہیں، ان میں کل یا بعض کی حرمت کسی مخصوص علت کے تحت ہے۔زیرنظر مقالہ عقل ونقل کی روشنی میں انہی دونوں سوالات کے گرد دائر ہے۔قابل غور ہے کہ:

۱-آلات موسیقی کو بنانے میں جو تار، کھال، ہڈی، لکڑی یا دوسرے عناصر استعمال ہوئے ہوں گے یا تو وہ پاک وصاف ہوں گے یا پھر ناپاک ونارو۔

۲-ان سے جوآواز نکل رہی ہوگی، وہ کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہوگی یا بھدی؟ اور یہ ان کے بجانے کے انداز پر مبنی ہے۔

۳-ان آوازوں کا مقصد یا تو واجب ہوگا، مستحب ہوگا، مباح ہوگا، یا پھر مکروہ یا حرام ہوگا۔

۴-ان کے بجانے سے کسی فرض یا حق کا سقوط ہورہا ہوگا، کسی حرام ومکروہ کا ارتکاب ہورہا ہوگا، یا کسی امر مندوب ومطلوب کا حصول ہورہا ہوگا، یا ایسا کچھ بھی نہ ہوگا۔

انہی نکات کے ضمن میں آلات موسیقی کا حکم بھی بہ آسانی معلوم ہوجاتا ہے اور یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان آلات کو فی نفسہ حرام نہیں کہا جاسکتا؛ کیوں کہ یہ آلاتِ صوت وصدا ہیں اور صوت وصدا بذاتہ حرام نہیں، بلکہ کسی علت اور سبب کے تحت ان کے اندر حرمت یا کراہت پیدا ہوتی ہے۔اس کی تفصیل تحقیق نغمات کے ذیل میں گزرچکی۔اسی طرح آلات صوت وصدا یا آلات موسیقی بھی بذاتہ ہرگز حرام نہیں ہوسکتے، بلکہ ان کے اندر حرمت یا کراہت کا معنی یا تو ان کے حرام مادے سے ہوگا جس سے وہ بنائے گئے ہوں اور ایسا ہوتا نہیں، یا ان کے بجانے کے غلط مقاصد کے سبب ہوگا یا پھر ان کی آواز کی کراہت، ناموزونیت، یا بے وقتیت سے ہوگا۔

آلات موسیقی- فطری اور عقلی اصولوں کی روشنی میں

''موسیقی مباحات فطرت سے ہے۔'' آلات موسیقی کے حوالے سے جناب جاوید احمد غامدی کی یہ بات فطرت کی ترجمانی معلوم ہوتی ہے۔چوں کہ آواز کا تعلق قوت سامعہ سے ہے اور دیگر حواس کی طرح سامعہ بھی جمالیات پسند ہے۔اسے اچھی، موزوں، متناسب اور سریلی آواز پسند ہے۔اس کے برخلاف کرخت، غیر متناسب اور بے سری آواز اس پر گراں ہے۔ بے سر اور بھدی آواز کی بدترین مثال گدھے کی آواز ہے۔قرآن حکیم میں ہے: إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ (لقمان:۱۹) ہندی معاشرے میں بھینس کو اَسُر کہا گیا ہے، یعنی اس کی کوئی سر نہیں، اس کی آواز میں کوئی تناسب نہیں، کرختگی اور کراہت ہے۔

رسائل اخوان الصفا میں ہے کہ آوازیں دو طرح کی ہیں۔حیوانی اور غیر حیوانی۔پھر غیر حیوانی آوازیں دو طرح کی ہیں: طبعی اور آلی۔طبعی کی مثال پتھر، لوہا، لکڑی، بجلی اور پانی کی آواز ہے جو از خود ٹکرانے سے پیدا ہوتی

ہے، جب کہ آلی کی مثال ڈھول، تاشہ، سارنگی اور بانسری کی آواز ہے۔ پھر حیوانی آوازوں کی بھی دو قسمیں ہیں؛ منطقی اور غیر منطقی۔ منطقی آواز انسانوں کی ہوتی ہے اور باقی تمام حیوانات کی آوازیں غیر منطقی ہوتی ہیں۔ پھر منطقی آوازیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں بامعنی اور بے معنی، بے معنی وہ آوازیں ہیں جن کے اندر ہجا نہیں ہوتا جیسے ہنسنے اور رونے کی آواز۔ (جلد اول، رسالہ نمبر ۵ فصل فی ادراک القوۃ السامعۃ للاصوات)

پھر یہ تمام آوازیں تناسب یا عدم تناسب کے سبب طبع انسانی کے لیے اچھی یا بری ہوتی ہیں۔ تاہم ارباب شریعت کے یہاں صرف آلی آوازیں اور ان آوازوں کے آلات زیر بحث آ گئے۔ یہ ساری آوازیں ذی روح مخلوقات کے بیچ مواصلات کا کام کرتی ہیں۔ منطقی آوازیں، انسانوں کے درمیان افہام و تفہیم کا وسیلہ بنتی ہیں، جب کہ غیر منطقی آوازیں حیوانات کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہیں۔ حیوانات کی غیر منطقی آوازیں انسانوں کو بھی بہت کچھ سمجھا دیتی ہیں۔ اسی طرح طبعی آوازیں عالم طبیعیات میں ہو رہی تبدیلیوں کا پتہ دیتی ہیں، جن کے مطابق انسان اور دیگر مخلوقات اپنی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ رہی آلی آوازیں تو ان کو انسان مختلف چیزوں، اوزاروں اور آلات سے پیدا کرتا ہے اور ان آوازوں سے اپنے بے شمار مقاصد کی تحصیل کرتا ہے۔ گھڑی کی ٹک ٹک، گھنٹہ کا ٹن ٹن، فون کی ٹرن ٹرن، جنگ کا طبل، نکاح کا دف، اعلان کا نگاڑا، کھیل کی سیٹی، سحری کا سائرن، یہ وہ آلی آوازیں ہیں جن کا انسان مختلف مواقع پر استعمال کرتا ہے اور مختلف مقاصد حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ آلی آوازوں کا استعمال انسان تسکین دل، تحزین نفس، تفریح طبع، تزئین شعر و نغمہ اور تحسین نغمگی و ترنم ریزی کے لیے بھی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے امور اپنی ذات میں نظر کرتے ہوئے حَسن ہیں، لہٰذا یہ تمام آوازیں- منطقی، غیر منطقی، طبعی اور آلی- بھی اپنی ذات میں حَسن ہوں گی، تا آں کہ ان کے اندر کوئی باطل مقصد، غیر شرعی تشابہ اور کسی حق یا فرض کا اسقاط یا کسی حرام و مکروہ کا ارتکاب شامل ہو جائے۔

فلاسفہ کا یہ ماننا ہے کہ باشندگان افلاک کے اندر بھی اصوات و نغمات ہیں۔ چوں کہ ان کے اندر بھی قوت سامعہ ہے؛ کیوں کہ اگر یہ نہ ہوتی تو ان کی مثال جمادات کی طرح صُمٌّ بکمٌ کی ہوتی۔ ملائکہ تسبیح و تہلیل کرتے ہیں۔ ان کی تسبیحات نغمات ہیں جو سیدنا داؤد علیہ السلام کے مزامیر اور شاہی درباروں میں بجنے والے رباب کی آوازوں سے بڑھ کر دل کش اور حسین ہیں۔ اسی طرح افلاک و کواکب کی حرکات میں بھی نغمات ہوتے ہیں جو ملأِ اعلی کی مخلوقات کے سرور و بہجت کا موجب ہوتے ہیں اور انہیں عالم ارواح کے سرور کی یاد دلاتے ہیں، جس طرح زمین پر سازندوں کے نغمے انسانی نفوس میں عالم افلاک کی مسرتوں کی تذکیر کرتے ہیں۔ چوں کہ موجودات ثانی کے احوال، موجودات اول کے احوال کا پتہ دیتے ہیں، جو موجودات ثانی کے لیے علت ہیں۔ اسی طرح اشخاص فلکی، اشخاص ارضی کے لیے علت ہیں اور آسمان والوں کی حرکات زمین والوں کی حرکات کے لیے علت ہیں۔ اس طرح زمین والوں کا ہر عمل آسمان والوں کے عمل کی حکایت کرتا ہے، جس طرح بچے اور طلبہ اپنے آبا اور اساتذہ کی

نقل وحکایت کرتے ہیں۔

اسی اصول کے تحت فلاسفہ کا کہنا ہے کہ زمین کی آوازیں آسمانی آوازوں کی حکایت ہیں۔ یہاں تک کہ زمین پر جو نغمگی، ترنم ریزی اور آوازوں کا خوب صورت زیر و بم ہے، وہ آسمانی نغموں کی ہی حکایت ہے۔ چنانچہ ایسا مانا جاتا ہے کہ فیثاغورث (Pythagoras) نے اپنے ضیائے باطن کی بنیاد پر افلاک وکواکب کی حرکات کے نغمات سن لیے، اسی کے بعد اس نے اپنی جودت طبع اور ذہن اَخاذ سے آوازوں کے نغمے اور موسیقی کے اصول وضع کیے اور اس فن میں گفتگو کا آغاز کیا۔ (رسائل خوان الصفا، جلد اول مکتوب خامس، فصل فی ان لحرکات الافلاک نغمات کنغمات العیدان)

رسائل اخوان الصفا میں یہاں پر یہ بھی لکھا ہے کہ حکمائے الٰہیات اپنے عبادت خانوں میں آلات موسیقی کے ساتھ اشعار پڑھنے لگے اور اس سے ان کا مقصد یہی تھا کہ عالم ارواح میں جو میثاق کیا ہے اس کی تذکیر کریں۔ آلات موسیقی کے ساتھ یہ نغمات قلوب کی ترقیق، نفوس کی تنبیہ اور ارواح کی تشویق کے موجب ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بعض شرائع میں آلات موسیقی کو اس لیے حرام کیا گیا کہ بعد میں ان کے متبعین ان مقاصد سے منحرف ہو گئے جن مقاصد کے لیے حکما نے یہ آلات ایجاد کیے تھے۔

بہر کیف! نفس آواز- خواہ وہ منہ سے نکلے خواہ کسی چیز پر ضرب، رگڑ یا پھر پھونکنے سے- اپنی اصل کے اعتبار سے شرعی طور پر کبھی حرام یا مکروہ نہیں ہوسکتی۔ ہاں! اگر آواز سر اور لے کے بغیر، غیر ضروری بلندی اور کرختگی کے ساتھ ہو تو اس کی وجہ سے طبعی کراہت ضرور پیدا ہوتی ہے، لیکن یہ کراہت طبعی ہے، نہ کہ شرعی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان آواز کے لیے خواہ منہ کا استعمال کرے، خواہ کسی آلے کا، اسے شائستگی، تناسب، نرمی، سُر اور لے کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ چنانچہ جو سازندے بے سُر تال کے اور غیر ضروری شدت اور بلندی کے ساتھ اپنا ساز بجاتے ہیں وہ طبع سلیم پر گراں گزرتا ہے، اگر چہ بعض فقہا نے دف بجانے کے جواز کے لیے بھی غیر موزونیت اور بے ہنگم انداز کو شرط قرار دے دیا ہے۔ (۱)

ہاں! ان آلات موسیقی کا استعمال اگر کفر وشرک کے نغموں کی تزئین کے لیے ہو، ناجائز شہوت انگیزی کے لیے ہو، حرام اور مکروہ باتوں کے ساتھ ہو، کسی فعل حرام یا مکروہ میں شوق وذوق اور اشتغال کو بڑھانے کے لیے ہو، تو پھر ان کے ناجائز یا مکروہ ہونے میں بھلا کس کو شبہہ ہوسکتا ہے، اگر چہ یہ بات اپنی جگہ واضح ہے کہ یہ حرمت یا کراہت بھی، حرام یا مکروہ مقاصد کے سبب پیدا ہوگی، نہ کہ نفس آلات موسیقی کے سبب اور حرام ومکروہ مقاصد کے سبب صرف آلات موسیقی ہی نہیں، آلات حرب وضرب، آلات اکل وشرب اور آلات مواصلات کا استعمال بھی حرام

---

(۱) اوقات سرور میں دف جائز ہے، بشرطیکہ اس میں جلاجل یعنی جھانجھ نہ ہوں، نہ وہ موسیقی کے تال سر پر بجایا جائے، ورنہ وہ بھی ممنوع، کما فی ردالمحتار وغیرہ۔ (فتاویٰ رضویہ، ج: ۲۴، مسئلہ: ۲۸) اب یہ بات ہمارے فہم سے بالاتر ہے کہ اگر دف کو سُر اور لَے کی موافقت کے بغیر یوں ہی بے ڈھب کے دھب دھب بجایا جائے تو گانے والے کے لیے گانا ممکن بھی ہوگا۔ گانے اور بجانے کے بیچ موافقت، طبعی اور حسابی اصولوں کی روشنی میں ایک امر واجب ہے، جو گانے، بجانے اور سننے والے پر یا طبع سلیم کے ساتھ غور کرنے والے پر مخفی نہیں۔

یا مکروہ ہوجاتا ہے اور آلات موسیقی کی طرح ہی ان آلات کے اندر بھی بذاتہ حرمت یا کراہت کا معنی پیدا نہیں ہوتا۔

حرام مقاصد کی طرح نامناسب اوقات میں بھی آلات موسیقی بجانا یا سننا، جس سے کسی فرض یا حق کا سقوط لازم آرہا ہو، کسی کو ضرر یا Disturbance ہورہا ہو، تو ایسی صورت میں بھی آلات موسیقی کا بجانا یا سننا ناجائز ٹھہرے گا، اگرچہ اس حرمت کا اثر بھی براہ راست ان آلات تک نہیں پہنچتا۔

بعض آلات موسیقی کی حرمت یا کراہت کی ایک بڑی وجہ کفار ومشرکین اور فساق وفجار کی مشابہت بھی ہے۔ یعنی اگر کوئی آلۂ موسیقی، کفار ومشرکین کا شعار ہو، مثلاً آج کے زمانے میں سنکھ یا مندر کا گھنٹا بجانا، یہ سب مشرکین کا شعار ہے۔ اسی طرح امام غزالی نے احیاء العلوم کے اندر ڈمرو (طبل الکوبہ) بجانے کو مخنثوں کا شعار بتایا ہے اور اس شعار کی وجہ سے اسے ناجائز کہا ہے۔ یہاں بھی غور کریں تو حرمت وکراہت کا اصل تعلق ان آلات موسیقی سے نہیں، بلکہ ان کے اہل باطل کا شعار ہونے سے ہے اور اہل باطل کا شعار ہونے کے سبب صرف آلات موسیقی ہی نہیں، لباس اور وضع قطع بھی حرام ہوجاتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ کراہت وحرمت صرف شعار سے متعلق ہوتا ہے، لہٰذا اگر وہی آلات وملبوسات کسی زمانے میں باطل کا شعار نہ رہیں تو پھر ان کی حرمت وکراہت بھی جاتی رہے گی۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ آلات موسیقی میں سے کوئی بھی فی نفسہ ناجائز یا مکروہ نہیں ہے، ان کے اندر جو بھی حرمت یا کراہت پیدا ہوگی وہ خارجی عوارض کے سبب سے ہوگی، مثلاً:

۱- وہ آلہ خنزیر کی کھال یا ہڈی سے بنا ہو، یا سونے وغیرہ سے بنا ہو۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں صرف آلات موسیقی ہی نہیں، جملہ آلات وظروف حرام ٹھہریں گے۔

۲- وہ آلہ کسی باطل مقصد کے لیے، بجایا جارہا ہو، ظاہر ہے اس کراہت وحرمت میں آلات موسیقی کی کیا تخصیص؟

باطل کے لیے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ
شمشیر ہی کیا نعرۂ تکبیر بھی فتنہ

۳- ان آلات کے بجانے سے کوئی فرض یا حق ساقط ہورہا ہو۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں آلات موسیقی کا استعمال ہی نہیں، قرآن کی تلاوت بھی ناجائز وناروا ٹھہرے گی۔

۴- وہ آلات اہل باطل کا شعار ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ شعار کی وجہ سے جو حرمت یا کراہت پیدا ہوتی ہے، وہ آلات موسیقی ہی کے ساتھ نہیں، بلکہ تمام ظروف وملبوسات کے اندر اور ہر تعمیر وتزئین کے اندر بھی پائی جاسکتی ہے۔

۵- ایک صورت یہ ہے کہ جب ان آلات موسیقی کے بجانے سے طبعی کراہت پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب سُر تال کے بغیر، ضرورت سے زیادہ بلندی اور کرختگی سے بجائے جارہے ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ کراہت فقط طبعی ہے، اس کا تعلق شرعی کراہت سے نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ یہ کراہت طبعی بھی ان آلات کے سبب نہیں، بلکہ بجانے والے کے بے ڈھنگے پن کے سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب شوق ہمیشہ اچھے

سازندوں کو پسند کرتے ہیں اور الل ٹپ بجانے والے کو سننا بھی نہیں چاہتے۔

واضح رہے کہ جب آلات موسیقی اپنی اصل کے لحاظ سے جائز ہوئے اور ان کے اندر حرمت وکراہت کا معنی کسی عرضِ عارض کی بنیاد پر ہوا تو اب ایسے میں کسی عارض کو ذہن میں رکھ کر آلات موسیقی کو حرام کہنا ایسا ہی ہوا کہ کوئی کہے کہ بکرے کا گوشت حرام ہے، اور اس کی مراد یہ ہو کہ اگر بکرا ذبح نہ کیا گیا ہو، یا چوری کا ہو، یا اس کے گوشت میں کوئی ناپاک چیز مل جائے تو ناجائز ہے۔ حرام لذاتہ اور حرام لغیرہ کا فرق جو حضرات بھی سمجھتے ہیں، ان کے لیے اس نکتے کو سمجھنا بہت آسان ہوگا۔

لیکن یہاں سوال باقی ہے کہ آلات موسیقی کے تعلق سے کتاب وسنت کے نصوص کیا کہتے ہیں اور ان کو فقہا نے خصوصاً فقہائے احناف نے کس طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آنے والے سطور میں یہ امور بالترتیب زیر بحث ہیں:

آلات موسیقی-آیات قرآنیہ کی روشنی میں

قرآن پاک میں آلات موسیقی کی حلت یا حرمت کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ قرآن سے جو لوگ بھی آلات موسیقی کی حرمت پر استدلال کرتے ہیں در اصل وہ پتھر سے چشمہ ابالنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ ان کا استدلال بعض صحابہ کی مبہم تفسیر یا دوراز کار تاویل پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی طرح اس مسئلے سے متعلق قرآن کے سکوت سے آلات موسیقی کے جواز پر استدلال تو درست ہے، البتہ بعض اہل علم راست طور سے بعض آیات کو آلات موسیقی کے جواز پر ایک دلیل کے طور پر جو پیش کرتے ہیں، ان کا استدلال، تکلفات اور غیر ضروری کھینچ تان پر قائم ہوتا ہے۔ اس اجمال کے بعد فریقین کے نارسا استدلال کا تجزیہ ملاحظہ کیجیے:

منکرین آلات نغمہ کا آیات قرآنیہ سے استدلال

پہلی آیت

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً (الانفال: ۳۵)

خانۂ کعبہ کے پاس ان کی عبادت محض سیٹی بجانے اور تالی بجانے کی صورت میں تھی۔

علامہ موفق الدین ابن قدامہ حنبلی (۶۲۰ھ) نے اس آیت کو بھی اپنے ایک فتوے (۱) کے اندر آلات موسیقی کی حرمت میں پیش کیا ہے۔

مذکورہ آیت سے موسیقی کی حرمت کے استدلال کو امام احمد غزالی نے شدت کے ساتھ رد کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ استدلال فاسد ہے؛ کیوں کہ انہیں بیت اللہ کے قریب تالی بجانے اور سیٹی بجانے سے منع کیا گیا ہے اور کسی حرام حالت میں کسی امر کی ممانعت سے یہ لازم نہیں آتا کہ دیگر احوال میں بھی وہ امر ممنوع ہو۔ اسی لیے نماز کے اندر اگر امام سے سہو ہو جائے تو عورت کے لیے جائز ہے کہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی پشت پر مارے لیکن

---

(۱) جزء فیه فتیا فی ذم الشبابة والرقص والسماع ونحو ذلک

یہی عمل اس کے لیے دوسری جگہ جائز نہیں۔ چوں کہ بیت اللہ ایک واجب الاحترام مقام ہے اور اس کے گرد طواف کرنا ہی عبادت ہے، اس لیے انہیں اس عمل سے منع کر دیا گیا۔ نیز یہ کہا کہ بیت اللہ کے قریب ان کی نماز یہ تھی، یہ نہیں فرمایا کہ بیت اللہ کے قریب ان کا سماع یہ تھا۔ لہٰذا بیت اللہ کے قریب تالی بجانے کی ممانعت سے یہ لازم نہیں کہ ہر جگہ یہ ممنوع ہو جائے۔ (بوارق الالماع، مشمولہ: مجموعہ رسائل السماع، ص: ۷۲)

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کریمہ سے آلات موسیقی کی حرمت پر استدلال ایک غیر متعلق استدلال ہے۔ اس آیت کے سیاق وسباق میں مشرکین مکہ کے مختلف توحید بیزار اور شرکیہ اوصاف کا ذکر ہوا ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ حق سے بیزار ہیں اور کعبہ کے گرد یعنی اپنے اپنے بتوں کے سامنے تالی اور سیٹی بجاتے ہیں۔ اب اس کے بعد جو ان پر وعید آئی ہے اسے تالی بجانے اور سیٹی بجانے سے متعلق سمجھنا ان کے کفر وشرک اور عداوت حق کو ہضم کر جانے کے مترادف ہے۔ ایسے مشرکین، بت پرست، حق بیزار، سیٹی اور تالی نہیں، اگر وہ قرآن کی آیات بھی تلاوت کرتے اور روزہ اور نماز بھی کرتے جس سے ان کا مقصد بتوں کی رضا جوئی ہوتی تو وہ جہنمی اور لعنتی ہوتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اب اس وجہ سے اصلاً نماز و روزہ بھی حرام ہو جائیں، بلکہ اس عمل سے جو ان کا مقصود اور غایت ہے، دراصل وہ حرام ٹھہرے گا۔

اب جب کہ بتوں کے لیے نماز روزہ ایک محض فضول اور واجب العذاب عمل ہے تو ایسی صورت میں ان بتوں کے سامنے تالیاں بجانا کس قدر بے معنی اور حق سے منحرف عمل ہے، یہ بتانے کی حاجت نہیں۔ اس آیت میں ان کی اسی حماقت مآبی اور کار عبث کا ذکر ہے۔

دوسری آیت

وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا (الانعام: ۷۰)

ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرلو جنہوں نے لہو ولعب کو اپنا دین بنالیا ہے اور جنہیں دنیاوی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

علامہ ابن قدامہ مقدسی نے اپنے مذکورہ فتوے کے اندر اس آیت کریمہ کو بھی سماع ومزامیر کے خلاف پیش کیا ہے، جس کا اس مقام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس میں لہو ولعب کو دین بنانے کی مذمت ہے۔ یہ بات تو واضح ہے ۔لیکن اس کے ساتھ یہ سمجھنا کہ آلات موسیقی حقیقت کے لحاظ سے آلات لہو ہی ہیں، لہو کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے استعمال نہیں ہوتے، آلات موسیقی کی حقیقت، ان کے استعمال اور مقاصد استعمال سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ بالفرض یہ مان بھی لیں کہ آلات موسیقی، آلات لہو ہی ہیں تو اس کے ساتھ یہ سمجھنا کہ ہر لہو حرام ہے، یہ فہم لہو سے بے خبری سے عبارت ہے۔ قرآن مقدس میں ہے: وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ۔ (الانعام: ۳۲) دنیوی زندگی محض لہو ولعب ہے۔ اگر کوئی اس سے یہ سمجھ لے کہ پوری انسانی زندگی لہو ولعب ہونے کی وجہ سے حرام ہے، تو

وہ زندگی اور خودکشی کے بیچ کسی ایک کو اختیار کرنے کی عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جائے گا۔

تیسری آیت

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡتَرِىۡ لَهۡوَ الۡحَدِيۡثِ لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ (لقمان:٦)

کچھ لوگ لہوالحدیث کو خریدتے ہیں تاکہ اپنی جہالت کے سبب لوگوں کو راہ خدا سے غافل کریں۔

اہل علم نے لہوالحدیث کی مختلف تفسیریں کی ہیں۔ مثلاً شرک، باطل، غنا، مزامیر وغیرہ۔ بعض حضرات ان تفسیروں کی بنیاد پر غنا اور آلات موسیقی کو قرآن سے حرام قرار دیتے ہیں، جب کہ ایسے حضرات کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ تفسیریں ضعیف ہیں، جن کو بنیاد بنا کر آلات موسیقی کو قرآن کی روشنی میں حرام کہنا جسارت ہے۔ اس آیت میں اس لہوالحدیث کی خرید وفروخت کی مذمت کی گئی ہے جو سبیل اللہ سے پھیرنے والی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ چیز جو راہ حق سے غافل کرنے والی ہو اس کا برتنا حرام ہے۔ قرآن کے اس عمومی اصول کو آلات موسیقی کے جھنکاروں میں جکڑ دینا بھلا کون سی قرآن فہمی ہے؟ پاکستان کے اہل حدیث عالم مولانا ارشاد الحق اثری نے بھی اس آیت کو آلات موسیقی کی حرمت کے اثبات میں پیش کیا ہے۔ موصوف، جناب جاوید احمد غامدی کی طرف سے اس استدلال کی تردید کے جواب میں لکھتے ہیں: ''اس نوعیت کے اقوال دراصل اختلاف تنوع ہے، تضاد نہیں۔'' (اسلام اور موسیقی، شبہات ومغالطات کا ازالہ، ص: ٦٢)

ہم مولانا کی اس تنوع نگاری کے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ چلیے تھوڑی دیر کے لیے ہم اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہاں! لہوالحدیث کی جتنی تفاسیر کی گئی ہیں، وہ سب درست ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں، وہ تفسیریں ضعیف ہوں تو بھی معتبر ہیں۔ البتہ اس میں وہ شرط ملحوظ ہے جو آیت کریمہ میں مذکور ہے: لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ، یعنی لہوالحدیث اس وقت حرام ہوگا جب وہ راہ حق سے غافل کرنے والا ہو۔ اب اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ غنا اور آلات غنا، لہوالحدیث کے وسیع مفہوم میں شامل ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ اس وقت حرام ہوں گے جب راہ حق سے دور کر رہے ہوں، اس وقت نہیں جب کہ راہ حق سے دور نہ کر رہے ہوں، چہ جائے کہ اس وقت کہ کوئی آلات موسیقی کے ساتھ ذکر ونعت سن رہا ہو اور اس کے دینی واسلامی جذبات کو مہمیز مل رہی ہو۔ قرآن جو بات مقید کہہ رہا ہے اسے مقید ہی رکھا جائے، اپنی طرف سے اسے مطلق نہ کیا جائے۔

لہوالحدیث کی تفسیر بعض اسلاف سے جو غنا یا غنا اور مزامیر منقول ہے، اس کی وجہ مولانا مودودی کے اس اقتباس سے معلوم ہوتی ہے:

> ''ابن ہشام نے محمد ابن اسحاق کی روایت نقل کی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کفار مکہ کی ساری کوششوں کے باوجود پھیلتی چلی جا رہی تھی تو نضر بن حارث نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ جس طرح تم اس شخص کا مقابلہ کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔ یہ شخص تمہارے درمیان بچپن سے ادھیڑ

عمر کو پہنچا ہے۔ آج تک وہ اپنے اخلاق میں تمہارا سب سے بہتر آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امانت دار تھا۔ اب تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے، ساحر ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ آخر ان باتوں کو کون باور کرے گا۔ کیا لوگ ساحروں کو نہیں جانتے کہ وہ کس قسم کی جھاڑ پھونک کرتے ہیں؟ کیا لوگوں کو معلوم نہیں کہ کاہن کس قسم کی باتیں بنایا کرتے ہیں؟ کیا لوگ شعر وشاعری سے ناواقف ہیں؟ کیا لوگوں کو جنون کی کیفیات کا علم نہیں ہے؟ ان الزامات میں سے آخر کون سا الزام محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر چسپاں ہوتا ہے کہ اس کا یقین دلا کر تم عوام کو اس کی طرف توجہ کرنے سے روک سکو گے۔ ٹھہرو، اس کا علاج میں کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ مکہ سے عراق گیا اور وہاں سے شاہان عجم کے قصے اور اسفند یار کی داستانیں لا کر اس نے قصہ گوئی کی محفلیں برپا کرنی شروع کر دیں تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹے اور وہ ان کہانیوں میں کھو جائیں۔ (سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص: ۳۲۰-۳۲۱) یہی روایت اسباب النزول میں واحدی نے کلبی اور مقاتل سے نقل کی ہے اور ابن عباس نے اس پر مزید یہ اضافہ کیا ہے کہ نضر نے اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ جس کسی کے متعلق وہ سنتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے اس پر اپنی ایک لونڈی مسلط کر دیتا اور اس سے کہتا کہ اسے خوب کھلا پلا اور گانا سنا تاکہ تیرے ساتھ مشغول ہو کر اس کا دل ادھر سے ہٹ جائے۔ یہ قریب قریب وہی چال تھی جس سے قوموں کے اکابر مجرمین ہر زمانے میں کام لیتے رہے ہیں۔ وہ عوام کو کھیل تماشوں اور رقص وسرود (کلچر) میں غرق کر دینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ انھیں زندگی کے سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کرنے کا ہوش ہی نہ رہے اور اس عالم مستی میں ان کو سرے سے یہ محسوس ہی نہ ہونے پائے کہ انہیں کس تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ لہو الحدیث کی یہی تفسیر بکثرت صحابہ وتابعین سے منقول ہے۔ عبداللہ بن مسعود سے پوچھا گیا کہ اس آیت میں لہو الحدیث سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے تین مرتبہ زور دے کر فرمایا: **ھو واللّٰہ الغناء**، ''خدا کی قسم اس سے مراد گانا ہے۔'' (ابن جریر، ابن ابی شیبہ، حاکم، بیہقی (۱)

مولانا ارشاد الحق اثری نے کمال فن کاری سے مودودی صاحب کے اس اقتباس کو بھی اپنے موقف، تحریم غنا کے اثبات اور غامدی صاحب کے موقف کے ابطال کے لیے استعمال کیا ہے، (۲) جب کہ یہ تفصیل واضح طور پر بتاتی ہے کہ غنا کی حرمت خصوصی تناظر - آیات حق سے انحراف - میں ہوئی ہے، نہ کہ عمومی تناظر میں۔ علامہ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی ابن القیسرانی (۵۰۷ھ) نے غنا اور موسیقی سے لہو الحدیث کی تفسیر کو کئی جہتوں سے رد

---

(۱) تفہیم القرآن، ۴/ ۸-۹

(۲) اسلام اور موسیقی، شبہات ومغالطات کا ازالہ، ص: ۶۶

کر دیا ہے، مثلاً یہ کہ:

(۱) ان میں سے کوئی بھی تفسیر ضعف سے خالی نہیں۔

(۲) لہوالحدیث کی دوسری تفاسیر بھی ہیں، جن سے یہ تفسیر ٹوٹ جاتی ہے۔

(۳) اگر اس آیت میں لہوالحدیث سے مراد غنا اور موسیقی تھی تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کی تفسیر وتوضیح کیوں نہ فرمائی؟

(۴) اگر لہو مطلقاً حرام ہے اور اس سے مراد غنا وآلات موسیقی ہے تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لہو پسند کیوں فرمایا؟ اور سیدہ عائشہ سے انصاریہ کی شادی میں لہو کے انتظام نہ ہونے کا شکوہ کیوں کیا؟

(۵) اصل تفسیر قرآن وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو، بعد والوں کی تفسیر حجت نہیں۔

(۶) اسی طرح اگر مطلقاً غنا اور آلات موسیقی یہاں مراد ہوں تو ان کا سماع تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ (کتاب السماع لابن طاہر مقدسی، ملخصاً)

چوتھی آیت

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ (اسراء: ۶۴)

اور تم اولادِ آدم میں سے جس کو ڈرا سکو اس کو اپنی آواز سے ڈراتے رہو۔

یہ آیت کریمہ اس سیاق میں ہے کہ جب فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کر لیا اور ابلیس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے؟ کیا اسے تو نے مجھ پر فضیلت دے دی؟ مجھے مہلت دے تو میں قیامت تک اس کی نسل کو حق سے بہکاتا رہوں گا۔ اللہ رب العزت نے اسے مہلت دیتے ہوئے کہا کہ جاؤ، بہکاتے رہو، ان میں سے جو بھی تمہارے بہکاوے میں آ گئے وہ سب تمہارے ساتھ جہنم میں ہوں گے، جاؤ ان کو اپنی آواز سے ڈراتے رہے، اپنے سوار اور پیادہ فوج کے ساتھ ان کے اوپر ٹوٹ پڑو، ان کے اموال واولاد میں شریک ہو جاؤ اور انہیں ڈراتے رہو۔ لیکن یاد رکھو! میرے خالص بندوں پر تمہارا بس نہیں چلے گا۔ ان کے حق میں تمہارا خوف دلانا محض ایک فریب ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں طرح طرح سے انسانوں کو بہکانے کی بات کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک اسْتَفْزِزْ بِصَوْتِكَ بھی ہے۔ اس سے بعض مفسرین نے نغمہ اور آلات نغمہ مراد لیے ہیں۔ یہ محض ان کا اپنا فہم ہے، نہ کہ قرآنی آیت کا درست مفہوم۔ اور کسی بھی آیت سے متعلق کسی مفسر کے اپنے ذاتی فہم کو معنیِ قرآن قرار نہیں دیا جا سکتا، جب تک کہ قرآن کا وہ لفظ محاورۂ عرب اور سیاق کلام کی روشنی میں خود اس فہم کو ثابت نہیں کر رہا ہو۔ شیطانی آواز، جو باطنی وسوسوں اور خارجی خوف کی شکل میں ہوتی ہے، اسے آلات موسیقی پر چسپاں کر دینا قرآن کے وسیع مفہوم کو اپنی محدود فکر کے تنگنائے میں مقید کرنا ہے۔ مزید یہ کہ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ

کی تفسیر میں حسب ذیل باتیں بھی منقول ہیں:

۱-معروف لغوی ابوعبیدہ تیمی (۲۰۹ھ) لکھتا ہے: و استخفف و استجھل، ہلکان کرو اور جاہل بناؤ۔ (مجاز القرآن) یہی معنی ابن قتیبہ (۲۷۶ھ) نے غریب القرآن میں لکھے ہیں۔

۲-ابوجعفر طبری (۳۱۰ھ) نے بھی یہی معنی بتائے ہیں۔ پھر مجاہد سے اس کی تفسیر لہو وغنا اور لہو ولعب نقل کی ہے، جب کہ حضرت ابن عباس سے اس کے معنی معصیت نقل کیے ہیں۔ پھر آخر میں لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں صوت کو کسی متعین مفہوم کے لیے خاص نہیں کیا ہے، لہٰذا ہر وہ آواز جو شیطان اور اس کی اطاعت کی طرف داعی ہو اور طاعت الٰہی سے منحرف کرنے والی ہو، وہ اس صَوْتِكَ کے مفہوم میں شامل ہے۔

صرف اسی قدر سے واضح ہو جاتا ہے کہ بعض اہل نظر نے بِصَوْتِكَ کی تفسیر جو مزامیر سے کی ہے، وہ کس قدر حقیقت سے دور ہے۔ مزید یہ کہ مزامیر کے معنی کے اندر خود بڑا توسع ہے، اس سے متعین طور پر آلات موسیقی کی حرمت پر استدلال شجر بول کر متعین طور پر امرود مراد لینے جیسا ہے۔ جس طرح اس آیت سے مطلقاً نغمہ کی حرمت پر استدلال مردود ہے، جس کی تفصیل ماسبق میں گزر چکی، اسی طرح اس سے مطلقاً آلات موسیقی کی حرمت پر استدلال بھی مردود ہے۔

اس تفصیل کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ وَاسْتَفْزِزْ بِصَوْتِكَ کی تفسیر متعدد روایتوں میں غنا بھی آئی ہے، اس کے باوجود مخالفین آلات نغمہ بالعموم غنا کی مطلقاً حرمت کے قائل نہیں ہیں۔ ایسے میں اگر بعض روایتوں میں غنا کے ساتھ مزامیر کا بھی لفظ آ گیا ہے تو پھر ایسا کیوں ہو گیا کہ غنا کی حرمت تو مقید رہے، لیکن آلات غنا مطلقاً حرام ہو جائیں -ع- ہے جناب شیخ کا فلسفہ بھی عجیب سارے جہان میں

مجوزین آلات نغمہ کا آیات قرآنیہ سے استدلال

اب ان آیات کو ملاحظہ کیجیے جنہیں آلات نغمہ کے مجوزین پیش کرتے ہیں:

پہلی آیت

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُودَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فَاعِلِين (انبیاء: ۷۹)

ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو داؤد کے تابع کر دیا تھا، جو اس کے ساتھ خدا کی تسبیح کرتے تھے اور یہ عمل ہم ہی انجام دینے والے ہیں۔

اس آیت کے ذیل میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> يُسَبِّحْنَ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو إِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ میں ہے۔ دوسرا یہ کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام حمد الٰہی کے نغمے گاتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا اور چٹانیں تک وجد میں آ جاتی تھیں۔ حضرت داؤد بڑے ہی خوش آواز تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے

عبرانی موسیقی مدون کی اور مصری اور بابلی مزامیر کو ترقی دے کر نئے نئے آلات ایجاد کیے۔ تورات اور روایات یہود سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بیٹھ کر حمد الٰہی کے ترانے گاتے اور اپنا بربط بجاتے تو شجر و حجر جھومنے لگتے تھے۔ روایات تفسیر سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ پرندوں کی تسخیر کو بھی دونوں باتوں پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ اس بات پر بھی کہ ہر طرح کے پرند ان کی محفل میں جمع ہو گئے تھے اور اس پر بھی کہ ان کی نغمہ سرائیوں سے متاثر ہوتے تھے۔ کتاب زبور در اصل ان گیتوں کا مجموعہ ہے جو حضرت داؤد نے الہام الٰہی سے نظم کی تھیں۔''

(ترجمان القرآن، جلد دوم، ص: ۵۵۵، اسلامی اکیڈمی، اردو بازار، لاہور)

مولانا آزاد کی یہ بات اسلامی نصوص سے کس حد تک ثابت ہے، یہ کہنا مشکل ہے۔ سوائے اس کے کہ صحیح احادیث میں مزامیر داؤد کا ذکر ہے اور مزامیر کے لفظی عموم کے اندر نغمات اور آلات نغمات دونوں ہی شامل ہیں۔ اس سے قطع نظر بائبل کے مختلف حوالے اس فکر کی تائید کرتے ہیں۔

سر دست ایک مثال دیکھیے:

''اور اس (داؤد) نے لاویوں میں سے بعض کو خداوند کے صندوق کے آگے مناجات کرنے، شکر گذاری کرنے اور خداوند اسرائیل کے خدا کی حمد و ثنا کرنے کی خدمات پر مقرر کیا۔ آسف افسر اعلیٰ تھا، زکریاہ اس کا نائب تھا۔ اس کے بعد یعی ایل تھے۔ سمیراموت، یحیئیل، متتیاہ، الیاب، بنایاہ، عوبیدادوم اور یعی ایل تھے۔ انہیں ستار اور بربط بجانے کی ذمہ داری دی گئی اور آسف کا کام یہ تھا کہ وہ زور زور سے جھانجھ بجایا کرے اور بنایاہ اور یحزیئیل کاہنوں کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ خدا کے عہد کے صندوق کے آگے دستور کے مطابق نرسنگے بجایا کریں۔

اسی دن پہلے داؤد نے آسف اور اس کے ہم خدمت ساتھیوں کو ہدایت دی کہ وہ خداوند کا شکر بجالانے کے لیے یہ زبور گائیں:

خداوند کا شکر بجالاؤ، اس سے دعا کرو؛

قوموں کے درمیان اس کے کاموں کا بیان کرو۔

اس کے حضور اس کی حمد و ثنا کرو؛

اس کے سب عجیب کاموں کا تذکرہ کرو۔

اس کے پاک نام پر فخر و کرو،

جو خداوند کے طالب ہیں، ان کے دل شادمان ہوں۔'' (بائبل، ۱-تواریخ ۱۶:۱-۱۰)

مزامیر داؤد کے سلسلے میں اس تفسیر کے برخلاف صاحب روح البیان علامہ اسماعیل حقی حنفی (۱۱۲۷ھ)

نے قصص الانبیا کے حوالے سے حضرت ابن عباس سے یہ بات نقل کی ہے کہ بنی اسرائیل حضرت داؤد علیہ السلام کی بعثت سے قبل افتراق وانتشار کا شکار ہو چکے تھے۔عود، طنبورہ، ، زمار، صنوج اور اس قسم کے شیطانی لہو ولعب میں لگے ہوئے تھے۔انہی حالات میں اللہ رب العزت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور انہی حسن صوت اور نغمگی کی دولت عطا فرمائی۔حضرت داؤد زیر و بم کے ساتھ کھینچ کر جب توریت کی تلاوت کرتے تو بنی اسرائیل حیرت زدہ رہ جاتے۔اس طرح حضرت داؤد نے انہیں لہو ولعب کے سابقہ مشاغل سے دور کر دیا۔سب داؤد کے گرد جمع ہو کر ان کے نغمے سننے لگے۔جب آپ اللہ کی حمد وثنا کرتے تو آپ کے ساتھ پہاڑ، پرندے اور جانور بھی اللہ کی حمد وثنا بیان کرنے لگتے۔(روح البیان:۵/ ۵۰۶)

اہل نظر خوب واقف ہیں کہ بائبل اور قصص الانبیا سے قرآنی آیات کی تفسیر، تفسیر کے سوا سب کچھ ہے۔اس لیے یہ کہنے میں باک نہیں کہ مذکورہ آیت کریمہ سے آلات موسیقی کے جواز پر استدلال ایک نامکمل استدلال ہے۔

دیگر آیات

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب:۲۱)

تمہارے لیے رسول اللہ کی شخصیت بہترین ماڈل ہے۔

امام احمد غزالی قدس سرہ (۵۲۰ھ) اس آیت کریمہ سے نغمہ اور آلات نغمہ کے جواز پر استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جو شخص یہ کہتا ہے کہ سماع نغمہ حرام ہے، یا دف بجانا حرام ہے، یا ایسی محافل میں شرکت حرام ہے، گویا وہ یہ کہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام سنا اور [حضرت ابوبکر کو] نہی عن المنکر سے منع کیا اور جو شخص ایسا اعتقاد رکھے، وہ متفقہ طور پر کافر ہے۔(لوارق الالماع،ص:۶۶)

اس آیت سے آلات نغمہ کے جواز پر استدلال درحقیقت سنت سے استدلال کے ہم معنی ہے۔راست طور پر یہ آیت بھی آلات موسیقی کے جواز پر دلالت نہیں کرتی۔

اسی طرح دیگر اہل علم يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَات (مائدۃ:۴[۱]) وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (الانعام:۱۱۹[۲]) اور وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُم (نساء:۲۴[۳]) جیسی آیات سے آلات موسیقی کے جواز پر استدلال کرتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ راست طور پر ان میں سے کسی بھی آیت سے

---

(۱) وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ ان کے لیے کون سی چیزیں حلال کی گئی ہیں؟ آپ کہہ دیں: تمہارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔

(۲) جو کچھ تمہارے اوپر حرام کیا ہے، تحقیق کہ سب کی تفصیل فرما دی ہے۔

(۳) ان حرام کردہ امور کے ماسوا سب کچھ تم پر حلال کر دیا گیا۔

آلات موسیقی کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

ہاں! زیادہ سے زیادہ ان سے قاعدۂ فقہیہ- الاصل فی الاشیاء اباحة (۱) کا ثبوت ہوتا ہے اور اس طرح بالواسطہ طور پر آلات موسیقی کا جواز بھی ثابت ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ آلات موسیقی، آلات تحسین نغمہ ہیں، جو اصل کے لحاظ سے حسن وخیر پر مشتمل ہیں۔ ان کی حرمت کی تفصیل کتاب اللہ میں بیان نہیں ہوئی ہے اور محرمات کے ماسوا چیزیں مذکورہ اصل کے تحت اصلاً جائز ہیں۔ البتہ یہ استدلال بھی نامکمل رہے گا جب تک ذخیرۂ احادیث کو نہ کھنگال لیا جائے اور وہاں سے آلات موسیقی کا جواز یا کم ازکم سکوت ثابت نہ ہوجائے؛ کیوں کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جن کی حرمت کتاب اللہ میں بیان نہ ہوکر سنت رسول میں بیان ہوئی ہے اور یہ دونوں ہی یکساں طور پر تحلیل وتحریم کے مصادر ہیں۔

تطبیق وتجزیہ

مذکورہ بالا قرآنی مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱- آلات موسیقی کی حرمت پر کوئی آیت بصراحت دلالت نہیں کرتی۔

۲- صوت شیطان کی تفسیر جن حضرات نے مزامیر سے کی ہے، یہ ان کی اپنی تفسیر ہے، جو عام تفسیر کے خلاف اور لفظ کی غیر ضروری تخصیص پر مبنی ہے۔ دراصل انھوں نے پہلے سے مزامیر کو شیطانی آواز مان لیا ہے، اس لیے اسے صوت الشیطان کا حصہ قرار دیا ہے۔ یہ ان کا اپنا فہم اور اجتہاد ہے، جس کو بنیاد بنا کر قرآن کی روشنی میں آلات موسیقی کو مطلقاً حرام کہنا، قرآن پڑھنا نہیں، قرآن سے کھیلنا ہے۔ مزید یہ کہ مزامیر کا دوسرا معنی نغمہ ہے اور نغمہ کی بحث ماسبق میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح دیگر آیات جنھیں حرمت آلات موسیقی کے اثبات کے لیے پیش کیا جاتا ہے، وہ آلات موسیقی سے کلیۃً غیر متعلق ہیں۔

۳- آلات موسیقی کی تحسین یا جواز پر براہ راست کوئی آیت دلالت نہیں کرتی، لیکن قرآن میں آلات موسیقی کے جواز پر صریح آیت نہ ہونے کے سبب ان کی حرمت لازم نہیں آتی۔ اس کے برخلاف چوں کہ آلات موسیقی کی حرمت پر کوئی صریح آیت نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی آیت ہے جس سے اشارۃً ہی سہی آلات موسیقی کی حرمت ثابت ہوتی ہو، ایسے میں الاصل فی الاشیاء اباحة(۲) کے تحت آلات موسیقی کا سماع جائز ہوگا۔ مزید یہ کہ قَدۡ فَصَّلَ لَكُمۡ مَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمۡ (الانعام: ۱۱۹(۳)) سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی روشنی میں آلات موسیقی کا سماع حرام نہیں ہے، کیوں کہ اس کی حرمت کی تفصیل قرآن مقدس میں نہیں ہے۔

---

(۱) احکام میں اصل جواز ہے۔

(۲) اشیا میں اصل جواز ہے۔

(۳) اللہ نے جن باتوں کو تم پر حرام کیا ہے، ان کو تفصیل سے بیان کردیا ہے۔

حدیث پر گفتگو آگے آتی ہے:

آلات موسیقی کا سماع-احادیث کی روشنی میں

آلات موسیقی کے حوالے سے احادیث کا مطالعہ کانٹے کی بحث ہے۔ چوں کہ ہر دو طرف احادیث کا انبار ہے، ان کے بیچ تطبیق، ترجیح اور تحقیق وتنقید کا مرحلہ ایک آگ کا دریا ہے، جسے پار کرنا پتہ ماری کا کام ہے۔ یہ مرحلہ اس وقت اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس بحر مواج میں ہر عہد کے اکابر نے غوطہ زنی کی ہے اور پھر یہ بات مزید پریشان کن ہے کہ ان کے نتائج یکساں نہیں ہیں۔ ویسے اس پوری بحث سے جو بات واضح طور پر نکل کر سامنے آتی ہے وہ بہت صاف ہے اور وہ یہ کہ یہ بحث ایک کثیر الجہات، اختلافی ظنی اور اجتہادی ہے۔

اب اس سلسلے میں ہم دونوں طرح کی احادیث پیش کرتے ہیں، پھر ان میں تحقیق، تطبیق اور ترجیح کا عمل کیا جائے گا۔

منکرین آلات نغمہ کا احادیث کریمہ سے استدلال

پہلی حدیث

إِذَا فَعَلَتْ أُمَّتِي خَمْسَ عَشْرَةَ خَصْلَةً حَلَّ بِهَا البَلَاءُ، فَقِيلَ: وَمَا هُنَّ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: إِذَا كَانَ المَغْنَمُ دُوَلًا، وَالأَمَانَةُ مَغْنَمًا، وَالزَّكَاةُ مَغْرَمًا، وَأَطَاعَ الرَّجُلُ زَوْجَتَهُ وَعَقَّ أُمَّهُ، وَبَرَّ صَدِيقَهُ وَجَفَا أَبَاهُ، وَارْتَفَعَتِ الأَصْوَاتُ فِي المَسَاجِدِ، وَكَانَ زَعِيمُ القَوْمِ أَرْذَلَهُمْ، وَأُكْرِمَ الرَّجُلُ مَخَافَةَ شَرِّهِ، وَشُرِبَتِ الخُمُورُ، وَلُبِسَ الحَرِيرُ، وَاتُّخِذَتِ القَيْنَاتُ وَالمَعَازِفُ، وَلَعَنَ آخِرُ هَذِهِ الأُمَّةِ أَوَّلَهَا، فَلْيَرْتَقِبُوا عِنْدَ ذَلِكَ رِيحًا حَمْرَاءَ أَوْ خَسْفًا وَمَسْخًا (ترمذی، ابواب الفتن، بَابُ مَا جَاءَ فِي عَلَامَةِ حُلُولِ المَسْخِ وَالخَسْفِ)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب میری امت پندرہ چیزیں کرنے لگے گی تو اس پر بلائے عام نازل ہوگی۔ دریافت کیا گیا: حضور! وہ چیزیں کیا ہیں؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مال غنیمت کو اپنا مال بنا لیا جائے، امانت کو مال غنیمت بنا دیا جائے، زکات کو بوجھ بنا دیا جائے، شوہر بیوی کا اطاعت گزار اور ماں کا نافرمان ہو جائے، دوست کے ساتھ حسن سلوک اور باپ کے ساتھ زیادتی ہونے لگے، مسجدوں میں شور وشغب ہونے لگے، قوم کا رذیل ترین شخص قوم کا لیڈر بن جائے، کسی کے شر سے بچنے کے لیے اس کی تکریم کی جانے لگے، شراب پی جانے لگے، ریشم پہنا جانے لگے، مغنیات اور مزامیر کو شغل بنا لیا جائے، اس امت کے متاخرین اولین پر لعنت بھیجنے لگیں تو اس وقت لوگ سرخ آندھی، زلزلہ یا انسانوں کے مسخ وتباہی کا انتظار کریں۔

قاضی شوکانی نے اس حدیث کے راوی فرج بن فضالہ پر جرح کیا ہے اور دارقطنی کے حوالے سے اس کی حدیث کو باطل کہا ہے۔ اسی طرح اس کے اندر دوسرا راوی یحییٰ بن سعید ہے جس کو منکر احادیث کا راوی بتایا ہے۔ ترمذی کی دوسری روایت میں زمیح جذامی ہیں جن کو مجہول الحال کہا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ترمذی کے سوا

اصحاب ستہ میں سے کسی نے اس سے روایت نہیں کی۔

اس حدیث پر جو جرحیں ہوئی ہیں، شیخ البانی نے ان کا تفصیلی جواب دیا ہے اور ان کے شواہد و متابعات پیش کر کے تصحیح کی کوشش کی ہے۔ (تحریم آلات الطرب، ص: ۶۵)

قاضی شوکانی نے آخر میں لکھا کہ ان دونوں احادیث کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اندر جو وعید ہے وہ معازف کے ساتھ مذکور دیگر اشیا کے اجتماعی وجود پر ہے، لہٰذا اس سے انفرادی طور پر ان میں سے ہر ایک کی حرمت پر استدلال درست نہیں ہے۔ (الفتح الربانی، ص: ۵۲۲۰)

اس حدیث میں قابل غور لفظ **اتخذت القینات والمعازف** ہے۔ امام ترمذی کی اسی باب کی دوسری روایت میں **ظهرت القينات والمعازف وشربت الخمور** (جب مغنیات اور مزامیر عام ہو جائیں اور شراب پی جانے لگے) ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں پر معازف کی مذمت انفرادی نہیں، بلکہ شراب اور مغنیات کے ساتھ ہے۔ قینات پیشہ ور مغنیات ہوتی ہیں جو اہل ہویٰ کی مجلس میں عیش وطرب کی رونق افزائی کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مغنیات کا رقص ونغمہ آلات موسیقی کے بغیر ہو جب بھی حرام ہے اور اس کے ساتھ اگر مزید ہوس وہویٰ کی تپش بڑھانے کے لیے شراب اور آلات موسیقی کا استعمال ہو تو یہ استعمال بھی حرام ہوگا اور اس کے ساتھ اس رقص ونغمہ کی حرمت میں بھی اضافے کا باعث ہوگا۔

دراصل آلات موسیقی کی حرمت کے جتنے نصوص ہیں، ان میں شراب وشباب کی صراحت ہو یا نہ ہو، وہ سب اسی قید کے ساتھ معہود ومشروط ہیں، ورنہ تنہا آلات موسیقی میں شر وفساد کی کون سی پخ لگی ہوئی ہے جس کی وجہ سے انہیں مطلقاً حرام کہا جائے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ ہمیں مطالعۂ سیرت اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ وہاں مختلف مقامات پر آلات موسیقی کی جلوہ سامانی ہے۔

دوسری حدیث

حَدَّثَنِي أَبُو عَامِرٍ أَوْ أَبُو مَالِكٍ الْأَشْعَرِيُّ، وَاللهِ مَا كَذَبَنِي: سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ، يَسْتَحِلُّونَ الحِرَ وَالحَرِيرَ، وَالخَمْرَ وَالمَعَازِفَ۔ (بخاری، کتاب الاشربہ، باب ماجاء فیمن یستحل الخمر، ویسمیہ بغیر اسمہ)

ابو عامر یا ابو مالک اشعری نے بیان کیا اور بخدا جھوٹ نہیں کہا، انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا: میری امت میں ضرور کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور باجے کو حلال کر لیں گے۔

اس حدیث کے سلسلے میں علامہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ بخاری نے اسے پوری سند کے ساتھ نقل نہیں کیا ہے، بلکہ اسے **قال هشام** کہہ کر شروع کر دیا ہے۔ پھر اس میں آخر کے راوی ابو عامر یا ابو مالک ہیں، جب کہ

ابوعامر مجہول ہیں۔(۱) البانی نے اس حدیث کو ابن تیمیہ کے حوالے سے صحیح کہا ہے اور کہا ہے کہ ہشام بن عمار بخاری کے شیخ ہیں، لہٰذا قال کہنا عن کے معنی میں ہے۔صورتاً یہ حدیث منقطع ہے، جب کہ حقیقت میں یہ متصل ہے۔(تحریم آلات الطرب،ص:۳۹)

سند کے علاوہ متن کو غور سے دیکھیں تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ یہاں معازف کا ذکر خمر کے ساتھ آیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر معازف کے ساتھ بادہ وسبو کا دور چل رہا ہو تو ایسے عالم میں ان کا بجانا یا سننا قطعاً حرام ہوگا۔

محرمین کہیں گے کہ یہاں پر کئی ایک چیزوں کا ذکر ہے اور وہ سب ایک دوسرے پر عطف ہیں، لہٰذا ان سب کو ایک دوسرے سے ملا کر حرام اور الگ الگ حلال سمجھنا، جنون کی حد تک ایک لغو خیال ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح دیگر معطوفات مستقل حرام ہیں، اسی طرح معازف کی حرمت بھی مستقل ہونی چاہیے، خواہ وہ خمر کے ساتھ ہوں یا اس کے بغیر، ظاہراً مفہوم تو یہی ہے، لیکن یہ مفہوم اس لیے متروک ہے؛ کیوں کہ دیگر امور کی طرح معازف کی حرمت نہ تو بالذات ہے جس طرح زنا اور شراب کی حرمت ہے اور نہ ہی مطلقاً ہے جیسے مردوں کے لیے حریر کی حرمت۔ بالذات نہیں ہے، اس کی گفتگو ماسبق میں گزر چکی اور رہی یہ بات کہ معازف کی حرمت مطلقاً نہیں ہے، تو اس کی دلیل یہ ہے کہ خود پیغمبر اور اصحاب پیغمبر سے مختلف مواقع پر معازف کا سننا ثابت ہے، جو یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ معازف کی حرمت مطلقاً نہیں ہے۔ رہی بات یہ کہ پھر اس کی حرمت کب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس وقت شراب کے ساتھ ہو جیسا کہ اس حدیث میں عطف سے اشارہ ہے یا شبابِ ناروا کے ساتھ ہو، جس کا ذکر پہلی حدیث میں گزرا۔

قاضی شوکانی نے اپنے رسالہ ابطال دعویٰ الاجماع میں اس حدیث کو منقطع کہا ہے۔ اس کے راوی صدقہ بن خالد کو ضعیف کہا ہے۔ جس صحابی سے یہ منقول ہے، اس کے نام میں راوی کا شک بتایا ہے۔ سند ومتن ہر لحاظ سے اس حدیث کو مضطرب کہا ہے، لفظ معازف سے آلات موسیقی پر استدلال کے سلسلے میں محتمل اور غیر متعین بتایا ہے اور پھر آخر میں تحریم کے معنی پر اس حدیث سے استدلال کو رد کیا ہے اور بر سبیل تسلیم، آلات موسیقی کی انفرادی حرمت پر سوال اٹھایا ہے اور کہا ہے کہ جن امور کا حدیث پاک میں ذکر آیا ہے ان کے ساتھ مجموعی طور پر آلات موسیقی حرام ہیں، نہ کہ انفرادی طور پر۔

اس کی مثال میں یہ آیت پیش کی ہے: خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ۔ (الحاقۃ:۳۰-۳۴)

(۱) الغناء الملهی مباح هو أم محظور

(۱) اور کہا ہے کہ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہ دینا تنہا یہ عمل مذکورہ وعید کا موجب نہیں ہوسکتا اور نہ تنہا یہ عمل حرام ہے۔(۲)

نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے بھی دلیل الطالب علی ارجح المطالب میں یہی توجیہ کی ہے۔(۳) مولانا جعفر پھلواروی نے اس کی مزید وضاحت کی ہے:

''اس کی مثال ہر روز ہمارے سامنے اپنی زبان میں آتی رہتی ہے۔ہم کہتے ہیں کہ فلاں بدبخت ہر وقت شراب وکباب میں بدمست رہتا ہے۔ذرا غور کر کے بتایئے کہ کیا کباب بھی ویسا ہی حرام ہے جیسی شراب؟ کون صاحب عقل ہے جو شراب وکباب کی مجموعی برائی کرنے کے باوجود دونوں کو انفراداً بھی ایک ہی حکم میں داخل سمجھے۔'' (حوالہ سابق،ص:۱۹۶)

تیسری حدیث

يشرَب أناسٌ من أمَّتي الخمرَ يُسمُّونَها بغيرِ اسمِها، يضرب علَى رءوسِهِم بالمعازفِ، والقيناتِ، يخسِفُ اللهُ بِهِمُ الأرضَ، ويجعَلُ منهمُ القِرَدةَ والخَنازيرَ۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الاشربہ، من حرم المسکر م وقال ہو حرام نہی عنہ)

میری امت میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو شراب پئیں گے اور اس کا نام بدل دیں گے۔ان کے سامنے آلات موسیقی اور مغنیات کی جلوہ سامانی ہوگی۔ان کی وجہ سے اللہ زمین میں زلزلے پیدا کرے گا اور ان میں سے کچھ کو بندر اور خنزیر بنا دے گا۔

اس حدیث کی سند میں معاویہ ابن صالح ہیں جن کو علامہ ابن حزم نے ضعیف کہا ہے۔ایک دوسرے راوی مالک بن ابی مریم ہیں جو مجہول ہیں۔(۴) لیکن اس سلسلے میں شوکانی نے لکھا کہ اس حدیث کو ابن ماجہ نے عن ابن محیریز عن ثابت بن سمط نقل کیا ہے، جب کہ ابوداؤد نے بھی اس کی تخریج کی ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس کے دیگر شواہد بھی ہیں۔(نیل الاوطار: ۸/ ۱۱۵)

صحت وضعف سے قطع نظر اس حدیث کو بھی آلات موسیقی کی حرمت میں پیش کرنا اسے سیاق وسباق سے ہٹانا ہے۔دراصل اس حدیث کے اندر آلات موسیقی کی مذمت اس سیاق میں ہے کہ وہ شراب وشباب اور فسق وفجور

---

(۱) اسے پکڑو، اس کی گردن میں طوق ڈال دو، پھر اسے جہنم میں جھونک دو، پھر اسے ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو، کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔

(۲) ابطال دعوی الاجماع علی تحریم مطلق السماع، مشمولہ الفتح الربانی، ج:۱۰،ص:۵۲۱۸

(۳) اسلام اور موسیقی، پھلواروی،ص:۱۹۵

(۴) الغناء الملهى امباح هو أم محظور

کی مجلس میں بجائے جارہے ہوں گے۔ اس سیاق سے صرف نظر کر کے اس حدیث سے مطلقاً آلات موسیقی کی حرمت پر استدلال کرنا وَأَنْتُمْ سُكَارَى کو چھوڑ کر صرف لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ(۱) کی تلاوت کیے جانا ہے۔

چوتھی حدیث

سَمِعَ ابْنُ عُمَرَ، مِزْمَارًا قَالَ: فَوَضَعَ إِصْبَعَيْهِ عَلَى أُذُنَيْهِ، وَنَأَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَقَالَ لِي: يَا نَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا؟ قَالَ: فَقُلْتُ: لَا، قَالَ: فَرَفَعَ إِصْبَعَيْهِ مِنْ أُذُنَيْهِ، وَقَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ مِثْلَ هَذَا فَصَنَعَ مِثْلَ هَذَا، قَالَ أَبُو عَلِيٍّ اللُّؤْلُؤِيُّ: سَمِعْتُ أَبَا دَاوُدَ يَقُولُ: هَذَا حَدِيثٌ مُنْكَرٌ۔

(سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب کراھیۃ الغناء والزمر)

حضرت عبداللہ بن عمر نے بانسری کی آواز سنی تو اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ڈال لیں اور راستہ بدل دیا۔ پھر پوچھا: نافع! کیا تمہیں کچھ سنائی دے رہا ہے؟ میں نے کہا نہیں! نافع کہتے ہیں: اس کے بعد حضرت ابن عمر نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں سے نکال لیں اور کہا: میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا تو آپ نے بھی ایسی ہی آواز سنی، پھر آپ نے بھی ایسا ہی کیا۔ ابوعلی لولوی کہتے ہیں: میں نے ابوداؤد کو کہتے سنا کہ یہ حدیث منکر ہے۔

مفتی محمد شفیع دیوبندی نے اس پر تعلیق لگائی ہے کہ متقدمین کی اصطلاح میں منکر کا اطلاق بعض اوقات حدیث غریب پر بھی ہوتا ہے۔(۲) چنانچہ بذل المجہول اور عون المعبود کے مصنفین نے بھی اس کی نکارت کا انکار کیا ہے۔(۳) اس حدیث کے ذیل میں علامہ ابن قدامہ مقدسی لکھتے ہیں:

> مزامیر کی تحریم کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر مبالغہ فرمایا کہ آواز سن کر اپنے گوش مبارک بند فرما لیے تھے، بلکہ وہ راستہ بھی بدل لیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں ہاتھ پر ہاتھ باندھ کر مزامیر کی آواز سنتے نہ رہے تھے۔ (قوالی اور گانا بجانا، ص: ۱۸)

حافظ ابن طاہر مقدسی ابن القیسرانی کہتے ہیں:

> ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس حدیث کو اسی طرح نقل کیا ہے اور یہ دو وجہوں سے مردود ہے۔ اول: اس کی سند فاسد ہے۔ اس کی روایت میں سلیمان ابن موسیٰ ہے جو اشدق دمشقی ہے۔ اہل علم نے اس پر جرح کیا ہے۔ پھر یہ کہ نافع سے روایت کرنے میں وہ منفرد ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور نے یہ روایت نہیں کی ہے۔ بخاری نے کہا کہ سلیمان بن موسیٰ منکر روایات بیان کرتا ہے۔ دوسری وجہ حضرت عبداللہ بن عمر کا نافع سے یہ پوچھنا کہ کیا تمہیں سنائی دے رہی ہے؟ اگر یہ حرام ہوتا تو وہ ان کو سننے کو نہ کہتے۔ پھر یہی بات انہوں

---

(۱) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى (نساء: ۴۳) اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ۔

(۲) اسلام اور موسیقی، ص: ۱۳۳

(۳) حوالہ سابق، حاشیہ

نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کی۔اگر یہ چیز حرام ہوتی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سننے سے ان کو بھی منع فرمایا ہوتا اور صراحت کے ساتھ اس کی حرمت بیان کی ہوتی؛ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم محرمات کے بیان پر مامور تھے۔ بھلا کون سی ضرورت یا وجہ تقیہ تھی جس کی وجہ سے آپ نے راستہ بدل لیا؟ سیدہ عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے سہواً ایک ایسا پردہ لگا دیا جس میں تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آپ نے اسے پھاڑ دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عمر کو اپنے والد کی قسم کھاتے ہوئے سنا تو آپ نے انہیں اس سے منع فرمایا۔ یعیش ابن طخفہ کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پیٹ کے بل لیٹا ہوا دیکھا تو آپ نے انہیں منع فرمایا اور کہا لیٹنے کا یہ وہ طریقہ ہے جسے اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو سنا کہ وہ اپنی اونٹنی پر لعنت بھیج رہا ہے تو آپ رک گئے اور فرمایا: ہمارے ساتھ کوئی ملعون نہیں چلتا۔ یہ سن کر وہ شخص اپنی اونٹنی سے اترا اور اسے آزاد کر دیا۔ اس قسم کی مرویات کی طویل فہرست ہے۔ چوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اسی بیان کے لیے ہوئی تھی اور ضرورت کے وقت بیان نہ کرنا بہر حال جائز نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث سند و متن ہر لحاظ سے ضعیف ہے۔ واللہ اعلم (کتاب السماع، ص:۵۹/ ۶۰)

مذکورہ حدیث کی ایک توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ مزمار سے یہاں مراد کفار کا نغمہ و موسیقی ہو، جس کا سننا غیر اختیاری ہی کیوں نہ ہو، بہر کیف! غیر اولیٰ ہے اور ایسے عالم میں اپنے کانوں میں انگلی ڈال لینا یہ از باب تقویٰ ہے، نہ کہ از باب تشریع۔ ملا علی قاری نے کہا: **بل التحقیق ان نفس الوضع من باب الورع و التقویٰ و مراعاۃ الاولی**۔ (مرقاۃ المفاتیح: ۷/ ۳۰۲۴)

مسند احمد اور صحیح ابن حبان وغیر میں زمارۃ راع (بانسری) کا لفظ ہے اور ممکن ہے کہ بانسری اس عہد میں اہل شر کا شعار ہو، یا اہل باطل کا مذہبی عمل ہو، جیسا کہ ملا علی قاری نے بھی اس شخص کے ذمی یہودی ہونے کا امکان ذکر کیا ہے۔(۱) اس لیے خصوصیت کے ساتھ بانسری سے منع کیا گیا ہو، اس کی وجہ سے مطلقاً تمام آلات موسیقی کی کلی تحریم غیر معقول ہے۔ اس حدیث کے ذیل میں ملا علی قاری، علامہ طیبی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ بانسری سننا مباح ہے اور یہاں جو ممانعت ہے وہ تحریم کے لیے نہیں فقط تنزیہ کے لیے ہے؛ کیوں کہ اگر یہ حرام ہوتا تو حضرت عمر نافع کو بھی سماع سے منع کرتے۔ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ نافع ابھی عمر کے لحاظ سے مکلف ہی نہیں ہوئے تھے جس کی طرف [ایک دوسری روایت میں] انہوں نے **کنت اذ ذاک صغیرا** کہہ کر اشارہ کیا ہے۔“ (مرقاۃ: ۷/ ۳۰۲۴)

اس قسم کی نکتہ آفرینیاں بعض دیگر اہل علم نے بھی کیں ہے۔ لیکن یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ بانسری سننا

---

(۱) مرقاۃ: ۷/ ۳۰۲۴

حرام ہے، نافع نابالغ تھے، اس لیے حضرت ابن عمر نے ان کو یہ حرام کام کرنے دیا۔ نابالغ اور غیر مکلف ہونے کی رخصت شرع میں صرف یہ ہے کہ کوئی نابالغ اگر کسی امر حرام کا ارتکاب کرلے تو اس سے باز پرس نہ ہوگی، نہ یہ مطلب ہے کہ کوئی کسی نابالغ کو حرام کام کرنے کی اجازت دے اور اس سے حرام کا ارتکاب کرائے تو یہ عمل اس بالغ کے لیے جائز ہو۔ بر تقدیر حرام بھی، جب ایسی صورت میں کان پر انگلی رکھنا از باب تقویٰ ہے، جب یہ موٹی بات ہوگئی تو پھر اس کے بعد اس قدر غیر ضروری، بے فائدہ بلکہ ضرر رساں نکتہ آفرینی کی حاجت ہی کیا ہے۔ یہ متحقق ہوگیا کہ یہ عمل محض تقویٰ پر دلالت ہے اور تقویٰ جس طرح حرام کے غیر ارادی سماع میں ہے، اسی طرح مکروہ کے غیر ارادی سماع میں بھی ہے۔ الحاصل اس حدیث کی حرمت پر اصلاً کوئی دلالت نہیں ہے۔

علامہ عبدالغنی نابلسی نے یہاں پر دو بڑے لطیف نکتے بیان کیے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''باقی رہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے کانوں پر انگلیاں رکھ کر بند کرنے کا معاملہ تو اس کی دو وجوہات ممکن ہیں: ایک تو یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے سالک ہیں جو احوال کمال کے اتم واعلیٰ منصب پر فائز ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ ایسے امور بلکہ دیگر کئی مباح امور کا اکثر اوقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ترک کر دینا ہی شایاں تھا۔ اور دوسری وجہ یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک ذکر وفکر اور توجہ الٰہی کی کیفیات میں مشغول ومصروف رہتا تھا اور بانسری وغیرہ کی آواز سے اس استغراق میں خلل کا اندیشہ تھا؛ کیوں کہ آوازوں کی تاثیر دل میں اثر انداز ہوتی ہے اور اس احتمال کی مثال یہ ہے کہ ایک مرتبہ نماز سے فراغت کے بعد ابوجہم کے دیے ہوئے کپڑے اتار دیے؛ کیوں کہ اس کے پہننے سے حالت قلبی میں خلل اندازی ہو رہی تھی۔ تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ یہ معاملہ کپڑے کے حرام ہونے پر دلیل ہے بلکہ اس میں اشارہ ہے کہ اس کپڑے کے پہننے سے قلبی کیفیت میں خلل محسوس فرمایا تو اسے اتار دیا۔ اسی طرح کانوں پر انگلیاں رکھ کر بند کرنے کا معاملہ ہے۔'' (ایضاح الدلالات۔ اردو، ص: ۱۱۲-۱۱۳)

علامہ سید احمد سعید کاظمی لکھتے ہیں:

''اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی اہم معاملہ میں انہماک کے باعث اپنے خیالات میں مستغرق ہوتے ہیں، اگر اس وقت کوئی شور وغل کا دفع کرنا اپنے امکان میں ہوتا ہے تو اس کو دفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ورنہ خود وہاں سے اٹھ کر الگ جا بیٹھتے ہیں تو کیا ان آوازوں کو اور شور وغل کے سننے کو حرام سمجھتے ہیں۔ (نعوذ باللہ!) (اثبات السماع، ص: ۱۷)

یہاں یہ نکتہ بھی واضح رہے کہ حضرت ابن عمر عاشقانہ مزاج کے حامل تھے اور وہ ہر ہر عمل میں نبی کریم ﷺ کا نقل واتباع فرمایا کرتے تھے، عام ازیں کہ نبی کریم ﷺ نے وہ عمل کسی خاص مقصد اور کسی خاص تناظر میں ہی کیوں نہ کیا ہو۔ اس کی تائید ان کی سیرت کے متعدد عاشقانہ واقعات سے ہوتا ہے۔ مورخین نے لکھا

ہے کہ ان کے ذوق اتباع رسول دیکھ کر کوئی بھی انہیں مجنوں اور دیوانہ سمجھ سکتا تھا۔(۱)

مذکورہ بالا حدیث کو محرمین کے برخلاف مجوزین اپنے موقف کے اثبات میں پیش کرتے ہیں اور اس سے آلات موسیقی کے سماع کو مباح قرار دیتے ہیں۔ شیخ البانی نے ان کے استدلال کو کئی جہتوں سے رد کیا ہے اور اس ضمن میں ایک بات یہ بھی کہی ہے کہ برسبیل تنزل ہم یہ مان بھی لیں کہ اس کے اندر سماع آلات موسیقی کا جواز ہے تو ہم اس روایت کو آلات موسیقی کی حرمت سے قبل کے واقعہ پر محمول کریں گے اور یہ کہیں گے کہ شراب ہی کی طرح ممکن ہے یہ بھی شروع میں مباح رہا ہو۔(۲) سوال یہ ہے کہ اس توجیہ بعید کا انطباق حضرت رسالت مآب پر ہم مان بھی لیں، لیکن حضرت ابن عمر کے عمل پر اس کا انطباق کیسے ہوگا؟ کیا حضرت ابن عمر اور نافع کے عہد تک یہ حرام نہیں ہوا تھا ان کے مطابق؟ البانی نے اس حدیث کی ایک اور توجیہ یہ بھی کی ہے کہ ممکن ہے کہ یہ بانسری چرواہے کی تھی جو عام آلات موسیقی سے مستثنیٰ ہو۔ (حوالہ سابق)

مطلب یہ کہ البانی صاحب کے مطابق اب ہر بانسری کو سننا یکساں طور پر حرام نہ رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ اصول شرع اور مقاصد دین سے بے پروا لفظ پرستی پر مبنی توجیہ اسی قسم کی ہوسکتی ہے۔

پانچویں حدیث

اِنَّ رَبِّی حَرَّمَ عَلَیَّ الخَمرَ وَ المَیسِرَ وَ الْکُوبَۃَ وَ الْقِنِیْنَ۔ میرے رب نے مجھ پر شراب، جوا، کوبہ اور قنین کو حرام کر دیا ہے۔ (۳)

اس حدیث سے استدلال پر نقد کرتے ہوئے قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ اس کی جو سند عمرو بن العاص سے مروی ہے، اس میں ابن لہیعہ ہے جسے بے شمار ائمۂ حدیث نے ضعیف کہا ہے۔ قیس بن سعد بن عبادہ والی سند میں عبید اللہ بن زحر ہے اور محدثین کے نزدیک یہ بھی ضعیف ہے۔ مزید یہ کہ لفظ قنین کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ حبشہ کی زبان میں طنبور کے لیے استعمال ہوتا ہے، جب کہ ایک دوسرے قول کے مطابق جوا کا ایک کھیل ہے۔ (ابطال دعوی الاجماع، ۵۲۲۱)

منتقی الاخبار نے احمد اور ابوداؤد کے حوالے سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

ان اللہ حرم الخمر و المیسر و الکوبۃ و الغبیراء و کل مسکر حرام۔

امام احمد کے حوالے سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں۔

---

(۱) عَنْ مَالِكٍ، عَمَّنْ حدَّثَهُ: أَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يَتَّبِعُ أَمرَ رَسُوْلِ اللهِ - صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم - وَ آثَارَهُ وَ حَالَهُ، وَيهتمُّ بِهِ، حَتَّى كَانَ قَدْ خِيفَ عَلَى عَقلِهِ مِنِ اهتمَامِهِ بِذَلِك۔۔لَوْ نَظرْتَ إِلَى ابْنِ عُمَرَ إِذَا اتَّبعَ رَسُوْلَ اللهِ - صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم - لَقُلْتَ: هَذَا مَجنُوْنٌ. (سير أعلام النبلاء: ۳/ ۲۱۳)

(۲) تحریم آلات الطرب، ص: ۱۱۸

(۳) السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الشہادات، جماع ابواب من تجوز شہادتہ ومن لا تجوز، باب ما جاء فی ذم الملاھی من المعازف والمزامیر

ان اللہ حرم علی امتی الخمر و المیسر و المزر و الکوبۃ و القنین۔

اس کی شرح نیل الاوطار میں قاضی شوکانی لکھتے ہیں:

’’حافظ نے تلخیص میں اس حدیث کو ذکر کر کے سکوت کیا ہے، جب کہ اس کی سند میں ولید بن عبدہ ہیں، جو ابن عمر سے روایت کرتے ہیں اور جن کو ابو حاتم رازی نے مجہول کہا ہے۔ ابن یونس نے تاریخ المصریین میں لکھا ہے کہ اس سے یزید بن ابی حبیب نے روایت کی ہے۔ منذری نے اس حدیث کو معلول کہا لیکن احمد، ابوداؤد، ابن حبان اور بیہقی نے اس کے مثل ابن عباس سے جو روایت کی ہے وہ اس کے لیے شاہد ہے۔ احمد نے اس کی تخریج قیس بن سعد بن عبادہ سے کی ہے۔

(نیل الاوطار: ۸/ ۱۱۰)

البانی نے اس پر تفصیلی گفتگو کے بعد اس کی تصحیح کی ہے اور اس کے مختلف طرق اور راویوں کا ذکر کیا ہے۔

(تحریم آلات الطرب، ص: ۵۶)

واضح رہے کہ کوبہ اور قنین دونوں دو مختلف معانی کے لیے مستعمل ہیں۔ باجہ اور جوا کا کھیل۔ کوبہ، طبل اور ڈگڈگی کے لیے بھی ہے اور نرد کے لیے بھی ہے جو ایک جوا کا کھیل ہے۔ اسی طرح قنین طنبور کے معنی میں بھی ہے اور جوا کا ایک کھیل بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ جوا کے حرام ہونے میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے، البتہ آلات موسیقی کی حرمت کے سلسلے میں یہ سوال اٹھایا جائے گا کہ طبل ، ڈگڈگی اور طنبور اگر حرام ہیں تو لذاتہ ہیں یا لغیرہ؟ کوبہ (ڈگڈگی) کے سلسلے میں امام غزالی نے لکھا ہے کہ اس کی حرمت اس لیے ہے کہ یہ ہجڑوں کا شعار ہے۔ لہٰذا اگر یہ فساق کا شعار نہ ہو تو جہاد اور حج کے طبل کی طرح یہ بھی جائز ہوگا۔

(احیاء العلوم، کتاب آداب السماع والرقص، ۲/ ۲۷۲)

چھٹی حدیث

إِنَّ اللهَ بَعَثَنِي رَحْمَةً وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ، وَأَمَرَنِي أَنْ أَمْحَقَ الْمَزَامِيرَ وَالْكَنَارَاتِ، يَعْنِي الْبَرَابِطَ وَالْمَعَازِفَ۔ (مسند احمد تتمۃ مسند الانصار، حدیث ابی امامۃ الباھلی)

اللہ تعالیٰ نے مجھے سارے جہان کے لیے رحمت و ہدایت بنا کر مبعوث کیا اور مجھے مزامیر و کنارات یعنی برابط و معازف مٹانے کا حکم دیا۔

حافظ عراقی نے اس کے ساتھ سابقہ دو حدیثیں: لَيَكُونَنَّ فِي أُمَّتِي أَقْوَامٌ يَسْتَحِلُّونَ الْخَزَّ وَالْحَرِيرَ وَالْمَعَازِفَ اور إِنَّ رَبِّي حرم عَلَيَّ الخمر والكوبة والقنين کا ذکر کیا ہے اور پھر سب کو ضعیف کہا ہے۔

(المغنی عن حمل الاسفار، ص: ۷۴۶)

اس میں ایک لفظ کنارات بھی ہے جس کی تشریح امام بیہقی نے یوں کی ہے: وَأَمَّا الْكِنَارَاتُ فَيُقَالُ: إِنَّهَا الْعِيدَانُ

أَيْضًا، وَيُقَالُ: بَلِ الدُّفُوف۔(۱) کنارات عود کو کہا جاتا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ دف کو بھی کنارات کہا جاتا ہے۔

اس میں دف کا غیر ضروری استثنا کرنے والوں کے لیے عبرت ہے۔

ساتویں حدیث

كُلُّ مَا يَلْهُو بِهِ الرَّجُلُ الْمُسْلِمُ بَاطِلٌ، إِلَّا رَمْيَهُ بِقَوْسِهِ، وَتَأْدِيبَهُ فَرَسَهُ، وَمُلَاعَبَتَهُ أَهْلَهُ، فَإِنَّهُنَّ مِنَ الْحَقِّ۔ (سنن الترمذی، ابو اب فضائل الجهاد، باب ماجاء فی فضل الرمی فی سبیل الله)

ایک مرد مومن کا ہر لہو باطل ہے، سوائے تیر اندازی، گھوڑ سواری اور بیوی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے۔ اس لیے کہ یہ سارے لہو مباح ہیں۔

اس حدیث سے بھی بعض حضرات آلات موسیقی کو رد کرتے ہیں۔ چوں کہ ان کے مطابق آلات موسیقی آلات لہو ہیں اور اس حدیث کے مطابق لہو کی تین ہی صورتیں درست ہیں، لہٰذا آلات موسیقی باطل اور حرام ہیں۔ یہ استدلال کس قدر سخیف اور غیر متعلق ہے، اہل نظر پر مخفی نہیں۔ کیوں کہ:

۱- یہ حضرات ابھی لہو کے فہم سے قاصر ہیں۔

۲- اس امر سے نا آشنا ہیں کہ استثنا ہمیشہ حصر حقیقی کے لیے نہیں آتا، بسا اوقات حصر اضافی اور خصوصیت و اہمیت کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں پر بھی استثنا محض تخصیص کے لیے ہے، نہ کہ حقیقی حصر کے لیے۔ یہ بات اس وقت اور بہتر سمجھ میں آئے گی جب لہو کا درست مفہوم سمجھ میں آجائے۔ (اس کے لیے دیکھیے الاحسان کا شمارہ-۹)

۳- اس حدیث سے آلات موسیقی کی حرمت پر استدلال اسی طرح ہے جس طرح حدیث شد رحال سے زیارت قبر انور کے سفر کی حرمت پر استدلال ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حرفیت پرستی کا فقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

علامہ عبد الغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ (۱۷۳۱ء) نے اس فہم پر تفصیلی نقد کیا ہے، کچھ حصے آپ بھی دیکھیں:

”میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کا اگر یہ مفہوم لیا جائے کہ ان تین امور کے علاوہ بقیہ تمام لہو ولعب حرام ہیں تو ایسا استدلال درست نہیں ہے؛ کیوں کہ:

اگر لہو سے مراد ہر وہ شے لی جائے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کردے تو اس میں جمیع مباح شدہ امور بھی داخل ہوں گے؛ کیوں کہ ان میں بھی یاد الٰہی سے غفلت پائی جاتی ہے۔ حالاں کہ مباح شدہ امور حرام نہیں ہیں۔

اور اگر لہو سے مراد طاعت خداوندی کے افعال واحکام سے غافل کرنے والی اشیاء ہوں تو ان سے سماع بالمزامیر نکل جاتے ہیں جب کہ انہیں اوقات نماز کے علاوہ میں سنا جائے اور اس کی وجہ سے

---

(۱) السنن الكبرى للبيهقي، جُمَّاعُ أَبْوَابِ مَنْ تَجُوزُ شَهَادَتُهُ, وَمَنْ لَا تَجُوزُ مِنَ الْأَحْرَارِ الْبَالِغِينَ، بَاب: مَا جَاءَ فِي ذَمِّ الْمَلَاهِي مِنَ الْمَعَازِفِ وَالْمَزَامِيرِ وَنَحْوِهَا

افعال واحکام اطاعت میں کوئی غفلت نہ پائی جائے، کیوں کہ اب یہ لہو کی مذکورہ تفصیل میں داخل ہی نہیں ہیں۔۔۔

اسی طرح تمام آلات نغمات کا معاملہ ہے جب انہیں بطور لہو ولعب استعمال کیا جائے تو ان پر حرمت کا حکم ہوگا اور جب ان سے لہو ولعب کو دور کر دیا جائے تو حرمت کا حکم بھی ساقط ہو جائے گا، اگر چہ کم علم علما نے یہ کہا کہ ان آلات سے لہو زائل نہیں ہوسکتا۔۔۔

اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات متعین ہوگئی کہ لہو سے مراد حرام اور ملاہی سے مراد حرام کی طرف لے جانے والے امور ہیں یعنی ایسے افعال وامور جو فرائض وواجبات سے غافل اور فسق وفجور وممنوعات، شراب نوشی زنا وغیرہ سے قریب کر دیں۔۔۔

صرف لہو مطلقاً باطل نہیں ہے، جیسا کہ شیخ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ کف الرعاع میں اس بات کی تصریح کی ہے اور حدیث بیان کی کہ حضرت عبد المطلب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **الھوا والعبوا فانی أکرہ أن أری فی دینکم غلظة**۔ ترجمہ: تم لوگ لہو ولعب سے بھی شغف رکھا کرو، میں تمہیں دینی امور میں سخت دیکھنے کو ناپسند جانتا ہوں۔ (ایضاح الدلالات، (اردو) ص: ۱۷-۷۴)

ڈاکٹر محمد عمارہ آیت کریمہ **وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ** (جمعہ: ۱۱(۱)) کے تحت لکھتے ہیں:

بیع حرام نہیں ہے، لیکن حرام یہ ہے کہ وہ ہمیں نماز جمعہ سے غافل و بے خبر کر دے۔ زمین میں پھرنا اور رزق خدا سے تلاش کرنا، یہ ضروریات زندگی سے ہے، لیکن ان کا وقت اور جگہ نماز کا وقت نہیں ہے۔ تجارت اور لہو مباح ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ انسان کو نماز جمعہ سے غافل نہ کر دیں۔

لہو - لذت طرب - کو یہاں بیع وتجارت، سیر فی الارض اور رزق خدا - زندگی کی ضروریات ومباحات - کی تلاش کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ چوں کہ لہو اپنے عمومی مفہوم میں ہر اس چیز کو شامل ہے جو دوسری چیز سے بے خبر کر دے، لہٰذا یہ آیتیں اس کو حرام نہیں کرتیں؛ کیوں کہ لہو اپنی ذات اور حقیقت کے لحاظ سے حرام نہیں ہے، بلکہ اس کی حرمت اس وقت ہے جب کہ وہ کسی واجب سے غافل کرنے والا ہو۔

واضح رہے کہ ان آیتوں میں لہو؛ مباحات، ضروریات اور واجبات کے ساتھ مذکور ہے۔ یہ آیتیں در اصل انسانی زندگی میں مکمل توازن چاہتی ہیں، تاکہ انسان واجبات ادا کرے، ضروریات پوری

---

(۱) جب انہوں نے تجارت یا لہو کو دیکھا تو اس کی طرف نکل پڑے اور آپ کو اکیلا چھوڑ دیا۔ آپ کہہ دیں: جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ لہو وتجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہتر عطا فرمانے والا ہے۔

کرے، حاجیات حاصل کرے اور مباح تحسینیات وکمالات اور لذات سے اپنی زندگی کی تجدید و تزئین کرتا رہے، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر انسان کی غیر مفروضہ نماز بھی پورے اوقات کو محیط ہو اور اسے زندگی کی ضروریات ومباحات کی تکمیل سے روک دے تو اسے غلو فی الدین کہا جائے گا۔

(الغناء والموسیقی، ص:۵)

آٹھویں حدیث

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يُمْسَخُ قَوْمٌ مِنْ أُمَّتِي فِي آخِرِ الزَّمَانِ قِرَدَةً وَخَنَازِيرَ، قِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ، وَيَشْهَدُونَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّكَ رَسُولُ اللهِ، وَيَصُومُونَ؟ قَالَ: نَعَمْ، قِيلَ: فَمَا بَالُهُمْ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: يَتَّخِذُونَ الْمَعَازِفَ وَالْقَيْنَاتِ وَالدُّفُوفَ، وَيَشْرَبُونَ الْأَشْرِبَةَ، فَبَاتُوا عَلَى شُرْبِهِمْ وَلَهْوِهِمْ، فَأَصْبَحُوا قَدْ مُسِخُوا قِرَدَةً وَخَنَازِيرَ. كَذَا رَوَاهُ حَسَّانُ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ مُرْسَلًا، وَرَوَاهُ غَيْرُهُ عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ مُتَّصِلًا۔ (حلیۃ الاولیاء، الطبقۃ الاولی من التابعین، حسان بن ابی سنان)

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: آخری زمانے میں میری امت کے ایک گروہ کی صورت مسخ کر کے انہیں بندر اور خنزیر بنا دیا جائے گا۔ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! کیا وہ اللہ کی وحدانیت اور آپ کی رسالت کی گواہی دینے والے اور روزہ رکھنے والے ہوں گے؟ فرمایا: ہاں! پوچھا گیا: حضور! پھر اس کی وجہ کیا ہوگی؟ فرمایا: وہ آلات موسیقی، مغنیات اور دفوف کے ساتھ شراب نوشی میں مشغول ہوں گے۔ وہ اپنی اسی مے نوشی اور لہو ولعب میں رات گزاریں گے اور صبح ہوتے ہی بندر اور خنزیر کی صورت میں مسخ کر دیے جائیں گے۔ حسان نے ابو ہریرہ سے اسی طرح مرسلا روایت کی ہے، جب کہ دوسروں نے از حسن از ابو ہریرہ متصلاً روایت کی ہے۔

آلات موسیقی کی مذمت میں اسے علامہ ابن حجر مکی نے کف الرعاع میں مسدد اور ابن حبان سے نقل کیا ہے، جب کہ کف الرعاع کے حوالے سے مفتی شفیع دیوبندی نے اسے اسلام اور موسیقی میں نقل کیا ہے۔ اس حدیث میں آلات موسیقی کی حرمت کا پورا سیاق مذکور ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قسم کی محفل میں یہاں آلات موسیقی کا ذکر ہے وہ فسق وفجور کی بدترین مجالس ہیں جہاں شراب وشباب کی جملہ خرمستیاں موجود ہوتی ہیں۔ آلات موسیقی کا کام چوں کہ جذبات کو انگیز کرنا ہے، اس لیے وہ ایسی شہوانی مجلسوں میں یقیناً شہوانی جذبات کو ہی انگیز کریں گے۔ ایسے میں ان کی حرمت میں کسے شک ہوسکتا ہے۔ لیکن اس پورے سیاق کو حذف کر کے اس سے مطلقاً آلات موسیقی کی حرمت پر استدلال کس قسم کی زیادتی بلکہ سادگی ہے، اہل نظر پر مخفی نہیں۔

یہ حدیث ظاہر پرستوں کی جڑ کاٹ دیتی ہے؛ کیوں کہ اس میں دف کی بھی مذمت ہے، جسے وہ جائز کہتے ہیں۔ اسی طرح شوکانی نے نیل الاوطار میں یہ حدیث نقل کی ہے۔ عَنْ عَلِيٍّ أَنَّ النَّبِيَّ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - نَهَى عَنْ ضَرْبِ الدُّفِّ وَالطَّبْلِ وَصَوْتِ الزَّمَّارَةِ۔ حضرت علی سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے

دف، طبل اور بانسری بجانے سے منع فرمایا۔ (باب ماجاء فی آلۃ اللھو)

اہل نظر کے لیے معاملہ بہت سادہ اور آسان ہے کہ اگر آلات موسیقی جائز جذبات کو فروغ دیں تو وہ جائز ہوں گے اور ناجائز جذبات کو انگیز کریں، جیسا کہ ہویٰ پرستوں کی مجالس کا حال ہے، تو ان کا سننا اور بجانا ناجائز ہوگا۔ اس میں دف اور غیر دف کی کوئی تخصیص نہیں۔

نویں حدیث

النَّبِيّ - صَلَّى اللہُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ - قَالَ: اسۡتِمَاعُ الۡمَلَاهِي مَعۡصِيَةٌ وَالۡجُلُوسُ عَلَيۡهَا فِسۡقٌ وَالتَّلَذُّذُ بِهَا كُفۡرٌ (نیل الاوطار، باب ماجاء فی آلۃ اللھو)

پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا: اسباب لہو کا سننا معصیت ہے، وہاں بیٹھنا فسق ہے اور اس سے لطف اندوزی کفر ہے۔

اس حدیث کو بھی بہت سے اہل علم نے آلات موسیقی کی حرمت کے اثبات کے لیے برہان قاطع کے طور پر پیش کیا ہے، جب کہ اس کے اندر آلات موسیقی کا بصراحت ذکر نہیں ہے۔ اس میں ملاہی یعنی اسباب لہو کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آلات موسیقی بھی بعض اوقات اسباب لہو کا کام کرتے ہیں، اس لیے ضمناً ان کا بیان بھی اس میں شامل ہے۔ اس وضاحت کے بعد اب یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کیا ہر لہو اور سبب لہو معصیت ہے؟ اس سے پہلے بارہا لہو کی وضاحت کی جا چکی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ:

۱۔ لہو کبھی مطلقاً تفریح کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ کبھی معصیت اور ترک واجب کے مفہوم کے لیے آتا ہے۔

مذکورہ بالا حدیث کا تیور بتا رہا ہے کہ یہاں ملاہی کا اطلاق دوسرے خصوصی مفہوم میں ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ گناہ کی باتیں سننا سنانا، یقیناً گناہ ہے، ان مجالس میں بیٹھنا فسق ہے اور ان سے لطف اندوزی کرنا یعنی ان کو اچھا سمجھنا کفر ہے۔

یہ ایک واضح اور عام حقیقت ہے، لیکن اس عمومی واضح حقیقت کو صرف آلات موسیقی کے ساتھ جوڑنا، وہ بھی بلا تقیید، حدیث رسول کی غیر ضروری تخصیص بھی ہے اور تعمیم بھی۔ یعنی اسباب لہو کو آلات موسیقی کے ساتھ خاص کرنا اور آلات موسیقی کو لہو حرام کے لیے عام کر دینا، یہ دونوں باتیں علم اور انصاف کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔

مذکورہ حکم، آلات موسیقی کے ساتھ خاص نہیں ہے، نہ آلات موسیقی کے ساتھ بہر صورت مطلقاً ہے۔ اس کا اشارہ کتب فقہ سے بھی ملتا ہے۔ مثلاً اس حدیث کے ذیل میں آلات موسیقی کی حرمت بیان کرتے ہوئے علامہ برہان الدین حنفی (۶۱۶ھ) نے لکھا: قالوا: إلا أن يسمع نفسه فيكون معذوراً۔ بعض فقہا نے کہا کہ اگر صرف خود کو سنائے تو وہ معذور ہوگا، یعنی یہ عمل حرام نہیں ہے۔

پھر اس کے بعد امام ابوحنیفہ کا وہ واقعہ بھی لکھا ہے جس میں آپ ایک ولیمے میں تشریف لے گئے تھے اور وہاں لعب یا غناء تھا۔(۱) گویا ان کے نزدیک ملاہی میں، صرف آلات نغمہ نہیں، نفس نغمہ بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ نغمات کی مطلقاً حرمت کا کوئی قائل نہیں، پھر آلات نغمہ کی مطلقاً تحریم کا قول کیسے کیا جا سکتا ہے؟

حدیث مذکور میں ایک حصہ یہ ہے: والتلذذ بھا کفر۔ اسباب لہو سے لطف اندوزی کفر ہے۔ فقہا نے لکھا ہے کہ یہ بات بطور اظہار شدت ہے، یہ معنی نہیں کہ ایسا شخص سچ مچ کافر ہو جائے گا۔(۲) بعض نے اسے کفران نعمت کے معنی میں لیا ہے۔(۳)

دسویں حدیث

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: بُعِثْتُ بِكَسْرِ الْمَزَامِيرِ، وَأَقْسَمَ رَبِّي لَا يَشْرَبُ عَبْدٌ فِي الدُّنْيَا خَمْرًا إِلَّا سَقَاهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَمِيمًا، مُعَذَّبًا بَعْدُ أَوْ مَغْفُورًا لَهُ، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَسْبُ الْمُغَنِّيَةِ وَالْمُغَنِّي حَرَامٌ، وَكَسْبُ الزَّانِيَةِ سُحْتٌ (کتاب الفوائد (الغیلانیات)، ۱/۱۲۹)

حضرت علی بیان کرتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھے آلات موسیقی توڑنے کے لیے مبعوث کیا گیا۔ میرے رب نے یہ عہد لیا ہے کہ دنیا میں جو بندہ بھی شراب پیے گا اسے قیامت میں کھولتا پانی پلائے گا۔ خواہ بعد میں اس پر عذاب ہوتا رہے یا اس کی بخشش ہو جائے۔ پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مغنی اور مغنیہ کی کمائی حرام ہے اور پیشہ ور عورت کی کمائی حرام ہے۔

اس حدیث کے ابتدائی حصے کو بھی بعض اہل علم آلات موسیقی کی حرمت ثابت کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں، جب کہ آنے والے حصے پر غور کیا جائے تو اس استدلال کا ضعف ظاہر ہو جائے گا۔ یہاں مزامیر کی مذمت کے ساتھ شراب و شباب کا ذکر ہے اور اہل نظر پر مخفی نہیں کہ یہی دونوں باتیں دراصل مزامیر و معازف کی حرمت کا سبب ہیں۔ چنانچہ جن روایتوں میں صرف مزامیر و معازف کا ذکر ہے شراب و شباب کا ذکر نہیں ہے، وہ روایتیں بھی اسی بات پر محمول ہوں گی؛ کیوں کہ ممکن ہے کہ وہاں روایت کا دوسرا حصہ راوی نے ترک کر دیا ہو یا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق ذکر کیا ہو اور مراد مقید ہو، چوں کہ مزامیر و معازف کا متعارف استعمال وہی رہا ہو۔ چنانچہ غنا کی حرمت پر جو روایتیں وارد ہیں، فقہا نے ان کو بھی اسی طرح کی تقیید کے ساتھ سمجھا ہے اور غنائے حسن یا غنائے اسلامی کو جائز قرار دیا ہے۔

گیارہویں حدیث

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: الْجَرَسُ مَزَامِيرُ الشَّيْطَانِ۔ (کتاب

---

(۱) المحیط البرھانی، کتاب الاستحسان و الکراھیة، الفصل الثامن عشر فی الغناء، واللھو، وسائر المعاصی، والامر بالمعروف

(۲) ھذا اخرج علی وجه التشدید لا أنه یکفر۔ (البحر الرائق، کتاب الکراھیة، فصل فی اللبس توسدہ و افتراشه)

(۳) والتلذذ بھا کفر أی بالنعمة۔ (الدر المختار، کتاب الحظر والاباحة، ۱/ ۶۵۲)

اللِّبَاسِ وَ الزِّينَةِ، بَابُ كَرَاهَةِ الْكَلْبِ وَ الْجَرَسِ فِي السَّفَرِ)

اس حدیث کو علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح مسلم میں آلات موسیقی کی حرمت کے ذیل میں نقل کیا ہے اور اس کا حسب ذیل ترجمہ کیا ہے: گھنٹی شیطان کا مزمار (بانسری) ہے۔

جرس کا ترجمہ ''گھنٹی'' اور مزامیر الشیطان کا ترجمہ ''شیطان کا مزمار (بانسری)'' کرنا یہ بتاتا ہے کہ گھنٹی کوئی شیطانی آلہ ہے۔ آج مساجد کی گھڑیوں، مدارس کے گھنٹوں اور علما اور مشائخ کے فون اور موبائل سے مسلسل گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں۔ اگر اس ترجمے اور فکر کو اس کے عموم کے ساتھ قبول کرلیا جائے، جس طرح آلات موسیقی کے محرمین عمومی تحریم کے داعی ہیں تو اس فکر کی ضرب کہاں کہاں پڑے گی، بتانے کی حاجت نہیں۔ مزامیر الشیطان کے ترجمہ ''شیطان کا مزمار (بانسری)'' سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مزمار کا ترجمہ ہر جگہ بانسری کرنا ضروری ہے، جب کہ بانسری مزمار کے معانی میں سے ایک معنی ہے نہ کہ کل معنی۔ اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

اس نص کی حقیقی فقہ کے لیے ضروری ہے کہ ہم جرس کا معنی دیکھیں اور اس کی ممانعت کا پس منظر سامنے رکھیں۔ شارح بخاری علامہ ابوالحسن ابن بطال (۴۴۹ھ) لکھتے ہیں:

الجرس معروف وهو شبه الناقوس الصغير يوضع في أعناق الابل۔ (شرح البخاری لابن بطال: ۱/ ۵۱)

جرس معروف ہے اور یہ چھوٹے ناقوس کے مشابہ ہوتا ہے جسے اونٹوں کی گردنوں میں لٹکایا جاتا ہے۔

امام بخاری اپنی صحیح کے اندر باب ما قيل في الجرس ونحوه في اعناق الابل کے تحت ناقل ہیں:

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ، أَخْبَرَنَا مَالِكٌ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ، عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيمٍ، أَنَّ أَبَا بَشِيرٍ الْأَنْصَارِيَّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَخْبَرَهُ أَنَّهُ كَانَ مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَعْضِ أَسْفَارِهِ، قَالَ عَبْدُ اللهِ: حَسِبْتُ أَنَّهُ قَالَ: وَالنَّاسُ فِي مَبِيتِهِمْ، فَأَرْسَلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَسُولًا أَنْ لَا يَبْقَيَنَّ فِي رَقَبَةِ بَعِيرٍ قِلَادَةٌ مِنْ وَتَرٍ، أَوْ قِلَادَةٌ إِلَّا قُطِعَتْ۔ (بخاری کتاب الجهاد والسير، باب ما قيل في الجرس ونحوه في أعناق الابل)

عبداللہ بن یوسف نے بیان کیا۔ ان سے مالک نے بیان کیا۔ وہ عبداللہ بن ابی بکر سے، وہ عباد بن تمیم سے روایت کرتے ہیں کہ ابوبشیر انصاری رضی اللہ عنہ نے ان کو بتایا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھے گمان ہے کہ انھوں نے یہ کہا۔ لوگ اس وقت سو رہے تھے۔ اس وقت اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کسی فرستادہ کو یہ کہلا بھیجا کہ جس کسی اونٹ کی گردن میں ہار یا تار کا ہار ہو اسے کاٹ کر ہٹا دیا جائے۔

شارح بخاری علامہ ابن بطال فرماتے ہیں:

''امام مالک نے اس حدیث کے بعد مؤطا میں کہا: أرى ذالک من العين۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حکم لوگوں کے اندر بدنظری کے عقیدے کے سبب ہے۔ یہاں اونٹوں کے ہار کو توڑ کر پھینکنے کا جو حکم

ہے، امام مالک نے اس کی وجہ بیان کر دی اور وہ یہ ہے کہ جو شخص اونٹوں کے گلے میں یہ ہار پہناتا، اس کا عقیدہ یہ ہوتا کہ یہ ہار بدنظری کے اثرات کو ختم کر دے گا، گو یا وہ اس بات کا عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ ہار قضا کو ٹال دے گا اور یہ عقیدہ جائز نہیں۔ اسی پس منظر میں مروی ہے کہ جس قافلے میں جرس ہو اس کے ساتھ فرشتے نہیں چلتے۔ (شرح صحیح البخاری کتاب الجہاد، باب ما قیل فی الجرس فی أعناق الابل)

جرس اور مزامیر کے اس پس منظر کو نظر انداز کر کے بہت سے اہل علم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ مولانا ارشاد الحق اثری جرس سے متعلق بعض دوسری روایتیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گھنٹی اور گھنگرو شیطان کا ساز ہے اور جہاں بھی ان کا استعمال ہو وہاں اللہ تعالیٰ کے فرشتے نہیں آتے۔ یہ قافلے میں جانوروں کے گلے میں ہوں یا کسی انسان کے گلے یا پاؤں میں ہوں، ان کا استعمال بہر حال ناجائز ہے۔ (اسلام اور موسیقی، شبہات ومغالطات کا ازالہ، ص: ۱۱۴)

اس ''بہر حال'' کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ مولانا اثری کے گھر میں گھڑی، موبائل، فون وغیرہ ضروری اشیا ہیں یا نہیں اور ہیں تو ان میں گھنٹیاں بجتی ہیں یا نہیں اور بجتی ہیں تو ان کا یہ بجنا جائز ہے یا ''بہر حال'' ناجائز ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ مولانا کے گھر میں لیپ ٹاپ، کمپیوٹر اور ٹیلی ویژن ہے یا نہیں اور ان کے کھلنے اور بند ہونے میں جو گھنٹیاں بجتی ہیں وہ ''بہر حال ناجائز'' ہیں یا بعض احوال میں جائز بھی ہیں؟

اپنے موقف کے اثبات میں اثری صاحب نے بعض آثار پیش کیے ہیں جن میں ایک روایت کی انہوں نے تصحیح کی ہے جس میں سیدہ عائشہ نے یہ کہہ کر ایک لونڈی کے گھنگھرو تُڑوا دیے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس گھر میں جرس ہوں اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عمر سے بھی نقل کیا ہے۔

علیها جلاجل کا ترجمہ اثری صاحب نے ''پاؤں میں گھنگرو'' کیا ہے۔ اثری صاحب کے اس فہم کو درست مانا جائے تو بہت ممکن ہے کہ یہ وہ گھنگھرو ہوں گے جن کو پہن کر رقاصائیں رقص کرتی تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خود کبھی اس پیشے سے وابستہ رہی ہو یا کم از کم اس سے پیشہ ور مغنیات سے مشابہت پیدا ہو رہی تھی اس لیے سیدہ عائشہ نے وہ گھنگھرو توڑ وا دیے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے گھنگھرو عورتوں کی طرف مردوں کی توجہات کشید کرتے ہوں، جس کی وجہ سے منع فرما دیا ہو۔ اسی طرح جرس کی ممانعت بھی خاص سیاق میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہوگی، جیسا کہ اوپر علامہ ابن بطال کی تشریح سے واضح ہوا اور اس وجہ سے بھی کہ جرس کی بالذات حرمت نا قابل فہم ہے اور اس پر موجودہ عہد میں عمل کرنا ناممکنات سے ہے۔

جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے اس ممانعت کی ایک وجہ جہادی حکمت بھی بتائی ہے کہ گھنگھرو بجنے سے دشمنوں کو پتہ چل جانے کا اندیشہ تھا، ممکن ہے اسی وجہ سے جرس کی ممانعت آئی ہو۔ یہ توضیح دراصل امام محمد شیبانی

کی ہے جسے انہوں نے موطا میں پیش کیا ہے۔(۱) لیکن مولانا ارشاد الحق صاحب نے اس احتمال کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ احادیث میں اس کی وجہ فرشتوں کی عدم مصاحبت (**لا تصحبها الملائكة**) کی صراحت موجود ہے، اس لیے غامدی صاحب کی تاویل درست نہیں۔ (اسلام اور موسیقی، شبہات ومغالطات کا ازالہ، ص:۱۱۵)

میں کہتا ہوں کہ شکست و ہزیمت اور ملائکہ کی فتح وظفر کی عدم مصاحبت دونوں باتوں میں تضاد کیا ہے؟ غور کیجیے تو دونوں باتوں میں گہرا ربط ملے گا، بلکہ دونوں باتیں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

غامدی صاحب نے **الجرس مزامير الشيطان** (جرس شیطان کے باجے ہیں) کو مبالغے کے باب سے لیا ہے۔ چوں کہ جرس کی آواز ذکر وفکر سے مانع ہوتی ہے، اس لیے از راہ مبالغہ اس خصوصی سیاق میں اسے **مزامیر الشیطان** فرما دیا گیا۔

غامدی صاحب اس کی نظیر اس حدیث کو قرار دیتے ہیں جس میں حمام کو شیطان کا گھر، بازار کو اس کی مجلس، شعر کو اس کا قرآن اور عورتوں کو اس کا جال کہا گیا ہے۔ حالاں کہ حقیقت کے اعتبار سے نہ حمام شیطان کا گھر ہے، نہ بازار اس کی مجلس ہے، نہ شعر اس کا قرآن ہے اور نہ عورتیں اس کا جال ہیں۔

ارشاد الحق صاحب نے اس روایت پر مختلف طریقے سے کلام کیا ہے اور پھر آخر میں بر تقدیر تسلیم کہا ہے کہ اس حدیث میں مبالغہ کیا ہے، مثلاً حمام میں زمانۂ جاہلیت میں اور آج بھی فائیو اسٹار ہوٹلوں میں مرد اور عورتیں ننگے نہاتے ہیں، لہٰذا حمام شیطان کا گھر ہوئے یا نہیں؟ (اسلام اور موسیقی، شبہات ومغالطات کا ازالہ، ص:۱۲۱)

اثری صاحب سے پوچھنا یہ ہے کہ ہم اگر ان کی توجیہ کو تسلیم کر لیں تو کیا اب اس کے بعد حمام کا شیطان کا گھر ہونا اور امر حرام ہونا، مطلق رہے گا یا مقید اور **الحمام بيت الشيطان** پر وہ جو حکم مرتب کریں گے۔ مطلق یا مقید۔ کیا وہی حکم **الجرس مزامير الشيطان** پر مرتب فرمائیں گے؟

واضح رہے کہ اثری صاحب نے یہاں ''اپنے طور پر اس صحیح روایت'' کو بھی نقل کیا ہے: **الحمام حرام على نساء أمتي**۔(۲) حمام میری امت کی عورتوں پر حرام ہے۔ اب ان کو چاہیے کہ حمام اور مزامیر دونوں تعلق سے ایک ہی طرح کی توجیہ وتاویل کریں اور ایک ہی طرح کا موقف رکھیں۔

بارہویں حدیث

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ، عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَبِيعُوا الْقَيْنَاتِ، وَلَا تَشْتَرُوهُنَّ، وَلَا تُعَلِّمُوهُنَّ، وَلَا خَيْرَ فِي تِجَارَةٍ فِيهِنَّ، وَثَمَنُهُنَّ حَرَامٌ، فِي مِثْلِ هَذَا أُنْزِلَتْ هَذِهِ الآيَةُ: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ۔ (سنن ترمذی، ابواب البیوع، باب ماجاء فی کراھیۃ بیع المغنیات)

---

(۱) باب التصاویر والجرس وما یکرہ منہا۔

(۲) مستدرک، كِتَابُ الْأَدَبِ

یہ حدیث غنا سے متعلق ہے، آلات غنا سے اس کا کوئی ظاہری تعلق ہے ہی نہیں، لیکن اس کے باوجود علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح مسلم جلد دوم، ص: ۲۷۷ پر اسے ''احادیث اور آثار سے آلات غنا کی حرمت'' کے ذیل میں نقل کیا ہے اور غنا کے ''اپنے ترجمے'' کے ذریعے اس حدیث کا آلات موسیقی سے تعلق قائم کیا ہے۔ ان کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

''حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گانے بجانے والی لونڈیوں کی خرید وفروخت نہ کرو، نہ انہیں (گانا بجانا) سکھاؤ، نہ اس کی تجارت میں خیر ہے اور ان کی قیمت حرام ہے۔ اور اسی کی مثل میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡتَرِىۡ لَهۡوَ الۡحَدِيۡثِ لِيُضِلَّ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ''۔

۱- غور کیجیے! یہاں مغنیات کی بیع وشرا اور ان کی تعلیم کا ذکر ہے۔ مغنیات گانے والیوں کو کہتے ہیں اور ان کی تعلیم گانے کی تعلیم ہوگی۔ لیکن گانے کے ساتھ علامہ صاحب نے ''بجانا'' کو بھی مقدر مان لیا اور اس طرح اس کا آلات موسیقی سے تعلق قائم کر دیا۔

۲- اگر مغنی صرف گانے والے کو نہیں بلکہ گانے اور بجانے والے کو کہا جاتا ہے، جیسا کہ اس ترجمے سے اشارہ ملتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ غنا کا لفظ جہاں جہاں وارد ہے اس کا معنی ''گانا اور بجانا'' ہے۔ پھر اگر ان نصوص کی بنیاد پر ''بجانے'' کو مطلقاً حرام کہنا درست ہو تو ''گانے'' کی مطلقاً تحریم سے کون سی شے مانع ہے؟

۳- یہ حضرات فرمائیں گے کہ ہاں! گانا منع ہے اور اس پر بے شمار نصوص شاہد ہیں، لیکن یہ تحریم مطلقاً گانے کی نہیں، مقید گانے کی ہے۔ عرض ہے کہ اگر ''گانے'' کو مطلق گانے پر محمول نہ کر کے مقید گانے پر محمول کرنا ضروری ہوا تو ''بجانے'' کو مطلق بجانے پر محمول کرنے کے بجائے ''مقید بجانے'' پر محمول کرنے میں قیامت کیوں ٹوٹ پڑتی ہے؟ آخر جو دلیل گانے کی تخصیص کی مقتضی ہے وہی دلیل بجانے کی تخصیص کی مقتضی کیوں نہیں ہے؟ جب کہ غنا اور آلات غنا سب کی ممانعت و مذمت میں یکساں نصوص موجود ہیں۔

تیرہویں حدیث

صَوتَانِ مَلعُونَانِ فِی الدُنیا و الآخِرَةِ: مِزمارٌ عِندَنِعمَةٍ وَرَنَّةٌ عِندَ مُصِیبَةٍ (مسند البزار، مسند ابی حمزة انس ابن مالک)

دو آوازیں دنیا اور آخرت میں ملعون ہیں، نعمت کے وقت ساز اور مصیبت کے وقت چیخ و پکار۔

آلات موسیقی کی مطلقاً تحریم کرنے والے اس حدیث کو بھی اپنے موقف کے اثبات میں پیش کرتے ہیں۔ اس کو نقل کرنے کے بعد مولانا ارشاد الحق اثری لکھتے ہیں:

''یہ روایت امام بزار نے اپنی مسند میں ذکر کی ہے، جیسا کہ کشف الاستار [ج:۱،ص:۳۷۷] میں ہے۔

علامہ المنذری نے الترغیب [ج:۴،ص:۳۵۰] اور علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد [ج:۱،ص:۳۷۷] میں فرمایا ہے: **رجاله ثقات** کہ اس کے راوی ثقہ ہیں ۔علامہ البانی نے تحریم آلات الطرب [ص: ۵۱-۵۲] میں کہا ہے کہ امام ابن السماک نے بھی یہ روایت ایک اور سند سے بیان کی ہے اور مجموعی طور پر یہ حدیث صحیح ہے۔ (اسلام اور موسیقی ،شبہات ومغالطات کا ازالہ،ص:۹۷)

مولانا اثری کے دلائل کے پیش نظر اگر اس حدیث کی صحت وسند کو تسلیم کرلیا جائے تو بھی کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ مصیبت کے وقت مطلقاً رونا بھی قابل لعنت امر ہے؟ ایسا ماننے پر اس کی ضرب کہاں کہاں پڑے گی، کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟

علما کہیں گے کہ میت ومصیبت پر مطلقاً رونا یہ امر ملعون نہیں، بلکہ جو رونا مصنوعی نوحہ کے طور پر ہو، جس کے لیے کوئی گریباں چاک کرے یا بھاڑے پر نوحہ کرنے والیوں سے نوحہ کرائے تو ایسا نوحہ ملعون ہے۔ یقیناً یہی معاملہ **مزمار عند نعمة** کا بھی ہے۔خوشی کے وقت مطلقاً ساز حرام نہیں ہوسکتا، جب تک اس کے ساتھ شراب و شباب کا آمیزہ نہ ہو۔ جو رسول شادی کے مواقع پر خود دف بجانے کا حکم دے رہے ہوں، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ شادی وخوشی کے وقت مطلقاً مزمار اور آلات موسیقی کو ملعون قرار دے دیں؟

چودہویں حدیث

عن ابن عباس رضی اللہ عنه أنه قال : الدُفُّ حَرامٌ ، وَالكُوبَةُ حَرامٌ وَالمِزمَارُ حَرامٌ۔(السنن الصغیر للبیهقی، کتاب الشهادات، باب من تجوز شهادته ومن لا تجوز)

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے۔فرماتے ہیں: دف حرام ہے، طبل حرام ہے اور بانسری حرام ہے۔

مولانا جعفر پھلواروی لکھتے ہیں:

”اسی طرح کی ایک روایت **عقود الجواهر المنیفة**، جلد ۲،ص:۱۲۱ میں **أبو حنیفة عن مسلم بن عمران عن سعید بن جبیر عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیه وسلم** یہ روایت ہے:

اِن اللہَ کَرِہَ لَکُم الخَمرَ وَالمَیسِرَ وَالمِزمَارَ وَالکُوبَۃَ وَالدُّفَ۔

اللہ نے تمہارے لیے شراب، جوا، باجا، نرد (یا شطرنج) اور دف سب کو مکروہ (تحریمی) قرار دیا ہے۔

ہم ان دونوں روایتوں کے متعلق صرف اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں:

(الف) اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو ان روایات کی کیا توجیہ کی جائے گی جن سے خود حضور کا متعدد بار دف سننا ثابت ہے؟

(ب) اور اس حدیث کو کدھر لے جایا جائے گا جس میں حضور نے فرمایا ہے: **أَعلِنُوا النِّکاحَ بِالدُّفوفِ** (دف بجا کر نکاح کا اعلان کیا کرو۔) اور **فصل بین الحلال والحرام الدف**

والصوت (حرام وحلال نکاح میں فرق کرنے والی چیز دف ہے اور گانا ہے۔)

(ج) اور ان بے شمار صحابہ، تابعین، تبع تابعین، مجتہدین، ائمہ، علماء، صلحاء، قضاۃ، صوفیہ، عرفاء کے متعلق کیا حکم لگایا جائے گا جن سے دف اور غنا بلکہ دوسرے معازف ومزامیر کا سننا بتواتر ثابت ہے۔'' (اسلام اور موسیقی، پھلواروی، ص:۲۰۱)

تبصرہ

آلات موسیقی کی حرمت میں پیش کی جانے والی یہ نسبتاً مشہور اور قوی روایتیں ہیں، جنہیں موسیقی اور آلات موسیقی کی حرمت کے قائلین بالعموم پیش کرتے ہیں۔ ان کے حوالے سے ہر ایک کے ذیل میں تفصیلی بحث و نظر ہو چکی۔ اب یہاں بعض اہل نظر کے اقوال نقل کرتے ہیں جو آلات موسیقی کے اثبات میں پیش کی جانے والی روایتوں سے متعلق ہیں:

● علامہ ابن حزم نے اس باب کی تمام روایتوں کو غیر صحیح بلکہ موضوع کہا ہے۔[۱] لیکن اس بات میں کس قدر تفریط ہے، یہ محتاج بیان نہیں ہے۔

● علامہ محمد ابن طاہر مقدسی ابن القیسرانی کا کہنا ہے کہ محرمین کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہویٰ پرستی میں مبتلا ہیں، اس لیے وہ صرف ایک قسم کی روایتیں ہی نقل کرتے ہیں اور جو روایتیں جواز واباحت ثابت کرتی ہیں، ان سے صرف نظر کر جاتے ہیں، جب کہ حضرت وکیع فرماتے ہیں: **أهل العلم يكتبون مالهم وماعليهم، وأهل الأهواء لايكتبون الا مالهم۔** اہل علم تمام باتیں نقل کرتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ ان کے حق میں ہوں یا ان کے خلاف ہوں، لیکن اہل ہویٰ صرف اپنے کام کی باتیں نقل کرتے ہیں۔ (کتاب السماع، ۴۷)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''ان روایات اور اس طرح کی دوسری روایات کی بنا پر سماع کا انکار کیا گیا ہے جو کہ فن حدیث سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جب یہ کسی کتاب میں اپنے حق میں کوئی حدیث دیکھتے ہیں تو اس کو مذہب بنا لیتے ہیں اور اس حدیث کی وجہ سے اپنے مخالفین پر اعتراض کرتے ہیں اور یہ ایک بڑی غلطی بلکہ عظیم جہالت ہے۔'' (کتاب السماع، ۸۹)

● علامہ عبدالغنی نابلسی فرماتے ہیں:

''اگر ان نصوص کی بنیاد پر ہم حرمت کا حکم لگائیں تو قیاس یہ کہتا ہے کہ پھر تو ہنسنا اور رونا بھی حرام ہو۔ اسی طرح حضرت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور کے پیش نظر قیاس کے مطابق شرم گاہ کو دائیں ہاتھ سے چھونا بھی حرام ہو۔ اگر مذکورہ بالا تمام احادیث میں حرمت کو مطلق رکھیں تو یہ لازم

---

[۱] الغناء الملهي، أمباح هو أم محظور

آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام امور کیے، ان کا حکم دیا اور حرام فعل سے راضی رہے۔ پس جو کوئی بھی اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا گمان رکھے تو وہ شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔'' (ایضاح الدلالات،ص:۱۱۵،اردو)

● قاضی شوکانی نے لکھا:

''معازف اور دیگر آلات کی حرمت میں بڑی کثرت سے حدیثیں مروی ہیں، لیکن ان سب پر ائمۂ حدیث نے کلام کیا ہے اور بعض نے تو ان کے موضوع ہونے کا قول کیا ہے اور ہم نے جو روایات یہاں نقل کی ہیں وہ اس باب کی اصح ترین روایات ہیں۔ (اور قاضی شوکانی نے ان تمام روایتوں پر کلام کیا ہے۔ مصباحی) (ابطال دعوی الاجماع، مشمولہ الفتح الربانی ص:۵۲۲۲)

● قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں:

''عبدالرحیم عراقی گفتہ کہ ایں ہمہ احادیث ضعیف اند۔ (رسالہ سماع،ص:۷)

عبدالرحیم عراقی نے کہا کہ یہ تمام حدیثیں ضعیف ہیں۔

● مفتی محمد شفیع دیوبندی نغمہ اور آلات نغمہ کی حرمت پر ۳۰/احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ تیس حدیثیں ہیں جن کی اسنادی حیثیت مختلف ہیں۔ بعض صحیح ہیں، بعض حسن ہیں اور بعض ضعیف۔ پھر ان احادیث میں جس اطلاق اور عموم کے ساتھ گانے یا باجے کو حرام قرار دیا گیا ہے، ان کو سننے کے بعد میرے خیال میں کوئی مسلمان بھی ان چیزوں کے ناجائز ہونے میں شک نہیں کر سکتا۔'' (اسلام اور موسیقی،ص:۱۵۶)

● مفتی شفیع کے برخلاف مولانا جعفر پھلواروی لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ یہ روایات اگر صحیح ہیں تو ان کا مقصد وہی مجموعی شکل وصورت ہے جہاں زنا، شراب اور جوئے وغیرہ کے ساتھ گانا بجانا اور ناچ رنگ بھی ہوتا ہے، جس کی تشریح ہم اوپر کر آئے ہیں، ورنہ ان تمام روایات کا شمار ان ہی کی احادیث میں ہے جن کو ابن حزم، شوکانی، شیخ عبدالحق، محمد بن طاہر مقدسی، عبدالغنی، ابن عبدالبر، کمال الدین ادفوی، نووی، ابوبکر بن العربی، نواب صدیق حسن خان اور بے شمار محدثین، ضعیف، منکر یا موضوع کہتے ہیں۔ (اسلام اور موسیقی،ص:۲۰۲)

● لیکن ماضی قریب کے معروف سلفی محدث شیخ ناصرالدین البانی اس باب کی بیشتر احادیث کے متن و سند پر تفصیلی نقد و جرح اور تحقیق و ترجیح کے بعد لکھتے ہیں:

اعلم أخي المسلم أن الأحاديث الواردة في ذلك كثيرة جدا فقد جاوز عددها العشرة عند ابن حزم وابن القيم فهي من الكثرة أن مجموعها يدل الواقف عليها على أن

مضمونها الذي اتفقت عليه متونها وهو التحريم ثابت عنه صلى الله عليه وسلم يقينا حتى ولو فرض أن إسناد كل فرد منها معلول كما زعم ابن حزم وذلك بحكم القاعدة المتفق عليها عند المحدثين والعلماء: أن الحديث الضعيف يتقوى بكثرة الطرق كما هو مفصل في علم مصطلح الحديث۔ (تحریم آلات الطرب، ص: ۲۶)

برادر مسلم! یہ جان لو کہ اس سلسلے میں کثیر احادیث وارد ہیں۔ ابن حزم اور ابن قیم کے نزدیک ان کی تعداد دس سے متجاوز ہے۔ یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ ان کی مجموعی تعداد ان سے واقف شخص کو اس بات سے مطلع کرتی ہے کہ جس مضمون پر یہ تمام متون متفق ہیں یعنی تحریم وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یقینی طور پر ثابت ہے، خواہ یہ بات ہی کیوں نہ فرض کر لی جائے کہ ان سب کی سند انفرادی طور پر ضعیف ہے، جیسا کہ ابن حزم کا خیال ہے۔ چوں کہ محدثین اور اہل علم کے یہاں یہ ایک متفق علیہ قاعدہ ہے کہ حدیث ضعیف کثرت طرق سے قوی ہوجاتی ہے، جیسا کہ علم مصطلح الحدیث کے اندر یہ بات مفصل و مشرح ہے۔

● شیخ البانی کے برخلاف معروف معاصر سلفی اسکالر علامہ یوسف القرضاوی اس باب کی احادیث پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں:

خلاصہ یہ کہ حرمت کے قائلین جن نصوص سے اپنے موقف پر استدلال کرتے ہیں، اگر وہ صحیح ہیں تو صریح نہیں ہیں اور صریح ہیں تو صحیح نہیں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں جو حرمت کے لیے دلیل بننے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ان تمام احادیث کو ظاہری، مالکی، حنبلی اور شافعی علما کی ایک جماعت نے ضعیف قرار دیا ہے۔ قاضی ابوبکر ابن العربی نے کتاب الاحکام میں کہا کہ تحریم کے حوالے سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں۔ یہی بات غزالی نے اور عمدہ میں نحوی نے کہی ہے۔ ابن طاہر مقدسی نے کتاب السماع میں لکھا ہے کہ کوئی ایک حرف بھی اس حوالے سے صحیح نہیں۔ ابن حزم نے کہا کہ اس باب کی کوئی حدیث صحیح نہیں، بلکہ سب کی سب موضوع ہیں۔ بخدا اگر وہ سب یا ان میں سے ایک یا چند احادیث ثقہ راویوں کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک مروی ہوتیں تو ہمیں ان پر عمل کرنے میں کوئی تردد نہیں ہوتا۔ (الاسلام والفن، ص: ۲۲)

واضح رہے کہ بالفرض اگر ہم ایک طرف سے سب کی باتیں رد کر کے شیخ البانی کی باتیں ہی بر سبیل تنزل تسلیم کرلیں تب بھی یہاں چند سوالات باقی رہیں گے:

۱- آلات موسیقی کی یہ حرمت لذاتہ ہے یا لغیرہ؟

۲- آلات موسیقی کی یہ حرمت مطلق ہے یا مقید؟

۳- جونصوص صحیحہ آلات موسیقی کے وجود واثبات اور تحسین کوثابت کرتے ہیں، ان کے ساتھ ان تحریمی نصوص کی تطبیق وتوفیق کی صورت کیا ہے؟ صرف ممانعت کی احادیث لینا اور جواز واثبات کی احادیث سے صرف نظر کرلینا اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَ تَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ (بقرۃ:۸۵)(۱) کا مصداق بننا نہیں ہے؟

مجوزین آلات سماع کا احادیث کریمہ سے استدلال

اب اس کے بعد جواز آلات سماع پر بھی چند احادیث سرسری طور سے دیکھتے ہیں۔ حدیث مزمار، حدیث جاریتان اور سیرت کے دیگر واقعات سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آلات نغمہ کا ثبوت شہرت وتواتر کے درجے پر پہنچا ہوا ہے۔ اس سلسلے کی چند روایات ملاحظہ کیجیے:

پہلی حدیث

عن عُروةَ عن عائشةَ قالتْ: دخلَ عليَّ رسولُ الله - صلى الله عليه وسلم - وعِندي جاريتانِ [مِن جَواري الأَنصارِ (وفي روايةٍ: قَينتان) [في أيام مِنى، تُدَفِّفان وتَضربانِ]، تُغنِّيانِ بغناءِ (وفي روايةٍ: بما تقاوَلَت (وفي أخرى: تَقاذَفَتِ) الأَنصارُ يوم) بُعاث [وليستا بمغنِّيَتَيْنِ]، فاضطَجعَ على الفِراشِ، وحوَّلَ وَجهَهُ، ودخلَ أبو بكرٍ [والنبيُّ - صلى الله عليه وسلم - متَغَشٍّ بثوبهِ]، فانتهرَني (وفي روايةٍ: فانتهرهما) وقالَ: مِزْمارَةُ (وفي رواية: مزمارُ) الشيطانِ عندَ (وفي روايةٍ: أمزاميرُ الشيطان في بيت) رسولِ الله - صلى الله عليه وسلم - [مرتين]؟! فأَقبلَ عليهِ رسولُ الله - صلى الله عليه وسلم - (وفي روايةٍ]: فكشف النبيُّ - صلى الله عليه وسلم - عن وجهه)، فقالَ: دعْهُما [يا أبا بكرٍ! [فـ] إنَّ لكلِّ قوْمٍ عيداً، وهذا عيدُنا] ". فلمّا غفَلَ غمَزْتُهُما فخرَجتا. (۲)

حضرت عروہ سے روایت ہے، وہ سیدہ عائشہ سے نقل کرتے ہیں۔ سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ میرے گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت میرے پاس انصار کی دو لڑکیاں تھیں۔ [ایک روایت میں قینتان (باندیاں/گانے والیاں) وارد ہے۔] یہ منیٰ کے ایام تھے۔ یہ دونوں لڑکیاں دف بجا رہی تھیں اور یوم بعاث کے گیت گا رہی تھیں۔ [اور دونوں پیشہ ور مغنیہ نہیں تھیں] حضور ﷺ بستر پر لیٹ گئے اور اپنے چہرے پر چادر ڈال لی۔ پھر ابوبکر داخل ہوئے [اس وقت حضور اپنا چہرہ ڈھکے ہوئے تھے۔] انھوں نے مجھے ڈانٹا (اور ایک روایت میں یہ ہے کہ انھوں نے ان دونوں لڑکیوں کو ڈانٹا۔) اور کہا: کیا اللہ کے رسول ﷺ کے قریب (ان کے گھر میں) شیطانی مزامیر؟ [یہ بات آپ نے دومرتبہ فرمائی۔] پھر ان کی طرف اللہ کے رسول ﷺ متوجہ

---

(۱) کیا کتاب کے بعض حصے پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟

(۲) مختصر صحیح البخاری للالبانی، یہاں پر شیخ البانی نے بخاری میں مذکور مختلف مقامات پر وارد احادیث کے مختلف کلمات کو اکٹھا کرلیا ہے۔ (کتاب العیدین، باب الحِرابِ والدَّرَقِ یومَ العیدِ)

ہوئے (اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا) اور فرمایا: ابوبکر! ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ہر قوم کی عید ہوا کرتی ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے۔ پھر جب ابوبکر کی توجہ ہٹی، میں نے کنکھیوں سے اشارہ کر دیا اور وہ دونوں لڑکیاں نکل گئیں۔

علامہ ابن حزم فرماتے ہیں:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کی یہ بات سنی کہ کیا رسول اللہ کے گھر میں شیطان کی آواز؟ تو آپ نے ان کی بات کو ناپسند فرمایا، ان دوشیزاؤں کے نغمہ کو ناپسند نہیں فرمایا۔ یہ وہ حجت ہے جس سے کسی کو مفر نہیں اور سوائے تسلیم کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ (الغناء الملهي أمباح هو أم محظور)

علامہ ابن حزم کے اس استدلال کو رد کرتے ہوئے شیخ البانی لکھتے ہیں:

اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کے مذکورہ قول کو ناپسند فرمایا، بلکہ انہوں نے جوان لڑکیوں کے عمل کا انکار فرمایا تھا حضور نے اس انکار کا انکار فرمایا۔ گویا حضور نے یہ فرمایا: اے ابوبکر! تم نے اصولی اعتبار سے بات درست کہی ہے، لیکن اس کے باوجود ان لڑکیوں کے اس عمل پر اس اصول کے انطباق میں خطا کر گئے ہو، کیوں کہ آج تو عید کا دن ہے۔ [جو حرمت مزامیر کے عام احکام سے مستثنیٰ ہے۔ مصباحی] (تحریم آلات الطرب، ص:۱۰۸)

ان فقہا کے کمال فن کاری پر داد دینے کو جی چاہتا ہے جو اس روایت سے بھی آلات موسیقی کی حرمت ثابت کر دیتے ہیں۔ انہیں صحابیِ رسول کا قول **مزمارة الشيطان عند رسول الله** ﷺ نظر آتا ہے، لیکن صاحب شرع رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس قول کی تردید نظر نہیں آتی۔

علامہ ابن حجر مکی نے دف کے سلسلے میں تین مذاہب نقل کیے ہیں:

(۱) مباح بلا کراہت اور ترک اولیٰ۔

(۲) شادی اور عید کے مواقع پر مباح، ان کے ماسوا مواقع پر حرام۔

(۳) عام حالات میں مباح اور مذکورہ دو مواقع پر مستحب۔

ان میں دوسرے مذہب کی دلیل کے حوالے سے لکھا کہ شادی اور عید کے دن جو دف بجانے کا حکم ہے وہ برائے اباحت ہے؛ کیوں کہ دف کے اندر بھی اصل حرمت ہی ہے؛ کیوں کہ وہ بھی من جملہ لہو محظور کے قبیل سے ہے، جیسا کہ بہت سے لوگ اسی طرف گئے ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ حضرت صدیق اکبر سے منقول ہے کہ انہوں نے سرکار کی موجودگی میں **مزمور الشيطان** کہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار نہیں فرمایا۔ (کف الرعاع، ص:۵۷)

حضرت مرشد گرامی فرماتے ہیں کہ دراصل حضرت ابوبکر نے یہ بات اس لیے کہی کہ انہوں نے دیکھا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم منہ پر کپڑا ڈالے آرام فرما رہے ہیں اور یہ دوشیزائیں اپنے گانے بجانے سے سرور دو عالم صلی

اللہ علیہ وسلم کی راحت میں خلل انداز ہورہی ہیں اور رسول اللہ کے آرام میں خلل ڈالنا یقیناً ایک شیطانی عمل ہے۔ حالت بیداری میں جہاں لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ کا حکم ہو، حالت خواب میں وہاں گانا بجانا کیوں کر شیطانی عمل نہیں ہوگا؟ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ابوبکر کو منع کرنا دراصل اس بات کا اظہار ہے کہ ابوبکر! تم پریشان خاطر نہ ہو، میں سو نہیں رہا، بلکہ میں تو سن رہا ہوں اور آج عید کا دن ہے اور عید کے دن اس قدر تفریح طبع ضروری ہے۔

بخاری کی ایک روایت میں **تُدَفِّفان و تَضربانِ** ہے۔ (۱) اسی طرح مسند اسحق بن راھویہ کے اندر **وتضربان بدفين** آیا ہے۔ (۲) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوشیزائیں دف بجارہی تھیں۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے بعض فقہا یہ کہتے ہیں کہ شریعت میں دف کا بجانا جائز ہے اور دیگر آلات موسیقی ناجائز ہیں۔ یہ ایک انتہائی غیر معقول بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ آلات موسیقی کی آواز اگر حرام ہے تو ہر قسم کے آلۂ موسیقی کی آواز حرام ہونی چاہیے۔ اس میں دف کا استثنا ایک غیر معقول خیال ہے۔ دف میں ایک طرف کھال ہوتی ہے، دوسری طرف خالی ہوتا ہے، جب کہ ڈھول میں دونوں طرف کھال ہوتی ہے۔ یہ بات کس پرلے درجے کی نامعقولیت پر مبنی ہے کہ ایک طرف کھال لگی تو جائز اور دونوں طرف لگ گئی تو ناجائز۔

اس پر کچھ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ دف کے اندر موسیقانہ موزونیت نہیں ہوتی، بعض اس پر یہ بھی شرط لگاتے ہیں کہ دف بھی جب جائز ہے جب سر اور تال کے بغیر بجایا جائے۔ بعض ایک شرط کا مزید اضافہ کرتے ہیں کہ اس میں گھنگرو نہ ہوں۔ بعض اس سے آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ صرف عورتوں کا بجانا جائز ہے۔ کچھ عورتوں میں بھی باندیوں اور بچیوں کی تخصیص کرتے ہیں۔ یہ ساری باتیں نامعقولیت میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ دف میں موسیقانہ موزونیت نہیں ہوتی، یہ خیال موسیقیت سے کلی ناآشنائی پر مبنی ہے اور سر اور تال کے بغیر ڈھب ڈھب بجانے کی بات انسانی واسلامی جمالیات پسندی سے دشمنی اور ناموزونی طبع کی دلیل ہے اور گھنگھرو نہ ہونے کی قید بھی ایک لغو قید ہے۔ اگر یہ **الجرس مزامير الشيطان** پر مبنی ہے، تو اس حدیث پاک کی صحیح تفہیم ماسبق میں گزر چکی۔ عورتوں کے ساتھ تخصیص اور مردوں کے لیے تحریم کی بات بھی غیر ضروری شدت پسندی پر مبنی ہے۔ آگے حدیث نمبر ۷ ملاحظہ کیجیے جس میں اس کے نسبت مَردوں کی طرف ہے۔ اسی طرح عورتوں میں آزاد اور باندیوں کی تفریق یا عورتوں اور بچیوں کی تفریق بھی ایک لغو اور غیر معقول بات ہے، اِلّا یہ کہ اس قسم کی تخصیصات بعض علاقوں میں عرفی شرافت پر مبنی ہوں، لیکن اس وقت ان کی شرعی حتمیت ناقابل قبول ہوگی۔ بعض یہ عذر لنگ لاتے ہیں کہ چوں کہ مزامیر و معازف کی حرمت وشناعت احادیث کریمہ میں منقول ہے اور دوسری طرف دف کا سننا بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ دف کا حکم مستثنیٰ ہے۔ اس پر عرض ہے کہ یہ استثنائی خیال اس وقت رد ہوجاتا ہے جب ہم دیکھتے

---

(۱) ابواب العیدین، اذا فاتہ العید یصلی رکعتین وکذالک النساء

(۲) ما یروی عن عروۃ ابن زبیر عن خالتہ

ہیں کہ متعدد روایات میں دف کی ممانعت وشناعت مذکور ہے، جن میں سے چند یہاں بھی ملاحظہ کیجیے:

۱ -تَبِيتُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي عَلَى أَكْلٍ وَشُرْبٍ وَلَهْوٍ وَلَعِبٍ، ثُمَّ يُصْبِحُونَ قِرَدَةً وَخَنَازِيرَ، وَيُبْعَثُ عَلَى أَحْيَاءٍ مِنْ أَحْيَائِهِمْ رِيحٌ فَتَنْسِفُهُمْ، كَمَا نَسَفَتْ مَنْ كَانَ قَبْلَهُمْ بِاسْتِحْلَالِهِمُ الْخُمُورَ وَضَرْبِهِمْ بِالدُّفُوفِ، وَاتِّخَاذِهِمُ الْقَيْنَاتِ (مسند احمد، تتمۃ مسند الانصار، حدیث ابو امامۃ الباھلی)

میری امت کا ایک گروہ شراب و کباب اور لہو ولعب کے ساتھ رات گزارے گا اور صبح ہوتے ہی انہیں بندر اور خنزیر کی صورت میں مسخ کر دیا جائے گا۔ ان کے بعض علاقوں میں تباہ کن آندھی چلے گی جو انہیں ہلاک کر دے گی جیسے ان سے پہلوں کو اس نے ہلاک کر دیا۔ وجہ یہ ہو گی کہ وہ شراب کو حلال سمجھیں گے، دف بجائیں گے اور اپنی محفل میں مغنیات رکھیں گے۔

۲ -عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ دَخَلَ عَلَيْهَا فِي أَيَّامِ التَّشْرِيقِ وَعِنْدَهَا جَارِيَتَانِ تُغَنِّيَانِ، وَتَضْرِبَانِ بِالدُّفِّ، فَسَبَّهُمَا، وَخَرَقَ دُفَّيْهِمَا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "دَعْهُمَا فَإِنَّهَا أَيَّامُ عيد

(صحیح ابن حبان، ذِكْرُ الْبَيَانِ بِأَنَّ أَبَا بَكْرٍ خَرَقَ دُفُوفَهُمَا فِي ذَلِكَ الْيَوْمِ، باب اللعب و اللھو)

سیدہ عائشہ سے مروی ہے کہ حضرت ابو بکر ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان کے پاس انصار کی دو لڑکیاں تھیں جو گا رہی تھیں اور دف بجا رہی تھیں۔ حضرت ابو بکر نے انہیں برا بھلا کہا اور ان کے دف کو پھاڑ دیا۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اے ابو بکر! انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، چوں کہ یہ عید کے ایام ہیں۔

شعیب ارنوط نے اپنے محقق ومخرج نسخے میں کہا: اس کی سند صحیح ہے۔ محمد بن سہل بن عسکر ثقہ ہیں اور مسلم کے راویوں میں سے ہیں، بلکہ ثقہ سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام راوی صحیحین کے راوی ہیں سوائے اسحاق بن راشد کے، جو صرف بخاری کے رجال میں ہیں۔

۳ -عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ضَرْبِ الدُّفِّ وَلَعِبِ الطَّبْلِ وَصَوْتِ الزِّمَارَةِ. (تحریم النرد و الشطرنج و الملاھی، الباب الثانی، بَابُ ذِكْرِ تَحْرِيمِ اسْتِمَاعِ الْمَزَامِيرِ مِثْلُ الْمَعْزَفَةِ وَالصُّفَّارَةِ وَالصَّنْجِ وَالطَّبْلِ وَالْعُودِ وَالطُّنْبُورِ وَأَشْبَاهِ هَذَا) حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے دف بجانے، طبل بجانے اور بانسری بجانے سے منع فرمایا۔

۴ -عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: الدُّفُّ حَرَامٌ، وَالْمَعَازِفُ حَرَامٌ، وَالْكُوبَةُ حَرَامٌ، وَالْمِزْمَارُ حَرَامٌ۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی، جماع ابواب من تجوز شہادتہ و من لا تجوز، باب ما جاء فی ذم الملاھی من المعازف و المزامیر)

حضرت عبد اللہ ابن عباس سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: دف حرام ہے، معازف حرام ہیں، کوبہ حرام ہے، بانسری حرام ہے۔ البانی نے اسے صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔ (تحریم آلات الطرب، ص: ۹۲)

۵ - كَانَ أَصْحَابُ عَبْدِ اللَّهِ يَسْتَقْبِلُونَ الْجَوَارِيَ فِي الْأَزِقَّةِ مَعَهُنَّ الدُّفُّ فَيَشُقُّونَهَا (مصنف ابن ابی

شیبہ، کتاب النکاح، من کرہ الدف)

حضرت عبداللہ ابن مسعود کے تلامذہ گلیوں کے اندر لڑکیوں کو دف کے ساتھ دیکھتے تو دف پھاڑ دیتے۔

حدیث عائشہ کے حوالے سے ایک عجیب وغریب نکتہ آفرینی ابن تیمیہ نے بھی کی ہے کہ عید کے دن کی یہ رخصت بھی فقط بچے بچیوں کے لیے ہے بڑوں کے لیے نہیں ہے۔ رہا حضور کا سننا تو وہ از قبیل سماع (از خود سنائی دینے سے) ہے، از قبیل استماع (جان بوجھ کر سننے سے) نہیں ہے اور امر و نہی کا تعلق سماع سے نہیں، استماع سے ہوتا ہے۔ (مجموع الفتاویٰ: ۱۱/ ۵۶۶)

شیخ ابن تیمیہ کی سادگیاں بھی ایسی ہوتی ہیں جن پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔ حضور گھر میں آئے، بچیاں (یہ لفظ شیخ کے فہم کے مطابق ہے) گا بجا رہی تھیں، حضور نے دیکھا، ان کو منع نہیں کیا اور آپ چہرے پر چادر ڈال کر لیٹ گئے۔ گویا شیخ ابن تیمیہ کے مطابق کاشانۂ رسول میں حرام آواز بلند ہو رہی تھی، آپ نے بند نہیں کرایا اور بستر پر لیٹ گئے اور اس وقت جو حرام آواز حضور کے کانوں سے ٹکرائی وہ از باب سماع تھا، از باب استماع نہیں تھا۔ یعنی اس کے سننے میں حضور کا ارادہ واختیار شامل نہیں تھا۔ شیخ ابن تیمیہ کو کوئی کیسے سمجھائے کہ اگر یہ آوازیں حرام تھیں تو ان کو بند کرنا تو حضور کے اختیار میں تھا اور جب اس اختیار کا آپ نے استعمال نہیں فرمایا تو اس کے بعد آپ کا سننا از راہ اختیار ہوا، نہ کہ از راہ بے اختیاری۔ یہ نکتہ آفرینی بھی قیامت کی ہے کہ وہ لڑکیاں نابالغہ تھیں۔ یہ نکتہ لفظ جاریہ/ جواری کے فہم پر مبنی ہے۔ ارے سیدہ عائشہ تو نابالغہ نہیں تھیں، جو اس وقت حجلۂ نبوت میں تھیں اور وہ خود اپنے لیے بھی جاریہ کا لفظ استعمال کرتی ہیں۔ کنت جارية۔ (بخاری، کتاب الشھادات، باب تعدیل النساء بعضھن بعض)

دف کی حرمت وشناعت میں وارد بے شمار نصوص میں سے مشتے نمونہ از خروارے آپ نے ملاحظہ کیا۔ یہ حوالے اتنا بتانے کے لیے کافی ہیں کہ شریعت میں دف اور غیر دف کی تفریق کی بات بے بنیاد ہے۔ اس کے بجائے یہ کہنا زیادہ قرین انصاف ہے کہ آلات موسیقی کے ثبوت و انکار دونوں طرح کے نصوص موجود ہیں۔ دونوں طرف متعدد روایات ہیں، جن میں انفرادی یا مجموعی طور پر صحت متحقق ہے۔ اب ایسے میں دونوں طرح کی احادیث میں وہ تطبیق کی جائے گی جو مقاصد واغراض کے تحت ہوگی۔ جائز اور مستحب مقاصد کے لیے ان کا جواز و استحباب اور ناجائز و ناروا مقاصد کے لیے ان کی کراہت یا حرمت کا قول کرنا یہی قرین عقل وحکمت ہے، نہ کہ دف اور غیر دف کی بنیاد پر فرق کرنا درست ہے، جب کہ صراحت کے ساتھ دف کی شناعت وحرمت پر متعدد نصوص موجود ہیں۔

یہاں ایک بات رہ جاتی ہے کہ بعض اہل علم جو کہتے ہیں کہ ویسے حرام تو بشمول دف کے سارے آلات موسیقی ہیں، البتہ دف کے لیے بعض مواقع پر خصوصی استثنا ہے۔ اس بات کا اشارہ بعض آثار صحابہ سے بھی ملتا ہے، لیکن یہی حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ ”ہاں! جہاد کا طبل، سحری کا نقارہ، حمام کا بوق، اعلان نکاح کا بے جلاجل دف

جائز ہیں کہ یہ آلات لہوولعب نہیں۔'' (فتاویٰ رضویہ، ج: ۲۴، مسئلہ: ۲، (۱)

بھائی! جب استثناءات کی اتنی طویل فہرست موجود ہے، پھر اس بات کا جواز کیا رہ گیا کہ ''حرام تو بشمول دف کے سارے آلات موسیقی ہیں، البتہ دف کے لیے بعض مواقع پر خصوصی استثنا ہے''؟

پھر اتنے سارے استثناءات کے ساتھ یہ کہنا کہ ''یہ آلات لہوولعب نہیں'' ہیں، کیا یہ اس بات کا اشارہ نہیں کہ یہ مقاصد جائز ہیں لہٰذا مقاصد جائز ہونے کی وجہ سے ان کے آلۂ لہو ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ چنانچہ انہی آلات-طبل، نقارہ، بوق اور دف-کو لہوحرام کے لیے استعمال کیا جائے تو پھر یہی آلات، آلات لہوولعب ہو جائیں گے اور ان کا سننا اور بجانا ناجائز وحرام ہو جائے گا۔ گویا آلات موسیقی میں سے کوئی بھی اصلاً آلۂ لہوولعب ہے ہی نہیں کہ ان کو لہوولعب کی بنیاد پر ان میں سے کسی کو اصلاً حلال اور کسی کو حرام کہا جائے۔ ان کا آلۂ لہو ہونا یا نہ ہونا ان کے مقاصد استعمال کے تابع ہے، اس لیے یہ کہنا درست ہوا کہ آلات موسیقی اگر جائز مقاصد کے لیے استعمال ہوں تو اس وقت نہ وہ آلۂ لہو ہوں گے اور نہ مکروہ وحرام۔ ہاں! اگر لہو کے لیے استعمال ہوں تو اس وقت ان کو آلۂ لہو کہا جائے گا۔ پھر اس وقت دیکھا جائے گا کہ وہ لہوحرام ہے یا محض تفریح طبع کا سامان ہے، اگر وہ لہوحرام ہو تو اس وقت ان کا بجانا سننا ناجائز وحرام ٹھہرے گا اور محض تفریح طبع کے لیے ہو تو جائز۔ کیوں کہ تفریح طبع پر بھی لہو کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ امر حرام نہیں ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ بھی واضح ہو گیا کہ جواز وحرمت کے لیے جس طرح دف اور غیر دف کی تفریق درست نہیں، اسی طرح دف کے بعض مواقع پر جواز اور بعض مواقع پر عدم جواز کی تفریق بھی درست نہیں اور آلات موسیقی کے حوالے سے متعارض نصوص میں تطبیق کا درست محمل یہی ہے کہ بات مقاصد کی، کی جائے۔ آلات موسیقی بجائے جانے کے مقاصد-حرام، مکروہ، مباح یا مستحب-جیسے ہوں گے، ان آلات کے بجانے اور سننے پر وہی حکم مرتب ہوگا۔

دوسری حدیث

عَنْ نَافِعٍ، قَالَ: سَمِعَ ابْنُ عُمَرَ، مِزْمَارًا قَالَ: فَوَضَعَ إِصْبَعَيْهِ عَلَى أُذُنَيْهِ، وَنَأَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَقَالَ لِي: يَا نَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا؟ قَالَ: فَقُلْتُ: لَا، قَالَ: فَرَفَعَ إِصْبَعَيْهِ مِنْ أُذُنَيْهِ، وَقَالَ: كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ مِثْلَ هَذَا فَصَنَعَ مِثْلَ هَذَا۔ (سنن ابو داؤد، کتاب الادب، باب کراھیۃ الغناء والزمر)

حضرت نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عمر نے بانسری کی آواز سنی تو انہوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال لیں اور راستہ تبدیل کر لیا۔ پھر مجھ سے پوچھا: نافع! کیا تجھے کچھ سنائی دے رہی ہے؟ نافع کہتے

---

(۱) حضرت شیخ ابو سعید دام ظلہ فرماتے ہیں: جب جہاد اصغر میں طبل بجانا جائز ہے تو جہاد اکبر کے لیے اگر بجایا جائے تو یہ بدرجۂ اولیٰ درست ہوگا۔ سحری کے لیے بیدار ہونا ایک امر مندوب ہے، اس کے لیے نقارہ بجایا جا سکتا ہے تو قلب کی بیداری جو ہر مطلوب سے بڑھ کر مطلوب ہے، اگر کوئی اس کے لیے بجائے تو کیوں کر جائز نہ ہوگا؟ حمام کا بوق تطہیر جسم کے لیے درست ہے تو سماع صوفیہ کا بوق جو تطہیر روح کا سامان ہے، کیوں کر درست نہ ہوگا؟ خلق سے رشتہ جوڑنے کے لیے نکاح کے وقت اگر دف بجانا جائز ہے تو خالق سے رشتہ جوڑنے کے مقصد سے اگر کوئی دف بجاتا ہے تو یہ بدرجۂ اولیٰ مستحب ومندوب ہوگا۔

ہیں کہ میں نے کہا: نہیں! یہ سن کر انھوں نے اپنی انگلیاں کان سے نکال لیں اور فرمایا: میں ایک بار نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا تو انھوں نے بھی ایسی ہی آواز سنی اور ایسا ہی عمل کیا۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد علامہ ابن حزم اندلسی لکھتے ہیں:

اگر مزمار کا سماع حرام ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عمر کو اس کی اجازت نہیں دیتے اور نہ حضرت ابن عمر نافع کو اس کی اجازت دیتے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ یہ تھا کہ آپ ہر اس چیز کو اپنے لیے ناپسند فرماتے تھے جو قرب خداوندی کا ذریعہ نہ ہو، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر کھانا ناپسند فرماتے تھے، غسل کے بعد اسی کپڑے سے بدن صاف کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔ سیدہ عائشہ اور سیدہ فاطمہ کے دروازے پر نقش ونگار والے پردے کو ناپسند فرماتے تھے۔ اسی طرح یہ بات بھی سخت ناپسند فرماتے کہ درہم ودینار کے ساتھ رات گزاریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے ہوئی تھی۔ اگر سماع مزمار حرام ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کرتے کہ خود تو اپنی انگلیاں کان میں ڈال لیں اور دوسرے کو سننے سے منع نہ فرمائیں، بلکہ اس عمل کو دوسرے کے لیے ثابت فرمادیا اور خود اس سے بچ گئے۔ ثابت ہوا کہ یہ مباح ہے، اگرچہ اس کا ترک کرنا افضل ہے، جیسا کہ دنیا کی دیگر زائد مباح چیزوں کا بھی یہی حکم ہے اور ان میں کسی طرح کی کوئی تفریق درست نہیں۔

واضح رہے کہ اس حدیث کو محرمین اپنے موقف میں بھی پیش کرتے ہیں، جس پر تفصیلی گفتگو پیچھے ہو چکی ہے۔

تیسری حدیث

حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ ذَكْوَانَ، قَالَ: قَالَتِ الرُّبَيِّعُ بِنْتُ مُعَوِّذِ ابْنِ عَفْرَاءَ، جَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلَ حِينَ بُنِيَ عَلَيَّ، فَجَلَسَ عَلَى فِرَاشِي كَمَجْلِسِكَ مِنِّي، فَجَعَلَتْ جُوَيْرِيَاتٌ لَنَا يَضْرِبْنَ بِالدُّفِّ وَيَنْدُبْنَ مَنْ قُتِلَ مِنْ آبَائِي يَوْمَ بَدْرٍ۔ (صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب)

خالد بن ذکوان بیان کرتے ہیں۔ حضرت ربیع بنت معوذ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری شب عروسی کی صبح میرے گھر آئے اور میرے بستر پر اسی طرح بیٹھ گئے جس طرح تم میرے پاس بیٹھے ہو۔ اس وقت گھر کی لڑکیاں دف بجانے لگیں اور جنگ بدر میں شہید ہونے والے میرے خاندان کے لوگوں کا مرثیہ پڑھنے لگیں۔

چوتھی حدیث

قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَصْلُ مَا بَيْنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ الدُّفُّ وَالصَّوْتُ فِي النِّكَاحِ۔ (سنن نسائی، کتاب النکاح، باب اعلان النکاح بالصوت وَضَرْبِ الدُّفِ)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح اور زنا کے درمیان کا فرق صرف دف اور نغمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

پانچویں حدیث

عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم -: سَافَرَ سَفَرًا فَنَذَرَتْ جَارِيَةٌ مِنْ قُرَيْشٍ: إِنِ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ رَدَّهُ أَنْ تَضْرِبَ فِي بَيْتِ عَائِشَةَ بِدُفٍّ، فَلَمَّا رَجَعَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَتِ الْجَارِيَةُ، فَقَالَتْ عَائِشَةُ لِلنَّبِيِّ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم -: هَذِهِ فُلَانَةُ بِنْتُ فُلَانٍ نَذَرَتْ إِنْ رَدَّكَ اللهُ تَعَالَى أَنْ تَضْرِبَ فِي بَيْتِي بِدُفٍّ، قَالَ: فَلْتَضْرِبْ۔ (کتاب السماع، ص: ۵۴)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک سفر پر نکلے۔ اس وقت ایک قریشی لڑکی نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ عزوجل نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واپس لوٹایا تو وہ سیدہ عائشہ کے گھر میں دف بجائے گی۔ چنانچہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس آئے تو وہ لڑکی بھی آئی۔ سیدہ عائشہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: یہ فلانہ بنت فلانہ ہے۔ اس نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے آپ کو واپس لوٹایا تو یہ میرے گھر میں دف بجائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو بجا لے۔

اس حدیث کے ذیل میں علامہ محمد ابن طاہر مقدسی کہتے ہیں:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ معصیت میں کوئی نذر نہیں۔ **لا نذرَ فی معصیةٍ**۔ چنانچہ اگر دف بجانا معصیت ہوتا تو ضرور آپ اس نذر کے کفارے کا حکم دیتے اور اس عمل معصیت کی انجام دہی سے منع فرما دیتے۔ (کتاب السماع، ص: ۵۵)

قاضی شوکانی لکھتے ہیں:

''اس حدیث کو ابن حبان اور بیہقی نے نقل کیا ہے۔ اس باب کی ایک روایت حضرت عبداللہ بن عمر سے بھی مروی ہے اور ابو داؤد میں ہے۔ اور ایک روایت سیدہ عائشہ سے منقول ہے جو فاکہانی کی تاریخ مکہ میں ہے اور جس کی سند صحیح ہے۔ اس باب کی حدیث سے مصنف نے کسی کے باہر سے آنے پر اس امر کے جواز پر استدلال کیا ہے جس کا ذکر اس حدیث میں ہے۔ تحریم کے قائلین منع پر وارد عام نصوص سے اس قسم کے امور کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں، جب کہ مجوزین اس سے مطلقاً جواز پر استدلال کرتے ہیں، جیسا کہ اوپر گزرا۔ اور دلائل اس بات پر قائم ہیں کہ اللہ کی معصیت میں کوئی نذر درست نہیں ہے۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اس عورت کے لیے دف بجانے کی اجازت اس بات کی دلیل ہے کہ اس عورت نے جو کچھ کیا وہ ایسے مقام پر معصیت نہیں ہو سکتا۔''

(نیل الاوطار، ابواب السبق والرمی، باب ضرب النساء بالدف لقدوم الغائب)

شیخ البانی اس مقام پر نکتہ آفرینی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''جو بات مجھ پر ظاہر ہے وہ یہ کہ چوں کہ اس کا نذر نبی کریم صلی اللہ عیہ وسلم کی کامیابی و کامرانی کے ساتھ واپسی پر خوشی سے متعلق تھی، لہٰذا اس کے لیے اس نے جس معصیت کی نذر مان بھی لی تھی، اس کے حق

میں معاف کردی گئی۔ یہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت میں ایسا ہوا، حضور کے علاوہ کسی دوسرے کے حق میں یہ جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے تمام مواقع مسرت کے لیے جواز دف پر استدلال نہیں کیا جا سکتا؛ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جیسی خوشی حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور سے حاصل نہیں ہوسکتی اور اس لیے بھی کہ چوں کہ تمام معازف ودفوف کی حرمت پر بعض استثناءات کے ساتھ عمومی دلیلیں قائم ہیں جو تمام مواقع سرور پر اباحت دف کے خلاف ہیں۔'' (تحریم آلات الطرب، ص: ۱۲۴)

واقعہ یہ ہے کہ مقاصد شرع کے عدم ادراک اور عموم حرمت پر کامل یقین کے بعد اسی قسم کی توجیہات متوقع ہیں۔ یہاں مجھے حیرت ہوئی علامہ غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ کی آلات موسیقی کے حوالے سے شدت طبع پر کہ جس حدیث کو امام ترمذی، محمد بن طاہر مقدسی، قاضی شوکانی اور شیخ البانی جیسے لوگ صحیح قرار دیں اسے انہوں نے کھینچ تان کر ضعیف کہا ہے۔ انہوں نے امام ترمذی، ابوداؤد، بیہقی اور تذکرۃ الموضوعات سے کل پانچ سندوں پر جرح کی ہے۔ یہ جرح خود قابل جرح ہے، خصوصاً جو امام ترمذی کے راوی علی بن حسین واقد کے حوالے سے ہے، مگر میں نے یہاں اسے دوسری سند سے منقول روایت کو لیا، جو علامہ سعیدی کے تمام طرق اور اسانید سے خارج ہے اور جسے علامہ محمد بن طاہر مقدسی نے نقل کیا ہے اور اس کے بعد: وَهَذَا إِسْنَادٌ مُتَّصِلٌ وَرِجَالُهُ ثِقَاتٌ کہا ہے۔ علامہ سعیدی نے اس کے علاوہ جو کچھ الطاف وعنایات فرمائے ہیں ان کے جواب میں انہی کی عبارت پیش کروں گا جسے انہوں نے آلات موسیقی کی احادیث تحریم کے حوالے سے لکھا ہے:

''ہم نے آلات موسیقی کی حرمت واضح کرنے کے لیے بیشتر احادیث صحاح ستہ سے پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ سنن کبریٰ بیہقی، مسند احمد بن حنبل، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، کنز العمال اور مجمع الزوائد سے بھی احادیث پیش کی ہیں، جن میں سے زیادہ تر احادیث سند حسن سے مروی ہیں۔ بعض احادیث کی انفرادی سند ضعیف ہے، لیکن چوں کہ وہ احادیث دیگر طرق اور اسانید سے بھی مروی ہیں، اس لیے وہ سند بھی اصطلاحاً سند حسن ہے، خواہ سند (حسن) لغیرہ ہو اور ان میں کوئی حدیث خدانخواستہ موضوع نہیں ہے۔'' (شرح صحیح مسلم، جلد دوم، ص: ۷۰۰)

ہمارے لیے جب اس عبارت کو پڑھیں تو حرمت کی جگہ اباحت کا لفظ بدل دیں اور صحاح کے علاوہ کتابوں کے اسامیں جزوی تبدیلی کردیں۔

علامہ سعیدی نے اس حدیث کو درایت کے بھی خلاف کہا ہے اور وہ درایت ہے بالغہ سے غنا سننا جو شاید ان کے نزدیک بالذات مطلقاً حرام ہے۔ میں یہاں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ہمیں حدیث پڑھنے کے بعد حلال وحرام طے کرنا چاہیے نہ یہ کہ پہلے سے حلال وحرام طے کرلیں، پھر اس کے بعد احادیث کریمہ کا مطالعہ کریں۔ علامہ سعیدی سے مجھے اس کے علاوہ کچھ نہیں کہنا۔

چھٹی حدیث

عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ قَائِمًا ثُمَّ يَجْلِسُ، ثُمَّ يَقُومُ فَيَخْطُبُ قَائِمًا خُطْبَتَيْنِ، فَكَانَ الْجَوَارِي إِذَا نُكِحُوا يَمُرُّونَ بِالْكَبَرِ وَالْمَزَامِيرِ فَيَشْتَدُّ النَّاسُ وَيَدَعُوا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَائِمًا فَعَاتَبَهُمُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ فَقَالَ: وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا (الجمعة: ١١) (المسند الصحیح المستخرج علی صحیح مسلم، الجامعۃ الاسلامیۃ ،السعودۃ ، ۲۰۱۴ء)

حضرت جابر کا بیان ہے: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوکر خطبہ دے رہے تھے، پھر بیٹھ گئے، پھر کھڑے ہوئے اور اس طرح کھڑے ہوکر دو خطبے دیے۔ اس وقت نکاح کا موقع تھا، لڑکیاں طبل اور دیگر آلات موسیقی کے ساتھ نکلیں۔ ان کی آواز سن کر لوگ تیزی سے اس طرف نکل پڑے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنہا چھوڑ گئے۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب پر فرمایا۔ ارشاد ہوا: جب انھوں نے تجارت یا لہو ولعب کو دیکھا تو تیزی سے اس طرف نکل پڑے اور آپ کو تنہا چھوڑ دیا۔

محقق نے اس کے ذیل میں لکھا ہے:

> یہ حدیث اس لفظ کے ساتھ امام مسلم نے روایت نہیں کی۔ یہ مصنف کے اضافات سے ہیں۔ مصنف کی سند حسن ہے، اس کے راوی ثقہ ہیں۔ البتہ ابوامیہ صدوق ہوتے ہوئے بھی مبتلائے اوہام ہے، لیکن اس کی متابعت محمد بن سہل بن عسکر سے ہوجاتی ہے جو کہ طبری کے نزدیک ثقہ ہے۔ طبری نے اسے جامع البیان فی تاویل القرآن میں ذکر کیا ہے۔

یہی حدیث علامہ محمد بن طاہر مقدسی نے کتاب السماع میں اپنی سند کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں: کن الجواری اذا انکحوھن یمرون یضربون بالدف والمزامیر۔ جب لڑکیوں کی شادی کراتے تو دف اور دیگر آلات موسیقی بجاتے جاتے۔

یہی حدیث مسند شافعی میں اس طرح ہے:

ساتویں حدیث

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَكَانَتْ لَهُمْ سُوقٌ يُقَالُ لَهَا الْبُطْحَاءُ، كَانَتْ بَنُو سُلَيْمٍ يَجْلِبُونَ إِلَيْهَا الْخَيْلَ وَالْإِبِلَ وَالْغَنَمَ وَالسَّمْنَ، فَقَدِمُوا فَخَرَجَ إِلَيْهِمُ النَّاسُ وَتَرَكُوا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَكَانَ لَهُمْ لَهْوٌ، إِذَا تَزَوَّجَ أَحَدُهُمْ مِنَ الْأَنْصَارِ ضَرَبُوا بِالْكَبَرِ فَعَيَّرَهُمُ اللهُ بِذَلِكَ فَقَالَ: وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا۔ (الْجُمُعَة: ١١) (مسند الشافعی، کتاب الصلوٰۃ، الباب الحادی عشر فی صلاۃ الجمعۃ)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے۔ ان کے بازار بطحا میں بنوسلیم جو گھوڑے،

اونٹ، بکری اور گھی لے کر آیا کرتے تھے، وہ آ گئے، جن کی طرف سارے لوگ نکل پڑے اور آپ ﷺ کو چھوڑ دیا۔ ان کے یہاں لہو کا بھی چلن تھا۔ جب ان میں سے کسی کی شادی ہوتی تو وہ طبل بجایا کرتے تھے۔(۱) اس بات پر اللہ نے انہیں غیرت دلائی۔ ارشاد فرمایا: جب انھوں نے تجارت یا لہو ولعب کو دیکھا تو تیزی سے اس طرف نکل گئے اور آپ کو کھڑا چھوڑ دیا۔

مذکورہ کئی روایات میں الْكَبَر کا لفظ وارد ہے، جس کا ترجمہ ہم نے طبل کیا ہے۔ اس سے متعلق لسان العرب میں ہے:

الْكَبَرُ بِفَتْحَتَيْنِ الطبلُ فِيمَا بَلَغنا، وَقِيلَ: هُوَ الطَّبْلُ ذُو الرأْسين، وَقِيلَ: الطَّبْلُ الَّذِي لَهُ وَجْهٌ وَاحِد۔ کبر کے بارے میں ہمیں اطلاع ہوئی کہ یہ طبل ہے۔ پھر ایک قول ہے کہ یہ دو سرا والا طبل ہے اور ایک قول کے مطابق ایک سرا والا۔

شعب الایمان کی روایت میں تو باضابطہ طبل کا لفظ وارد ہے، جو اسی آیت سے متعلق دیگر تناظر کے ساتھ ہے:

إِنَّ دِحْيَةَ الْكَلْبِيَّ كَانَ رَجُلًا تَاجِرًا وَكَانَ قَبْلَ أَنْ يُسلِمَ إِذَا أَقْبَلَ بِتِجَارَتِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ، خَرَجَ النَّاسُ يَنْظُرُونَ إِلَى مَا جَاءَ بِهِ، فَيَشْتَرُونَ مِنْهُ فَقَدِمَ ذَاتَ يَوْمِ الْمَدِينَةَ، وَوَافَقَ الْجُمُعَةَ وَالنَّاسُ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ، وَهُوَ قَائِمٌ يَخْطُبُ فَاسْتَقْبَلَ أَهْلُ دِحْيَةَ الْعِيرَ دَخَلُوا الْمَدِينَةَ بِالطَّبْلِ وَاللهْوِ، فَذَلِكَ اللهْوُ الَّذِي ذَكَرَ اللهُ۔ (شعب الایمان، باب في تحريم الملاعب والملاهي)

دحیہ کلبی ایک تاجر انسان تھے۔ اسلام لانے سے قبل جب وہ اپنا سامان تجارت لے کر مدینہ آتے، لوگ ان کا سامان تجارت دیکھنے اور خریدنے کے لیے نکل پڑتے۔ اسی طرح ایک بار ان کا مدینے میں آنا ہوا۔ اتفاق سے یہ جمعہ کا دن تھا۔ اس وقت لوگ مسجد میں نبی کریم ﷺ کے پاس تھے۔ آپ کھڑے ہو کر خطبہ دے رہے تھے۔ اس وقت جو دحیہ کے احباب تھے انہوں نے طبل اور لہو وہنگامے کے ساتھ اس قافلے کا استقبال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اسی لہو کا ذکر فرمایا ہے۔

قابل غور ہے کہ یہاں طبل اور دف کے ساتھ مزامیر یعنی دیگر آلات موسیقی کے بجانے اور سننے کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوا کہ شادی بیاہ اور استقبال کے مواقع پر طبل اور دف کے ساتھ دیگر آلات موسیقی بھی بجائے جاتے تھے، اگرچہ دف بجانا ہی اس عہد کی عام ثقافت تھی۔

---

(۱) اس روایت میں وارد لفظ لہو کے تناظر میں بخاری کی اس حدیث کو بھی سمجھا جا سکتا ہے، جس میں آقا ﷺ نے فرمایا: عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّهَا زَفَّتِ امْرَأَةً إِلَى رَجُلٍ مِنَ الأَنْصَارِ، فَقَالَ نَبِيُّ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا عَائِشَةُ، مَا كَانَ مَعَكُمْ لَهْوٌ؟ فَإِنَّ الأَنْصَارَ يُعْجِبُهُمُ اللَّهْوُ۔ (صحيح بخاری، کتاب النکاح، بَابُ النِّسْوَةِ اللاَّتِي يَهْدِينَ المَرْأَةَ إِلَى زَوْجِهَا وَدُعَائِهِنَّ بِالْبَرَكَةِ) اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ انصار کے یہاں شادیوں میں صرف دف ہی نہیں، طبل بجانے کا بھی رواج تھا۔

آٹھویں حدیث

دَخَلَ ابْنُ مَسْعُودٍ عُرْسًا فِيهِ مَزَامِيرُ وَلَهْوٌ فَقَعَدَ وَلَمْ يَنْهَ عَنْهُ۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ماقالوا فی اللهو وفی ضرب الدف فی العرس) حضرت عبداللہ ابن مسعود ایک شادی کی محفل میں گئے جہاں آلات موسیقی اور سامان تفریح موجود تھے۔ آپ وہاں بیٹھے اور منع نہیں فرمایا۔

حضرت ابن مسعود ہی کے حوالے سے منقول ہے:

عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدٍ، قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى ابْنِ مَسْعُودٍ وَقَرَظَةَ بْنِ كَعْبٍ وَعِنْدَهُمَا جَوَارٍ تُغَنِّينَ فَقُلْتُ: أَتَفْعَلُونَ هَذَا وَأَنْتُمْ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟، قَالَ: فَقَالَ: إِنَّهُ رَخَّصَ لَنَا فِي اللَّهْوِ عِنْدَ الْعُرْسِ. (مصنف ابن ابی شیبہ، ماقالوا فی اللهو وفی ضرب الدف فی العرس)

عامر بن سعد سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں عبداللہ ابن مسعود اور قرظہ ابن کعب کے پاس گیا، جن کے پاس لڑکیاں نغمے گا رہی تھیں۔ میں نے عرض کیا: آپ حضرات یہ کرتے ہیں، جب کہ آپ حضرات نبی کریم ﷺ کے صحابہ ہیں؟ عامر بن سعد کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت ابن مسعود نے فرمایا: حضور ﷺ نے ہمیں شادی کے موقع پر غنا کی رخصت دی ہے۔

ان دونوں روایتوں سے واضح ہوا کہ شادی کے مواقع پر حضرت ابن مسعود نغمہ اور آلات نغمہ سنا کرتے تھے، جب کہ دوسری طرف نغمہ اور آلات نغمہ کے خلاف ان کے شدید رجحانات موجود ہیں۔ اب یہ دو حال سے خالی نہیں:

۱- یا تو ان کے نزدیک شادی اور غیر شادی کے نغمات اور آلات نغمات کا فرق ہو، جیسا کہ بظاہر الفاظ سے اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور بہت سے اہل علم جس کے قائل ہیں۔

۲- وہ اسی غنا کو باعث نفاق کہتے ہوں جو غنا کا ایک خاص مفہوم ہے جو رقص وسرود اور شراب وکباب کی محافل کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے برخلاف شادی بیاہ، حمد وقصائد اور دیگر جائز اور اچھے نغمات پر وہ غنا کا اطلاق ہی نہ کرتے ہوں۔ اسی طرح ان جائز یا مستحسن نغمات کے ساتھ بجنے والے آلات موسیقی کو درست سمجھتے ہوں، وہ صرف انہیں آلات موسیقی کے خلاف ہوں جو مخصوص غنا کے ساتھ یا فضول اور وقت بے وقت بجائے جاتے ہوں، جیسا کہ پیچھے گزرا کہ ان کے تلامذہ گلیوں میں جب لڑکیوں کو دف بجاتے دیکھتے تو اسے پھاڑ دیتے۔

مذکورہ بالا دو احتمالات میں سے جنہیں پہلے احتمال کی صحت اور دوسرے کے عدم صحت پر اصرار ہو، ان سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ:

اولاً: دوسرے احتمال کی کلی نفی درست نہیں۔

ثانیاً: بر سبیل تنزل اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ پہلا احتمال ہی حضرت ابن مسعود کا موقف تھا تو اس کی کیا ضمانت کہ یہی کل موقف ہے۔

ثالثاً: یہ بات نا قابل فہم ہے کہ ایک قطعی حرام شے صرف شادی کے موقع پر جائز ہو اور دیگر مواقع پر ناجائز ہو۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شادی کا استثنا سمجھنے والے یہ حضرات اگلے ہی لمحے استثناءات کی ایک طویل فہرست بناتے چلے جاتے ہیں، پھر تیسرے لمحے یہی رٹتے رہتے ہیں کہ صرف شادی کا استثنا ہے۔ اس قسم کی توجیہات فقہ و درایت سے پرے لفظ پرستی بلکہ تنگ نظری و تضاد فہمی پر مبنی ہے۔

نویں حدیث

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ سِيرِينَ أَنَّ رَجُلًا قَدِمَ الْمَدِينَةَ بِجِوَارٍ فَأَتَى إِلَى عَبْدِ اللهِ بْنِ جَعْفَرٍ فَعَرَضَهُنَّ عَلَيْهِ، فَأَمَرَ جَارِيَةً مِنْهُنَّ فَأَحْدَثَتْ، قَالَ أَيُّوبُ: بِالدُّفِّ، وَقَالَ هِشَامٌ: بِالْعُودِ۔ (المحلی بالآثار، کتاب البیوع، مسالة بیع آلات اللهو)

حضرت محمد ابن سیرین سے روایت ہے کہ ایک شخص چند باندیاں لے کر مدینہ آیا۔ وہ عبداللہ بن جعفر کے پاس گیا اور ان کے سامنے ان باندیوں کو پیش کیا۔ آپ نے ان میں سے ایک کو حدی خوانی کا حکم دیا تو اس نے حدی خوانی کی۔ ایوب کا بیان ہے کہ اس نے دف کے ساتھ حدی خوانی کی، جب کہ ہشام نے کہا کہ عود کے ساتھ۔

ابن حزم نے اسے صحیح الاسناد کہا ہے۔ (حوالۂ سابق)

قاضی شوکانی لکھتے ہیں:

> العقد الفرید کے مصنف معروف ادیب علامہ ابو عمر اندلسی نے بھی لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر، عبد اللہ بن جعفر کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہاں ایک باندی ہے، جس کی گود میں عود ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا: کیا آپ کو اس میں کوئی حرج محسوس ہوتا ہے؟ عبداللہ بن جعفر نے کہا: نہیں! اسی طرح ماوردی نے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص نے حضرت عبداللہ ابن جعفر کے پاس عود سنا۔ اسی طرح ابو الفرج اصفہانی نے لکھا ہے کہ حضرت حسان نے عزۃ المیلاء فنانہ سے مزہر یعنی دف پر اپنا شعر سنا۔ (ابطال دعوی الاجماع، مشمولہ الفتح الربانی، ص: ۵۲۰۷)

دسویں حدیث

عَبْدُ اللهِ بْنُ زَيْدٍ، قَالَ: لَمَّا أَمَرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّاقُوسِ يُعْمَلُ لِيُضْرَبَ بِهِ لِلنَّاسِ لِجَمْعِ الصَّلَاةِ طَافَ بِي وَأَنَا نَائِمٌ رَجُلٌ يَحْمِلُ نَاقُوسًا فِي يَدِهِ، فَقُلْتُ: يَا عَبْدَ اللهِ أَتَبِيعُ النَّاقُوسَ؟ (سنن أبو داؤد، کتاب الصلاة، باب کیف الاذان)

عبداللہ بن زید کا بیان ہے کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں کو جمع کرنے کے لیے ناقوس بجانے کا حکم دیا، ایک دن میں سو رہا تھا، کوئی شخص اپنے ہاتھوں میں ناقوس لیے میرے خواب میں آیا۔ میں نے اس سے پوچھا: اے اللہ کے بندے! کیا تم یہ ناقوس بیچو گے؟

اس حدیث کو البانی نے حسن صحیح کہا ہے۔اس حدیث سے ثابت ہوا کہ شروع میں جب اعلان نماز کی تدابیر پر غور وخوض ہو رہا تھا اس وقت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقوس بجانے کی رائے کو قبول کرلیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ناقوس کے آلۂ موسیقی ہونے میں کوئی شک نہیں، اگر آلات موسیقی کو کلی طور پر حرام سمجھا جائے تو لازم آئے گا کہ ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہم الفرائض کے اعلان کے لیے ایک امر حرام کے بجائے جانے کی تجویز قبول فرمالی تھی۔

واضح رہے کہ ابوداؤد ہی کی ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلان نماز کے لیے نبی کریم ﷺ کے حضور پہلے علَم بلند کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی جسے حضور نے پسند نہیں فرمایا۔ پھر شبور بجانے کی تجویز رکھی گئی تو حضور نے اسے بھی پسند نہیں فرمایا اور یہ کہا کہ یہ یہود کا شعار ہے، پھر ناقوس بجانے کی تجویز پیش کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ یہ نصاریٰ کا شعار ہے۔(۱) قابل ذکر ہے کہ صحابہ نے اعلان نماز کے لیے ان آلات موسیقی کے بجانے کی تجویز پیش کی، اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ آلات موسیقی کو مطلقاً شیطانی آلہ نہیں سمجھتے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے اگر چہ ان تجاویز کو قبول نہیں کیا اور مختلف وجوہات کے سبب انہیں رد کر دیا، لیکن یہ نہیں فرمایا کہ تم لوگ ان چیزوں کا ذکر کیوں کرتے ہو جو شیطانی آلات ہیں؟ بھلا رحمانی عبادت شیطانی ذریعۂ اعلان سے کیسے ہوگی؟ اس سے صاف ہوجاتا ہے کہ آلات موسیقی کو مطلقاً آلات شیطان سمجھنا بعد کے بعض فقہا کا فہم ہے۔

گیارہویں حدیث

فقدم المدينة صلّى اللهَ عليه وسلّم مؤيدا مظفرا منصورا قد أعلى اللهّ كلمته ومكّن له وأعزّ نصره، ودخلها من ثنية الوداع في يوم الأربعاء الثاني والعشرين من رمضان فتلقاه الولائد بالدفوف وهنّ يقلن:

طلع البدر علينا من ثنيات الوداع

وجب الشكر علينا ما دعا الله داع

(امتاع الاسماع بما للبنى من الاحوال والاموال، الحفدة والمتاع: ۱۱۷)

نبی کریم ﷺ نصرت وظفر کے ساتھ مدینہ تشریف لائے، اس حال میں کہ اللہ نے آپ کا پرچم بلند کر دیا تھا اور ان کو قوت ونصرت عطا فرمادی تھی۔ آپ بدھ کے روز ۲۲/رمضان کو وادی وداع کی طرف سے مدینے میں داخل ہوئے۔ بچیوں نے اپنے ہاتھوں میں دف لے کر آپ کا استقبال کیا۔ اس وقت وہ بچیاں یہ اشعار پڑھ رہی تھیں:

---

(۱) فَقِيلَ لَهُ: انْصِبْ رَايَةً عِنْدَ حُضُورِ الصَّلَاةِ فَإِذَا رَأَوْهَا آذَنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا، فَلَمْ يُعْجِبْهُ ذَلِكَ، قَالَ: فَذُكِرَ لَهُ الْقُنْعُ - يَعْنِي الشَّبُّورَ وَقَالَ زِيَادٌ: شَبُّورُ الْيَهُودِ - فَلَمْ يُعْجِبْهُ ذَلِكَ، وَقَالَ: هُوَ مِنْ أَمْرِ الْيَهُودِ، قَالَ: فَذُكِرَ لَهُ النَّاقُوسُ، فَقَالَ: هُوَ مِنْ أَمْرِ النَّصَارَى، فَانْصَرَفَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ زَيْدِ بْنِ عَبْدِ رَبِّهِ وَهُوَ مُهْتَمٌّ لِهَمِّ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأُرِيَ الْأَذَانَ فِي مَنَامِهِ (سنن ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب بدء الاذان)

نکلا وادی وداع سے ماہ کامل واہ واہ
شکرِ حق واجب ہے جب تک داعی حق دے صدا

تقی الدین مقریزی نے یہ واقعہ جنگ بدر سے واپسی سے متعلق لکھا ہے، جب کہ بعض دیگر مؤرخین نے جنگ تبوک سے واپسی یا مدینہ میں داخلہ کے وقت لکھا ہے۔ بہر کیف! اس سے ثابت ہے کہ عہد رسالت میں موسیقانہ نغمات وآلات کے ساتھ استقبالیہ کا چلن تھا جسے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قائم رکھا۔

بارہویں حدیث

هَبَّار أَنَّهُ زَوَّجَ ابْنَةً لَهُ- وَكَانَ عِنْدَهُمْ كَبَرٌ وَغَرَابِيلُ - فَخَرَجَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَسَمِعَ الصَّوْتَ، فَقَالَ: مَاهَذَا؟، فَقِيلَ: زَوَّجَ هَبَّارٌ ابْنَتَهُ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: أَشِيدُوا النِّكَاحَ أَشِيدُوا النِّكَاحَ، هَذَا النِّكَاحُ لَا السِّفَاحُ، قَالَ: قُلْتُ: فَمَا الْكَبَرُ؟، قَالَ: الْكَبَرُ: الطَّبْلُ الْكَبِيرُ، وَالْغَرَابِيلُ: الصُّنُوجُ. (الجامع الصحيح للسنن والمسانيد (۹/ ۳۴۶)(۱)

ہبار نے اپنی بیٹی کی شادی کی۔اس محفل میں کَبَر اور غرابیل موجود تھے۔اللہ کے رسول ﷺ اس طرف سے نکلے تو انہیں اس کی آواز سنائی دی۔دریافت فرمایا: یہ کیسی آواز ہے؟ عرض کیا گیا: ہبار نے اپنی بیٹی کی شادی کی ہے۔اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: نکاح کو مضبوط کرو، اور مضبوط کرو، یہ نکاح ہے، بدکاری نہیں ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ کبَر کیا ہے؟ فرمایا: کبر بڑے طبل کو کہتے ہیں اور غرابیل صنوج کو۔

علامہ ابوالعباس حموی (۷۷۰ھ) صنوج کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

الصَّنْجُ مِنْ آلَاتِ الْمَلَاهِي جَمْعُهُ صُنُوجٌ مِثْلُ فَلْسٍ وَفُلُوسٍ قَالَ الْمُطَرِّزِيُّ وَهُوَ مَا يُتَّخَذُ مُدَوَّرًا يُضْرَبُ أَحَدُهُمَا بِالْآخَرِ وَيُقَالُ لِمَا يُجْعَلُ فِي إِطَارِ الدُّفِّ مِنْ النُّحَاسِ الْمُدَوَّرِ صِغَارًا صُنُوجٌ أَيْضًا وَهَذَا شَيْءٌ تَعْرِفُهُ الْعَرَبُ وَأَمَّا الصَّنْجُ ذُو الْأَوْتَارِ فَمُخْتَصٌّ بِهِ الْعَجَمُ وَكِلَاهُمَا مُعَرَّبٌ. (المصباح المنير في غريب الشرح الكبير: ۱/ ۳۴۸)

صنج ایک آلۂ لہو ہے، جس کی جمع صنوج ہے، جیسے فلس کی جمع فلوس۔مطرزی نے کہا کہ یہ دو گولے ہوتے ہیں جن میں سے ایک کو دوسرے پر مارا جاتا ہے۔اسی طرح دف کے چاروں طرف جو چھوٹے چھوٹے جھانجھ ہوتے ہیں، ان کو بھی صنوج کہا جاتا ہے۔صنج کا یہ وہ مفہوم ہے جس سے عرب واقف ہیں۔رہا وہ صنج جس میں تار لگے ہوتے ہیں، تو یہ صرف عجم میں پایا جاتا ہے اور یہ دونوں ہی معرب ہیں۔

---

(۱)(5) قال المولف فی ذیل هذا الحديث: أخرجه أبو نعيم في المعرفة (5/2768، رقم 6578)، والطبراني (22/201، رقم 529)، وابن الأثير في الأُسد (5/385)، انظر صَحِيح الْجَامِع: 1010، 1011، 1013، الصَّحِيحَة: 1463

اس سے بھی واضح ہوا کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں اصحاب رسول اپنی شادیوں میں دف کے علاوہ دیگر آلات موسیقی؛ طبل اور جھانجھ(۱) وغیرہ کا بھی استعمال کرتے تھے۔

تیرھویں حدیث

عَنْ قَيْسِ بْنِ سَعْدٍ، قَالَ مَا كَانَ شَيْءٌ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا وَقَدْ رَأَيْتُهُ، إِلَّا شَيْءٌ وَاحِدٌ، فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُقَلَّسُ لَهُ يَوْمَ الْفِطْرِ ۔(سنن ابن ماجه، كِتَابُ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ، وَالسُّنَّةُ فِيهَا، بَابُ مَا جَاءَ فِي التَّقْلِيسِ يَوْمَ الْعِيدِ(۲)

حضرت قیس بن سعد فرماتے ہیں: عہد رسالت کی ہر چیز مجھے نظر آئی سوائے ایک چیز کے۔ اور وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے عید الفطر کے دن تقلیس کی جاتی تھی۔

شَهِدَ عِيَاضٌ الْأَشْعَرِيُّ عِيدًا بِالْأَنْبَارِ، فَقَالَ: مَا لِي لَا أَرَاكُمْ تُقَلِّسُونَ كَمَا كَانَ يُقَلَّسُ عِنْدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.(سنن ابن ماجه، كِتَابُ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ، وَالسُّنَّةُ فِيهَا، بَابُ مَا جَاءَ فِي التَّقْلِيسِ يَوْمَ الْعِيدِ(۳)

عیاض اشعری ایک بار انبار کی تقریب عید میں موجود تھے۔ فرمایا: کیا بات ہے کہ میں تمہیں تقلیس کرتا نہیں دیکھتا، جیسا کہ عہد رسالت میں لوگ کرتے تھے۔

قَالَ يُوسُفُ بْنُ عَدِيٍّ: التَّقْلِيسُ أَنْ تَقْعُدَ الْجَوَارِي وَالصِّبْيَانُ عَلَى أَفْوَاهِ الطُّرُقِ يَلْعَبُونَ بِالطَّبْلِ وَغَيْرِ ذَلِكَ (السنن الکبریٰ، جماع ابواب من تجوز شھادتہ، باب مالا ینھی عنہ من اللعب)

یوسف بن عدی کہتے ہیں: تقلیس یہ ہے کہ لڑکیاں راستوں کے نکڑ پر بیٹھ کر طبل وغیرہ بجائیں۔

ابوحاتم رازی نے تقلیس کے معنی اسلحہ سے کھیلنا بتائے ہیں۔(۴) محمد فواد عبد الباقی ابن ماجہ کے اس باب کے حاشیے پر لکھتے ہیں:

---

(۱) المنجد اردو میں صنج کے معنی جانجھ اور مجیرا لکھے ہیں، جب کہ فیروز اللغات فارسی میں اس کے معنی جھانجھ، جلاجل اور پیتل کا ایک ساز رقم ہیں۔

(۲) هذا إسناد ظاهره الصحة، فإن رجاله كلهم ثقات من رجال الشيخين، وجرى على ظاهره البوصيري في "الزوائد" فقال (2/81): إسناده صحيح، رجاله ثقات۔ (سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة وأثرها السيئ في الأمة: 278/9)، ثم ضعفه الألباني حسب خشونة طبعه وعداوته من الموسيقى۔

(۳) هَذَا إِسْنَادٌ رِجَالُهُ ثِقَاتٌ (مصباح الزجاجة في زوائد ابن ماجه: 154/1)، وَعِيَاضٌ هَذَا رَجُلٌ مِنَ التَّابِعِينَ فَعَادَ الْحَدِيثُ بِهِ إِلَى أَنْ صَارَ مُنْقَطِعًا۔ (شرح مشكل الآثار: 129/4)، أقول: بل ذكره العديد من المورخين أنه صحابی، يقول الخطيب فی تاريخه: قال الشيخ أبو بكر: وقد ذكره غير واحد من العلماء في جملة الصحابة، وأخرج حديثه في المسند۔ (تاريخ بغداد وذيوله: 221/1) و مع كونه تابعيا فان الحديث مويد بما رواه الصحابی الجليل قيس بن سعد، وقد مر آنفا، و مع ذلک ضعيف عند الألبانی، و لا يخفی سببه علی من لا يخفی طبعه۔

(۴) معنى التقليس: أن الحبش كانوا يلعبون يوم الفطر بعد الصلاة بالحراب. (علل الحديث لابن أبي حاتم (575/2)

تقلیس دف بجانا اور نغمہ سنجی کرنا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ امیر کے شہر واپس آنے پر اس کے سامنے جو تماشہ کیا جاتا ہے، اس کا نام تقلیس ہے۔ حکام کی آمد پر لڑکیوں کی طرف سے مختلف ساز ونغمہ سے استقبال کیے جانے کو بھی تقلیس کہا جاتا ہے۔(۱)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں عید کے دن جگہ جگہ بچیاں دف اور طبل وغیرہ بجایا کرتی تھیں۔ جوان اسلحہ جات سے کھیلتے اور اپنے فن کا جوہر دکھاتے۔ اس قسم کی عام تفریح طبع صرف عید کے دن مروج تھی۔ جن روایات میں آیا ہے کہ عید کے دن کی رخصت ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ باضابطہ تفریح طبع کے لیے جگہ جگہ سازوں کا اہتمام، کھیل تماشہ یہ عید کے دن کی خصوصیت تھی۔ رہے دیگر ایام تو ان میں لوگ صنعت، حرفت، زراعت، تجارت، جہاد، ذکر وتسبیح اور دیگر سنجیدہ اشغال میں مشغول ہوتے۔ ہر وقت اور ہر دن انسان بیٹھ کر تفریح طبع ہی کرتا رہے، یہ اہل ایمان بالخصوص اہل تقویٰ اور بطور اخص الخصوص اصحاب رسول کو زیبا نہیں دیتا۔ لیکن افسوس کہ اس کے معنی بہتوں نے یہ سمجھ لیے کہ دف بجانا عید کے دن جائز اور دوسرے دن ناجائز ہے۔ عید کی خصوصیت اگر ایسی ہی ہوتی کہ اس کے لیے ناجائز چیزیں بھی جائز ہوجائیں تب تو اس دن شراب وکباب کی مجالس کو بھی جائز ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ دیگر غیر مسلم ثقافتوں کی عیدوں کا یہی حال ہے۔ سال بھر شراب کے خلاف Campaign چلانے والے اپنے تہوار کے دن شراب پینا ہرگز نہیں بھولتے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ وھو اعلیٰ واعلم!

چودھویں حدیث

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِبَعْضِ الْمَدِينَةِ، فَإِذَا هُوَ بِجَوَارٍ يَضْرِبْنَ بِدُفِّهِنَّ، وَيَتَغَنَّيْنَ، وَيَقُلْنَ: [البحر الرجز]

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ - يَا حَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِنْ جَارِ

فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اللهُ يَعْلَمُ إِنِّي لَأُحِبُّكُنَّ (سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الغناء والدف(۲)

حضرت انس ابن مالک سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ مدینہ کے کسی شخص کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ اس کے قریب لڑکیاں دف بجا رہی ہیں اور نغمے گا رہی ہیں اور یہ کہہ رہی ہیں:

ہم بنی نجار کی ہیں بیٹیاں
خوش ہیں پاکر پاس اپنے مصطفیٰ

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اللہ گواہ ہے کہ میں تم سب سے محبت کرتا ہوں۔

---

(۱) (التقليس) هو الضرب بالدف والغناء. وقيل هو الذي يلعب بين يدي الأمير إذا قدم المصر. والتقليس استقبال الولاة عند قدومهم بأصناف اللهو۔

(۲) هَذَا إِسْنَادٌ صَحِيحٌ رِجَالُهُ ثِقَاتٌ وَبَعْضُهُ مِنَ الصَّحِيحَيْنِ۔ (مصباح الزجاجۃ فی زوائد ابن ماجہ: ۲۲/۱۰۶)

تطبیق وتجزیہ

آلات نغمہ کی حلت وحرمت سے متعلق احادیث کے اس مختصر مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ہر دو جانب صحیح وحسن اور ضعیف روایات کا انبار ہے۔ ایسے مواقع پر جب کہ کسی ایک جانب کی احادیث کی مطلقاً تضعیف ممکن نہ ہو، (افسوس کہ موسیقی پر لکھنے والے بیشتر اہل قلم نے اس ناممکن کو ممکن بنادیا ہے) تو ایک ہی راہ بچ جاتی ہے کہ ان دونوں کے بیچ تطبیق وتوفیق کی راہ تلاش کی جائے۔ نامور دیوبندی عالم مفتی شفیع نے بھی یہی عمل انجام دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جو شخص بھی مذکورہ روایات کو اس طرح بنظر غائر دیکھے گا، وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ان روایات کا مرکزی مفہوم فی الجملہ ثابت اور مستند ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض روایات کی اسناد پر کلام کیا گیا ہے اور ان کا نہ صرف ضعیف بلکہ انتہائی درجہ کا ضعف مسلم ہے، لیکن ان سب روایات کا سرے سے انکار یا سب ہی کو ضعیف قرار دے دینا کسی طرح ممکن نہیں ہے، بلکہ دونوں قسم کی روایات میں کچھ کو صحیح اور کچھ کو حسن ماننا ناگزیر ہے۔

چنانچہ ایک صاحب بصیرت ناقد لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے غنا ومزامیر کی حرمت ثابت ہے، اسی طرح آپ سے بعض مواقع پر ان کے بعض اقسام کی اباحت بھی ثابت ہے۔ لہٰذا اس پر لازم ہے کہ وہ اس باب میں تحقیق کے لیے غور وفکر سے کام لے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے یہ ظاہری تعارض اور تضاد بھی دور ہوجائے۔'' (اسلام اور موسیقی: ۲۳۱)

مفتی شفیع کی پہلی تطبیق

مفتی محمد شفیع نے اس کے بعد دو تطبیقات فرمائی ہیں۔ پہلی تطبیق میں **الاصل فی الاشیاء اباحۃ** اور **قبیح لعینہ و قبیح لغیرہ** پر اصولی گفتگو کرتے ہوئے اسے اصلاً مباح اور قبیح لغیرہ قرار دیا ہے اور ممانعت کو کسی علت کے تابع مانا ہے، جو یقیناً درست اور صحیح تطبیق ہے۔ اس کے بعد عالم سکر میں کیا کیا لکھا ہے، کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ مثلاً:

''اس اصولی بات کو سمجھ لینے کے بعد مختلف روایات میں نظر آنے والا تعارض بھی دور ہوجاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام معازف ومزامیر (باجے تاشے) کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان آلات لہو ولعب اور غناء مجرد کو حرام کیا ہے جو ذکر اللہ اور فکر آخرت سے غفلت پیدا کریں۔''

ممکن ہے کہ اس عبارت میں پہلا حرام مصنف کی ناراضگی یا کاتب کی غلطی کے سبب حلال سے حرام ہوا ہو۔ اس صورت میں بات بالکل درست اور سابق اصول کے موافق ہوگی۔ صورت موجودہ میں سوال یہ ہے کہ جب ان آلات کی حرمت قبیح لغیرہ ہے، جیسا کہ انہوں نے اس کی وضاحت کی ہے، پھر ایک طرف سے ''تمام معازف ومزامیر'' مطلقاً کیوں حرام ہوگئے؟ اور جب ''تمام مطلقاً حرام'' ہوگئے تو پھر ان میں ''اس کے علاوہ وہ

آلات لہو ولعب'' کہاں سے نکل آئے جو ذکر اللہ سے غفلت پیدا کرتے ہیں؟ پھر ذکر اللہ سے غفلت پیدا کرنے والے اور غفلت پیدا نہ کرنے والے آلات کی تقسیم کس بنیاد پر ہے اور ان میں سے کون کون سے پہلے گروپ میں ہیں اور کون سے دوسرے گروپ میں؟ بھلا آلات موسیقی میں کچھ ایسے بھی ہیں جو از خود اللہ سے غفلت پیدا کرتے ہیں؟ اور اگر خدانخواستہ ایسا اعجوبہ موجود ہے تو پھر تمام آلات موسیقی کے حرام لغیرہ ہونے کے کیا معنی ہیں؟

معاملہ یہ ہے کہ جس طرح غنا ے مجرد قبیح مضامین اور غیر صالح زبان واقوال اور احوال واوقات کے ساتھ ہو تو وہ قبیح ہوتا ہے ورنہ مباح یا مندوب ہوتا ہے، یہی حال آلات غنا کا بھی ہے۔ اس میں تمام یوں اور کچھ یوں اور یوں کی پیچہ کاری کی کیا حاجت؟ مفتی شفیع نے اصولی اعتبار سے درست تطبیق دی ہے، لیکن اس کے بعد نہ جانے کون سی مصلحت یا خوف نے اس واضح اور بدیہی تطبیق کو اقلیدس کا خیالی نکتہ اور معشوق کی موہوم کمر بنا کر رکھ دیا ہے۔

مفتی شفیع کی دوسری تطبیق

مفتی شفیع دیوبندی نے دوسری تطبیق کے ذیل میں لکھا ہے کہ غنا کے دو معنی ہیں؛ ان میں ایک معنی کے لحاظ سے غنا جائز ہے اور دوسرے کے لحاظ سے ناجائز۔ اس لیے دونوں طرح کی احادیث غنا کو غنا کے الگ الگ مفہوم پر منطبق کرنے سے تضاد ختم ہو جاتا ہے۔

اس ذیل میں بھی وہ اپنی افتادِ طبع کے مطابق اس سلجھی تطبیق کو قدم قدم پر الجھاتے رہے ہیں۔ تاہم حافظ ابن حجر مکی کی درج ذیل بات جو انہوں نے نقل کی ہے، اس سے ان کے مدعا کی درست وضاحت اور مناسب تطبیق ہو جاتی ہے:

> ''حضرت عائشہ نے ان لڑکیوں کے بارے میں تصریح کی ہے کہ وہ دونوں کوئی پیشہ ور گانے والیاں نہیں تھیں۔ ولیستا بمغنیتین۔ اس طرح ابتداء ظاہری الفاظ سے جو وہم ہوتا تھا، اسے آپ نے دور کر دیا۔ وجہ یہ ہے کہ غنا کا اطلاق عربی زبان میں ترنم اور بلند آواز سے پڑھنے پر ہوتا ہے، جسے اہل عرب نصب کہتے ہیں۔ اسی طرح حدی خوانی پر بھی غنا کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن نصب یا حدی خوان کو مغنی نہیں کہا جاتا، مغنی صرف اس شخص کو کہتے ہیں جو آواز کو زیر و بم کے ساتھ لوگوں کے جذبات بھڑکا کر ایسے اشعار گائے جن میں گندی باتوں کی صراحت یا اشارہ ہو۔''

(اسلام اور موسیقی، ص: ۲۵۳)

مفتی شفیع کی یہ تطبیق اور علامہ ابن حجر کی یہ تحقیق صرف غنا کے دو مختلف معانی اور اس سے متعلق حلت وحرمت کے نصوص کے درمیان پیدا ظاہری تضاد کو ختم کرتی ہے، البتہ ہم اسی نہج پر آلات موسیقی سے متعلق وارد بظاہر متضاد نصوص میں بھی توفیق وتطبیق پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ یوں کہ ہم کہیں کہ:

''احادیث کریمہ میں معازف ومزامیر کا اطلاق کبھی تو اس کے اصل لغوی معنی کے اعتبار سے آلات

موسیقی کے مفہوم میں ہوا ہے، جو مفتی شفیع کے بقول قبیح لغیرہ ہیں۔ لہٰذا اصل کے لحاظ سے ان کا استعمال مباح ہے اور اگر اس کے ساتھ اچھے مضامین پر مشتمل دینی، اخلاقی اور فکری و انقلابی اشعار پڑھے جا رہے ہوں تو ان کے اندر ندب واستحباب بھی پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح معازف و مزامیر کا اطلاق اس خصوص میں بھی ہوا ہے جو عہد جاہلیت سے اب تک فسق و فجور، رقص و سرود اور شراب و کباب کی مجالس میں ہوس و شہوت کو بڑھانے کے لیے آلات موسیقی کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس کی تائید مزید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے جن کے اندر آلات و معازف کا ذکر شراب و شباب کے ساتھ ہوا ہے۔ لہٰذا مزامیر و معازف کی حرمت و شناعت کی بات جہاں کی گئی ہے وہ اسی خصوصی تناظر میں ہے۔''

علامہ زرادی کی تطبیق

ہم اپنی بات علامہ فخر الدین زرادی کی بات پر ختم کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے پیر و مرشد سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے اپنے رسالہ اصول السماع کی اصل سوم کے تحت لکھی ہے:

مزمار وہ آلہ ہے جس میں موزون آواز پائی جائے اور اپنی ذات کی طرف نظر کرتے ہوئے یہ مباح ہے، جیسا کہ اہل علم نے بتایا ہے۔ رہی اس کی حرمت تو اس کی علت ایک دوسری چیز ہے اور وہ ہے شراب نوشی کی یاد کا تازہ ہونا، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ثقہ راویوں نے بیان کیا ہے کہ جب شراب حرام ہوئی تو مزامیر بھی حرام ہو گیا۔ اس لیے کہ شراب پیتے وقت لوگ مزامیر بجایا کرتے تھے، اس لیے اب اس کا بجانا حرام کر دیا گیا تاکہ اس سے شراب نوشی کی یاد تازہ نہ ہو جائے۔ اس طرح مزامیر قبیح لغیرہ ہوا۔ تو اب جب بھی یہ علت حرمت مفقود ہوگی، اس وقت یقینی طور پر مزامیر کی حرمت بھی ختم ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جنگوں میں طبل اور اچھے اوقات میں 'شخ' (شہنائی) وغیرہ بجانا درست ہے۔ ثابت ہوا کہ علت بدلنے سے مزامیر کا حکم بھی بدل جائے گا۔

اگر نفس لہو سے پاک ہو، مزکّٰی و مصفّٰی ہو، مشتاق لقائے مولیٰ ہو، ایسی صورت میں مزامیر کی آواز آلودگی سے صفائی کی طرف اور پستی سے بلندی کی طرف لے جانے والی ہوگی۔ اس لیے کہ اچھی آواز روح کی غذا ہے اور یہ غذا عالم ملکوت میں روح کی پرواز میں معاون ہوگی۔ اس کی تائید حضرت ذوالنون مصری کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ آپ سے اچھی آواز کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ خطاب غیبی اور اشارۂ غیبی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے ہر اچھے اور پاک مرد و عورت کے اندر ودیعت فرما دیا ہے۔ ثابت ہوا کہ اچھے مرد و عورت کے لیے سماع مزامیر جائز ہے، کیوں کہ ان کے حق میں مزامیر کی حرمت کی علت مفقود ہے۔ اسے جنگوں میں بجنے والے

نقاروں پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اعلان نکاح کے لیے نبی کرم ﷺ نے دف بجانے کو جائز کہا ہے۔صحیح حدیث ہے: **اعلنو ا النکاح و لو بالدف** اگر چہ دف سے ہو، نکاح کا اعلان کرو۔عید اور دیگر مسرت کے دنوں میں بھی دف بجانے کی دیگر روایتیں موجود ہیں۔ غور کرو کہ دف میں دو اوصاف ہیں؛ مسرت انگیزی اور اعلان ،مسرت اس کی آواز کی موزونیت کی وجہ سے ہے اور اعلان اس آواز کی بلندی کے سبب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے انھیں دو اوصاف کے پیش نظر دف بجانے اور سننے کو مباح فرمایا۔لہٰذا دف کے علاوہ دیگر مزامیر کو بھی انھیں پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔اس لیے کہ ان کی حرمت ،علت حرمت کی موجودگی کے سبب تھی، جب علت نہ رہی تو اب حرمت بھی نہ رہی۔(۱۸-۲۲)

ہماری تطبیق

ہم ان تینوں تطبیقات سے اتفاق کرتے ہوئے، انہی سے استفادہ کرتے ہوئے اور انہی باتوں کی تلخیص کرتے ہوئے عرض گذار ہیں کہ آلات موسیقی کی حرمت کا مسئلہ اسی تفصیل کے ساتھ ہے جو نغمہ کے حوالے سے (پہلی قسط میں) گزر چکی۔اگر ان آلات کا بجانا یا سننا از راہ لہو ہو تو حرام ہوگا اور بغیر لہو کے ہو تو مباح ہوگا۔ہاں !اگر ان میں سے کوئی آلہ کسی زمانے یا علاقے میں اشرار کا شعار ہو تو از راہ سد مفاسد ان کی بھی ممانعت ہوگی اور ظاہر ہے یہ ممانعت بھی تشبہ کے سبب ہوگی، اصلاً نہیں ہوگی۔لہٰذا تشبہ ختم ہونے کے ساتھ ہی حرمت بھی ختم ہو جائے گی۔

یہاں ایک بات کی مزید وضاحت ضروری ہے کہ لہو اپنے متعارف یا خصوصی معنی میں مذموم ہے، ورنہ از راہ لغت لہو کے مفہوم میں تفریح طبع اور زینت حیات کے تمام- جائز و ناجائز- اسباب شامل ہیں۔اور اس عموم کے لحاظ سے لہو مطلقاً حرام نہیں ہے، بلکہ تفریح طبع اور زینت حیات اپنی اصل کے لحاظ سے جائز ہیں۔ البتہ اس میں اشتغال کے سبب کسی فرض یا حق کا ترک یا کسی حرام و مکروہ کا ارتکاب ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں وہ لہو بھی ضرور حرام یا مکروہ ہو جائے گا۔لیکن چوں کہ اصطلاح فقہ میں بالعموم اسی منفی مفہوم میں لہو بولا جاتا ہے، اس لیے ہم نے اوپر مطلقاً لہو کے سبب آلات موسیقی کو حرام کہا۔ اُس بات کو اِس دوسرے نکتے سے جوڑ کر دیکھا جائے تبھی صحیح اور پوری حقیقت سامنے آئے گی۔

استدراک

سابقہ گفتگو سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ آلات نغمہ و موسیقی کے حوالے سے حلت و حرمت ہر دو کے حق میں نصوص موجود ہیں اور نہ صرف موجود ہیں بلکہ کثرت سے موجود ہیں جن میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر طرح کی احادیث شامل ہیں اور علم حدیث کی روشنی میں یہ بات بھی معلوم ہے کہ احکام میں صحیح اور حسن احادیث مقبول ہیں۔ علم حدیث کی روشنی میں اہل نظر پر یہ بات بھی روشن ہے کہ اگر احادیث مقبولہ کی معارض احادیث موجود ہوں تو

دیکھا جائے گا کہ وہ معارض احادیث مقبول ہیں یا مردود؟ اگر مردود ہوں تو انہیں رد کر دیا جائے گا اور وہاں پر موجود مقبول احادیث کو بلا معارض سمجھا جائے گا۔ بصورت دیگر- یعنی معارض احادیث بھی مقبول؛ صحیح یا حسن ہوں تو- سب سے پہلے دونوں طرح کی احادیث میں جمع و تطبیق کی کوشش کی جائے گی جس کے لیے محدثین نے فن مختلف الحدیث ایجاد کیا ہے۔(۱)

سابقہ گفتگو سے یہ بھی واضح ہوا کہ آلات نغمہ کے حوالے سے جو بظاہر متعارض نصوص ہیں ان میں اصل کام جمع و تطبیق کا ہے۔ حلت یا حرمت میں سے کسی بھی ایک جہت کی احادیث کو بالکلیہ رد کر دینا انصاف نہیں ہے، جیسا کہ بہت سے اہل ہنر نے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔

اب رہی بات تطبیق کی تو متعارض نصوص کے درمیان تطبیق کی راہ بالعموم یہی ہوتی ہے کہ آدمی حلت کے نصوص کو اصل مان لے اور حرمت کو استثنائی اور مقید مان لے یا حرمت کے نصوص کو اصل مان لے اور حلت کو استثنائی اور مقید مان لے؟ آلات موسیقی کے حوالے سے متعارض نصوص کی تطبیق جن علما نے فرمائی ہے وہ عام طور پر انہی دو میں سے کسی ایک طریقے پر دلائل کی روشنی میں فرمائی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ جمع و تطبیق کا عمل ایک اجتہادی عمل ہے اور آلات نغمہ کے حوالے سے علماے اسلام کا اختلاف اجتہادی نوعیت کا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ اجتہادی معاملات میں طرفین میں سے کسی پر بھی لعنت وملامت کرنا ایک قابل لعنت وملامت عمل ہے۔

سابقہ گفتگو سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اس کم علم نے گذشتہ صفحات میں دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آلات نغمہ کے حوالے سے شریعت کا اصل حکم حلت کا ہے، لہٰذا حرمت کے نصوص استثنائی یا مقید صورتوں کے لیے ہیں۔ یہ تطبیق راقم نے اپنی تحقیق و تفتیش کی روشنی میں کی ہے، اس لیے اس پر سختی سے قائم ہے، البتہ رہے وہ اہل علم جو اس تطبیق سے متفق نہیں اور ان کے نزدیک آلات نغمہ کے حوالے سے حرمت کا حکم ہی اصل ہے اور حلت استثنائی اور مقید ہے تو یہ ان کی اپنی رائے ہے، راقم جس کا احترام کرتا ہے اور اس رائے کی وجہ سے انہیں مستحق لعنت وملامت نہیں سمجھتا۔

بہرکیف! آلات نغمہ کے حوالے سے نصوص کے درمیان تطبیق کے بعد ان کے درمیان ظاہری تعارض کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان نصوص کے درمیان جن اہل علم نے ترجیح کا عمل انجام دیا ہے وہ نامقبول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بظاہر متعارض نصوص میں ترجیح کا عمل اس وقت انجام دیا جاتا ہے جب کہ ان کے درمیان تطبیق ممکن نہ ہو۔ علامہ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) رقم طراز ہیں:

---

(۱) إنْ عُورِضَ فلا يَخْلو: إما أنْ يكونَ مُعارِضُه مقبولاً مثلَه، أو يكونَ مردوداً. فالثاني لا أثر له لأن القوي لا يؤثر فيه مخالفةُ الضعيف. وإن كانت المعارضة بمثله، فلا يَخْلو: إما أن يمكن الجمع بين مدلوليهما بغير تعسُّفٍ، أو لا، فإن أمكن الجمع فهو النوع المسمَّى: مختَلِفَ-الحديث. (نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر: ۹۰)

فصار ما ظاهره التعارض واقعاً على هذا الترتيب: 1 - الجَمْعُ إن أمكن. 2 - فاعتبار الناسخ والمنسوخ. 3 - فالترجيح إنْ تَعَيّن. 4 - ثم التوقف عن العمل بأَحَدِ الحديثين (۱)

جن احادیث میں بظاہر تعارض ہو، ان کے اس تعارض کا ازالہ حسب ذیل ترتیب پر ہوگا:

۱- اگر [ان دونوں کے جداگانہ محامل کی تلاش] ممکن ہو تو تطبیق کی جائے گی۔

۲- [اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر دیکھا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کا تاریخی اعتبار سے تقدم ثابت ہے یا نہیں؟ اگر دلائل سے تقدم و تاخر ثابت ہو جائے تو] ناسخ اور منسوخ کا اعتبار کیا جائے گا۔ [یعنی متاخر کو ناسخ اور متقدم کو منسوخ سمجھا جائے گا۔]

۳- [اور اگر ان میں سے ایک کا دوسرے پر تاریخی تقدم ثابت نہ ہو سکے تو دیکھا جائے کہ کسی بھی جہت سے ان میں سے ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح ثابت کرنا ممکن ہے یا نہیں؟ اگر ایسا ممکن ہو تو] ان میں سے ایک کی ترجیح کی جائے گی، بشرطے کہ کسی ایک پہلو کی ترجیح متعین ہو جائے۔

۴- ورنہ پھر ان میں سے کسی بھی حدیث پر عمل کرنے کے سلسلے میں توقف کیا جائے گا۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ نغمہ اور آلات نغمہ کے سلسلے میں وارد بظاہر متعارض نصوص کے درمیان جب مناسب تطبیق ہو جا رہی ہے تو اب اس کے بعد ان کے بیچ ترجیح کی راہ تلاش کرنا اصول حدیث سے ناواقفیت پر مبنی ایک کار عبث ہے، جسے بعض اہل علم نے بڑی جان کاہی سے انجام دیا ہے۔

اب خیر سے ان حضرات کی ترجیح - جس کی سرے سے حاجت ہی نہیں تھی - پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ ان حضرات نے سند و متن دونوں لحاظ سے احادیث حرمت کو ترجیح دی ہے۔ سند کے لحاظ سے ان کی ترجیح کے سلسلے میں پھر ہم وہی عرض کریں گے جو "تطبیق و تجزیہ" کے ذیل میں ابتدائی سطور کے اندر عرض کر چکے ہیں۔ رہی ترجیح باعتبار متن، تو اس سلسلے میں فقہ کے حسب ذیل دو قواعد پیش کیے جاتے ہیں۔

۱- جب دلائل اباحت و حرمت جمع ہوں تو دلائل حرمت کو ترجیح ہوتی ہے۔(۲)

۲- متعارض سنتوں میں اقوال صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔(۳)

پہلے قاعدے سے ان کے مدعا پر استدلال تو واضح ہے، جب کہ دوسرے قاعدے کا انطباق ان کے مدعا پر یوں ہوتا ہے کہ ان کے مطابق صحابہ، تابعین اور ائمۂ مجتہدین نے حرمت کے پہلو کو ہی اختیار فرمایا ہے۔ یہاں پر قابل غور ہے کہ:

---

(۱) نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر، ص: ۹۵

(۲) إذَا اجْتَمَعَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ غَلَبَ الْحَرَامُ وَبِمَعْنَاهَا: مَا اجْتَمَعَ مُحَرِّمٌ وَمُبِيحٌ إلَّا غَلَبَ الْمُحَرِّمُ (الْأَشْبَاهِ وَالنَّظَائِرِ، ص: ۹۳)

(۳) اذا وقع التعارض بین السنتین وجب المصیر الی قول الصحابة (التفسیرات الاحمدیۃ، ص: ۴۱۸)

۱- یہ دونوں قاعدے اس وقت کے لیے ہیں جب کہ دلائل اباحت وحرمت متعارض ہوں اور ان میں تطبیق ناممکن ہو اور یہاں جب کہ ان کے بیچ تطبیق ہوگئی تو اب سرے سے ان قواعد کی یہاں حاجت ہی نہ رہی۔

۲- دلائل حرمت کی ترجیح والے قاعدے کا جہاں انطباق ہوتا ہے وہاں حرمت کو ترجیح ہوجاتی ہے اور حلت ختم ہوجاتی ہے، جب کہ اہل علم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو اس بات کا قائل ہو کہ آلات نغمہ کے دلائل حرمت راجح ہیں اور اب کوئی آلۂ نغمہ حلال نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ کیس ترجیح کا نہیں تطبیق کا ہے۔

۳- آلات موسیقی کے سلسلے میں وارد متعارض نصوص میں صحابہ کے قول وعمل سے ترجیح کی بات خود ایک علاحدہ وجہ ترجیح کی محتاج ہے۔ چوں کہ جو ظاہری تعارض رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں ہے وہی ظاہری تعارض صحابہ کے آثار میں ہے اور آثار صحابہ میں سے صرف حرمت والے نصوص کو نقل کرنا وہی جرم ہے جو جرم احادیث رسول نقل کرتے ہوئے بعض غیر امین لوگ کیا کرتے ہیں۔ یعنی حرمت کے تمام نصوص اور ان کے تمام طرق کو نقل کرتے ہیں اور حلت سے متعلق نصوص کو نظرانداز کر جاتے ہیں۔ رہا اجماع امت یا اتفاق ائمہ کا دعویٰ ففیہ نظر! تفصیل آگے آتی ہے۔

سماع آلات موسیقی- مذاہب اربعہ کی روشنی میں

افسوس کہ فقہا کی عبارتیں موسیقی اور آلات موسیقی کے باب میں بہت کم ہی اصولی اور منضبط ہیں۔ عموماً وہ جزوی طور پر غیر منضبط گفتگو کرتے ہیں۔ اِلا ماشاء اللہ۔ علامہ ابن عابدین شامی انہی میں سے ایک ہیں جنہوں نے بعض مقامات پر اصولی گفتگو کی ہے۔ علامہ شامی نے ردالمحتار میں یہ بڑی جامع، منضبط اور اصولی بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

> **اَلَةُ اللَّهْوِ لَيْسَتْ مُحَرَّمَةً لِعَيْنِهَا، بَلْ لِقَصْدِ اللَّهْوِ مِنْهَا إِمَّا مِنْ سَامِعِهَا أَوْ مِنَ الْمُشْتَغِلِ بِهَا وَبِهِ تُشْعِرُ الْإِضَافَةُ أَلَا تَرَى أَنَّ ضَرْبَ تِلْكَ الْآلَةِ بِعَيْنِهَا حَلَّ تَارَةً وَحَرُمَ أُخْرَى بِاخْتِلَافِ النِّيَّةِ بِسَمَاعِهَا وَالْأُمُورُ بِمَقَاصِدِهَا۔**
>
> آلات لہو بالذات حرام نہیں ہیں، بلکہ ارادۂ لہو کے سبب سے حرام ہیں۔ اب یہ ارادۂ لہو خواہ سننے والے کی طرف سے ہو یا بجانے والے کی طرف سے۔ آلات لہو میں موجود اضافت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک ہی آلے کا بجانا کبھی حلال ہوتا ہے اور کبھی اسی کا بجانا حرام ہوجاتا ہے اور ایسا نیت سماع میں اختلاف کے سبب ہوتا ہے۔ چوں کہ احکام، مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔ (ردالمحتار علی الدر المختار، ۶/ ۳۵۰)

فقہیات کے حوالے سے ایک دوسری دشواری یہ پیش آتی ہے کہ خصوصاً اس مسئلے میں مذاہب اربعہ کے نام پر فقہائے مذاہب کے اقوال اور احتیاطات وتخمینات کا تو انبار ہے، لیکن عام طور پر جو کچھ حضرات تحریم نقل کرتے

ہیں اس کے اندر مجتہدین اربعہ کے اقوال کم ہی نظر آتے ہیں۔اس پر یہ خلط مبحث مستزاد کہ حرمت غنا کو آلات غنا پر تھوپ دیا اور خود غنا کی حرمت وکراہت کو تو مقید رکھا، لیکن اس سے آلات غنا کی حرمت کو مطلقاً ثابت کردیا۔

یہاں ایک تیسری مشکل کا سامنا یہ ہے کہ پیشہ ور مغنی اور مغنیات کی فحش سرائی اور شہوت نوائی سے متعلق اقوال فقہا کو اپنے احتیاط کی بنیاد پر اتنا عام کر دیا کہ اس کے اندر صالحین، ثنا خوانوں اور نعت خوانوں کی نغمہ سنجیوں اور نے نوازیوں کے لیے بھی جواز وحلت کی کوئی جگہ نہیں بچی، یہ اور بات کہ پھر اپنے ذوق وشوق کی بنیاد پر حمد ونعت کو غنا کے عمومی حکم سے خارج کردیا، لیکن آلات حمد ونعت کو زبردستی آلات لہو ولعب ہی بنائے رکھا اور انہیں بہر صورت حرام حرام اور اشد حرام کہتے رہے۔خدا جانے کہ یہ فقہی جبر؛ احتیاط، سد ذرائع اور تقویٰ شعاری کا کون سا باب ہے جس نے صالحین پر سب وشتم اور ان کی تفسیق وتضلیل اور بعض اوقات تکفیر ولعنت کا دروازہ کھول دیا۔

بعض فقہائے متاخرین نے ایک نیکی یہ بھی کی ہے کہ غنا سے متعلق جو جواز کے احادیث واقوال ملے ہیں ان کو اپنے ذوق کے لحاظ سے غنائے مجرد پر محمول کر دیا ہے اور جو حرمت کے احادیث واقوال ملے ان کو اپنی تقشّف مزاجی سے مجبور ہو کر غنا بالآلات پر محمول کر دیا۔ خیر! ع- جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اب ہم یہاں آلات موسیقی کے حوالے سے ائمۂ اربعہ اور فقہاے مذاہب کے کچھ اقوال نقل کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کا تحلیل وتجزیہ بھی ہوتا جائے گا اور پھر آخر میں ''تحقیق مقام'' کے زیر عنوان فقہاے محققین کی آرا کی روشنی میں اس بحث کا حسن ختام ہو جائے گا۔

مذہب مالکی کی تحقیق

فقہ مالکی میں موطا کے بعد ''مدونہ'' کا دوسرا درجہ ہے۔اس کا منہج سوال وجواب کا ہے۔اسے سحنون تنوخی (۲۴۰ھ) نے اپنے شیخ اور امام مالک کے شاگرد رشید عبدالرحمٰن بن قاسم (۱۹۱ھ) کے حوالے سے مرتب کیا ہے۔اس کے اندر دف کے حوالے سے یہ مکالمہ موجود ہے:

قُلْتُ: هَلْ كَانَ مَالِك يَكْرَهُ الدِّفَافَ فِي الْعُرْسِ أَوْ يُجِيزُهُ وَهَلْ كَانَ مَالِك يُجِيزُ الْإِجَارَةَ فِيهِ؟ قَالَ: كَانَ مَالِك يَكْرَهُ الدِّفَافَ وَالْمَعَازِفَ كُلَّهَا فِي الْعُرْسِ وَذَلِكَ أَنِّي سَأَلْتُهُ عَنْهُ فَضَعَّفَهُ وَلَمْ يُعْجِبْهُ ذَلِكَ. (المدونة، کتاب الجعل والاجارة، باب فی اجارة الدفاف فی العرس)

میں نے پوچھا: امام مالک دف کو شادی میں مکروہ سمجھتے تھے یا مباح؟ اور کیا امام مالک اس کے اجارہ کو درست سمجھتے تھے؟ فرمایا: امام مالک شادی کے اندر ہر قسم کے دف اور باجوں کو مکروہ سمجھتے تھے۔ وہ یوں کہ ایک بار میں نے اس کے بارے میں آپ سے دریافت کیا تو آپ نے اس کی تضعیف کی اور اسے پسند نہیں فرمایا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام مالک کے نزدیک دف بھی مطلقاً مکروہ تھا، حتیٰ کہ شادی کے مواقع پر بھی وہ

دف کومکروہ سمجھتے تھے، جوسنت سے ثابت ہے۔غور کرنے کی بات یہ ہے کہ امام دارالہجرہ سے یہ بعید ہے کہ ایک ثابت شدہ سنت کووہ مکروہ قرار دیں اور یہ بات بھی نا قابل فہم ہے کہ امام مالک کواس باب میں سنت کا علم نہ رہا ہو۔ اس لیے اس سلسلے میں مدونہ کی روایت از روئے درایت نا قابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ چوں کہ مختلف مصادر میں اس کے خلاف حوالے موجود ہیں۔علامہ کمال الدین جعفرادفوی (۷۴۸ھ) لکھتے ہیں:

”وحکاه [جواز العود] الأستاذ أبو منصور عن مالک بن أنس، وکذلک حکاه الفورانی فی کتابه العمر وحکی الرؤیانی عن القفال عن مالك أنه کان یبیح الغناء علی المعازف، وقد قدمنا في قصة إبراهیم بن سعد في فصل الإجماع عن مالك سماعه“

(الإمتاع بأحکام السماع، مخطوطة، ورق: ۶۵)

استاذ ابومنصور نے امام مالک بن انس سے عود کا جواز نقل کیا ہے۔اسی طرح فورانی نے اپنی کتاب العمر (۱) میں اس کی روایت کی ہے۔اسی طرح رویانی نے قفال کے حوالے سے امام مالک کا مذہب نقل کیا ہے کہ آپ معازف پر غنا کو جائز قرار دیتے تھے اوراس سے قبل اجماع کی بحث میں ابراہیم بن سعد کے واقعے کے ضمن میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ امام مالک نے اسے سنا بھی ہے۔

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ آلات موسیقی کے حوالے سے امام مالک کا مذہب عمومی جواز کا ہے،اس لیے مدونہ کے حوالے سے کراہت دف کا جو مذہب اوپر مذکور ہوا وہ یا تو واجبِ رد ہے، یا پھراس کی مناسب توجیہ ضروری ہوگی۔مثلاً یہ کہ جس طرح احوال زمانہ کے پیش نظر حضرت عمر نے مسجد میں عورتوں کے داخلہ کومنع فرمادیا تھا،ممکن ہےاسی طرح امام مالک نے اپنے احوال زمانہ کے پیش نظر اس قسم کا امتناعی حکم صادر فرمایا ہو۔لہٰذاامام مالک کی یہ رائے از باب سدذرائع ہوئی، نہ کہ اصل حکم شرعی۔

بالفرض اگر ہم ان دونوں روایتوں میں مدونہ کی روایت کو ہی ترجیح دیں؛ کیوں کہ وہ فقہ مالکی میں مؤطا کے بعد سب سے مستند کتاب ہے،تو اس سے صرف یہ معلوم ہوگا کہ آلات موسیقی کے تعلق سے امام مالک کا مذہب کراہت کا ہے۔اب رہا یہ کہ یہ کراہت تحریمی ہے یا تنزیہی؟ تو یہاں چار ایسے قرائن ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب کراہت تحریمی کا نہیں، بلکہ کراہت تنزیہی کا ہے۔

۱-جمہور بشمول مالکیہ کی اصطلاح یہ ہے کہ وہ کراہت کے اطلاق سے بالعموم کراہت تنزیہ ہی مراد لیتے ہیں۔الفقه علی المذاهب الاربعه میں ہے: **والقاعدة في مذهبهم أنهم متی أطلقوا انصرفت الکراهة إلی التنزیهیة؛ وهي خلاف الأولی۔**(۱/ ۷۲) مالکیہ کے مذہب میں قاعدہ یہ ہے کہ جب وہ کراہت مطلق بولتے ہیں تو اس سے کراہت تنزیہی مراد ہوتی ہے، جسے خلاف اولیٰ بھی کہا جاتا ہے۔

---

(۱) مخطوطہ میں کتاب کا نام واضح نہیں ہے۔

۲- دوسرا قرینہ خود مدونہ کی عبارت میں موجود ہے، چوں کہ سائل نے جب امام سے آلات موسیقی کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا جس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کا مذہب کراہت کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کراہت ناپسندیدگی کی بنیاد پر ہوگی ظن غالب ہے کہ وہ کراہت تنزیہی ہی ہوگی۔

۳- چوں کہ دیگر روایات سے آلات موسیقی کا جواز اور سماع ثابت ہے، اب یہ ثبوت ضعیف بھی ہو پھر بھی ان کے موقف میں کراہت کی شدت کو کم کر کے اسے مکروہ تنزیہی بنانے کے لیے کافی ہے۔

۴- چوتھا قرینہ یہ ہے کہ مدونہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک نکاح اور شادی میں بھی دف کو مکروہ سمجھتے ہیں اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ احادیث صحیحہ سے شادی میں دف بجانے کا جواز بلکہ وقوع ثابت ہے۔ اس کے باوجود بھلا امام مالک سے کیوں کر متصور ہوسکتا ہے کہ وہ اسے مکروہ تحریمی کہیں گے۔ ممکن ہے وہ اس اجازت کو جواز کی حد تک مانتے ہوئے لہو سے مشابہت کی وجہ سے مکروہ تنزیہی سمجھتے ہوں، جب کہ یہ بھی ممکن ہے کہ سرے سے وہ روایت ہی درست نہ ہو، البتہ احادیث صحیحہ کے برخلاف آپ شادی میں دف بجانے کو مکروہ تحریمی کہیں، یہ ممکن نہیں ہے اور چوں کہ دف کے ساتھ دیگر معازف کو بھی انہوں نے ایک ہی خانے میں رکھا ہے، اس لیے برتقدیر صحتِ روایت زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب آلات موسیقی کو اصلاً کراہت تنزیہی کے ساتھ مباح سمجھتے ہیں۔

یہ سب باتیں اس وقت ہیں جب مدونہ کی بات تسلیم کی جائے، جب کہ عام مالکیہ نے اسے رد کر دیا ہے۔ مثلاً:

الف: خلیل بن اسحاق جندی (۷۷۶ھ) کی معروف زمانہ متن مالکی مختصر الخلیل میں ہے:

وكره: نثر اللوز والسكر لا الغربال ولو لرجل وَفِي الْكَبَرِ وَالْمِزْهَرِ ثَالِثُهَا يَجُوزُ فِي الْكَبَرِ ابن كنانة وتجوز الزمارة والبوق. (مختصر خليل، باب في أحكام النكاح وما يتبعه، فصل في الوليمة، ص: ۱۱۰)

ب: علامہ دردیر (۱۲۰۱ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ولیمہ میں اخروٹ اور شکر لٹانا اس وقت مکروہ ہے جب کہ کوئی بھی شخص دوسرے کے ہاتھ سے نہ چھینے، ورنہ حرام ہے۔ غربال یعنی وہ دف جسے عرف عام میں طار کہتے ہیں اور صرف اس کی ایک جانب کھال لگی ہوتی ہے، وہ مکروہ نہیں ہے۔ خواہ اسے مرد ہی کیوں نہ بجائیں، بلکہ یہ تو نکاح میں مستحب ہے۔ البتہ کبَر جو کہ بڑے گول طبل کو کہتے ہیں اور جس کے دونوں طرف کھال لگی ہوتی ہے اور مِزہر بروزن منبر یہ چوکور طبل ہوتا ہے، جس میں دونوں طرف کھال لگی ہوتی ہے، جو اب مصر میں نظر نہیں آتا، تو ان دونوں میں تین اقوال ہیں جن میں معتبر قول یہ ہے کہ کبر تو جائز ہے البتہ مزہر مکروہ ہے۔ ابن کنانہ نے کہا کہ بانسری اور بوق یعنی نفیر جس کے دونوں کنارے برابر ہوتے ہیں، جائز ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ یہ دونوں مکروہ ہیں، مدونہ میں امام مالک سے یہی منقول ہے۔ رہے دیگر آلات نغمہ تو ان کے سلسلے میں قول راجح حرمت ہی کا ہے، خواہ نکاح میں ہی کیوں نہ بجائے جائیں۔ واللہ اعلم (الشرح الکبیر لمختصر خلیل)

ج: شرح کبیر کے حاشیہ میں علامہ دسوقی شرح و بسط کے بعد لکھتے ہیں:

وَالْحَاصِلُ أَنَّ الطَّبْلَ بِجَمِيعِ أَنْوَاعِهِ يَجُوزُ فِي النِّكَاحِ مَا لَمْ يَكُنْ فِيهِ صَرَاصِرُ أَوْ وَلَوْ كَانَ فِيهِ عَلَى مَا مَرَّ مِنَ الْخِلَافِ، وَأَمَّا فِي غَيْرِ النِّكَاحِ فَلَا يَجُوزُ شَيْءٌ مِنْهُ اتِّفَاقًا فِي غَيْرِ الدُّفِّ۔۔۔أَيْ يَجُوزُ التَّزْمِيرُ بِهِمَا فِي النِّكَاحِ، وَأَمَّا فِي غَيْرِهِ فَحَرَامٌ ثُمَّ ظَاهِرُ كَلَامِ الْمُصَنِّفِ سَوَاءٌ كَانَ التَّزْمِيرُ بِهِمَا كَثِيرًا أَوْ يَسِيرًا مَعَ أَنَّ ابْنَ كِنَانَةَ قَيَّدَ الْجَوَازَ بِمَا إِذَا كَانَ التَّزْمِيرُ بِهِمَا يَسِيرًا وَإِلَّا حَرُمَ فَعَلَى الْمُصَنِّفِ الْمُؤَاخَذَةُ فِي إِطْلَاقِهِ

حاصل یہ ہے کہ طبل کے تمام اقسام نکاح میں جائز ہیں، اگر ان کے اندر جھانجھ نہ ہو، البتہ جھانجھ ہونے کی صورت میں اختلاف ہے جس کی تفصیل مذکور ہوئی۔ البتہ غیر نکاح میں دف کے سوا ان میں سے کچھ بھی جائز نہیں ہے۔۔۔۔یعنی نکاح میں بانسری اور بوق بجانا جائز ہے، البتہ غیر نکاح میں حرام ہے۔ پھر مصنف کے ظاہر کلام سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ بانسری اور بوق کم بجایا جائے یا زیادہ دونوں برابر ہیں، حالاں کہ ابن کنانہ نے مقدار قلیل کے ساتھ اپنا قول مقید رکھا ہے، ورنہ کثیر مقدار میں ان کے نزدیک بھی حرام ہے۔ ایسی صورت میں مصنف کا مطلقاً قول کرنا قابل مواخذہ ہے۔ (حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر)

د: علامہ محمد بن احمد تونسی مالکی (۸۸۲ھ) آلات غنا کے حوالے سے مالکی اور دیگر فقہا کی فکر و عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ غنا جو دف اور شبابہ (بانسری) کے ساتھ ہو، اس حوالے سے ہمارے اصحاب مالکیہ نے کہا کہ دف سے نکاح کا اعلان سنت ہے۔ شارح المقنع نے یہی مذہب حنابلہ کا ذکر کیا ہے اور ابوبکر عامری نے یہی مذہب شوافع کا لکھا ہے، جب کہ ایک جماعت نے مطلقاً اس کی اباحت کا قول کیا ہے۔ یہی مذہب امام الحرمین اور امام غزالی کا ہے، جب کہ متعدد شوافع سے نکاح اور ختنہ کے علاوہ مواقع کے لیے اس سلسلے میں دو مذاہب منقول ہیں اور رافعی نے جواز کو اصح قرار دیا ہے۔ یہی رائے ابوبکر بن العربی مالکی کی ہے۔

رہی بانسری اور یہ بانس کی بنی ہوتی ہے جس میں سوراخ ہوتے ہیں، اس کے بارے میں ماہرین موسیقی کا کہنا ہے کہ یہ ایک کامل و مکمل آلۂ موسیقی ہے جو تمام نغمات کو جامع ہے۔ علما اس سلسلے میں مختلف الخیال ہیں۔ ایک طبقہ تحریم کی طرف گیا اور ایک دوسرا طبقہ اباحت کی طرف گیا۔ ایک جماعت کا مذہب یہی ہے۔ غزالی، عامری اور رافعی کا مذہب بھی یہی ہے۔ رافعی نے شرح صغیر میں اسے اظہر کہا، جب کہ شرح کبیر میں اسے اقرب کہا۔ امام عزالدین بن عبدالسلام، امام تقی الدین بن دقیق العید اور قاضی القضاۃ ابن جماعہ کا مذہب مختار بھی یہی ہے۔ علامہ تاج الدین سرشی نے کہا کہ

یہی ہمارے مذہب کا مقتضا ہے۔ امام رافعی نے کہا کہ پیغمبر خدا حضرت داؤد اپنی بکریاں چراتے ہوئے اسے بجاتے تھے۔ نیز کہا کہ صحابہ سے چرواہے کے لیے اس کی رخصت منقول ہے۔ بانسری اشک بار کرتی ہے، دل کو نرم کرتی ہے، سلوک کو آسان کرتی ہے اور بکھرے جانوروں کو جمع کر دیتی ہے۔ عرفا، صالحین اور علما نے بانسری والی مجالس سماع میں ہمیشہ شرکت کی ہے جن کے ہاتھوں پر نمایاں کرامات کا ظہور ہوتا رہا ہے اور ان کے پاکیزہ احوال ظاہر ہوتے رہے ہیں، جب کہ مرتکب حرام اگر اس پر اصرار کرے تو فاسق ہو جاتا ہے اور امام الحرمین اور امام متولی اور دیگر ائمہ نے صراحت کی ہے کہ فاسق کے ہاتھ پر کرامت کا ظہور نہیں ہو سکتا۔

رہا ستار اور دیگر آلات موسیقی پر سماع تو اس سلسلے میں عود (سارنگی) جو کہ ایک معروف آلہ ہے اور کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے ابوالبشر حضرت آدم کے بیٹے مالک نے سنا تھا اور ایک قول ہے کہ اہل ہند نے طبائع انسانی کے موافق اسے بنایا ہے، اس کے سلسلے میں اور اس جیسے دیگر تار والے معروف آلات کے سلسلے میں علما کا اختلاف ہے۔ مذاہب اربعہ سے معروف یہی ہے کہ اس کا بجانا اور سننا حرام ہے، جب کہ ایک طبقہ اس کی اباحت کی طرف گیا ہے۔ صحابہ میں عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن جعفر، عبداللہ بن زبیر، معاویہ بن ابوسفیان اور عمرو بن العاص وغیرہم سے اس کا سماع منقول ہے۔ تابعین میں خارجہ بن زید، عبدالرحمٰن بن حسان، سعید بن المسیب، عطاء بن ابی رباح، شعبی، ابن عتیق اور اکثر فقہائے مدینہ سے اس کا سماع منقول ہے۔ امام مالک سے بھی اس کا سماع منقول ہے، جو ان کے اصحاب کے بیچ معروف نہیں ہے۔ قاضی ابوبکر بن العربی مالکی نے شرح ترمذی عارضہ میں اباحت غنا پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس کے ساتھ عود شامل ہو تو وہ حضرت ابوبکر کے بقول **مزمار الشیطان فی بیت رسول اللہ** میں داخل ہوگا اور اگر اس کے ساتھ طنبور کا اضافہ ہو تو پھر تحریم میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا؛ کیوں کہ یہ سب ان آلات میں سے ہیں جن سے کمزوروں کا دل قوت پاتا ہے اور نفوس کو راحت ملتی ہے، جب کہ لغت میں معروف یہ ہے کہ طنبور کو ہی عود کہا گیا ہے۔ ماوردی نے بعض شوافع سے اس کی اباحت نقل کی ہے۔ استاذ ابومنصور بغدادی کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ ابواسحاق شیرازی سے منقول ہے کہ یہی ان کا بھی مذہب مشہور ہے۔ کسی عالم نے ان سے اس کی کراہت نقل نہیں کی ہے۔ اس کی روایت ابن طاہر مقدسی نے کی ہے، جو شیخ ابواسحٰق شیرازی کے معاصر ہیں اور اس کی روایت اہل مدینہ سے بھی کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کے مابین اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ علمائے مدینہ میں ابراہیم بن سعد زہری اس کے جواز کے قائل تھے اور جب تک عود بجایا نہ جاتا آپ حدیث نہیں سناتے تھے۔ ابراہیم بن سعد جب بغداد

آئے اور ہارون رشید کے دربار میں پہنچے تو ہارون رشید نے ان سے حدیث سنانے کی گذارش کی۔ اس پر انہوں نے کہا: امیرالمومنین! عود حاضر کریں۔ ہارون رشید نے کہا کہ خوشبو والا یا غنا والا؟ ابراہیم بن سعد نے کہا: غناوالاعود۔ ہارون رشید نے حاضر کرایا۔ حضرت ابراہیم بن سعد نے عود بجایا اور نغمہ سنجی فرمائی، پھر حدیث بیان کی۔ ابراہیم بن سعد امام شافعی کے شیوخ میں ہیں۔ امام بخاری نے ان سے روایت کی ہے۔ وہ امام مجتہد، معروف، عادل، صالح، ثقہ اور مامون ہیں۔ جب انہوں نے ہارون کے سامنے عود بجایا تو اس وقت ہارون نے کہا: اے ابراہیم! تمہارے علما میں کون لوگ اس کی حرمت کی قائل ہیں؟ کہا: امیرالمؤمنین! یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل میں حق تعالیٰ نے گرہ ڈال دی ہے۔ من ربطه الله تعالیٰ۔ امام ابن عرفہ نے اپنی مختصر فقہی میں حضرت ابراہیم بن سعد سے غنا بالعود کی اباحت نقل کی ہے اور امام مازنی نے عبداللہ بن حکم سے اس کی کراہت نقل کی ہے اور امام عزالدین بن عبدالسلام سے اس کا جواز لکھا ہے۔ پھر قائلین حرمت کا اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ آیا یہ گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ اور شوافع متاخرین کا اصح مذہب یہی ہے کہ یہ صغیرہ ہے۔ یہی امام الحرمین کا مذہب ہے۔" (فرح الاسماع برخص السماع-۶-۱۰)

المختصر! امام مالک سے نکاح میں دف سے اعلان کا استحباب ثابت ہے اور جہاں تک کراہت کا قول ہے تو تحقیق سے ثابت ہوا کہ وہ مردود یا مرجوح ہے۔ بعض فقہاے مالکیہ دف کے علاوہ دیگر آلات موسیقی مثلاً طبل، مزہر اور بانسری سے بھی اعلان نکاح کے جواز کے قائل ہیں۔ رہا جھانجھ والے دف کا بجانا یا مردوں کا بجانا تو اس سلسلے میں مالکی فقہا مختلف الخیال ہیں۔ اسی طرح شادی کے علاوہ دیگر مواقع پر آلات موسیقی بجائے جانے کے سلسلے میں مالکی فقہا کے مختلف اقوال ملتے ہیں، اگر چہ اکثریت تحریم کی طرف مائل ہے۔ لیکن ہم نے امام دارالہجرہ پر انحصار کیا ہے، ان کے یہاں حرمت کی صراحت نہیں ملتی، بلکہ بعض اہل علم نے تو باضابطہ امام مالک اور فقہاے مدینہ سے آلات موسیقی کا سماع بھی نقل کیا ہے، اگر چہ عام مالکی فقہا کے نزدیک یہ بات ثابت شدہ نہیں ہے۔

مذہب شافعی کی تحقیق

امام شافعی نے کہا:

"خلقت [خلفت] بالعراق شيئا يسمى التغبير أحدثه الزنادقة ليشتغلوا به عن القرآن والذكر۔" (اتحاف السادۃ المتقین، ۷/۷/۶۴)

میں عراق میں اپنے پیچھے ایک ایسی چیز چھوڑ کے آیا جسے تغبیر کہا جاتا ہے۔ اسے زندیقوں نے قرآن اور ذکر سے غافل کرنے کے لیے ایجاد کیا ہے۔

یہاں امام شافعی کا رخ تغبیر کی حرمت کی طرف ہے، لیکن غور سے دیکھیے تو دو باتیں معلوم ہوں گی:

۱- یہ تحریم تمام آلات موسیقی کو شامل نہیں ہے بلکہ صرف ضرب بالقضیب کے لیے ہے۔مزید یہ کہ تغبیر کا ایک معنی زاہدانہ نغمہ بھی ہے۔(۱)

۲-تغبیر کی حرمت بھی مطلقاً نہیں بلکہ قرآن اور ذکر الٰہی سے غافل کرنے کی قید کے ساتھ مقید ہے۔

علامہ ابن حجر ہیتمی شافعی لکھتے ہیں:

قال الشيخان وغيرهما: ولا يحرم ضَرْبُ الطبول إلّا الكُوبَة، وهي: طبل طويل متَّسِع الطرفين ضيِّق الوسط، وهو الذي يعتاد ضربه المخنَّثون ويولعون به، قال: والطبول التي تُهيَّأ لِمَلاعِب الصبيان إنْ لم تلحق بالطبول الكبار فهي كالدُّفِ وليست كالكُوبَة بحال، وبه يُعلَم أنَّ ما يُصنَع فِي الأعياد من الطُّبول الصِّغار التي هي على هيئة الكُوبَة وغيرها لا حُرمَة فيها۔ (کف الرعاع،ص:۶۱-۶۲)

شیخین (امام رافعی اور امام نووی) اور ان کے علاوہ دیگر علمانے کہا: طبل بجانا حرام نہیں ہے، سوائے کوبہ (ڈمرو) بجانے کے۔ یہ ایک طویل طبل ہوتا ہے جس کے دونوں کنارے وسیع ہوتے ہیں جب کہ بیچ کا حصہ تنگ ہوتا ہے۔مخنث اس کے عادی اور عاشق ہوتے ہیں۔فرمایا: اور وہ طبل جو بچوں کے کھیلنے کے لیے بنائے جاتے ہیں، اگر وہ بڑے طبل کی طرح نہ ہوں تو ان کا حکم دف کا ہے، ڈمرو کا نہیں۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عید کے مواقع پر جو چھوٹے چھوٹے طبلے بنائے جاتے ہیں اور وہ ڈمرو کی شکل پر بھی ہوتے ہیں، وہ حرام نہیں ہیں۔

والمعتمَد من مذهبنا عند الشيخين وغيرهما، كالشيخ أبي محمد، والقاضي الحسين، وصاحب "المُهَذَّبِ"، ونقله فِي "البحر" عن الأصحاب أنَّ ذلك[ضرب الصفاقتين] حرامٌ؛ لأنهما من عادة المخنَّثين كالكُوبَة، وتوقَّف الإمام فيهما؛ لأنَّه لم يردُ فيهما خبرٌ، بخِلاف الكُوبَة، يُجاب عنه بأنَّ شأن القياس أنَّ المقيس عليه منصوصٌ بخلاف المقيس، وهذا كذلك؛ لأنَّ الكُوبَة منصوصٌ عليها بخلاف الصفاقتين۔ (کف الرعاع،ص:۶۵-۶۶)

امام رافعی اور امام نووی وغیرہ ہمارے دیگر شیوخ مثلاً شیخ ابو محمد، قاضی حسین، صاحب المہذب کا مذہب

---

(۱) التغبير: تهليل أو ترديد صوت يردد بقراءة وغيرها. ومثله قول ابن القطاع، ونصه: وغبر تغبيرا: وهو تهليل وترديد صوت بقراءة أو غيرها. فقوله: أو غيرها وكذا قول ابن دريد: وغيرها، المراد به ما قال الليث ما نصه: وقد سموا ما يطربون فيه من الشعر في ذكر الله تغبيرا، كأنهم إذا تناشدوه بالألحان طربوا فرقصوا وأرهجوا، فسموا المغبرة لهذا المعنى. قال الأزهري: وروينا عن الشافعي أنه قال: أرى الزنادقة وضعوا هذا التغبير ليصدوا عن ذكر الله وقراءة القرآن. وقال الزجاج: سموا بها لأنهم يرغبون الناس في الغابرة، أي الباقية، أي الآخرة، ويزهدونهم في الفانية، وهي الدنيا. (تاج العروس من جواهر القاموس:۱۹۵/۱۳)

معتمد، جسے اصحاب شافعیہ سے بحر میں بھی نقل کیا ہے، یہ ہے کہ جھانجھر بجانا حرام ہے، کیوں کہ ڈمرو کی طرح ہی یہ بھی مخنثوں کا شعار ہے، جب کہ امام نے اس میں توقف کیا؛ کیوں کہ جس طرح ڈمرو کے لیے نص ہے، اس کے لیے نص نہیں ہے۔اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ قیاس میں یہ ہوتا ہے کہ مقیس علیہ منصوص ہوتا ہے، مقیس منصوص نہیں ہوتا۔ یہاں بھی اسی طرح ہے۔ڈمرو منصوص ہے، جھانجھر منصوص نہیں ہیں۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

۱-ڈمرو اور جھانجھر کے علاوہ ہر طرح کے طبلے شوافع محققین کے نزدیک جائز ہیں۔

۲- ڈمرو اور جھانجھر بھی صرف اس لیے ناجائز ہیں کہ وہ مخنثوں کا شعار ہیں۔ ظاہر ہے جب شعار نہ ہوں گے تو یہ حکم حرمت بھی ان کے ساتھ نہ ہوگا۔

علامہ ابوزرعہ ولی الدین شافعی کردی (۸۲۶ھ) لکھتے ہیں:

إن سماع الدف ولو كان فيه جلاجل ليس بحرام۔ (تحریر الفتاویٰ: کتاب الشھادات، ۳/۶۶۱)

دف، جھانجھ والا ہی کیوں نہ ہو، اس کا سننا حرام نہیں ہے۔

علامہ کمال الدین ادفوی شافعی (۷۴۸ھ) لکھتے ہیں:

وأما حكم الضرب به [الدف] شرعا فقد اختلف العلماء فيه ---- وحكى عن فتاوي أبي الليث أن ضرب الدف في غير العرس مختلف فيه بين العلماء. قال بعضهم يكره وبعضهم قال لا يكره، وذهبت طائفة إلى إباحته مطلقاً، جرى عليه إمام الحرمين والغزالي ----وذهب بعض الفقهاء الشافعية إلى أنه إن لم يكن بجلاجل فمباح، وإن كان بجلاجل فوجهان وجرى الرافعي على طريقة الغزالي وصححا الجواز ---- وحاصل مذهب الإمام الشافعي أن الصحيح على ما نقل المتأخرون الجواز مطلقا.

(کتاب الامتاع باحکام السماع، مخطوط، ورق، ۵۴)

رہا دف بجانے کا حکم تو اس سلسلے میں علما کا اختلاف ہے۔۔۔۔فتاویٰ ابواللیث سے منقول ہے کہ شادی کے علاوہ مواقع پر دف بجانا علما کے مابین ایک مختلف فیہ امر ہے۔بعض نے اسے مکروہ کہا تو بعض نے غیر مکروہ، جب کہ ایک جماعت مطلقاً اباحت کی قائل ہے۔امام الحرمین اور امام غزالی کا مذہب یہی ہے۔۔۔۔بعض فقہاے شوافع اس طرف گئے کہ اگر وہ جھانجھ کے بغیر ہو تو مباح ہے اور اگر جھانجھ کے ساتھ ہو تو اس میں دو قول ہیں۔امام رافعی نے امام غزالی کی موافقت کی، چنانچہ دونوں نے جواز کو ہی صحیح کہا ہے۔۔۔۔جیسا کہ متاخرین نے لکھا ہے، مذہب امام شافعی کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا مذہبِ صحیح جواز کا ہے۔(کتاب الامتاع باحکام السماع، مخطوط، ورق، ۵۴)

أما حکمها [الشبابة] فی الشرع فاختلف فیه العلماء، فذهبت طائفة الی التحریم وهو الموجود فی الکتب الحنفیة والمالکیة والحنابلة، واختاره من الشافعیة البغوی وجزم به ابن أبی عصرون ونقل الحموی فی شرح الوسیط عن الشیخ أبی علی أنه قال صوت الیراعة مختلف فیه، والقیاس تحریمه کسایر المزامیر وادعی النووی أنه الأصح وذهبت طائفة الی الاباحة وهو مذهب الظاهریة واختاره ابن طاهر المقدسی واحتج علیه علی ما سنذکره واختاره أبوبکر محمد بن عبد الله العامری البغدادی الشافعی فی کتابه، واختاره الغزالی وقال الرافعی فی الشرح الصغیر أنه الأظهر وقال فی الشرح الکبیر أنه الأقوی، وکلام الرؤیانی یشعر بالاباحة، فانه لم یحک التحریم.

(کتاب الامتاع باحکام السماع، مخطوط: ورق:۵۹)

رہا بانسری کا شرعی حکم تو اس میں علما مختلف ہیں۔ ایک جماعت حرمت کی قائل ہے اور یہی حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کی کتابوں میں مسطور ہے۔ شوافع میں علامہ بغوی کا یہی مذہب مختار ہے، ابن ابی عصرون نے اسی پر جزم کیا۔ علامہ حموی نے شرح وسیط میں شیخ ابو علی کا یہ قول لکھا کہ بانسری کی آواز مختلف فیہ ہے اور قیاس یہ ہے کہ دیگر آلات موسیقی کی طرح یہ بھی حرام ہے۔ علامہ نووی نے اسی کو اصح کہا، جب کہ ایک جماعت اباحت کی طرف گئی ہے۔ یہ ظاہریہ کا مذہب ہے۔ یہی ابن طاہر مقدسی کا مختار ہے۔ اس پر وہ دلیلیں لائیں ہیں، جس کا عنقریب ہم ذکر کریں گے۔ علامہ ابوبکر محمد بن عبداللہ عامری بغدادی شافعی نے بھی اپنی کتاب میں یہی قول اختیار کیا ہے۔ یہی امام غزالی کا مسلک مختار ہے، جب کہ علامہ رافعی نے شرح صغیر میں اسے اظہر اور شرح کبیر میں اقوی کہا ہے اور امام رویانی کا قول بھی اباحت کی طرف مشعر ہے، کیوں کہ انہوں نے حرمت کی بات ہی نہیں کی ہے۔

وقد اختلف العلماء فیه [العود]، فالمعروف فی مذاهب الأئمة الأربعة أن الضرب به وسماعه حرام، وذهبت طائفة الی جوازه وحکوا سماعه عن عبد الله بن جعفر، وعبد الله بن عمر، وحکی صاحب العقد أن عبد الله بن عمر دخل علی عبد الله بن جعفر فوجد عنده جاریة فی حجرها عود، فغنت، ثم قالت لابن عمر هل تری بذلک بأساً، فقال: أو غیر هذا؟ فقالت: لا، فقال: لا بأس بهذا، ونقل سماعه عن عبد الله بن الزبیر ومعاویة بن أبی سفیان وعمرو بن العاص وحسان بن ثابت، ومن غیر الصحابة عبد الرحمٰن بن حسان، وحارثة بن زید، ونقله الأستاذ أبو منصور عن الزهری وسعید بن المسیب وعطاء بن أبی رباح والشعبی وعبد الله بن أبی عتیق وأکثر أهل المدینة۔ (الامتاع باحکام السماع، مخطوط، ورق، ۶۵)

علما سارنگی (عود) کے سلسلے میں بھی مختلف ہیں۔ ائمہ اربعہ میں متعارف یہی ہے کہ سارنگی بجانا اور سننا حرام ہے، جب کہ ایک جماعت اس کے جواز کی طرف گئی ہے اور حضرت عبداللہ بن جعفر اور عبداللہ بن عمر سے اس کی سماعت نقل کی ہے۔ صاحب عقد فرید نے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن جعفر کے پاس تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہاں ایک باندی ہے جس کی گود میں سارنگی رکھی ہوئی ہے۔ اس نے نغمہ سرائی کی، پھر حضرت ابن عمر سے پوچھا: کیا آپ کے نزدیک اس میں کچھ حرج ہے؟ حضرت ابن عمر نے پوچھا کیا اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہے؟ اس نے کہا: نہیں! حضرت ابن عمر نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ صاحب عقد فرید نے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر، معاویہ بن ابوسفیان، عمرو بن العاص اور حسان بن ثابت سے اور غیر صحابہ میں عبدالرحمٰن بن حسان اور حارثہ بن زید سے اس کا سماع نقل کیا ہے، جب کہ استاذ ابومنصور نے اسے زہری، سعید بن مسیب، عطا بن ابی رباح، شعبی، عبداللہ بن ابی عتیق اور اکثر اہل مدینہ سے نقل کیا ہے۔

علامہ ادفوی لکھتے ہیں:

"فقد اختلف العلماء فی الضرب به [طبل الكوبة] فالموجود فی كتب من رأيت من الشافعية انه حرام، وتوقف امام الحرمين فيه وقال: ان صح حديث عملنا به، قال: والقاضی لم يتعرض للكوبة ولو رددناه الی ذلک المعنی فهو فی معنی الدف، ولست أری فيها ما يقتضی التحريم الا أن المخنثين يعتادون الضرب بها ويتولعون بها، قال: والذی يقتضيه الرائ أن ما يصار منه ألحان مستلذة تهيج الانسان وتستحثه علی الشرب ومجالسةأهله فهو المحرم وما ليس بمستلذ وانما يجیء لايقاعات قد تطرب، فان كانت لاتلذفجميعهافی معنی الدف"۔ (الامتاع باحکام السماع، مخطوط، ورق، ۶۸)

ڈمرو بجانے کے سلسلے میں علما مختلف ہیں۔ جن شوافع علما کی کتابیں دیکھیں ان میں حرام لکھا ہوا ہے، جب کہ امام الحرمین نے اس مسئلے میں توقف کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اس سلسلے میں اگر کوئی حدیث صحیح ہو تو ہم اس پر عمل کریں گے۔ فرمایا: قاضی نے ڈمرو سے تعرض نہیں کیا ہے اور اگر ہم اس کے معنی کی طرف نظر کریں تو وہ دف کے ہم معنی ہے اور اس کے اندر میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جو تحریم کی مقتضی ہو، اِلا یہ کہ ڈمرو بجانا مخنثوں کا شعار ہے۔ وہ اس کے شیدائی ہوتے ہیں۔ مزید فرماتے ہیں: جو بات عقلی طور پر سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ جس آلۂ موسیقی کے اندر ایسی طرب انگیز آواز ہو جس سے انسان کے اندر ہیجانی کیفیت پیدا ہو جائے اور مے کشی اور مجالس مے کشی کی طرف آمادگی ہو، تو وہ حرام ہے اور جو ہیجان انگیز نہ ہو، صرف لے کو درست کرنے کے لیے بجایا جاتا ہو اور اس میں کبھی کبھی طرب وشوق پیدا ہو جاتا

ہوتو اگر اس سے شہوانی ہیجان پیدا نہ ہوتا ہوتو ایسے سارے آلات دف کے معنی میں ہیں۔‘‘(۱)

وأما سائر الطبول غير الكوبة فللعلماء فيه اختلاف، قال الغزالی فی الاحياء و البسيط و الوسيط: تباح سائر الطبول غير الكوبة و تابعه الرافعی و هو مذهب الظاهرية و ابن طاهر المقدسی، و ذهبت طائفة الی تحريم الطبول كلها غير طبل الحرب، قال القاضی حسين: ان كان طبل حرب فيجوز، و ان كان طبل لهو فلايجوز ضربه۔ (الامتاع، ورق،۶۹-۷۰)

ڈمرو کے علاوہ دیگر طبول میں علما کا اختلاف ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم، بسیط اور وسیط میں لکھا ہے کہ ڈمرو کے علاوہ سارے طبل مباح ہیں۔ امام رافعی نے بھی غزالی کی موافقت کی۔ یہی ظاہریہ اور ابن طاہر مقدسی کا مذہب ہے، جب کہ ایک جماعت جہادی طبل کے ماسوا سارے طبل کو حرام کہتی ہے۔ قاضی حسین نے کہا: جنگ کا طبل مباح ہے اور لہو کا طبل حرام ہے۔

امام غزالی نے تو مسئلہ ہی واضح کر دیا ہے:

دوسرا عارض آلے سے متعلق ہے۔ وہ یہ کہ وہ آلہ شرابیوں اور مخنثوں کا شعار ہو، اور یہ منہ سے بجائے جانے والے اور تار والے آلات موسیقی اور ڈمرو ہیں۔ یہ تینوں ممنوع اقسام ہیں۔ ان کے علاوہ جو بھی آلات موسیقی ہیں وہ اصل اباحت پر قائم ہیں، جیسے دف، طبل، شاہین، لکڑی اور دیگر آلات موسیقی۔ (احیاء علوم الدین: ۲/ ۲۸۲)

بہر کیف! آلات موسیقی کی حرمت کی کلی یا غیر مشروط صراحت حضرت امام شافعی سے بھی ثابت نہیں ہے۔ رہے شوافع تو ان میں خیالات اور تفاصیل مختلف ہیں، اگرچہ فقہائے شوافع کے یہاں بھی عمومی میلان عدم جواز کی طرف ہے، لیکن ان میں بھی بڑی تعداد ایسے محققین کی ہے جو مطلق یا مشروط اباحت کے قائل ہیں، جن کے بعض حوالے مذکور ہوئے۔

مذہب حنبلی کی تحقیق

ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

”**قال أحمد رحمه الله لا بأس بالدف فی العرس و الختان، و أكره الطبل و هو المنكر و هو الكوبة التی نهی عنها النبی -صلی الله عليه وسلم-۔**“ (المغنی، کتاب النکاح، فصل اعلان النکاح والضرب فیہ بالدف)

---

(۱) اقول: آلات موسیقی کو ہیجان انگیز اور غیر ہیجان انگیز خانوں میں تقسیم کرنا نا معقول بات ہے۔ ہاں! ان کے لے کو ان دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بعض لے ہیجان انگیز ہوتے ہیں، بعض فرحت بخش ہوتے ہیں، بعض رزمی ہوتے ہیں تو بعض بزمی، بعض رلانے والے ہوتے ہیں تو بعض ہنسانے اور سلانے والے۔ اس لیے اصل گفتگو نغمات اور لے کے جواز اور عدم جواز پر ہونی چاہیے، نہ کہ آلات کے جواز اور عدم جواز کی تقسیم پر۔

امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: شادی اور ختنے میں دف بجانے میں کوئی حرج نہیں اور میں طبل یعنی کوبہ (ڈمرو) جو منکر ہے اور جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے، کومکروہ جانتا ہوں۔

علامہ کمال الدین ادفوی لکھتے ہیں:

قال شارح المقنع من الحنابلة أن أحمد قال:أكره الطبل وهو الكوبة، وإطلاق بن حمدان يشمل الكوبة في الكراهة، والظاهرية أطلقوا اباباحة جميع الآلات فتندرج الكوبة فيها. (الإمتاع بأحكام السماع، مخطوط، ورق، ٦٩)

شارح مقنع حنبلی نے کہا کہ امام احمد کا ارشاد ہے: میں طبل یعنی کوبہ (ڈمرو) کومکروہ جانتا ہوں۔ ابن حمدان کا اطلاق (کراہت) کوبہ کی کراہت کو بھی شامل ہے جب کہ ظاہریہ نے تمام آلات کو مطلقاً مباح کہا ہے جس میں کوبہ بھی شامل ہے۔

ظاہر ہے کہ امام احمد کا ارشاد صرف کوبہ کے بارے میں ہے، اس کی بنیاد پر تمام آلات موسیقی کو حنبلی فقہ کی روشنی میں ناجائز وحرام نہیں کہا جا سکتا۔ پھر امام کا یہ حکم اس حدیث پاک کی بنیاد پر ہے جس میں کوبہ کی ممانعت وارد ہے، لیکن اس کے باوجود ظاہریہ نے دیگر آلات موسیقی کے ساتھ کوبہ کو بھی مباح کہا ہے؛ کیوں کہ ان کے نزدیک وہ حدیث صحیح الاسناد نہیں ہے۔ امام غزالی نے اس ممانعت کی وجہ بھی بتائی ہے کہ کوبہ چوں کہ مخنثوں کا شعار ہے، اس لیے اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

بہرکیف! یہ صرف ڈمرو (کوبہ) کی ممانعت ہے اور اگر بالفرض یہ بھی کہا جائے کہ کوبہ سے ان کی مراد ہر طرح کے طبل ہیں، جو کوبہ کے حقیقی مفہوم کے خلاف ہے، تو بھی زیادہ سے زیادہ طبل کی کراہت ہوگی، نہ کہ جملہ آلات موسیقی کی مطلقاً کراہت یا حرمت۔

البتہ ابن قدامہ حنبلی اور دیگر فقہائے حنابلہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں عمومیت کے ساتھ تمام آلات موسیقی حرام ہیں، سوائے ان کے جن کا ذکر مخصوص مواقع پر احادیث کریمہ میں موجود ہے۔ تاہم امام احمد سے بھی مطلقاً تمام آلات موسیقی کی حرمت کی تصریح ثابت نہیں ہے۔ جن کے خلاف نص موجود ہے انھی کو انہوں نے ناجائز کہا ہے۔ رہے فقہائے حنابلہ تو ان کا عمومی میلان بھی کراہت یا حرمت کی طرف ہے جس کو بعینہ امام احمد کا مذہب کہنا کتنا مشکل ہے، اہل نظر پر مخفی نہیں۔

البتہ علامہ ابن حزم اور فقہائے ظاہریہ کے نزدیک احادیث حرمت ثابت ہی نہیں ہیں، اس لیے وہ تمام آلات موسیقی کی مطلقاً اباحت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تمام آلات موسیقی مباحات فطرت میں شامل ہیں۔ جب تک ان کے ساتھ کسی امر حرام کا اتصال نہ ہو، وہ اپنی ذات میں مباح ہی رہیں گے۔

مذہب حنفی کی تحقیق

مدون مذہب حنفی امام محمد شیبانی (۱۸۹ھ) لکھتے ہیں:

رجل دُعیَ إلی ولیمة أو طعام فوجد هناک لعبا أو غناء فلا بأس بأن یقعد و یأکل، وقال أبو حنیفة رضی الله عنه ابتلیت بهذا مرة۔ (الجامع الصغیر مع النافع الکبیر، کتاب المزارعة، مسائل من کتاب الکراهیة، ص: ۴۸۲)

کوئی شخص کسی ولیمے میں یا اور کسی کھانے پر مدعو کیا جائے اور وہاں پہنچ کر دیکھے کہ وہاں کھیل یا غنا ہو رہا ہو تو وہاں بیٹھے اور کھائے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ابوحنیفہ نے کہا کہ ایک مرتبہ میں بھی اس میں مبتلا ہوا تھا۔

غور سے دیکھیے! امام محمد نے تو اپنے امام کے قول سے استناد کرتے ہوئے **لا بأس به** (اس میں کوئی حرج نہیں) کہا ہے، مگر بعد کے فقہا نے اس پر جو نکتہ آفرینیاں فرمائی ہیں ان کی تفصیل ماسبق میں (نغمات کی بحث میں گذشتہ قسط میں) گزر چکی ہے۔ اس جواز کی عبارت کو فقہائے حنفیہ نے کمال مہارت سے حرمت سے جوڑ دیا ہے۔ اس میں طرفہ یہ ہے کہ اس عبارت میں ''غنا'' اور ''لعب'' دو الفاظ آئے ہیں، ان سے اگر کوئی پوچھے کہ کیا غنا اور لعب مطلقاً حرام ہیں؟ تو جواب دیں گے نہیں! اور اس کی تفصیل کریں گے۔ لیکن '' آلات غنا'' جن کا اس عبارت میں سرے سے ذکر ہی نہیں ہے، ہمارے باکمال فقہا اسی عبارت سے انہیں مذہب حنفی کی روشنی میں حرام لکھتے ہیں۔ کمال ہے کہ اس عبارت میں مذکور امور کو تو وہ قید کے ساتھ حرام کہتے ہیں، جب کہ ''امر غیر مذکور'' کو مطلقاً حرام ثابت کرتے ہیں۔ **فالیه المشتکی۔**

کتب فقہ میں اس قسم کے نظارے آپ کو قدم قدم پر ملیں گے جہاں فقہائے متاخرین نے اپنے کمال فن سے اپنی ذاتی نکتہ آفرینیوں کو مذہب امام بنا دیا ہے۔ ان نکتہ آفرینیوں کی قلعی مزید اس وقت کھل جاتی ہے جب ہم یہ پڑھتے ہیں:

''قال: "و من کسر لمسلم بربطا أو طبلا أو مزمارا أو دفا أو أراق له سکرا أو منصفا فهو ضامن، و بیع هذه الأشیاء جائز" و هذا عند أبي حنیفة. وقال أبو یوسف و محمد: لا یضمن ولا یجوز بیعها. و قیل الاختلاف في الدف و الطبل الذي یضرب للهو، فأما طبل الغزاة و الدف الذي یباح ضربه في العرس یضمن بالإتلاف من غیر خلاف. و قیل الفتوی في الضمان علی قولهما۔ (هدایة، کتاب الغصب، فصل ما غصب مالا یتقوم)

جس نے کسی مسلمان کا بربط، طبل، بانسری یا دف توڑ دیا، یا اس کا کھجور کا ابلا ہوا شیرہ، یا پک کر نصف بچا ہوا شیرہ انڈیل دیا تو وہ اس کا تاوان بھرے گا۔ ان تمام اشیا کی خرید و فروخت جائز ہے۔ یہ امام

ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد نے کہا کہ نہ ان کا تاوان بھرے گا اور نہ ہی ان کی خرید وفروخت جائز ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ امام اور صاحبین کا اختلاف اس دف اور طبل کے سلسلے میں ہے جو لہو کے لیے بجایا جاتا ہو، رہا مجاہدین کا طبل اور شادی میں بجنے والا مباح دف تو اس کو تلف کرنے سے بالاتفاق تاوان واجب ہوگا۔ ایک قول کے مطابق تاوان کے سلسلے میں صاحبین کے قول پر ہی فتویٰ ہے۔''

اس سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

۱- امام ابوحنیفہ کے نزدیک بربط، طبل، مزمار اور دف مال ہیں۔ ان کی خرید وفروخت جائز ہے اور ان کو تلف کرنے کی صورت میں ان کا تاوان واجب ہے۔

۲- ایک قول کے مطابق یہی حکم صاحبین کے نزدیک بھی ہے، اگر یہ آلات بغرض لہو نہ ہوں۔ گویا اگر لہو کے لیے نہ ہوں تو صاحبین کے نزدیک بھی یہ اشیا مال ہیں۔ ان کی خرید وفروخت جائز ہے۔ گویا صاحبین کے نزدیک سارا معاملہ لہو پر موقوف ہے، جب کہ امام صاحب کے نزدیک مطلقاً یہ اشیا مال ہیں اور ان کی بیع وشرا جائز اور ان کے تلف کرنے پر تاوان واجب ہے۔

۳- اس سلسلے میں صاحبین کے قول پر فتویٰ بعض احناف کا قول ہے، یہ الگ بات ہے کہ فقہاے متاخرین نے انہی بعض احناف کو کل احناف بنادیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام محققین احناف کے مطابق امام صاحب کا قول ہی مفتی بہ ہے؛ کیوں نہ ہو کہ وہی حنفیت کے اصل امام ہیں اور اس لیے بھی کہ بیع وشرا اور اِتلاف کے وقت لہو کا تعین مشکل ہے۔ اب اس تماشہ کو کیا کہیے گا کہ اس حقیقی حنفیت کو چھپا کر نہ جانے مخالفین موسیقی کس حنفیت کی رو سے اسے حرام حرام اشد حرام کا نعرہ لگاتے رہے ہیں۔ وہ بھی صوفیہ کی موسیقی کے لیے جہاں لہو نہ ہونا اور غرض صالح ہونا متعین ہے۔ اس مقصد کے لیے امام اور صاحبین کے متفقہ اصول کے تحت آلات موسیقی کا خریدنا بیچنا اور سننا سنانا جائز ہوگا۔

مذہب حنفی کی تحقیق آخری سطح پر امام محمد کے اس ارشاد سے ہوجاتی ہے:

ولا بأس بأن يجرس في سبيل الله وعلى حصون المسلمين بالأجراس وكذلك لا بأس بالطبول التي يضرب بها في الحرب لاجتماع الناس ولا ينبغي للمسمين أن يضربوا بناقوس ولا شبور۔ (السیر الکبیر باب مایکرہ فی دار الحرب ومالا یکرہ)

جہاد میں اور مسلمانوں کے قلعوں پر گھنٹے بجانے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح ایسے طبل میں کوئی حرج نہیں جو لوگوں کو جمع کرنے کے لیے جنگ میں بجائے جاتے ہیں۔ البتہ ناقوس یا شبور بجانا مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں۔

اس کی شرح میں امام سرخسی (۴۸۳ھ) فرماتے ہیں:

جہاد میں اور مسلمانوں کے قلعوں پر گھنٹے بجانے میں کوئی حرج اس لیے نہیں، کیوں کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں قوت پیدا ہوگی اور ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ گھنٹیوں کی کراہت بطور لہو استعمال کرنے کی صورت میں ہے یا اس طور پر استعمال کرنے کی صورت میں ہے جس سے مسلمانوں کو ضرر ہو، مثلاً یہ کہ اس کی آواز کی وجہ سے مشرکین کو یا چوروں کو مسلمانوں کے بارے میں پتہ چل جائے۔ لہٰذا جب یہ علت مفقود ہوگی، گھنٹی کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہوگا، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اسی طرح گھوڑے کی زین کے ساتھ جنگ کے اندر جو گھنگھرو باندھے جاتے ہیں ان میں بھی کوئی حرج نہیں، کیوں کہ اس کی وجہ سے مشرکین پر رعب پڑتا ہے اور ایسا کرنا جنگی حیلوں میں شامل ہے۔ اسی طرح جنگ کے لیے لوگوں کو جمع کرنے کی خاطر جو طبل بجائے جاتے ہیں ان میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ یہاں مقصد لہو نہیں ہوتا اور مکروہ وہ طبل ہیں جو بغرض لہو بجائے جائیں، جیسا کہ اعلان نکاح کے لیے دف کا بجانا جائز ہے جب کہ لہو کے لیے دف بجانا مکروہ ہے اور جنگوں میں ناقوس اور شبور بجانا اس لیے مکروہ ہے کیوں کہ یہ نصاریٰ کا عمل ہے اور ہمیں ان کے تشبہ سے بچنے کو کہا گیا ہے۔'' (شرح السیر الکبیر باب ما یکرہ فی دار الحرب وما لا یکرہ)

اب کتب احناف کے وہ حوالے دیکھیے جن سے محرمین کو دھوکہ ہوا:

امام سرخسی (۴۸۳ھ) کی مبسوط میں ہے:

لاتجوز الاجارة من الغناء والنوح والمزامير والطبل وشيء من اللهو ، لأنه معصية والاستئجار على المعاصي باطل۔ (المبسوط، کتاب الاجارات، باب الاجارہ الفاسدۃ: ۱۶/ ۳۸)

غنا، نوحہ، بانسری، طبل، یا کسی لہو کا اجارہ درست نہیں، کیوں کہ لہو معصیت ہے اور معصیت کا اجارہ باطل ہے۔

آلات موسیقی کی حرمت میں بہت سے فقہائے ناقلین اس قسم کی فقہی جزئیات پیش کرتے ہیں، جب کہ اس کے اندر لہو کی صراحت موجود ہے اور یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ اصطلاح فقہا میں لہو بالعموم لہو مذموم کے لیے استعمال ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات میں حرام یا مکروہ ہوتا ہے، لہٰذا لہو مذموم کے لیے غنا، خواہ آلات کے ساتھ ہو خواہ اس کے بغیر، بہر کیف مکروہ یا حرام ہوگا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ اگر لہو کے بغیر فقط تفریح طبع یا ذکر وفکر کے لیے غنا بالآلات یا بغیر آلات ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ ظاہر ہے کہ فقہائے سلف کی اس قسم کی عبارتیں اس سوال سے قطعاً غیر متعلق ہیں، بلکہ لہو کی قید کے ساتھ عدم جواز کا حکم اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ حکم لہو کے بغیر غنا یا آلات کے اندر نہیں پایا جائے گا۔ اس بات کی وضاحت تو خود دوسرے فقہائے حنفیہ نے کر دی ہے۔ علامہ محمد بن حسین طوری حنفی قادری (بعد ۱۱۳۸ھ) رقم طراز ہیں:

وفي شرح الكافي: ولا يجوز الإجارة على شيء من الغناء واللهو والنوح والمزامير والطبل ولا على الحداء وقراءة الشعر ولا غيره ولا أجر في ذلك، هذا في الطبل إذا كان للهو أما إذا كان لغيره فلا بأس به، كطبل القراءة وطبل العرس، وفي الأجناس: ولا بأس أن يكون ليلة العرس دف يضرب به لشهرة العرس، وفي الولوالجية: رجل استأجر رجلا ليضرب الطبل، إن كان للهو لا يجوز وإن كان للغزو والقافلة يجوز. (تکملۃ البحر الرائق للطوری، کتاب الاجارۃ، باب الاجارۃ الفاسدۃ، اخذ اجرۃ الحجام)

شرح الکافی میں ہے: غنا، لہو، نوحہ، بانسری اور طبل میں سے کسی کا بھی اجارہ جائز نہیں، نہ حدی خوانی اور شعر خوانی وغیرہ کا اجارہ جائز ہے، نہ اس پر کوئی اجر وثواب ہے۔ یہ طبل کے بارے میں اس صورت میں ہے جب وہ برائے لہو ہو، اگر غیر لہو کے لیے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، جیسے قراءت اور شادی کا طبل۔ اجناس میں ہے: شادی کی رات میں بغرض تشہیر دف بجانے میں کوئی حرج نہیں۔ ولوالجیہ میں ہے: ایک شخص نے دوسرے کو طبل بجانے کے کے لیے اجرت پر رکھا، اگر یہ بغرض لہو ہو تو ناجائز ہے اور اگر جہاد یا قافلے کے لیے ہو تو جائز ہے۔

مذکورہ دونوں عبارتوں پر دوبارہ نظر ڈالیں۔ ان کے اندر نغمہ خوانی، حدی خوانی اور شعر خوانی کے اجارے کو بھی ناجائز کہا گیا ہے تو کیا اس کی وجہ سے مطلقاً غنا، حدی خوانی اور شعر خوانی بھی حرام ہوں گے؟ اسی اصول کے تحت فقہائے معاصرین نعت ومنقبت کے اجارے کو بھی ناجائز کہتے ہیں تو کیا نعت ومنقبت پڑھنا بھی ناجائز ہو گیا؟ اس سیاق میں علامہ احمد سعید کاظمی (۱۹۸۶ء) لکھتے ہیں:

''اجرتِ غنا کے حرام ہونے سے کہاں لازم آتا ہے کہ غنا بھی حرام ہو۔ دیکھو اسی کتاب محیط میں جس کی عبارت معترض نے نقل کی ہے، اس منقولہ عبارت سے پہلے لکھا ہوا ہے کہ نر کو مادہ پر چڑھانے کی اجرت لینا جائز نہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ نر کو مادہ پر چڑھانا بھی حرام ہے۔''

(اثبات السماع، ص: ۴۰)

علامہ کاظمی آگے لکھتے ہیں:

''معلوم ہوا کہ اجرت اس وقت حرام ہوگی جس وقت طبل بجانے میں گناہ اور معصیت ہو، لیکن جب معصیت کے بجائے طاعت ہو تو پھر حرمت کی کوئی وجہ نہیں اور ہم نے کئی مرتبہ اس امر پر تنبیہ کی ہے کہ سماع صوفیاء کرام لہو ولعب کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اس سے خشوع وخضوع اور رقت قلب وعشق الٰہی پیدا ہوتا ہے، اس لیے یہ غنا موجب عصیاں نہ ہوا، بلکہ باعث طاعت ہوا۔ پس ایسا غنا اور اس کی اجرت دونوں جائز ہیں۔ بخلاف غنا محرم کی اجرت کے کہ اس غنا اور اس کی اجرت کے حرام ہونے

میں کسی کا اختلاف نہیں۔‘‘ (اثبات السماع،ص:۴۱)(۱)

امام ابوحنیفہ کے ولیمہ والے واقعہ اوراس میں امام صاحب کے قول **ابتلیت بھذا مرۃ** کے ذیل میں صاحب ہدایہ امام مرغینانی (۵۹۳ھ) لکھتے ہیں: **دلت المسئلة علی ان الملاھی کلھا حرم حتی التغنی بضرب القضیب**۔ یہ مسئلہ ثابت کرتا ہے کہ تمام اسباب لہو حرام ہیں، یہاں تک کہ لکڑی بجا کر گانا بھی حرام ہے۔ (کتاب الکراہیۃ، فصل فی الاکل والشرب)

بہت سے معاصرین صاحب ہدایہ کے اس قول سے سماع بالمزامیر کی حرمت پر از روئے حنفیت استدلال کرتے ہیں۔ایسے اصحاب سے گزارش ہے کہ:

۱- صاحب ہدایہ کے فہم و استدلال کو مذہب ابوحنیفہ تسلیم کر لینا کس اصول کے تحت ہے؟ کیا صاحب ہدایہ کا فہم عین مذہب امام ہے؟

۲- ماسبق میں گزر چکا کہ امام صاحب کے مذکورہ ارشاد سے آلات موسیقی کی مطلقاً حرمت پر استدلال درست نہیں ہے۔

۳- صاحب ہدایہ نے بھی مطلقاً آلات موسیقی کو حرام نہیں کہا ہے، بلکہ تمام اسباب لہو (ملاہی) کو حرام کہا ہے۔ یہاں واضح رہے کہ محققین کے نزدیک ہر لہو حرام نہیں ہوتا، بلکہ بعض مباح اور بعض مکروہ بھی ہوتا ہے، جس کی تفصیل لہو کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

۴- علما کا ایک طبقہ لہو کا اطلاق صرف حرام امور پر کرتا ہے، صاحب ہدایہ بھی انہی میں معلوم ہوتے ہیں۔ اب جب کہ انہوں نے ملاہی کو حرام کہا ہے تو اس سے تمام آلات کو ملاہی اور حرام سمجھنا زیادتی ہے۔ ملاہی کی صراحت بتاتی ہے کہ حرمت کا حکم وصف لہو کی شرط کے ساتھ ہے اور اہل نظر پر مخفی نہیں کہ آلات موسیقی اپنی ذات کے اعتبار سے آلات لہو نہیں ہیں، بلکہ اپنے مقاصد استعمال کے اعتبار سے آلات لہو ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات انہیں مطلقاً آلات لہو کہہ دیا جاتا ہے، جواز باب مجاز ہے۔ بقول علامہ شامی (۱۲۵۲ھ):

آلة اللهو ليست محرمة لعينها، بل لقصد اللهو منها: إما من سامعها، أو من المشتغل بها، وبه تشعر الإضافة، ألا ترى أن ضرب تلك الآلة بعينها حل تارة وحرم أخرى۔

آلۂ لہو بذات خود حرام نہیں، بلکہ قصد لہو کے سبب حرام ہے، یہ قصد لہو خواہ سامع کی طرف سے ہو یا بجانے والے کی طرف سے۔ اضافت بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کیا نہیں دیکھتے کہ ایک ہی آلہ کبھی حلال ہوتا ہے اور کبھی بعینہ وہی حرام ہو جاتا ہے؟ (ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحۃ)

---

(۱) اقول: جہاں تک غنائے صوفیہ کی اجرت کے جواز کی بات ہے تو فیہ نظر، اگرچہ غنائے صوفیہ جائز ہے۔ چنانچہ بعض فقہائے معاصرین نے لکھا ہے اور بجا لکھا ہے کہ نعت و منقبت پڑھنے کی اجرت ناجائز ہے، اگرچہ نعت خوانی بلا اختلاف جائز ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ملاہی سے مراد جملہ آلات موسیقی ہوں تب بھی ان پر حکمِ حرام کا اطلاق اس صورت میں ہوگا جب ان کا استعمال بغرض لہو ہو۔ بقول فاضل بریلوی (۱۳۴۰ھ): مزامیر یعنی آلات لہو ولعب بروجہ لہو ولعب بلاشبہ حرام ہیں۔ (فتاویٰ رضویہ: ۲۴/ ۷۸، پوربندر)

فقہائے حنفیہ کی مختلف عبارات نقل کرنے اور ان کی تشریح وتوضیح کرنے کے بعد علامہ عبد الغنی نابلسی (۱۱۴۳ھ) لکھتے ہیں:

''پس ہمیں تو مذہب حنفی بلکہ دیگر مذاہب کے فقہائے کرام کی آلات نغمات کی حرمت کے بارے میں کوئی ایک بھی ایسی عبارت نہیں ملی جس میں لہو کی قید کو ملحوظ نہ رکھا گیا ہو، اسی لیے ان فقہائے کرام نے ارشاد فرمایا: ملاہی کا سننا یا لہو والی کسی شے کا سننا وغیرہ، جیسا کہ عبارات فقہا ماقبل مذکور ہو چکیں اور اگر بالفرض مذہب حنفی یا کسی اور مذہب کی کتب فقہ میں دف، طنبورہ وغیرہ کے سننے کو بغیر لہو کی قید کے حرام ذکر کیا بھی گیا ہے تو ہمیں دیگر اکابر فقہائے کرام کے قانون کے پیش نظر یہ تاویل کرنی پڑے گی کہ قائل کی مراد بطریق لہو ولعب ان کے سماع کا حرام ہونا ہے۔ کیوں کہ لہو کی قید دیگر فقہائے کرام کی عبارات میں مذکور بلکہ احادیث واخبار میں موجود ومسطور ہے۔

اور جن احادیث میں لہو کی قید کے بغیر مطلقاً ذکر موجود ہے تو ہم ایسی احادیث کو شراب نوشی اور ناچنے والی عورتوں کے ذکر سے مقید پاتے ہیں، جب کہ بعض احادیث میں کسی بھی قسم کی قید نہیں پاتے تو ایسی صورت میں علمائے کرام نے دیگر احادیث واقوال کے پیش نظر کچھ اشیاء کا استثنا کیا ہے اور استثنا دراصل قید ہی تو ہے۔'' (ایضاح الدلالات، ص:۹۶، ۹۷ (اردو)

بیہقی زماں قاضی ثناء اللہ پانی پتی حنفی نقش بندی رحمہ اللہ (۱۲۵۵ھ) لکھتے ہیں:

''در نکاح بضرب دفوف رسول کریم صلعم امر فرمود و مالک آں را شرط نکاح گفتہ و چون ضرب دف برائے اعلان نکاح حلال یا مستحب باشد، دہل وطنبور، ونقارہ وغیرہ از دف چہ تفاوت است، برائے لہو ہمہ حرام است و برائے غرض صحیح ہمہ حلال باشد، اعلان نکاح از ہر یک میشود، فرق کردن در دف وغیر آں امری است غیر معقول۔'' (رسالہ سماع، ص:۱۶)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح میں دف بجانے کا حکم دیا ہے اور امام مالک نے اسے شرط نکاح قرار دیا ہے۔ اب جب کہ اعلان نکاح کے لیے دف بجانا جائز یا مستحب ہوا، ڈھول، طنبور اور نقارے کا حکم دف سے مختلف کیسے ہو گیا؟ لہو کے لیے سب حرام اور صحیح مقصد کے لیے سب حلال۔ اعلان نکاح ان میں سے ہر ایک سے ہو سکتا ہے۔ دف اور غیر دف میں فرق کرنا ایک غیر معقول بات ہے۔

درج بالا حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ:

۱-آلات موسیقی کی حرمت میں امام اعظم ابوحنیفہ سے کوئی صراحت منقول نہیں ہے۔

۲-غنا اور لعب کی ایک مجلس میں وہ شریک ہوئے تھے، جس کی تعبیر ابتلیت بھذا سے فرمائی ہے۔ان کے لفظ ابتلا سے تعین کے ساتھ حرمت پر استدلال ایک نامکمل استدلال ہے۔اس استدلال کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کا انطباق غنا اور لعب پر ہوگا جس کے ساتھ امام نے ابتلا کا لفظ استعمال کیا ہے۔کمال ہے ان فقہا کا جو ابتلا کے ساتھ وارد ہونے والے الفاظ؛ لعب اور غنا کو تو وہ مطلقاً حرام نہیں کہتے، لیکن آلات غنا جن کا وہاں سرے سے ذکر ہی نہیں، مذکورہ قول کی بنیاد پر ان کو از روئے حنفیت مطلقاً حرام کہتے ہیں۔

۳-امام ابوحنیفہ کے نزدیک آلات موسیقی کی خرید وفروخت جائز ہے اور ان کے توڑنے پر تاوان واجب ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب آلات موسیقی کو ہرگز ناجائز نہیں سمجھتے، خصوصاً اطلاق وعموم کے ساتھ، ورنہ جس طرح ان کے نزدیک شراب اور خنزیر کی خرید وفروخت ناجائز ہے، آلات موسیقی کی خرید وفروخت بھی ناجائز ہوتی۔

۴-امام محمد کی تحقیق کے مطابق ناقوس اور شبور بجانا جائز نہیں، اور گھنٹے اور گھنٹیاں بجانا، اگر کسی غرض صالح کے لیے ہو تو جائز ہے۔امام سرخسی نے لکھا ہے کہ ناقوس اور شبور میں نصاریٰ سے تشبہ ہے، اس لیے ناجائز ہے، رہے گھنٹے، گھنٹی، گھنگھرو تو نیک مقاصد کے لیے جائز اور جہاں ضرر ہو یا فاسد مقصد ہو وہاں ناجائز۔چوں کہ اعمال کی بنیاد نیتوں پر ہے۔

۵-سرخسی کی مبسوط میں ہے کہ غنا، آلات غنا اور نوحہ پر اجارہ جائز نہیں۔اس قسم کی عبارت سے بہت سے فقہا نے غنا اور آلات غنا کو حرام کہا ہے۔خصوصاً آلات غنا پر تو پوری قوت صرف کر دی ہے۔جب کہ کسی چیز کے اجارہ کے عدم جواز سے اس چیز کا عدم جواز ثابت ہو، کوئی ضروری نہیں۔پھر یہ کہ سرخسی نے ان اشیا کے ساتھ لہو کا ذکر کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان امور کا اجارہ ناجائز اس وقت ہے، جب وہ بغرض لہو ہو۔تکملۃ البحر الرائق کے مصنف علامہ طوری نے یہی وضاحت کی ہے۔

۶-علامہ شامی نے بطور خاص وضاحت کی ہے کہ آلات موسیقی بذاتہ حرام نہیں ہیں، بلکہ ان کے بجانے یا سننے میں لہو کا جب قصد ہوگا تب ان کا بجانا یا سننا حرام ہوگا۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محققین حنفیہ کے نزدیک آلات موسیقی کی حرمت مطلقاً یا بالذات ثابت نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ علامہ شامی نے کہا ہے کہ ایک ہی آلے کا بجانا یا سننا کبھی ناجائز ہوتا ہے اور کبھی جائز اور ایسا لہو کا قصد ہونے یا نہ ہونے کے سبب ہوتا ہے۔

۷-علامہ عبدالغنی نابلسی حنفی نے تو بالکل صاف کر دیا کہ کتب حدیث وفقہ میں جہاں کہیں آلات موسیقی کی حرمت کا ذکر ہے، وہاں لہو کی قید، یا شراب و کباب کا ذکر موجود ہے، لہٰذا آلات موسیقی کی حرمت لہو کے سبب ہوگی اور لہو کے فقدان سے اس کی حرمت کا حکم بھی مفقود ہو جائے گا۔قاضی ثناء اللہ صاحب نے تو اسی بات کو بالکل

واشگاف لفظوں میں کہا کہ آلات موسیقی کی حلت وحرمت کے معاملے میں دف اور غیر دف کا فرق درست نہیں۔ برائے لہو سب حرام اور برائے غرض صحیح سب جائز۔ مرشد گرامی فرماتے ہیں:

''یہ بات کس قدر غیر معقول ہے کہ کھال اگر ایک طرف لگی ہو (دف) تو جائز اور وہی کھال اگر دونوں طرف لگ جائے (طبل) تو ناجائز!''

تحقیق مقام

شیخ الازہر شیخ محمود شلتوت (۱۸۹۳-۱۹۶۳ء) فرماتے ہیں:

''فسماع الآلات ذات النغمات أو الأصوات الجميلة ، لا يمكن أن يحرم بإعتباره صوت آلةأو صوت إنسان أو صوت حيوان، وإنما إذا استعين به على محرم أو اتخذ وسيلةإلى محرم أو ألهي عن واجب.'' (الفتاوی للشیخ محمود شلتوت، ص: ۴۱۴)

نغمگی یا خوش الحانی والے آلات کا سننا حرام ہو ہی نہیں سکتا، اس اعتبار سے کہ وہ کسی آلے، کسی انسان یا کسی حیوان کی آواز ہے۔ یہ حرمت اس وقت ہوگی جب وہ کسی امر حرام پر معاون ہو، یا کسی امر حرام تک پہنچنے کا وسیلہ بنے یا کسی واجب سے غفلت کا سبب بنے۔

اسی فتوے میں شیخ شلتوت کے پیش رو شیخ الازہر شیخ حسن عطار شافعی (۱۸۳۵ء) کے حوالے سے رقم ہے:

كان الشيخ حسن العطار -شيخ الجامع الأزهر في القرن الثالث عشر الهجري- ذا ولع شديد بالسماع وعلى معرفة تامة بأصوله، ومن كلماته في بعض مؤلفاته: ''من لم يتأثر برقيق الأشعار، تتلى بلسان الأوتار، على شطوط الأنهار، في ظلال الأشجار، فذلك جلف الطبع حمار۔'' (حوالہ سابق)

تیرہویں صدی ہجری کے شیخ الازہر شیخ حسن عطار موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے اور اصول موسیقی کے بڑے رمز آشنا تھے۔ ان کی کسی کتاب میں ان کے یہ الفاظ ہیں: ساحل سمندر پر، درختوں کی چھاؤں میں، ستار کے ساز پر پڑھے جارہے لطیف اشعار سے جو شخص لطف اندوز نہ ہو، وہ خشک طبع حمار ہے۔

عصر حاضر کے معروف سلفی عالم ڈاکٹر یوسف القرضاوی لکھتے ہیں:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سماع اور بالخصوص سماع بالمزامیر کے تعلق سے فقہائے متقدمین کے بالمقابل فقہائے متاخرین زیادہ سخت ہیں اور اس کے کئی اسباب ہیں:

۱-احتیاط- متقدمین کے یہاں آسانی پائی جاتی ہے جب کہ متاخرین کے یہاں احتیاط پسندی زیادہ ہے۔ یعنی سختی اور تشدد۔ عہد صحابہ اور اس کے بعد کے اسالیب فقہ وفتویٰ کی تاریخ کا جو مطالعہ کرے گا وہ اس حقیقت کو واضح طور پر محسوس کرے گا۔ اس کے بے شمار شواہد موجود ہیں۔

۲-احادیث ضعیفہ اور موضوعہ سے دھوکہ- فقہائے متاخرین کوضعیف وموضوع روایات کے سیل رواں نے متاثر کرلیا جن سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔روایات واسانید کی تحقیق وتمحیص کا انہیں ملکہ نہیں تھا۔اس لیے اس قسم کی حدیثیں ان کے بیچ رائج ہوگئیں۔خصوصاً ایسی صورت حال میں جب کہ یہ قول ان کے بیچ عام تھا کہ ''ضعیف روایتیں کثرت طرق کے سبب قوی ہوجاتی ہیں۔''

۳-مروج نغمہ سرائی- مروج نغمہ سرائی انحرافات اورتجاوزات سے آلودہ تھی،جس کے سبب فقہانے منع وتحریم کے پہلو کی ترجیح فرمائی۔اس مروج نغمہ سرائی کی دوصورتیں تھیں جن میں سے ہرایک فقہا کی ایک جماعت پر اثر انداز ہوئی۔'' (الاسلام والفن،ص:۳۷)

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اس کے بعد منحرف نغمہ سرائی کی دونوں محافل کا ذکر کیا ہے۔ان کے مطابق منحرف مجالس کی ایک قسم تو وہ ہے جو فساق وفجار، بے دین وبے شرع لوگوں کی مجالس ہیں، جو عہد جاہلیت سے عہد عباسی تک اورتب سے اب تک تسلسل کے ساتھ قائم ہیں۔

ڈاکٹر قرضاوی کے مطابق فقہائے متشددین کی نظر میں منحرف نغمہ سرائی کی دوسری قسم صوفیہ کا سماع ہے جن کے یہاں یہ دینی سماع ذوق وشوق کو بڑھانے اور سیر الی اللہ کی رفتار تیز کرنے کے لیے ہے۔صوفیہ اسے قربت وعبادت کا درجہ دیتے ہیں،جس کی مذمت شیخ ابن تیمیہ اوران کے تلمیذ شیخ ابن القیم نے بطور خاص کی ہے۔اس کے بعد انہوں نے امام غزالی کا ذکر کیا ہے جو سماع صوفیہ کے مجوز اور وکیل ہیں۔قرضاوی نے ان کے موقف کو معتدل ترین موقف کہا ہے۔''اعدل **المواقف المعبرة عن وسطية الشريعة وسماحتها وصلاحيتها لكل البيئات والأعصار۔**'' (ص:۳۹)

یوسف قرضاوی نے اس مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ امام غزالی احیاء العلوم کے اندر عمومی طور پر تقلید سے آزاد اوراجتہاد مطلق کے درجے پر فائز نظر آتے ہیں۔اس کے بعد امام غزالی کے حوالے سے ان پانچ عوارض کو ذکر کیا ہے جن کے سبب سماع حرام ہوجاتا ہے۔ان میں دوسرا عارض آلات سماع کے تعلق سے ہے۔امام غزالی فرماتے ہیں:

> **''العارض الثاني في الآلة بأن تكون من شعار أهل الشرب أو المخنثين وهي المزامير والأوتار وطبل الكوبة، فهذه ثلاثة أنواع ممنوعة، وما عدا ذلك يبقى على أصل الإباحة كالدف -وإن كان فيه الجلاجل- وكالطبل والشاهين والضرب بالقضيب وسائر الآلات۔** (احیاء علوم الدین، کتاب آداب السماع والوجد، الباب الاول)

دوسرا عارض آلے سے متعلق ہے۔وہ یہ کہ وہ آلہ شرابیوں اور مخنثوں کا شعار ہو، اور یہ منہ سے بجائے جانے والے اورتاروالے آلات موسیقی اور ڈمرو ہیں۔یہ تینوں ممنوع اقسام ہیں۔ان کے علاوہ جو بھی آلات موسیقی ہیں وہ اصل اباحت پر قائم ہیں، جیسے دف-خواہ اس میں گھنگھرو ہی کیوں نہ ہو-، طبل،شاہین،لکڑی اور دیگر آلات موسیقی۔(احیاء علوم الدین:۲/ ۲۸۲)

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آلات موسیقی کے حوالے سے امام غزالی کی فکر کو ذرا تفصیل سے نقل کیا جائے۔فرماتے ہیں:

موزون آوازیں اپنے مخارج کے لحاظ سے تین طرح کی ہوتی ہیں: یا تو وہ جماد سے نکل رہی ہوں گی، جیسے بانسری، ستار، لکڑی، طبل وغیرہ کی آواز یا وہ کسی جاندار کے حلق سے نکل رہی ہوگی؛ پھر وہ جاندار یا تو انسان ہوگا یا غیر انسان، جیسے بلبلوں اور قمریوں کی آواز اور دیگر خوش الحان پرندوں کی آواز۔ یہ آوازیں اچھی ہونے کے ساتھ موزون اور متناسب ہوتی ہیں، اس لیے ان کا سننا خوش گوار ہوتا ہے۔ پھر آوازوں میں اصل ان کا حیوانات کے حلقوم سے نکلنا ہے۔آلات موسیقی بھی حلقوم کی آوازوں کی نقل پر بنے ہیں۔ دراصل یہ خلقت سے صنعت کی تشبیہ پر مبنی ہیں۔ چنانچہ ارباب صنعت نے جس چیز کو بھی ایجاد کیا ہے اس کی مثال خلقت میں موجود ہے، جو خالص اللہ کا عمل ہے۔خلقت سے ہی اہل صنعت نے ایجاد کرنا سیکھا اور اسی کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ اس اجمال کی تفصیل بہت طویل ہے۔لہٰذا اب ان آوازوں کا سننا حرام ہو، یہ ایک محال امر ہے۔ کیوں کہ یہ آوازیں اچھی اور موزون ہوتی ہیں۔ بھلا بلبل اور دیگر پرندوں کی آواز کو کون حرام کہنے لگا۔ اور اس سلسلے میں نہ مختلف حلقوموں کے درمیان کوئی فرق ہے [کہ کسی کے حلق کی آواز جائز ہو اور کسی کے حلق کی ناجائز] اور نہ ہی جماد اور حیوان کا کوئی فرق۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ بلبل کی آواز پر ہی دیگر اجسام سے نکلنے والی آوازوں کا قیاس کیا جائے جو انسان کے قصد وارادہ سے نکلتی ہیں۔ جیسے وہ آواز جو اس کے حلق سے، یا لکڑی سے یا طبل ودف وغیرہ سے نکلتی ہے۔اس کلیہ سے صرف انہی سازوں، ستاروں اور مزامیر کا استثنا ہوگا شریعت میں جن کی ممانعت وارد ہے۔ پھر یہ ممانعت بھی بالذات نہیں ہے، کیوں کہ اگر یہ ممانعت بالذات ہوتی تو اس پر قیاس کرتے ہوئے ہر وہ چیز حرام ہو جاتی جس سے انسان لذت حاصل کرتا ہے۔لیکن معاملہ یہ ہے کہ شراب حرام کی گئی تو اس کا شر اس بات کا مقتضی تھا کہ لوگوں کو اس سے دور رکھنے کے لیے پورا غلو اور شدت سے کام لیا جاتا، یہاں تک کہ شروع میں اس کا ظہور اس حد تک ہوا کہ شراب کے برتن توڑ دیے گئے۔ لہٰذا اب شراب کے ساتھ شرابیوں کا شعار بھی حرام کر دیا گیا اور یہ فقط ستار اور بانسریاں تھیں۔ یہ حرمت بالتبع تھی، جیسے اجنبیہ کے ساتھ خلوت کو اس لیے حرام کر دیا گیا کیوں کہ یہ زنا کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ران کی طرف دیکھنا حرام کر دیا گیا کیوں کہ یہ دونوں شرم گاہوں سے متصل ہوتی ہے۔تھوڑی شراب جو نشہ آور نہ ہو، اسے بھی حرام کیا گیا، کیوں کہ وہی نشے کی داعی بنتی ہے۔اسی طرح ہر حرام کا ایک حریم ہوتا ہے جو اس حرام کے چاروں طرف محیط ہوتا ہے اور اس حریم کی حرمت اس لیے ہوتی ہے کہ جو چیز اصلاً حرام ہے یہ حریم اس کے

گرد مضبوط حصار بن کر اس کے لیے محافظ اور اس سے لوگوں کو دور رکھنے والا بن جائے۔جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر بادشاہ کا ایک مضبوط حصار ہوتا ہے اور اللہ کا حصار اس کے حرام کردہ امور ہیں۔اس لیے یہ آلات تین وجوہ سے تبعاً حرام ہیں:

۱-وہ شراب نوشی کی طرف داعی ہوتے ہیں؛ کیوں کہ ان سے جو لذت حاصل ہوتی ہے ان کی تکمیل شراب سے ہی ممکن ہوتی ہے۔اسی طرح کی علت سے شراب کی تھوڑی مقدار بھی حرام کر دی گئی۔

۲-ان آلات کی حرمت بھی اس کے حق میں ہے جس نے ابھی ابھی شراب چھوڑی ہو،اس کے لیے وہ آلات موسیقی مجالس مے کشی کی یاد تازہ کرنے والے ہوں گے۔گویا وہ آلات یاد کے موجب ہیں اور یاد شوق کی موجب ہوا کرتی ہے اور شوق اگر بڑھ جائے تو وہ براہ راست مے کشی کا موجب بن جائے گا۔اسی علت کے پیش نظر شراب کے لیے مخصوص ظروف؛ مزفت، حنتم اور نقیر میں نبیذ بنانے سے منع کر دیا گیا۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان آلات کا مشاہدہ شراب کی یاد پیدا کر دے گا۔۔۔

۳-ان آلات پر مشتمل محافل میں شرکت چوں کہ فساق کی عادت ہے،اس لیے ان سے مشابہت کے سبب ممانعت آئی۔کیوں کہ جو جس قوم سے مشابہت اختیار کرتا ہے وہ انہی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی علت کے تحت ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی سنت کبھی اہل بدعت کا شعار بن جائے تو ان سے مشابہت کے خوف سے اسے ترک کر دیا جائے گا۔(۱) اسی علت کے سبب ڈمرو بجانا حرام ہے، جو کہ ایک مستطیل شکل کا باجہ ہوتا ہے، بیچ کا حصہ تنگ ہوتا ہے اور دونوں کنارے کشادہ ہوتے ہیں۔ڈمرو بجانا ہجڑوں کا شعار ہے۔اگر اس کے اندر یہ مشابہت نہ ہوتو اس کا حکم بھی حج اور جہاد کے طبل کا ہوگا۔اسی علت کے پیش نظر ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کچھ لوگ ایک ایسی مجلس آراستہ کریں جس میں مجالس مے کشی کے آلات موسیقی اور ظروف لے کر بیٹھیں اور انہیں ظروف میں شکنجبی انڈیلیں،ایک ساقی مقرر کریں جو اہل مجلس کے پاس یکے بعد دیگر جائے اور انہیں شکنجبی پلائے، وہ اس ساقی سے پیالہ لیں اور پییں اور باہم انہی الفاظ کا تبادلہ کریں جو شرابیوں کی مجالس کے مروج الفاظ ہیں تو ایسا کرنا ان کے لیے حرام ہوگا، اگر چہ وہ مشروب فی نفسہ مباح ہے؛ کیوں کہ ایسا کرنا فساق سے مشابہت پر مبنی ہے۔ اسی علت کے پیش نظر قبا پہننا اور سر پر کہیں بال چھوڑ دینا اور کہیں مونڈ دینا ممنوع ہے، جہاں قبا پوشی فساق کا شعار ہو، چنانچہ بلاد ماوراء النہر میں ممنوع نہیں ہے، کیوں کہ وہاں اہل تقویٰ اس لباس کے عادی ہیں۔اور اسی علت کے سبب عراقی بانسری اور سارنگی، صنج، رباب، بربط جیسے ہر قسم کے تار والے آلات موسیقی حرام ہیں۔البتہ ان کے ماسوا جو آلات ہیں ان کا

(۱) یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں تاہم امام کی اس فکر سے بہت سے اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔

یہ حکم نہیں ہے۔ مثلاً چرواہوں اور حاجیوں کی شاہین، طبلچیوں کی شاہین، طبلہ اور لکڑی بجانا اور اسی طرح ہر ایسا آلہ بجانا جس سے اچھی اور موزون آواز نکلے، سوائے ان آلات کے جو شرابیوں کا شعار ہو۔ یہ حلت اس لیے ہے کہ یہ آلات نہ تو شراب سے متعلق ہیں، نہ شراب کی یاد دلانے والے ہیں، نہ اس کا شوق پیدا کرنے والے ہیں، نہ شرابیوں سے مشابہت پیدا کرنے والے ہیں۔ لہٰذا یہ آلاتِ حرام کے حکم میں نہیں ہوں گے اور پرندوں اور دوسرے حیوانات کی آواز پر قیاس کرتے ہوئے اپنی اصل یعنی اباحت پر باقی ہوں گے، بلکہ میں کہتا ہوں کہ تار والے باجے اگر غیر موزون اور بے ہنگم بجائے جائیں اور سننے والے کو اس سے لذت ملے تب بھی وہ سماع حرام ہوگا۔ اس سے واضح ہو گیا کہ ان کی تحریم میں علت صرف اچھی لذت کا ملنا نہیں ہے، بلکہ از روئے قیاس تو تمام اچھی چیزیں حلال ہیں، سوائے ان کے جن کی حلت میں کوئی فساد ہو۔ اللہ کریم کا ارشاد ہے: پوچھو، اللہ نے اپنے بندوں کے لیے جو آرائش پیدا کی ہے، اسے کس نے حرام کر دیا۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (اعراف:۳۲)

لہٰذا یہ آوازیں موزون آواز ہونے کی وجہ سے حرام نہیں ہو سکتیں، بلکہ ان کی حرمت کسی دوسرے عارض کے سبب ہوتی ہے، جس کا بیان عوارض محرمہ کے ذیل میں آئے گا۔

(احیاء علوم الدین: ۲/ ۲۷۱-۲۷۳)

امام غزالی کی تعلیلات وتوجیہات پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ قرضاوی لکھتے ہیں:

غزالی کی مذکورہ عوارض کی بحث سے معلوم ہوا کہ انہوں نے تار والے آلات اور بانسریوں کو حرمت کے عوارض میں شمار کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چوں کہ ان آلات کی ممانعت کے تعلق سے نص وارد ہے۔ امام غزالی نے اس ممانعت کی تعلیل وتوجیہ میں بڑی کوشش کی ہے اور بڑی عمدہ اور نفیس گفتگو کی ہے۔۔۔۔ اللہ کریم امام غزالی پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شرع میں کوئی ایک بھی ایسا نص وارد نہیں جو مزامیر واوتار کی حرمت پر صحیح الثبوت اور صریح الدلالۃ ہو، جیسا کہ انہوں نے سمجھ لیا ہے۔ انہوں نے اس باب میں وارد مرویات کو پہلے درست تسلیم کر لیا پھر ان کی مذکورہ توجیہ وتاویل میں لگ گئے۔ اگر اس باب کی مرویات کا ضعف ان پر آشکار ہوتا تو وہ تاویل کے پیچھے اس قدر خود کو نہ تھکاتے۔ تاہم ان کی توجیہ وتاویل ان لوگوں کے حق میں بہت ہی زبردست ہے جو ان احادیث کے ضعف کو تسلیم نہیں کرتے۔ (الاسلام والفن، ص:۴۱)

اقول: بر تقدیر صحت روایات، یہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جیسا کہ بعض آلات موسیقی کی منصوص حرمت کے بارے میں امام غزالی نے فرمایا کہ:

۱- وہ آلات شراب نوشی کی طرف داعی ہوتے ہیں۔

۲- جس نے جلد ہی شراب چھوڑی ہو اس کے لیے یہ آلات مذکر شراب اور داعی شراب بن جاتے ہیں۔

۳- یا پھر ان آلات پر مشتمل محافل کا انعقاد فساق کا شعار ہے۔

اب اگر امام کی ان توجیہات کو تسلیم کرلیا جائے جو قرین قیاس بھی ہیں، تو ان تینوں علتوں کے فقدان کی صورت میں ان مخصوص ممنوع آلات کا استعمال بھی درست ٹھہرے گا۔ جیسا کہ حنتم، دباء، مزفت اور دیگر ظروف شراب کی منصوص حرمت کے باوجود فقہا نے ان مسلمانوں کے لیے ان ظروف کے استعمال کو جائز کہا ہے جن کے دل میں شراب کی حرمت راسخ ہو چکی ہے اور وہ ان ظروف کو دیکھ کر اب شراب کی عادت کی طرف نہیں لوٹ سکتے۔ اسی بات کو سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کے حکم سے ان کے جلیل القدر خلیفہ علامہ فخر الدین زرادی نے انتہائی اختصار، جامعیت، فنیت اور خوب صورتی کے ساتھ اپنے رسالہ اصول السماع میں بیان کیا ہے۔ آخر میں ایک بار پھر ان کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

مزمار وہ آلہ ہے جس میں موزون آواز پائی جائے اور اپنی ذات کی طرف نظر کرتے ہوئے یہ مباح ہے، جیسا کہ اہل علم نے بتایا ہے۔

رہی اس کی حرمت تو اس کی علت ایک دوسری چیز ہے اور وہ ہے شراب نوشی کی یاد کا تازہ ہونا، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے ثقہ راویوں نے بیان کیا ہے کہ جب شراب حرام ہوئی تو مزامیر بھی حرام ہو گئے۔ اس لیے کہ شراب پیتے وقت لوگ مزامیر بجایا کرتے تھے، اس لیے اب اس کا بجانا حرام کر دیا گیا تاکہ اس سے شراب نوشی کی یاد تازہ نہ ہو جائے۔ اس طرح مزامیر قبیح لغیرہ ہوا۔ تو اب جب بھی یہ علت حرمت مفقود ہوگی، اس وقت یقینی طور پر مزامیر کی حرمت بھی ختم ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جنگوں میں طبل اور اچھے اوقات میں 'شخ' (شہنائی) وغیرہ بجانا درست ہے۔ ثابت ہوا کہ علت بدلنے سے مزامیر کا حکم بھی بدل جائے گا۔ اگر نفس، لہو سے پاک ہو، مزکّٰی و مصفّٰی ہو، مشتاق لقاے مولیٰ ہو، ایسی صورت میں مزامیر کی آواز آلودگی سے صفائی کی طرف اور پستی سے بلندی کی طرف لے جانے والی ہوگی۔ اس لیے کہ اچھی آواز روح کی غذا ہے اور یہ غذا عالم ملکوت میں روح کی پرواز میں معاون ہوگی۔ اس کی تائید حضرت ذوالنون مصری کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ آپ سے اچھی آواز کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ خطاب غیبی اور اشارۂ غیبی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے ہر اچھے اور پاک مرد و عورت کے اندر ودیعت فرما دی ہے۔

ثابت ہوا کہ اچھے مرد و عورت کے لیے سماع مزامیر جائز ہے، کیوں کہ ان کے حق میں مزامیر کی حرمت کی علت مفقود ہے۔ اسے جنگوں میں بجنے والے نقاروں پر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کیا آپ

نے نہیں دیکھا کہ اعلان نکاح کے لیے نبی کریم ﷺ نے دف بجانے کو جائز کہا ہے۔ صحیح حدیث ہے: **اعلنوا النکاح و لو بالدف** اگر چہ دف سے ہو، نکاح کا اعلان کرو۔ عید اور دیگر مسرت کے دنوں میں بھی دف بجانے کی دیگر روایتیں موجود ہیں۔ غور کرو کہ دف میں دو اوصاف ہیں؛ مسرت انگیزی اور اعلان، مسرت اس کی آواز کی موزونیت کی وجہ سے ہے اور اعلان اس آواز کی بلندی کے سبب ہے۔ نبی کریم ﷺ نے انھیں دو اوصاف کے پیش نظر دف بجانے اور سننے کو مباح فرمایا۔ لہٰذا دف کے علاوہ دیگر مزامیر کو بھی انھیں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کی حرمت، علت حرمت کی موجودگی کے سبب تھی، جب علت نہ رہی تو اب حرمت بھی نہ رہی۔ امام غزالی نے اسی استدلال کے پیش نظر مزامیر کی آواز کو خوش الحان پرندوں کی آواز پر محمول کیا ہے اور سماع مزامیر کو جائز قرار دیا ہے۔ (۱۸-۲۲)

خلاصۂ بحث

۱- مزامیر و معازف کے الفاظ تمام آلات موسیقی کو شامل ہیں، اگر چہ کبھی خصوصی مفاہیم میں بھی ان کا اطلاق ہوتا ہے، مثلاً مزامیر منہ سے بجائے جانے والے آلات اور معازف ہاتھ سے بجائے جانے والے آلات۔ مزامیر، بانسری کے معنی میں یا نغمات کے معنی میں اور معازف دف کے معنی میں وغیرہ۔

۲- مزامیر و معازف کی حلت و حرمت میں کوئی حکم ناسخ یا منسوخ نہیں، نہ ان میں کوئی حکم خاص اور عام ہے، نہ کچھ آلات مستثنیٰ اور کچھ مستثنیٰ منہ ہیں، بلکہ سارے احکام علی حالہ اب بھی قائم اور باقی ہیں۔

۳- آلات موسیقی کی حلت یا حرمت کے حوالے سے کتاب اللہ میں کوئی صریح نص موجود نہیں ہے۔ احادیث بے شمار ہیں اور دونوں طرح کی ہیں۔ علمائے متعصبین میں سے ہر گروہ اپنے ذوق کے مطابق ان میں سے ایک طرح کی احادیث کو لے لیتا ہے اور دوسری قسم کی احادیث کو ترک کر دیتا ہے، جب کہ حق پسند علما دونوں طرح کی احادیث کو لیتے ہیں اور ان میں ترجیح و تطبیق کی مناسب راہ تلاش کرتے ہیں۔

۴- حق پسند علما ان دونوں قسم کی احادیث میں تطبیق کے قائل ہیں۔ یہ تطبیق دو طرح سے کی گئی ہے:

(الف) اصل حکم حرمت کا ہے جب کہ جواز کے احادیث استثنائی واقعات پر مبنی ہیں۔

(ب) اصل حکم اباحت کا ہے جب کہ حرمت کا حکم کسی امر حرام کے اتصال کے ساتھ مقید ہے۔

تحقیق کار کے نزدیک یہی دوسری تطبیق درست، راجح اور عقل، فطرت اور مقاصدِ کتاب وسنت سے قریب ہے۔ چنانچہ اس پوری بحث سے یہ بات پورے طور پر واضح کی جا چکی کہ حلت کا حکم ہی اصالۃً ہے، جب کہ حرمت کا حکم کسی سبب حرام سے اتصال کے سبب ہے، یا حلت کا حکم مطلق ہے اور حرمت کا حکم کسی قیدِ حرمت کے ساتھ مقید ہے۔ جس طرح کہ نغمات کی بحث میں گزرا کہ نغمات اپنی اصل کے لحاظ سے مباح ہیں، البتہ کسی سبب حرام کے

اتصال کے پیش نظر ان کے اندر حرمت کا معنی پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لیے غنا - وہ مجرد ہو یا بالآلات - دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔ اصل کے لحاظ سے مباح، جب کہ استحباب، کراہت اور حرمت کے اسباب کے ساتھ اتصال کے وقت مستحب، مکروہ یا حرام۔ ٹھیک اسی طرح آلات موسیقی اپنی اصل کے لحاظ سے مباح ہیں، جب کہ استحباب، کراہت اور حرمت کے اسباب کے ساتھ اتصال کے وقت مستحب، مکروہ یا حرام۔

۵ - ائمہ اربعہ سے آلات موسیقی کی مطلقاً حرمت کی صراحت موجود نہیں ہے، بلکہ چاروں مذاہب میں ایسے فقہا موجود ہیں جو آلات موسیقی کو مطلقاً یا ان کے بعض اقسام کو مباح کہتے ہیں۔ ہاں! عام فقہاے مذاہب کا عمومی میلان عمومی حرمت و کراہت کی طرف ہے، جس سے بہت سے قدیم و جدید محققین نے اختلاف کیا ہے۔

۶ - آلات موسیقی کی حرمت میں امام ابو حنیفہ سے کوئی صراحت منقول نہیں ہے۔ امام کے جس جملے سے بعض فقہا نے حرمت پر استدلال کیا ہے، اس عبارت سے حرمت پر استدلال نامکمل ہے۔ مزید یہ کہ وہ عبارت غنا اور لعب سے متعلق ہے، آلات موسیقی سے راست متعلق نہیں ہے، جب کہ حنفیہ غنا اور لعب کو مطلقاً حرام نہیں کہتے۔ مزید یہ کہ امام صاحب کے بعض ایسے اقوال ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک آلات موسیقی حرام نہیں ہے، چوں کہ وہ ان کے خرید و فروخت اور ان کے توڑے جانے پر تاوان کے قائل ہیں۔

۷ - آلات موسیقی بالذات مباح ہیں۔ ان میں حرمت یا کراہت کا معنی کسی عارض سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ خنزیر کی کھال یا ہڈی سے بنا ہو، کسی باطل مقصد اور لہو فاسد کے تحت بجایا جا رہا ہو، اس کے بجائے جانے کی وجہ سے کسی حق کا فرض کا سکوت لازم آ رہا ہو، وہ آلہ اہل باطل کا شعار ہو، یا غیر متناسب انداز و آہنگ سے بجایا جا رہا ہو جس کے سبب صوتی و طبعی کراہت پیدا ہو رہی ہو۔

۸ - شراب و شباب، فحش و عیاشی، کفر و شرک، ترک واجب، پامالی حق، یہ امور اپنی ذات کے لحاظ سے حرام ہیں، یہ اور اس قسم کا کوئی بھی امر حرام اگر آلات موسیقی کے بجانے اور سننے کے ساتھ عارض ہو تو اس حالت میں بلا استثنا تمام آلات کا بجانا اور سننا تبعاً حرام ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی آلہ نغمہ یا سُر کفار و مشرکین اور فساق و فجار کا شعار ہو تو اس کا بجانا اور سننا بھی تشبہ باطل کے سبب از باب سد مفاسد، حرام یا مکروہ ٹھہرے گا۔

۹ - آلات موسیقی میں دف یا غیر دف کا فرق کرنا، جلاجل یا بلا جلاجل کا فرق کرنا، یا مرد و عورت یا بچی اور عورت کا فرق کرنا متعدد فقہا سے منقول ہے، جو محققین کے نزدیک مردود اور غیر معقول ہے۔ اسی طرح آلات موسیقی کو آلات لہو اور آلات غیر لہو کی طرف تقسیم کرنا بھی غیر معقول ہے۔ کوئی آلہ موسیقی بالذات آلہ لہو نہیں ہوتا، بلکہ ایک ہی آلہ لہو کی غرض سے بجایا یا سنا جائے تو وہ آلہ لہو اور ممنوع ہے اور وہی آلہ غیر لہو کے لیے بجایا یا سنا جائے تو وہی آلہ، آلۂ غیر لہو اور جائز ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ قانون موسیقی پر بجایا جائے تو حرام ورنہ جائز، یہ بات بھی غیر معقول ہونے کے ساتھ بد ذوقی کا اعلیٰ ثبوت ہے؛ کیوں کہ اصول موسیقی کے بغیر اگر یوں ہی دف یا کوئی آلۂ موسیقی بجایا جائے تو وہ

کانوں پر گراں گزرے گا اوراس کے ساتھ نغمگی اور نغمہ سنجی محال ہو جائے گی۔ ہاں! یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے آہنگ اور لے کے ساتھ بجانا ممنوع ہے جو شہوت انگیز ہو، یا جو انداز فساق وفجار کی عادت اور علامت ہو۔

۱۰- یہ خیال کہ بعض آلات کے ساتھ حرمت کا معنی ہمیشہ متصل ہوتا ہے، یا تو حرمت کے معنی سے عدم واقفیت پر مبنی ہے یا اتصال کے مفہوم سے نا آشنائی پر موقوف ہے۔اس بات کی وضاحت علامہ عبدالغنی نابلسی نے بڑے خوب صورت انداز میں فرمائی ہے۔لکھتے ہیں:

''وہ جاہل و بے فہم جو کہتا پھرتا ہے کہ مذکورہ آلات لہو ولعب سے مبرا ومنزہ ہو ہی نہیں سکتے، اگر ہم چاہیں تو اس جاہل کو بایں طور پکڑ سکتے ہیں کہ ذرا یہ تو بتاؤ کہ جہاد کے وقت نقارہ وطبل وغیرہ بھلا کیسے لہو ولعب سے نکال کر جائز قرار دے دیے گئے۔ارے کم فہم! سن! علماے ذیشان نے مشرکین پر رعب ودبدبہ بڑھانے کے لیے جہاد کے دن اسے جائز قرار دیا ہے، اسی طرح اعلان نکاح، عید کے دن فرحت وسرور کے اظہار کے لیے اس کے بجانے کو جائز قرار دیا ہے، حالاں کہ طبل ودف دونوں ہی آلات نغمات میں سے ہیں۔اگر ان آلات نغمات میں لہو ولعب کے زائل ہونے کی کوئی صورت نہ ہوتی تو بھلا علماے کرام اسے کیوں کر جائز قرار دیتے؟ اور مطلق احادیث کو لہو ولعب کی قید سے مقید بھی نہ کرتے، بلکہ انہیں مطلق ہی برقرار رکھتے۔'' (ایضاح الدلالات، (اردو) ص:۹۲)

۱۱-لہو کا اطلاق اپنے لفظی عموم کے لحاظ سے ہر جائز سامان تفریح کو شامل ہے۔اس لیے واضح رہے کہ حرمت بقید لہو کا مطلب یہ نہیں کہ مطلقاً تفریح طبع کے لیے بھی آلات موسیقی کا استعمال ناجائز ہے، بلکہ اس سے مراد لہو مذموم وحرام ہے۔لہٰذا آلات موسیقی کا استعمال صرف اسی لہو کے لیے حرام ہے جو لہو مذموم ہے اور عام طور سے جب فقہا لفظ لہو پہ اطلاق کرتے ہیں تو ان کی مراد لہو مذموم وممنوع ہی ہوتا ہے۔

۱۲- آلات موسیقی کے حوالے سے علامہ زرادی کی گفتگو انتہائی جامع ہے جس کے مطابق مزمار آلۂ صوت کو کہتے ہیں، وہ اصلاً حلال ہے، لیکن جب شراب حرام کی گئی تو جس طرح شراب کے برتن حرام کر دیے گئے تا کہ کسی کو شراب کی یاد دوبارہ شراب کا عادی نہ بنادے، اسی طرح شراب کے ساتھ بجنے والے ساز وآلات کو بھی حرام کر دیا گیا تا کہ شراب کی یاد ہی ختم ہو جائے۔ بعد میں جب شراب کی حرمت دلوں میں راسخ ہو گئی تو جس طرح شراب کے برتن کا استعمال جائز ہو گیا اسی طرح آلات موسیقی کا استعمال بھی جائز ٹھہرا، سوائے ان کے حق میں جنہیں آلات موسیقی شراب وشباب کی یاد دلا سکتے ہوں یا اس کی طرف پھیر سکتے ہوں۔ چوں کہ ان کے حق میں حرمتِ مزامیر کی علت اب بھی موجود ہے لہٰذا ان کے لیے مزامیر کا استعمال اب بھی ناجائز ٹھہرے گا۔رہے دوسرے لوگ تو مزامیر وآلات موسیقی کا سننا ان کے حق میں اپنی اصل کے لحاظ سے جائز ہے اور اگر ان کے قلوب مزکی ومصفی ہوں تو ان کے لیے موجب رفع درجات۔

۱۳- اسی پر قیاس کرتے ہوئے آلات موسیقی کے ساتھ غیر شرعی کلام کا سننا ناجائز ہے، جب کہ حمد و مناقب اور حکیمانہ و عارفانہ کلام کا سننا جائز و مستحب ہے۔ اس تناظر میں صوفیہ کے سماع پر اعتراض ہرگز مناسب نہیں۔

۱۴- اس پوری بحث سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ آلات موسیقی کے حوالے سے قائم اختلاف، اجتہادی اختلاف ہے اور جس امر کی حلت و حرمت فقہا کے نزدیک مختلف فیہ ہو، اس میں قطعیت ختم ہو جاتی ہے اور ظنیت قائم ہو جاتی ہے۔ اب جب کہ آلات موسیقی کی حلت یا حرمت ظنی ٹھہری تو طرفین میں سے کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ اپنے حریف کو نص کا منکر، حرام کا مرتکب یا فاسق کہے۔ ہاں! جن کے نزدیک آلات موسیقی کی حرمتِ اجتہادی ثابت ہے ان پر واجب ہے کہ وہ ان آلات سے کلی اجتناب کریں۔ اسی طرح فواحش، منہیات اور لہو حرام کے اتصال کے ساتھ آلات موسیقی کا بجانا اور سننا اجماعی طور پر حرام ہے جس سے ہر دو فریق کا اجتناب فرض و واجب ہے۔

کتابیات

۱- القرآن الحکیم

۲- ابطال دعوی الاجماع علی تحریم مطلق السماع، مشمولہ فتاویٰ الامام الشوکانی (۱۲۵۰ھ)، مکتبۃ الجیل الجدید، یمن

۳- اتحاف السادۃ المتقین بشرح احیاء علوم الدین، علامہ محمد مرتضیٰ زبیدی (۱۲۰۵ھ)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۱۷ء

۴- اثبات السماع (مزیلۃ النزاع)، علامہ سید احمد سعید کاظمی (۱۹۸۶ء)، مرکزی انجمن غلامان نظام، ملتان نے ۱۳۶۴ھ

۵- احیاء علوم الدین، ابو حامد محمد بن محمد الغزالی (۵۰۵ھ)، دار المعرفۃ، بیروت

۶- اسلام اور موسیقی/ محمد جعفر شاہ پھلواروی (۱۹۸۲ء)، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۷ء

۷- اسلام اور موسیقی/ محمد شفیع (۱۹۷۶ء)، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۴۲۳ھ

۸- اسلام اور موسیقی: شبہات ومغالطات کا ازالہ، ارشاد الحق اثری، ادارۃ العلوم الاثریہ، منٹگمری بازار، فیصل آباد، پاکستان، ۲۰۰۵ء

۹- الاحسان، مجلہ، شمارہ-۹، شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، کوشامبی، یوپی، ۲۰۱۹ء

۱۰- الاسلام والفن، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، برقی ایڈیشن، تفصیلات ندارد

۱۱- الامتاع بأحکام السماع، مخطوط، عکس مخطوطہ (PDF) مقالہ نگار کے پاس محفوظ ہے۔

۱۲- البحر الرائق شرح کنز الدقائق، زین الدن ابن نجیم مصری (۹۷۰ھ)، دار الکتاب الاسلامی

۱۳- التفسیرات الاحمدیۃ فی بیان الآیات الشرعیۃ، ملا احمد جیون، مکتبہ الشرکہ، ۱۹۰۴ء

۱۴- الجامع الصغیر وشرحہ النافع الکبیر، ابو عبداللہ محمد بن حسن شیبانی (۱۸۹ھ)/ علامہ عبد الحی اللکنوی،، عالم الکتب، بیروت، ۱۴۰۶ھ

۱۵- الدر المختار شرح تنویر الابصار وجامع البحار، محمد بن علی علاء الدین حصکفی حنفی (۱۰۸۸ھ)، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۲۳ھ

۱۶- السنن الکبریٰ، احمد بن الحسین بن علی البیہقی (۴۵۸ھ)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۴۲۴ھ

۱۷- الشرح الکبیر لمختصر خلیل مع حاشیۃ الدسوقی، شارح: شیخ الدردیر احمد بن محمد (۱۲۰۱ھ) محشی: شمس الدین محمد بن احمد بن عرفہ الدسوقی (۱۲۳۰ھ)، دار الفکر۔

۱۸-الغناء والموسیقی حلال ام حرام، ڈاکٹر محمد عمارہ، نھضۃ مصر، ۱۹۹۹ء

۱۹-الفتاوی، شیخ محمود شلتوت، دار الشروق، قاہرہ، طباعت، ۱۸، ۲۰۰۱ء

۲۰-الفقہ علی المذاہب الاربعہ، عبدالرحمن بن محمد عوض الجزیری (۱۳۶۰ھ)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ھ

۲۱-المبسوط، شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی (۴۸۳ھ)، دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۱۴ھ

۲۲-المحیط البرہانی، برہان الدین محمود بن احمد بن مَازہ بخاری حنفی (۶۱۶ھ)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ھ

۲۳-المدونۃ، مالک بن انس (۱۷۹ھ)، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۵ھ

۲۴-المستدرک علی الصحیحین، ابوعبداللہ الحاکم محمد بن عبداللہ نیشاپوری (۴۰۵ھ)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۱ھ

۲۵-المسند الصحیح المستخرج علی صحیح مسلم، ابونعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی (۴۳۰ھ)، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۱۹۹۶ء

۲۶-المعجم الوسیط، مجمع اللغۃ العربیہ، قاہرہ

۲۷-المغنی، ابومحمد موفق الدین عبداللہ بن احمد ابن قدامہ المقدسی (۶۲۰ھ)، مکتبۃ القاہرہ، ۱۹۶۸ء

۲۸-المنجد عربی اردو، لویس معلوف (۱۳۶۵ھ)، مترجم: عبدالحفیظ بلیاوی، خزینۂ علم وادب، لاہور

۲۹-الہدایہ، ابوالحسن برہان الدین علی بن ابی بکر مرغینانی (۵۹۳ھ)، دار احیاء التراث العربی، بیروت

۳۰-ایضاح الدلالات، علامہ عبدالغنی نابلسی (۱۱۴۳ھ)، مترجم: ابومحمد اعجاز احمد، دار البیان، خیابان شاہین، کراچی، ۲۰۱۳ء

۳۱-تحریر الفتاویٰ (النکت علی المختصرات الثلاث: التنبیہ، والمنہاج والحاوی) ولی الدین ابوزرعہ احمد بن عبد الرحیم عراقی شافعی (۸۲۶ھ)، دار المنہاج للنشر والتوزیع، جدہ، ۲۰۱۱ء

۳۲-تحریم آلات الطرب، ابوعبدالرحمن محمد ناصر الدین البانی (۱۴۲۰ھ)، مؤسسۃ الریان، بیروت، لبنان، ۲۰۰۵ء

۳۳-تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

۳۴-تکملۃ البحر الرائق شرح کنز الدقائق، محمد بن حسین بن علی الطوری الحنفی القادری (بعد ۱۱۳۸ھ)، دار الکتاب الاسلامی

۳۵-حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر، محمد بن احمد بن عرفہ الدسوقی المالکی (۱۲۳۰ھ)، دار الفکر، بیروت

۳۶-ذم الشبابۃ والرقص والسماع، علامہ موفق الدین ابن قدامہ المقدسی (۶۲۰ھ)، تحقیق ودراسۃ: عمرو عبدالمنعم سلیم (برقی ایڈیشن)، اس کا اردو ترجمہ غازی عزیز نے کیا ہے: قوالی اور گانا بجانا، مکتبہ دار السلام، ۱۴۲۵ھ

۳۷-رد المحتار علی الدر المختار، محمد امین بن عمر بن عابدین حنفی شامی (۱۲۵۲ھ)، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۲ء

۳۸-رسالہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۸۳۹ء)، مطبع آئین دانش، بارہ بنکی سے ۱۳۰۵ھ

۳۹-رسالۃ فی الغناء الملہی، مشمولہ: رسائل ابن حزم الاندلسی (۴۵۶ھ)، الموسسۃ العربیہ للدراسات والنشر

۴۰-سنن ابن ماجہ، ابن ماجہ ابوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی، (۲۷۳ھ)، دار احیاء الکتب العربیہ

۴۱-سنن ابی داؤود، ابوداود سلیمان بن الاشعث ازدی (۲۷۵ھ)، المکتبۃ العصریہ، بیروت

۴۲-سنن ترمذی، محمد بن عیسیٰ الترمذی ۲۷۹ھ)، مصطفیٰ البابی، مصر، ۱۳۹۵ھ

۴۳-سنن نسائی، ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب نسائی (۳۰۳ھ)، مکتب المطبوعات الاسلامی، حلب، ۱۴۰۶ھ

۴۴-سیر اعلام النبلاء، شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن احمد ذہبی (۷۴۸ھ)، مؤسسۃ الرسالہ، ۱۹۸۵ء

۴۵-شرح السیر الکبیر للامام محمد بن حسن الشیبانی (۱۸۹ھ)، محمد بن احمد شمس الائمۃ سرخسی (۴۸۳ھ)، الشرکۃ الشرقیۃ للاعلانات، ۱۹۷۱ھ

۴۶-شرح صحیح البخاری، ابن بطال ابو الحسن علی بن خلف (۴۴۹ھ)، مکتبۃ الرشد، ریاض، ۱۴۲۳ھ

۴۷-شرح صحیح مسلم، علامہ غلام رسول سعیدی، فرید بک سٹال، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۰ء

۴۸-صحیح ابن حبان، ابو حاتم محمد بن حبان تمیمی دارمی بُستی (۳۵۴ھ)، موسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۴۱۴ھ

۴۹-صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل ابو عبد اللہ بخاری (۲۵۶ھ)، دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ

۵۰-فتاویٰ رضویہ، اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی (۱۳۴۰ھ)، مرکز اہل سنت، پور بندر، ۱۴۲۶ھ

۵۱-فرح الاسماع برخص السماع، محمد ابن احمد مغربی تونسی مالکی شاذلی (۸۸۲ھ)، مشمولہ مجموعہ رسائل سماع، مطبع انوار محمدی، لکھنؤ، ۱۳۱۷ھ

۵۲-کتاب السماع، ابن القیسر انی ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی شیبانی (۵۰۷ھ)، وزارۃ الاوقاف، مصر

۵۳-کشف القناع عن اصول السماع، فخر الدین زرادی (۷۴۸ھ)، مطبع مسلم پریس، جھجھر، ۱۳۱۱ھ

۵۴-کف الرعاع عن محرمات اللھو والسماع، علامہ احمد بن محمد بن حجر ہیتمی، مکتبۃ القرآن، بولاق، قاہرہ

۵۵-لسان العرب، ابو الفضل محمد بن مکرم ابن منظور الانصاری (۷۱۱ھ)، دار صادر، بیروت، ۱۴۱۴ھ

۵۶-مختصر خلیل، خلیل بن اسحاق ضیاء الدین جندی مالکی مصری (۷۷۶ھ)، دار الحدیث، قاہرہ، ۱۴۲۶ھ

۵۷-مختصر صحیح البخاری، ابو عبد الرحمن محمد ناصر الدین البانی (۱۴۲۰ھ)، مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع، الریاض، ۱۴۲۲ھ

۵۸-مرقاۃ المفاتیح، ابو الحسن نور الدین علی بن محمد ملا الہروی القاری (۱۰۱۴ھ)، دار الفکر، بیروت، ۱۴۲۲ھ

۵۹-مروجہ قوالی دین کے نام پر مذہب کی بدنامی، محمد نیر رضا مصباحی، المکتبۃ الازہریہ، بستی، ۲۰۱۹ء

۶۰-مسند اسحٰق بن راھویہ، ابو یعقوب اسحاق بن ابراہیم مروزی ابن راہویہ (۲۳۸ھ)، مکتبۃ الایمان، مدینۃ المنورہ، ۱۹۹۱ء

۶۱-مصنف ابن ابی شیبہ، ابو بکر بن ابی شیبہ، عبد اللہ بن محمد (۲۳۵ھ)، مکتبۃ الرشد، الریاض، ۱۴۰۹ھ

۶۲-موطا مالک بروایۃ محمد بن الحسن الشیبانی، مالک بن انس بن مالک بن عامر الاصبحی المدنی (۱۷۹ھ)، المکتبۃ العلمیہ

۶۳-نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر، علامہ ابن حجر عسقلانی، برقی نسخہ، ۲۰۰۸ء

۶۴-نیل الاوطار، محمد بن علی شوکانی یمنی (۱۲۵۰ھ)، دار الحدیث، مصر، ۱۹۹۳ء

(نوٹ: بیشتر کتب کے حوالے المکتبۃ الشاملہ کی وساطت سے ہیں۔)

○○○

تاثرات

خواجہ سید محمد نظامی
سجادہ نشین، درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، دہلی

پیغام

سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی قدس سرہ ہندوستانی چشتی سلسلۂ تصوف کے چوتھے خلیفۂ راشد اور مظہر ولایت مرتضوی ہیں۔ آپ نے خاک ہند پر چشتی ولایت کے آفتاب کو نصف النہار پر پہنچا دیا۔ علم و عشق، خدمت و عبادت اور انسانیت و اخوت کا جو نظام آپ نے قائم کیا تھا وہ جہاں ایک طرف درست اسلامی اخلاقیات کی علامت ہے تو دوسری طرف ہندوستان میں گنگا جمنی تہذیب کے فروغ و بقا کی قطعی ضمانت۔ آپ نے اپنے کثیر خلفا کے توسط سے ہندوستان بھر میں جو روحانی نیٹ ورک قائم کیا تھا، اس کے ذریعے آج کے اس عہد زوال میں بھی دین و شریعت اور اخلاق و محبت کی شمع روشن ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سرزمین اودھ پر نظر خاص رہی ہے جس کا ثبوت یہاں پیدا ہونے والے مادرزاد اولیاء اللہ ہیں۔ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی جائے ولادت بدایوں شریف ہے (جو الحمد للہ اس ناچیز کو عطا ہوئی ہے۔) اس طرح محبوب الٰہی کی مٹی بھی اودھ کی ہے اور ان کی جان حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اودھ میں ہی جنم لیا۔ ع

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی

محبوب الٰہی کے فرزند جانی یعنی حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی کا وطن بھی اودھ ہے، جنھوں نے 'یارانِ اودھ' کے نام سے انجمن بنائی اور محبوب الٰہی کے سلسلے کو پوری دنیا میں پھیلایا۔

حضرت محبوب الٰہی نے خدمت خلق پر اور دنیاوی معاملات اچھے رکھنے پر بہت زور دیا اور اس بات کی کوشش پر زور دیا کہ ہر انسان کامیابی سے ہم کنار ہو۔ اکثر چشتی نظامی درگاہ میں آپ کو کھرنی کا درخت ضرور ملے گا۔ یہ صرف حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے طریقے کی پیروی ہے۔ درگاہ حضرت قطب صاحب، درگاہ

حضرت محبوب الٰہی اور درگاہ حضرت چراغ دہلی میں جو کھرنی کے درخت ہیں وہ خود حضرت جہانیاں جہاں گشت کے لگائے ہوئے ہیں۔ اس درخت کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ درویش کو کھرنی کے درخت جیسا ہونا چاہیے۔ اس درخت میں کبھی پت جھڑ نہیں آتا ہمیشہ سایہ دار رہتا ہے، کھانے کو پھل دیتا ہے، اس کی جڑ سیدھی زمین میں جاتی ہے، اپنے آس پاس کسی کو Disturb نہیں کرتی۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت نے صوفیانہ تعلیمات کو ایسا عام و تام کیا کہ آج بھی زندہ ہے اور ان شاء اللہ زندہ و پائندہ رہے گی۔

شمالِ ہند میں چشتی نظامی فیضان کو عام و تام کرنے میں مخدوم شاہ مینا لکھنوی شاہِ اودھ کا نام نامی بہت سی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔ آپ ہی کا فیض مخدوم شیخ سعد الدین خیرآبادی کے توسط سے مخدوم شاہ صفی قدست اسرارھم تک پہنچا۔ ہمارے جدّ امجد مصوّر فطرت حضرت خواجہ حسن نظامیؒ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب نظامی بنسری میں آپ کا ذکر خیر فرمایا ہے (ص ۵۰۹)۔ نیز آپ نے فرمایا ہے کہ صفی پور ضلع اناؤ میں بھی نظامیہ سلسلے کی بہت بڑی خانقاہ ہے اور یو پی میں صفی پوری مشائخ کے ذریعے نظامیہ سلسلے کی بہت اشاعت ہوئی ہے۔ (نظامی بنسری ص ۵۰۷) مزید لکھتے ہیں کہ صفی پور کے سلسلے کے ایک خلیفہ قل ہو اللہ شاہ صاحب [بارہ بنکی میں] تھے جنہوں نے سلسلے کی بہت زیادہ اشاعت کی تھی۔ (ص ۵۱۰) چنانچہ اسی سلسلے کی ایک مستحکم کڑی صفی پور- بارہ بنکی ہوتے ہوئے سنگم نگری الہ آباد کے ایک قدیم قصبے سید سراواں پہنچی جو عصر حاضر میں معتدل اسلامی فکر، تصوف اور انسانی و اخلاقی اقدار کے فروغ میں ہمہ دم مصروف ہے۔

چشتی نظامی فیضان کی امین خانقاہ عالیہ عارفیہ اپنی مختلف تعلیمی، تبلیغی، اشاعتی اور رفاہی اداروں کے ساتھ شاہ صفی اکیڈمی کے ذریعے اسلامیات اور تصوف پر صالح عصری لیٹریچر کی اشاعت کا علمی فریضہ انجام دے رہی ہے، جس میں سالنامہ مجلہ الاحسان سرفہرست ہے۔ یہ خبر انتہائی مسرت انگیز ہے کہ اس کا دسواں شمارہ حضرت محبوب الٰہی کی شخصیت اور افکار و تعلیمات کے لیے وقف ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ شمارہ بھی حسب روایت اپنی انفرادیت کا حامل ہوگا اور سلطان جی سے متعلق بہت سے نئے مباحث پر مشتمل ہوگا۔

دعا ہے کہ مولیٰ کریم خانقاہ عارفیہ اور اس کے سجادہ نشین حضرت شاہ ابوسعید احسان اللہ صفوی محمدی اور ان کے تمام اعوان و انصار کی نصرت و حمایت فرمائے، انہیں خدمات مزید کی توفیقات سے نوازے اور مشائخ چشت اہل بہشت کے فیوض و برکات سے دونوں جہاں میں شادکام فرمائے۔ آمین بجاہ حبیبہ الکریم ﷺ

OOO

پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی
ڈین فیکلٹی آف آرٹس، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جاذب قلب ونظر شخصیت

تاریخ کے وسیع وعریض منظر نامہ پر نظر ڈالنے سے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہر دور میں مخلوق خدا کی ہدایت ورہنمائی اور ارشاد کے لیے حضرت حق تعالیٰ نے اپنے منتخب بندوں کو مامور فرمایا جنہوں نے اپنے کردار وعمل اور اخلاص وللّٰہیت سے انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی بھرپور ترویج واشاعت کی۔ آدمیت کو انسانیت کی وہ زریں قبا پہنائی جس سے وہ احسن تقویم کے مرتبہ پر فائز المرام ہوئی۔ ان کے نالہاے نیم شبی اور سوزِ دروں سے بڑے بڑے روحانی وفکری انقلابات رونما ہوئے۔

دردِ آہ سینۂ سوزان من
سوخت ایں افسردگان خام را

ان حضرات کے سینہ سوزاں سے اٹھنے والے دھویں سے نہ جانے کتنے افسردگان خام سوختہ ہوکر کندن بنے۔

عہد وسطی کی ایک عظیم روحانی وعلمی شخصیت سلطان المشائخ حضرت سید محمد بدایونی معروف بہ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی دہلوی قدس سرہ السامی کی ہے۔ ان کی سحر انگیز، دل نشیں اور دل پذیر شخصیت نہ صرف اپنے معاصرین ومتاخرین بلکہ متقدمین کی صفوں میں بھی نمایاں اور بہت سی جہات سے منفرد وبے عدیل نظر آتی ہے۔

ان کی ذات والاصفات میں تصوف کے چاروں اہم پہلو؛ علمی، عملی، عشقی اور روحانی، پوری طرح رچے بسے بلکہ لازم وملزوم ہیں۔ استقامت، سکینت اور مکنت کی جیسی ارزانی ان کو ہوئی وہ بھی عدیم المثل ہے (آپ کی وفات کی تاریخ لفظ **عدیم المثل** (۷۲۵ھ) سے مستخرج ہے۔) انھوں نے بیک وقت خالق کو بھی منایا اور مخلوق کو بھی۔

حضرت محبوب الٰہی نے آدمیوں کو ان کی تخلیق کے مقصد سے ہی صرف آشنا نہ فرمایا بلکہ عبدیت وبندگی کے

حقیقی مفہوم سے آگاہ کیا۔ آدمیت واحترام آدمیت کا سبق پڑھایا، ان کی پیشانیوں کو سجدوں کی آوارگی اور اس کے ضمن میں رسوائی سے محفوظ فرمایا۔ اس لیے کہ حیات انسانی کی کامیابی و کامرانی صرف عبادت و ریاضت ظاہری کے حجابات میں پڑے رہنے کا نام نہیں ہے بلکہ مشیت الٰہی یہ ہے کہ وہ اس عالم ناسوت کو اپنے احکام کی روشنی میں فردوس بداماں بنانا چاہتی ہے اور انسان اس کی اسی مشیت اور ارادہ کی تکمیل کا ذریعہ بنتے ہیں۔

لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی نے ان ہی درویشان پاک طینت اور عازمین باصفا کی شان میں کہا تھا۔

روضۂ خلد بریں خلوت درویشان است — مایۂ محتشمی خدمت درویشان است

گنج عزلت کہ طلسمات عجائب دارد — فتح آں در نظر رحمت درویشان است

آنچہ زر می شود از پرتو آں قلب سیاہ — کیمیائیست کہ در صحبت درویشان است

خسرواں قبلۂ حاجات جہانند ولے — سببش بندگی حضرت درویشان است

اے دل ار آب حیات ابدی می طلبی — منبعش خاکِ در خلوت درویشان است

حافظ این جا بہ ادب باش کہ سلطانی ملک — ہمہ از بندگی حضرت درویشان است

(درویشوں کی خلوت، جنت کا باغیچہ اور ان کی خدمت عزت و سربلندی کا سرمایہ ہے۔ گوشۂ تنہائی جس میں عجائبات کے طلسم ہیں، اس کی کشادگی دراصل درویشوں کے رحم و کرم پر منحصر ہے، وہ کیمیا جس سے سیاہ دل بھی سونا بن جاتا ہے، وہ صرف ان درویشوں کی ہمنشینی میں پوشیدہ ہے، بادشاہ، اہل دنیا کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں مگر اس کا سبب ان درویشوں کے دربار کی غلامی ہے (یعنی ان کی باطنی توجہات سے وہ اس قابل بنے کہ ان کی دنیاوی ضرورتوں کی تکمیل کر سکیں۔) اے دل! اگر تو ہمیشگی کا آب حیات پینا چاہتا ہے تو اس کا چشمہ، درویشوں کے در کی خاک ہے۔ حافظ! اس جگہ ادب سے رہ کیوں کہ دنیا جہان کی سلطانی سب کی سب ان درویشوں کے آستانہ کی غلامی میں ہے۔)

حضرت محبوب الٰہی کے گرد باکمال و باخدا عرفا و مشائخ کی جیسی کہکشاں نظر آتی ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ کی پاک و مبارک ذات میں قلوب انسانی کی قلب ماہیت کرنے اور ذہن انسانی کو صیقل کرنے کی جو قوت اور قدرت ودیعت فرمائی گئی تھی، اس کی بنا پر ان کے خلفا، مسترشدین اور مریدین آن واحد میں ان کے فیض صحبت اور کیمیا اثری سے علوئے کردار و عمل کے حامل بنے اور بادۂ نظامی کو نوش جاں کر کے اپنے مطلوب حقیقی تک پہنچ گئے۔

ان کے یہ باکمال خلفا و مسترشدین ملک کے طول و عرض میں پھیلے اور سلسلہ چشتیہ کی تعلیمات اخوت و بھائی چارگی، مساوات، انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی ترویج و اشاعت میں ہمہ تن اپنے کو وقف کر دیا اور تصوف کو ایک عوامی تحریک کی شکل دی۔

حضرت سلطان المشائخ قدس سرہ کی دل آویز اور جاذب قلب ونظر شخصیت ان اشعار کی آئینہ دار تھی:

آنی کہ تو از نام تو می بارد عشق
وز نامہ و پیغام تو می بارد عشق
عاشق شود آنکس کہ بکویت گذرد
آرے ز در و بام تو می بارد عشق

(آپ تو وہ ہیں جن کے نام مبارک سے ہی عشق برس رہا ہے، آپ کی گفتگو ارشادات و پیغامات سبھی سے عشق و محبت کی بارش ہورہی ہے۔ جو کوئی بھی آپ کے کوچہ سے گزر جاتا ہے وہ آپ کا شیدا ہوجاتا ہے کیوں کہ آپ کے تو بام و در سے عشق کا مینہ برس رہا ہے۔)

الاحسان کے فاضل ولائق مدیر عزیز گرامی مولانا شاہ حسن سعید صفوی **أبقاه الله تعالیٰ علی جادة مشائخه العظام** ہم سب کے شکریہ اور مبارک باد کے سزاوار ہیں کہ ایسی عظیم شخصیت پر خصوصی شمارہ شائع فرما رہے ہیں۔

○○○

مکتوبات

تلک عشرۃ کاملۃ

احمد جاوید، انقلاب، ۵۔ پاٹلی پترا انڈسٹریل ایریا، پٹنہ-۱۳

مکرمی! سلام ورحمت! مزاج گرامی؟ خدا کرے کہ آپ شاداں وفرحاں ہوں؛ گیسوئے علم وادب کے پیچ وخم میں مشغول اور مخلص ونامخلص، مہربان ونامہرباں، کارآمد وبے کار بہرنوع دوستوں کے ساتھ جو خوش قسمتی سے آپ حضرات کو دورونزدیک ہر جگہ کثیر تعداد میں میسر ہیں، سرگرم تلطف ہوں۔

گرامی نامہ ملا تھا اور میں نے بروقت مطلع بھی کر دیا تھا، یاد آوری کا ایک بار پھر شکریہ! لیکن یہ کن الفاظ میں ادا کروں، خود کو تہی دامن پاتا ہوں۔ حسب حکم حضرت سلطان المشائخ کے عہد کے سیاسی وسماجی حالات پر مضمون حاضر خدمت ہے۔ کسی لائق ہو تو لے لیں ورنہ ضائع کر دیں۔ تاکہ آپ کو اپنے معیار کو برقرار رکھنے میں کوئی تکلف آڑے نہ آئے، اس لیے عرض کر رہا ہوں۔ مضمون کچھ طویل بھی ہے، جتنا چاہیں بلا تکلف کام میں لائیں اور تہذیب وتحذیف میں کسی دریغ سے کام نہ لیں۔

'الاحسان' کا نواں شمارہ پیش نظر ہے اور سلطان المشائخ نمبر آپ کا دسواں شمارہ ہوگا، تلک عشرۃ کاملۃ! کیسا حسین اور کتنا مبارک اہتمام ہے۔ شاہ صفی اکیڈمی کی گراں قدر اشاعتوں کا وصف خاص اس کا یکساں صوری ومعنوی معیار ہے۔ مجلہ کا ہر شمارہ اپنے ماسبق سے زیادہ پر کشش ہوتا ہے۔ آپ حضرات اس میدان میں وہ ہیں جن کا مقابلہ کسی اور سے نہیں، آپ ہر بار اپنے آپ ہی پر سبقت لے جاتے ہیں۔

زیر نظر شمارے میں جو کچھ جہاں ہے وہیں آفتاب ہے لیکن میرے لیے آپ کا ابتدائیہ، افادات حضرت داعی اسلام شیخ ابوسعید صفوی 'وحدت الوجود وحدت الشہود کی تعبیر جدید'، محترم احمد جاوید صاحب کا مضمون 'مذہبی معاشرے کا اخلاقی احتساب'، مولانا ضیاء الرحمن علیمی کا 'ابن جوزی کی صوفیہ پر تنقیدات کا علمی جائزہ'، نوشاد عالم چشتی کا 'محافل میلاد کا مذہبی، تاریخی اور ثقافتی مطالعہ' خاصے کی چیزیں ہیں۔

آپ نے کتنے پتے کی بات کہی ہے کہ تصوف کے مسائل ومباحث پر گفتگو میں ہم بہت دور نکل جاتے ہیں اور بسا اوقات اتنا دور نکل جاتے ہیں کہ محقق، فقیہ، نکتہ سنج اور دقیق النظر ہو جاتے ہیں اور تحقیق وتمحیص کے اس پورے سفر میں ہم جو نہیں ہوتے، وہ صوفی نہیں ہوتے۔ اسی طرح آپ نے تصوف میں فلسفۂ عشق کی اتنی آسان اور خوب صورت تعبیرات پیش کی ہیں کہ بے ساختہ قلم چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ آپ نے حضرت داعی اسلام اور خانقاہ عارفیہ کے احیائے تصوف کے مشن کی بھی بڑی خوب صورت اور بامعنی توجیہ پیش کی، کاش! علمائے دین وشریعت میں کم از کم وہی لوگ کچھ سمجھ بوجھ سے کام لیتے جو دعوئ تصوف بھی رکھتے ہیں تو آج اہل اسلام کی جو حالت ہے، وہ نہ ہوتی، تبدیلی آجاتی۔

جہاں تک احمد جاوید صاحب کا تعلق ہے تو ان کی شاعری ہو یا نثر، میرے لیے اپنے اندر کشش کے بہت سے سامان رکھتی ہے۔ وہ ایک بہت ہی وسیع المطالعہ اسکالر ہیں۔ ماہر اقبالیات، شاعر اور شعر و ادب کے نقاد و نکتہ سنج مبصر کی حیثیت سے تو ان کی شخصیت بہت پہلے سے متعارف تھی، ماہر اسلامیات کے طور پر وہ ہمارے لیے ایک تازہ دریافت ہیں اور ذہنوں کو چھوتے ہیں۔ ان کا جدید اسلوب اور منطقی استدلال جدید ذہنوں کو متأثر کرتا ہے۔

جناب نوشاد عالم چشتی کا مضمون پر مغز، مفید مطلب اور مکمل ہے۔ کاش! اس میں عہد مغلیہ کے زوال کے زمانہ اور برطانوی ہند میں محافل میلاد کی ترویج کے لیے تحریک چلانے اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دولت بیدار کو عام کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کردینے والے علما و شعرا کا ایک مختصر اجمالی ذکر بھی شامل ہوتا۔ مولانا کافی مرادآبادی (شہید) رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں اس تحریک کے سرخیل تھے۔ ان کے سامنے روافض کی مکاریوں سے اہل سنت و جماعت کے ایمان و عقائد کو بچانے کا بھی چیلنج تھا اور یہ کام انہوں نے ان محافل سے لیا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ نے ان کو شہنشاہ نعت گویاں اور خود کو ان کا وزیر کہہ کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

مضمون کے تمہیدی حصے میں جس مقام پر تین ذرائع سے ہندوستان میں اسلام کی آمد کا ذکر ہے، وہاں علما و مبلغین کے مقابلے میں تجارتی قافلوں اور تجارتی بستیوں کے لیے یہ لکھنا کہ ان کا واحد مقصد دین کی تبلیغ و اشاعت نہ تھی، درست ہے لیکن یہ کہنا کہ اس حوالے سے ''آمد اسلام و اشاعت میں تہذیبی و ثقافتی روایت پر عمل و ترویج کے پہلو کو تلاش کرنا مناسب نہیں ہے'' خلاف واقعہ اور کنفیوزن پیدا کرنے والا فقرہ ہے۔ برصغیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے تاریخی تسلسل اور اس ملک کی سماجی ساخت پر نگاہ رکھنے والا کوئی بھی شخص اس سے بے خبر نہیں ہوسکتا کہ یہاں عربوں کی تجارتی بستیاں جو اسلام کی آمد سے صدیوں پہلے قائم ہوچکی تھیں، اسلام کے ظہور کے بعد تہذیبی و ثقافتی روایات پر عمل اور ترویج کے اولین مراکز ثابت ہوئیں۔ شمال میں قنوج، بداؤں، گجرات و سوراشٹر میں سنجان، بھروچ، کامبے، چیمبور، تھانہ، سوپارا اور اسی طرح جنوب میں کرنگانور، مالابار، کالیکٹ اور کولم وہ مقامات ہیں جہاں سے اس ملک میں اسلام کی اشاعت کا آغاز ہوا اور مبلغین اسلام نے بھی اپنا پہلا ٹھکانہ ان ہی بستیوں کو بنایا جو بنیادی طور پر تجارتی بستیاں تھیں۔ ان میں سے ہزارہا بستیوں کا تو اب کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے لیکن تہذیبی و ثقافتی روایات کے فروغ اور اسلام کی ترویج و اشاعت میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔ مسلم فاتحین کی آمد سے پہلے علما و مشائخ کے لیے یہی بستیاں پشت پناہ کا کام کرتی تھیں، ان میں سب سے پہلے اللہ اکبر کی صدائیں گونجیں اور یہیں اس سرزمین پر اولین مساجد اور درس گاہیں وجود میں آئیں۔ اس لیے ان کی تہذیبی و ثقافتی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ہمیں ان کو آج کے تجارتی طبقات پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت داعی اسلام مدظلہ العالی کی خدمت میں سلام عرض کریں، دعا کی درخواست بھی ہے۔

مکالماتی عہد کی اہم ضرورت!

سید قمر الاسلام (خانقاہ ولیہ، جہانگیر نگر، فتح پور)

مدیر محترم! الاحسان کا نواں شمارہ پیش نظر ہے۔ حسب سابق مجلّے کے مشمولات تحقیقی اور دعوتی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ الاحسان نے شائقین تصوف کے لیے ایک وقیع پلیٹ فارم مہیا کیا ہے جو اس مکالماتی عہد کی اہم ضرورت ہے۔

شمارے کی ابتدا دو صوفیانہ غزلوں سے ہوتی ہے جو بالترتیب مخدوم مکرم شیخ ابوسعید صفوی اور جناب احمد جاوید صاحب کے رشحات فکر کا حسین مرقع ہیں۔ زبان کی لطافت اور فکر کی پاکیزگی کسی فرد میں جمع ہو جائیں تو شاعری فقط شاعری نہیں رہ جاتی، ساحری ہو جاتی ہے۔ دونوں غزلوں میں یہ چیز قدر مشترک ہے۔

بادۂ کہنہ دو مضامین پر مشتمل ہے۔ محترم حسن سعید صفوی نے شیخ نظام الدین الہدیہ کے نوشتہ نامے پر تحقیق و ترجمے کا کام کیا ہے، یہ ایک دل پذیر طرح ہے، اس سے سادات صوفیہ کے وہ مکاتیب و رسائل افادۂ عام کے قابل ہو جائیں گے جو مختصر ہونے کی وجہ سے عموما وسیع تحقیقی منصوبوں کا حصہ نہیں بن پاتے۔ مولانا حماد رضا مصباحی نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب مرج البحرین کے ایک حصے کو ترجمہ و تخریج کے مراحل سے گزار کر بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

تذکیر کا کالم مختصر مگر باوزن ہے، مخدوم مکرم شیخ ابوسعید صفوی دام ظلہ کی مجلس کو مولانا ذیشان مصباحی نے جس سلیقہ مندی اور فن کاری کے ساتھ مرتب کر دیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ احمد جاوید صاحب (لاہور) کا کمال یہ ہے کہ وہ مجلسی گفتگو میں کتابی لب ولہجہ اپناتے ہیں جب کہ ان کی تحریروں کو پڑھ کر لطفِ مجلس تازہ ہو جاتا ہے۔ شاید ایسا اس وجہ سے ممکن ہو سکا ہے کہ ان کا دل تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے جب کہ دماغ فلسفہ کا آہنگ لیے ہوئے ہے اور قدرت نے شرح و بیان کی صلاحیتیں بھی اسی تناسب سے عطا کی ہیں۔ ان تینوں کی یکجائی کے سبب ان کا سامع بیک وقت صوفی کے جذب و کیف، فلسفی کی فکری تہ داریوں اور متکلم کے حسن بیان سے استفادہ کرتا ہے۔ زیر نظر مضمون تینوں رنگوں کا خوبصورت آمیزہ ہے۔

تحقیق و تنقید مجلّے کا سب سے طویل، علمی اخلاقیات سے مملو اور جدید تحقیقی تقاضوں سے ہم آہنگ کالم ہے۔ اس کالم کی تمام تحریریں دیدہ و دل کو آسودگی فراہم کر رہی ہیں۔ احمد جاوید صاحب (پٹنہ) نے اکیسویں صدی میں تصوف کی اہمیت و معنویت پر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ مولانا محمد ذکی صاحب نے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات پر متوازن اور فاضلانہ مضمون رقم کیا ہے۔ یہ موضوع بجائے خود بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اب جب کہ مسلمانوں کے اقتدار کی بساط الٹے ہوئے صدی بیت گئی اور ہر چہار طرف جمہوری نظام کا غلغلہ بلند ہے، تو

ضرورت ہے کہ سماجی موضوعات کو بدلتے ہوئے تناظرات کی روشنی میں دیکھا جائے، مگر تعجب خیز بات یہ ہے کہ ہماری نیم بیدار آنکھیں سامنے موجود حقائق کو نظرانداز کر کے اب بھی خلافت وسلطنت کے خواب دیکھ رہی ہیں۔اس سیاق میں سادات صوفیہ بالخصوص چشتی روایت سے وابستہ مشائخ کی حکمت وبصیرت اور دینی خدمات کو دیکھ کر خوش گوار احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تبلیغی جدوجہد کے دوران تیرہ وتاریک حالات میں شمع نبوت سے روشنی حاصل کی اور دور دراز علاقوں میں امن وایمان کا اجالا پھیلایا۔امید کی جاتی ہے کہ فاضل مقالہ نگار بطور خاص چشتی بزرگوں کی اس روایت پر بھی قلم اٹھائیں گے، گوکہ اس پر لکھا گیا ہے لیکن اکیسویں صدی کے رستا خیز ماحول میں ضروری ہے کہ اس قصۂ پارینہ کو گاہے گاہے دہرایا جاتا رہے، اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ارباب خانقاہ متقدمین کی اس روش کو اپنے عمل سے زندہ کریں۔

ڈاکٹر مشتاق تجاروی تصوف پر لکھنے والے ممتاز اہل قلم ہیں، اچھے اور انوکھے موضوعات پر لکھتے ہیں۔اس مجلّے میں بھی انھوں نے ایک خوبصورت مقالے سے قارئین الاحسان کو 'گراں بار' کیا ہے۔مولانا ضیاء الرحمن علیمی کا مقالہ ابن جوزی کی تنقیدات کے جائزے اور علمی احتساب پر مبنی ہے۔مولانا علیمی کی خوبی یہ ہے کہ وہ موضوع سے متعلق دستیاب مواد کا ممکنہ حد تک احاطہ کرتے ہیں اور پھر کامل دیانت داری کے ساتھ اپنا حاصل مطالعہ پیش کر دیتے ہیں۔کسی بھی تحقیقی کام میں یہ امانت داری جوہر اصلی کا درجہ رکھتی ہے۔زیر نظر مقالے میں انھوں نے علامہ ابن جوزی کی تلبیس ابلیس پر صحت مند نقد کیا ہے۔اس مضمون نے الاحسان کے علمی وقار میں بجا طور پر اضافہ کیا ہے۔

مولانا ذیشان احمد مصباحی کی دو طویل تحریریں الاحسان کی زینت ہیں؛ پہلی تحریر سماع مزامیر کے فقہی وشرعی مطالعے پر ۷۸ صفحات میں پھیلی ہوئی ہے، جب کہ دوسری تحریر ۳۹ صفحات کی ہے جس میں انھوں نے عہد تدوین سے دسویں صدی تک کے صوفی ادب کا تجزیہ پیش کیا ہے۔زبان وبیان کی کشش، وسعت مطالعہ اور فکر ونظر کی گہرائی ہر سطر سے عیاں ہے۔شیخ محمد عبدہ کا شمار جدید مصر کے معماروں اور نمایاں مصلحین میں ہوتا ہے، عاطف الاکرت نے ان کی زندگی میں تعلیمات تصوف کے اثرات کو اجاگر کیا ہے۔مولانا ساجد الرحمن شبر مصباحی نے عاطف صاحب کی عربی تحریر کو اردوے معلّٰی کا جامۂ خوش زیب پہنا کر اہل ہند کو شیخ محمد عبدہ کی شخصیت کے اہم پہلو سے متعارف کروایا ہے۔اس کے لیے ساجد صاحب ہم سب کی طرف سے ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں۔محترم نوشاد عالم چشتی صاحب نے میلاد کے تاریخی وثقافتی پہلوؤں کا عمدہ جائزہ پیش فرمایا ہے۔

اس بار زاویہ کا کالم شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے حیات وافکار سے متعلق ہیں۔اس کالم میں کل چھ مضامین شامل ہیں۔شروع کے دو مضامین محدث دہلوی کے عمومی تعارف اور سوانحی حوالے سے ہیں، جبکہ بقیہ چار مضامین میں شیخ دہلوی کی چار کتابوں پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔تمام مضامین اہم ہیں خاص طور پر ڈاکٹر عارف نوشاہی کا مضمون استادانہ تجربے اور وسعت مطالعہ کا غماز ہے۔

الاحسان کا یہ شمارہ اس لائق ہے کہ تصوف سے دل چسپی رکھنے والے قارئین اس کا مطالعہ کریں۔ بعض مضامین تفصیلی مکالمے کی راہ کھولتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان پر سنجیدگی کے ساتھ مکالمہ کیا جائے۔

اس پایے کا علمی و تحقیقی مجلہ نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن اگر آپ حضرات جیسے جواں مرد، جواں ہمت اور جواں فکر افراد یکجا ہو جائیں تو یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں۔ ایک ایسے عہد میں جب علمی حلقوں میں روایتی علوم وفنون کی تدوین نو یا بیان نو کی ضرورت کا شدید احساس پایا جاتا ہو، خدا نے خانقاہ عارفیہ کے مسند نشین کی شفقتوں کے سائبان تلے ایسے ایسے ماہ ونجوم اکٹھا کر دیے۔ ممکن ہے کہ یہ حسن اتفاق قدرت کے کسی بڑے منصوبے کا حصہ ہو اور شاید تصوف کی تدوین نو کا قرعۂ فال ان ہی دیوانوں کے حصے میں آیا ہو۔ اگر بتوفیق الٰہی یہ امکان واقع میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اکیسویں صدی کی دنیا پر یہ بڑا احسان ہوگا۔ میں اسے مادّیت گزیدہ اور مضطرب روحوں کی دعاؤں کا ثمرہ خیال کروں گا کہ مظلوم کی دعا اور رحمت الٰہی کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔ خدا ہر محاذ پر آپ کا حامی و ناصر ہو!

ترکش معرفت کا خدنگِ آخرین!

مفتی میرزا شمشاد احمد بیگ، سوں گر، جون پور (یوپی)

خانقاہیں احساسات پر پڑے دبیز پردوں کو اٹھا دینے سے بڑھ کر دلوں میں معرفتِ الٰہی کو راسخ کرنے والے مبارک مقامات ہیں، جبکہ خانقاہی تجلّیات سے محروم صرف قال اقول کا طواف کرنے والے مراکز رفعِ حجاب سے بھی بے بس ہوتے ہیں۔ حالانکہ تنِ تنہا رفعِ حجاب بھی بذاتِ خود معرفت آشنا نہیں کر سکتا، دیدار اور معرفت کے مابین جو فرقِ عظیم ہے وہی رفعِ حجاب اور معرفت کے درمیان ہے، رفعِ حجاب معینِ معرفت ہے، مدرکِ معرفت نہیں ہے، معرفت کے بغیر آقائے کائنات کی محبّت وخشیّت سے بہرہ مند ہونا فی الواقع ناممکن ہے، آقائے کائنات کی محبّت وخشیّت مشترکہ طور پر مطلوب ایمان کی قندیل کے لازمی ابدی آبگینے ہیں، جس دل میں بشرطِ اخلاص یہ قندیل روشن ہے، وہ صاحبِ دل مرشدِ بشریّت اور مسندِ خانقاہیّت پر مسند نشین ہونے کا حقیقی حق دار ہے۔ شیخِ طریقت کا مرکّبِ اضافی اس کی عارفانہ ہستی کا لافانی ترجمان ہے۔

یہ شیخ جس بقعۂ زمین کو اپنی اقامت کے شرف سے شرف آراء کر دیتا ہے، وہ مبارک ومحمود زمین خانقاہ کہلاتی ہے، جسے قرآن عزیز نے صوامع کے مبارک ترین کلمہ سے تعبیر کر کے آگاہ کر دیا ہے کہ صوامع یعنی خانقاہیں تبریکات، تحمیدات، تمجیدات، دعواتِ صالحات اور نوازشاتِ الٰہیّہ کا مرکز ہوتی ہیں۔ کیوں کہ خانقاہیں اُس معرفتِ الٰہی کا رواں دواں سرچشمہ ہیں جو تبریکات، تحمیدات، تمجیدات، دعواتِ صالحات اور الٰہی نوازشات کی شاہ کلید ہے۔

شیخِ خانقاہ اپنے متوسّلین سمیت عام عزیزانِ نسلِ انسانی کے دلوں میں اس قندیلِ معرفت کو روشن کر دینے کی عظیم ترین خدمت میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیتا ہے، باعث یہ ہے کہ وہ بخوبی ادراک رکھتا ہے کہ جس دل میں یہ قندیل روشن ہو جائے، محبّت کا آبگینہ اسے مخلصانہ اعمالِ صالحہ پر قائم رکھتا ہے اور خشیّت کا چقماق برے اعمال کو اس سے دور کھدیڑ دیتا ہے، ان کے دل کفر و شرک کی آلودگیوں اور الحاد و منافقت کے داغ دھبّوں سے پاک صاف ہو جاتے ہیں۔

شیخِ خانقاہ گناہوں سے پوری طرح سیاہ ہو چکے دلوں میں پھر سے نورِ ایمان کی قندیلِ معرفت کو روشن کر دینے کا قوی ذریعہ ہے شیخِ خانقاہ حق و باطل میں تمیز کرنے کی صلاحیّت سے محروم عزیزانِ انسانیّت کے دلوں میں معرفتِ الٰہی کا نور بار چراغ از سرِ نو روشن کر دیتا ہے، خانقاہ کا حقیقی شیخ متوسّلین کی تربیّت اس طرح کرتا ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر اپنے اور دنیا کے پیدا کرنے والے آقائے کائنات سے غافل نہ رہیں، شیخ نگاہِ باطن سے بجا طور پر مشاہدہ کرتا رہتا ہے کہ غفلت سے بچاؤ کا واحد ذریعہ اللہ العزیز کی معرفت ہے، جو اللہ الرّحمان کی محبّت و خشیّت کو باہم جوڑ کر دلوں کے آبگینوں میں نورِ ایمان کے روشن رہنے کو یقینی بناتی ہے، سچا شیخِ خانقاہ چشمۂ معرفت کا امین ہے، امینِ چشمۂ معرفت کی خدمات و توجّہات سے شاد کام افراد اس چشمۂ معرفت سے فیض یاب ہو کر اہلِ خانقاہ گروہِ عارفین اور ہدایتِ عالم کے نقیب کہلاتے ہیں اور آقائے کائنات سے متعارف کرانے والے طریقِ معرفت کے مخلص محافظین کے مقامِ محمود پر فائز کر دیے جاتے ہیں۔

آقائے کائنات اللہ العزیز کی معرفت اللہ الرّحمان کی جملہ مرضیّات کی مرکز اور جامع ہے، یہ معرفت جس بندہ کے لوحِ دل کے نقوشِ فطرت میں سرگرم ہو جاتی ہے، اس کا دل تمام علوم و فیوض کا مرکز و منبع بن جاتا ہے اور اُمُّ المعارف کا مصداق ہو جاتا ہے، کیوں کہ تقرّب الی اللہ اور فنائے عبدیّت کا آغاز اسی دل سے ہوتا ہے، دل کو اُمُّ المعارف کا مرتبۂ بلند اسی لیے حاصل ہے کہ دل فنائے عبدیّت کا مقامِ مبتدا ہے، اور بقائے عبدیّت بالحق کے تمام اسرار و رموز کی خبرِ جامع کا مقامِ منتہی ہے۔

یہ دل صاحبِ دل کو فناء کے اطراف و جوانب میں سے ہر ہر سَمتِ فنا سے کاٹ کر اور بقا کے تمام جہات و حدود میں سے ہر ہر جہتِ بقا کے لیے یکسو کر کے ان مٹ ابدی روش یعنی دینِ حق اختیار کرنے کے لیے یکا یک یکلخت سرگرمِ کار کر دیتا ہے اور اس فطرۃُ اللہ کے نقوشِ قدم پر گامزن کر دیتا ہے، جس کے شاکلہ پر اللہ نے عزیزانِ نسلِ انسانی کو پیدا کیا ہے، فطرۃُ اللہ، اللہ کی فطرۃ وہی میلان اور وجدان ہے، جسے اللہ نے پیدا کردہ انسانوں کے دلوں میں اپنی معرفت کو سرگرم رکھنے کے لیے محفوظ کر دیا ہے، اسی کو امام العارفین، امینِ معرفت، خاتم النّبیّین ہمارے حضور آنجناب محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی الجھاؤ کے بغیر صاف صاف لفظوں میں قرطاسِ بشریت پر از بر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ پیدا کیا گیا ہر ہر فردِ بشریّت فطرۃُ اللہ پر پیدا کیا جاتا ہے، پھر محرومُ

المعرفت ماں باپ کا ماحول اور بیرونی تاثیرات اسے معرفت دشمن راستوں پر ڈال دیتے ہیں، پیدا کیا گیا کوئی بھی بشر سادہ بیئر نہیں ہے کہ جو چاہے اس پر اپنے پسندیدہ نقوش ثبت کر دے، بلکہ آقائے کائنات مالکُ الارض والسّموات اس کے دل کی تختی پر اپنی معرفت اور دینِ حق کے تقاضاؤں پر مشتمل نقوش کی تصویر گری کر کے وجود بخشتا ہے، موافق ماحول میں اللہ کی معرفت اور دینِ حق کے ثبت شدہ الٰہی نقوش سرگرم دوام و بقا کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جبکہ معرفت دشمن ناموافق ماحول معرفت اور دین کے نقوشِ ربانیّہ کو گھٹا مٹا کر بے اثر کر دیتا ہے۔

حقیقی خانقاہیں ناسازگار ماحول اور غلط کار مشاغل میں پھنس جانے کی وجہ سے معرفتِ الٰہی اور دینِ حق کے مؤثّر نقوش سے بےفیض ہوجانے والے عزیزانِ انسانیّت کو پھر سے اللہ کی فطرت یعنی معرفتِ الٰہی اور دینِ حق کے تقاضاؤں پر رواں دواں کر دینے کے مراکز ہیں۔

سیّدسراواں کی خانقاہ عالیہ عارفیہ اور اس کے روحِ رواں حقیقی شیخِ طریقت حضرت شاہ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی زیدت حسناتہم کے وجودِ باوجود سے عزیز انسانوں کو اپنے آقا اللہ العزیز کی فطرت یعنی معرفتِ الٰہی اور دینِ حق کے مقتضیات پر گام زن ہوجانے کا بیش قیمت موقع من جانب اللہ دستیاب ہے، سیّدسراواں میں ضوفشاں خانقاہِ عارفیّہ قحطِ معرفت کے اس پرآشوب دور میں حقیقی خانقاہوں کی پیشانیوں کا جھومر ہے اور صاحبِ خانقاہ حضرۃُ الشیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ زادہ اللہ شرفاً و فضلاً معرفت کے اس دورِ قحط الرّجال میں غالباً ہمارے ترکشِ معرفت کے خدنگِ آخرین ہیں۔

آقائے کائنات اللہ العزیز نے مسندِ معرفت اور ولایت کے شہ نشین میرے استاذِ محترم شیخ الکل فی الکل حضرۃُ الامام شیخ ضیاء الحق فیض آبادی علیہ الرّحمۃ والرّضوان کی وفاتِ حسرت آیات کے طویل عرصہ بعد مجھے مسندِ ولایت و معرفت کے دوسرے شہ نشین کے روپ میں حضرۃُ الشیخ ابوسعید الہٰ آبادی زیدت حسناتہم کے قرب و نوازشات سے فیض یاب ہونے کا نادرۂ روزگار موقع عطا فرمایا۔ میرے یہ کلماتِ تعلّی، مبالغہ، تملّق اور لاف و گزاف سے ناآشنا رشتۂ ساز سے تحیّر زدہ دردِ دل کی صدائے خاموش کے ابدی ترجمان ہیں، جس کی بےقرار معرفت کی طویل جستجو کو بحرِ معرفت شیخ خانقاہِ عارفیّہ سیّدسراواں حضرۃُ الشیخ ابوسعید کے ساحلِ معرفت سے اعترافِ موثوق اور افراغ علی القلب کی بجا توقّعات نے قرار آشنائی کی جانب ملتفت کر دیا ہے۔

میرا اٹل فیصلہ تھا کہ میرے ہاتھوں بحکمِ حق معرضِ وجود میں آسکنے والیں تمام تصانیف گہوارۂ معرفت یعنی حقیقی خانقاہ سے شائع ہوں، ایسی خانقاہ جو معرفت کے امین حقیقی شیخِ خانقاہ کی معرفت سے معمور اور پرنور ہو، اس عارفانہ شان سے شائع ہوکر الٰہیّات کے ابوابِ رحمت پر مشتمل یہ تصانیف عالمِ بشریّت کے لیے توشۂ معرفت اور رختِ آخرت کے روپ میں زادِ جنّت کا ابدی سرمایہ بنیں آقائے کائنات اللہ العزیز کا مجھ پر اتھاہ احسان اور اپار فضل ہے کہ اس آقائے دستگیر نے مجھے حضرۃُ الشیخ ابوسعید زیدت حسناتہم کی بارگہِ معرفت و ولایت تک مخلصانہ رسائی کی توفیقِ حسن سے شادکام فرمایا۔

آقائے کائنات اللہ العزیز نے اس مبارک رسائی کے لیے اپنے مبارک ومسعود بندے حضرت حافظ سرفراز حسین فاروقی الٰہ آبادی سلّم اللہ علیہ کو واسطۂ حسنہ بنایا اپنے محسن کی قدردانی کا آشکارا اعتراف کرنا آقائے کائنات کا بندوں پر عائد کردہ ابدی فریضہ ہے، میں اپنے آپ کو اس ابدی الٰہی آرٹیکل کے معاکس اثرات سے محفوظ نہیں رکھ سکتا اگر میں صاف صاف الفاظ میں کسی الجھاؤ ٹکراؤ کے بغیر یہ واضح نہ کردوں کہ حضرت حافظ سرفراز حسین فاروقی خانقاہِ عارفیّہ اور حضرۃُ الشیخ ابوسعید زیدت حسناتہم کی سرپرستی میں اس دینی تحریری فیضِ امانت کے اللہ کے بندوں تک پہنچنے کا نردبان ہیں، جانبدارانہ تصوّرات سے پاک بات یہ ہے کہ حافظ سرفراز سلّم اللہ علیہ بفضلِ حق اور بہ تربیّتِ شیخ ابوسعید زیدت حسناتہم دلِ حق آگاہ اور قلبِ طاہر ومعصوم کی نعمت سے سرفراز ہیں، میری معلومات کے مطابق حضرۃُ الشیخ ابوسعید زیدت حسناتہم کے سب سے زیادہ حسّاس او رفرّاس متقرّبین اور مستفیدین میں حافظ سرفراز حسین فاروقی دستۂ ہراول کے ممتاز ترین سرخیلوں میں سے نمایا ترین فرد ہیں، آقائے کائنات انہیں اپنی دائمی معرفت سے سرفراز رکھے، جناب حافظ سرفراز حسین فاروقی صاحب مجھ سے دینِ حق کے ابدی ترجمان قرآنِ کریم کا سب سے زیادہ استفادہ کرنے والے خوش خصال اور خوش قسمت مردِ جلیل ہیں۔

بہ نفسِ نفیس حضرۃُ الشیخ ابوسعید زادہ اللہ شرفاً وفضلاً کی عارفانہ خواہش جان کر میرا آبگینۂ دل نورِ معرفت سے مزید جگمگا اٹھا کہ میرے ہاتھوں بحکمِ حق حوالۂ قرطاس تصنیفات اسی مقامِ محمود سے طبع ہوں، جو اللہ کی فطرت یعنی معرفتِ الٰہی اور دینِ حق سے استفادہ کا مرکز ہو اور ایسی ہستی کی سرپرستی میں طبع ہوں، جو فطرۃُ اللہ یعنی معرفتِ الٰہی اور دینِ حق کے ازلی، ابدی، تخلیقی نقوش کو نورِ ایمان، نورِ حق اور نورِ معرفت سے روشن رکھنے کے ربّانی فیضان سے فیض یاب ہو، صد ہزار شکر ہے کہ آقائے کائنات الٰہ ارض وسموات کا کہ اس آقائے دستگیر نے مجھ کاتبُ السّطور میرزا شمشاد احمد بیگ کو شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی زیدت حسناتہم کے سراپا میں ایسی ہستی سے نوازا اور میری تصنیفات کو خانقاہوں میں حقیقی خانقاہ خانقاہِ عالیّہ عارفیّہ سیّد سراوں سے طبع ہونے کا شرف بخشا۔

حسن میاں سلّم اللہ علیہ کی خواہش بھی ٹھیک ٹھیک حضرۃُ الشیخ کی خواہش کی ترجمان ملی، آقائے کائنات نے حسبِ ظرف جن عظیم وجلیل نعمتوں کو مجھ پر مبذول فرمایا ہے، ان میں سے حسن میاں سلّم اللہ علیہ کو اپنی مشیّتِ مطلقۂ رضوانیّہ کے تحت وہ قابلِ رشک حصّہ عطا فرمایا ہے جو کامیاب وبامراد قسمت کے دھنی عازمِ معرفت شاگرد کا ازلی نصیبہ ہوتا ہے حسن میاں میرے صاحبِ ژرف عزیز شاگرد اور حضرۃُ الشیخ کے بڑے فرزندارجمند ہیں آقائے کائنات کی نوازشات کے طفیل وہ حضرۃُ الشیخ کے نقوشِ خیر کو اپنی لوحِ حیات پر ثبت کرنے میں چاک وسبّاق ہیں، آقائے کائنات ان کو صبح وشام علی الدّوام عالمِ معرفت میں پیش گام رکھے اور انہیں خانقاہِ عارفیہ کو اپنے مقصدِ وجود کا حقیقی ناطق اور زندہ گواہ بنائے رکھنے میں تاحیاتِ مستعار فائزُ المرامی سے بہرہ مند رکھے۔ آمین

یہ حقیقت نقشِ یادداشت رہے کہ یہ خانقاہ عارفیّہ اور خانقاہوں سے اس امتیازی استثنائی زاویّہ سے ممتاز

اور منفرد ہے کہ دیگر خانقاہوں کے برعکس خانقاہِ عارفیہ کا مبارک نام براہِ راست نہ صرف معرفت سے مستفاد ہے، بلکہ معرفت سے راست استفادہ کرنے والی افادۂ فیضِ معرفت کی زندہ مثال ہے، اس طرح معرفت کے نام سے شاد کام خانقاہِ عارفیہ اسم بامسمّٰی کی جیتی جاگتی تصویر ہے، ان سطور کے لکھے جانے تک خانقاہِ عارفیہ کے اسمِ بامسمّٰی ہونے کا سہرا آقائے کائنات کی عنایات کا رہینِ منّت ہے، آقائے کائنات کی یہ عنایات بقائے کائنات کے نقش بہ نقش خانقاہِ عارفیہ پر مبذول رہیں، اور مجھ خاکسار کی ممکنہ خدمات خانقاہِ عارفیہ کے استقبالِ حسن کے لیے ہمیشہ پیش پیش ہوں۔ اللّٰھم آمین ثمّ آمین۔

تحقیقات تصوف کی ایک نئی دنیا

مولانا رضی احمد مصباحی (پروپرائٹر: معین ٹریڈرس، ارریہ (بہار)

زمانہ طالب علمی میں امام غزالی کی تعریف وتوصیف سننے اور پڑھنے کی وجہ سے دل میں ان کے لیے ایک خاص عظمت پیدا ہوگئی تھی، اسی وجہ سے جب بھی کہیں ان کی کوئی کتاب ملتی اسے حاصل کر لیتا تھا، اگر چہ ان کو سمجھ پانے کی لیاقت اپنے اندر نہیں تھی۔ اردو میں امام صاحب کی چند کتابیں پڑھا تو اندازہ ہوا کہ مترجمین نے ترجمے میں انصاف نہیں کیا ہے۔

گذشتہ چند سالوں سے سوشل میڈیا کے توسط سے داعی اسلام شیخ ابوسعید صفوی دام ظلہ کے تصوفانہ تجدیدی کاموں کی خبر ملتی رہی ہے۔ اس میں میرے لیے بڑی خبر یہ تھی کہ آپ کی ٹیم نے امام صاحب پر اردو اور عربی میں بڑا کام کیا ہے اور سال کے چند ایام بھی آپ لوگوں نے امام صاحب کے لیے خاص کیے ہیں، جن ایام میں آپ کا ادارہ اپنے طلبہ کے مابین مختلف علمی مسابقات کا انعقاد کرتا ہے۔ اسلاف بیزاری کے اس دور میں جہاں صرف اپنے پیر خانے کو ہی اسلاف سمجھا جاتا ہے آپ لوگوں نے جس طرح سے ہمت وجرات کے ساتھ بلاتفریق تمام صوفی اسلاف اور اہل ہمت کو متعارف کرانے کا سلسلہ شروع کیا اور اس پر ڈٹ گئے ہیں، تاریخ تصوف کا طالب علم آپ کی طرف سے منہ موڑ کر نہیں گزر سکتا۔ خاص کر رسالہ مکیہ اور مجمع السلوک کی اشاعت نے عالمی سطح پر آپ کی صوفیانہ خدمات کو اجاگر کیا ہے۔ دینی راہوں سے دنیاوی مال وزر کے حصول کے زمانے میں ایسی کتابوں کا شائع ہونا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کتاب کا ہاتھوں ہاتھ لیا جانا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ایک بہت بڑے طبقے کو اس روحانی غذا کی تلاش تھی جس کے لیے سعید روحیں آج بھی بے چین ہیں۔

سال نامہ الاحسان کے کچھ نسخے تلاوت کرنے کی توفیق ملی، جس میں جہاں اہل تصوف قلم کاروں کی ایک بڑی ٹیم سے تعارف ہوا، وہیں مولانا ذیشان مصباحی، مولانا ضیاء الرحمن علیمی اور علامہ غلام مصطفیٰ ازہری کی تصوف پر گہری نظر نے متعجب کیا۔

ذیشان بھائی کے ’’سماعیاتی مضمون‘‘ نے سارے اشکال دور کردیے۔سماع پر سے مثل ’’خمر‘‘ کے پڑی حرمت کی دبیز چادر میری نگاہ سے ہٹ گئی اور شاید میرے ساتھ بہت سے متشددالخیال بھی اپنا نظریہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوئے ہوں گے، خاص کر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے ایک صاف ستھرے فتوے کے سہارے بغیر پڑھے جس طرح اس باب میں دہشت گردی مچائی جاتی ہے، ذیشان بھائی نے آسمان سماع پر آئے بے موسم بادلوں کو اپنی نوک قلم سے پاش پاش کردیا ہے۔قلم کی دنیا کا یہ مست قلندر اور نڈر پہلوان جس طرف رخ کرتا ہے سارے کالے بادل خودبخود چھٹتے چلے جاتے ہیں۔

ضیا بھائی کو میں اپنے احباب کی محفلوں میں روبوٹ کہنے لگا ہوں کہ یہ اتنا زیادہ پڑھتے کیسے ہیں؟ ضیا بھائی کی خاص بات یہ نظر آئی کہ اپنے ’’روبوٹک مطالعے‘‘ کے ٹول سے اپنی بات پر اس قدر شواہد پیش کردیتے ہیں کہ قاری کی سانسیں اٹک جاتی ہیں۔آج کے زمانے میں جہاں بہت سے جدید وقدیم محققین متوسط مصادر کو ہی اولین مصادر کا درجہ دے کر اپنی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ منحنی صورت جوان تمام تمام اصل مصادر و مآخذ کی دنیا تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

مولانا غلام مصطفیٰ ازہری کی تحقیقات اور عارفانہ خیالات کی بلندی ایسی ہے کہ ان کی تحریریں شیخ ابن عربی کے افکار کا اردو پیکر معلوم ہوتی ہیں۔معرفت وسلوک کے جس منزل سے بات کرتے ہیں وہاں تک ہر قاری کی رسائی ناممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ داعی اسلام کے ساتھ آپ تمام احباب کو سلامت رکھے۔مجمع السلوک کا ایک نسخہ اشتیاق بھائی کی مہربانی سے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ابھی پوری کتاب نہیں پڑھ سکا ہوں، آپ لوگ دعا کریں کہ اس کتاب کے فیوض وبرکات سے کچھ حصے حاصل کرسکوں۔

اپنی نوعیت کا منفرد مجلہ!

سید عینین علی حق (ایسوسی ایٹ پروڈیوسر، سہارا نیوز نیٹ ورک، غازی آباد، (یوپی)

شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی کے زیر سرپرستی شائع ہونے والا مجلہ ’الاحسان‘ اپنی نوعیت کا منفرد مجلہ ہے۔ بلا مبالغہ خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں کوشامبی الہٰ آباد نے خانقاہوں اور صوفیوں کی عزت وحرمت کو برقرار رکھا ہے، ورنہ دور حاضر کا المیہ ہے کہ خانقاہوں اور درگاہوں کو کھانے کمانے کا ذریعہ ہی تصور کیا جاتا ہے اور تلخ حقیقت بھی یہی ہے کہ آج کی درگاہیں اور خانقاہیں نذرانہ لینے اور رسم ورواج تک ہی محدود ہوکر رہ گئی ہیں۔ ملک کی تمام بڑی خانقاہوں میں اپنے اسلاف اور تصوف کی تعلیمات پر کام نہیں ہورہا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ خانقاہوں میں وسائل کا فقدان ہے، یا سجادگان اور خدام حضرات مفلسی کی زندگی بسر

کررہے ہیں۔اچھے لباس سے لے کر مرغن غذاؤں کے شوقین بھی ہیں، لیکن دینی تعلیم اور آباواجداد کی تعلیمات کو پڑھنے اور انہیں دوسروں تک پہنچانے کو کار فضول سمجھتے ہیں۔ بڑی درگاہوں اور خانقاہوں کے بیشتر صاحب زادگان کی صورت حال یہ ہے کہ کچھ جماعت پڑھنے کے بعد نذرانہ وصول کرنے کے کام کو ہی اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں، جب کہ درگاہوں اور خانقاہوں کی اس قدر آمدنی ہے کہ اگر متحد ہو جائیں تو جامعہ ملیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طرز پر بڑے بڑے ادارے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ چند ایسی خانقاہیں ہیں جہاں کچھ علمی اور تعمیری کام انجام دیے جارہے ہیں۔

لیکن جو رسالے یا کتابیں شائع ہوتی ہیں وہ کسی ایک طبقے کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے لکھی اور ترتیب دی جاتی ہیں۔کوئی ایسا مستحکم کام انجام نہیں دیا جاتا، جس کے ذریعے تصوف مخالفین کو متاثر کیا جائے یا اپنے افکار و نظریات سے آشنا کرایا جاسکے۔ خانقاہوں اور درگاہوں سے شائع ہونے والے اکثر و بیشتر رسائل وجرائد اور کتابیں سجادگان، پیران طریقت، مریدین اور معتقدین کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے لکھی اور ترتیب دی جاتی ہیں، لیکن الاحسان ایک ایسا مجلہ ہے، جس نے تمام طبقات کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا ہے اور ایک وسیع تر ویژن کے تحت کام کیا جارہا ہے۔تصوف پر اس قدر علمی، تحقیقی اور دعوتی مجلہ شاید ہی اب تک کسی خانقاہ نے شائع کیا ہوگا۔

میرے بچپن کی یاداشت کے مطابق سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ شریف سے ایک علمی اور خالصتاً تصوف پر مبنی ماہ نامہ ''آستانہ'' دہلی سے شائع ہوا کرتا تھا۔صاحب زادہ محمد مستحسن فاروقی کے انتقال کے بعد بیگم ریحانہ فاروقی کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہنامہ 'آستانہ' خانقاہوں اور درگاہوں کا نمائندہ رسالہ ہوا کرتا تھا اور مقبول بھی تھا۔ میرے نانا حضرت علامہ شاہ احتشام الدین احمد فریدی چشتی، سابق سجادہ نشیں خانقاہ فریدیہ، سہسرام اکثر ماہنامہ 'آستانہ' کے پرانے شمارے پڑھنے کے لیے دیا کرتے تھے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ 'آستانہ' بھی بند ہو گیا۔

خانقاہوں کے کچھ پڑھے لکھے افراد ماہ نامہ 'آستانہ' بند ہونے کا خلا مستقل محسوس کررہے تھے، لیکن ایک طویل عرصے کے بعد 'الاحسان' نے اس خلا کو پر کرتے ہوئے خانقاہوں اور درگاہوں کی نمائندگی کا ذمہ اپنے سر لیا ہے، جس کے لیے خانقاہوں کے صاحب زادگان کو 'الاحسان' کا احسان مند ہونا چاہیے۔ان سے گذارش ہے کہ اپنی درگاہوں اور اپنے اسلاف کو محض روزی روٹی کا ذریعہ نہ سمجھیں بلکہ ان کے تعمیری اور علمی کاموں پر توجہ دیتے ہوئے اپنی نگارشات بھی 'الاحسان' کو بھیجیں اور الاحسان کا مستقل قاری بنیں۔

'الاحسان' کا کتابی سلسلہ آب وتاب کے ساتھ جاری ہے۔مجلہ الاحسان کا دسواں شمارہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب 'سلطان المشائخ نمبر' کا شدت سے انتظار ہے۔امید کرتا ہوں کہ گذشتہ شماروں کی طرح ہی 'سلطان المشائخ نمبر' بھی اہمیت وافادیت کا حامل ہوگا۔

صوفی تحقیق وادب کا فرض کفایہ!

سید نورین علی حق (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی)

داعی اسلام حضرت شیخ ابوسعید احسان اللہ صفوی دام ظلہ وحفظہ اللہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کتابی سلسلہ الاحسان کے پہلے شمارے سے اب تک کے تقریبا تمام شمارے گاہے بگاہے مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ آپ نے تصوف کے اعلی مضامین، مقالات اور متصوفانہ ادب کا جو معیار قائم کیا ہے، وہ برسوں تک علمی وفکری طبقے کے لیے مثال اور آئیڈیل ہے۔ آپ کے ادارے، اشاعتی ادارے، رسائل، عملی خدمات اور آپ کے تربیت یافتہ علما کا زمانہ معترف ہے اور جو نہیں ہیں انھیں بھی ہونا چاہیے۔ الاحسان صوفی تحقیق وادب کے معاملے میں ہم سب چشتیوں کی جانب سے فرض کفایہ ہے۔ کتابی مجلہ اور خانقاہ سے نکلنے والا مجلہ اتنا ہمہ جہت اور معیاری مجلہ اس دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اگر آپ اس کی اشاعت کا بیڑا نہ اٹھاتے۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ آپ ہم سب چشتیوں کی لاج بچائے ہوئے ہیں۔ علمی، فکری، عملی اور تعلیمی کون سا ایسا دائرہ ہے، جو آپ سے چھوٹ گیا ہو۔ تن تنہا آپ کئی محاذ پر کام کر رہے ہیں اور مسرت کی بات یہ ہے کہ ہر محاذ پر کامیاب ہیں، بلکہ دوسرے آپ کے طریقوں سے اکتساب کر رہے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ گذشتہ شماروں کی طرح ہی ہر لحاظ سے یہ شمارہ بھی معیاری اور لائبریریوں کی زینت بننے کے لائق ہوگا۔ سلطان جی کی خدمت میں ایسا شاہ کار خراج مجھے لگتا ہے کہ زمانے کے بعد پیش کیا جا رہا ہے، ورنہ تو بیسویں صدی میں اکابرین چشتیہ پر زیادہ معتبر اور شایان شان کام علمائے دیوبند کی طرف سے کیا جاتا رہا۔ ہم تو ھاوھو میں اتنے مصروف ہوگئے تھے کہ پڑھنا لکھنا ہی ترک کر دیا تھا۔ بہر حال! ایک بار پھر علم کی طرف خانقاہیوں کی مراجعت کا دور آیا ہے، جس کے مثبت نتائج سامنے آ رہے ہیں۔

آپ نے بڑی جاں فشانیوں اور محنتوں کے بعد ایسا سیٹ اپ تیار کیا ہے کہ اعلی سے اعلی اور معیاری کام آپ کے زیر سرپرستی انجام پا سکتا ہے۔ عرض یہ ہے کہ اسی آن بان شان کے ساتھ حضرت خواجہ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی، حضرت مولانا فخر الدین چراغ چشت، خواجہ گیسو دراز بندہ نواز اور حضرت مولانا نیاز بریلوی پر بھی کام ہو جائے تو ہم سب چشتی آپ کے ممنون کرم ہوں گے۔

”پین ٹاک“ کا پلیٹ فارم!

آفتاب رشک مصباحی (القدس اکیڈمی، دارا پٹی، مظفر پور، بہار)

مخدوم گرامی قدر علامہ حسن سعید صفوی دام ظلہ العالی! تسلیمات!

مزاج گرامی؟ یہ اطلاع پا کر بڑی مسرت ہوئی کہ اس سال ’الاحسان ٹیم‘ نے سلسلہ چشتیہ کے ایک عظیم

بزرگ، بلکہ مرکزی شخصیت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ کی حیات وتعلیمات پر خصوصی شمارہ نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔اس مبارک کام کے لیے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

سلطان المشائخ کی تعلیمات نے نہ صرف ان کے دور سعید میں، بلکہ ہر دور میں ایک بڑی آبادی کو متأثر کیا ہے۔آپ کی ذات اور آپ کی تعلیمات عالم انسانیت کے لیے امن وشانتی، آپسی بھائی چارے،قومی ہم آہنگی اور اتحاد ملی کی علامت رہی ہے۔عالمی سطح پر جس طرح آج کی انسانی فضا مکدر ہوئی ہے ایسے میں آپ کی تعلیمات پر عمل کر کے بڑی حد تک تشدد آگیں سماج کو پر امن بنایا جا سکتا ہے۔

الاحسان ٹیم نے اپنی ابتدا ہی سے مشائخ صوفیہ کی تاریخ وتعلیمات سے ایک جہان کو نہ صرف واقف کرانے کی، بلکہ اس پر عملی پیش رفت کے لیے مہمیز کرنے کی سعی مسعود کی ہے۔علمی سطح پر تصوف،صوفیہ اور تعلیمات صوفیہ کی اہمیت وضرورت کی حیثیت واقعی کو اجاگر کرنے میں 'مجلہ الاحسان، الہ آباد' اپنی مثال آپ ہے۔اس مجلّے کی مقبولیت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں نہ تو مشربی خانہ جنگی ہے، نہ ہی مسلکی تعصب وعناد۔علمی دلائل کی بنیاد پر ہر کسی کی بات سننے اور ہر کسی کو اپنی تحقیق پیش کرنے کی روش ہی نے اس کے ذریعے افہام وتفہیم کی ایک نئی دنیا آباد کی ہے۔

مجلہ ''الاحسان'' پرنٹ دنیا کا وہ واحد پلیٹ فارم ہے جہاں تصوف کے موافقین ومخالفین عزت واحترام کے ماحول میں باہم ''پین ٹاک'' کرتے ہیں،جس کے مثبت اور دور رس نتائج دکھنے بھی لگے ہیں۔اللہ کرے کہ مجلّے کی یہ خوبی کاغذ کے اوراق سے باہر نکل کر ہماری زندگی کا ایک لازمی وصف بن جائے تا کہ ہمارے وجود اور اس کی حرکتوں سے دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔

خانقاہ عارفیہ کی انفرادیت

سیف الدین عیاض رومی، ایڈیٹر رسالہ ''صوفیانہ''، خانقاہ رومی حسن، کیلا باڑی، درگ (چھتیس گڑھ)

مجلہ الاحسان تصوف کے علمی وتحقیقی مطالعے پر علمی رسالہ ہے جو اپنے پورے علمی معیار اور توازن کے ساتھ پابندی سے اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ابتدائیہ کا یہ جملہ بہت اہم ہے: ''تصوف کے مسائل ومباحث پر گفتگو میں ہم بہت دور نکل جاتے ہیں اور بسا اوقات اتنا دور نکل جاتے ہیں کہ محقق،فقیہ،نکتہ سنج اور دقیق النظر ہو جاتے ہیں اور تحقیق وتمحیص کے اس پورے سفر میں ہم جو نہیں ہوتے، وہ صوفی نہیں ہوتے۔''لیکن ہمارا ماننا ہے کہ داعی اسلام بہت آگے بھی نکل گئے ہیں اور سچے صوفی بھی ہیں اور یہی بات ان کی ذات گرامی کو دوسروں سے الگ کرتی ہے۔

پچھلے دنوں، داعی اسلام شیخ ابوسعید صفوی حفظہ اللہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔دوران گفتگو آپ نے فرمایا: سلسلہ قادریہ میں رعب ودبدبہ ہے، کیونکہ غوث پاک کی خانقاہ اسلامی ریاست میں قائم تھی۔البتہ ہندوستان میں دعوت وتبلیغ کے لیے غریب نواز کا طریقہ زیادہ کارگر ہے، کیونکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی سے متاثر ہے۔

جہاں کچرے بھی پھینکے گئے، پتھر بھی برسائے گئے، لیکن جواب میں محبت ملی۔ خون نکل آیا لیکن زبان میں دعائیں رہی۔ اسی طریقہ کو لے کر غریب نواز ہندوستان تشریف لائے اور آج بھی یہ طریقہ اثر رکھتا ہے۔

حضرت نظام الدین قدس سرہ العزیز کئی سال مرشد کی خدمت میں رہے اور تمام روحانی نعمتوں کے ساتھ شیخ کے حکم سے دہلی پہنچے۔ دہلی میں اس وقت ایک پیسہ میں دو آدمی دو دنوں تک بخوبی شکم سیر ہو جاتے تھے۔ آپ کو اتنا بھی نصیب نہیں تھا، کئی کئی دنوں تک فاقہ رہتا۔ ایک روز ایک سوت کاتنے والی عورت آدھا سیر جو دے گئی، آپ نے شیخ کمال الدین یعقوب سے ہنڈیا چڑھانے کو کہا۔ ابھی ٹھیک سے پکا بھی نہیں تھا کہ ایک فقیر تشریف لے آئے اور آواز لگائی: کھانا لے آؤ۔ حضرت نے جو کچھ تھا پیش کر دیا۔ فقیر نے کھانا کھا کر، ہنڈیا کو توڑ دیا اور فرمایا، اے نظام الدین باطنی نعمت تم نے فرید سے پائی اور کاسہ فاقہ و اخلاص ظاہری کو ہم نے توڑ دیا (یعنی باطنی رکاوٹوں کو بابا فرید نے درست کیا اور ظاہری پریشانیوں کو ہم نے دور کر دیا)۔ اب تم سلطان ظاہری و باطنی ہو گئے۔ اس روز کے بعد سے آپ کی فاقہ وتنگی ایسی دور ہوئی کہ جس کا حساب نہیں۔ آپ کی خانقاہ میں ہر وقت لنگر جاری رہتا اور لوگوں کا ہجوم لگا ہوتا، آپ کی مجلس اس وقت کے سلطان سے بھی بڑھ کر ہوتی تھی۔

ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کی داغ بیل خواجہ غریب نواز کے ہاتھوں پڑی، پھر خواجہ قطب و بابا فرید نے اسے منظم کیا اور حضرت نظام الدین اولیاء نے اسے معراج کمال تک پہنچا دیا۔ نصف صدی سے زیادہ دہلی میں ان کی خانقاہ ارشاد و تلقین کا مرکز اور رشد ہدایت کا سرچشمہ بنی رہی۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور آج بھی خانقاہوں میں بدستور جاری ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ صوفی فقیروں نے دین کی اشاعت میں جو کردار انجام دیا وہ بڑے بڑے شہنشاہ کیوں نہ کر سکے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ تصوف و روحانیت ہے۔ انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا، جسم کا تعلق مادے سے ہے اور اس کی غذا بھی مادی ہے۔ روح علمِ قُدس کی چیز ہے اور اس کی غذا بھی روحانی یعنی خالق کائنات کی محبت اس کی معرفت اور قرب ہے۔ جس طرح انسان کا جسم مادی غذا نہ ملنے کی وجہ سے بے چین ہو جاتا ہے اسی طرح روح کو بھی روحانی غذا نہ ملنے سے سخت بے چینی اور بے قراری لاحق ہوتی ہے۔ اور اسی بے قرار روح کو صوفیہ کرام نے قرار دیا۔ صوفیوں نے سیاہ قلب کو نور سے بھر دیا اور حدیث، کنت کنزاً مخفیاً اور وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (میں نے انسان میں اپنی طرف کی روح پھونکی) کے مطابق عشق الٰہی میں ڈبو دیا۔

ایسا ہی روحانی خدمات، خانقاہ عارفیہ میں حقیقتاً دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک صدا آ رہی ہے:

این درگہ ما درگہ نومیدی نیست

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

○○○

اس شمارے کے اہل قلم

- **خواجہ سید محمد نظامی**، سجادہ نشین، درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، دہلی
- **پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی**، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
- **احمد جاوید**، سابق ڈائریکٹر: اقبال اکیڈمی، لاہور
- **پروفیسر معین نظامی**، شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور
- **ڈاکٹر سید شمیم احمد گوہر**، خانقاہ ابوالعلائیہ، الٰہ آباد
- **ڈاکٹر عارف نوشاہی**، ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد، پاکستان
- **احمد جاوید**، ریزیڈنٹ ایڈیٹر: روزنامہ انقلاب، پٹنہ
- **مولانا سید سیف الدین اصدق**، ڈائریکٹر: پیغام اسلام سینٹر، جمشید پور، جھارکھنڈ
- **مفتی میرزا شمشاد احمد بیگ**، سوں گر، جون پور، یوپی
- **نوشاد عالم چشتی علیگ**، میڈیکل کالج روڈ، علی گڑھ
- **ڈاکٹر شبیب انور علوی**، استاذ: شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
- **مفتی محمد رضا قادری**، استاذ: جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی
- **مولانا رضی احمد مصباحی**، پروپرائٹر: معین ٹریڈرس، ارریہ، بہار
- **سید قمر الاسلام**، ریسرچ اسکالر: شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
- **زین العابدین اشرفی**، متعلم، کلیہ شریعہ، جامعہ ازہر، قاہرہ، مصر
- **سید عینین علی حق**، ایسوسی ایٹ پروڈیوسر، سہارا نیوز نیٹ ورک، غازی آباد، یوپی
- **سید نورین علی حق**، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی
- **آفتاب رشک مصباحی**، القدس اکیڈمی، داراپٹی، مظفر پور، بہار
- **سیف الدین عیاض رومی**، ایڈیٹر رسالہ ''صوفیانہ''، خانقاہ رومی حسن، درگ، چھتیس گڑھ

الاحسان ٹیم

- **حسن سعید صفوی**، مدیر: مجلہ الاحسان، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں
- **ضیاء الرحمٰن علیمی**، شریک مرتب: مجلہ الاحسان، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں
- **ذیشان احمد مصباحی**، شریک مرتب: مجلہ الاحسان، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں
- **غلام مصطفی ازہری**، شریک مرتب: مجلہ الاحسان، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں
- **ڈاکٹر جہاں گیر حسن مصباحی**، مدیر مسئول: ماہ نامہ خضر راہ، خانقاہ عارفیہ، سید سراواں
- **رفعت رضا نوری**، پرنسپل: سنی دار العلوم الٰہ آباد، ہمت شاہ، الٰہ آباد
- **محمد ذکی**، استاذ: جامعہ عارفیہ، سید سراواں
- **اصغر علی مصباحی**، لائبریرین: مکتبۃ الاحسان، جامعہ عارفیہ، سید سراواں
- **حماد رضا مصباحی**، استاذ: جامعہ عارفیہ، سید سراواں
- **ساجد الرحمٰن مصباحی**، استاذ: جامعہ عارفیہ، سید سراواں

سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ کی شخصیت اور حیات وافکار پر خصوصی شمارہ

سلطان المشائخ نمبر

کی اشاعت پر مجلہ الاحسان اور اس کے علمی کارواں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک!

منجانب: جامعہ اہل سنت نورالعلوم عتیقیہ، مہراج گنج بازار ترائی، بلرام پور (یوپی)

التماس: جامعہ اہل سنت نورالعلوم عتیقیہ مشرقی اتر پردیش کے ترائی علاقے میں ایک عرصہ سے علم وفن کی نشرواشاعت میں سرگرم عمل ہے اور مخیرین قوم وملت کی خصوصی توجہ کا طلب گار ہے۔

عرض گذار

فیاض احمد برکاتی مصباحی، استاذ جامعہ ہذا

جنرل سکریٹری: ٹیچرس ایسوسی ایشن، مدارس عربیہ اتر پردیش، اکائی بلرام پور (یوپی)

Bank Details:

Jamia Ahle Sunnat Noorul Uloom

A/c-State Bank of India 39146112564-Current

IFSC-SBIN0008943 Branch- Kauwapur